تاریخ تحریکِ آزادیِ ہند

جلد دوم

تاراچند

تاریخ تحریکِ آزادیِ ہند

جلد دوم

تارا چند

مترجم

غلام ربانی تاباں

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

فروغ اردو بھون FC-33/9

انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی ۔ 110025

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

اشاعت : 2018
تعداد : 1100
قیمت : روپے
سلسلۂ مطبوعات : ....

Tareekh Tahreek-e Azady-e Hnd
By
Ghulam Rabbani Taban

ISBN : ....

ناشر:
ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
فیکس:26108159
ای میل:urducouncil@gmail.com،
ویب سائٹ:www.urducouncil.nic.in

پیش لفظ

''ابتدا میں لفظ تھا۔ اور لفظ ہی خدا ہے''

پہلے جمادات تھے۔ان میں نمو پیدا ہوئی تو نباتات آئے۔نباتات میں جبلّت پیدا ہوئی تو حیوانات پیدا ہوئے۔ان میں شعور پیدا ہوا تو بنی نوع انسان کا وجود ہوا۔اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ کائنات میں جو سب سے اچھا ہے اس سے انسان کی تخلیق ہوئی۔

انسان اور حیوان میں صرف نطق اور شعور کا فرق ہے۔ یہ شعور ایک جگہ پر ٹھہر نہیں سکتا۔اگر ٹھہر جائے تو پھر ذہنی ترقی، روحانی ترقی اور انسان کی ترقی رُک جائے۔تحریر کی ایجاد سے پہلے انسان کو ہر بات یاد رکھنا پڑتی تھی، علم سینہ بہ سینہ اگلی نسلوں کو پہنچتا تھا، بہت سا حصہ ضائع ہو جاتا تھا۔تحریر سے لفظ اور علم کی عمر میں اضافہ ہوا۔زیادہ لوگ اس میں شریک ہوئے اور انھوں نے نہ صرف علم حاصل کیا بلکہ اس کے ذخیرے میں اضافہ بھی کیا۔

لفظ حقیقت اور صداقت کے اظہار کے لیے تھا، اس لیے مقدس تھا۔ لکھے ہوئے لفظ کی اور اس کی وجہ سے قلم اور کاغذ کی تقدیس ہوئی۔ بولا ہوا لفظ، آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ ہوا تو علم و دانش کے خزانے محفوظ ہو گئے۔جو کچھ نہ لکھا جا سکا، وہ بالآخر ضائع ہو گیا۔

پہلے کتابیں ہاتھ سے نقل کی جاتی تھیں اور علم سے صرف کچھ لوگوں کے ذہن ہی سیراب ہوتے تھے۔ علم حاصل کرنے کے لیے دور دور کا سفر کرنا پڑتا تھا، جہاں کتب خانے ہوں اور ان کا درس دینے والے عالم ہوں۔ چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد علم کے پھیلاؤ میں وسعت آئی کیونکہ وہ کتابیں جو نادر تھیں اور وہ کتابیں جو مفید تھیں آسانی سے فراہم ہوئیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اچھی کتابیں، کم سے کم قیمت پر مہیا کرنا ہے تاکہ اردو کا دائرہ نہ صرف وسیع ہو بلکہ سارے اس ملک میں سمجھی جانے والی، بولی جانے والی اور پڑھی جانے والی اس زبان کی ضرورتیں پوری کی جائیں اور نصابی اور غیر نصابی کتابیں آسانی سے مناسب قیمت پر سب تک پہنچیں۔ زبان صرف ادب نہیں، سماجی اور طبعی علوم کی کتابوں کی اہمیت ادبی کتابوں سے کم نہیں، کیونکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے، زندگی سماج سے جڑی ہوئی ہے اور سماجیس ارتقا اور ذہنِ انسانی کی نشوونما طبعی، انسانی علوم اور ٹکنالوجی کے بغیر ممکن نہیں۔

اب تک بیورو نے اور اب تشکیل کے بعد قومی اردو کونسل نے مختلف علوم اور فنون کی کتابیں شائع کی ہیں اور ایک مرتب پروگرام کے تحت بنیادی اہمیت کی کتابیں چھاپنے کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ یہ کتاب اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ امید ہے یہ اہم علمی ضرورت کو پورا کرے گی۔ میں ماہرین سے یہ گذارش بھی کروں گا کہ اگر کوئی بات ان کو نادرست نظر آئے تو ہمیں لکھیں تاکہ اگلے ایڈیشن میں نظر ثانی کے وقت خامی دور کر دی جائے۔

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

فہرست

مضامین	صفحہ نمبر
دیباچہ	vii
پہلا باب	
مزاحمتیں اور شورشیں	1
دوسرا باب	
1857 کی بغاوت	43
تیسرا باب	
ہندوستانی درمیانی طبقہ	133
چوتھا باب	
نئی تعلیم اور مغربی تہذیب کا اثر	209
پانچواں باب	
اخبارات اور رائے عامہ	257
چھٹا باب	
سماجی اصلاح	279

ساتواں باب
ہندوستانی قوم پرستی کا معاشی پس منظر 337
آٹھواں باب
مسلم سیاسی فکر کے رجحانات 423
نواں باب
مذہبی اور سماجی اصلاحی تحریکات 473
دسواں باب
تعلیم اور ہندوستانی اخبارات 521
گیارھواں باب
سامراج اور اُس کے ریکارڈ 565
بارھواں باب
سیاسی تحریک 637
تیرھواں باب
ادبی نشأۃ ثانیہ 707

دیباچہ

انیسویں صدی میں برطانوی اثرات کے خلاف ہندوستان کے ردّعمل کا جائزہ ہندوستان کی تحریک آزادی کی تاریخ کی دوسری جلد میں لیا گیا ہے۔ یہ اثرات بڑی حد تک سیاسی تھے اور اس کے ایجنٹ جدیدیت کے جذبے سے سرشار تھے جو ہندوستان میں پائے جانے والے عہد وسطی کے رویے کے برعکس تھا۔ وہ سیاست کو تعمیری معنی میں ایک ایسا عنصر سمجھتے تھے جو سماج کی تمام سرگرمیوں میں شامل ہے اور ان کی سمت کا تعین کرتا ہے۔ چنانچہ ہندوستانی زندگی پر برطانوی اثرات وسیع بھی تھے اور ان کی جڑیں گہری بھی تھیں۔ اس کے مثبت اور منفی دونوں قسم کے اثر پڑے۔

مغرب کے خلاف ہونے والی صف آرائی نے ہندوستان کو مجبور کردیا کہ وہ اپنی روایات یعنی اقدار وتصورات رسم ورواج اور اداروں کا تنقیدی جائزہ لے اور اُن میں سے جو غیر معقول یا غیر صحت مند نظر آئیں انھیں یا تو ترک کردے یا نئی شکل دے۔ اُس تصادم کا یہ تخریبی پہلو تھا۔ دوسری طرف یہ ضروری تھا کہ چیلنج کا جواب ہندوستانی شعور کی اتھاہ گہرائیوں سے ابھرے جو ہندوستانی زندگی کے بنیادی اصولوں کی یکتائی کے اعادے کے مترادف ہوتا۔ وہ اصول جو ہزاروں سال تک فرد اور سماج کے طور طریقوں کے لیے محرکات مہیا کرتے رہے۔ جن سے

ہندوستانی تہذیب کی خصوصیات عبارت ہیں اور جو ہزاروں سال تک اُن کی انفرادیت اور تسلسل کے ضامن رہے۔

ان خصوصیات کو دوبارہ دریافت کرنے اور اُن میں نئی جان ڈالنے اور ایک نئے ہندوستان کی تعمیر کرنے کے لئے پہلے شرط تھی سیاسی آزادی۔ یہ تھا بدیسی اقتدار کا اصلاحی رول۔

سماجی اور مذہبی اصلاح کی تحریکیں ہوں یا ذہن نشیں کر کے ادبی اظہار یا معاشی اور سیاسی تبدیلی کی تحریکیں ہوں۔ یہ سب مظہر تھیں اُس بڑے تغیر کی جو جدیدیت کے نظریاتی اور عملی حملے کے نتیجے میں وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ انیسویں صدی کے نصف اول میں جب جدیدیت کی روشنی رفتہ رفتہ پھیلنی شروع ہو گئی تھی، قدیم ہندوستان اس منظر کو دیکھ کر بہت پریشان ہو گیا تھا اس لیے کہ وہ مغربی سامراج کی ابتدا کو اپنی قدیم تہذیب کے لیے ایک خطرہ سمجھتا تھا جس میں معیشت، سیاسی نظام اور مذہب شامل تھے۔ اس ہلاکت آفرینی سے بچنے کے لیے پرانے نظام نے شدید مگر بے اثر ردعمل کا مظاہرہ کیا۔ ابتدائی شورشیں انفرادی حادثات تھے جن میں کوئی تال میل نہیں تھا لیکن اُن کا نقطۂ عروج تھی 1857 کی بغاوت جس کا حشر ایک المیے پر ہوا۔

اس دوران ایک نیا ہندوستان شکل پذیر ہو رہا تھا۔ ہندوستانی تہذیب کی انفرادیت اور تسلسل کی بنیاد پر قومی اتحاد کی عمارت تعمیر کی جا رہی تھی۔ ابھی تک ہندوستان کی تاریخ کی نمایاں خصوصیات رہی ہے تہذیبی یک جہتی اور اُس کے ساتھ سیاسی تفریق پسندی۔ اب کوشش کی گئی تہذیبی ہم آہنگی کو تقویت دینے کی اور ایک دوامی بنیادی سیاسی یک جہتی پیدا کرنے کی۔ ہندوستان کا قوم پرستی کے ارتقا میں انیسویں صدی کا نصف آخر ایک تشکیلی دور تھا۔ ابتدا میں تحریک کمزور تھی اور اسے خود پر اعتماد نہیں تھا۔ اس نے سماج کے درمیانی طبقے کو متاثر کیا۔ اس کی کئی آوازیں تھی اور اپنے سیاسی اور مذہبی مفادات و مقاصد میں امتیاز نہیں کر سکی۔ یہ برطانوی سامراج کے دامن سے چمٹی رہنا چاہتی تھی۔ اپنے بھولے پن اور ناتجربہ کاری کی بنا پر اس نے سیاسی اصلاح کی ڈپلومیٹک یقین دہانیوں اور فیاضی کے ساتھ کئے جانے والے وعدوں پر یقین کر لیا اور اتنی سی بات اُس کی سمجھ میں نہیں آئی کہ سامراجی مفادات قومی توقعات سے مطابقت نہیں رکھتے ہیں۔ چنانچہ قومی عزم کے اس آرگن نے جو دجود میں آ چکا تھا، ابتدا میں اپنے مقاصد کو

گڈمڈ کر دیا اور اُن مقاصد کو حاصل کرنے کے طریقوں میں دوسروں کی نقل کرنے لگا اس دوران سماجی و معاشی تبدیلیاں آزادی کی جدوجہد کے آخری مرحلے کے لیے میدان تیار کر رہی تھیں۔ لوگوں کی بدحالی بڑھتی جا رہی تھی۔ درمیانی طبقوں کی طاقت اور اثر میں اضافہ ہو رہا تھا۔ وہ اُن خرابیوں سے روز بروز زیادہ باخبر ہوتے جا رہے تھے جو ہندوستان کو لاحق تھیں اور اُن کو دور کرنے کے لئے جو طریقے انھوں نے ابھی تک اپنائے تھے اُن کی بے اثری اُن پر رفتہ رفتہ ظاہر ہونے لگی تھی۔ عام لوگوں کے مایوس کن حالات کا ناقابل انکار ثبوت مہلک قحطوں کے اُس سلسلے نے فراہم کر دیا تھا جس کی وجہ سے انیسویں صدی میں لوگوں کو ناقابل بیان دکھ سہنے پڑے۔

دوسری طرف مذہبی اور سماجی اصلاح کی تحریکات اور ادب و فن کا نشاۃ ثانیہ قوم پرستی کے ابھرتے ہوئے جذبے کے مظاہر تھے۔ ایک ایسی نئی صبح کے مظاہر جو غلامی اور دکھوں کی رات کے خاتمے کا اعلان کر رہی تھی۔

بدقسمتی سے ہندوستان کے حکمرانوں نے جس طرح لوگوں کے دکھوں کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں اُس طرح وہ ہندوستان کی قوم پرستی کے وجود کو تسلیم کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے۔ بقول سر جان اسٹریچی ''نہ ہندوستان ہے اور نہ کبھی تھا۔ ہندوستان کا کوئی ملک بھی نہیں ہے'' بلاشبہ حکمرانوں کی یہ بے نیازی ہندوستانی لوگوں اور اُس کی بدیسی حکومت کے درمیان تصادم کی اصل وجہ بن گئی۔ انیسویں صدی کے آخر تک یہ تصادم بڑی حد تک تقریروں، کبھی کبھی تحریکوں، پر جوش جلوس، تجویزوں اور عرضداشتوں کی شکل میں کئے جانے والے اختلاف و احتجاج سے ظاہر ہوتا رہا۔ سیاست کا کل کھیل اُن کے مطابق کھیلا جاتا تھا جو ''دستوری ضوابط'' کے نام سے مشہور تھے۔ اس کا مقصد تھا حکومت وقت کے جذبہ خیر سگالی سے رجوع کرنا اور اُسے حتی الامکان کم سے کم ناراضگی کا موقع دینا تھا۔

اُس صدی کا ربع آخر بین الاقوامی معاملات میں برطانیہ کے مسلمہ قیادت اور سامراج کے بڑے فروغ کا زمانہ تھا۔ سلطنت کے دونوں حصوں میں سے سفید حصے کو رفتہ رفتہ ڈومنین اسٹیٹس کے لئے تیار کیا جا رہا تھا جس میں اصل ملک کے ساتھ مساوی حیثیت مضمر تھی۔ دوسرے حصے کو جہاں غیر سفید نسلیں اور مختلف تہذیبوں کے لوگ آباد تھے، برطانیہ کی شان و شوکت کو برقرار رکھنے

کی خاطر ایک ضروری بنیاد کے طور پر تعمیر کیا جا رہا تھا، کرزن کے زمانۂ حکومت میں ہندوستان میں سامراج کے دعوے اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ چکے تھے جس کا ردِعمل ناگزیر تھا۔ وہاں سے جارحانہ قوم پرستی کا دور شروع ہوا۔

صدی کے اختتام کے ساتھ آزادی کی تحریک کی کہانی ایک نئے مرحلے میں داخل ہوتی ہے جہاں سے اُس نے بیسویں صدی میں نفوذ کیا اور اپنی تکمیل کو پہنچی۔ اس موضوع پر بحث تیسری جلد میں کی جائے گی۔

اس تاریخ کو لکھتے وقت اتنا زور نئے واقعات کی دریافت پر نہیں دیا گیا جتنا کہ جانے پہچانے واقعات کی تشریح و تصریح پر۔ صراحت کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ اُسے کسی قدر موضوعی عمل بنا دیتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ تشریح کی بنیاد ہونی چاہئے وہ واقعات جو تاریخی بیان کے لئے خام مال کی حیثیت رکھتے ہیں پھر بھی واقعات کے انتخاب، اُن کی ترتیب اور اُن کی قدر و قیمت کا انحصار ہوتا ہے مورخ کی پسند، فیصلے اور دلچسپی پر۔ جیسا کہ ای۔ ایچ۔ کار نے کہا ہے ''تاریخی واقعات کے ایک ایسے مرکزی نقطے پر یقین رکھنا جو مورخوں کی تشریحات سے آزاد ایک معروض وجود رکھتا ہو، بڑی خام خیالی ہے'' چارلس اے۔ بیرڈ کی بات بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ ''تاریخ جیسی کہ وہ حقیقت میں تھی اور تاریخ کے مخصوص واقعات سے جس کی حیثیت جداگانہ تھی اُس کو نہ ہم جانتے ہیں اور نہ جان سکتے ہیں چاہے کتنے ہی جوش و خروش کے ساتھ معروضی حقیقت کی کوشش کے تصور پر عمل کیا جائے۔''

میں اس بات سے اچھی طرح واقف ہوں کہ تاریخ نویسی میں قطعیت نہیں ہوا کرتی ہے اور نیو کیمبرج ماڈرن ہسٹری کے مدیر اعلیٰ سر جارج کلارک کی طرح میں بھی توقع کرتا ہوں کہ میری کتاب میں بار بار ترمیم کی جائے گی۔ پھر بھی مجھے امید ہے کہ ان جلدوں میں مَیں نے دل کو گرمانے والے اُن واقعات کو صحت اور یکسانیت کے ساتھ پیش کر دیا ہے جو انسانی ارتقا کی تاریخ کے ایک دلچسپ اور سبق آموز باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔

مجھے اپنے کام میں دوستوں اور ساتھیوں سے بیش قیمت امداد ملی۔ میں ڈاکٹر کے۔ کے۔ دتا، پروفیسر محمد مجیب، ڈاکٹر نہار رنجن رے، ڈاکٹر بشیشور پرشاد اور پروفیسر کے۔ اے۔ نیلکنٹ

شاستری کا انتہائی ممنون ہوں جنھوں نے مخطوطے کو پڑھا اور اُس کو بہتر بنانے کے لئے مفید مشورے دیے۔ انھوں نے بغیر کسی پس وپیش کے میری جو مدد کی ہے میں شکریے کے ساتھ اُس کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔

میرے ساتھی ڈاکٹر وی۔ جی۔ دگھے، ڈاکٹر آر۔ کے۔ پارمو اور ڈاکٹر بی۔ ایم۔ بھاٹیہ نے اس کام میں اپنی بہترین قوت عمل اور صلاحیت صرف کی۔ معاشی حالات کے متعلق ترتیب دیے جانے والے ابواب میں ڈاکٹر بھاٹیہ کا بڑا حصہ ہے۔ ڈاکٹر دگھے اور ڈاکٹر پارمو کا حصہ بھی اُسی قدر بیش قیمت ہے جنھوں نے جلد کے بقیہ حصے کے لئے نہ صرف بڑا مواد فراہم کیا بلکہ حوالہ جات کی تصدیق کی، واقعات کی تفتیش کی اور مخطوطے پر نظر ثانی کی۔ ڈاکٹر دگھے نے اشاریہ بھی تیار کیا۔ اُن کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔

نیشنل لائبریری کلکتہ کے لائبریرین شری۔ وائی۔ ایم۔ مولے اور نیشنل ارکائیو آف انڈیا، نئی دہلی، کے ڈائرکٹر اور ڈپٹی ڈائرکٹر بالترتیب شری کے۔ ڈی۔ بھارگو اور شری ایس۔ رائے اور اُن کے ماتحتوں کے نام اُن لوگوں کی فہرست میں شامل نہ کرنا درست نہیں ہوگا جن کے تعاون کے لئے مصنف ممنون ہے۔

میرے پرسنل سکریٹری شری۔ بی۔ آر۔ اجمانی پر ٹائپ شدہ اسکرپٹ تیار کرنے کی انتہائی محنت طلب ذمہ داری تھی۔

ان سب کا میں ممنون ہوں۔ لیکن تاریخ میں جو کچھ درج کیا گیا ہے اُس کی ذمہ داری اُن میں سے کسی پر نہیں ہے۔ اسمیں جو کچھ کہا گیا ہے اور جیسے کہا گیا ہے اُس کے لئے تنہا میں جوابدہ ہوں۔

تاراچند

نئی دہلی

2 مئی 1967

پہلا باب

مزاحمتیں اور شورشیں

پلاسی کی فتح کے ساتھ ہندوستان میں برطانوی فتوحات کا دھارا بہہ نکلا۔ 1764 میں دہلی کے شہنشاہ کو بکسر کی جنگ میں شکست ہوئی اور 1765 میں اُس نے بنگال، بہار اور اڑیسہ کی دیوانی انگریزوں کو عطا کر کے انتقال اختیارات کو قانونی شکل دے دی۔ 1772 میں وارن ہسٹنگز نے ان علاقوں کے راست اختیارات سنبھال لئے اور برطانوی حکومت کے نظام کی بنیاد ڈالنی شروع کی۔ اُس وقت ہندوستان میں کئی ڈھیلی ڈھالی تنظیموں والی سیاسی طاقتیں اور بہت سی نیم خودمختار فیوڈل ریاستیں موجود تھیں۔ اُن میں سے زیادہ تر مغل شہنشاہ کی حکم فرمانی تسلیم کرتی تھیں جس کے اختیارات تیزی کے ساتھ ختم ہوتے جا رہے تھے۔

یہ ریاستیں اور جاگیریں خودکشی کے راستے پر چل رہی تھیں اور ایک دوسرے کے خلاف دائمی جنگوں میں مبتلا تھیں۔ ریاستیں مقابلتاً بڑی تھیں۔ اُن میں سے کچھ مثلاً مرہٹہ سلطنت ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر پھیلی ہوئی تھیں لیکن اُس میں سے کسی کو سیاسی استحکام یا مالیاتی مقدرت نصیب نہیں تھی۔ وہ داخلی جھگڑوں، جماعتی منافقتوں اور ذاتی رقابتوں کی شکار تھیں۔

واقعہ یہ ہے کہ وہ کمپنی کی مدد کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میلکم نے کہا ہے ''ان سرداروں نے تنگ نظری کی پالیسی کی بنا پر نفرت اور جاہ طلبی کے فوری مقاصد کو حاصل کرنے کی خاطر دائمی آزادی کو قربان کر دیا[1]۔ دیکھنے میں وہ عالی شان عمارتیں معلوم ہوتی تھیں اور اُن کے مالک بڑے بڑے دعوے کرتے تھے لیکن اُن کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں اور انھیں آسانی سے ڈھایا جا سکا۔ وہ صرف اُس وقت تک برقرار رہ سکیں جب تک ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں سے اُن کا ٹکراؤ نہیں ہوا۔ جنگ کی صورت میں وہ جلد ختم ہو گئیں۔ ہر مہم نے اُن کی فوجی کمزوری کو ظاہر کیا اور قریب قریب ہر جنگ میں انھیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ چنانچہ اس طرح میسور، حیدر آباد اور اودھ کی بڑی بڑی ریاستیں اور مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کے علاقے انگریزوں کے قبضے میں آ گئے۔ لیکن ان فتوحات سے اُن کی وسعت کچھ سہی، نہ تو پورے ملک پر حاوی کوئی سلطنت قائم کی اور نہ لوگوں کو امن سے مستفید ہونے کا موقع دیا۔ ریاستوں کے حکمرانوں کے مغلوب ہونے کی معنی یہ نہیں تھے کہ صد سری فیوڈل اشرافیہ ختم ہو گئی جو اختیارات سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھی۔ اور بدیسی حکمرانوں کے نئے قسم کے نظم و نسق سے نفرت کرتی تھی۔ دیسی حکومتوں کی کمزوری نے برطانوی فاتحین کے کام کو ایک تھکا دینے والی طویل جدوجہد میں تبدیل کر دیا جس کہ وجہ سے کمپنی کو بہت زیادہ مالی نقصان برداشت کرنا پڑا۔ ہوتا یہ تھا کہ ہر فتح اور نئے انتظامی ڈھانچے کے قیام کے بعد برے قسم کے سیاسی ردعمل رونما ہوئے تھے۔ اُن سرداروں اور زمینداروں سے، جن کی وفاداری خود ہندوستانی بالادستوں کی طرف مذبذب تھی، اس امر کی توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ آسانی سے بدیسی حکمرانوں کی اطاعت قبول کر لیں گے خصوصیت کے ساتھ اُس صورت میں جب وہ کسانوں پر اُن کے اختیارات کی گرفت کو ڈھیلا کرنا چاہتے تھے، اُن پر ناقابل برداشت مالی بار ڈال رہے تھے اور انھیں ایک بدیسی عدالتی نظام کے تابع لانا چاہتے تھے جس نے ''نچلے طبقوں کو بالادستوں سے آزاد کرا کے سماج میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا''۔[2] چنانچہ پلاسی کے بعد کی صدی کے دوران، جس میں 1857 کی عظیم

---

[1] میلکم۔ جے 'Sketch of the Political History of India' صفحہ 33

[2] محولہ بالا، صفحہ 466

بغاوت پھوٹ پڑی تھی، ہندوستان میں برطانوی اقتدار کی توسیع نے شورشوں اور ہنگاموں کے ایک سلسلے کو جنم دیا۔ الحاق کے بعد ہر ہر علاقے میں مزاحمت اور بغاوت شروع ہوگئی۔ جس میں زمیندار اور کسان شامل ہوگئے۔

اور زمینداروں کی ملازمت سے سبکدوش ہوجانے والے سپاہیوں، مذہبی رہنماؤں اور محروم ہونے والے متعلقین نے حصہ لیا۔ لیکن یہ ہنگامے صرف اُن علاقوں تک محدود نہیں تھے جن کا الحاق کیا گیا تھا۔ اُن کے ساتھ کئے جانے والے برتاؤ کے خلاف احتجاج کے طور پر وقتاً فوقتاً کمپنی کی فوجوں کے سپاہیوں میں بھی بغاوت پھوٹ پڑتی تھی۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایک طرف تو ہندوستان میں اقتدار کے نئے نظام کی توسیع ہورہی تھی اور سماج میں ایک نیا طبقہ ابھر رہا تھا اور دوسری طرف پرانے نظام کے مختلف شعبے اپنے کو فنا ہونے سے بچانے کی جرأت مندانہ لیکن بے سود کوششیں کررہے تھے۔

II بنگال اور مشرقی ہندوستان کے ہنگامے

میر قاسم کی بغاوت

برطانوی اقتدار کی تاریخ بنگال، بہار اور اڑیسہ کے صوبوں کو حاصل کرنے سے شروع ہوتی ہے۔ اور یہ فطری امر تھا کہ جذبہ مزاحمت کا اظہار بھی سب سے پہلے اس علاقے میں ہو۔ پہلا چیلنج میر قاسم کی طرف سے آیا جسے 1760 میں میر جعفر کی معزولی کے بعد بنگال کے نواب ناظم کے عہدے پر فائز کیا گیا تھا۔ وارن ہسٹنگز کے مطابق اس عہدہ کے لئے اُس کی اہلیت کی بنیاد تھی ''بزدلی اور جنگ سے دور بھاگنے کی خواہش''۔

لیکن میر قاسم نے اپنے متعلق وارن ہسٹنگز کی رائے کو غلط ثابت کردیا۔ اُس نے غیر متوقع حد تک آزادی کے جذبے اور اپنی رعایا کی خوش حالی کے لئے گہرے احساس کا مظاہرہ کیا۔ اُس نے بغیر چنگی ادا کئے داخلی تجارت کرنے کے انگریز تاجروں کے غیر قانونی اور نامعقول مطالبے کو تسلیم کرنے سے انکار کردیا جس کو اگر تسلیم کرلیا جاتا تو ہندوستانی زمیندار اور تاجر بہت خسارے

میں رہتے اور ملک برباد ہوجاتا۔ کلکتہ کی کونسل نے اُسے جان پر کھیل جانے پر مجبور کردیا۔ اُس کے بعد جو جدوجہد ہوئی اُس میں میر قاسم نے اودھ کے نواب شجاع الدولہ اور شہنشاہ شاہ عالم کی حمایت حاصل کرلی اور دشمن کے خلاف ایک متحدہ محاذ بن گیا۔ لیکن اتحادی فوجیں کمپنی کی تربیت یافتہ فوجوں کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھیں۔ بکسر کے مقام پر انھیں ذلت آمیز شکست کا منہ دیکھنا پڑا (1764) اور میر قاسم کو 1777 میں اپنی موت تک ایک آوارہ گرد کی زندگی گزارنی پڑی۔

لیکن نواب کی طاقت ختم ہوجانے کے معنی یہ نہیں تھے کہ مخالفت بھی ختم ہوگئی۔ بنگال کے تمام ضلعوں میں، گنگا کے جنوب میں واقع بہار کے ضلعوں میں اور چھوٹا ناگپور کے ضلعوں میں اکثر بغاوتیں اور ہنگامے ہوتے رہے۔ ان ہنگاموں کی اصل وجہ تھی روایتی سیاسی نظام کی شکست و ریخت اور مالگزاری کے تعلق سے کمپنی کی سخت گیر پالیسی۔ اس کے علاوہ ملک کے قدیم رواجوں میں مداخلت اور انگریزوں کے قائم کردہ اجنبی عدالتی نظام نے بھی عام بے چینی میں بڑا اضافہ کردیا تھا۔

مغربی بنگال میں بیر بھوم اور بسنو پور کے راجوں کی سخت گیری، قحط اور مالگزاری میں اضافے نے مل کر وسیع پیمانے پر بے چینی پھیلا دی تھی۔ سرکش عناصر نے حالات سے فائدہ اٹھا کر 1789 میں ڈکیتی اور رہزنی کی وارداتیں شروع کردیں جن کی وجہ سے حکومت معطل ہوکر رہ گئی۔ بالاخر امن بحال کردیا گیا لیکن ان ہنگاموں کے اثرات بڑی مدت تک محسوس کئے جاتے رہے۔

پہاڑی قبیلوں کی بغاوتیں

پہاڑوں اور جنگلوں پر مشتمل وسیع علاقے میں، جہاں پہاڑی لوگ اور آدی واسی قبائل آباد تھے، بہت سے چھوٹے چھوٹے راجا تھے جن میں سے کچھ خود کو راجپوتوں کی اولاد بتاتے تھے اور کچھ اپنا سلسلۂ نسب قدیم زمانے سے ملاتے تھے یعنی بنگال میں ترکوں کی آمد سے پہلے کے دور سے۔ یہاں بنگال کے سخت ضابطوں پر مبنی انتظامی نظام قائم کرنا دشوار امر تھا۔ اس کی کوشش کا نتیجہ ہوا ناراضگی اور حکم عدولی۔

چور بغاوتیں

جن علاقوں میں آدی واسی قبائل آباد تھے وہاں قریب قریب مسلسل بدنظمی پھیل رہی۔ مغربی مدنا پور سے جنوبی بہار، چھوٹا ناگپور اور اڑیسہ تک جنگل محل کے چوروں، سنگھ بھوم کے ہوؤں، چھوٹا ناگپور کے کولوں اور منڈوں، من بھوم کے بھومیج اور راج محل کی پہاڑیوں کے سنتھالوں میں بار بار بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔ اڑیسہ میں کھونڈوں اور آسام میں کھاسیوں نے بڑی بڑی شورشیں شروع کیں۔

قحط، جنگلی جانوروں کی تاراجی، تشخیص میں اضافہ اور مالگزاری وصول کرنے میں سختی نے معاشی دکھوں اور سماجی بےچینی کو جنم دیا۔ برطرف شدہ سپاہیوں، تباہ حال کسانوں اور بے روزگار دست کاروں نے لٹیروں کے چلتے پھرتے گروہ بنالئے جو گاؤں میں سے گزرتے تھے، انھیں لوٹتے تھے اور لوگوں کو خوفزدہ کردیتے تھے۔ اس کے نتیجے میں تصادم ناگزیر تھے۔ چنانچہ بڑے بڑے ہنگامے ہوئے۔

چور یا بھومیج بنگال کے مدنا پور ضلع میں آباد تھے جس میں اُس وقت مان بھوم اور بڑا بھوم کے محل شامل تھے۔ مدنا پور کے ضلع پر 1760 میں انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تھا اور محلوں پر 1765 میں، لیکن زمیندار سرکش تھے۔ دھل بھوم کے راجہ جگن ناتھ نے مزاحمت کی قیادت کی (1768) اور سب کچھ جلا کر خاک کردیا۔ اُس نے اپنے جھنڈے کے نیچے چوروں کو جمع کرلیا۔ لیکد پال، دھولکا اور بڑا بھوم کے راجہ بغاوت میں شامل ہوگئے اور نواب گنج اور جھریا کے زمینداروں نے مالگزاری ادا نہیں کی۔ یہ بدنظمی تقریباً تیس سال تک جاری رہی اور اُس کے بعد از خود فرو ہوگئی۔

لیکن 1832 میں گنگا رام کی قیادت میں قبائل کی ایک نئی بغاوت شروع ہوئی۔ اُس نے بڑا بازار میں سرکاری دفاتر پر حملہ کیا اور بڑا بھوم پر قبضہ کرلیا۔ اُس کے بعد سنگھ بھوم کے ہوؤں کو اپنے گرد جمع کرکے اُس نے ایسی نازک صورت پیدا کردی کہ اُس کے خلاف فوجی کارروائی کی ضرورت پڑی۔ جنگ میں لیڈروں کی موت سے باغیوں کی ہمت نہیں ٹوٹی اور وہ اُس وقت تک مزاحمت کرتے رہے جب تک سرکاری فوجوں نے کولہن پر قبضہ نہیں کیا۔

چھوٹا ناگپور اور سنگھ بھوم کے ہوؤں کو بھی پرانا حساب چکانا تھا۔ 1773 میں پوراہاٹ،

کھراسوان اورسرائے قلعہ کے راجوں کو پناہ گزین باغیوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے پر مجبور کیا گیا تھا۔لیکن 1820 میں پوراہاٹ کے راجہ نے کھراسوان اورسرائے قلعہ کوذلیل کرنے اور آزادی پسند ہوقبائلیوں کواطاعت پر مجبور کرنے کی خاطر برطانیہ کے باج گزار کی حیثیت قبول کرلی تھی۔اُس نے انگریزوں سے مدد مانگی اور برطانوی فوجیں کولہن میں داخل ہوگئیں اور چائے باسا کی طرف پیش قدمی کرنے لگیں۔لیکن ہوؤں نے بڑا سخت مقابلہ کیا اور دو سال تک (22۔ 1820) وہ ڈھل دھوم کواور باجن گھائی کوتاخت وتاراج کرتے رہے اور چھوٹا ناگپور میں داخل ہوگئے۔اوراُس وقت تک لڑتے رہے جب تک 1827 میں انھیں اطاعت پر مجبور نہیں کردیا گیا۔لیکن اُس وقت بھی پوری طرح امن بحال نہیں کیا جاسکا۔ 1831 میں چھوٹا ناگپور سنگھ بھوم، مان بھوم اورقبائلی علاقوں میں شورشیں ہوئی جہاں چھوٹا ناگپور کے منڈوں نے بغاوت کی اور ہواُن سے جا ملے۔

کول بغاوتیں

کولوں کی بغاوت (32۔ 1831) کی وجہ یہ تھی کہ اُن کے گاؤں کول قبائل سرداروں (منڈوں) سے چھین کر بدیسی سکھ اور مسلمان کسانوں کومنتقل کئے جارہے تھے۔یہ شورشیں رانچی میں شروع ہوئی اورسنگھ بھوم، ہزاری باغ، پلاموا ور مان بھوم کے مغربی حصوں تک پھیل گئیں۔اس پرقابو پانے کے لئے بڑے پیمانے پرفوجی کارروائی کرنی پڑی۔

سنتھال کی بغاوتیں

سنتھال کی ہزاری باغ اور مان بھوم سے ترک وطن کرکے راج مل کی پہاڑیوں کے علاقے میں آباد ہوگئے تھےاور 1836 تک انھوں نے دامن کوہ میں چارسوزائد گاؤں پر قبضہ کرلیا تھا۔ وہ سیدھے سادھے لوگ تھے۔لگان کے بڑے بڑے مطالبوں نے انھیں مہاجنوں سے قرض لینے پر مجبور کردیا اوروہ آسانی سے اُن کی چالبازیوں کا شکار ہوگئے۔حکام مال بھی اُن کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرتے تھے۔ریلوے کے حکام، جوان سے کام کرواتے تھے اُن کی اجرت نہیں دیتے تھے اوراس سے بھی زیادہ بری بات یہ تھی کہ وہ اُن کی عورتوں کی بےعزتی کرتے تھے۔ان

باتوں کی وجہ سے اُن میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس نے آگ پر تیل کا کام کیا ایک جوشیلے مذہبی انسان نے جو خود کو صاب کشف ظاہر کرتا تھا اور کہتا تھا کہ حکام میں جھوٹ اور بد دیانتی کا رواج ہونے کی وجہ سے، مہاجنوں کے خون چوسنے کی وجہ سے اور پولیس کی زیادتیوں کی وجہ سے یہ ملک صاحبوں سے چھین لیا جائے گا۔ شکایتیں بڑھتی چلی گئیں اور 1855 میں سنتھالوں نے بغاوت کر دی۔ لیکن بندوقوں کا مقابلہ تیر کمان سے نہیں کیا جا سکتا تھا اور اُنھیں اطاعت تسلیم کرنی پڑی۔ یہ محسوس کیا گیا کہ اُن کے لئے ایک خصوصی انتظامی نظام کی ضرورت ہے اور سنتھال پرگنہ کا ایک علیحدہ ضلع بنا دیا گیا۔

اڑیسہ کے زمینداروں کی بغاوت

کمپنی نے 1803 میں اڑیسہ کا الحاق کیا تھا۔ لیکن زمیندار اس سے مطمئن نہیں تھے۔ کھرداکے راجہ نے، جو ایک بڑا زمیندار تھا، 1804 میں بغاوت کر دی لیکن اُسے اطاعت پر مجبور کر دیا گیا۔ اُس کے بعد زمین رکھنے والی نیم فوجی تنظیم پائک نے مال گزاری وصول کنندہ اور پولیس کے خلاف بغاوت کر دی۔ اُن کے قائد جگبندھو نے بان پور پر حملہ کیا، سرکاری خزانہ لوٹ لیا اور کھردا کی عمارتوں کو آگ لگا دی۔ سرکاری حکام بھاگ گئے اور کچھ دن کے لئے برطانوی اقتدار کے تمام نشانات مٹ گئے۔ 1817 کے اختتام تک انگریزوں نے پھر کھردا پر دوبارہ قبضہ کر لیا لیکن وہ پوری مخالفت پر ڈٹا ہوا تھا۔ لیکن بالآخر امن بحال کر دیا گیا۔ مارشل لا نافذ کیا گیا اور بغاوت کو کچل دیا گیا۔ بہت دن تک پیچھا کرنے والی فوج سے بچنے کے بعد بالآخر 1825 میں جگبندھو نے خود کو حکومت کے حوالے کر دیا۔ لیکن چونکہ وہ بہت بااثر تھا اس لئے اُس کی پینشن مقرر کر دی گئی اور کٹک میں سکونت اختیار کرنے کی اجازت دے دی گئی۔[1]

کھونڈ بغاوتیں

کھونڈ اُس پہاڑی علاقے میں آباد تھے جو کھونڈ ملی کہلاتا تھا اور انگل کے جنوب مغرب میں واقع تھا۔ یہ علاقہ بایود کی باج گزار ریاست اور گنجم کے ضلع سے گھرا ہوا تھا۔ 1815 میں

---

1. History of The Freedom Movement in Orissa (Orissa, 1957)، Vol. 1757-1856, pg. 142

حکومت مدراس نے گُم سور کے راجہ دھنن جے بھیری کو گرفتار کرلیا اور کھروا کی جاگیر ضبط کرلی اُس کے بعد 1835 میں اُس نے راجہ سے اختیارات چھین لئے جو پہاڑیوں کی طرف بھاگ گیا اور کھونڈوں سے امداد کا طلب گار رہا۔ 1836 میں ڈورابیسئی کی قیادت میں کھونڈوں نے بغاوت کردی لیکن برطانوی فوجوں نے، جنھیں کمک پہنچ چکی تھی، مزاحمت کو کچل دیا۔ 1836 میں کھونڈوں نے ایک دفعہ پھر علم بغاوت بلند کیا اور اُن کے قائد چکرابیسی نے ملک میں فتنہ وفساد برپا کردیا۔ بایود کھونڈملوں سے بغاوت گم سور کے نشیبی علاقے میں پھیل گئی۔ انگل کے راجہ اور دوسرے سرداروں کو، جو باغیوں سے ہمدردی رکھتے تھے، اس بات پر مجبور کیا گیا کہ بیُنی کو اپنی جاگیروں سے نکال دیں۔لیکن حکومت مشکوک تھی اور اُس نے انگل کے راجہ کو گدی سے اُتار دیا اور جاگیر ضبط کرلی۔اس کے بعد چکرابیسی پہاڑوں کی طرف چلا گیا اور چھ سال تک خاموش رہا۔ لیکن 1854 میں اُس نے پھر حکومت کو پریشان کرنا شروع کردیا۔اُسے کھونڈوں کی حفاظت سے محروم کرنے کے لئے بایود کے راجہ کو مخرول او چکرابیسی کو کھونڈمل چھوڑنے پر مجبور کردیا گیا۔وہ فرار ہوگیا، ادھر اُدھر گھومتا پھرا اور بالآخر لاپتہ ہوگیا۔

کئی سال کی جنگ کے بعد بغاوت فرو کردی گئی۔ 1855 میں ایک دفعہ پھر بغاوت پھوٹ پڑی۔ وہ اُس وقت ختم ہوئی جب کھونڈملوں کو مدراس کے حلقۂ اختیار سے نکال کر کٹک کے حلقۂ اختیار کو منتقل کردیا گیا۔راجہ کو گرفتار کرکے ایک قیدی کی طرح ہزاری باغ بھیج دیا گیا۔

آسام کی بغاوتیں

بنگال کی شمالی سرحد پر آہوم کی قدیم سلطنت تھی۔ 1824 میں برما کی پہلی جنگ شروع ہونے پر برموں کو نکالنے کے لئے ایک برطانوی فوجی دستہ اُن کے علاقے میں سے گزرا۔قدیم آہوم دربار کے شہزادوں اور امیروں کو بتایا گیا تھا کہ برما کی جنگ ختم ہونے کے بعد انگریز وہاں سے چلے جائیں گے اور برطانیہ کے زیر تحفظ اُن کی حکومت بحال کردی جائے گی، بشرطیکہ وہ خراج ادا کریں لیکن وعدے پورے نہیں کئے گئے۔اس کے برعکس مال گزاری وصول کرنے اور حکومت کا بندوبست سنبھالنے کے انتظامات کئے جانے لگے اور آسامی دربار کے حقوق واختیارات چھین لئے گئے۔اس کی وجہ سے آہوم امیروں میں بددلی پھیل گئی۔

1828 میں آسامیوں نے آہوم شاہی خاندان کے مگدھر کنور کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا اور آہوم امیروں کے ساتھ مل کر انگ پور کی طرف بڑھنے کی تجویز کی۔ اس مہم کے قائدوں میں آہوم حکومت کا ایک سابق وزیر دھنن جے بار گوہین اور ریاست کے دوسرے سابق حکام شامل تھے۔ یہ کوشش قبل از وقت ثابت ہوئی اور اکتوبر 1828 میں اُس پر قابو پا لیا گیا۔ مگدھر نے خود حکومت کے حوالے کر دیا اور اُس کو سات سال قید کی سزا دی گئی۔

1830 میں ایک اور بغاوت کا منصوبہ بنا گیا۔ کھمپتیوں، سنگھ پھٹوں، مواماریوں، من پوریوں، ناگوں، کھاسیوں اور گاروؤں کے سرحدی قبیلوں کے سرداروں کے نام خط بھیجے گئے اور انھیں دشمن کے خلاف مشترکہ اقدام کی دعوت دی گئی۔ روپ چند کونارکو راجہ بنا دیا گیا۔ پالی بار پھوکن، جیورام دھولیہ باروا اور امیر گھرانوں کے دوسرے نوعمر اراکین نے مل کر ایک چھوٹی سی فوج کے ساتھ رنگ پور کی طرف بڑھنا شروع کیا لیکن انگریزوں کو اُن کے منصوبے کا پہلے سے علم تھا۔ وہ سب گرفتار کر لئے گئے اور غداری کے جرم کی سزا کے مستوجب قرار پائے۔ پیالی بار پھوکن اور جیورام کو سزائے موت دی گئی اور بقیہ کو چودہ سال کے لئے ملک بدر کر دیا گیا۔ اُن کو جائدادیں ضبط کر لی گئیں۔ 1833 میں تلافی مافات کے طور پر بالائی برما سر مہاراجہ پورندر سنگھ نرندر کے سپرد کر دیا گیا اور سلطنت کا ایک حصہ آسام کے راجہ کو دے دیا گیا۔

کھاسی بغاوتیں

مغربی کھاسی پہاڑیوں میں ایک ریاست پر تیرت سنگھ حکومت کرتا تھا جو اُس زمانے میں کیما کھات سپھرا کہلاتی تھی اور آج لونگ کھلاڈ ریاست کے نام سے مشہور ہے۔ وہ ایک اچھا اور قابل اعتماد حکمران تھا۔ انگریز، جن کا کھاسی پہاڑیوں کے ایک طرف کام روپ پر قبضہ تھا اور دوسری طرف سلہٹ پر، آسام کو سلہٹ سے جوڑنے کے لیے ایک سڑک بنانا چاہتے تھے جس کے ذریعے فوجیں برما بھیجی جاسکیں۔ برطانوی نمائندے ڈیوڈ اسکاٹ نے تیرت سنگھ کو اس بات پر آمادہ کر لیا کہ اسے نونگ کھلاؤ میں رہنے اور سڑک بنانے کی اجازت دے دی جائے۔ سڑک بنانے کے بہانے بہت سے فوجی اور شاگرد پیشہ سلطنت میں داخل ہوگئے۔ کھاسی اس سے خائف ہوگئے۔

ان افواہوں نے اُن کے شکوک کو تقویت پہنچائی کہ انگریز محاصل لگانا چاہتے ہیں۔ 1829 میں تیرت سنگھ نے اپنے ساتھیوں کے ایک گروہ کے ساتھ لونگ کھاڈ میں انگریزوں پر حملہ کردیا۔ دوسرے سردار بھی اس میں شریک ہوگئے اور گوریلا جنگ شروع ہوگئی۔

کھاسیوں نے گاروؤں، کھامپتیوں اور سنگھ پھوڈوں کی مدد سے شمالی مشرقی سرحد کے لئے خطرہ پیدا کردیا۔ اپنے بہادر راجہ کی زیر قیادت قبائلی جنگ جو اتنی بے جگری سے لڑے کہ دشمنوں کو بھی اُن کی تعریف کرنی پڑی اُس کے بعد انگریزوں نے تیرت سنگھ کو ملانے کی کوشش کی لیکن اُس نے اُس وقت تک گفتگو کرنے سے انکار کردیا جب تک اُس کا علاقہ بغیر کسی شرط کے واپس نہ کردیا جائے۔ لیکن یہ نابرابری کی لڑائی زیادہ مدت تک جاری نہیں رکھی جاسکتی تھی۔ اور شیر دل سپاہی تیرت سنگھ کو مجبوراً ہتھیار ڈالنے پڑے اور اُسے ریاست بدر کرکے ڈھاکہ بھیج دیا گیا۔ اُس کو پیش کش کی گئی کہ اُس کی حیثیت بحال کی جاسکتی ہے بشرطیکہ وہ برطانوی حکومت کی اطاعت قبول کرے اور اُس کے احکامات کی تعمیل کرے۔ اُس کا جواب تھا ''ایک غلام بادشاہ کی زندگی سے ایک آزاد عام آدمی کی موت بہتر''۔ جلاوطنی کے دوران 1844 میں اُس کا انتقال ہوا۔ اُس کے بعد ملک میں عام طور سے امن وامان رہا۔

III نیپال کی ریشہ دوانیاں

ہندوستان کے مختلف حصوں میں انگریزوں کے خلاف سازشیں کی جاتی تھیں اُن کی ہمت افزائی پڑوسی ملک اور خاص طور سے نیپال کرتا تھا۔ گورکھا حکمرانوں کے زیرنگیں جب سے نیپال متحد ہوا تھا۔ انگریز اُس کے معاملات میں دلچسپی لینے لگے تھے۔ 1814 تک گورکھوں نے اپنی سلطنت کی توسیع شمالی ہندوستان میں برطانوی علاقے کی سرحد تک کرلی تھی۔ اُس کے بعد جنگ ہوئی جس میں نیپالی فوج کو شکست ہوئی اور معاہدہ سگولی پر دستخط کئے گئے (28 نومبر 1816)

یہ ذلت آمیز شکست گورکھوں کے ذہنوں میں کانٹوں کی طرح چبھ رہی تھی جس کی بنا پر انھیں برطانوی سفیر کو کاٹھ منڈو آنے کی اجازت دینی پڑی تھی۔ ایک طرف تو انھوں نے اپنے ملک میں برطانوی سفیر سے کم سے کم تعلقات رکھے دوسری طرف وہ انگریزوں سے انتقام لینے کے منصوبے

بنانے لگے۔ لیکن کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہندوستان کے دیسی حکمرانوں سے امداد لینا ضروری تھا۔ چنانچہ انھوں نے اُن حکمرانوں کے پاس ایلچی بھیجے جس کے متعلق انھیں گمان تھا کہ انگریزوں سے غیر مطمئن ہیں۔

ہندوستان میں بدیسی حکمرانوں کے خلاف اطمینانی کا جذبہ پایا جاتا تھا اور اس لئے یہ فطری امر تھا کہ وہ نیپالیوں کی دوستانہ پیشکش کا خیر مقدم کریں۔ برطانوی حکومت کو جلد ان سازشوں کا پتہ چل گیا۔ حیدرآباد میں مقیم برطانوی ریزیڈنٹ نے مدراس میں لی جانے والی شہادت کی بنیاد پر لکھا تھا میرے خیال میں اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ ایک ایسا محاذ موجود ہے جس کا مقصد اُن اسکیموں کو پورا کرنا ہے جو کسی نہ کسی طرح سے ہمارے مفادات کے لئے مضر ہوسکتی ہیں۔[1]

اوا کی ریاست کے لئے بھی کہا جاسکتا ہے کہ اُس نے مخالفت کا رویہ اختیار کرلیا ہے، گورکھا مدتوں سے ہمیں نقصان پہچانے کی کوشش کررہا ہے، جودھپور کے راجہ نے بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اُس جماعت نے جو اُس کی ریاست میں حکومت کررہی ہے حکم عدولی کا راستہ اختیار کیا ہے، ستارا کا راجہ قریب قریب ہمارا کھلا دشمن ہے، گیکواڑ انتہائی بد باطن دوست ہے اور ہندوستان کے جنوب میں ایک طاقت ور جماعت حیدرآباد میں ہمارے خلاف سازش کررہی ہے۔[2]

اس میں کوئی تعجب نہیں کہ اُن حالات میں نیپال دربار نے انگریزوں کے خلاف عام بے چینی کے احساس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہو۔ انھوں نے خطوط اور پیغامات کے ساتھ ایلچی پنجاب کے مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار کو، ہنس راج کے ذریعے اودے پور کو، جس کے سامان کی غازی پور میں تلاشی لی گئی اور سات خط اُس میں پائے گئے۔ جودھپور میں آپا صاحب بھونسلے کو، شاہ پور کے مہاراجہ کو، جے پور کو، آسام کے راجوں کو جو نیپال اور برما کے ایلچیوں سے خفیہ ملاقات کرنے اور انھیں پناہ دینے کے لئے مندر کو استعمال کرتے تھے، بندیل کھنڈ میں پنّا کو اور برما اور آوا کے بادشاہوں کو بھیجے۔ انھوں نے ایک پیغام ہیرات بھی بھیجا جہاں ایرانی ایک مہم

---

[1] Foreign Secrets Consultation, no. 11, deted 12th June 1838

[2] ایضاً

میں مصروف تھے۔ ٹامس نے 14 فروری 1829 کو بنارس سے لکھا تھا۔ ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیپال دربار پہلے کے مقابلے میں زیادہ سازشیں کر رہا ہے۔ گوسائیں، پنڈت اور پرکارے سب کے کام مقرر ہیں اور نیپال کے باشندے مسلسل میدانوں کی طرف آ رہے ہیں۔ پچھلے مہینے یاترا، تجارت یا ملازمت کے بہانے تقریباً 500 بنارس آئے اور میرا خیال ہے کہ اس سے زیادہ تعداد میں پٹنہ گئے۔ پولیس کا کہنا ہے کہ اس سے پہلے کسی برس میں اتنے زیادہ نیپالی نہیں آئے تھے۔''[1]

منصوبوں کے کوئی نتیجے نہیں نکلے۔ جو اُس وقت تک بنائے جاتے رہے جب تک طاقت رانا جنگ بہادر کے ہاتھ میں نہیں آ گئی۔ کاٹھ منڈو میں مقیم برطانوی ریزیڈنٹ اور ہندوستان میں حکام اُن سے پوری طرح باخبر تھے۔ خفیہ پولیس نے حکومت کو یقین دلا دیا تھا کہ جب تک دیسی حکمران اور عام ہندو اور مسلمان مل کر کوئی اقدام نہیں کرتے ہیں ہندوستان میں برطانوی حکومت کو کوئی بڑا خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا ہے۔

IV مسلمانوں کی تحریکات

یہ امر قدرتی ہے کہ بنگال کے مسلمانوں میں انگریزوں کی طرف سخت بے اطمینانی اور نفرت کے جذبات پائے جاتے تھے۔ اُن کے بالائی طبقہ نظامت کی معزولی، انگریزی انداز کے انتظام اور مسلمان حاکموں کی جگہ انگریز حاکموں کے تقرر سے متاثر ہوئے تھے۔ بڑی بڑی زمینداریوں کی مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جانے کی وجہ سے بھی اُن پر مضر اثر پڑا تھا۔ مسلم درمیانی طبقے کو نواب کی فوجوں کی برطرفی، دیہی پولیس کی منسوخی، جس کی وجہ سے اُن کی آمدنی کا ایک بڑا ذریعہ ختم ہو گیا اور اُن زمینات پر از سرِ نو سرکاری قبضے کی بنا پر نقصان پہنچا جو علما کو مدد معاش کے طور پر دی گئی تھیں پارچہ بافی کی صنعت کی بربادی، انگریزوں اور اُن کے بندگماشتوں کے مظالم اور نیل کی کاشت کرنے والے انگریزوں کی بنا پر مسلم نچلے طبقے بے روزگار ہو گئے تھے۔

---

[1] Thomas, Torrens, H. Officiating Secretary to Government of India. Foreign Secret Consultation, No. 16, dated 14th February 1839

بدیسیوں کے غیر اسلامی طور طریق اور عیسائی مشنریوں اور ضرورت سے زیادہ پرجوش سرکاری کام کی سرگرمیوں نے مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو بری طرح مجروح کر ڈالا تھا۔ چنانچہ سیاسی، معاشی اور مذہبی عناصر مسلمانوں میں بے چینی پھیلاتے رہے۔ اس بے چینی نے کئی صورتیں اختیار کیں۔

انگریز حکمرانوں کے لئے تکلیف کا کسی قدر غیر معمولی ذریعہ تھا مسلمان فقیروں کی تحریک۔ فقیروں کے اس گروہ کا قائد تھا مجنوں شاہ جس نے 77-1776 بنگال کے مختلف حصوں میں بدنظمی پھیلا دی۔ اُن کا صدر مقام تھا نیپال کی ترائی بالخصوص کاٹھ منڈو کے جنوب میں واقع مکوان پور میں۔ بنگال میں اُن کی سرگرمیوں کے خاص خاص مرکز تھے بوگرا ضلع کے مدارگنج اور مہاستھان جہاں ایک قلعہ تعمیر کر لیا گیا تھا۔ اُن کی ٹکڑیاں اُس علاقے میں ادھر اُدھر گھومتی پھرتی رہتی تھیں، زمینداروں اور کسانوں سے چندہ وصول کرتی تھیں اور حکومت کی حکم عدولی کرتی تھیں۔ گاؤں کے لوگ انھیں پناہ دیتے تھے اور اُن کے کھانے پینے کا انتظام کرتے تھے۔ 1787 میں مجنوں شاہ کے انتقال کے بعد اُس کا بیٹا چراغ علی شاہ اور اُس کے پیرو 90-1788 میں بنگال کے شمالی اضلاع سے گزرے۔ انھوں نے دوسرے مجاہدین آزادی مثلاً بھوانی پاٹھک اور ایک خاتون لیڈر دیوی چودھورانی کے ساتھ اشتراک عملی کیا۔ انھوں نے انگریزوں کی کوٹھیوں پر حملے کئے اور مال وزر کے علاوہ ہتھیاروں اور گولی بارود پر بھی قبضہ کر لیا۔ جلد ہی اُن کی طاقت بڑھ گئی اور تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ پٹھان، راجپور اور برطرف شدہ سپاہی اُن کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ 1793 سے 1800 تک وہ لڑتے رہے۔ کبھی کمپنی کی فوجوں سے اُن کی جھڑپیں ہوتی تھیں اور کبھی مال گزاری کی وصولی کو خطرہ لاحق ہو جاتا تھا، لیکن وہ ایک منتظم حکومت کا مقابلہ ہمیشہ تو نہیں کر سکتے تھے۔ جب انگریزوں نے نیپال کے مہاراجہ کے ساتھ معاہدہ کیا اور بنگال کے نظم ونسق کو سدھارنے کے لئے ضابطوں کا ایک سلسلہ نافذ کیا گیا تو رفتہ رفتہ اُن پر قابو پا لیا گیا۔ پھر بھی کئی سال تک اُن کا اثر برقرار رہا اور 1800 میں لارڈ منٹو کو اعتراف کرنا پڑا ''واقعہ یہ ہے کہ اس گروہ کے سرداروں اور کپتان کی عزت کی جاتی تھی اور انھیں حاکم تک کہا جاتا تھا۔ حکومت کے پاس

اتنے اختیارات تھے نہ اثر کہ وہ اپنے تحفظ کی خاطر لوگوں سے تھوڑی سی بھی مدد حاصل کر سکے"۔[1]

پاگل پنتھی فرقے کے قائدین نے بھی اسی انداز سے حکومت کی مخالفت کی۔ اُس کے باپ کرم شاہ نے تقریباً 1775 میں سوسنگ پرگنہ میں سکونت اختیار کر لی تھی اور سچائی، مساوات اور بھائی چارے کی تبلیغ کیا کرتا تھا۔ اُس کے پیروؤں میں ہندو اور مسلمان، گارو اور ہاجونگ سبھی شامل تھے۔

1813 میں کرم شاہ کے انتقال کے بعد اُس کے بیٹے ٹیپو نے ایک مسلح گروہ اکٹھا کر لیا اور کسانوں کو زمینداروں کے خلاف اکسانے لگا۔ 1825 میں اُس نے شیر پور کے زمینداروں اور گارجاریا کے قلعے پر حملہ کیا جو اُس کا صدر مقام تھا۔ اُس نے دربار آراستہ کیا، اور انتظام چلانے کے لئے ایک مجسٹریٹ اور ایک کلکٹر کا تقرر کیا۔ کچھ برسوں تک اُس نے آزاد حکومت چلائی لیکن 1831 میدانوں سے اور 1833 میں پہاڑی علاقے سے ٹیپو کے پیروؤں کو نکال دیا گیا۔

1852 میں جند میں اُس کا انتقال ہوا۔ انگریزوں کے خلاف ایک اور تحریک، جس میں مذہبی جذبہ غالب عنصر تھا، وہ تھی جس کی قیادت فرائضی کر رہے تھے۔ اس فرقے کی بنیاد مشرقی بنگال میں واقع فرید کے حاجی شریعت اللہ نے ڈالی تھی (1781 لغایت 1840) جو مذہبی طریقوں میں ایک بڑی اصلاح کے پروگرام کی تبلیغ کرتا تھا۔ وہ اسلام کو بعد کے الحاقات و اضافات سے پاک کرنا چاہتا تھا، اور دور رس سماجی اور سیاسی تبدیلیوں کی وکالت کرتا تھا۔ وہ زمینداروں کے ہاتھوں کسانوں کے استحصال کا مخالف تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ انگریزوں کو نکال کر بنگال میں مسلم حکومت بحال کر دی جائے۔ اُس کے بیٹے محمد محسن نے، جو عام طور سے دادو میاں کے نام سے پکارا جاتا تھا محاصل ادا کرنے کے خلاف ایک جدوجہد کی قیادت کی اس نے تجربہ کار اور معمر کسانوں کے تحت گاؤں میں عدالتیں قائم کیں تاکہ وہ جھگڑے نبٹا سکیں اور زمینداروں کی بالجبر وصولی میں کسانوں کی مزاحمت میں معاون ثابت ہوں۔ 1838 سے 1857 تک اُس کی سرگرمیاں وقفے وقفے سے جاری رہیں۔

فرائضی تحریک کو سید احمد شہید کے پیروؤں کے منظر عام پر آنے اور اُن کے ساتھ مل کر کام

---

[1] گھوش۔ جے۔ ایم، Saryari and Fakir Raiden in Bengal, (Calcutta, 1930, pg10)

کرنے سے تقویت حاصل ہوئی۔ سید احمد شہید دہلی کے دبستان ولی اللہ کے شاگرد اور بنگال میں مجاہدین کے قائد تھے۔ وہ طریقۂ محمدیہ قائم کرنا چاہتے تھے اسلامی عقائد کا وہ پاک وصاف نظام جس پر اسلامی تاریخ کے ابتدائی برسوں میں عمل کیا جاتا تھا۔ اُن کے شاگرد میر متھین علی عرف تینو نظام، ولایت علی اور عنایت علی بنگال میں کام کر رہے تھے۔ تینو نظام نے ظالم زمینداروں کے خلاف جدوجہد کی قیادت کی جو اتفاق سے زیادہ تر ہندو تھے۔ 1931 میں ایک فوجی مہم کے ذریعے تینوں کو کچل دیا گیا۔ لیکن فرائضی اُس وقت تک زمینداروں کے خلاف لڑتے رہے جب تک 60-1859 یں نیل کی شورش نہ پھوٹ پڑی۔ بنگال کے لفٹنٹ گورنر نے 1857 میں اطلاع دی تھی ''اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت بنگال کے تحت ایک ضلع ایسا نہیں جو حقیقی خطرے سے محفوظ ہو یا جہاں بڑا خطرہ لاحق نہ ہو۔''

V سنیاسیوں کی بغاوت

لیکن ابتدائی بغاوتوں میں سب سے عجیب وغریب بغاوت تھی سنیاسیوں کی۔ وہ ہندوستان کے عظیم مذہبی فلسفی سری شنکراچاریہ (آٹھویں صدی) کے پیرو تھے۔ جنھوں نے مطلق وحدت الوجود کے عقیدے کی تشکیل کی تھی۔ شنکراچاریہ کے شاگرد دس حلقوں میں بٹے ہوئے تھے اور باغی سنیاسیوں کا تعلق تھا گیریوں سے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ انھوں نے فوجی پیشہ کب اختیار کیا لیکن اکبر کے دور حکومت میں ایک جنگجو حلقے کے طور پر پہلی مرتبہ اُن کا ذکر کیا گیا۔ فارقوہر کے مطابق مدھوسودن سرسوتی نے سنیاسیوں کے حلقے میں مشنریوں کو شامل کرنا شروع کیا۔ مسلح ناگا اور گیری سنیاسی اٹھارھویں صدی کی فوجوں میں مل کر لڑا کرتے تھے۔ مثال کے طور مسلح گسائیوں کا ایک دستہ اودھ کے نواب کی فوج میں شامل تھا جب وہ مرہٹوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی کی مدد کرنے کے لئے پانی پت گیا تھا۔ بکسر کی جنگ میں گوسائیں ہمت گیری کی قیادت میں پانچ ہزار سنیاسیوں نے انگریزوں کو بنگال سے نکالنے کے لئے میر قاسم کی طرف سے جنگ میں شرکت کی تھی۔ مرہٹہ سردار ہلکہ اور سندھیا اور جے پور کے راجوں کی فوجوں میں سنیاسی ملازم تھے۔

بنگال کے معاملات میں سنیاسیوں کی مداخلت وہاں انگریزی حکومت قائم ہونے کے بعد شروع ہوئی کمپنی کی حکومت کے ابتدائی برس لوگوں کے لئے سخت تکلیفوں اور دکھوں کا زمانہ تھا۔ مال گزاری کے تعلق سے انگریزوں کی پالیسیوں اور اُس کے وصولی میں کی جانے والی سختی نے زمینداروں، کسانوں اور دست کاروں کو تباہ حال کردیا تھا۔ اُس کے بعد 1770 کے قحط نے بنگال کو انتشار اور دکھوں کا شکار بنادیا۔ اس قسم کے حالات میں بدامنی اور قانون سے روگردانی ناگزیر تھی۔ بنگال کے فورٹ ولیم کی کونسل اور اُس کے صدر نے 1773 میں کورٹ آف ڈائریکٹرز کو مطلع کیا کہ سنیاسیوں اور فقیروں کے گروہ، جن کی صفوں کو بھوکے کسانوں کے انبوہ کی شرکت نے زیادہ بڑھادیا ''زیریں بنگال کے زیر کاشت کھیتوں میں آتے ہیں اور انھیں جلاتے ہیں، لوٹتے ہیں اور برباد کرتے ہیں۔ اُن کی تعداد پچاس ہزار ہوتی ہے۔''[1]

سنیاسیوں کی بغاوت کی اصل وجوہ تھیں بنگال میں اُن کی سرگرمیوں کی روک تھام اور مقدس مقامات کی یاترا پر عائد کی جانے والی بندشیں۔ 1763 ہی میں سنیاسیوں نے کوٹھیوں پر حملے شروع کردیے تھے۔ اُس کے بعد بڑے بڑے گروہ بنا کر انھوں نے برطانوی فوجوں سے ٹکر لینی شروع کی۔ وہ کسی ضلع پر اچانک حملہ کرتے تھے، وہاں کے لوگوں سے چندہ وصول کرتے تھے اور اُس کے بعد تیزی سے منتشر ہوجاتے تھے۔ اُن کا پیچھا کرنے کے لئے سپاہیوں کے دستے بھیجے جاتے تھے لیکن انھیں آسانی سے کھلے میدان میں لڑنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا تھا۔ مزید برآں اکثر اوقات کمپنی کے سپاہی پوری طرح وفادار ثابت نہیں ہوتے تھے اور سرکاری فوج کو تباہی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

VI مدراس پریسیڈنسی میں شورشیں

جو بنگال میں ہوا اس کی آواز بازگشت ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی سنائی دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جہاں جہاں انگریزوں نے اپنی حکومت قائم کی وہاں ایک سے عناصر عمل میں

[1] صدر کونسل کا خط (خفیہ محکمہ) کورٹ آف ڈائریکٹرز کے نام، مورخہ 15 جنوری 1773، پیرا، 13 ہنٹر، ڈبلیو، ڈبلیو۔ Annals of Rural Bangal (لندن 1868) صفحات 70-71

آئے۔ یہ ضرور ہے کہ مختلف جگہوں پر احتجاج اور بے اطمینانی کا اظہار مقامی حالات کے زیر اثر مختلف طریقوں سے کیا گیا۔

مدراس پریسیڈنسی میں انگریزوں نے مال گزاری وصول کرنے کے رعیت داری نظام کو رواج دیا جس کی بنا پر کسان کا راست رابطہ حکومت سے قائم ہو گیا اور بیچ کے لوگوں کو اس کا موقع نہ تھا کہ وہ منافع کا حصہ خود حاصل کرسکیں۔ آر۔سی۔دت کے مطابق ''کسانوں پر کمپنی کی گرفت ویسی تھی جیسی کہ غلام کے مالک کی غلاموں پر ہوتی ہے اور جو کچھ انھیں زندہ رکھنے کے لئے ضروری نہیں ہوتا تھا وہ کمپنی سے لیتی تھی۔''[1] جہاں تک رعیت کا تعلق تھا اُسے زمین پر حق دوام حاصل نہیں تھا اور اُس کے لگان میں ہر سال فصل کے مطابق تبدیلی کی جاسکتی تھی۔ جن غیر یقینی حالات میں اُسے کام کرنا پڑتا تھا انھوں نے اُس کو وہاں پہنچادیا تھا جہاں کاشت میں کوئی ترقی ممکن نہیں تھی۔ لیکن عام بندوبست میں کچھ پولیگروں کی زمینداریاں بچ گئی تھیں اور حکومت کو زیادہ تر اُن کی طرف سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔

وزیانگرم کے راجہ کی بغاوت

پہلی بغاوت تھی وزیانگرم کے راجہ کی جس کی چیکاکول میں بڑی زمینداری تھی۔ فرانسیسیوں اور انگریزوں کے درمیان ہونے والی جنگ کے پرآشوب دور میں راجہ نے وزاگاپٹم، کاسم کوٹا، چیکاکول اور پارلکی میدی کے اطراف کے علاقے پر قبضہ کرلیا۔ جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1765 میں شمالی سرکاریں بطور عطیہ کے حاصل کرلیں تو اُس نے راجہ سے تین لاکھ روپے کی پیش کش طلب کی۔ کچھ دن بعد اس مطالبے کو تگنا کردیا گیا اور راجہ سے یہ کہا گیا کہ وہ بڑی سی فوج کو برطرف کردے۔ راجہ نے ان مطالبات کو پورا نہیں کیا اور اُس کی زمینداری ضبط کرلی گئی۔ اپنی فوج کی مدد سے راجہ نے علم بغاوت بلند کیا لیکن 1794 میں وہ لڑائی میں مارا

---

[1] آر۔سی۔دت، Economic History of India under Early British Rule (London, 1956, pg 362)

گیا۔ اُس کے بعد کمپنی نے سمجھداری سے کام لیتے ہوئے مصالحت آمیز اقدام کیا۔ اُس نے پیشکش کی رقم میں تخفیف کی اور مرحوم راجہ کے بیٹے کی زمینداری بحال کردی جس کا رقبہ کم کردیا گیا۔

تنی ویلی، پنچلم کوریچی، سیوگیری اور رام ناد کے پولیگروں نے بھی بے چینی کی علامتوں اور سرتابی کا مظاہرہ کرنا شروع کیا۔ 1801 میں جنوبی پلایموں دندیگلی اور ملابار میں شورشیں پھوٹ پڑی۔ باغیوں نے پلم کوٹا اور ٹوئی کورن کے قلعوں پر قبضہ کرلیا۔ لیکن بغاوت کو فرو کردیا، پولیگروں کے قلعے مسمار کردیے گئے اور باغیوں سے اسلحہ چھین لئے گئے۔ اُس کے بعد واگزارشدہ اضلاع (1801۔لغایت 1805) شمالی ارکاٹ (1803 لغایت 1807) اور پولیگروں نے ناکام بغاوتیں کیں۔

1830 سے 1834 تک وزاگا پٹم کے بیر بھدر راجہ اور جگن ناتھ راجہ نے بغاوت کا علم بلند رکھا۔ گنجم ضلع کا گمسور کے زمیندار اور کرنول کے پولیگر نرسمہ ریڈی نے 37-1835 اور 1846-47 میں بغاوت کی۔

1792 میں ولی ناد کے گرالا وزراجہ نے (جو ایک نوجوان حسینہ کے روپ میں خود کو روح کی تجسیم سمجھتا تھا) بدنظمی پھیلادی جس کی لپیٹ میں پورا صوبہ آ گیا اور جو 1805 میں اُس کی موت کے بعد ختم ہوسکی۔

دیوان دیلوتاپی کی بغاوت

1805 میں معاونت کا ایک نیا عہد نامہ کرنے پر انکور کو مجبور کیا گیا۔ دربار غیر مطمئن تھا اور برطانوی حکومت سے اُس کے تعلقات کشیدہ تھے۔ زرمعاونت ادا نہیں کیا گیا اور بقایا رہا۔ دیوان دیلوتاپی اور ریزیڈنٹ میں جھگڑا ہوگیا جس کی وجہ سے ریاست کا نائر بٹالین نے بغاوت کردی۔ لیکن برطانوی فوج نے بغاوت فرو کردی اور راجہ کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کردیا گیا۔ دیوان نے خودکشی کرلی۔

دھوند جی واگھ کی بغاوت

میسور میں سرنگا پٹم پر 1799 میں قبضہ ہوجانے کے بعد ٹیپو سلطان کے سیاسی قیدیوں کو رہا کر دیا گیا تھا۔جن میں دھوند جی واگھ بھی شامل تھا۔اُس نے غیر مطمئن عناصر کو اپنے گرد جمع کرلیا۔ کچھ قلعہ دار اُس سے مل گئے اور پیدنور کے آس پاس کے ضلعوں سے رقمیں وصول کی جانے لگیں۔ جب برطانوی فوج نے اُس کے ساتھیوں کو شیمو گا اور شکار پور کے مقاموں میں شکست دے دی تو دھوند جی بھاگ کر مرہٹوں کے علاقوں میں چلا گیا جہاں ارتھر ویلیتر نے اُس کا پیچھا کیا۔10 ستمبر 1800 کو دھوند جی ایک بڑی فوج کے خلاف بہادری سے لڑتے ہوئے مارا گیا۔

1831 میں میسور کی رعیت کو جو راجہ کی لا پرواہی اور زمینداروں کے مظالم کی بنیاد پر غیر مطمئن تھے، مجبوراً بغاوت کرنی پڑی۔امن بحال کرنے کے لئے برطانوی فوج کو استعمال کرنا پڑا۔

کورگ میں راجہ منیراجہ کمپنی کی حکومت کے خلاف ہوگیا۔جنرل فریزر نے 15 مارچ 1834 کو ایک فرمان کے ذریعے اُسے گدی سے اتار دیا۔

VII دکن کی بغاوتیں

راجہ مہی پت رام کی بغاوت

دکن میں نظام علی خاں سے 1800 میں کئے جانے والے معاہدہ کی رو سے حیدر آباد کے نظام کی آزاد حیثیت کو انگریزوں کے ایک ماتحت حلیف کی حیثیت میں بدل دیا گیا تھا۔لیکن ریاست کے بااثر عناصر اس تبدیلی کو پسند نہیں کرتے تھے۔سکندر جاہ، جو 1803 میں نظام علی خاں کے بعد گدی پر بیٹھا تھا، اس معاہدہ کے خلاف تھا اور مرہٹوں کے ساتھ انگریزوں کی جنگ میں اُس نے مدد نہیں کی۔راجہ مہی پت رام نے، جو برابر کا گورنر اور نظام کا معتمد اعلیٰ تھا، انگریزوں کی مخالف جماعت کی حمایت کی۔ دولت آباد، دھرور اور بدنا پور کے قلعہ داروں نے برطانوی

فوجوں کی طرف معاندانہ رویہ اختیار کیا۔ نظام اور اُس کے حکام پر بدگمانی اور نفرت کا الزام لگایا گیا اور یہ بھی الزام لگا گیا کہ وہ ہلکر اور سندھیا سے خفیہ مراسلت کر رہے ہیں۔ ریاست میں مقیم ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج میں مخالفت کا جذبہ پایا جاتا تھا اور کچھ امرا مثلاً راجہ راؤ امبھا تمبالکر اور نور لا مرا پر شبہ کیا گیا کہ وہ اُن سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ دونوں کو ریاست بدر کر دیا گیا۔ برطانوی ریزیڈنٹ سیدن ہیم نے انگریزوں کے حامی وزیر اعظم میر عالم کو اس پر آمادہ کر لیا کہ وہ مہی پت رام کو برطرف کر دے اور نظام پر اُس کے اثر کو زائل کر دے۔ اس کی بنا پر راجہ نے 1808 میں بغاوت کر دی اور سیاسی منظر سے وہ ہٹ گیا۔ اس کے بعد بھی سکندر جاہ کی دشمنی میں کمی نہیں ہوئی۔ لیکن 1808 سے ریاست کے معاملات میں چندو لال کا عمل دخل ہو گیا، جو انگریزوں کے جاں نثاروں میں سے تھا۔ اور نظام نے حالات عامہ میں دلچسپی لینی چھوڑ دی۔ 1820 میں اُس کا انتقال ہو گیا اور اُس کی جگہ اُس کا بیٹا نصر الدولہ تخت پر بیٹھا۔ اُس کا بھائی مبارز الدولہ، جو ایک پرجوش اور آزاد نوجوان تھا، انگریز مخالف سرگرمیوں کا مرکز بن گیا۔

مبارز الدولہ کی بغاوت

اس زمانے میں سید احمد بریلوی کی مسلمانوں کی اصلاح اور جہاد کی تحریک پورے ہندوستان میں پھیل رہی تھی۔ دکن میں مبارز الدولہ اس کا پرجوش حامی بن گیا۔ حیدر آباد میں مقیم برطانوی ریزیڈنٹ نے، جو ان سرگرمیوں پر کڑی نظر رکھتا تھا، گولکنڈا کے قلعے میں مبارز الدولہ کی نظر بندی کے احکام نظام سے حاصل کر لیے۔ اُس کے مقدمے کی سماعت کرنے کے لئے ایک کمیشن مقرر کیا گیا۔ اُس کمیشن نے مبارز الدولہ اور اُس کے ساتھیوں کو ہندوستان کے دیسی حکمرانوں کی مدد سے برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش، اُدگیر کے قلعہ کو تقویت پہنچانے، اسلحہ اور گولہ بارود اکٹھا کرنے اور مبارز الدولہ کی قیادت میں جہاد کا علم بلند کرنے کی اسکیمیں بنانے کا ملزم ٹھہرایا جس کو رئیس المومنین کا لقب دیا گیا تھا۔ اس تفتیش کے نتیجے کے طور پر 1840 میں مبارز الدولہ کو ایک سرکاری قیدی کی حیثیت سے گولکنڈرا کے قلعے میں نظر بند کرنے کا حکم صادر کیا گیا اور اُس کے ساتھی حراست میں لے گئے۔ وہ باغی شہزادہ جو پوری زندگی برطانوی اقتدار کو خاطر میں نہ لایا 1854 میں ایک سرکاری قیدی کی حیثیت سے مرا۔

اعلیٰ حیثیت رکھنے والے افراد کی جانب سے کئے جانے والے مخالفانہ مظاہروں کے علاوہ کئی اور بھی شورشیں پھوٹ پڑیں جن میں چھوٹے چھوٹے سرداروں اور زمینداروں نے حصہ لیا۔ اُن میں شامل تھے۔ دھرم جی پرتاب راؤ، جس نے 1818 میں بہار میں بنجاروں کی قیادت کی، ہتکر ناٹک یعنی نو ساجی اور ہنساجی، جن کی بغاوت کئی سال تک جاری رہی، رانچور ضلع کا زمیندار ویرپّا، جس نے کوپ بال کے قلعہ پر قبضہ کرلیا اور نظام کی حکم عدولی کی اور اُدگیر کا دیش مکھ (ضلع بیدر) جس نے 1820 میں مالگزاری کے نظام کا مطالبہ ادا کرنے سے انکار کردیا۔

رموسی بغاوتیں

مغربی ہندوستان یعنی مرہٹوں کے علاقے میں 1818 میں پیشوا کی قطعی شکست کے بعد نظم ونسق بحال کرنا آسان نہیں تھا۔ نئی حکومت نے کسانوں پر برا بوجھ ڈال دیا تھا اور پہاڑی قبائل، جن سے ہندوستانیوں کی حکومت میں تعرض نہیں کیا جاتا تھا، انگریزوں کی حکومت کی دراز دستی کے دباؤ کو محسوس کرنے لگے اور مزاحمت پر آمادہ ہوگئے۔ اُن میں اُماجی ناٹک اور اُس کا حامی باپو تربنک جی ساونت شامل تھے جنھوں نے تورنا کے قلعے کے آس پاس کی پہاڑیوں میں اپنی سرگرمیاں 28-1827 کے دوران جاری رکھیں۔ لیکن انھیں گرفتار کرلیا گیا اور اُن پر مقدمہ چلا۔ اُس کے بعد دادا جی دولت راؤ گھور پاڑے نے کولہاپور کے مضافات میں ایک بغاوت کی تنظیم کرنے کی کوشش کی لیکن اس کی کوشش بھی ناکام بنادی گئی (1829)۔ اس سلسلہ میں قابل غور واقعہ تھا سمیاجی نرسیّا (نرسنگھ راؤ زماتر میہ پنکر) کی بغاوت جو ستارا کے معزول راجہ پرتاب سنگھ کو بحال کرنا چاہتا تھا۔ اس نے دو عرب بھاڑے کے سالاروں سلیم بن ابود (کوہران) طالب بن علی کو عرب اور روہیلا سپاہی اکٹھا کرنے پر مامور کیا۔ اُس کے بعد انھوں نے دھودرگ (رانچور) سے باوامی کی طرف پیش قدمی کی، قلعہ پر قبضہ کرلیا اور ستارا کے راجہ کا جھنڈا لگادیا۔ لیکن ایک لمبی جدوجہد کے بعد 1841 میں یہ بغاوت کچل دی گئی۔

گدکاری بغاوت

1844 میں کولہاپور میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ 1837 میں شاہ جی کی موت کے بعد

شیواجی چہارم کو گدی پر بٹھادیا گیا جو نابالغ تھا اور ریاست کے معاملات کے ذمہ دار وزیر کی حیثیت سے داجی کرشنا پنڈت کا تقرر ہوا۔ اُس نے مال گزاری کی وصولی کے نظام میں جن تبدیلیوں کو رواج دیا اُن کی وجہ سے وہ غیر مقبول ہوگیا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ قلعوں پر قبضہ کرے تاکہ انھیں مسمار کرکے وہ گدکاریوں یا قلعہ سے تعلق رکھنے والے موروثی ملازمین کو برطرف کرسکے، جن کے ساتھ دوسرے طبقوں کے لوگوں کو ہمدردی تھی، اور اُن کی زمینات معاملت داروں کی نگرانی میں دے دی جائیں۔ اس نے بغاوت کے لئے اسباب مہیا کردیے۔ گدکاریوں نے سمن گڑھ اور بھودار گڑھ کے قلعوں پر قبضہ کرلیا۔ باغیوں پر قابو پانے اور امن بحال کرنے میں انگریزوں کا بہت خون بہا اور روپیہ خرچ ہوا۔

اسی سال ساونت دادی میں، جہاں بے چینی اپنے نقطہ عروج تک پہنچ چکی تھی، ریاست کے ایک سردار پھوند ساونت کی قیادت میں ہونے والی بغاوت کی وجہ سے بدنظمی پھیل گئی۔ اُس نے حکمراں کے نابالغ بیٹے انّا صاحب کو اور کئی دوسرے سرداروں اور دیسائیوں کو اپنے ساتھ ملاکر کچھ قلعوں پر قبضہ کرلیا۔ جب برطانوی فوجوں نے اُسے قلعوں سے نکالا تو وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ گوا کی طرف بھاگ گیا اور ریاست میں بدنظمی جاری رہی۔ اُس کے بعد پرتگالی حکام کو اس امر پر آمادہ کیا گیا کہ وہ سرکرداروں دیسائیوں کو انگریزوں کے حوالے کردیں۔ لیکن انھوں نے پھوند ساونت اور انّا صاحب کو اُن کے حوالے کرنے سے انکار کردیا۔ جن لوگوں کو انگریزوں کے حوالے کیا گیا تھا اُن مین غداری کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا اور مختلف مدتوں کی سزا دی گئی۔

VIII گجرات اور سوراشٹر میں بغاوتیں

گجرات اور سوراشٹر میں بے اطمینانی نے کچھ ایسی ہی شکل اختیار کی۔ جب 1835 میں کیپٹن اوٹ رم وہاں گیا تو اُس نے سرداروں کو بغاوت کرتے ہوئے پایا۔ اُس نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا ''باغی سرداروں کی اصل قوت اور ہماری مخالفت کرنے میں اُن کے اور جھگڑوں کو ہوا دینے والوں کے اعتماد کا باعث ہیں بدیسی بھاڑے کے سپاہی جن کا ذریعہ معاش ہیں وہ دنگے اور لڑائیاں جن کے لئے وہ خود اشتعال انگیزی کرتے ہیں۔ زیادہ تر وہ ہیں مکرانی، سندھی، سیدی،

گوساتی اور کچھ عرب۔'' اُس نے مزید لکھا ''بلا خوف پاداش گجرات کے لوگ جتنی آسانی کے ساتھ برطانوی حکام کی توہین کرتے ہیں اور انھیں لوٹتے ہیں وہ، اگر اُس کی روک تھام نہیں کی گئی، ہندوستان کے اس حصے میں یورپی حکومت کو اُن لاکھوں غیر مطمئن مقامی باشندوں کے مقابلے میں مٹھی بھر انگریزوں کی محض جسمانی قوت کی نیچی سطح تک پہنچا دے گی جو ہماری قوت سے خائف نہیں ہیں۔[1]

وگھیرا بغاوت

مندرجہ بالا رپورٹ میں کچھ کی اُن شورشوں کا ذکر کیا گیا ہے جو 1815 سے 1832 تک جاری رہیں۔ اُس کے علاوہ اکھامنڈل کے وگھیروں کی بغاوت تھی جنھوں نے ابتدا سے انگریزی حکومت کے قیام کی مزاحمت کی تھی۔ اُن کی بے اطمینانی کی بڑی وجہ تھی بروڈا کے گیکواڑ کا عائد کردہ ملک گیری کا محصول اور اُس پر عمل درآمد کرنے میں برطانوی حکومت کی امداد۔ سورت میں اختلاف کی طویل روایت پائی جاتی تھی۔ وہاں کے شہریوں نے غیر پسندیدہ اقدامات مثلاً نمک کا محصول اور معیاری اوزان اور پیمائش کے طریقوں کے رواج کی پہلے بھی مزاحمت کی تھی۔ انھوں نے دوکانیں بند کردیں، سرکاری ملازمین کا بائیکاٹ کیا اور عرضداشتیں تیار کیں جن پر ہزاروں نے دستخط کیے یہاں تک کہ حکومت کو ان غیر پسندیدہ اقدامات کو منسوخ کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔

بھیل بغاوتیں

بھیل خاندیش اور نگ آباد ضلع کے آس پاس کے پہاڑی علاقے میں رہنے والا ایک آدی واسی قبیلہ تھا، شمال اور دکن کے درمیان واقع پہاڑی دروں پر قابو رکھتا تھا۔ وہ راجپوت حکمرانوں کی جاں نثاری کے دعویدار تھے اور اُن سے بڑی وفاداری کا مظاہرہ کرتے تھے۔

---

[1] کیپٹن جیمس روٹ رم کی رپورٹ گجرات کی بدنظمی کے متعلق (P.D. Vol. No. 37/736 of 1836) 1835 ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی تاریخ میں استعمال ہونے والے ماخذ دیکھئے حکومت بمبئی، 1957 جلد 1، صفحات 55-54۔

اٹھارھویں صدی کے آخری برس اُن کے لئے دکھ کا زمانہ تھا اس لئے کہ اُن کا علاقہ مرہٹوں کی جنگوں، پنڈاریوں کی لوٹ مار، بدنظمی اور قحط کی بنا پر تباہ ہوگیا تھا۔ مزید برآں 1818 میں انگریزوں نے اُن علاقے پر قبضہ کرلیا۔ اس بغاوت نے جس فتنہ وفساد کو جنم دیا وہ تقریباً تیس سال تک جاری رہا اور بالآخر فوجی کارروائی کے ساتھ مصلحت آمیز مصالحتی اقدامات کے نتیجے میں ختم ہوگیا۔

کولی بغاوتیں

بھیلوں کے پڑوسی کولی، جو اُس پہاڑی علاقے میں آباد تھے جس کو سہیادرس کہا جاتا ہے، فطرتاً سرکش لوگ تھے۔ قلعوں میں تعینات محافظ دستوں میں انھیں عام طور سے ملازم رکھا جاتا تھا۔ لیکن جب انگریزوں نے قلعہ مسمار کردئے تو اُن کے روزگار کے مواقع ختم ہوگئے، اس کے نتیجے میں اُن میں بڑی بے چینی پھیل گئی اور 1828 اور 1839 اور 48-1844 کی بغاوتوں کی باعث بنی۔ لیکن 1850 تک حکومت انھیں اطاعت پر مجبور کرنے میں کامیاب ہوگئی۔

IX راجپوتانہ میں بے چینی

راجپوتانہ کے بیس سے زیادہ آزاد حکمراں باہمی رقابت اور پھوٹ کے شکار تھے۔ اُن کی باہمی رقابت اور ایک دوسرے کے خلاف کئے جانے والے دعوں نے انھیں ذلیل کیا تھا اور آزادی سے محروم کردیا تھا۔ اٹھارھویں صدی میں راجپوتانہ سے مرہٹے خراج لیا کرتے تھے جس کو وصول کرنے کی خاطر اُن کی فوجی مہموں نے ملک کو دکھوں میں مبتلا کردیا تھا۔ حالانکہ برطانوی مداخلت ان حکمرانوں کو مرہٹوں کے مظالم سے نجات دلادی پھر بھی حقیقت میں صرف مالک تبدیل ہوگئے تھے۔ اُس وقت کچھ صورتوں میں انگریزی حکومت کی اطاعت ممکن ہے مرہٹوں کی لوٹ مار سے بہتر ہو پھر بھی اس سے راجپوت حکمرانوں کی مجروح خودداری کا مداوا نہیں ہوسکتا تھا جو نتیجہ تھی خودمختاری سے محروم ہونے کا۔ اس کے علاوہ نظم ونسق کے ایک نئے نظام کے رواج، اُن کے کچھ قدیم اور مقبول رواجوں کی تنسیخ، کچھ ایسے حکمرانوں کی چیرہ دستی جنھیں انگریزوں کی حمایت کا یقین دلایا گیا تھا، برطانوی چھاؤنیوں کا قیام جو ہر وقت غلامی کی یاد دلاتی رہتی تھیں اور خوف کہ اُن

کی روایت و مذاہب کو ختم کر دیا جائے گا۔ اُن سب باتوں نے بڑے پیمانے پر بے چینی پھیلا دی۔

انگریزوں کے خلاف تحریک کا مرکز تھا جودھپور کا مہاراجہ مان سنگھ۔ لیکن وہ اپنی بے بسی سے اتنا بددل ہوا کہ اُس نے گدی چھوڑ دینے کو ترجیح دی، کوٹا کے جوتھارام اور مہاراؤ کرشن سنگھ کی کوششیں اور میواڑ اور مارعاڑ کے جاگیرداروں کی سازشیں ظاہر کرتی ہیں کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں راجپوتانہ کس حد تک مشتعل تھا۔ بغاوت کے جذبے کی عوامی تصدیق کا اظہار کوی راج بانکی داس بھاٹ کی نظموں اور مہیا کوی سوریا مل مشرا کی تحریروں سے ہوتا ہے۔

X اتر پردیش میں شورشیں

1765 اور 1805 کی درمیانی مدت میں شمالی ہند کا وہ علاقہ انگریزوں کے زیرنگیں اور زیرحفاظت آگیا جو بہار اور پنجاب کے درمیان واقع ہے۔ ابتدائی زمانے میں انگریزوں کی نگرانی میں اودھ کا نواب دوآبے کے بڑے حصے پر حکومت کرتا تھا اور بقیہ حصے پر مرہٹوں کو اقتدار حاصل تھا۔ مرہٹوں کے ساتھ تیسری جنگ کے بعد انھیں دوآبے اور بندیل کھنڈ سے بے دخل کر دیا گیا اور نواب کے زیرنگیں علاقے میں تخفیف کر دی گئی۔ 1856 تک پورے علاقے پر انگریزوں کی راست حکومت قائم ہو چکی تھی۔

انگریزوں کی مداخلت اور نگرانی اودھ کے نوابوں کو ناگوار تھی اور دونوں فریقوں میں مسلسل لڑائی جھگڑے کا باعث بنی رہتی تھی۔ اودھ کی بہت سی خرابیوں کی اصل وجہ تھی حکومت کا غیرفطری نظام جس میں انتظام کی ذمہ داری نواب پر تھی لیکن اصل طاقت انگریزوں کے ہاتھوں میں تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا 1856 میں اودھ کا الحاق اور درمیانی مدت میں ضرورت سے زیادہ تکلیف دہ حادثات کا سلسلہ۔

گورکھپور کی بغاوت

ان حادثات میں سے پہلا حادثہ کمپنی کے ایک حاکم کرنل ہینے کی اشتعال انگیزی کا نتیجہ تھا۔ 1778 میں اودھ کے نواب نے اُسے اپنی ملازمت میں لے لیا اور گورکھپور بہرائچ اور بستی کے

اضلاع کا انتظام اُس کے سپرد کیا۔ ہینے نے بڑی سخت گیری سے کام لیا اور خوب دولت کمائی۔ اُس نے مال گزاری وصول کرنے کا حق ٹھیکیداروں کو دے دیا جنھوں نے گاؤں سے بہت زیادہ لگان وصول کیا اور انھیں خوب لوٹا۔ مال گزاری کے مطالبے کی وصولی میں بڑی سختی سے کام لیا جاتا تھا۔ تین سال سے کم کی مدت میں وہ علاقہ جو خاصہ خوشحال تھا تباہ و ویران کر دیا گیا۔ مجبوراً لوگوں نے اُس ظالم کے خلاف بغاوت کر دی۔ گھاگرا دریا کے مشرق کے علاقے میں رہنے والے زمینداروں نے تلوار اٹھائی، گورکھپور، بلیا اور ڈومریا گنج کے قلعوں پر قبضہ کر لیا اور آمدرفت کے راستے کاٹ دئے وارن ہسٹنگز کو، جو اودھ کی بیگمات اور بنارس کے مہاراجہ اجیت سنگھ کے خلاف الزامات پر یقین کرنے کے کچھ نجی وجہ رکھتا تھا، کرنل ہینے نے اس بات کا یقین دلایا کہ اس بغاوت میں اُن کا ہاتھ ہے۔ انگریزوں نے بغاوت کو کچلنے کے اقدامات میں اتنی زیادہ سختی سے کام لیا کہ وہ پورا علاقہ ویران ہو گیا۔

وزیر علی کی بغاوت

کمپنی کے حکمت عملی اور موقع شناسی سے کام لینے والے حکام کی اسکیم میں اودھ ایک ماتحت حلیف تھا اور اُس کا مقصد کمپنی کے مشرقی صوبوں اور مغرب کی دیسی ریاستوں کے درمیان فاصل ریاست کا کام کرنا تھا۔ وزیر علی نے اُن کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے اور زیادہ امدادی رقم دینے سے انکار کر دیا۔ اُسے 1799 میں معزول کر دیا گیا۔ اُس کے متعلق شبہ کیا جا رہا تھا وہ برطانوی مفادات کے خلاف کام کر رہا ہے اور راجپوت اور مرہٹہ سرداروں اور مسلم حکمرانوں کے ایک محاذ کی تنظیم کر رہا ہے جن میں زیادہ اہم تھے گوالیار کا سندھیا اور کابل کا زماں شاہ، مرشد آباد اور ڈھاکہ کے نواب بھی اس سازش میں شامل تھے۔ جب وزیر علی کو لکھنؤ چھوڑنے اور کلکتہ جانے کا حکم دیا گیا تو بغاوت ہو گئی۔ برطانوی فوجوں کے حملے کے بعد وزیر علی بھاگ کھڑا ہوا لیکن وہ گرفتار کر لیا گیا اور جلاوطن کی حیثیت سے ویلور بھیج دیا گیا۔

روہیلوں کے علاقے میں بغاوت

روہیل کھنڈ میں، جسے اودھ کے نواب نے 1801 میں کمپنی کے حوالے کر دیا تھا، جلد ہی عوامی بے چینی کی آثار دکھائی دینے لگے۔ اُن روہیلہ سرداروں کے لئے یہ صورت حال بڑی

توہین آمیز تھی جن کی حیثیتیں چھین لی گئی تھیں اور اُن کو ملازمین کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ حسب معمول بے چینی کی اصل وجہ تھی مالگزاری اور عدالت کے انتظام کا نیا نظام۔ بغاوت کا فوری سبب تھا 1814 کے ضابطے XVI کے تحت بریلی میں چوکیداروں کا انتظام کرنے کے لئے عائد کیا جانے والا پولیس محصول۔ لوگوں کے احتجاج پر کسی نے توجہ نہیں دی اور ایک مولوی کے ساتھ، جس کا لوگ احترام کرتے تھے، برا سلوک کیا۔ اس نے عام لوگوں کو بری طرح مشتعل کر دیا جو ہر حد سے آگے بڑھ گئے۔ مجسٹریٹ کے ساتھ جو سپاہی تھے وہ چونکہ مؤثر ثابت نہیں ہوئے اس لئے باغیوں کو منتشر کرنے کے لیے فوج بلانی پڑی۔

ہاتھرس کا دیارام

علی گڑھ کے ضلع میں مالگزاری کے اضافے نے چھوٹے چھوٹے زمینداروں کو تکلیفوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ تشخیص شدہ رقمیں وصول کر سکتے تھے اور بقایا وصول کرنے کے لئے ان کی زمینداریاں بیچ دی جاتی تھی۔ برطرف شدہ سپاہیوں اور سرکش زمینداروں نے مل کر بدنظمی اور بدامنی پھیلادی تھی۔ ان خرابیوں میں میواتیوں اور بدھیکوں کے گروہوں نے اضافہ کر دیا۔ ہاتھرس کے ایک تعلقدار دیارام کو، جو ضلع میں کئی گاؤں کا مالک تھا اور ایک ایسے قلعہ میں رہتا تھا جس کی حفاظت اونچی اونچی دیواریں اور گہری کھائی کرتی تھی، قلعہ مسمار کرنے اور سپاہیوں کو برخواست کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس حکم کی تعمیل کروانے کے لئے ایک پورا ڈویژن بھیجا گیا۔ توپوں کے اس ہجوم کے مقابلے میں، جو اس سے پہلے ہندوستان میں نہیں دیکھا گیا تھا، زیادہ مدت تک دفاع نہیں کیا جا سکتا تھا اور قلعہ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ لیکن دیارام بچ کر نکل گیا۔ بالآخر پنشن کی پیشکش کے بعد اُس نے خود کو حکومت کے حوالے کر دیا۔

اس اجمالی جائزے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تمام مدت میں بے چینی اور بغاوت ابتدائی دور سے گزر رہی تھی اور کبھی کبھی ملک کے مختلف حصوں میں سامنے آجاتی تھی۔ ہندوستان کے برطانوی علاقوں میں یکساں حالات پائے جاتے تھے۔ اُن میں سے سب سے اہم تھے زمین کی مالگزاری کے انتظام کے ایک نئے نظام کو رواج دینا جس کی بنا پر زمینداروں کے اختیارات کم ہو گئے اور زمین پر بہت زیادہ بوجھ پڑ گیا۔ اس نظام نے سماجی اور معاشی سطحوں پر ایک انقلاب

برپا کردیا اور قدرتی طور سے اُن زمینداروں اور کسانوں کو مخالفت پر آمادہ کردیا جن کے حقوق ان سے متاثر ہوئے اور قدیم معاشی ڈھانچے میں خلل پڑا۔ حالانکہ اسباب یکساں تھے پھر بھی حکومت کی مخالفت کا مظاہرہ اُس علاقے کے حالات کے مطابق ہوا۔ بغاوتیں یا تو مقامی تھیں یا کسی خاص فرقے تک محدود تھیں۔ اُن میں تال میل اور اتحاد کی کمی تھی اس لئے انھیں آسانی سے دبادیا جاتا تھا۔

1 ولی اللہی تحریک

اس زمانے میں جو تحریک برطانوی اقتدار کے لئے سب سے بڑا خطرہ بن گئی وہ تھی مسلمانوں کے ایک طبقے کی جانب سے کی جانے والی جہاد کی تبلیغ۔ اس کے قائد تھے اُتر پردیش کے ضلع رائے بریلی کے سید احمد۔ وہ علما کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے تھے جو اپنا سلسلہ نسب پیغمبر اسلام سے ملاتا تھا۔ سید احمد طبیعتاً نہایت زود حس واقع ہوئے تھے اور انھیں کشفی پیکر نظر آتے تھے جو مذہب کے لئے زندگی وقف کردینے کی تلقین کرتے تھے۔

اپنے تشکیلی دور میں اُن کے جوشیلے ذہن نے ولی اللہ(1703لغایت 1762)کے قائم کئے ہوئے دبستان کے احیائے مذہب کے ماحول کا اثر قبول کیا ہوگا۔ جس کے سربراہ اُن کے بعد اُن کے بیٹے عبدالعزیز(1746لغایت 1823)ہوئے جنھوں نے 1803 میں فتویٰ دیا کہ ہندوستان اب دارالاسلام نہیں ہے۔

اس صداقت پرستانہ اور احیا پسندانہ ماحول میں سید احمد کے رجحانات اور رویے اپنے نقطہ عروج کو پہنچ گئے۔ لیکن وہ محض ایسے خیال پرست نہیں تھے جو فنا فی اللہ کا ناقابل بیان تجربہ حاصل کرنے کے خواہش مند ہوں۔ اُن کی روح عمل کی پیاسی تھی۔ وہ پیغمبر اسلام کے نقش قدم پر چلنا چاہتے تھے اور طریقہ محمدیہ کی تجدید کرنا چاہتے تھے۔ سہ رکنی پروگرام کے ذریعے وہ زبوں حال ملت اسلامیہ کو نئی زندگی بخشنا چاہتے تھے۔ اُن کے پروگرام کے تین ارکان تھے۔ خدا کے کلام کا عروج، قول و فعل میں جذبۂ ایمان کی تجدید اور جہاد پر عمل۔ مذہب کے پانچ ارکان یعنی نماز، خدا اور اُس کے رسول کا اقرار، زکوٰۃ، روزہ اور حج میں وہ آخرالذکر کو خدا کی عبادت کا بہترین ذریعہ سمجھتے تھے۔

1808 میں سید احمد کی تعلیم مکمل ہوگئی۔ چنانچہ وہ اپنے گھر واپس چلے گئے اور شادی کر لی۔ اُس کے بعد وہ اپنی منزل کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے اور ٹونک پہنچے جہاں امیر خان ایک آزاد حکمراں کی حیثیت سے حکومت کرتا تھا۔ اُس کی فوج میں ملازم ہو گئے، اُس کی جنگوں میں حصہ لیا اور فوجی حکمت عملی اور تدابیر میں ضروری تربیت حاصل کی۔ لیکن 1817 میں جب امیر خاں نے انگریزوں کے باج گزار کی حیثیت قبول کر لی تو انھوں نے اُس کی نوکری ترک کر دی۔

ٹونک سے واپس آنے کے بعد انھوں نے سب سے پہلے اتر پردیش کے مغربی اضلاع کا دورہ کیا۔ میرٹھ، مظفر نگر اور سہارن پور کے اضلاع کے اہم قصبوں اور گاؤں کا انھوں نے سفر کیا۔ اس کے بعد انھوں نے مشرقی اضلاع کا بھی دورہ کیا۔ یعنی الٰہ آباد، بنارس، کانپور اور لکھنؤ اور تیسرا دورہ روہیل کھنڈ کا کیا۔

وہ جہاں جہاں گئے سید احمد کا پر جوش خیر مقدم کیا گیا اور خاطر مدارت میں کوئی کسر نہیں چھوڑی گئی۔ لوگ بڑی تعداد میں اُن کا واعظ سننے کے لئے جمع ہو جاتے تھے۔ وہ قرآن کی تعلیمات کی روشنی میں اسلام کی تبلیغ کرتے تھے اور دو باتوں پر بہت زیادہ زور دیتے تھے۔ پہلی بات تھی شرک سے بچنا یعنی خدا کی ذات میں کسی کو شریک نہ کرنا اور خدا کی صفات کو کسی سے منسوب نہ کرنا۔ وہ اس کو گناہ عظیم سمجھتے تھے۔ وہ اس بات پر زور دیتے تھے کہ ایک سچے مسلمان کو اس پر یقین نہیں کرنا چاہیۓ کی کوئی فرشتہ، روح، روحانی پیشوا، معلم، نبی یا ولی اللہ اس کے اور خدا کے درمیان پڑ سکتا ہے اور انسان کی دشواریوں کو دور کر سکتا ہے یا اُس کی خواہشات پوری کر سکتا ہے۔ کسی مسلمان کو نہ اُس سے کچھ طلب کرنا چاہیۓ اور نہ اُن کی ناراضگی سے ڈرنا چاہیۓ اس لیے خدا کے حضور میں وہ بھی اسی طرح بے بس ہیں جیسے کوئی اور انسان۔ دوسری بات وہ یہ کہتے تھے کہ مسلمانوں کو بدعت ترک کر دینا چاہیۓ اور تمام معاملات میں چاہیۓ وہ اہم ہوں یا غیر اہم، سنت پر عمل کرنا چاہیۓ۔ سید احمد کی سیدھی سادی زندگی، اُن کے بے پایاں جوش اور بے پناہ خلوص اُن کی بے لوثی اور انکساری نے اُن سب لوگوں پر گہرا اثر ڈالا جو اُن کے قریب آئے۔ چنانچہ انھوں نے جو بیج بویا تھا وہ بھی فصل کا ضامن بن گیا۔ بہت سے شاگردوں نے اُن کی پیروی کرنے کا پکا عہد کر لیا۔

لیکن جہاد شروع کرنے سے پہلے انھوں نے مکہ جا کر حج کرنے کا فیصلہ کیا۔ جولائی 1821 میں وہ رائے بریلی سے کلکتہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مئی 1822 میں جب وہ مدینہ پہنچے تو اُن کے ساتھ آٹھ سو معتقدین تھے۔ جس وقت وہ رائے بریلی سے روانہ ہوئے تو اُن کے پاس پیسہ کوڑی کچھ نہیں تھا پھر بھی اُن کے سفر پر ستر اسّی ہزار روپیہ خرچ ہوا جو اُن کے مداحوں اور شاگردوں کے چندوں سے جمع ہوا تھا۔ دو سال کے بعد وہ گھر واپس آئے۔ (27اپریل 1824)

سید احمد نے عرب میں جس سے اثر لیا وہ محمد بن عبدالوہاب کا مسلک نہیں تھا بلکہ مسلمانوں کی ذلت وخواری کی داستان اور مشرقی ممالک میں مغربی طاقتوں کے تیزی سے بڑھتے ہوئے غلبے کی روداد تھی۔ اس نے اُس شخص کو جو کسی حد تک تخیل پرست کہا جا سکتا تھا ایک آتش نفس مجاہد میں تبدیل کر دیا جس نے اسلام کے دشمنوں سے جنگ کرنے کا مصمم عزم کر لیا تھا تاکہ اُن علاقوں کو دوبارہ حاصل کیا جا سکے جن پر مسلمان حکومت کر چکے تھے۔ ہندوستان پہنچنے کے بعد انھوں نے فوراً اپنی تحریک کی تنظیم کا کام شروع کر دیا۔ انھوں نے ''ایک ایسے نظام کی بنیاد ڈالی جس کے ذریعہ انھوں نے (اُن کے پیروؤں نے) احیائے مذہب کا اتنا بڑا کارنامہ سرانجام دیا جس کی مثال ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی ہے اور جس کی وجہ سے پچاس سال تک انگریزی حکومت کے خلاف جذبہ بغاوت زندہ رہا۔''[1]

جہاد کی تیاری میں شامل تھے (1) لڑنے والے سپاہیوں کا ایک گروہ تیار کرنا جن کی تعداد اور اسلحہ ایسے ہوں کہ دشمن کی مزاحمت کا مناسب ومعقول دافع فراہم کر سکیں۔ (2) ایسے قائد کا انتخاب جس میں وہ صفات پائی جاتی ہوں جو فوج کے کمانڈر کے لئے ضروری ہیں۔ (3) کسی مسلم حکمراں کے زیرنگیں ایسے علاقے کا انتخاب جو مجاہدین کے گروہ کی حفاظت کی ضمانت کر سکے۔

پہلی دو شرائط تو اس وقت پوری ہوگئیں جب کئی سو ہندوستانی مسلمان بھرتی کر لئے گئے اور سید احمد کو امام منتخب کر لیا گیا۔ تیسری شرط ہندوستان کی سرحدوں کے اندر رہ کر پوری نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس لئے لڑائی کے میدان کے طور پر شمال۔ مغربی سرحد کے علاقے کا انتخاب کیا گیا۔ سرحد

---

[1] ہنٹر۔ ڈبلیو۔ the IndianMusalman (Hirdedition Calcutta 1876) صفحہ 61-62

کے قبائل کٹر تھے اور اُن کے ملّا اس کٹر پن کو پوری طرح استعمال کرنا جانتے تھے۔ یہ بھی معلوم تھا کہ عرب کے محمد بن عبدالوہاب کے عقائد کی تھوڑی بہت اشاعت اس علاقے میں بھی کی جا چکی ہے۔

پہلا قدم تھا ہندوستان سے جو دارالحرب تھا، مومنین کے گروہ کا سرحدی علاقے کی طرف، جو دارالاسلام، ہجرت کا انتظام کرنا۔ پانچ چھ سو انسانوں کو، جن کے ساتھ کچھ عورتیں اور بچے بھی تھے، پانچ ہزار روپے فراہم کئے گئے تاکہ وہ اپنے خطرناک عزائم پورے کرنے کے لئے شمال۔مغرب کی طرف سفر کریں۔ 17 جنوری 1826 کو یہ قافلہ سید احمد کی قیادت میں رائے بریلی سے روانہ ہوا جن کی مدد ایک مجلس مشاورت کرتی تھی۔ اُس کے اراکین میں اہم تھے مولوی محمد اسماعیل اور مولوی عبدالحئی جو شاہ عبدالعزیز کے قریبی عزیز تھے۔ پہلی اہم قیام گاہ تھی گوالیار۔ گوالیار سے وہ ٹونک گئے، پھر اجمیر پہنچے اور راجپوتانہ سے گزر کر سندھ میں داخل ہوئے۔ حیدر آباد (سندھ) پہنچ کر کٹر مجاہدین کا یہ گروہ اپنے ہم مذہبوں کے درمیان آ گیا تھا اور انھیں توقع تھی کہ سندھ کے امیر اُن کے ساتھ ہو جائیں گے۔ اُن کے رویے سے مایوس ہو کر وہ شکار پور کی طرف بڑھے جہاں سید احمد نے سرداروں اور علما کو جہاد میں شرکت کی دعوت دی۔ اُن کا جواب بھی اُسی حد تک مایوس کن ثابت ہوا۔ اُس کے بعد ریگستان اور پہاڑی علاقے کو پار کر کے مجاہدین کا گروہ درّہ بولان سے گزر کر کوئٹہ پہنچا۔ کوئٹے سے وہ قندھار، غزنی اور کابل گئے اور بالآخر 20 نومبر 1826 کو پشاور پہنچے۔ انھوں نے تقریباً دس مہینے تک سفر کیا تھا اور قریب قریب تین ہزار میل چلے تھے۔

یہ حیرت انگیز کارنامہ تھا۔ زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ برطانوی حکومت نے، جو سید احمد کے منصوبوں اور مقاصد سے واقف ہو گئی تھی۔ اپنے علاقے سے گزرتی ہوئی اس چھوٹی سی فوج سے کوئی تعرض نہیں کیا۔ کیا اس عدم مزاحمت کی وجہ یہ علم تھا کہ جہاد کا نشانہ برطانوی ہندوستان نہیں بلکہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سکھ ریاست ہے اگر شمال۔مغرب کی طرف سے رنجیت سنگھ کے لئے خطرہ پیدا ہوتا تو انگریزوں کے لئے یہ کوئی تشویش کی بات نہیں تھی۔ اس لئے کہ اس حملے کی بنا پر اُس کی توجہ سندھ اور ستلج کے علاقوں سے ہٹ جاتی جنھیں وہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ جلد ہی انھوں نے

پشاور پر قبضہ کرلیا جس سے اُن کے وقار میں اضافہ ہوگیا لیکن انھوں نے جہاد کے صدر مقام کے لئے چہار سدّا کے قصبے کا انتخاب کیا۔ یہاں سے سکھوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا گیا۔ سرحد کے قبائل کو ہندوستانی مجاہدین کی صفوں میں شامل ہونے کی دعوت دی گئی۔ قبائل نے بڑی مستعدی کے ساتھ اس دعوت پر لبیک کہا لیکن اُن کے سردار مذبذب میں تھے اور انھوں نے گرم جوشی کا اظہار نہیں کیا۔

بہرحال سید احمد کو امام یا مجاہدین کا قائد تسلیم کرلیا گیا۔ انھیں امام مہدی، امیر المومنین اور خلیفہ کے القاب دئے گئے۔ اُن کی پاکبازی و برگزیدہ زندگی کی بنا پر انھیں ولی کا درجہ دے دیا گیا۔ جب اُن کی یہ حیثیت تسلیم کرلی گئی تو انھوں نے وحشی قبائل کی اصلاح کی کوشش کی اور انھیں ایک مذہبی۔ سیاسی طاقت کے طور پر منظّم کرنا چاہا۔ انھیں عشر اور زکوٰۃ ادا کرنے کی ہدایت کی گئی اور کہا گیا کہ فیصلے کے لئے اپنے جھگڑے امام کے مقرر کردہ قاضی کے سامنے پیش کریں اور اُس کے احکام کی تعمیل کریں۔ شادی کے قبائلی رواجوں کو غیر قانونی قرار دیا گیا اور ہندوستانی مہاجرین کی پٹھان لڑکیوں کے ساتھ شادیاں کرائی گئیں۔ انتقامی کاروائیوں، رقابتوں اور حسدوں کی مذمّت کی گئی، جن کی وجہ سے دائمی ہلاکت خیز لڑائیاں ہوتی رہتی تھیں اور اسلامی برادری کی کمزوری کا باعث بنتی تھیں۔

بدقسمتی سے اتحاد و اتفاق کی کوششیں ناکام ہوگئیں۔ اصلاح کے اقدامات نے قبائل میں ناگواری کا احساس پیدا کردیا اور ملّا اس لئے ناراض ہوگئے کہ عشر اور زکوٰۃ کے ضوابط نے انھیں بالائی آمدنی سے محروم کردیا تھا۔ قبائل کے خان اور سردار فی الجملہ بڑے خودغرض لوگ تھے۔ وہ ضمیر فروش تھے اور بڑی آسانی سے خریدے جاسکتے تھے۔ صدیوں سے وہ لوٹ مار تشدد اور غیر شائستہ قبائلی طریقوں کے عادی رہے تھے۔ مذہبی جذبات کی اپیل کا اُن پر اثر نہیں ہوتا تھا حالانکہ اُن کے خدام جو غریب، توہم پرست اور کٹر تھے اپنے مذہبی رہنماؤں کی بات سنتے اور ایسی جنگ میں حصہ لینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے جس سے انھیں مذہبی فائدہ بھی ہو اور مال غنیمت بھی ہاتھ آئے۔

ان ناکامیوں کے باوجود جہاد کی آگ ایک دفعہ روشن ہونے کے بعد آدھی صدی جلتی

رہی۔اس کے پہلے مرحلے میں راست نشانہ تھا پنجاب کی سکھ ریاست پر حملہ۔فریقین میں بہت سی جھڑپیں ہوئی۔ان میں سب سے اہم تھی 1831 میں ہونے والی بالاکوٹ کی جنگ جہاں مجاہدین کو شکست فاش کا منہ دیکھنا پڑا۔سید احمد اور شاہ محمد اسماعیل اس جنگ میں مارے گئے۔

امام کا منظر عام سے ہٹ جانا ایک کاری ضرب تھا۔لیکن سید احمد نے ہندوستان میں جو تنظیم بنائی تھی اُس کی وجہ سے سرحد پر لڑنے والے گروہ میں انتشار نہیں پھیلا۔سرحد کے لئے روانہ ہونے سے پہلے سید احمد نے مرکزوں اور گماشتوں کا ایک جال پھیلا دیا تھا تاکہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو جہاد کے لئے تیار کریں اور سرحد پر لڑنے والے گروہ کے لئے چندہ جمع کریں اور سپاہی بھرتی کریں۔حیدرآباد دکن، مدراس، بنگال، بمبئی اور اس صوبے میں جس کو اب اتر پردیش کہا جاتا ہے ادارے قائم کئے گئے تھے۔اس تحریک کا صدر مقام تھا پٹنہ۔روپیہ اکٹھا کرنے اور سلسلہ مراسلت جاری رکھنے کے لئے گماشتے مقرر کئے گئے تھے۔چندہ اور رنگروٹ صدر مقام آتے تھے اور سرحد کو روانہ کردئے جاتے تھے۔نقد روپیہ گماشتے لے جاتے تھے اور ہنڈیا سرحدی مقبول کے ساہوکاروں (جو عام طور سے ہندو ہوتے تھے) کو بھیجی جاتی تھیں۔رنگروٹوں کے چھوٹے چھوٹے گروہ اتر پردیش اور پنجاب سے گزرتے تھے۔راستے میں قیام گاہیں تھیں یعنی تھانیسر اور راولپنڈی میں تاکہ خوردنی اشیا اور سامان لے جانے میں مسافروں کی مدد کی جاسکے۔

ہندوستان کے مختلف حصوں کے مسلمانوں نے چندہ اکٹھا کیا اور رضاکار بھیجے لیکن ان مقاصد کے لئے زیریں صوبوں میں زیادہ بہتر تنظیم کی گئی تھی۔قریب قریب ہر گاؤں میں ایک مبلغ ہوتا تھا اور گاؤں کی مسجد میں جوان کی جلسہ گاہ تھی وہاں لوگ وعظ سننے کے لئے جمع ہوتے تھے جس میں مذہبی اصلاح،سرحد پر جہاد کا جذبہ برقرار و بحال رکھا گیا۔

سید احمد کے ایک قریبی رفیق کار مولوی محمد قاسم پانی پتی ستھانا آئے اور قبائلی سردار اکبر شاہ کے ساتھ مل کر وہاں کام کیا جو سید احمد کا جاں نثار تھا۔انھوں نے تمام مرکزوں کو خطوط لکھے اور انھیں یقین دلایا کہ قائد کی موت کی خبر غلط ہے۔مولوی ولایت علی اور عنایت علی کو، جو پٹنہ کے گروہ کے قائد تھے، یہ یقین آگیا کہ سید نہیں مرے ہیں اور جنگ جاری رکھنے کی غرض سے وہ سرحد کی طرف گئے۔

رنجیت سنگھ کی موت اور سکھوں کے ساتھ انگریزوں کی پہلی لڑائی (1845) کے بعد پنجاب میں انگریزوں نے غلبہ حاصل کرلیا۔ مجاہدین نے اب جہاد کا رُخ اُن کی طرف پھیر دیا۔ ہونے والی جھڑپوں میں انھیں اکثر شکستیں ہوتیں لیکن انھوں نے ہتھیار نہیں ڈالے۔ اب حکومت نے اُن کے خلاف دو محاذوں پر جنگ شروع کردی۔ انھوں نے پولیس کا ایک خصوصی محکمہ قائم کیا جس کے سپرد ہندوستان میں اُن کی سرگرمیوں کی نگرانی اور اُن مرکزوں کو ختم کرنے کا کام کیا گیا جہاں سے رنگروٹ سرحد بھیجے جاتے تھے۔ اس کے ساتھ سرحدوں پر مجاہدین کو ختم کرنے کے لئے باضابطہ فوج کی مہمیں شروع کی گئیں۔

1850 اور 1853 کی درمیانی مدت میں بیس مہمیں بھیجی گئیں جن میں 60،000 سپاہی تھے۔ ستھانہ سے نکال دئے جانے کے بعد انھوں نے ملکانا کو اپنا صدر مقام بنالیا اور اُس کے کچھ دن بعد ستھانہ پر قبضہ کرلیا۔

1863 میں جنرل سر نویل چیمبرلین کی قیادت میں ایک بڑی فوج اُن کی سرزنش کے لئے بڑھی لیکن قبائل نے اُسے درہ امبیلا میں کئی ہفتے تک گھیرے رکھا اور بہت جانی نقصان پہنچایا۔ سرحدی فوج کو تباہی سے بچانے کے لئے پنجاب کو فوجوں سے خالی کرنا پڑا۔ لیکن جہاں برطانوی اسلحہ ناکام رہے تو وہاں اُن کی حکمت عملی کامیاب ہوگی قبائلیوں کا اتحاد ٹوٹ گیا اور برطانوی فوج نے ملکانا کو جلا کر خاک کردیا۔ لیکن مذہب کی خاطر لڑنے والے ناقابل تسخیر جنگجوں پھر برسرِ پیکار ہوئے۔ چونکہ فوجی کاروائی مجاہدوں کو دبانے میں ناکام رہی تھی اس لیے تیزی کے ساتھ پولیس کی کاروائی کی گئی اور اُس کے بعد اُن پر مقدمے چلائے گئے۔

اس وقت تک مولوی ولایت علی اور مولوی عنایت علی مرچکے تھے اور اُن کا بھائی یحییٰ علی پٹنہ میں کاروبار کی نگرانی کر رہا تھا۔ مولوی فرحت علی اور مولوی احمد اللہ اُس کے کٹر حامی تھے۔ انھوں نے تحریک کو پورے زور وشور کے ساتھ چلانے کے لئے ہر امکانی کوشش کی۔ مذہبی اصلاح اور جہاد کی نشر واشاعت کی خاطر کتابیں اور کتابچے چھاپے گئے۔ پٹنہ میں صادق پور کے مقام پر ایک عمارت بنائی گئی جس میں تحفظ اور پردہ پوشی کے پورے پورے انتظامات کئے گئے تھے۔ دیہی علاقوں میں ایک تنظیم قائم کی گئ جس کی شاخیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ مختلف مراکز میں

بستیاں آباد ہو گئیں جن میں مبلغین، محصول وصول کنندگان اور منتظمین کا عملہ تھا جن کا کام تھا رقم یا جنس کی شکل میں چندے وصول کرنا۔ پٹنہ سے سرحد کو جانے والی سڑک پر مراکز قائم تھے جو رقموں اور اشخاص کو ادھر سے اُدھر بھیجتے تھے اور اُن کا خیر مقدم کرتے تھے۔

حکومت نے اس خطرے کا مقابلہ تنظیم پر بسیار اضی حملے سے کیا۔ 64-1863 میں کچھ بڑے اچھے کارکنوں کو، جن میں یحییٰ علی، ولایت علی کا شاگرد محمد جعفر اور ایک ٹھیکیدار محمد شفیع شامل تھے، انبالہ کی عدالت میں پیش کیا گیا اور لمبی لمبی قید کی سزائیں دی گئیں۔ کچھ کو جزائر انڈمان بھیجا گیا۔

1865 میں پٹنہ میں پہلا مقدمہ چلایا گیا۔ جن لوگوں کے خلاف ملکہ کے خلاف جنگ کرنے کے الزام میں مقدمہ شروع کیا گیا اُن میں یحییٰ علی کا بھائی احمد اللہ بھی شامل تھا۔ اُن سب کو حبس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔ اس کے بعد بنگال میں مالدہ اور راج محل کے مقامات پر مقدمات کی سماعت ہوئی اور کئی مجاہدین کو حبس دوام کی سزا دی گئی۔ 1871 میں پٹنہ میں ہونے والے مقدمے کی دوسری سماعت نے تنظیم کا شیرازہ بکھیر دیا اُس میں پانچ سر کردہ مولویوں کو جلاوطن کیا گیا۔

حکومت نے پرچار کے ذریعے اپنے موقف کو زیادہ مضبوط بنالیا۔ تذبذب کے شکار اشخاص کو اپنے ساتھ کرنے کے لئے تحریک کے خلاف فتویٰ حاصل کئے گئے۔ اُن کے خلاف الزام تراشی کے لئے مکہ کے مفتی کو آمادہ کرلیا گیا۔ ہندوستان میں شیعوں نے جہاد کی مخالفت کی۔ شمالی صوبے کے علما نے جہاد کو غیر ضروری ٹھہرایا۔ کلکتہ کے علما نے اعلان کیا کہ ہندوستان دارالاسلام ہے جہاں بغاوت حرام ہے۔ کلکتہ کے محمڈن لٹریری سوسائٹی نے بحث و مباحثے کے بعد ایک کتابچہ شائع کیا جس میں دلیلیں دے کر ثابت کیا گیا تھا کہ انگریزوں کے خلاف جہاد حرام ہے۔ اس قسم کے سر کردہ مسلم علما نے جیسے جون پور کے مولوی کرامت علی اور کلکتہ کے مولوی عبدالطیف نے اس خیال کی حمایت کی۔

ان اقدامات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جماعت شکست دریخت کا شکار ہوگئی اور 1884 کے بعد اُس کے متعلق کچھ سننے میں نہیں آیا حالانکہ اُس کے بعد بھی وہ سرحد میں مدت تک موجود رہے۔ لیکن سید احمد کی تحریک کی کچھ نوعیتیں قابل غور ہیں۔ اس نے ظاہر کر دیا کہ علما کی قیادت میں بے مایہ

طبقات کی حمایت سے حکومت کے خلاف بغاوت کی تنظیم کی جاسکتی ہے اور پولیس کی نگرانی اور فوج کی احتیاطی تدابیر کے باوجود اُسے نصف صدی سے زیادہ مدت تک پوری شدت کے ساتھ چلایا جاسکتا ہے۔ بالآخر تحریک کی ناکامی نے ثابت کردیا کہ مذہبی جوش، اعلیٰ وارفع اعتقادات، استقامت عزم، دلاوری، قربانی اور جاں نثاری کا جذبہ کتنا ہی کیوں نہ ہو پھر بھی وہ کافی نہیں ہے۔ بڑی سے بڑی تنظیمی صلاحیت اور قابل لحاظ فوجی مہارت بھی اُس طاقتور سلطنت کا تختہ نہیں اُلٹ سکتی جو قوم پرستی، سائنس اور تکنالوی کی جدید سماجی قوتوں کی بنیاد پر قائم ہو۔

جن تصورات نے سید احمد اور اُن کے پیروؤں کو متاثر کیا وہ کئی طرح سے اپنی اہمیت کھوچکے تھے۔ وہ اُس طرز زندگی کی تجدید کرنا چاہتے تھے جو ساتویں صدی کے عربوں میں رائج تھی۔ انھوں نے تاریخ کے اسباق، اداروں کی اضافیت اور انسانی معاملات پر مکان وزماں کے اثر کو پوری طرح نظر انداز کردیا۔ انھوں نے نہ صرف اخلاق و مذہب کی بنیادی حقیقتوں کی مطلقیت پر زور دیا بلکہ اُن سماجی اور معاشی نظاموں، رسموں اور رواجوں پر بھی جو ہمیشہ حرکت میں رہتے ہیں۔ انیسویں صدی کے جغرافیائی، معاشی، سماجی اور سیاسی حالات کو پوری طرح نظر انداز کرنے کا نتیجہ مایوسی اور ہزیمت کی شکل میں ظاہر ہونا لازمی تھا۔ سید احمد کی اس کوشش نے کہ سرحد کے قبائلی لوگوں پر قانون اور اخلاقیات کے متعلق اپنے تصورات تھوپیں انھیں ناراض کردیا اور جہاد کو ہلاکت خیز جنگوں میں تبدیل کردیا۔ سیاسی تشکیل نو کے پروگرام میں ہندوستانیوں کی ایک بڑی اکثریت کو پوری طرح نظر انداز کرنے کی وجہ سے وہ سب سے کٹ کر رہ گئے جس کی بنا پر اُن کی ناکامی اُن کی کوششوں کا مقدر بن گئی۔

سید احمد کی تحریک ناکام ہوگئی لیکن اُس نے دورس اثرات چھوڑے۔ اس نے ہندوستانی سماج میں علیٰحدگی پسندی کے جذبہ کو تقویت دی۔ اس بات پر سید احمد کے اصرار کے نتیجے میں کہ تمام اُن رواجوں اور عادتوں کو ترک کردینا چاہئے، چاہے وہ اچھی ہوں یا بری، اہم ہوں یا غیر اہم (بدعت حسنہ یا بدعت سو)، جو ہندوستان میں رہ کر ہندوؤں کے ساتھ میل ملاپ کی بنا پر پیدا ہوئی ہیں دونوں فرقوں کے درمیان خلیج کا وسیع ہونا لازمی تھا۔ اس تحریک سے تصورات کی ایسی لہریں پھوٹیں جنھوں نے علیحدگی پسندی کے رجحانات کو تقویت پہنچائی۔

اس تحریک نے مسلمانوں میں احیا پسندی کے پرچار کو بڑھا وادیا۔ ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے قسم کا واقعہ دیکھنے میں آیا۔ انگریزوں کے دہلی پر قبضے کے بعد اہل سیف اور تاجداروں کی سیاسی قیادت کا دور ختم ہوگیا اور وہ رول اہل قلم اور مذہبی رہنما ادا کرنے لگے۔ اس تبدیلی کے بعد سیاست پر مذہبی اعتقاد نے غلبہ حاصل کرلیا۔ پھر بھی سید احمد کی تحریک کی یاد نے مسلمانوں میں آزادی کی خواہش کو زندہ رکھا۔ اُس کے بعد انگریزی حکومت کے خلاف کی جانے والی جدوجہد میں مولویوں کی حمایت شامل حال رہی مثلاً 1857 کی بغاوت میں۔

XII سپاہیوں کی بغاوتیں

دیہی بے چینی اور مجروح مذہبی جذبات نے بدیسی حکومت کے خلاف نفرت میں اضافہ کردیا۔ دیہی طبقوں یعنی کسانوں، زمینداروں، قبائلی سرداروں اور اُن کے متعلقین میں پھوٹنے والی شورشوں کی وجہ تحریک یہ تھیں۔ اُن ہندوستانی سپاہیوں پر بھی اُن کا اثر پڑتا تھا جو کمپنی کی فوجوں میں ملازم تھے اور خود اپنے ہم وطنوں کی گردنوں پر غلامی کا جوا رکھنے کی خاطر اپنے مالکوں کے لئے لڑتے تھے۔ یہ اثر اور بھی بڑھ گیا جب کمپنی کی فوج میں ملازمت کی شرائط مقابلتاً بدتر ہوگئی۔

ہندوستانی سپاہیوں کی پہلی بغاوت 1764 میں ہوئی جب پٹنہ میں میر قاسم کا مقابلہ کرنے والی فوج کی ایک پوری بٹیلین اپنی صفوں سے نکل کر نواب کی فوج میں شامل ہوگئی۔ لیکن انھیں کمپنی کے نمک حلال اور وفادار سپاہیوں نے گھیر لیا اور اُس کے بعد اُن پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا۔ اُن میں چوبیس کو توپوں سے باندھ کر اُڑا دیا گیا۔

1806 میں ویلور میں ہونے والی بغاوت زیادہ اہم تھی۔ 1796 میں ہونے والی فوج کی تنظیم نو نے برطانوی حکام کے حقوق میں اضافہ کردیا لیکن ضبط و نظم کم ہوگیا۔ اُن میں کئی پنشن کے فوائد سے استفادہ کرنے کی غرض سے ملازمت سے علیحدہ ہوگئے اور انگلستان واپس چلے گئے۔ فوج میں ایسے افسر رہ گئے جو سپاہیوں سے پوری طرح واقف نہیں تھے اور اپنی بٹیلینوں سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے تھے۔

1803 تک ٹیپو سلطان (وفات 1799) اور مرہٹوں کے خلاف کمپنی کی پُر جوش جنگوں کے نتیجے میں ہندوستان میں برطانوی اقتدار اعلیٰ قائم ہو چکا تھا۔ نئے جوش کے ساتھ حکام فوج کے حالات سدھارنے کی اسکیموں پر غور کر رہے تھے۔ انھوں نے طور طریق کے نئے ضابطے بنائے اور وردی اور ڈال میں جدت پیدا کی۔ سپاہی کو داڑھی منڈوانے، ماتھے سے قشقے کا نشان مٹانے اور کانوں سے در اُتارنے اور صافے کے بجائے ایک گول ہیٹ پہننے کا حکم دیا جس کا اوپری حصہ مسطح تھا اور چمڑے کا طرہ اور کھڑا ہوا پر لگا تھا۔ طرے کا چمڑا یا تو گندے سور کی کھال سے بنا تھا یا مقدس گائے کی۔

ان نئے نئے طریقوں نے جنھیں سپاہیوں کے احساسات کا خیال کئے بغیر نافذ کیا گیا تھا، اُن کے ذہنوں میں طرح طرح کے خطرات کو جنم دیا اور اُن کے شکوک میں اضافہ کر دیا۔ پرانی شکایتوں نے نئی شدت اور نئی وسعت پائی۔ انگریز حکام کی بدتمیزیوں پر زیادہ شکایت پیدا ہونے لگی، ہندوستانی حکام کی طرف انگریز سپاہیوں کے بدتہذیبی کے رویے پر زیادہ غصہ آنے لگا، معمولی الفاظ اور اعمال میں زیادہ گہرے مضمرات نظر آنے لگے اور وطن سے دور رہ کر ملازمت کرنا زیادہ تکلیف دہ معلوم ہونے لگا۔ کرناٹک اور دکن پر بے چینی اور کشیدہ احساسات کے بادل منڈلانے لگے۔

بارود بچھائی جا چکی تھی۔ اس میں آگ اس وقت لگی جب ٹیپو سلطان کے بیٹوں نے چنگاری پھینکی جو انگریزوں کی نگرانی میں دیور کے قلعے میں رہتے تھے۔ 1806 کے مئی کے مہینے کے شروع میں ایک بٹیلین نے بغاوت کر دی۔ بغاوت فرو کر دی گئی اور ڈسپلن قائم رکھنے کے لئے باغیوں کے سرغنوں کے کوڑے مارے گئے۔ کچھ دن تک خاموش رہے اس کے بعد 10 جولائی کو طوفان پھٹ پڑا۔ آدھی رات کے وقت ہندوستانی سپاہیوں نے بغاوت کر دی، پہرداروں کو قتل کر دیا، اصل گارڈ کو موت کے گھاٹ اُتار دیا، کچھ افسروں کو گولیوں سے اُڑا دیا اور (دین دین) کے نعروں کے ساتھ دمدمہ پر میسور کا شیر کی دھاریوں والا جھنڈا پھیلا دیا۔ اُس کے بعد سپاہی نظم و ضبط کو بالکل بھول گئے۔ سرکش لوگوں کا ایک جم غفیر اُن سے آن ملا اور برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کا اصل مقصد قتل و غارت کے سیلاب میں ڈوب گیا۔

جب اس کی خبر آرکاٹ میں انگریزوں کو ملی تو گلسپی کی قیادت میں ایک فوجی دستہ قلعے کی طرف بڑھا۔ دیواروں پر فوجی چڑھ گئے، پھاٹک توڑ دئے گئے اور رسالہ قلعہ میں داخل ہو گیا۔ ہندوستانی سپاہی، جن کی حیثیت بدنظمی کے شکار ایک مجمع سے زیادہ نہیں تھی، تحفظ کی صلاحیت سے محروم تھے۔ انھیں گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالا گیا۔ کچھ دیواروں پر سے کود کر بھاگ گئے، بہت سوں نے ہتھیار ڈال دیے اور رحم کی درخواست کی۔ بغاوت کچل دی گئی۔ طوفان جتنی تیزی کے ساتھ آیا تھا اتنی تیزی کے ساتھ گزر گیا۔

ویلور کے حادثے کے کچھ ہی دنوں بعد بنگال کی فوج میں پائی جانے والی بے چینی نے 1824 میں بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ یہاں بھی رجمنٹوں کے انتظامات میں کی جانے والی تبدیلیوں اور افسرانِ بالا کے ہاتھوں میں اختیارات مرکوز کرنے کی بنا پر سپاہیوں اور اُن کے افسروں کے درمیان خلیج پیدا ہو گئی تھی۔ برما کی جنگ کی ضرورتوں نے حکومت کو اس پر مجبور کر دیا کہ ہندوستانی سپاہی کے سپرد تکلیف دہ فرائض کرے۔ جس بات کو وہ مذہب اور اپنی سہولت کی بنیاد پر سب سے زیادہ ناپسند کرتا تھا وہ تھا ہندوستان کی سرحد سے گزرنا اور سمندر پار کرنا۔ ایک ایسے ملک میں لڑنا اسے ناگوار تھا جہاں کی آب و ہوا مختلف تھی اور جہاں کے لوگ زبان، نسل اور رسم و رواج تو اس کے لئے بالکل اجنبی تھے۔

سوار برداری کے ذرائع کی کمی کی بنا پر جب سپاہی کو اپنا سامان لاد کر چلنا پڑا تو اُس نے کہاوت کے مطابق آخری خطرے کا کام کیا۔ 47 ویں نیو انفنٹری نے اُس وقت تک برما جانے سے انکار کر دیا جب تک اُن کے بھتے میں سو فی صدی اضافے کا یقین نہ دلایا جائے۔ کمانڈر ان چیف نے جو بڑا سخت گیر افسر تھا، بغاوت کو کچلنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ وہ یورپین رجمنٹ کے پریڈ گراؤنڈ پر طلب کیا اور محاذ جنگ کی طرف روانہ ہونے یا ہتھیار ڈال دینے کا حکم دیا۔ سپاہیوں نے یہ کیا نہ وہ۔ اُس کے بعد اُن پر آگ برسنے لگی۔ جو بچ گئے اُن پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا گیا اور پھانسیاں دے دی گئیں۔ 47 ویں رجمنٹ کا نام فوج کی فہرست سے خارج کر دیا گیا۔

اُس کے بعد بنگال کی فوج کی دوسری رجمنٹوں میں بھی بے چینی کے آثار نظر آنے لگے۔

پہلی افغان جنگ کی بے پناہ تباہی نے انگریزوں کی عزت کو خاک میں ملا دیا تھا۔ تیزی کے ساتھ انگریزوں کی بگڑتی ہوئی حالت اور ملک سے اُن کے انخلا کی کہانیاں بازاروں میں گشت کرنے لگیں۔ سپاہی اُن احکام پر عمل کے لئے تیار نہیں تھے جن کو وہ غیر معقول سمجھتے تھے۔ بدقسمتی سے حکومت نے اس وقت انھیں ناراض کرنا مناسب نہ سمجھا۔ سندھ کے امیروں کے ساتھ جنگ کے دوران انھیں تنخواہ کے علاوہ دگنا بھتہ دیا جاتا تھا۔ فتح کے بعد سندھ برطانوی علاقے کا حصہ بن گیا اور بدیس میں عملی خدمت کے لئے دیا جانے والا بھتہ ختم کردیا گیا۔ اس تخفیف نے سپاہیوں کو مشتعل کردیا اور انھوں نے حکم عدولی کرنے کا فیصلہ کیا۔

فروری 1844 میں فیروز پور میں مقیم 34ویں رجمنٹ نے سندھ جانے سے انکار کردیا۔ باغی سپاہیوں کو واپس لایا گیا اور سرغنوں کو سزا دی گئی۔ 64ویں رجمنٹ کو نشان سے محروم اور 34ویں کو خدمت سے سبکدوش کردیا گیا۔ بنگال کے محافظ دستوں کی جگہ مدراس اور بمبئی کے دستے مقرر کئے گئے۔ پھر بھی بنگال کی فوج کا ڈسپلن بری طرح مجروح ہو چکا تھا۔

سندھ میں بھڑکنے والے شعلے ابھی پوری طرح بجھ بھی نہیں پائے تھے کہ بہار میں ہنگامہ شروع ہوگیا۔ پٹنہ جہاد کی تحریک کا مرکز رہ چکا تھا۔ اب مولوی فوج کے مسلمان سپاہیوں کو کمپنی کی ملازمت ترک کرنے اور جہاد میں شریک ہونے کی ترغیب دے رہے تھے۔ سکھوں سے ہونے والی جنگ کی غرض سے برطانوی فوجیں مشرق کی چھاؤنیوں سے ہٹا کر شمال مغربی سرحد کے قریب جمع کی جارہی تھی۔

یہ خبر فوج میں پھیلائی گئی جس سے اُن کے اشتعال میں اضافہ ہوگیا۔ اُس کے بعد خفیہ مذاکرات ہوئے اور سپاہیوں کو اس امر کا یقین دلایا گیا کہ وہ کمپنی کی ملازمت اگر ترک کردیں تو دہلی کا بادشاہ انھیں ملازم رکھ لے گا۔ جو کچھ ہورہا تھا اُس کی رپورٹ انگریز کمانڈرنگ آفیسر کو اور اُس کے ذریعے حکومت کو بھیجی گئی۔ ملزموں پر مقدمہ چلایا گیا اور انھوں نے اپنی ناسمجھی کی سزا پائی۔ بنگال کے گورنر نے ایک اعلان جاری کیا جس میں لوگوں کو یقین دلایا گیا تھا کہ حکومت کسی کے مذہب میں مداخلت کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی ہے۔ سکھوں کے خلاف برطانوی فوجوں کی کامیابیوں نے اُن کے وقار کو بحال کردیا اور اشتعال رفتہ رفتہ ختم ہوگیا۔

اُس کے بعد یہ منظر پنجاب میں نظر آیا جہاں سکھوں کے خلاف جنگ میں بنگال کی فوج نے کارہائے نمایاں انجام دئے تھے۔ لیکن سپاہیوں کو اس بات نے بددل کر دیا تھا کہ فتح سے کسی قسم کا فائدہ ہونے کے بجائے انھیں حقیقت میں بھتے کا نقصان برداشت کرنا پڑا تھا۔ جن رجمنٹوں پر اس کا اثر پڑا تھا انھوں نے آپس میں مشورہ کیا، ایک چھاؤنی سے دوسری چھاؤنی کو پیغامبر بھیجے اور حکم عدولی کا فیصلہ کیا۔ راولپنڈی میں مقیم 22ویں رجمنٹ نے تنخواہ لینے سے انکار کر دیا اور وزیر آباد اور جہلم میں مقیم رجمنٹوں نے بھی اس قسم کا رویہ اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ کمانڈر ان چیف سر چارلس نپیر نے علاقے کا دورہ کیا اور اُسے اس قسم کے ناقابل تردید ثبوت ملے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ کئی رجمنٹوں نے مل کر فیصلہ کیا ہے کہ جب تک تنخواہ میں اضافہ نہ کیا جائے وہ پنجاب میں اپنے فرائض ادا نہیں کریں گے۔ ہوا میں بغاوت کی بو تھی۔ شورش وزیر آباد میں شروع ہوئی اور اُس کے بعد گونڈ گڑھ میں بھی پھیل گئی جہاں 66ویں رجمنٹ تھی۔ لیکن نپیر کے فوری اور سنگ دلانہ اقدامات بغاوت کو فرو کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بے چینی دور کرنے کی غرض سے بھتوں کے معاوضے کی اونچی شرح مقرر کی گئی اور گورکھوں کو بھرتی کیا گیا جنھوں نے دوآبے کے برہمنوں کی جگہ لے لی۔

چنانچہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی پہلی صدی میں بڑھتے ہوئے دکھوں اور تکلیفوں کا زمانہ تھا۔ پرانے حکمراں طبقے محسوس کرتے تھے کہ اُن کی زندگی رنگ و نور سے محروم ہو گئی ہے۔ نمایاں کارناموں اور جرأت آمیز مہموں کے مواقع ختم ہو چکے تھے جن سے زندگی کی مسرتیں عبارت تھیں۔ ہندوستان کے پیش نظر حقیقت میں ایک اُداس منظر تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے ملحقہ مکانوں میں رہتا تھا اور سردی سے ٹھٹرا کرتا تھا جب کہ اُس کے بدیسی آقا و مالک اُن گرم و کشادہ محلوں میں رہتے تھے جو خود اُس نے تعمیر کئے تھے۔ اُس کا حال غیر یقینی تھا اور مستقبل مشکوک اس لئے وہ اُن حاکموں کے سامنے عاجزی اور انکساری کا مظاہرہ کرتا تھا اور چاپلوسی سے کام لیتا تھا جو اُس کی قسمت کے مالک تھے۔ اُسے اُن پالیسیوں کی تشکیل میں حصہ لینے سے محروم کر دیا گیا تھا جو اُس کے تقدیر کا فیصلہ کرتی تھیں اور حکم اور اختیار کی حیثیت چھن جانے کی بنا پر وہ سیاسی طور سے حقیر اور اخلاقی اعتبار سے پستہ قامت ہو کر رہ گیا تھا۔ اُس سے پہلے کی تاریخ میں کوئی ایسی مثال

نہیں ملتی جب وہ اس حد تک ذلیل وخوار ہوا ہو۔ اُس نے زنجیریں توڑنے کی بڑی کوششیں کیں۔ ان سو برسوں کی بغاوتیں اور شورشیں اس امر کا ثبوت مہیا کرتی ہیں کہ وہ آزادی حاصل کرنے کا خواہش مند تھا لیکن اُس کی ناکامیوں نے اُس کی کوتاہیوں کو واضح کر دیا۔ الگ الگ کی جانے والی ایسی کوششوں کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں تھا جن کی وجہ تحریک سماجی خوشحالی اور عام بھلائی کے محدود و سطحی تصورات تھے۔ 1857 کی بغاوت، جس کو ان کوششوں کا نقطہ عروج کہنا چاہئے، وسطی نظام کی آخری جدوجہد تھی۔ لیکن یہ پچھلی کوششوں سے مختلف تھی اس لئے کہ اس میں وہ تمام تحریکیں اور مقاصد شامل تھے جنھوں نے گزشتہ بغاوتوں اور شورشوں کو جنم دیا تھا اور قریب قریب پورے ہندوستان پر محیط تھی۔

دوسرا باب

1857 کی بغاوت

I۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کی نوعیت

جس وقت ڈلہوزی اپنے عہدے سے سبکدوش ہوا ہندوستان میں برطانوی حکومت اپنی فطری حدوں کو پہنچ چکی تھی۔ مغرب سے مشرق کی طرف یہ دریائے سندھ سے ایراودی تک پھیلی ہوئی تھی اور شمال سے جنوب کی طرف ہمالیہ سے بحر ہند تک فتح کئے ہوئے ان وسیع علاقوں میں برطانوی سامراجی اہلیت نے حکومت کا ایک ایسا نظام بنایا جو دو مقاصد پورے کرتا تھا۔ ایک طرف تو اس نے مزاجیت سے نجات دلائی جو اٹھارھویں صدی میں ہندوستان میں پائی جاتی تھی، امن قائم کیا اور جان و مال کی حفاظت کا انتظام کیا اور ہندوستان کے لوگوں کے سیاسی اتحاد کے لئے سازگار حالات پیدا کئے۔ دوسری طرف انگریزوں نے ایک ایسی سلطنت پائی جس کی وسعت، دولت وسائل بے مثال تھے اور جس نے ایک چھوٹے سے جزیرے تک محدود برطانوی سلطنت کو دنیا کی قیادت کا منصب عطا کر دیا۔ اُس مہم کو جو سولہویں صدی میں دولت اور طاقت حاصل کرنے کی غرض سے تجارتی جذبے کے تحت شروع کی گئی تھی اتنی بڑی کامیابی نصیب ہوئی جس کی مثال پیش کرنے سے تاریخ قاصر ہے۔

اس غیر معمولی واقعہ کے تین مرحلے تھے۔ پہلے مرحلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرگرمیاں تجارت تک محدود تھیں۔ دوسرے مرحلے میں کمپنی نے دوسرے یوروپی رقیبوں کے ساتھ جنگیں کیں۔تجارت میں اپنی اجارہ داری قائم کی اور ہندوستان میں سیاسی اثر حاصل کیا۔

تیسرے مرحلے میں جو جنگ پلاسی سے شروع ہوتا ہے، کمپنی نے تجارت کے ساتھ فتوحات بھی شروع کردیں اور دونوں میں توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کی۔ اُس نے ایک وسیع علاقہ حاصل کرلیا جو قدرتی وسائل سے مالا مال تھا اور جہاں صابر و شاکر محنتی اور فرماں بردار کسانوں اور دست کاروں کی ایک بڑی تعداد آباد تھی۔ بنگال سے ہونے والی آمدنی نے نہ صرف مزید فتوحات کے لئے ساز وسامان مہیا کیا بلکہ منافع بخش بدیسی تجارت میں لگانے کے لئے نقد سرمایہ سے اور کم سے کم جانی نقصان کے ساتھ انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان کے بڑے حصے پر تسلط جمالیا۔

جب کمپنی اپنے تجارتی موقف سے دست بردار ہوئی تو تجارت سے منافع حاصل کرنے کا حق سب انگریزوں کو دے دیا گیا۔لیکن کمپنی نے علاقوں کی مزید توسیع سے اپنے نقصان کی تلافی کرلی۔ اس پوری کی پوری طویل مدت میں یورپی طاقتوں کے ساتھ تصادم اور فضول خرچ اور کمزور ہندوستانی حکمرانوں کے ساتھ جنگوں میں منافع کا جذبہ ایک اہم عنصر رہا ہے۔اس کے علاوہ نئے نئے علاقوں میں بڑی کشمکش تھی۔ یہ واقعہ کہ آسانی سے انھیں حاصل کیا جاسکتا تھا، ہندوستان کے مزید شاداب علاقوں کو سلطنت میں شامل کرنے کے لئے وجہ تحریک بن گیا تھا۔لیکن آمدنی میں اضافہ کی خواہش کے ساتھ جزرسی کی خواہش بھی تھی جو کبھی احمقانہ حدوں تک پہنچ جاتی تھی۔

لارڈ ہیسٹنگز، ایلن برو اور ڈلہوزی کی جارحانہ جنگیں، ہندوستانی حکمرانوں کی بد انتظامی کو بہانہ بنا کر کئے جانے والے الحاقات اور ولی عہدوں کو گود لینے کے طریقے کو تسلیم نہ کر کے علاقوں پر عمل دخل حاصل کرنا۔ان سب کے پیچھے علاقے حاصل کرنے کی خواہش کارفرما تھی۔ ڈزرائلی نے تسلیم کیا تھا کہ انگریزوں کی پالیسی ہے۔''اپنے علاقے کی توسیع کر کے سلطنت کی آمدنی بڑھانا۔''[1] مٹکاف نے ان لفظوں میں پالیسی کی تشریح کی تھی ''جن خطرات کا ہمیں اس وقت

---

[1] ہاؤس آف کامنز میں ڈزرائلی کی تقریر جو 72 جولائی 7581 میں کی گئی۔ از ہنسرڈ، پارلیمانی مباحثہ cxlvii کالم 944

سامنا کرنا پڑ رہا ہے اُن سے زیادہ خطرات میں ہمیں ڈالے بغیر ہندوستان کے وسط میں جو بھی علاقہ حاصل کیا جائے گا وہ اُس سرحد کی لمبائی کو کم کر دے گا جس کی ہمیں حفاظت کرنی پڑتی ہے یا قریب قریب بنگال کی فوجوں کے دوسری پرسیڈیوں کی فوجوں کے ساتھ روابط کو کم کر دے یا فوجوں کی تنخواہیں دینے کے لئے مزید آمدنی مہیا کر دے گا۔ اس لئے علاقہ میں اضافے کو بُرا سمجھ کر اُس سے بچنے کے بجائے جہاں کہیں بھی وہ جائز طور سے حاصل کیا جا سکتا ہو ہمیں اُسے تحفظ اور طاقت کے ایک ذریعہ کے طور پر حاصل کرنا چاہئے۔''[1] ڈلہوزی نے جو ''زائل ہونے'' کی پالیسی کا معمار اعظم تھا، خود 30 اگست 1848 کو لکھا تھا ''میرے خیال میں یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی شخص اس پالیسی سے اختلاف کر سکے کہ ہمیں اُن ریاستوں پر قبضہ کر کے جن کا حق زائل ہو جائے اپنے علاقوں کے استحکام کی غرض سے ہر جائز موقع سے فائدہ اٹھانا چاہئے۔ اس طرح اُن چھوٹی چھوٹی درمیانی ریاستوں سے ہمارا پیچھا کٹ جائے گا۔ جو نا گواری کا ذریعہ بنائی جا سکتی ہیں۔'' [2] چنانچہ اُس نے ''اس اصول کا اعلان کیا کہ اب بھی موقع ملے دیسی حکمرانوں کو ختم کر دیا جائے۔''[3]

الحاق کو جائز قرار دینے کے لئے انگریزوں نے ہندوستانی حکمرانوں کی ناقابل برداشت بد دیانتی اور بد انتظامی اور کچلے ہوئے عام لوگوں کے انتہائی دکھوں اور تکلیفوں کی بنیاد پر خود کو مطمئن کر لیا۔ لیکن حقیقت برنارڈ شاہ کے جو شیلے الفاظ میں بیان کی گئی ہے۔ ''ہر انگریز کچھ ما فوق الفطرت طاقت لے کر پیدا ہوتا ہے جو اُس کو دنیا کا آقا بنا دیتی ہے۔ جب وہ کسی چیز کا خواہش مند ہوتا ہے تو وہ خود سے کبھی نہیں کہتا کہ وہ اُس چیز کو حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ بڑے صبر و تحمل کے ساتھ اُس وقت تک انتظار کرتا ہے جب تک، نہ جانے کیسے، اُس کے دماغ میں یہ بات بیٹھ نہ جائے کہ مطلوبہ شے جن لوگوں کے پاس ہے اُن کو فتح کرنا اُس کا اخلاقی اور مذہبی فرض

---

[1] کے جی ڈبلیو Life & Correspondanceof Charles, Lard Metalf جلد دوم، (London 1854) صفحہ 446

[2] دیکھیے کے اور میلسن History ofthe Indian Matiny (Longmans, 1897) جلد 1 صفحہ 53

[3] سر چارلس وڈ کا خط لارڈ ایلگن کے نام، 17 اکتوبر 1862 (Indian Office Library-MS Vol. xi)

ہے۔ اُس کے لئے وہ ناقابل مزاحمت ہوجاتا ہے۔ طبقۂ اشراف کے ایک فرد کی حیثیت سے وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جس چیز کو پسند کرتا ہے اُسے چھین لیتا ہے۔ ایک دکاندار کی طرح وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے اُس محنت اور ثابت قدمی سے کام کرتا ہے جو کٹر مذہبی اذعان اور اخلاقی ذمہ داری کے گہرے جذبے کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اُسے موثر اخلاقی رویے کی تلاش میں کبھی کوئی دقت نہیں ہوتی ہے۔ کوئی کام نہ اتنا برا ہے نہ اتنا اچھا کہ انگریز اُسے نہ کرسکے۔ لیکن انگریز کبھی غلطی پر نہیں ہوگا۔ وہ آپ سے لڑتا ہے تو حب الوطنی کے اصولوں کے مطابق، وہ آپ کی چوری کرتا ہے تو تجارتی اصولوں کے مطابق، وہ آپ کو محکوم بناتا ہے تو سامراجی اصولوں کے مطابق، وہ آپ کو پریشان کرتا ہے تو مردانگی کے اصولوں کے مطابق، وہ وفاداری کے اصولوں کے مطابق اپنے بادشاہ کا سر کاٹ لیتا ہے۔ اُس کا نعرہ ہے فرض شناسی اور وہ یہ بات کبھی نہیں بھولتا ہے کہ جو قوم اپنے فرض کو اپنے مفاد کے خلاف بن جانے دیتی ہے وہ ختم ہوجاتی ہے۔‘‘[1]

الحاقات کی بنا پر کمپنی کی آمدنی تو بڑھ گئی لیکن جلد ہی اخراجات میں بھی اضافہ ہوگیا اور ڈائرکٹر اپنے منافعوں کے لئے تشویش میں مبتلا ہوگئے۔ اس لئے انھوں نے کفایت شعاری سے کام لینے کا حکم جاری کیا۔ کفایت شعاری سے کام لیتے وقت نتائج پر توجہ دی گئی۔ ان اقدامات میں دیسی حکمرانوں کو دی جانے والی پینشنوں کی تنسیخ یا تخفیف بھی شامل تھی۔ اس کی واضح مثالیں تھیں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بیوہ ملکہ رانی جندن کور کی پینشن 15000 پاونڈ سے گھٹا کر 12000 پاونڈ کردی گئی۔ پیشوا باجی راؤ دوم کے پسر متبنّیٰ نانا صاحب کی پینشن منسوخ کردی گئی، جھانسی کی رانی لکشمی بائی کی پینشن بند کردی گئی اور کرناٹک اور تن جور کے اخراجات میں کمی اور حکومت کی آمدنی میں اضافہ کرنے کے لئے قدیم خاندانوں کی جاگیریں اور انعام چھین لئے گئے جنھوں نے ہندوستانی حکمرانوں کی خدمات انجام دی تھیں۔

سماجی بہبود کے کاموں میں بھی کفایت شعاری برتی گئی۔ 1813 میں تعلیم کے لئے 10,000 پانڈ کی حقیر رقم منظور کی گئی تھی۔ لیکن صحت عامۂ طبی سہولت، قحط کے دوران راحت پہنچانے اور اس قسم کے دوسرے کاموں کے لئے رقم منظور نہیں کی گئی۔ تعلیم کے لئے جو رقم

---

[1] شاہ برنارڈ جی The man of Destiny (اڈیشن 1929) صفحات 200-201

منظور کی گئی تھی وہ بھی کئی سالوں تک خرچ نہ کی جا سکی۔

لیکن کفایت شعاری کی بدتر مثال تھی فوجی اخراجات میں کمی۔ ہندوستانی سپاہیوں کی مدد سے ہندوستان فتح کیا گیا تھا اور امن و امان بحال رکھنے کی ذمہ داری بڑی حد تک ہندوستانی فوجوں پر تھی۔ ہندوستانی سپاہی ایران، افغانستان، سندھ اور برما میں لڑ چکے تھے اور کریمیا میں لڑنے کے لئے انھیں بھیجنے کی تجویز پر بھی غور کیا گیا تھا۔ ہر میدان جنگ میں وہ اپنی وفاداری، بہادری اور ضبط و نظم کا وافر ثبوت پیش کر چکے تھے۔ وہ نمک حلال تھے، آقاؤں کے وفادار تھے اور افسروں کے جاں نثار تھے۔ لیکن کمپنی کی نظروں میں اُن کی سب سے بڑی خوبی تھی کم تنخواہیں اور روپئے کی لالچ میں فوج میں بھرتی ہونا۔ اس لئے اُن کی طرف سے کوئی سیاسی خطرہ نہیں تھا۔

ایک ہندوستانی سپاہی پر جو رقم خرچ کی جاتی تھی وہ برطانوی سپاہی پر خرچ کی جانے والی رقم کا ایک تہائی حصہ تھی۔ اس کفایت شعاری کا نتیجہ تھا کہ 1856 میں مجموعی اعتبار سے کمپنی کی تقریباً تین لاکھ فوج میں صرف 24 رائل رجمنٹیں تھیں جو مجموعی اعتبار سے 23000 سپاہیوں پر مشتمل تھیں۔ اور اتنی ہی تعداد میں یورپیوں کو ہندوستان میں بھرتی کیا گیا تھا۔[1] ظاہر ہے کہ یہ بڑے جوکھم کی بات تھی۔ برطانوی مدبرین دہری مشکل میں تھے یعنی سلطنت کی حفاظت و توسیع کے لئے ایک بڑی فوج کی موجودگی اور صحت مند عوامی مالیات اور تجارتی منافع اور لاگت کے دعوؤں میں مطابقت کیسے پیدا کی جائے۔ مختلف گورنر جنرل کبھی ایک راستہ اختیار کرتے تھے اور کبھی دوسرا۔ دونوں صورتوں میں کفایت شعاری کا خیال فیصلہ کن عنصر ہوتا تھا۔

حکومت کے سول شعبہ میں بھی معاملہ کچھ ایسا ہی تھا۔ انگریز حکام کی تعداد کم تھی۔ لیکن وہ اختیار، رہنمائی اور نگرانی کے تمام عہدوں پر فائز تھے۔ اُن کی تنخواہیں دنیا میں سب سے زیادہ تھیں۔ وہ ہندوستانی ماتحتوں کی ایک بڑی فوج کے ذریعے کام کرتے تھے جن کی تنخواہیں بہت کم تھیں اور جن کے عہدوں پر کم حیثیتی کی چھاپ لگی تھی۔

ایسی سلطنت جس کے غالب مفادات معاشی ہوں تاریخ کے لئے کوئی نیا واقعہ نہیں تھی۔ لیکن انگریز اپنے کو اتنا پاک باز سمجھتے تھے اور اپنی نام نہاد پاکبازی کی بنا پر اتنے مطمئن تھے کہ

---

[1] ہومس۔ ٹی۔ رائس A History of Indian Mutiny (London, 1888) صفحہ 62

انھوں نے سلطنت کے انسانی مضمرات پر کبھی سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا۔ اس میں شک نہیں کہ اُن میں سے کچھ ہندوستان کے تعلق سے حکومتی خود اختیاری کی دور افتادہ منزل کی بات کرتے تھے لیکن دو صدی تک ہندوستان سے رہنے والے رشتے کے دوران میں سے زیادہ تر اعمال و افعال سے اُس منزل تک پہنچنے کی خواہش کا اظہار بہت کم ہوا۔ اُن میں سے کچھ اس غیر فطری صورت حال سے پریشان ضرور تھے لیکن وہ بھی برطانوی حکومت کے غیر محدود تسلسل کے علاوہ کچھ اور نہیں سوچ سکتے تھے۔

طوفان سے پہلے کی خاموشی

جب ڈلہوزی کی مدت کار ختم ہوئی تو اس کی جگہ لینے کے لیے کیننگ کا انتخاب کیا گیا۔ وہ اوّل درجے کا کلاسیکی عالم تھا اور اس نے برطانوی سردار کر کیٹکس کے متعلق جو رومن سلطنت کی عظمت و جلال سے ٹکرایا تھا، لاطینی میں ایک نظم لکھ کر آکسفورڈ میں انعام حاصل کیا تھا۔ اس کے اعزاز میں کمپنی کے ڈائرکٹروں نے الوداعی دعوت کی تھی اس میں جام صحت کا جواب دیتے ہوئے اس نے عجیب وغریب تقریر کی جو اُن الجھنوں اور پریشانیوں کی آئینہ داری کرتی ہے جو اُس زمانے میں انگلستان کے حکمراں طبقے میں پائی جاتی تھیں۔ اُس نے حسب دستور ایک ایسے خود اعتماد گورنر جنرل کی طرح تقریر شروع کی جس کے جذبات کو اُس منظر نے برافروختہ کر دیا تھا جس کی مثال دنیا میں کوئی تاریخ پیش نہیں کر سکتی یعنی ''ڈیڑھ سو ملین لوگ پر امن انداز میں اور دلجمعی کے ساتھ، ایک ایسے ملک میں جو دولت سے بھرا ہوا ہے، بدیسیوں اور اجنبیوں کی حکومت کی اطاعت کرتے ہیں۔'' لیکن جوں جوں وہ آگے بڑھا اس کے دل میں شک وشبہ پیدا ہونے لگا۔ ایسا لگا کہ خود اعتمادی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ وہ سنجیدہ ہو گیا اور بات کرنے میں احتیاط سے کام لینے لگا۔ اس نے کہا ''مجھے معلوم نہیں کہ حالات کیا شکل اختیار کریں گے۔ مجھے امید ہے اور میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ ہمیں جنگ کی آخری منزل تک نہ جانا پڑے۔'' اُس کے بعد اس نے سنجیدگی کے ساتھ تقریر جاری رکھتے ہوئے کہا ''ہمیں یہ نہ بھولنا چاہئے کہ ہندوستان کے مطلع پر، جو ابھی صاف ہے، بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا نظر آ سکتا ہے جو شروع میں انسان کے بالشت سے بڑا نہ ہو لیکن برابر بڑھتا جائے اور بالآخر اُس کے پھٹ

پڑنے اور ہمیں تباہی سے دوچار کردینے کا خطرہ پیدا ہوجائے۔'' آخر میں اُس نے دھمکی دی ''اگر اپنی کوششوں کے باوجود ہمارے لئے ضرب لگانا ضرری ہوگیا تو ہم پاکئ ضمیر کے ساتھ ضرب لگائیں گے۔اس قسم کی ضربوں کی صورت میں جدوجہد کم مدت میں ختم ہوجائے گی اور اُس کے نتیجے کے متعلق کسی قسم کے شک وشبے کی گنجائش نہیں ہوگی۔''[1]

کون جانے کہ ہندوستان کے متعلق دستاویزات کا مطالعہ کرتے وقت کیننگ نے سلطنت کی نوعیت پر غور بھی کیا اور اُسے یہ خیال بھی آیا کہ ہندوستان کی سلطنت کا مقابلہ اُن دوسلطنتوں سے کرلے جنھوں نے انگلستان کو غلامی کی زنجیروں سے جکڑ دیا تھا یعنی رومن سلطنت جو ایسی حکومت کی نمائندگی کرتی تھی جس نے وطن سے دور کے علاقوں پر اپنا تسلط جمالیا تھا اور نارمن حکومت جس کے فاتحین نے مفتوحہ علاقوں میں سکونت اختیار کرلی تھیں۔

سلطنتوں کا حشر کیا ہوا اس کے متعلق کیننگ کے خیالات کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں ہے لیکن ہم یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ وہ ہندوستان میں پائی جانے والی عام بے چینی سے واقف تھا اور جانتا تھا کہ وہ کوئی بری شکل اختیار کرسکتی ہے۔جو خطرناک صورتحال ہندوستان میں پیدا ہورہی تھی وہ سلطنت کی نوعیت کا لازمی نتیجہ تھی۔حالات مختلف ہونے کی وجہ سے ہندوستان میں انگریز اگرچہ وہ سب نہیں کرسکتے تھے جو انگلستان میں نارمنوں نے کیا پھر بھی شہنشاہی روم کے نقش قدم پر تو چل ہی سکتے تھے اور ہندوستان کو ایک ایسی دودھاروگائے سمجھنے کے بجائے ،جس کو انگلستان کے مفاد میں استعمال کیا جائے، وہاں کے لوگوں کی معاشی اور سیاسی ضرورتوں پر تو غور کرسکتے تھے۔ لیکن بدقسمتی سے ان باتوں کو نظرانداز کردیا گیا جس کے نتیجے میں 1857 کے موسم گرما میں انھیں نفرت اور عداوت کی افسوسناک فصل کاٹنی پڑی۔

II شورش کی نوعیت

برطانوی مورخین کے مطابق 1857 کی شورش غدر تھی۔واقعہ یہ ہے کہ اس کی ابتدا اس زمانے کی حکومت کی طرف سے ہوئی۔اس زمانے کے سکریٹری آف اسٹیٹ لرل اسٹینسلی نے

---

[1] کے اور فلپس۔محولہ بالا،جلد 1،صفحہ 277-278

1857 کے واقعات کی رپورٹ پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرتے ہوئے ''غدر'' کی اصطلاح استعمال کی تھی۔ اس موضوع پر لکھنے والے زیادہ تر مصنفین نے اس کی پیروی کی۔ چنانچہ چارلس بال، جی۔ ڈبلیو۔ فارسٹ، ٹی۔ آر۔ ہولس، ایم۔ انس، جے۔ ڈبلیو۔ کے، جی۔ این۔ میک من، جی۔ بی۔ مِلن، سی۔ ٹی۔ ٹکاف، ارل رابرٹس اور دوسرے لکھنے والوں نے اس شورش کے لئے ''غدر'' کی اصطلاح استعمال کی۔

بہرحال یہ اصطلاح گمراہ کن ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس بغاوت میں فوج بڑے پیمانے پر شامل تھی۔ یہ بھی سچ ہے کہ اس کی تحریک بنگال کی فوج کی طرف سے ہوئی حالانکہ دوسرے صوبوں کی کچھ اور رجمنٹوں میں بھی بے چینی پائی جاتی تھی۔ لیکن اس کی ابتدا فوج تک محدود نہیں تھی۔ نہ یہ عام اصطلاحی معنوں میں غدر تھا یعنی مسلحہ آداب سے روگردانی اور آئینی ارکان اختیار کی حکم عدولی۔ اس کی وجوہ ان اسباب سے زیادہ گہری تھیں جو عام طور سے فوجی ڈسپلن توڑنے کے واقعات کی تہہ میں پائے جاتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ ڈزرائلی نے اس شورش کی اصل نوعیت کو سمجھ لیا تھا۔ ہاؤس آف کامنز میں 27 جولائی 1857 کو تقریر کرتے ہوئے اس نے حکومت کی رائے سے اختلاف کیا اور کہا کہ یہ تحریک ''فوجی غدر'' کے بجائے ایک ''قومی بغاوت'' ہے[1]۔ پھر انگلس میری میں 30 ستمبر 1857 کو تقریر کرتے ہوئے اس نے زور دے کر کہا ''میرا خیال ہے کہ اب یہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ ہندوستان میں رونما ہونے والی افسوسناک اور غیر معمولی تحریکات کی جو توضیح ابتدا میں کی گئی تھی وہ واقعات کے مطابق نہیں تھی۔ روز بروز یہ بات واضح ہوتی جا رہی ہے کہ جس کو ابتدا میں ایک چھوٹا سا اتفاق واقعہ بتایا گیا تھا وہ حقیقت میں اُن عظیم حادثات میں سے ایک ہے جو انسانی تاریخ کا ایک دور تشکیل کرتے ہیں جن کی توجیہ کرنے کے لئے مدبروں اور قوموں کی انتہائی گہری توجہ درکار ہوتی ہے۔''[2]

---

[1] ہاؤس آف کامنز میں ڈزرائلی کی تقریر جو 27 جولائی 1857 میں کی گئی۔ Hansard Parlimentary Vol. CXLVH کالم 440-441

[2] بال سی، The History of Indian Mutiny (London) جلد 11 صفحہ 418

ایلین برونے جو 1858 میں بورڈ آف کنٹرول کا صدر مقرر ہوا تھا، لارڈ کینگ کے اس اعلان پر تنقید کرتے ہوئے، جس کی رو سے اودھ کی تعلقداریاں ضبط کرلی گئی تھیں، لکھا تھا ''ہمیں اس امر کا اعتراف کرنا چاہئے کہ وہاں پائے جانے والے حالات کے پیشِ نظر اودھ میں جو جارحانہ کاروائیاں ہوئیں اُن کو غدر کے بجائے ایک جائز جنگ سمجھا جانا چاہئے۔''[1]

جسٹس میک گارتھی نے اس موضوع کے گہرے مطالعہ کے بعد لکھا تھا ''واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے عظیم جزیرہ نما کے شمال اور شمال مغرب میں انگریزی حکومت کے خلاف دیسی نسلوں نے بغاوت کی تھی۔ اس کو کسی طرح بھی محض فوجی غدر سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا۔ ہندوستان پر انگریزوں کے قبضے کے خلاف یہ فوجی شکایتوں، قومی نفرت اور مذہبی تعصب کا ایک مشترکہ محاذ تھا۔ اس میں دیسی حکمراں بھی شامل تھے اور دیسی سپاہی بھی عیسائیوں کے خلاف متحد ہونے کے لئے مسلمانوں اور ہندوؤں نے اپنے قدیم مذہبی اختلافات کو بھلا دیا تھا۔''[2]

چارلس بال نے مندرجہ ذیل الفاظ میں رونما ہونے والے واقعات کا ذکر کیا ہے ''بالآخر دھارا کناروں سے گزر گیا اور ہندوستان کی اختلافی سرزمین پر پھیل گیا۔ اس کے بعد یہ توقع تھی کہ موجیں تمام یورپی عناصر کو غرقاب اور تباہ کردیں گی اور یہ کہ بغاوت کا دھارا جب ایک دفعہ پھر کناروں کی آغوش میں سمائے گا تو بدیسی حکمرانوں کی محکومی سے آزادی حاصل کرکے حریت پسند ہندوستان محض کسی آزاد دیسی حکمراں کے سامنے اپنا سر جھکائے گا۔ اب اس تحریک نے زیادہ اہم صورت اختیار کرلی تھی۔ اور وہ تمام لوگوں کی بغاوت بن گئی تھی۔''[3]

دو آزاد فرانسیسی مصنفین کی رائے تھی ''ہندوستان میں قتلِ عام کا لمحہ قریب آتا جارہا ہے۔ ہندوستان کی آبادی کے تمام طبقات میں بے چینی پھیل چکی ہے۔ وہ سپاہیوں کا ساتھ دیں گے۔''[4]

---

[1] Secret Committee of the court of direction to governer generel 19 اپریل 1858

[2] میک گارتھی، جسٹس، A Short History of our own times (London) 1883، صفحہ 644

[3] بال، محولہ بالا، جلد 1، صفحہ 644

[4] Tonvielle et Leganlt, I' insurrection de'l inde مہدی حسن، بہادر جلد دوم (دہلیا 1958)، تعارف، صفحہ 1

بہادر شاہ کے مقدمے کی پیروی کرنے والا جج ایڈوکیٹ جنرل ہریٹ میجر سماعت کے وقت پیش کی جانے والی دستاویزات کے گہرے مطالعہ کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا ''ابتدا سے یہ سازش سپاہیوں تک محدود نہیں تھی۔ اس کو جنم بھی سپاہیوں نے نہیں دیا بلکہ اس کی شاخیں محل اور شہر میں پھیلی ہوئی تھیں۔''[1]

ونسنٹ اسمتھ کو بھی تسلیم کرنا پڑا کہ ''سول آبادی میں بے چینی اور بے اطمینانی بڑے پیمانے پر پائی جاتی تھی اور کئی مقامات پر وہاں مقیم سپاہیوں کی بغاوت سے پہلے لوگوں نے بغاوت کر دی۔''[2]

کیننگ نے بھی اُس وقت اپنی رائے بدل دی جب اُس نے سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کو لکھا کہ اُسے اس بات میں کوئی شک وشبہہ نہیں ہے کہ ''بغاوت'' کے لئے اشتعال ''مذہبی بنیادوں پر برہمنوں نے اور سیاسی وجوہ کی بنا پر دوسروں نے دی'' اور اینڈ ملیسن کے مطابق ''اُس نے جلد ہی غدر کی بات کرنا چھوڑ دی اور اسے بغاوت سے تعبیر کرنے لگا۔''[3]

چنانچہ یہ تو مناسب نہیں معلوم ہوتا ہے کہ 1857 کے واقعات کو ''غدر'' سے تعبیر کیا جائے۔ لیکن کیا اُنہیں ''قومی جنگ آزادی'' کہا جا سکتا ہے؟

یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ انگریزوں کے خلاف جنگ کا محرک کوئی قومیت کا جذبہ نہیں تھا اس لئے کہ 1857 میں ہندستان کو سیاسی اعتبار سے ایک قوم نہیں کہا جا سکتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں نے مل کر حصہ لیا لیکن دونوں فرقوں کے قائدوں اور اُن کے ساتھیوں نے ایک مشترک مادر وطن کی وفاداری کے بجائے ذاتی وفاداریوں سے تحریک پائی۔ اس کے باوجود 1857 کی شورش ہندوستان کو بدیسیوں کی غلامی سے نجات دلانے کی جنگ تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بدیسیوں نے حکمراں طبقے کے وقار اور عزت نفس کو بری طرح مجروح کر دیا تھا۔ یہ طبقہ تھا جو ایک زمانے میں سماجی اثر رکھتا تھا اور نظم ونسق کا بوجھ اٹھا چکا تا۔ بدیسیوں نے مال گزاری کی

---

1. Preceedings of the trical of Bahadur Shah (Calcutta,1899) صفحہ 145
2. Oxford History of India (1920 کا ایڈیشن)، صفحہ 722
3. کے اینڈ ملیسن، محولہ بالا، جلد 1، صفحات 452-453

ظالمانہ پالیسی کی بنا پر اور ان معاشی اقدامات کی بنا پر، جن کی وجہ سے فنون اور دست کاریاں تباہ ہوگئی تھیں، عام لوگوں کو بھی اپنا مخالف بنالیا تھا۔

آگرہ کے کمشنر ہارڈ لے نے 17 نومبر 1857 کو لکھا تھا ''اس بغاوت کی ابتدا نہ محض مسلمانوں کی طرف سے ہوئی نہ صرف ہندوؤں کی۔ اس کو جاری بھی کسی ایک فرقے نے نہیں رکھا۔ اس قسم کے اسباب ہمیشہ پائے جاتے تھے جو اس کی توضیح کے لیے کافی ہیں۔ حالات اور مواقع اور پرفریب کذب وافترا نے مسلمانوں کو شورش پر آمادہ کیا تاکہ وہ اُس کا بدلہ لے سکیں جسے اُن کے مذہب کی توہین سے تعبیر کیا گیا تھا۔ ایک پراسرار ہندو پیشن گوئی نے، جسے بڑے پیمانے پر پھیلا گیا، اُس مذہب کے غیر مطمئن پیروؤں کو ہونے والے غدر اور بغاوت میں حصہ لینے پر آمادہ کردیا۔''[1]

ٹرولین کی شہادت بھی دیکھیے۔ اُس نے کہا ہے ''بڑے ہوں یا چھوٹے، دولت مند ہوں یا غریب اُن میں ہر ایک محض اپنے سیاسی حالات کو سدھارنا چاہتا تھا۔ سماج بالائی طبقے میں اپنی پہلی سی اہمیت دوبارہ حاصل کرنے کی امید پر زندہ تھے۔ نچلے طبقے اس امید پر زندہ تھے کہ دیسی حکومت کے دوبارہ قیام کے بعد دولت وعزت کے راستے اُن پر ایک دفعہ پھر کھل جائیں گے۔''[2]

فی الجملہ 1857 کی بغاوت زوال کے سلسلے کو روکنے اور کھوئی ہوئی حیثیت کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش تھی جسے عہدِ وسطیٰ کے نظام کی آخری کوشش کہنا چاہیے۔ اس میں شک نہیں کہ وہ نظام زوال پذیر تھا۔ بہر حال یہ اپنی سیاسی تنظیم کی قوت کو بحال رکھنے اور بیرونی حملوں کے سیلاب کو روکنے میں ناکام رہا تھا حالانکہ انیسویں صدی کے وسط تک پریسیڈنسی شہروں کے باہر اس کی عزت ووقار میں کمی نہیں ہوئی تھی۔ مغربی اقتدار کے زیر اثر ہندوستان کے سماجی نظام میں کوئی بڑی تبدیلی ابھی تک نہیں آئی تھی اور بالائی طبقوں کو ابھی تک لوگوں کے قائد اور ہندوستان کے مفادات کا نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔

---

[1] Narative of Events attending the out track of disturbance Agra district in 1857-58 صفحہ 3

[2] ٹرولین۔ سے On Education of the people of India صفحہ 199

1857 کی بغاوت مسلمانوں اور ہندوؤں کے روایتی اشراف کی عام تحریک تھی یعنی حکمرانوں، زمینداروں، سپاہیوں، عالموں اور پنڈتوں اور مولویوں کی تحریک۔ باغیوں کی اصل جماعت مندرجہ ذیل پر مشتمل تھی۔ دہلی کا شہنشاہ، اودھ کا بادشاہ، کچھ نواب اور راجہ تعلقدار اور زمیندار، سپاہی جن میں پٹھان، مغل، راجپوت اور شمالی ہندوستان کے برہمن شامل تھے اور مولوی جو اس نظام کے جز تھے۔ باغیوں میں مختلف طبقات کی نمائندگی تحریک کے جغرافیائی کردار کو ظاہر کرتی ہے اور شرکا کے مقاصد پر روشنی ڈالتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس نظام سے تعلق رکھنے والے قریب قریب سبھی لوگ غیر مطمئن تھے حالانکہ اُن میں سے کچھ نے اپنے خصوصی حالات کی بنا پر اس میں عملی حصہ لینے سے گریز کیا۔

سردار اور زمیندار باغیوں کی جماعت کے سرغنہ تھے جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی باضابطہ اور بے ضابطہ فوجوں اور حکمرانوں کے مسلح سپاہیوں، ماتحتوں، کسانوں اور ملازموں پر مشتمل تھی۔ اُن کی روایتیں بھی مشترک تھیں اور شکایتیں بھی۔ وہ دکھوں میں ایک دوسرے سے ہمدردی کرتے تھے۔ حکمرانوں کے علاقے اور سیاسی طاقت چھن جانے کا اثر اُن پر پڑا تھا۔ اگر بالائی طبقوں سے حق فرماں روائی چھین لیا گیا تھا یعنی اُن کی ریاستیں، فوجی کمانداری اور سول دفاتر تو دوسروں سے روزگار کے ذریعے اور اثر اور مالی منفعت کی حیثیتیں چھن گئی تھیں۔ صاحب علم یعنی عالم، مذہبی پیشوا اور شاعر اور دستکار اہل ہنر سرپرستی سے محروم ہوگئے تھے۔ بہت سے وہ لوگ بے روزگار ہوگئے تھے جن کا آبائی پیشہ تھا سپہ گری اور اُن میں بہت سوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوجوں میں شامل ہونا پڑا تھا۔

اس تحریک کے قائدوں نے برطانوی حکومت کے خلاف جو فرد جرم تیار کی تھی وہ اس کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ بہادر شاہ نے 25 اگست 1857 کو شائع ہونے والے منشور میں کہا تھا۔ ''یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اس زمانے میں ہندوستان کے لوگ، جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں، کافر اور ریا کار انگریزوں کے مظالم اور جبر کی بنا پر تباہ ہو رہے ہیں۔''

اُس کے بعد اُس نے پانچ اصل الزامات کی وضاحت اس طرح کی۔[1]

1۔ زمینداروں کے تعلق سے اس نے یہ الزام لگائے۔ اُن پر بڑی بڑی جمع (زمین کی مالگزاری) تشخیص کی جاتی ہے، بقایا مال گزاری وصول کرنے کے لئے اُن کی جائیداد کو نیلام پر چڑھا کے اُن کی بے عزتی کی جاتی ہے۔ مہنگی مقدمے بازی سے انھیں تباہ کیا جاتا ہے جس میں اسٹامپ کورٹ فیس اور سماعت میں ہونے والی دیر کی بنا پر بہت روپیہ خرچ ہوتا ہے۔

2۔ تاجروں کے تعلق سے اُس نے کافر اور ریا کار برطانوی حکومت پر الزام لگایا تھا کہ تمام اچھی اور بیش قیمت اشیا مثلاً تیل، کپڑا اور جہازوں کے ذریعے بھیجی جانے والی دوسری چیزوں کی تجارت میں اجارہ داری حاصل کر لی ہے اور عام لوگوں کے لئے محض حقیر اشیا کی تجارت چھوڑی ہے اور اُس میں بھی کسٹم ڈیوٹی اسٹامپ فیس، محاصل، چنگی اور چندوں کے ذریعے وہ منافع میں سے اپنا حصہ وصول کر لیتے ہیں۔

3۔ ملازمین پولیس کے تعلق سے اُس نے کہا تھا کہ سول اور فوجی خدمات پر مامور ہونے والے دیسی لوگوں کی عزت نہیں کی جاتی۔ انھیں کم تنخواہ ملتی ہے اور اُن کا کسی طرح کا اثر نہیں ہوتا ہے۔ دونوں محکموں میں باعزت اور منافع بخش عہدے محض انگریزوں کو دیے جاتے ہیں۔

4۔ دست کاروں کے تعلق سے اُس نے کہا تھا کہ انگریزوں نے انگلستان کی مصنوعات کو رواج دے کر بنکروں، نداقوں، بڑھیوں، لوہاروں اور موچیوں وغیرہ کی روزی چھین لی ہے اور اُن کے پیشے چھین کر ہر قسم کے دیسی دست کاروں کو بھیک مانگنے پر مجبور کر دیا ہے۔

5۔ پنڈتوں، مولویوں اور دوسرے تعلیم یافتہ لوگوں کے تعلق سے اُس نے کہا کہ پنڈت اور مولوی بالترتیب ہندو مسلم مذاہب کے سرپرست ہیں اور یورپین دونوں کے دشمن ہیں اور اس لئے اُن کے لئے لازمی ہے کہ وہ جہاد میں حصہ لیں۔ یہ اعلان برطانوی حکومت میں پائی جانے والی سیاسی اور معاشی خرابیوں کی طرف توجہ کھینچتا ہے اور ظاہر کرتا ہے کہ بالائی طبقوں یعنی زمینداروں، بڑے تاجروں، سول اور فوجی حاکموں اور ہندو اور مسلمان عالموں کے دکھ بغاوت کی اصل وجہ تھے۔

---

[1] یہ وہ مشہور اشتہار ہے جو پہلے اعظم گڑھ میں شائع ہوا تھا اور اس کے بعد خفیہ طور سے دہلی گزٹ مورخہ 29 ستمبر 1857 میں شائع کیا گیا تھا۔ بال محولہ بالہ، صفحات 630 بعد کے صفحات۔

نانا صاحب نے فرانس کے شہنشاہ کو خطوط[1] لکھے تھے جو بہادر شاہ کے لگائے ہوئے الزامات کی تصدیق کرتے ہیں۔ ''انگریز حکومت کی ناانصافیوں میں وہ مندرجہ ذیل کا ذکر کرتا ہے'' جھوٹ اور فریب سے کام لے کر مرہٹی علاقوں کا الحاق کرلیا گیا، باجی راؤ دوم سے اُس کے اور اُس کے وارثوں کے لئے جس پینشن کا وعدہ کیا گیا تھا وہ ختم کردی گئی، سیاسی سازشوں اور چال بازیوں سے کام لے کر ہندوستانی حکمرانوں کا تختہ اُلٹ دیا گیا، ایسی عدالتیں قائم کی گئیں جن میں مقدمہ بازی کرنے کے بڑے اخراجات نے صاحب حیثیت لوگوں کو تباہ کردیا اور ایسے قانون بنائے گئے جو اُن کے مقدس ضابطوں اور مذہبی جذبات کے خلاف ہیں۔ مالکان آراضی پر بڑے بڑے محاصل لگائے اور اُن کے کھیتوں کی پیداوار پر کسٹم ڈیوٹی عائد کی۔ ایسی من مانی کاروائیاں کیں جن کی وجہ سے 200 سے زیادہ دیسی حکمراں اُن کے شاطرانہ چالوں کے شکار ہوگئے، ناگپور کے راجہ سے کئے گئے معاہدوں اور وعدوں کی خلاف ورزی کی گئی اُس کے محل کو لوٹا گیا اور اُس کے قیمتی سامان کو نیلام کردیا گیا، دہلی کے شہنشاہ اور دکن اور سندھ کے حکمرانوں کی بے عزتی اور ذلت کی گئی، مہاراجہ رنجیت سنگھ کے نابالغ وارث دلیپ سنگھ کو معزول کردیا گیا، معاہدوں اور عہد و پیمان کی خلاف ورزی کر کے اودھ کے بادشاہ کو تخت سے ہٹا دیا گیا، عورتوں کی بے آبروئی کی گئی اور مندر اور مسجدیں مسمار کردی گئیں، ہندوؤں کے گود لینے اور ستی ہونے کے رواجوں میں مداخلت کی گئی، مندروں اور دوسرے خیراتی اداروں کی مدد کے لئے کئے جانے والے اوقاف پر قبضہ کرلیا گیا اور سب سے زیادہ یہ کہ ہندوستانیوں کی مذہبی رسوم اور رواجوں کو مسخ کرنے کا منصوبہ بنالیا گیا یہاں تک کہ سپاہیوں نے بیک آواز کہا، انگریزوں نے ہمارے ذریعے ہندوستان کے تمام ملکوں کو فتح کیا۔ ان کے سپاہیوں نے کیا کیا ہے؟ کیا ہم نے

---

[1] ان میں تین خط چندرنگ کے گورنروں کے توسط سے بھیجے گئے تھے اور ایک راست ''ملک معظم نپولین بہادر شاہ شاہان امیر الدمر'' کے نام بھیجا گیا تھا۔ اُن پر نانا صاحب کے ایجنٹوں درگا پرشاد اور بھگوان پرشاد کے دستخط تھے 28 اپریل اور 30 مئی 1958 کو روانہ کئے گئے تھے۔ ان میں سے ایک خط اس طرح شروع ہوتا ہے ''انگریزی حکومت کی انتہائی ناانصافی کے شکار'' جسے عہد و پیا توڑنے میں پس و پیش نہیں ہوتا ہے، ہم چند دیگر میں پناہ لینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔'' خطوط اس وقت ارکا یوز ڈو منسٹریس دس افیسرس ارٹ یجیر ز، پیرس، کی تحویل میں ہیں۔ ہندوستان کے نیشنل ارکایوز نے اُن کی تصویری نقلیں (فوٹو اسٹیٹس) حاصل کرلی ہیں۔

اپنی زندگیاں اور اپنا وجود اس لئے قربان کیا تھا کہ ہم اپنے مذہب اور رسوم کو کھودیں؟ ہم اُس وقت تک لڑتے رہیں گے جب تک ہماری قوت بالکل ختم نہیں ہوجاتی ہے اور جب تک ہم میں سے ایک بھی زندہ ہے۔" ناناصاحب نے ایک جملے میں اس دکھ بھری کہانی کی تلخیص پیش کردی۔"انگریزی حکومت کی ناانصافیاں اور دروغ بیانیاں سورج کی شعاعوں کی طرح ہر طرف پھیل گئی ہیں۔"[1]

برجیس قدر نے، جسے باغیوں نے اس کی ماں حضرت محل کی تولیت میں ۵ جولائی 1857 کو اودھ کے تخت پر بٹھادیا تھا، انگریزوں کے خلاف بغاوت کے جواز میں ایک فرمان جاری کیا۔اس میں کہا گیا ہے "تمام ہندو اور مسلمان اس سے واقف ہیں کہ ہر انسان چار باتوں کو عزیز رکھتا ہے، (1) مذہب اور ایمان (2) عزت اور آبرو (3) اپنی اور اپنے قرابت داروں کی زندگیاں (4) اور جائداد۔ ہندوستانیوں کی حکومت میں ان چاروں کا تحفظ کیا جاتا تھا، ہر شخص اپنے مذہب کی پیروی کرتا تھا اور خود اُس کی منشا کے مطابق اُس کی عزت کا تحفظ کیا جاتا تھا۔اشراف کے ساتھ چاہے وہ مسلمان ہوں اور سید و شیخ، مغل اور پٹھان خاندانوں سے تعلق رکھتے ہوں یا ہندوؤں میں براہمن، شتری، ویش اور کائستھ ہوں، اُن کی حیثیت کے مطابق عزت و احترام کیا جاتا تھا۔کوئی پاجی مثلاً چوڑہا، چمار، دھانک اور پاسی اُن کی برابری کا دعویٰ نہیں کرسکتا تھا۔لیکن چاہے کوئی اونچے طبقے سے تعلق رکھتا ہو یا نچلے طبقے سے اُس کی جان خطرے میں نہیں تھی۔کسی بھی جرم یا خطا کی پاداش میں کسی کی جائداد پر قبضہ نہیں کیا جاتا تھا۔" اس میں مزید کہا گیا ہے "لیکن انگریز ان چاروں کے دشمن ہیں۔وہ چاہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان اپنا مذہب کھودیں اور سب عیسائی ہوجائیں۔اُن کے دور حکومت میں ہزاروں نیا مذہب اختیار کرچکے ہیں اور دوسرے اپنا مذہب بدل رہے ہیں۔وہ اعلیٰ طبقات کی آبرو کو نیچے کے لوگوں کی سطح پر لے آئے ہیں یعنی چوڑہوں او چماروں کی سطح پر۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریز اعلیٰ طبقوں پر نیچی ذاتوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ایک چوڑہا یا، چمار کی شکایت پر وہ ایک نواب یا راجہ کو بھی پکڑ لیتے ہیں اور اُس کی بےعزتی کرتے ہیں۔جہاں بھی جاتے ہیں اعلیٰ طبقات سے تعلق رکھنے والوں کو پھانسیاں دیتے ہیں وراُن کی بیویوں اور بچوں کو قتل کردیتے ہیں۔

---

[1] اس کے الفاظ ہیں:
"Les actos d' injustec at de perjure du ganjut Anglois brillent partout comme Les rayons du solil"

اُن کے سپاہی عورتوں کی بے آبروئی کرتے ہیں۔ وہ اُن کے گھر کھود ڈالتے ہیں، جائدادیں چھین لیتے ہیں اور کچھ بھی نہیں چھوڑتے ہیں۔''[1]

تحریک کے تین اہم ترین قائدوں کی تین دستاویزات اس بات کو واضح کر دیتی ہیں کہ 1857 کے واقعات کی ذمہ داری محض فوج کی شکایت پر نہیں تھی بلکہ بالائی طبقوں میں عام بے چینی پائی جاتی تھی۔ یہ کوئی فرقہ وارانہ تحریک نہیں تھی جو کسی ایک فرقے تک محدود ہو اور نہ اس کے محرک محض مذہبی اور رسوماتی خیالات تھے۔ موٹے طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک سیاسی تحریک تھی جس کا مقصد تھا ملک میں بدیسی حکومت کا ختم کرنا۔ یہ اُس پرانے نظام کو ایک دفعہ پھر رواج دینے کی آخری کوشش تھی جسے بالجبر طاقت سے محروم کر دیا گیا تھا۔

اسکاٹ لینڈ کے مشنری الگزینڈر ڈف کے لئے، جو آوٹ رم، ہنری لارنس اور چارلس ٹریویلین کا دوست اور کلکتہ یونیورسٹی کے بانیوں میں تھا، واقعات کے متعلق صحیح صحیح معلومات حاصل کرنا دشوار نہیں تھا اس لئے کہ بغاوت کے دوران وہ ہندوستان میں موجود تھا۔ بغاوت کی نوعیت کے متعلق اُس کی شہادت بیش قیمت ہے۔ فری چرچ آف اسکاٹ لینڈ کی فارن مشن کمیٹی کے کنوینز ڈاکٹر ٹویڈی کے نام ایک خط مورخہ 16 اکتوبر 1857 میں اُس نے لکھا تھا ''میں اُس یقین کی حقیقت کو اب پہلے سے زیادہ محسوس کرتا ہوں، جو ابتدا سے میرے ذہن میں تھی، کہ یہ بڑی بغاوت بڑی حد تک سیاسی اور بہت کم حد تک مذہبی نوعیت کی ہے۔''[2]

III انگریزوں کی فردِ قرارداد جرم

عظیم بغاوت کے قائدوں نے انگریزوں کے خلاف جو فردِ جرم تیار کی ہے اُس میں درج کئے گئے ہر الزام کی حمایت تاریخ کرتی ہے۔ مغل شہنشاہ کے واقع کو لیجئے۔ 1803 سے وہ انگریزوں کے زیرِ تحفظ رہ رہا تھا۔ پہلے عزت واحترام اور ترجیح کے تعلق سے اُس کے دعووں کو تسلیم کیا جاتا تھا۔ وہ گورنر جنرل کو ''پسرِ عزیز'' اور ''وفادار ملازم'' کہہ کر خطاب کیا کرتا تھا اور گورنر کی

---

[1] Foreign Consultation. No.63-649, 25th June 1958

[2] ڈف۔ The Indian Rebellion (London, 1858) صفحہ 133-132

مہروں پر ''فدوی'' کندہ ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ ایک تبدیلی آئی۔ ایمہرسٹ نے بادشاہ سے صاف صاف کہہ دیا'' آپ کی بادشاہت محض نام نہاد بادشاہت ہے۔ آپ کو محض بر بنائے خوش خلقی بادشاہ کہہ کر خطاب کیا جاتا ہے۔'' دربار سے منسلک ریزیڈنٹ نے نذر پیش کرتے وقت کھڑے ہونے سے انکار کر دیا۔ اکلینڈ نے بہادر شاہ سے کہا کہ وہ اپنے حقوق اور دعوے ترک کر دے۔ اُس سے نذر پیش کرنے خلعت عطا کرنے اور دربار کرنے کے حقوق چھین لئے گئے۔ دیوان خاص اور دیوان عام بند کر دئے گئے۔ اُس پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ بادشاہ کے لقب سے دست بردار ہوجائے، لال قلعے کی سکونت ترک کر دے اور اپنا جانشین نامزد نہ کرے۔ ڈلہوزی نے اُس سے زیادہ کج خلقی کا ثبوت دیا۔ وسطی کا کہنا ہے''بغاوت پھوٹنے سے پہلے بادشاہ کی حیثیت نا قابل برداشت دکھوں سے عبارت تھی۔ اُس کا محل حقیقت میں اُس کا قید خانہ تھا۔ وہ جانتا تھا کہ گذشتہ عروج کی مضحکہ خیز نمائندگی کرنے والے کچھ استحقاق جو اسے حاصل ہیں وہ اُس کے جانشینوں سے چھین لئے جائیں گے۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ وہ خود اپنے محل میں رہنے کے حق سے محروم کر دئے جائیں گے۔ اور شہر پناہ کے باہر کہیں بھیج دیے جائیں گے۔'' ہم نے اس کے عزیزوں کو اپنی ملازمت میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی۔ ہم نے انھیں محل کے حدود کے اندر افلاس اور قرض کی ذلت آمیز زندگی گزارنے پر مجبور کیا اور اُس کے بعد کاہلی، کمینگی اور زود حسی کے لئے انھیں سخت سست کہا۔ ہم نے فوجی عہدوں کے دروازے اُن پر بند کر دئے، ہم نے ہر کاروبار کے راستے اُن پر مسدود کر دئے، ہم نے اُن سے باعزت عزم کا ہر شائبہ چھین لیا اور اُس کے بعد ہمارے اخبار اور ہمارے میس کے کمرے اس کے گھرانے کے سست کاہل اور زود حس شہزادوں کے خلاف الزاموں سے معمور ہو گئے۔[1]

اس بات کو نہیں بھولنا چاہئے کہ لال قلعے کا باسی اگرچہ محض کٹھ پتلی تھا پھر بھی اُس کی بڑی عزت کی جاتی تھی کہ نظام، بنگال کے نواب، پیشوہ، مرہٹہ سردار یعنی سندھیا اور ہلکر اور راجپوت راجوں کی طرح نیم آزاد حکمراں اُس کی اطاعت کرنے، اُس کو نذر پیش کرنے اور اسُ سے خطاب وخلعت حاصل کرنے کے خواہش مند رہا کرتے تھے۔ حالانکہ اُس کے پاس نہ طاقت تھی نہ

---

[1] رسل۔ ڈبلیو۔ ایچ، My Diary in India (London, 1960)، جلد II صفحہ 51

وسائل پھر بھی مغل خاندان کے تیمور، بابر، اکبر اور شاہ جہاں کی طرح کے عظیم شہنشاہوں کے وارث کی حیثیت سے اُس کی عزت کی جاتی تھی۔ چنانچہ اس میں کوئی تعجب نہیں ہے کہ مسلمان اور ہندو حکمراں اور عام لوگ سب بادشاہ وقت کی بے عزتی سے نالاں تھے اور اُس خاندان کے ختم ہوجانے کے تصور کو ناپسند کرتے تھے۔

بنگال کی دیوانی رکھنے والوں کے لئے یہ بات نامناسب بھی تھی اور احسان فراموش کی مترادف بھی کہ وہ اپنے عہدے اور اُس سے حاصل ہونے والی آمدنی کو وہ اپنے علاقے کو توسیع دینے، فتوحات حاصل کرنے اور اپنے قانونی بادشاہ کے ساتھ گستاخی سے پیش آنے اور برابر کرنے کے لئے استعمال کریں۔ اُن کی بے وفائی کے متعلق اب کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟ مارکوئز آف ویلزلی نے 1803 میں شہنشاہ شاہ عالم کو یقین دلایا تھا ''حضور یقین رکھیں کہ برطانوی حکومت ہر اُس احترام کا مظاہرہ کرے گی اور ہر وہ توجہ صرف کرے گی جو حضور اور شاہی خاندان کے آرام و آسائش کے لئے ضروری ہو اور یہ کہ حضور کی ذات آپ کے خاندان اور آپ کے متعلقین کی اعانت کا برطانوی حکومت کی طرف سے مناسب انتظام کیا جائے گا۔''[1] ایک نے، جس نے ویلزلی کا خط بھیجا تھا لکھا تھا ''حضور کی خدمت میں وفاداری اور جاں نثاری کا مظاہرہ کرنے کی میں دوستانہ خواہش رکھتا ہوں اور میں اسے اپنے لئے ایک نمایاں اعزاز تصور کرتا ہوں، اس لئے کہ یہ ایک خصوصی حق ہے کہ حضور کے احکام کی تعمیل کروں۔''[2]

گورنر جنرلوں کے طریقہ کار سے ظاہر ہوتا ہے کہ مندرجہ بالا جملوں میں خلوص نہیں تھا اور واقعہ یہ ہے کہ انگریز اپنے اُن حقوق کا قانونی جواز تلاش کرنے کے لئے شہنشاہ کے نام اور وقار کو استعمال کر رہے تھے جو انھوں نے بالجبر حاصل کے تھے۔ اس کے علاوہ وہ بین الاقوامی الجھنوں سے بچنا چاہتے تھے جو اس علاقے کے متعلق صاف صاف دعوے کی بنا پر حکومت فرانس پیدا کر دیتی۔ لیکن بعد میں جب انھیں معلوم ہوا کہ اُن کی طاقت اختیارات کی بنیاد بن سکتی ہے تو

---

[1] ویلزلی کا خط شاہ عالم کے نام، 27 جولائی 1902 Wellesley's Corespondence, جلد III صفحہ 233

[2] اسپیر، پرسیول، Twilight of the Mughals (Conbridge, 1951)، صفحہ 35

انھوں نے عہد و پیماں توڑ دیے۔ اپنے ایک خط میں ڈائرکٹروں نے اس پالیسی کو مندرجہ ذیل الفاظ میں بیان کیا تھا ''ہمارا خیال ہے کہ اب ہندوستان میں ہماری طاقت اس حد تک بڑھ چکی ہے کہ ہم دہلی کے بادشاہ سے کچھ اور اختیارات حاصل کر کے، جن پر ہم خود اپنے نام سے عمل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، اُس کے مزید استحکام کی کوشش کا خطرناک تجربہ کریں۔''[1]

اودھ کا معاملہ بھی اتنا ہی افسوس ناک ہے۔ وارن ہیسٹنگز کے زمانے سے اودھ کے تعلق سے ایسٹ انڈیا کمپنی کا عمل دو طاقتوں کے روابط کی تاریخ میں ایک دردناک باب کا حکم رکھتا ہے۔ بکسر کی جنگ (1764) کے بعد سے اودھ کے نواب کمپنی کے دباؤ میں تھے۔ رفتہ رفتہ اُن کے اختیارات کم کر دیے گئے لیکن اُن کی ذمہ داریوں میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ نواب شجاع الدولہ کو 1763 میں مجبور کیا گیا کہ وہ فوج کی تعداد 35000 افراد سے زیادہ نہ بڑھائے۔ اسے اس امر کی ممانعت بھی کر دی گئی کہ برطانوی فوجوں کی طرح وہ 10000 سے زیادہ پیدل فوج کو نہ اسلحہ مہیا کرے نہ قواعد پریڈ کروائے۔ بعد میں اُسے کمپنی کے علم میں لائے بغیر کسی ریاست سے مراسلت کرنے سے بھی روک دیا گیا اور اس طرح اُس کے ایک ماتحت کی حیثیت تک پہنچا دیا گیا۔ 1798 میں سعادت علی خاں کو حکم دیا گیا کہ وہ برطانوی فوج کے اخراجات کے لئے سالانہ ترسٹھ لاکھ روپے ادا کرے۔ اس کی بے بسی نے نواب سعادت علی خاں کو اتنا مغموم بنا دیا تھا کہ اُس نے تخت سے دست بردار ہو جانے کی دھمکی دی۔ لیکن ویلزلی نے اُسے واضح طور سے بتا دیا کہ اس کے معنی ہونگے اُس کے خاندان کا زوال، اس دھمکی کے بعد سعادت علی خاں نے خاموشی اختیار کر لی اور اپنی حکومت کے بقیہ سال لوگوں کی حالت سدھارنے میں گزارے۔ اُس نے خزانہ ایک دفعہ پھر بھر دیا اور ریاست کے امور کا اتنا اچھا انتظام کیا کہ بشپ ہربرنے، جس نے اودھ میں سفر کیا تھا، ملک کو ''اس حد تک آباد اور زیر کاشت پایا جس حد تک کمپنی کے زیادہ تر علاقے تھے''۔[2] ارون کے مطابق غالباً اس وقت اودھ میں ہمارے آس پاس کے اضلاع کے مقابلے

---

[1] کورٹ آف ڈائریکٹرز کا سیاسی خط، مورخہ 4 ستمبر 1811 پیرا 199، اپیر محولہ بالا، صفحہ 44

[2] اقتباس، ارون، ایچ۔ سی۔ The Garden of India (London, 1880) صفحہ 113

میں بہت زیادہ دولت تھی، محاصل کم تھے اور وہ صوبے کے اندر خرچ کئے جاتے تھے''۔[1]

سعادت علی کے جانشیں غازی الدین حیدر کو جسے دہلی کے شہنشاہ کی حیثیت کم کرنے کے برطانوی منصوبے کے تحت لارڈ ہیسٹنگز نے بادشاہ کا لقب اختیار کرنے پر آمادہ کرلیا تھا، نیپال کے خلاف جنگ میں کمپنی کی مالی امداد کرنے کی غرض سے مجبوراً پینتیس لاکھ روپیہ قرض دینا پڑا۔ وہ ایک ناکارہ حکمران ثابت ہوا اُس کا بیٹا نصیرالدین اُس سے بدتر تھا۔

1837 میں نصیرالدین کی موت کے بعد اُس کے جانشیں محمد علی شاہ کو ایک نیا معاہدہ کرنا پڑا جس نے 1801 کے معاہدے کی شرائط کو بدل دیا۔ اُس کے بعد تخت پر بیٹھنے والے امجد علی کے زمانے میں حالات بد سے بدتر ہوگئے۔ مسز ہنری لارنس نے خود اُس کی وجوہ بیان کی ہیں۔ اُس کا کہنا ہے ''اصل خرابی اس نظام میں ہے، اُن میں نہیں جن کے ذریعے اس کو چلایا جاتا ہے۔ ہم نے ہر قسم کی مداخلت کی کوشش کر کے دیکھ لی۔ ہم نے براہ راست مداخلت کی، بالواسطہ طور سے مداخلت کی، عمل کے ذریعے مداخلت کی، ترک عمل کے ذریعے مداخلت کی لیکن ہر کوشش رائیگاں گئی۔''

''ایک بڑی غلطی یہ ہوی کہ ہم نے چھوٹی چھوٹی باتوں میں دست اندازی کی لیکن جب اہم مسائل سامنے آئے تو اُن کی طرف توجہ نہیں دی۔ ایک اور بڑی خرابی یہ تھی کہ لکھنؤ کے دربار کے ساتھ مذاکرات کرنے کے لئے پالیسی کا کوئی مسلحہ نظام موجود نہیں تھا۔''[2] جہاں تک نظام کا تعلق تھا اُس نے لکھا ''اگر بدنظمی کو یقینی بنانے کا کوئی ذریعہ ہوسکتا ہے تو وہ ہے ایک دیسی حکمراں یا وزیر کی حکومت جن کا انحصار ہو بدیسی سنگینوں پر اور جو برطانوی ریزیڈنٹ کی ہدایات کے مطابق کام کریں۔''[3]

اُس کے بعد اُس نے مشورہ دیا ''اس صوبے کا انتظام کچھ اسی قسم کے قواعد کے تحت ہاتھ میں لیا جائے جو لارڈ ولیمس بینٹنک نے بنائے تھے (جولائی 1831 میں کورٹ آف ڈائرکٹرز کو بھیجی جانے والی رپورٹ میں) جہاں تک ممکن ہو سکے ملک کا انتظام مقامی لوگوں کے ہاتھوں میں

---

[1] ایضاً صفحہ 114

[2] ایضاً صفحہ 134

[3] دیکھئے باسو، میجر۔ بی۔ ڈی۔ Rise of The Christian Power in India (Calcutta) صفحہ 946

رہنا چاہئے۔ ایک روپیہ بھی کمپنی کے خزانے میں نہیں آنا چاہئے۔ اودھ پر حکومت ایک شخص یعنی بادشاہ کی خاطر نہیں بلکہ اُس کے لوگوں کی خاطر کی جانی چاہئے۔"[1]

لیکن ڈلہوزی نے جو اودھ کے الحاق کا فیصلہ کر چکا تھا اُس کے مشورے کو رد کر دیا۔ واجد علی شاہ کی معزولی نے ملک میں غم و غصے کی لہر دوڑا دی۔ نواب میں جو بھی خرابیاں تھی پھر بھی ہندوستان کے لوگ اس کو پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھ سکتے تھے کہ ہندوستان کا سب سے اچھا صوبہ بدیسیوں کو منتقل ہو جائے۔ دیسی حکمراں، تعلقدار، حکام، متوسلین اور اودھ کے سپاہ گرانہ طبقے، جن میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے، غم و مایوسی سے بھرے ہوئے تھے۔ برطانوی عہد و پیمان میں اعتماد مکمل طور سے ختم ہو چکا تھا۔

الحاق کے متعلق اُس کے خیالات قابل غور ہیں۔ اُس نے لکھا تھا۔ "لیکن اس اقدام نے ہندوستان کے لوگوں کے ذہنوں پر جو بُرا اثر ڈالا اُس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے کہ اس سے ہم نے جو فائدہ حاصل کیا اس سے اس عمل کی انسان دوستانہ نوعیت پر دھبہ آ گیا اور لاکھوں لوگوں کو ایسا لگا کہ عام لوگوں کی بھلائی، جس کا ہم نے اُس وقت دعویٰ کیا تھا، جب ہم خود فائدہ اٹھا رہے تھے، ایک بہانے اور مکر و فریب سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی ہے"۔[2]

واجد علی شاہ کی سلطنت کا الحاق 3 فروری 1852 کو کیا گیا۔ الحاق کی وجہ بیان کرے ہوئے کہا گیا تھا "خدا اور انسان کی نظروں میں برطانوی حکومت گنہگار رہے گی اگر وہ ایک ایسی حکومت کی پشت پناہی کرتی رہی جو لاکھوں انسانوں کے دکھوں کا باعث ہے۔"[3]

اودھ کو چیف کمشنر کا صوبہ بنا دیا گیا۔ لارنس جو پہلا چیف کمشنر مقرر کیا گیا تھا آزادی کے ساتھ ہر قسم کے لوگوں سے ملتا تھا اور اُن کے احساسات جاننے کی کوشش کرتا تھا۔ برطانوی حکومت کی طرف اُن کی وفاداری پہ اُسے شبہ تھا۔ اُس نے 2 مئی 1857 کو لکھا تھا "توپ خانے

---

[1] ارون محولہ، صفحہ 134

[2] کے اور ملیسن محولہ بالا، صفحہ 110

[3] لارڈ ڈلہوزی کا اعلان جو 13 فروری 1852 کو جاری کیا گیا، فارسٹر جے۔ ڈبلیو
Selection from Letters, Dispatches and other State Papers of The Govt. of India, 1857-58 (Calcutta-Vol III)p.1

کی وفاداری پر شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی حالانکہ دیسی افسروں کو متنفر کرنے کی بہت کوششیں کی گئی ہیں...... جہاں تک مجھے معلوم ہے ابھی تک برے جذبات زیادہ تر ہندو سپاہیوں میں پائے جاتے ہیں......مسلمان جلدی ہی نہایت پر جوش اور متشدد باغی بن جائیں گے۔''[1] اس نے مزید لکھا تھا ''جب تک ہم یہ نہ سمجھیں کہ دیسی لوگ اور خصوصیت کے ساتھ دیسی سپاہی اُسی قسم کے احساسات، توقعات اور اہلیت اور نااہلی کا تصور رکھتے ہیں جیسا کہ خود ہم رکھتے ہیں۔ اُس وقت تک ہم محفوظ نہیں ہو سکتے۔''[2] یہ سلگتی ہوئی آگ 3 مئی 1857 کو انتقام کے شعلوں کی صورت میں بھڑک اُٹھی۔ اس سے پہلے کہ میرٹھ میں سپاہی بغاوت کریں ساتھ میں اودھ رجمنٹ میں بغاوت پھوٹ پڑی۔ سپاہیوں نے نئے کارتوسوں کو دانتوں سے کاٹنے سے انکار کر دیا، اپنے ہتھیار پھینک دیے اور بھاگ گئے۔ ہنری لارنس کو یقین تھا کہ ہندوستان کی سلطنت کے لیے انگریزوں کو از سرِ نو معرکہ آرائی کرنی ہوگی۔

پنجاب سرحدی صوبہ تھا اور اس لئے اُس پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ انیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں مغربی ایشیا میں رونما ہونے والے واقعات نے برطانوی سلطنت کے لئے ایک نئی صورت حال پیدا کر دی تھی۔ روس نے ایران کو شکست دے دی تھی۔ اُس کے بعد اُس نے ایران کو معاہدہ ترکمانچی (1828) کرنے پر مجبور کیا۔ کاکیشیا کے علاقے پر قبضہ کر لیا اور کسپین کے آس پاس کے علاقے پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ تقریباً دو سال بعد پامرسٹن خائف ہو گیا اور ایک ہوا کھڑا کر دیا جو پوری انیسویں صدی میں اور اُس کے بعد بھی برطانوی مدبروں کے ذہنوں پر مسلط رہا۔ ہندوستان کی طرف روسیوں کی پیش قدمی کو روکنا برطانوی خارجہ پالیسی کا اصل مقصد بن گیا اور روس اور ہندوستان کی سلطنت کے درمیان فاصل ریاستوں کی تشکیل برطانوی ڈپلومیسی کا اصل کام بن کر رہ گیا۔

روس نے ایران کی ہمت افزائی کی جو افغانستان کے خلاف اپنے دعوؤں کی تجدید کر کے نقصان کی تلافی کرنا چاہتا تھا۔ ہندوستان کی سرحد سے ملے ہوئے علاقے کے متعلق اُس کے عزائم

---

[1] Foreign Secret Consultation No. 564, 18th December, 1857

[2] ایضاً

نے ہندوستان کے برطانوی حکمرانوں کی نیندیں حرام کردیں۔

پنجاب بھی، جو رنجیت سنگھ کی موت کے بعد خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ گیا تھا، انگریزوں کے لئے زیادہ تشویش کا باعث بن گیا اُن کی حکمت عملیوں نے سکھوں کو مشتعل کر کے جنگ پر آمادہ کر دیا جس کی وجہ سے بالآخر پنجاب کا الحاق کرلیا گیا۔ پچاس ہزار مربع میل زرخیز زمین اور چالیس لاکھ تنومند کسان برطانوی حکومت میں آ گئے۔

شکست کے ساتھ ذلت بھی ہوئی۔ معزول شہزادے دلیپ سنگھ کو عیسائی بنالیا گیا اور ملک بدر کر کے انگلستان بھیج دیا گیا۔ لاہور دربار کی املاک نیلام کردی گئیں۔ برطانوی تاج کی آرائش کے لئے کوہِ نور انگلستان بھیج دیا گیا۔ لارڈ ڈلہوزی امرتسر کے سنہرے گردوارے میں گیا اور جوتے پہن کر اُس کے مقدس حدود میں چلا۔

انگریزوں کی زیادتی کی ایک اور واضح مثال ہے کہ ناگپور کا الحاق۔ اس کے متعلق ڈلہوزی نے روداد میں یہ وجہ بیان کی ہے ''میں اپنی قوت فیصلہ کو اس امر کے اعتراف کے لئے آمادہ نہیں کرسکتا ہوں کہ مہربانی وشفقت کا جذبہ ایک منصفانہ اور مصلحت اندیش پالیسی کو رد کرسکتا ہے۔''[1] لیکن اس پالیسی کے پیچھے کیا عوامل کام کررہے تھے یہ بات ڈزرائلی نے پارلمنٹ کے سامنے تقریر کرتے ہوئے واضح کردی تھی جس میں اُس نے گورنر جنرل کی روداد کے اقتباسات پیش کئے تھے۔ اُس نے کہا تھا ''ناگپور کے الحاق سے ہمیں ایسا علاقہ مل جائے گا جو 80,000 مربع میل پر مشتمل ہے، جس کی سالانہ آمدنی چالیس لاکھ روپیہ ہے اور جہاں 40,00,000 سے زیادہ لوگ آباد ہیں...... اس کی وجہ سے ہز ہائی نس نظام کی سلطنت برطانوی علاقے سے بالکل گھر جائے گی۔''[2] ڈلہوزی کے لئے برار کے علاقے کی کپاس پیدا کرنے کی صلاحیت اتنی زیادہ پرکشش تھی کہ اُس نے لوگوں کے احساسات اور انصاف کے تقاضے کو نظر انداز کرنے کے نتائج کے متعلق کرنل لو اور ولیم منسل کے مشوروں کو رد کردیا اور ناگپور کی مرہٹہ ریاست کی موت کے پروانے پر دستخط کردیے۔

---

[1] کے اور ملیسن، محولہ بالا، جلد 1، صفحہ 78

[2] ڈزرائلی کی تقریر 27/ Hansords Parlimentary Dbates, 1857 صفحہ 454

سندھ کی فتح کو بدطینتی اور بدکرداری کے مظاہرہ کہنا چاہئے۔ گندی جارحیت۔ اس کے روح رواں نیپیر نے اعتراف کیا ''ہمیں سندھ پر قبضہ کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ پھر بھی ہم اُس پر قبضہ کریں گے اور یہ نہایت سودمند، مفید اور انسان دوستی کے جذبات پر مبنی بدمعاشی ہوگی۔''[1] امیروں کے خلاف جھوٹے الزامات تراشے گئے جن کی بنیاد تھیں جعلی دستاویزات۔ برطانوی فوجوں کی بندوقوں نے زرق و برق لباس پہنے اور بھڑکیلے صافے باندھے بلوچیوں کو بھون کے رکھ دیا جو بڑی بہادری سے لڑے۔ لیکن اُن کے پاس عہد وسطی کے ہتھیار تھے یعنی تلواریں اور بھالے لیکن اس ظاہری تمسخر اور دکھاوے کی بہادری کے پیچھے ایک سنجیدہ مقصد تھا جس کا اعلان پامرسٹن نے کیا یعنی'' کاسکوں اور سکھوں کی ملاقات کو ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ دور رکھا جائے۔''[2]

بہت سے شاہی خاندانوں سے وراثت کو گود لینے کا روایتی حق چھین کر انھیں علاقوں اور پینشنوں سے محروم کر دیا گیا۔ چنانچہ ستارا، رائچور، نلدرگ، کرناٹک، تانجور، جھانسی، کرولی اور سمبھل پور وغیرہ کے خاندان اپنے علاقوں سے محروم کر دیے گئے۔

مالکان اراضی کے ساتھ بُرا برتاؤ

حکمراں خاندانوں کے بعد امرا اور شرفا کے طبقے کا نمبر آیا یعنی تعلقداروں، زمینداروں اور اعلیٰ سرکاری کام کا۔ اُن کو ختم کرنے کی کوشش کی گئی۔ ''اُس زمانے کی پالیسی یہ تھی کہ حکمراں اور کسان کے درمیان کسی کو تسلیم نہ کیا جائے۔''[3] اس طبقے کا خاتمہ جزوی طور سے بڑی بڑی ریاستوں کے خاتمے کی پالیسی کا نتیجہ تھا۔ ہندوستانی انتظامیہ کے زوال اور اُس کی جگہ برطانوی نمونے کے سول اور فوجی انتظام کے قیام نے، جو برطانوی کارکنوں پر مشتمل تھا، قدرتی طور سے ہندوستانی حکمراں طبقے کو برطرف کر دیا۔

---

[1] نیپیر۔ سر۔ ڈبلیو۔ The life & opinions of General Sir Charles (London, 1857) جلد II صفحہ 218

[2] بینٹ جی، The Concept ofEmpire, Burke to Attlle (London 1962)

[3] کے اور ملیسن، محولہ بالا، جلد 111

کمپنی نے جو مال گزاری کا نظام قائم کیا تھا اُس کی نوعیت نے بھی حکمراں طبقے کو ختم کرنے میں مدد دی۔ استمراری بندوبست کے علاقوں میں پرانے خاندانوں کی جگہ نئے قسم کے مالکان اراضی نے لے لی۔ رعیت داری علاقوں میں مالکان اراضی نیست و نابود ہوگئے۔ مرہٹوں کی جنگوں اور اودھ کے الحاق کے نتیجے میں جو علاقے برطانوی سلطنت میں شامل کر لئے گئے تھے وہاں ''بہت سے قابل برطانوی مدبر، خصوصیت کے ساتھ شمالی ہند میں، کسی ایسے شخص کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں تھے جس کو بجا طور سے مقامی شرفا کے زمرے میں شامل کیا جا سکے۔ اُن کے دل ہمدردی اور مکمل انسان دوستی کے جذبات سے بھرے ہوئے تھے پھر بھی وہ مقامی شرفا کے متعلق صرف ایک خیال رکھتے تھے اور وہ یہ تھا کہ اس ادارے کو بڑی ایمانداری کے ساتھ مٹا دیا جانا چاہئے۔''[1]

صوبجات شمال مغربی اور اودھ

مثال کے طور پر بالائی صوبوں میں مالکانہ حقوق رکھنے والے تین طبقے تھے: (1) زمیندار (2) تعلقدار اور (3) معافی دار، فیل کار۔ شروع میں اُن کے ساتھ جو بندوبست کئے گئے تھے اُن کی بنیاد پر کوئی واضح اصول نہں تھے۔ پھر بھی یہ سمجھا جاتا تھا کہ اراضی کے تمام خالص اثاثے کی حقدار ریاست ہے۔ 1824 میں خالص لگان کا 6 /5 حصہ معیاری مال گزاری قرار دیا گیا تھا۔ 1922 میں اُسے گھٹا کر لگان کا دو تہائی کر دیا گیا۔ صوبہ جات شمال مغربی کے لیفٹنٹ گورنر ٹی۔سی۔ رابرٹسن کو 42-1833 کی بندوبست کی کارروائی '' کچھ اس نوعیت کی معلوم ہوئی جس کا مقصد ہے سماج میں ایسی برابری پیدا کرنا کہ بالآخر حکمراں طبقے اور زمین جوتنے والے میں بڑے چھوٹے کا امتیاز باقی نہ رہے۔ یہ تجربہ خطرناک ہے کہ کسی درمیانی مقامی اجنسی کی مدد کے بغیر حکومت کرنے کی کوشش کی جائے۔ لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس وقت ہم جو کارروائی کر رہے ہیں اُس کا راست نتیجہ ہوگا اس قسم کی صورت حال پیدا کرنا۔''[2]

---

[1] کے اور ملیسن، محولہ بالا، جلد 1، صفحہ 112

[2] دت رمیش، The Economic History to India in the Victorian Age (London, Kegon Paul) صفحہ 42-43

1855 میں سہارن پور ضوابط کی رو سے تشخیص کی شرح 50 فیصد کردی گئی۔ اس شرح کا نفاذ، اودھ، صوبہ جات متوسط، پنجاب اور بعد میں مدراس اور بمبئی میں کردیا گیا۔ لیکن یہ راحت اتنی دیر میں نصیب ہوئی کہ 1857 کے واقعات پر اس کا زیادہ اثر نہیں پڑا۔

اس بے اندازہ مطالبے کی وصولی میں انتہائی سختی سے کام لیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ کے الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ ''اس نظام کے تحت جس کو ہم نے رواج دیا تھا وہ لوگ جو تاحد نظر پھیلے ہوئے زمین کے بڑے بڑے خطوں کے مالک تھے کچے جھونپڑیوں میں رہنے والے کسان بن گئے جن کے پاس صرف کھانا پکانے کے کچھ برتن بھانڈے تھے۔''[1]

جہاں تک اودھ کے تعلقداروں کا تعلق تھا، اُنھیں بلاشبہ جاگیردارانہ حقوق حاصل تھے۔ 1856 میں اودھ کے الحاق کے وقت اودھ کا دوتہائی حصہ اُن کی ملکیت تھا۔ لیکن برطانوی حکومت انھیں محض ''مال گزاری وصول کرنے کی خاطر مقرر کئے گئے درمیانی لوگ''[2] سمجھتی تھی۔ حکام بندوبست کا نظریہ تھا کہ ''تعلقدار ایک نودولتیا اور فریبی انسان ہوتا ہے...... کچھ نوجوان حکام بندوبست کا خیال تھا کہ ایک تعلقدار کو زمین سے محروم کرنا اتنا ہی بڑا کارنامہ ہے جیسے شیر کا شکار کرنا اور اس پر عمل کرتے تھے...... کارروائی اس طرح کی جاتی تھی کہ جو لوگ اسے پسند نہیں کرتے تھے انھیں بھی بادل نخواستہ اس کی تعریف کرنا پڑتی تھی۔ سب کو برابر بنانے کا یہ عظیم نظام تھا جس نے ہر چیز کو پہلے اصولوں اور گرتے ہوئے آدم کی سطح تک پہنچادیا۔''[3]

ہومس کے مطابق ''لیکن حکام بندوبست، جنھوں نے مشہور و معروف رابرٹ مرٹنس برڈ سے تحریک پائی تھی، زیادہ سے زیادہ لوگوں کو بڑی سے بڑی مسرت سے ہمکنار کرنے کے تصور سے سرشار تھے۔ وہ تعلقداروں کو بے مصرف کاہلوں سے تعبیر کرتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ ایک فٹ زمین پر بھی اُن کے حق کو اُس وقت تک تسلیم نہیں کیا جائے گا جب تک وہ

---

[1] کے اور ملیسن، محولہ بالا، جلد 1، صفحہ 114

[2] Moral and Material Progress and Condition of India صفحہ 23

[3] محولہ بالا، صفحہ 116

حق ملکیت کا ویسا ثبوت نہ پیش کریں جو ایک انگریز وکیل کو مطمئن کر سکے۔"[1] کے کا کہنا ہے "بندوبست کی جاروب نے بچے کھچے مالکانِ اراضی سے جاگیروں کو پاک کر دیا اور حق ملکیت رکھنے والے کسانوں کی ایک نسل کو زمین کے جائز وارث تسلیم کر لیا گیا۔"[2]

مثال کے طور پر مہاراجہ مان سنگھ سے، جو 577 گاؤں کا مالک تھا اور حکومت کو سالانہ 20000 پانڈ بطور مالگزاری ادا کرتا تھا، چھ کے علاوہ سب گاؤں چھین لئے گئے اور اُس کی مال گزاری 20000 پانڈ سے گھٹ کر 200 پانڈ رہ گئی۔ ایک اور تعلقدار کے 378 گاؤں میں 266 چھین لئے گئے اور ایک کے 204 میں 155 چھین گئے۔[3]

دوسری کاروائی جس نے اس طبقے کو متاثر کیا معافی دار و فیل کار کی زمینوں کو واپس لینا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر زمینیں اُن لوگوں کا ترکہ تھیں جنھوں نے حکومت کی شاندار خدمات سرانجام دی تھیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مغل سلطنت کے زوال کے انتشار پذیر زمانے میں اُن میں کچھ زمینوں کو ناجائز طور سے حاصل کر لیا گیا ہو۔ فی الجملہ تحقیقات کا حکم دیا گیا۔ اُس کا جو نتیجہ ہوا اُسے کے الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔"معافی داروں سے زمین خالی کروانے والے حاکم کو پورے اختیارات سونپ دیے گئے۔ معافی نامے طلب کئے گئے۔ اُن کے جائز ہونے کے ایسے ثبوت پیش کرنے تھے جو سرکاری کارکن کو مطمئن کر سکیں۔ اتنی مدت تک قابض رہنے کے بعد اُن سے کہنا کہ ثبوت پیش کریں ایک تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ اُس وقت اُن کے پاس محض ایک ثبوت تھا اور وہ تھا اُن کا قبضہ اور دخل۔ اُس کے بعد مظالم کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس میں شک نہیں کہ اُس کے بعد جو کچھ کیا گیا اُسے عام ضبطی سے تعبیر کیا جانا چاہئے۔"[4]

متاثر ہونے والوں میں سے بہت سے علم دوست حضرات تھے۔ وہ علما تھے جنھیں بزرگوں اور عالموں کے طور پر مذہبی خدمات سرانجام دینے کے لئے مدد معاش ملی تھی۔ اُن کے حقوق اور

---

[1] ہومس، محولہ بالا، صفحہ 25

[2] کے اور ملیسن، محولہ بالا، جلد 1، صفحہ 114

[3] Statement Exhibiting the moral & material progress and condition of India 1872-73، صفحہ 23

[4] کے اور ملیسن، محولہ بالا، جلد 1، صفحہ 123

ذرائع معاش کی ضبطی تلخی پیدا کرنے کی ایک بڑی وجہ بن گئی اور انھیں دشمنی پر آمادہ کر دیا۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ برطانوی حکومت کے خلاف لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے میں مولویوں کا بڑا ہاتھ تھا۔

نظام مالگزاری کے شکار چھوٹے لوگ بھی ہوئے، واقعہ یہ ہے کہ چھوٹے زمینداروں کی تعداد اور زیادہ تھی۔ وہ کئی ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے یعنی راجپوت، برہمن، جاٹ، گوجر وغیرہ تھے۔ حاصلہ حقوق پر حملہ نے انھیں دشواریوں میں مبتلا کر دیا اور اُن کی وجہ سے سپاہی بھی دشواریوں میں مبتلا ہو گئے اس لئے کے سپاہی اُن چھوٹے زمینداروں کے خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے جن کی آمدنی خاندان کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے کافی نہیں تھی۔ روٹی روزی حاصل کرنے کے لئے انھوں نے سپاہی کا پیشہ اختیار کر لیا تھا۔

کسانوں کی بے چینی

کسان بھی خوش نہیں تھے۔ عظیم بغاوت کے واقعات کے سرکاری بیان میں کہا گیا ہے۔[1]

گنگا پار 6 کے پرگنوں میں شورش کے اسباب مختلف تھے۔ اُن کا تعلق مذہب سے زیادہ نھیں تھا۔ ہمارے حوالے کئے جانے کے وقت ان پرگنوں کے گاؤں کے بڑے بڑے تعلقے ٹھاکر خاندانوں کی ملکیت تھے۔ قدیم زمیندار جو عادتاً فضول خرچ تھے اور لوٹ کھسوٹ کر کے گزر معاش کرتے تھے اپنی فضول خرچیوں کی بنا پر تباہ ہو گئے اور ہمارے ضابطوں اور قانونوں کی بنا پر اُن کی جائدادیں نیلام ہو گئیں۔ کسان اور غریب طبقے نیلام خریدنے کے مقابلے میں ان کا زیادہ لحاظ کرتے تھے۔ چاہے نیلام خریدنے والا کتنی مدت تک جائداد پر قابض کیوں نہ رہا ہو اب بھی سابق زمیندار اور اُس کا خاندان گاؤں کے سب سے زیادہ با اثر لوگ سمجھے جاتے تھے۔ اکثر اوقات گاؤں کے غریب لوگ انھیں ایک قسم کا خراج ادا کرتے تھے اور وہ اُس کے عوض اُن کی مدد کرتے تھے۔

---

[1] الہ آباد کے قائم مقام کمشنر ای۔سی۔بیلی کے نام الہ آباد کے قائم مقام مجسٹریٹ ایف۔ٹامسن کا مراسلہ مورخہ 9 نومبر 1958

Narratives events attending the break of disturbances and the Restoration of authority in the Allahabad distric in 1958.

نیلام خرید نے والا عام طور سے شہر کا رہنے والا ہوتا تھا جو لگان وصول کرنے یا ڈگری جاری کرانے کے قابل نفرت مقصد کے علاوہ کبھی گاؤں نہیں جاتا تھا۔ قدرتی طور سے لوگ زمینداروں کا ساتھ دیتے تھے۔ جنھوں نے اس بغاوت کو پرانی حیثیت دوبارہ حاصل کرنے کا بہترین موقع سمجھا انھوں نے پہلے تو ہر اُس چیز کو تباہ کر دیا اور لوٹ لیا جس کا تعلق یورپ سے تھا اور اُس کے بعد اپنی پرانی جائیدادوں پر بالجبر قبضہ کر لیا۔

اُن علاقوں میں بھی زراعت کی صورت حال اتنی ہی خراب تھی جہاں رعیت داری طریقہ رائج تھا۔ بمبئی پریسیڈنسی میں میراث دار ختم کر دیئے گئے جو زمین کے موروثی مالک تھے اور اراضی کا ایک مقررہ محصول ادا کرنے کی صورت میں وہ اُس پر قابض رہ سکتے تھے اور جب تک وہ محصول ادا کرتے رہیں انھیں بے دخل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

1824 لغایت 1828 پرنگل نے مجموعی پیداوار کا 55 فی صدی سرکاری مطالبہ مقرر کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کسانوں نے اپنے کھیت چھوڑ دئے اور بڑے بڑے قطعوں پر کاشت ختم ہوگئی۔ 1835 میں اس کی جزوی تلافی کی گئی۔ پھر بھی 1852 کی پارلیمانی کمیٹی کے سامنے سر جارج کی شہادت کی رو سے رعیت داری علاقوں کے لوگ غربت اور افلاس کا شکار تھے۔[1] 1817 اور 1835 کی درمیانی مدت میں مالگزاری قریب قریب دگنی ہوگئی تھی یعنی 8,68,000 پاؤنڈ سے بڑھ کر 15,35,000 پاؤنڈ ہوگئی تھی۔

مدراس پریسیڈنسی میں بھی حالات بہتر نہیں تھے۔ 1820 میں رعیت داری بندوبست کی کاروائی شروع کی گئی اور 1817 میں وہ پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ رمیش دت کے الفاظ میں اس کا نتیجہ تھا ''تیس سال تک مدراس کے صوبے میں ایسے مظالم اور زرعی دکھ دیکھنے میں آئے جن کی مثال اُس عہد کے ہندوستان میں بھی نہیں ملتی ہے۔''[2]

بعد میں ہونے والے بندوبستوں نے اس صورت حال میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں کی۔ 53-1852 میں بوردیلون نے دیکھا تھا کہ کسان روز کنواں کھود کر روز پانی پیتے تھے اور ہمیشہ

---

[1] دت رمیش، محولہ بالا، صفحہ 9

[2] ایضاً، صفحہ 68

چیٹی (مہاجن) کے مقروض رہتے تھے۔

شمال کے صوبوں کی طرح بمبئی اور مدراس میں شورش نہ پھوٹنے کی وجہ سے اطمینانی کی کمی نھیں تھی۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ رعیت داری نظام نے انھیں ضروری قیادت سے محروم کر دیا تھا۔ بڑی حد تک بمبئی کے میراث دار اور مدراس کے پولیگر اور زمیندار ختم کئے جا چکے تھے۔

حالانکہ مجموعی اعتبار سے یہ حقیقت ہے کہ برطانیہ کے خلاف عام طور سے بے اطمینانی پائی جاتی تھی پھر بھی واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے کچھ حصوں میں اور کچھ طبقوں میں یہ احساس دوسروں کے مقابلے میں زیادہ تھا، اس اختلاف کی بڑی وجہ تھی مال گزاری کے نظام کی نوعیت۔ جن علاقوں میں زمینداری نظام تھا، وقفہ وقفہ سے بندوبست کیا جاتا تھا اور سرکاری مطالبے کی شرح میں تبدیلی کا بڑا بار اُٹھانا پڑتا تھا وہاں برطانیہ کا تختہ الٹنے کی خواہش میں معاشی دکھوں نے شدت پیدا کر دی تھی۔ زمینداری نظام رکھنے والے دوسرے علاقوں میں جہاں مال گزاری کی استمراری تشخیص تھی جو مقابلتاً کم تھی اور آسانی سے ادا کی جاسکتی تھی وہاں کے لوگ زیادہ شدید کارروائی کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔

شمالی ہندوستان میں بنگال کو جو زرعی نظام کے تجربوں کی سرزمین تھا، ابتدا میں بہت سے دُکھ اُٹھانے پڑے لیکن جب بندوبست استمراری کی ابتدائی بھاری شرح تشخیص کے نتائج کی شدت رفتہ رفتہ کم ہوگئی تو انیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے زمینداریوں کی نسلیں بڑھتی ہوئی خوشحالی کے دور میں داخل ہوگئیں اور 1857 میں اُن کی زمینداریوں کی آمدنی اتنی تھی جس سے وہ فی الجملہ مطمئن تھے۔ ان خاندانوں کے نوجوان انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم حاصل کرنے لگے اور اُس زمانے میں انھیں روزگار حاصل کرنے میں بھی زیادہ دشواری نھیں ہوتی تھی۔ وہ سرکاری ملازمتوں یا آزاد پیشوں میں داخل ہو گئے۔

نئے مالکان اراضی کا تعلق کئی ذاتوں سے تھا اور انتظام و انصرام یا جنگ کی روایات اُن میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ انھوں نے بدیسی حکومت کو قبول کرلیا اور اُن کے پہلے کے حکمرانوں کے متعلق العنان اور من مانے نظم حکومت پر اُن سے باضابطہ طریقے اور باقاعدہ طریقہ کار کو ترجیح دی۔ قدرتی طور سے وہ نوابوں کے فیڈرل حکومت کی بحالی کے خلاف تھے۔ باغیوں سے انھیں

کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ کلکتہ کے ہندو پیٹر یارٹ نے اُن کے نقطہ نظر کی وضاحت اُن الفاظ میں کی تھی۔

''ان صوبہ جات کے لوگ اپنی عادت اور تولیم کی بنا پر باغی سپاہیوں کی صفوں میں شامل نہ ہوسکیں گے یا قومی امن و امان میں خلل ڈالنے والوں کی حفاظت کی کم سے کم ذمہ داری بھی قبول نہیں کرسکیں گے۔ بنگالیوں نے کچھ اس امر کی خواہش نہیں کی ہے وہ جنگ میں فوجوں کی قیادت یا مایوس زندگی کی شہادت کی ناموری سے بہریاب ہوں۔ اُن کے پیشے اور اُن کی کامیابیاں تمام تر سول ہیں۔ ایک ہمہ گیر بصیرت سوچنے اور پہلے سے کسی مسئلہ پر غور و فکر کرنے میں اُن کی معاونت کرتی ہے۔ وہ اس سے واقف ہیں کہ اُن کے پرسکون ذہنی مذاق کے لئے برطانوی حکومت سب سے زیادہ موزوں ہے یہ کہ ایک مفتوح نسل جس حد تک خوشحالی حاصل کرسکتی ہے وہ برطانوی حکومت کے سازگار دور میں اُس حد تک خوشحالی حاصل کرسکیں گے۔ انھیں امید ہے کہ انگریزوں کے جذبہ انصاف پسندی سے جو اپنے نمائندوں کے ذریعے مقتدر کونسل پارلیمنٹ میں حصہ لیتے ہیں، قانونی اور دستوری طریقوں سے رجوع کرکے وہ وقت آنے پر اپنے بدیسی حاکموں کے ساتھ زیادہ برابری کے مدارج طے کرلیں گے اور ایشیا کی سب سے زیادہ منظّم سلطنت کے انتظام و انصرام کی باعزت ذمہ داری میں اُن کے شریک ہوسکیں گے۔ ہندوستانیوں کے دوسرے حصوں سے زیادہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ موجودہ شورش میں ملک کو بہت پیچھے دھکیل دیا ہے۔ [1]

صوبجات متوسط

1818 میں مرہٹہ سلطنت کے زوال کے بعد وہ علاقے انگریزوں کے ہاتھوں میں آگئے جن پر صوبہ جات متوسط مشتمل ہیں۔ مال گزاری کے بندوبست کی فوری کاروائی کی گئی۔ اس بندوبست کی خاص خاص باتیں یہ تھی کہ حکومت کے مطالبے کی تشخیص اونچی شرح سے کی گئی اور اُس پر نظر ثانی کرنے کی مدت کم کردی گئی۔ مالکان اراضی کے اُس طبقے کو تسلیم کرلیا گیا جو مالگزار کہلاتا تھا اور اُن کے سابق حقوق میں بیع اور رہن کے حقوق کا اضافہ کردیا گیا۔

بہت سے بھاری لگان کی وصولی میں برتی جانے والی سختی کے حسب دستور نتائج سامنے

---

[1] ہندو پیٹر یارٹ 4 جون 1857

آئے۔ ہوشنگ آباد اور سیونی کے اضلاع میں 1825 میں مال گزاری کی تشخیص 2,277 پاؤنڈ فی سال سے بڑھ کر 13,877 پاؤنڈ کر دی گئی۔ چونکہ اس رقم کی وصولی ناممکن ثابت ہوئی اس لئے اسے گھٹا کر 6,192 پاؤنڈ کر دیا گیا۔ یہ بھی اُس رقم سے تقریباً تگنی تھی جو مرہٹے وصول کیا کرتے تھے۔ نرسنگھ پور، دموہ، ساگر اور ہزبدا کے علاقوں میں بھی یہ طریقہ اپنا لیا گیا۔ 1853 میں ناگپور کے الحاق کے بعد وہاں بھی یہی کیا گیا۔

اضلاع سے مظالم، جائیدا کی قیمت گرنے تباہی اور بد نظمی کی اطلاعات آنے لگیں اور بے اطمینانی بڑے علاقے میں پھیل گئی۔ اُس کا تلخ ثمر تھا 1857 میں رونما ہونے والے واقعات۔

پنجاب

1839 میں مکمل الحاق کے بعد پنجاب میں مالگزاری کا بندوبست شروع کیا گیا۔ دوسرے مقامات پر تشخیص کی اونچی شرح نے جن دشواریوں کو جنم دیا تھا اُس کے تجربے کی بنا پر انگریزوں کے کان ہو گئے تھے اس لئے پنجاب میں بڑی احتیاط کے ساتھ بندوبست کئے گئے۔ زمین کی پیمائش، فصلوں کی قیمت اور تشخیص کے کاموں میں مقامی محاسبوں اور گاؤں کے نمائندوں کو شامل کیا گیا۔ 1856 میں حکومت کا مطالبہ اُس سے 25 فی صدی کم تھا جو سکھ حکومت وصول کرتی تھی۔ 1857-58 کی رپورٹ کے مطابق اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ''زراعت پیشہ طبقے بافراغت اور خاموش تھے، حالات کا شکار کوئی نہیں تھا، کوئی تبدیلی کا خواہش مند نہیں تھا۔''[1]

مالگزاری کی تشخیص کی شرح کم تھی اور بغاوت کے دوران پنجاب میں مقابلتاً پرسکون حالات کی وجہ یہی تھی۔

اذیتوں کا استعمال

ایسٹ، نارٹن اور اسٹوکس نے 1855 میں اپنی ریاست میں کہا تھا کہ سرکاری مالگزاری وصول کرنے کے لئے لوگوں کو اذیتیں پہنچائی جاتی ہیں۔ مالگزاری وصول کرنے اور پولیس کی تفتیش کے دوران اذیتیں پہنچانے کا بڑا الزام کمپنی کی حکومت پر لگایا گیا تھا۔ مسٹر بلیکٹ نے 11 جولائی 1854 کو ایک تحقیقاتی کمیشن کے تقرر کی تجویز پر بولتے ہوئے ہاؤس آف کامنز میں یہ

---

[1] فارن سلیکٹس سیریز نمبر 157 (360)، پیرا 371

مسئلہ اٹھایا تھا۔ اُس نے کہا ''کہ سرکاری مطالبات اتنے بھاری ہیں کہ بدقسمت رعیت ظالمانہ وصولی کے بوجھ کے نیچے پس رہی ہے''۔[1] اس کے خلاف سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ''اس پر اُن ذرائع کو استعمال کئے بغیر عمل نہیں کیا جا سکتا جنھوں نے اس کو انتہائی ناقابلِ برداشت ظلم میں تبدیل کر دیا ہے۔'' [2] اس نے مزید کہا کہ نظام کے تحت لوگوں کی حالت ''نہایت درجہ خائف کن ہوگئی ہے جنھیں زمین اور تباہی کے بوجھ نے جسمانی اور ذہنی طور سے خاک میں ملا دیا ہے۔ یہ بوجھ غربت، دُکھ اور فاقہ کشی کا بوجھ ہے۔''[3] مسٹر وینی سیمور نے کہا کہ مدراس کی حکومت کا بڑا مقصد تھا اُس شخص سے 10 شلنگ فی سال وصول کرنا جس کے پاس محض شلنگ تھے۔ یہ کام ہمیشہ آسان نھیں ہوتا تھا اور رقم وصول کرنے کے لئے اُس قسم کی جسمانی اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں جن کا رواج پچھلی صدی کے اوائل میں تھا۔''[4] جان برائٹ کے مطابق ''زمین غیر زرخیز نہیں تھی لیکن اُس پر اتنا بھاری محصول لگایا جاتا تھا کہ اُس میں کاشت کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔''[5] اس بات کو ثابت کرنے کے لئے کہ مال گزاری کی وصولی کے سلسلے میں جسمانی اذیتیں پہنچائی جاتی تھیں اس نے انگریزوں یعنی کلکٹروں اور دوسرے حاکموں کی شہادتیں پیش کیں۔ مسٹر آٹوے نے بحث میں حصہ لیتے ہوئے کلکتہ کے ایک بیرسٹر مسٹر تھیولڈ کا حوالہ دیا جس نے اُسے لکھا تھا ''ہندوستان میں قریب قریب ہر قسم کی خرابی اور برائی پائی جاتی ہے۔ آپ نے جسمانی اذیتوں کے متعلق جو اطلاعات حاصل کیں ہیں وہ میرے لئے نئی نھیں ہیں۔ میرا خیال ہے کہ کلکتہ کی ہر حوالات میں اُن پر عمل کیا جاتا ہے۔ زیادہ مدت نھیں ہوئی جب مضافات میں خود مجھے اس کا ثبوت ملا۔''[6]

---

[1] ہنسرڈس پارلیمنٹری ڈبیٹ، جلد cxxxv کالم 49

[2] ایضاً

[3] ایضاً، کالم 50

[4] ایضاً، کالم 61

[5] ایضاً، کالم 79

[6] ایضاً، کالم 89

پانچ ووٹوں سے یہ تحریک گر گئی اُس کے بعد ہال آف ایمپارل نے ہندوستان کے لوگوں کی شکایتوں کو دور کرنے کی خاطر ایک عرضداشت 16 جولائی 1855 کو ایوان میں پیش کی اور مدراس پریسیڈنسی میں مبینہ اذیتوں کی تفتیش کرنے والے کمیشنروں کی رپورٹ کا حوالہ دیا جس میں مالگزاری کے معاملات اور پولیس کے مقدمات کے سلسلے میں پہنچائی جانے والی اذیتوں کی نوعیت کی وضاحت کی گئی تھی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ ''مال گزاری کے وصولی اور پولیس کے مقدمات دونوں صورتوں میں اس پریسیڈنسی کے طول وعروض میں مقامی مال گزاری اور پولیس کے حکام لوگوں کے خلاف تشدد سے کام لیتے ہیں۔''[1]

ایک آزاد فرانسیسی مشاہد کمانڈر مارٹن نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اُن اذیتوں کی ذمہ اری خود کمپنی پر آتی ہے جنھوں نے 1857 میں بہت سے انگریز خاندانوں کو سوگوار بنادیا'' کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ (کمپنی کے) ایجنٹوں کی زیادتیوں کا انتقام لینے کے لئے باغیوں نے وہ خوفناک مظالم کئے جس نے پوری سلطنت میں غصے کی لہر دوڑادی ہے؟ بغاوت شروع ہونے سے مشکل سے ایک سال پہلے حکومت کے حکم پر کی جانے والی تفتیش سے ظاہر ہوا تھا کہ ہندوستانیوں کو جسمانی اذیتیں پہنچانے کا ایک قابل نفرت باقاعدہ نظام پایا جاتا ہے جس سے عورتیں بھی محفوظ نہیں ہیں۔ اس تحقیقات کے بعد انگلستان کو، جو ہوورڑ اور ویلبرفورس کی سرزمین ہے، اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ کمپنی کے ملازم ہندوستانی مقبوضات میں اس قسم کی خباثت آمیز جسمانی اذیتیں پہنچاتے ہیں جو غیر مہذب طریق عملی کی آپ مثال ہیں۔''[2]

انتظامیہ سے ہندوستانیوں کی علیحدگی

بالائی طبقوں کی مزاحمت اور بے اطمینانی کی کئی اور وجوہ تھیں۔ سید احمد خاں کا خیال تھا کہ حکومت کے اثر اور اُس کی کارروائیوں سے ہندوستانیوں کی مکمل علیحدگی سے اہم تھی۔ انھوں نے

---

[1] ایضاً، جلد cxxxlx کالم 73-872۔ مدراس میں مبینہ جسمانی اذیتوں کی تفتیش کرنے والے کمیشن کی رپورٹ دیکھئے ٹارچر (مدراس)، 24 جولائی 1855۔

[2] مارٹن کمانڈ، La puissence Millataire des Aglais daus L'inde etc:, insurrectiordes cepayes (1859) صفحہ 447

لکھا تھا ''یہ بات عام طور سے تسلیم کی جاتی ہے کہ اچھی اور مناسب حکومت اور استحکام کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک کی حکومت میں رعایا کا بھی دخل ہو۔ اس سے پہلے کہ خرابیاں اُس منزل تک پہنچ جائیں جب اُن کا تدارک ناممکن ہو صرف عام لوگ منتظمین کو اُن کی پالیسیوں کی اچھائیوں اور برائیوں سے باخبر رکھ سکتے ہیں۔ اور یہ اُس وقت تک نہیں کیا جا سکتا ہے جب تک رعایا کو ایسی حکومت کے معاملات میں دخل و رسوخ حاصل نہ ہو جو ہمارے لوگوں سے مذہب، روایات، طور طریق، رواجوں، مزاج اور عادات میں مختلف ہے۔ ہندوستان کے لوگوں کو مجلس قانون ساز سے دور رکھنا کسی طرح جائز قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اُن کو دور رکھنے کی وجہ سے نہ صرف اتنا نقصان ہوا کہ حکومت کو اُن قوانین و ضوابط کی حقیقی خامیاں نہیں معلوم ہو سکیں جنھیں اس نے نافذ کیا، بلکہ اُس کا بدترین نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت اپنی رعایا کے حقیقی اغراض و مقاصد اور ارادوں سے واقف نہ ہو سکی اور لوگ حکومت کی تمام تر تجاویز کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا رہے۔''[1]

IV ہندوستانیوں کے ساتھ برا سلوک

ایک اور وجہ تھی ہندوستانیوں کی طرف انگریزوں کا بدلا ہوا رویہ۔ یہ تبدیلی، نتیجہ تھی نپولین کے خلاف جنگ میں انگلستان کی کامیابی، صنعتی انقلاب کی بنا پر بڑھتی خوشحالی، میتھوڈزم اور ایونجیلیکلوم کی طرح مذہبی تحریکوں کے پھیلاؤ اور سماجی رسم و رواج اور اخلاقی معیارات میں سدھار کا۔ ان تمام وجود کی بنا پر انگریزوں میں دوسروں کے مقابلے میں احساس برتری پیدا ہو گیا اور اُن کے قومی فخر و مباہات میں اضافہ ہو گیا۔

بال کے مطابق ہندوستان کی مقامی نسلوں کے ساتھ یورپی حکام اس قسم کا برتاؤ کرتے تھے ''جسے کوئی بھی باحمیت لوگ ایک گھنٹے کے لئے بھی برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔''[2] اس نے ایک ہندوستانی مصنف کی شہادت پیش کی جس نے لکھا تھا ''سول اور فوجی دونوں قسم کے انگریز حکام کی

---

[1] رسالہ اسباب بغاوت ہند، 1858 انگریزی ترجمہ از گرہم اور کرلون (بنارس 1873) صفحات 13-12 ڈاکٹر صدیقی کا اڈیشن، صفحات 116-115۔

[2] بال، محولہ، جلد دوم، صفحہ 636

ایک بڑی اکثریت اپنے ماتحتوں ملازموں اور سپاہیوں کے ساتھ اور ملک کے عام لوگوں کے ساتھ بھی بدکلامی کرتے ہیں''۔[1] اُس کا خیال تھا کہ حاکموں اور محکوموں کے درمیان ایک خلیج حائل تھی ''روز بروز وسیع تر اور ناقابل عبور بنتی جارہی ہے۔ علاوہ ازیں کمپنی کے سول اور فوجی ملازمین پڑھے لکھے مقامی باشندوں کے ساتھ بھی جس توہین آمیز لہجے اور طریقے سے بات کرتے ہیں اور جس قسم کے تکبر کا مظاہرہ کرتے ہیں اُس نے دونوں فریقوں میں جذبہ خیر سگالی اور اعتماد پیدا نہیں ہونے دیا۔''[2]

سکریٹریٹ آف اسٹیٹ فار انڈیا لارڈ اسٹیلی نے 10 دسمبر 1857 کو اولیس کومب کالج کے نوجوان کیڈٹوں کے سامنے ساتھ تقریر کرتے ہوئے ہندوستان میں یورپیوں کے ''تکبرانہ اور نفرت انگیز احساس برتری''[3] کی طرف اشارہ کیا تھا۔

1818 میں منزو نے گورنر جنرل لارڈ ہیسٹنگز کو لکھا تھا ''بدیسی فاتحین نے مقامی آبادی کے خلاف تشدد اور اکثر اوقات بڑی سنگدلی سے کام لیا ہے لیکن کسی نے اُس قسم کا ذلت آمیز برتاؤ نہیں کیا جیسا ہم نے کیا۔ کسی نے پوری قوم کے چہرے پر کالک نہیں لگائی اور اُس کو ناقابل اعتماد، دیانت داری سے محروم اور اس قابل نہیں ٹھہرایا جس کو محض اُس وقت استعمال کیا جائے جب اُس کے بغیر کام نہ چلے۔ یہ بات محض غیر شریفانہ نہیں بلکہ مصالح کے منافی بھی ہے کہ جو لوگ ہمارے زیرنگیں ہیں اُن کے کردار کو ہدف ملامت بنایا جائے۔''[4]

اُس نے مزید کہا ''ہمارے نظام کی اصل خرابی وہ ذلت آمیز حقیقت ہے جو ہم نے مقامی باشندوں کو دی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ وہ توہم پرست، جاہل اور جھوٹ اور بے ایمانی کی طرف مائل ہیں۔ اُن کی خوشحالی کے لیے ہمارا جوش اس امر کی اجازت نہیں دیتا کہ اتنے پست ذہنیت لوگوں کو ملک کے انتظام میں کوئی حصہ دیا جائے۔ ہم انھیں قابل اعتماد اور منافع بخش عہدوں سے

---

[1] ایضاً

[2] ایضاً

[3] ایضاً 637

[4] کلیک، The Life of Major General Sir Thomas Munzo جلد دوم، صفحات 85-86

دور رکھتے ہیں۔ ہم انھیں ادنیٰ ترین عہدوں تک محدود رکھتے ہیں جہاں ان کو محض اتنی یافت ہوتی ہے جو انھیں زندہ رکھ سکے۔ یہ عہدے بھی اُن کو محض اس لیے دیے جاتے ہیں کیونکہ یورپین اُن پر کام کرنے کی استعداد نہیں رکھتے۔ ہم انھیں انسانوں کی فرو نسل سمجھتے ہیں...... ہم انھیں اس گری ہوئی حالت تک پہنچا دیتے ہیں اور اُس کے بعد بڑی حقارت کے ساتھ ہم انھیں اعلیٰ عہدوں کے نا قابل سمجھتے ہیں۔''[1]

مارکوئز اف کلینریکارڈ نے فروری 1857 میں ہاؤس آف لارڈز میں اُس نظام پر بحث کرتے ہوئے کہا تھا جس کے تحت حکومت ہند انتظام و انصرام کرتی تھی، سچ تو یہ ہے کہ وہ نظام جس کے ذریعے ہندوستان پر حکومت کی جاتی ہے مقامی باشندوں میں گراوٹ پیدا کرنے اور انھیں چالاکی، کمینگی اور دھوکے بازی سے کام لینے پر اکسانے کا باعث ہے۔''[2]

ہندو مذہب اور رسم و رواج کے متعلق انگریزوں کا حقارت آمیز رویہ

انگریزوں کے دلوں میں ہندوستانیوں کے تعلق سے جو جزبہ تحقیر پایا جاتا تھا اس کا اطلاق ان کے مذہب اور تہذیب پر بھی ہوتا تھا۔ ہندو دھرم کے تمام پہلوؤں کی خدمت میں عیسائی مشنری سب سے آگے تھے اور بہت سے سول اور فوجی افسر اس امر کو اپنا فرض منصبی تصور کرتے تھے کہ ہندوستان کے تاریک خیالوں کو عذاب ابدی سے محفوظ رکھنے کے لئے بشارت عیسوی کی ترویج کریں۔ غالباً اس کی وجہ تھی ہندوستانی نظام مذہب کے متعلق اُن کی عدم واقفیت۔ واقعہ یہ ہے کہ ولیم بیٹنگ نے اے دوبو کی کتاب کے متعلق رائے ظاہر کرتے ہوئے کہا تھا ''ہندوستان میں اپنے زمانہ قیام میں جو کچھ میں نے دیکھا وہ یہ ہے کہ بالعموم یورپ کے لوگ ہندوؤں کے رسم و رواج کے متعلق بہت کم یا بالکل نہیں جانتے ہیں۔ ہم سب کچھ اہم نشانات و واقعات سے واقف ہوتے ہیں جو وہاں جانے والا ہر شخص پڑھ سکتا ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہم میں سے زیادہ تر اُن کے انداز فکر اور اُن کی گھریلو عادتوں اور رسموں سے ناواقف ہوتے ہیں جو کسی قوم کو سمجھنے کے لئے

---

[1] اقتباس The Mutinies, The Government and the People by a Hindu کشوری فوچند مشرا (کلکتہ 1858)، صفحہ 37

[2] بال، محولہ بالا، جلد اول، صفحہ 42

ضروری شرائط ہیں۔ ہم اُن کی زبان بھی پوری طرح نہیں سمجھتے ہیں۔ اور انھیں اُن کے گھروں اور خاندانوں میں دیکھنے کا موقع ہمیں نہیں ملتا ہے۔''[1]

مائیکل ایڈورڈسن نے کہا ہے ''اٹھارھویں صدی میں ہندوستانی اور انگریز ایک دوسرے کے ساتھ برابری کا برتاؤ کرتے تھے جیسا کہ ملک کی طاقتیں کرتی ہیں۔ لیکن اُس صدی کے آخری دنوں میں وہ کشیدگیاں نمودار ہونے لگیں جو 1857 کے غدر کی سبب بنیں جوں جوں انگریزوں میں اپنی طاقت کا شعور بڑھتا گیا وہ دور ہٹتے گئے اور اُن تک رسائی مشکل ہوگئی اور سماجی حکومت کے لازمی جُز کے طور پر کمتر اور مفتوح لوگوں کے لئے حقارت کا جذبہ حکمراں طبقے کی نمایاں خصوصیت کے طور پر روز بروز بڑھنے لگا۔[2] انگریز اُن لوگوں سے بالکل علیحدہ رہتے تھے جن پر وہ حکومت کرتے تھے۔ انھوں نے نیپیر کے مشورے کو قابل اعتنا نہیں سمجھا یعنی ''ہر چیز میں انھیں حصہ دیجئے یہاں تک کہ ہم اُن میں آمیز ہو جائیں اور قوم بن جائیں۔''[3]

شورش کی اصل وجہ تھی لوگوں کے مختلف حصوں کی سیاسی اور معاشی شکایتیں۔ مذہب کے لیے جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا وہ گڑبڑی کی مزید وجہ بن گیا اس لئے کہ ہندو مذہب کو زندگی کا سرچشمہ اور وجود کی بنیاد سمجھتے ہیں۔ اپنے مذہب سے دور ہو جانے کے بعد ہندو یا مسلمان ایک ایسی کشتی کی طرح تھا جس میں لنگر اور پتوار نہ ہو۔ وہ سب سے زیادہ خائف اس سے تھا کہ جانے پہچانے ماحول سے اٹھا کر کسی انجان اور اجنبی دنیا میں پھینک دیا جائے۔ یہ خیال ہی اُس کے لئے پریشان کن تھا۔

عیسائی مشن کا پرچار

سید احمد خاں نے کہا کہ حکومت کے سماجی اقدامات، مشنریوں کی کارروائیوں اور سرکاری حکام کے بیانوں نے مل کر لوگوں میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ حکمراں ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے

---

[1] دوبو، بے۔ جے۔ اے، Hindu Annual Customs and Ceremonies ترجمہ ایچ۔ کے۔ دیپو چمپ (آکسفورڈ 1906) صفحہ xv

[2] دیکھئے رسل ڈبلیو۔ ایچ، My Indian Mutiny Diary تدوین از مائیکل ایڈورڈسن (لندن 1957)

[3] The Mutinies, The Government and the People محولہ بالا، صفحہ 38

کا ارادہ رکھتے ہیں۔

1813 کے بعد، جب انھیں ہندوستان میں آباد ہونے کی اجازت دی گئی۔ عیسائی مشنریوں کا پرچار بڑھنے لگا۔ اُن کے پادری بازاروں اور میلوں میں نظر آنے لگے۔ اکثر اوقات پولیس اُن کے ساتھ ہوتی تھی۔ سرسید نے لکھا ''مشنریوں نے انجیل کی تبلیغ کا ایک نیا طریقہ رائج کیا تھا۔ ایسے مذہبی رسالے شائع کئے اور لوگوں میں تقسیم کئے جانے لگے جو سوالوں اور جوابوں پر مشتمل ہوتے تھے۔ اپنے مذہب کی تبلیغ کرنے کی خاطر وہ حسب مرضی مسلمانوں کی مسجدوں، ہندوؤں کے مندروں اور میلوں میں جاتے تھے اور حکومت کے خوف کی بنا پر کوئی اس پر اعتراض کرنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔ اس کے علاوہ کچھ اضلاع میں وہ خدمت کے لئے چپراسی کو استعمال کرسکتے تھے یا تھانے سے کسی سپاہی کو بلا سکتے تھے۔ یہ لوگ محض انجیل کی تبلیغ پر اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ دوسرے مذاہب کے بزرگوں اور مقدس مقامات کا ذکر بڑے توہین آمیز انداز میں کرتے تھے جس سے سننے والوں کی دل آزاری ہوتی تھی اور اُن کے دلوں میں حکومت کے خلاف بے اطمینانی کا جذبہ جڑ پکڑ لیتا تھا۔[1]

جن اقدامات کو قابل اعتراض سمجھا گیا وہ تھے ستی کی رسم کو ختم کرنا، ہندو بیواؤں کی دوبارہ شادی، عیسائی مذہب قبول کرنے والے کا حق موروثی جائیداد پر تسلیم کرنا، مختلف ذاتوں کے قیدیوں کے لئے یکساں کھانے کا انتظام، ریلوے میں ذات پات کا خیال نہ کرنا، سپاہیوں کی بھرتی کی شرط کہ انھیں باہر کے ملکوں میں جانا پڑے گا اور پوری کے جگناتھ مندر کی طرح مندروں کا انتظام سنبھالنا۔ اخلاق اور انتظامی کارکردگی کی بنیاد پر ان تمام اقدامات کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے۔ ان میں سے کچھ کو روشن خیال ہندوستانیوں کی حمایت حاصل تھی۔ لیکن پرانے خیال کے لوگوں کی ان سے بڑی دل آزاری ہوئی۔ چونکہ ان فیصلوں میں ہندوستانیوں کو دخل نہیں تھا اس لیے وہ انھیں اوپر سے لادے گئے ایسے فیصلے سمجھتے تھے جن کا نفاذ ایک بدیسی طاقت کی مدد سے کیا جارہا تھا۔

تعلیم کے نئے انتظام کے میدان میں پنڈت اور مولوی کی اجارہ داری کو ختم کردیا اور

---

[1] رسالہ اسباب بغاوت ہند (انگریزی ترجمہ) صفحہ 18 اور ڈاکٹر صدیقی اڈیشن، صفحات 115-118

نوجوانوں کے ذہنوں میں ایسے تصورات پیدا کردئے جن کی بنا پر ہندوستانی مذاہب کے عقائد و رسموں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔ چونکہ تعلیم کے نظام میں عیسائی مشنریوں کا بڑا اثر تھا اس لئے نئے تعلیمی اداروں کو تبدیلی مذہب کے مراکز تصور کیا جانے لگا۔

ایک طرف تو مشنری کھل کر ہندو دھرم اور اسلام کا مذاق اڑاتے تھے اور اُن کی خدمت کرتے تھے جس کی وجہ سے لوگوں کو غصہ آتا تھا مگر عیسائی حکمرانوں کی حکومت کے تحت وہ اُس کو ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ دوسری طرف بہت سے سول اور فوجی افسر اُس کی حمایت کرتے تھے جس کو وہ یسوع مسیح کی اعلیٰ وارفع تعلیمات سمجھتے تھے اور مشنری نہ ہونے کے باوجود تبلیغ کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ ریورنڈ ایم۔ ایڈمند نے 1855 میں کلکتہ سے ایک گشتی چھٹی شائع کی جس میں اُس نے کہا ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت آ گیا جب اس بات پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا جانا چاہئے کہ سب لوگوں کو ایک مذہب قبول کرنا چاہئے یا نہیں۔ ریلوے، دخانی جہاز اور تار برقی تیزی کے ساتھ دنیا کے لوگوں کو متحد کر رہے ہیں...... کیا اس تصور کو معقول نظور سمجھا جاتا ہے کہ ہر قوم بر بنائے قیاس خدا کی مہربانی سے اپنے لئے ایک رستے کا انتخاب کرے۔ یا یہ کہ اُس خدائے واحد نے جس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے، اپنے خاندان کے مختلف حصوں کی موجودہ اور آئندہ مسرت کے لئے مختلف طریقے متعین کئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا نہیں ہوسکتا ہے۔ عیسائی مذہب وہ واحد مذہب ہے جو دعویٰ کرتا ہے کہ راست وحی کے ذریعے وہ خدا کی طرف سے آیا ہے۔ یہ واحد مذہب ہے جو اس دنیا میں مسرت کا باعث ہے اور دوسری دنیا میں جس کے حالات کا انکشاف اُس نے کیا ہے...... چونکہ ہم نے اس سے بہت سی سعادتیں اور برکتیں پائی ہیں ہم چاہتے ہیں کہ ان کے حصول میں دوسروں کی ہمت افزائی بھی کی جائے۔

ہماری خواہش ہے کہ گرجا ہندوستانیوں سے بھرے ہوں جہاں نہ صرف بدیسی بلکہ اس ملک کے لوگ بھی باقاعدگی سے مسیحی مذہب کی بشارت دیں اور جہاں وہ اپنے گناہوں سے توبہ کریں اور خدا کی حضور جانے کے لیے خود کو تیار کریں اور جہاں بچوں کو اخلاق اور سچائی کی تعلیم دی جا سکے۔[1]

---

[1] اقتباس، رسالہ اسباب بغاوت ہند، صفحہ 22 اور ڈاکٹر صدیقی اڈیشن، صفحات 192-202

V سپاہیوں کی شکایتیں

جو شکایتیں بالائی طبقوں کے ذہنوں کو پریشان رکھتی تھیں اُن میں بنگال آرمی کے ہندوستانی سپاہی بھی شریک تھے جو زیادہ تر برہمن اور راجپوت تھے لیکن انھیں کچھ اور بھی شکایتیں تھیں۔ اُن میں مندرجہ ذیل شامل تھیں۔ ملازمت کے غیر اطمینان بخش حالات، مذہبی رسموں میں مداخلت اور اُن کے وقار وعزت نفس کو پہنچائے جانے والے صدمے۔

جہاں تک ملازمت کی شرائط کا تعلق تھا ترقی اور تنخواہ کے مسائل سب سے زیادہ تکلیف دہ تھے۔ اس لیے کہ اُن کا اثر سپاہیوں کی ملازمت اور وفاداری پر پڑتا تھا۔ ابتدائی زمانے میں جب کمپنی جنوب میں اپنی بقا کے لیے فرانسیسی رقیبوں اور دکنی حکمرانوں کے خلاف جنگ کر رہی تھی ہندوستانی سپاہی ترقی کر کے افسروں کے عہدوں تک پہنچ سکتے تھے جو یورپی اور ہندوستانی فوجوں کی آزادانہ کمانڈ کرتے تھے۔ بنگال کی فتح کے بعد جب انگریز افسروں کی بڑی تعداد ہندوستان آ گئی اور کارنواس نے انگریزوں کو افسر بنانے کی پالیسی اختیار کی تو ان عہدوں کے دروازے ہندوستانیوں کے لیے پوری طرح بند ہو گئے۔ ہندوستانیوں کو معمولی سپاہیوں کی حیثیت دی گئی اور کمیشنڈ افسروں کے عہدوں تک پہنچنے کے تمام امکانات ختم ہو گئے۔ بالائی طبقوں سے تعلق رکھنے والے اُن سپاہیوں کے لیے جو مغل حکومت اور ہندوستانی حکمرانوں کی فوجوں کو اعلیٰ ترین حیثیت کے کمانڈر مہیا کر چکے تھے، یہ واقعہ اس توہین آمیز صورت حال کا مظہر تھا کہ انگریزوں کے تحت اُن کی حیثیت کمتر ہے۔

تنخواہوں کا مسئلہ زیادہ الجھا ہوا تھا۔ یوں بھی تنخواہیں کم تھیں اور یورپی سپاہیوں کی تنخواہوں کے مقابلے میں تو اور بھی کم تھیں۔ ہندوستانی سپاہی کا تعلق سماج کے معزز گروہوں سے تھا۔ اسے اپنے پیشے پر بڑا فخر اور اخلاق اور پیشے کے اونچے معیار رکھتا تھا۔ اس کے برخلاف یورپی سپاہی کی خود اُس کے سماج میں عزت نہیں کی جاتی تھی اور اُس کے عادات واطوار بہت اچھے نہیں تھے۔

دونوں کے درمیان بڑا فرق تھا۔ اور اُن کے تنخواہوں کا فرق ذلت آمیز تھا۔[1] اگر اُن کے مختلف معیار زندگی کے پیشِ نظر تنخواہوں اور بھتوں کی مختلف شرحوں کو جائز قرار بھی دیا جائے پھر بھی ہر جنگ کے بعد اُن کی تنخواہ اور بھتے کے سلسلے میں جو غیر یقینی حالات پیدا ہو جاتے تھے اور جن مانے طریقے سے اُن کا فیصلہ کیا جاتا تھا اُس کا کوئی جواز نہیں تھا۔ سر ہنری لارنس نے اُس وقت اس کی طرف اشارہ کیا تھا جب اُس نے لکھا ''فوج کی ضرورتوں میں غالباً سب سے بڑی ضرورت ہے تنخواہ کا ایک سیدھا سادا ضابطہ جس میں ہر حال میں اور ہر شعبے کے تمام چھوٹی بڑی حیثیتوں کے سپاہیوں کی تنخواہ واضح انداز سے دکھائی جائے۔ اس سلسلے میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہونی چاہئے۔ اس وقت بہت سے شبہات پائے جاتے ہیں...... حالانکہ تنخواہ اور اڈٹ کے ضابطوں کی جلدیں موجود ہیں۔''[2]

ظاہر ہے کہ اس بات پر سپاہیوں کو بڑا غصہ آتا تھا کہ کسی صوبے کی فتح اور الحاق کے بعد بھتہ ختم کر دیا جاتا تھا اور انہی سپاہیوں کو کم تنخواہیں دے کر اُن علاقوں میں رکھا جاتا تھا۔ غریب سپاہی کو محض 7 روپیہ ماہوار تنخواہ ملتی تھی جس میں سے وہ ساڑھے تین روپے کھانے پر صرف کر دیتا تھا اور دو سے ڈھائی روپے تک زندگی کی دوسری ضروریات پر خرچ کرتا تھا اور بڑی مشکل سے ایک یا ڈیڑھ روپیہ بچا پاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی تنخواہیں پانے والے سپاہیوں کو جو بات گھر سے دور جانے پر اکساتی تھی وہ تھا روپیہ بچانے کا خیال جو وہ اپنے خاندان کو بھیج سکے۔ لیکن یہ اُس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

زمانۂ امن میں اس قسم کی بے اطمینانی تو ہمیشہ موجود ہی رہتی تھی۔ اس میں اضافہ اُس وقت

---

[1] ''انگلستان میں بہت کم لوگ ایک معزز پیشے کے طور پر فوج میں ملازمت کرتے ہیں یا اُسے گزر بسر کا ایک مفید ذریعہ سمجھتے ہیں۔ عام طور سے رنگروٹ ایک بے سہارا سویلین ہوتا ہے۔ جس کی مالی حالت خراب اور شہرت داغدار ہو چکی ہوتی ہے اسے لالچ دے کر یا دھوکے کی پٹی سے فوج میں پھانس لیا جاتا ہے۔ وہ یا تو ایسا شخص ہوتا ہے جس کا اپنی محبوبہ سے جھگڑا ہو گیا ہو یا وہ جس نے اپنے مالک کی چوری کی ہو۔ وہ اپنے لوگوں کے صبر کا پیمانہ لبریز کر چکا ہوتا ہے اور باہر کی دنیا اُس کو بھول چکی ہوتی ہے۔ ایسا شخص سپاہی بن جاتا ہے'' کے اور ملیسن، محولہ بالا، جلد 1، صفحہ 185

[2] کے اور ملیسن، محولہ بالا، جلد، 1 صفحہ 36

ہو گیا جب معاہدے کی شرائط کے خلاف ہندوستان کے باہر افغانستان اور برما لڑنے کے لیے انھیں بھیجنے کا غیر معقول فیصلہ کر کے انگریزوں نے برہمن اور راجپوت سپاہیوں کے مذہبی جذبات کو مجروح کیا۔ مسلمان کے درمیان رہنا اور اُن کا چھوا ہوا کھانا کھانا یا پانی پینا اُن کی روایت کے قطعی منافی تھا اور سمندر پار کرنا دھرم سے دست بردار ہونے کے مترادف تھا۔ ان میں سے کوئی بھی عمل کر کے وہ ذات باہر ہو جاتے تھے جو اُن کی سماجی زندگی کا کلیدی عنصر تھی۔

مالی دشواریوں اور مذہبی اشتعال کی بنا پر سپاہی کو انگریزوں کے متعلق پھیلائی جانے والی کہانیوں پر یقین آ گیا کہ وہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانا چاہتے ہیں۔ سر ہنری لارنس نے لارڈ کیننگ کو رپورٹ میں کہا تھا کہ اودھ توپ خانے کے ایک جمعدار کو، جو اچھے کردار کا انسان ہے، یقین ہے کہ ''پچھلے دس سال سے حکومت مقامی باشندوں کو بالجبر بلکہ دھوکہ دے کر عیسائی بنانے کے کام میں مصروف ہے۔''[1]

اس سے بھی زیادہ یہ کہ ''سفید فام'' افسروں کے برتاؤ پر، جن میں کمیشنڈ اور نان کمیشنڈ دونوں قسم کے افسر شامل تھے، بڑی ناراضگی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ اس کا شاہد سیتارام ہے جو کمپنی کی فوج میں صوبیدار تھا اور اُس وقت بھی کمپنی کا وفادار رہا جب اُس کا بیٹا بغاوت میں شامل ہو گیا۔ اُس نے کہا ''لیکن بہت سے (یورپی سارجنٹ) اپنا مافی الضمیر ظاہر نہیں کر سکتے تھے یا لوگوں کو اپنی بات نہیں سمجھا سکتے تھے اور اس قسم کے لوگ گالیاں دینے پر اُتر آتے تھے اور سپاہیوں کو مارنے اور مُکّے رسید کرنے میں بھی انھیں تامل نہیں ہوتا تھا۔ کئی دفعہ اڈجوئنٹ سے شکایتیں کی گئیں لیکن اس نے ہمیشہ سپاہی کے خلاف سرجنٹ کا ساتھ دیا اور شکایت دور کرنے کی کوشش نہیں کی۔''[2]

کمیشنڈ افسروں کا برتاؤ بھی اس سے بہتر نہیں تھا۔ وہ سپاہیوں کو کمتر مخلوق سمجھتے تھے ''اُسے برا بھلا کہا جاتا ہے۔ اُس کے ساتھ برا برتاؤ کیا جاتا ہے اُس کو ''حبشی'' کہا جاتا ہے......نوجوان اس کو ایک اچھا مذاق، جوش کے اظہار کی شہادت اور سپاہی کے مقابلے میں قابل قدر احساس

---

[1] ایڈورسن اور میریویل، سر ہنری لارنس کی زندگی، جلد، صفحات 322-323

[2] سپاہی سے صوبیدار تک، مترجمہ لفٹنٹ کرنل نورگیٹ، صفحہ 23

برتری سمجھتے ہیں کہ اُس کے ساتھ جانوروں سے بھی برا سلوک کیا جائے۔"[1]

لفٹنٹ کرنل ولیم ہنٹر کی شہادت اس کو ثابت کرتی ہے۔ یورپین نان کمیشنڈ افسروں کی بے ہودگی کے تعلق سے اُس نے کہا کہ مروجہ نظام "ہمیشہ انھیں (ہندوستانی افسروں کو) پس پشت رکھتا ہے اور نہ صرف رجمنٹ کا سب سے کم عمر اور ناتجربہ کار یورپین سکنڈ لفٹنٹ اُن پر حکم چلاتا ہے بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ یورپین نان کمیشنڈ افسر بھی نہ صرف اُن پر حکم چلاتے ہیں بلکہ اکثر اوقات انھیں بغیر کسی وجہ کے نہایت فحش گالیاں بھی دیتے ہیں۔"[2]

اس نظام کے تحت یہ ممکن نھیں تھا کہ افسروں اور اُن کے سپاہیوں کے درمیان اچھے تعلقات پیدا کیے جاسکیں۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ دونوں دو مختلف دنیاؤں کے باسی تھے۔ یورپین افسر ہندوستانی سپاہیوں اور ہندوستانی افسروں سے دور رہتا تھا۔ فرائض منصبی کے علاوہ اُن میں کوئی سماجی مراسم نہیں تھے۔ 1824 میں فوج کی تنظیم نو کے بعد کمانڈنگ افسر کا سپاہیوں سے تعلق ٹوٹتا گیا۔ دخانی جہازوں کے رواج نے یورپ سے رشتہ رکھنے کے لیے زیادہ سہولتیں پیدا کردیں جس کی بنا پر یورپی افسروں کا نقطہ نظر اور اُن کی دلچسپیاں بدل گئیں۔ جوں جوں اپنی نسل کے مردوں اور عورتوں سے رسم و راہ پیدا کرنے کے مواقع بڑھتے گئے ویسے ویسے اپنی رجمنٹ، اپنے سپاہیوں اور اپنی ہندوستانی داشتاؤں سے اُس کا لگاؤ کم ہوتا گیا۔ فوج افسروں کی سروے، امور عامہ اور سیاسی محکموں کے لیے خدمات حاصل کی گئیں۔ اس کی وجہ سے بھی فوجی کی کارکردگی متاثر ہوئی۔ نظم وضبط کم ہوگیا اور سپاہیوں کے دلوں میں افسروں کی عزت گھٹنے لگی۔

یورپین افسروں میں ڈسپلن کی کمی نے حالات کو بد سے بدتر بنادیا۔ وہ لالچی، ناعاقبت اندیش اور فضول خرچ تھے اور کھلم کھلا الزام تراشی کرتے تھے۔ تنخواہ اور بھتے کے معاملے میں وہ حکومت کے احکامات کی خلاف ورزی بھی کرتے تھے۔ اس طریق عمل نے اُن کے خلاف جذبہ حقارت پیدا کردیا اور سپاہیوں کے سامنے بری مثالیں رکھیں۔ افسر کے الفاظ اپنی قدر و قیمت کھو چکے تھے اور سپاہی اُن کے وعدوں پر یقین نہیں کرتے تھے۔ بار بار وعدے توڑے گئے تھے۔

---

[1] ہندوستان میں بغاوت، ہندوستان سے شمال مغربی صوبہ جات میں مقیم ایک ریزیڈنٹ کے قلم سے، صفحہ 34

[2] ہنٹر، لفٹنٹ کرنل ولیم، بنگال آرمی کے آئندہ انتظام، ڈسپلن اور تنظیم نو کے سفارشات، صفحہ 2

حقیقت یہ ہے کہ بنگال آرمی کے ایک ریٹائرڈ افسر کے مطابق ''ہندوستان کی تمام بغاوتیں، چاہے وہ بنگال میں ہوئی ہوں یا کہیں اور، خود ہماری پیدا کردہ ہیں یا کم از کم اُن کے لیے پہل ہم نے کی۔ عام طور سے یا تو معاہدے کی خلاف ورزی کی گئی یا مقامی سپاہیوں کے احساسات، صحت یا سہولت کا خیال نہیں کیا گیا''۔[1] اس کی مثالیں ہیں جاوا، ویلور، بارک پور، بنگال اور مدراس کی فوجوں میں 1842 اور 1844 میں ہونے والے ہنگامے اور پنجاب کی بغاوت 50-1849۔

کمپنی کی فوجوں کی ساخت

جہاں تک فوجوں کا تعلق تھا بنگال کمانڈ کی تمام تر چھاؤنیاں متاثر ہوئیں۔ کمپنی کی فوجوں میں، جن کی تنظیم تین کمانڈوں میں کی گئی تھی۔ بنگال کمانڈ سب سے بڑی تھی۔ اس کا حلقہ اختیار ایک بڑے علاقے پر محیط تھا جو خلیج بنگال سے افغانستان کی سرحد تک پھیلا ہوا تھا۔ یہ پورا علاقہ ایک کمانڈر انچیف کے تحت تھا جس کے ماتحت سات ڈویژنل کمانڈ تھیں۔ ہر ڈویژن کے تحت کئی اول اور دوسرے درجے کے بریگیڈ تھے۔ جن کی کمانڈ بریگیڈیر کرتے تھے۔

بنگال کمانڈ میں 1,10,000 پیدل، دس سے بارہ ہزار تک رسالہ اور تیس ہزار ہر قسم کے یورپی سپاہی تھے۔ ہندوستانی فوجوں میں آٹھویں سے دسویں حصے تک مسلمان تھے اور بقیہ سب ہندو تھے۔[2]

ڈویژنل علاقوں میں سے ایک تھا بنگال۔ وہاں تین چھاؤنیاں کلکتے کے گرد اور تین چھوٹی چھاؤنیاں سرحدوں پر واقع تھیں تاکہ آسام اور مشرقی پہاڑیوں کے سرداروں پر نظر رکھی جاسکے۔ بارک پور، برہام پور اور ڈم ڈم کی بڑی چھاؤنیوں میں مجموعی اعتبار سے ہندوستانی پیدل فوج کی پانچ رجمنٹیں، بے ضابطہ رسالے کا ایک دستہ، ایک ہندوستانی توپ خانہ اور رائفلوں کا اسلحہ خانہ تھا جس کی حفاظت ایک چھوٹا سا دستہ کرتا تھا۔ چٹا گانگ، ڈھاکہ اور جلپسیگری کی چھوٹی چھوٹی چھاؤنیوں میں فی الجملہ ہندوستانی پیدل فوج کی چھ کمپنیاں مقیم تھیں۔

---

[1] اقتباس، سین، اٹھارہ سوستاون، صفحہ 17

[2] سدرلینڈ، کیپٹن جے Sketches of the Relations Subsisting between the British Government in India & Different Retire State (ملٹری ارفن پریس، کلکتہ 1837) صفحہ 7

دوسرا ڈویژنل علاقہ تھا بہار۔ اُس کا صدر مقام تھا دیناپور اس کے تحت سات چھاؤنیاں تھیں جن میں پانچ پیدل اور دو بے ضابطہ رسالے کی رجمنٹ، ایک یورپی بٹالین اور ایک یورپی توپ خانے کی بٹالین تھی۔ شمال مغربی صوبہ جات میں دو کمانڈ تھیں یعنی کانپور اور میرٹھ اور وہاں بیس سے زیادہ چھاؤنیاں تھیں۔ وہاں کم سے کم دس رجمنٹ تھیں جن میں کئی بے ضابطہ رسالے، کچھ سکھ سپاہی اور کچھ توپ خانوں کی بٹالین اور اسلحہ کے ڈپو تھے۔

آگے مغرب کی طرف فوجوں کا ارتکاز بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔ اُس علاقے کو تین کمانڈروں میں تقسیم کیا گیا تھا یعنی سرہند، لاہور اور پشاور جس میں تقریباً بیس فوجی مرکز تھے۔ ہندوستانی فوج میں تیس سے زیادہ پیدل رجمنٹ اور خاص بڑی تعداد میں رسالہ اور توپ خانہ تھا جس کی مجموعی تعداد تقریباً 65,000 تھی۔ زیادہ تر یورپی فوج پنجاب میں تھی۔ اُن چار بٹالینوں اور یورپی توپ خانوں کو چھوڑ کر جو کلکتہ اور دہلی کے درمیان مقیم تھے زیادہ تر یورپی فوج جس میں 15,000 سپاہیوں سے زیادہ تھے، پنجاب میں تھی۔ میرٹھ سے پشاور تک یورپی پیدل فوج کی 9 رجمنٹ تھیں جن کے ساتھ گھوڑوں پر لے جائی جانے والی اور زمین پر لے جائی جانے والی توپوں کے کئی دستے تھے۔

وسطی ہند اور راجپوتانہ میں کمپنی کی ہندوستانی فوجوں کے کئی دستے کچھ بے ضابطہ رسالے، ہندوستانی توپ خانہ اور ہندوستانی والیان ریاست کی فوجیں تھیں۔ اُس علاقے میں تقریباً ایک درجن چھاؤنیاں تھیں۔ سب سے بڑی چھاؤنی تھی گوالیار۔ وہاں 8000 سپاہیوں کا دستہ تھا، دو رسالے کی رجمنٹ تھیں، دس پیدل بٹالین تھیں اور توپ خانے کی چار کمپنیاں تھیں۔ جبل پور، مہو اور نگود میں ایک ایک رجمنٹ تھی اور دیولی، بیور، رنپورا اور کھرداڑا میں چھوٹی چھوٹی فوجی اکائیاں تھیں۔ اجمیر میں گولا بارود بنانے کا کارخانہ تھا۔ جہاں تک بنگال کی فوج کے مواصلات اور نقل و حمل کا تعلق تھا ریلوں کی عدم موجودگی میں آبی راستے استعمال کیے جاتے تھے۔ چونکہ شمالی ہندوستان کے لیے گنگا، جمنا اور دریائے سندھ اور کشتی رانی کے قابل اُن کی معاون ندیاں بڑی اہمیت رکھتی تھیں اس لیے چھاؤنیاں اور اسلحہ خانے اُن کے ساتھ ساتھ تعمیر کئے گئے تھے۔

بنگال کی فوج میں بالائی طبقوں سے تعلق رکھنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد بہت

زیادہ تھی۔ لیکن بمبئی اور مدراس کی فوجوں میں ایسا نہیں تھا۔ بمبئی کی کمانڈ کے تحت، جس میں سندھ بھی شامل تھا، 23 چھاؤنیاں تھیں جہاں کچھ بلوچی فوجوں کے علاوہ 26000 فوج مقیم تھی۔ اس فوج کا ایک تہائی حصہ شمال کے ہندوؤں اور مسلمانوں پر اور ایک تہائی مرہٹوں پر مشتمل تھا۔ بقیہ فوج نیچی ذاتوں پر مشتمل تھی جن میں زیادہ تو مہر تھے۔ اونچے طبقوں سے تعلق رکھنے والے مرہٹوں، برہمنوں، پرجوں اور سرسوتوں کو بھرتی نہیں کیا جاتا تھا۔

مدراس کی فوج کی بھرتی مقامی طور سے کی جاتی تھی اور اُس میں بہت سے قبیلوں اور ذاتوں سے تعلق رکھنے والے سپاہی تھے۔ چونکہ مدراس میں کوئی جنگجو طبقہ نہیں تھا اور برہمن سپاہی کا پیشہ اختیار نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے مدراس کی فوج بڑی حد تک نیچی ذات کے ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل تھی۔ زیادہ تر مسلمان شمالی ہند کے تھے۔ مدراس اور بمبئی کی فوجوں میں ایک تہائی مسلمان تھے اور دو تہائی ہندو۔[1]

چربی لگے کارتوس

چربی لگے کارتوسوں نے بغاوت کرانے میں جو رول ادا کیا اُس کو ضرورت سے زیادہ بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ڈم ڈم کے اسلحہ خانے کے کمانڈر میجر یونٹین نے اس امر کی شہادت دی ہے کہ حالانکہ چربی لگے کارتوس نے ہندوستانی سپاہیوں میں اشتعال پیدا کر دیا تھا لیکن جب اُس نے اُن سے پریڈ کروائی ''تو اُن میں سے کم سے کم ایک تہائی، جس میں ہندوستانی کمیشنڈ افسر تھے فوراً آ گئے۔ انھوں نے احترام کو ملوظ رکھتے ہوئے نئی رائفلوں کے کارتوس بنانے کے طریقے پر واضح الفاظ میں اعتراضات کیے۔'' سپریم کونسل کے رکن جنرل لو نے اودھ کی بے ضابطہ پیدل فوج کے متعلق اپنی تحریر میں کہا تھا ''مجھے ایسا لگتا ہے کہ اس رجمنٹ کے زیادہ تر سپاہیوں نے غالباً حکومت یا اپنے افسروں کے خلاف کسی بے اطمینانی یا بے وفائی کا اظہار کرنے کی خاطر ان کارتوسوں کو کاٹنے سے انکار نہیں کیا بلکہ انھیں واقعی اس امر کا خوف ہے...... کہ کارتوس کاٹنے کی وجہ سے اُن کی ذات خراب ہو جائے گی اور آئندہ اُن کے کردار کے لوگوں کی دلوں میں عزت باقی

---

[1] فارسٹ، جی، ڈبلیو، Selection from The Letter, Despatches and other state papers Indian History, 1857-58, Vol.I, Page 2

نہیں رہے گی۔''[1]

لیکن سپاہیوں کی شکایتوں میں سے چربی لگا کارتوس محض ایک بہانہ تھا۔اس کو رواج دیے جانے کی بنا پر اُس کے خطرات بڑھ گئے اور اشتعال میں اضافہ ہوگیا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانے میں پائے جانے والے حالات میں ''بنگال کی فوج کا عمومی موقف تھا بغاوت۔''[2] اس کے علاوہ ہو بھی کیا سکتا تھا؟ ہندوستانی سپاہی محض بھاڑے کا سپاہی تھا۔فوج میں ملازمت کرنے کی جزوی وجہ تو تھی اُس کی ذات کی روایات اور جزوی وجہ یہ تھی کہ وہ ہندوستانی فوجیں ناپید ہو چکی تھیں جن میں اُسے روزگار ملتا تھا اور کمپنی اُسے تنخواہ اور پینشن کے علاوہ ایک ایسا پیشہ دیتی تھی جس کا وہ عادی تھا۔کمپنی کی فوج کی فتوحات نے اُس کو خود پسند بنا دیا اور ابتدا کے زمانے میں اُس کے ساتھ برابری کا برتاؤ کیا جاتا تھا جس نے اُس میں ذاتی وفاداری اور باہمی اعتماد کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔لیکن نظام کی تبدیلی کے ساتھ حالات بھی خراب ہونے لگے اور یورپینوں اور ہندوستانیوں کے درمیان دوری پیدا ہوگئی۔

ہندوستانیوں کی عزت نفس مجروح ہوگئی۔شاہی خاندانوں کی بے حرمتی ہوئی۔امیروں کا اثر زائل ہوگیا۔بدیسی طاقت نے لوگوں کو سرنگوں کر دیا۔طاقت کے قدیم مراکز کھنڈر بنا دیے گئے۔ قدیم طور طریقے ماند پڑ گئے۔ایک دوسری نسل کے نئے انسان، جن کا مذہب، زبان اور تہذیب مختلف تھی، ملک کے باشندوں پر حکم چلانے لگے اور اُن کی توہین و تذلیل حکمرانوں کے خلاف مسلح بغاوت کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ملک میں بغاوت کے لئے حالات سازگار تھے۔

یہ قدرتی امر ہے کہ مفتوح لوگ بدیسی حکومت کو ناپسند کرتے ہیں۔انگریز اس سے واقف تھے۔سر جان شور نے یہ مسئلہ اس وقت اٹھایا تھا جب اُس نے لکھا ''برطانوی نظام حکومت کے جو بھی فوائد ہوں لیکن بدیسی غلبے کی برائی اُن تمام فوائد پر پانی پھیر دیتی ہے۔'' میکالے نے کہا تھا ''سب سے بھاری ہوتا ہے اجنبی کا جوا۔'' فلسفی جان اسٹورٹ مل نے خیال ظاہر کیا تھا ''عام لوگوں کی حکومت بامعنی اور ایک حقیقت ہے۔لیکن ایک قوم کی دوسری قوم پر حکومت کوئی وجود نہیں

---

[1] ایضاً صفحہ 6 (تعارف)

[2] کے اور ملیسن، محولہ بالا، جلد 1 صفحہ 242

رکھتی۔ ایک قوم دوسری قوم کو محض خرگوشوں کا ایک جنگل تصور کر سکتی ہے یا اُسے ایک ایسا مخصوص علاقہ تصور کر سکتی ہے جہاں دولت کمائی جائے اور اپنی قوم کے لوگوں کے فائدے کے لئے اسے انسانی جانوروں کے فارم کے طور پر استعمال کیا جائے۔ لیکن اگر حکومت کا صحیح کام ہے اُن کی بھلائی جن پر وہ حکومت کرے تو یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ وہ قوم براہ راست یہ خدمت سر انجام دے سکے۔''[1]

VI بغاوت کی پیش رفت

چنانچہ دھما کہ ہوا اور پورا ملک تھرا گیا۔ اس کا اثر ہر علاقے میں محسوس کیا گیا۔ اتنے بڑے پیمانے پر ہونے والی سیاسی شورش تاریخ ہند میں ایک نیا حادثہ تھی۔ پچھلے زمانوں میں فاتح آئے اور خاندانوں کا تختہ اُلٹ گیا لیکن فتنہ وفساد زندگی کی اوپر سطح تک محدود رہا۔ کسی فتح کے نتیجے میں ہونے والی سیاسی تبدیلی عموماً کسی ایک علاقے تک محدود رہتی تھی۔ اگر پنجاب میں شورش پھوٹ پڑتی تھی تو ملک کے دوسرے حصے اُس سے مامون ومحفوظ رہتے تھے جیسا کہ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے حکومتوں کے وقت ہوا۔ انگریزوں نے بنگال فتح کیا لیکن سراج الدولہ کے زوال نے لکھنؤ، دلی، لاہور، حیدرآباد، پونا یا مدراس کو بالکل متاثر نہیں کیا۔ دوآبے میں جاٹوں اور پنجاب میں سکھوں کی بغاوت کی آواز بازگشت کہیں اور سنائی نہیں دی۔ اورنگ زیب کے خلاف مرہٹوں کی لڑائی ایک طاقت اور سلطنت کے خلاف طویل جدوجہد تھی لیکن مہاراشٹر کے باہر اُس کا شور مشکل سے کسی نے سنا ہوگا۔ انیسویں صدی کے نصف اول کی بغاوتیں شورشیں علیحدہ علیحدہ رونما ہونے والے حادثات تھے۔

لیکن 1857 کی بغاوت ان سے بہت مختلف تھی۔ اس کی بنا پر ملک کے بڑے بڑے حصے نے بالواسطہ یا بلاواسطہ انداز سے انگریزی سرکار کی مزاحمت کی۔ بغاوت کی آگ بھڑکی اور اُس کے شعلے پورے ملک میں پھیل گئے۔ کچھ حصوں میں بغاوت نے خوں ریز جنگ کی شکل اختیار کی

---

[1] مل۔ جے۔ ایس، Everymans Library Consideration on Representative Government, Edition, صفحہ 384 سنہ 1929

جس میں لاکھوں انسانوں نے حصہ لیا، دوسرے علاقوں میں مختلف مقامات پر مسلح بغاوتیں ہوئی اور کچھ اور حصوں میں سول بدنظمی پھوٹ پڑی۔ لیکن ملک کا کوئی ایسا حصہ نہیں تھا جس نے حاکموں کو تشویش میں مبتلا نہ کیا ہو اور جہاں بغاوت کا خطرہ نہ پیدا ہوا ہو۔

بنگال سے پنجاب تک شمالی ہندوستان میں بغاوت پھوٹ پڑی تھی۔ دوسرے صوبوں میں حالانکہ وہاں کے خصوصی حالات نے بے چینی کو بغاوت کی شکل اختیار نہیں کرنے دی پھر بھی لوگ مطمئن نہیں تھے۔ جس طبقے نے بغاوت کی حمایت نہیں کی وہ تھا نیا متوسط طبقہ جس نے مغربی تعلیم پائی تھی۔ لیکن اُن کی تعداد کم تھی اور وہ پریسیڈنسی شہروں تک محدود تھے۔ اُن کے متعلق ٹرولین نے لکھا ہے ''انگریزوں کے گلے کاٹنے کے بجائے وہ اُن کے ساتھ گرنڈ جیوری اور مجسٹریٹوں کی عدالتوں میں بیٹھنا چاہتے تھے۔ پنجاب اور نیپال کی سیاست کے مطلق قیاس آرائی کرنے کے بجائے وہ مباحث اُن کی انجمنوں میں جو انھوں نے قائم کرلی تھیں، انگریزی میں دادخطابت دے کر طباعت و آزادی اظہار کے فوائد پر بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔''[1]

چنانچہ تعلیم یافتہ بنگال نے بغاوت میں حصہ نہیں لیا۔ لیکن فوج نے بغاوت کی جو بالائی ہند سے تعلق رکھنے والے سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ بارک پور میں، جو کلکتہ سے 16 میل کی دوری پر واقع ہے، 29 مارچ 1857 کو منگل پانڈے آگے بڑھا اور اُس نے اپنے ساتھیوں کو مذہب کے لیے ضرب لگانے کی دعوت دی۔ اُس کے بعد ہفتوں اور مہینوں میں کلکتہ میں بغاوت پھوٹ پڑنے کا بار بار خطرہ پیدا ہوا اور یورپین بہت دنوں تک اپنے کو غیر محفوظ سمجھتے رہے۔ کلکتہ کے باہر کئی مقامات پر یا تو بغاوت ہوئی یا اُس کا خطرہ پیدا ہو گیا مثلاً بیر بھوم، بالکورا، جیسور کرشن نگر، مالدا، ڈھاکہ، فرنڈ پور، باقر گنج، پیترہ، سلہٹ، چٹاگانگ، کھاسی اور جینتیا کی پہاڑیاں۔

آسام

آسام میں 1832 سے تیزی کے ساتھ تبدیلیاں ہوتی رہی تھیں۔ آسام کے آخری بادشاہ پرېندر سنگھ کو اپنی سلطنت سے دست بردار ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ برطانوی حکومت کے بوجھ کے نتیجے میں لوگ پس رہے تھے جو اُن پر لادی گئی تھی۔ اُس وقت کے دیوانی منی رام دت نے 1853

---

[1] ٹرولین۔ سی، محولہ، صفحہ 199

میں حکومت کو پیش کی جانے والی ایک یاداشت میں کہا تھا ''شاستروں میں لکھا ہے کہ حکمرانوں کو پاکبازی سے کام لینا چاہئے اور اُس کی خوشحالی پر نظر رکھتے ہوئے اپنی رعایا پر انصاف کے ساتھ حکومت کرنی چاہئے۔ اس وقت اس پر عمل نہیں کیا جارہا ہے بلکہ اس کے برعکس کارروائی ہورہی ہے۔ اس قسم کے گناہوں اور لاپرواہیوں کا خمیازہ ایک سرحدی ریاست میں بھی بھگتنا پڑے گا۔'' اور سابق مقامی حکومت کی بحالی کا مطالبہ کیا۔ لیکن مقامی حکام اور گورنر جنرل دونوں نے یہ اپیل خارج کردی۔

جس وقت 1857 کی بغاوت شروع ہوئی اُس وقت منی رام کلکتہ میں تھا۔ ناکامیوں نے اس کے دل میں غم و غصہ بھر دیا تھا اس لیے اُس نے باغیوں کی حمایت کرنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے قدیم امیروں کے خاندانوں کو خطوط لکھے اور انھوں نے فیصلہ کیا کہ 1857 میں چاند کی آٹھویں تاریخ کو وہ بغاوت کریں گے اور آسام کے آخری تاجدار کے پوتے کندرپیسور سنگھ کو تخت پر بٹھادیں گے۔

لیکن ایک پیغامبر کی بے احتیاطی کی بنا پر سازش کا علم حکومت کو ہو گیا جس نے اُس کو کچلنے کے فوری اقدامات کیے۔ کندرپیسور سنگھ کو اُس کے محل سے اور منی رام کو کلکتہ میں گرفتار کرلیا گیا۔ محبّ وطن عناصر کے لیے آسام کا کونا کونا چھان ڈالا گیا۔ منی رام اور پیالی بروا پر مقدمہ چلا اور اُن دونوں کو ایک ہی دن یعنی 26 فروری 1858 کو پھانسی دی گئی۔ دوسروں کو مختلف مدتوں کی قید کی سزائیں دی گئیں اور دوبارہ آزادی حاصل کرنے کی آسامی امیروں کی کوشش ناکام بنادی گئی۔

اُڑیسہ میں حالات مختلف تھے۔ 1803 میں اُس کے الحاق کے بعد دوتہائی اُڑیا زمیندار ختم کردیے گئے اور اُن کی جگہ بنگالی زمینداروں نے لے لی۔ کاشتکاروں کے طبقے کو بھی بہت نقصان پہنچا اور اُن میں سے پائکوں کو، جو اڑیسہ کے حکمرانوں کی کسانوں کی نیم فوجی تنظیموں میں شامل تھے، کمپنی کی حکومت کے چھوٹے حکام کچلنے لگے اور ان کا خون چوسنے لگے۔ چونکہ گم سور، باؤ اور انگل کے سردار انگریزوں کے اقتدار اعلیٰ کی مزاحمت کررہے تھے اس لیے اڑیسہ میں بدنظمی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک اور مظلوم عنصر تھا کھونڈ کا آدی واسی قبیلہ جو اُس علاقے میں آباد تھا۔

1857 میں غیر مطمئن عناصر متحد ہوگئے اور ہنگامہ شروع ہوگیا۔ سمبل پور کے شہزادوں

سرندر ساہی اور اُجل ساہی کو، جو ہزاری باغ جیل میں بند تھے، باغی سپاہیوں نے چھڑا لیا اور انھوں نے بغاوت کی قیادت سنبھال لی۔ بغاوت کا جھنڈا بلند کیا گیا اور انگریزی حکومت سے ٹکر لی گئی۔ سمبل پور کے آس پاس کا پورا علاقہ عارضی طور سے باغیوں کے ہاتھوں میں آ گیا۔ بالآخر 1862 میں سرندر سنگھ نے خود کو انگریزوں کے سپرد کر دیا اور وہ جلا وطن کر دیا گیا۔ اُس وقت بھی مالکان اراضی اور کسانوں نے حکومت سے درخواست کی کہ اُسے گدّی پر بحال کر دیا جائے۔

پرلکی میدی کے زمیندار گنجم کے ایک آدی واسی قبیلے سواروں نے رادھا کرشن ڈنڈ سینا کی قیادت کی۔ کوتیہ کھونڈوں نے بھی بغاوت کی۔

چھوٹا ناگپور

چھوٹا ناگپور میں، جو اُس وقت بنگال کا حصہ تھا، پالاموں، ہزاری باغ، رانچی، سنگھ بھوم، مان بھوم اور سمبل پور کے ضلعوں میں بغاوتیں ہوئیں۔ حالات اتنے خراب ہو گئے کہ انگریز افسروں کو ''حملوں کو ناکام بنانے، چھوٹی موٹی شورشوں کو فرو کرنے، حکومت کے دعویداروں کو کچلنے، مسلح لٹیروں کی سرکوبی کرنے، اُن مقامات کو دوبارہ حاصل کرنے جن پر اچانک قبضہ کر لیا گیا تھا اور مظالم کا انتقام لینے کا دشوار کام کرنا پڑا۔''[1]

ان شورشوں میں حصہ لینے والے تھے آدی واسی قبیلے اور مالکان اراضی باغی سپاہیوں اور غیر مطمئن زمینداروں کا مقصد تھا بابو کندر سنگھ کے ساتھ اشتراکِ عمل کرنا۔ پوراہٹ کے راجا کی قیادت میں سنگھ بھوم کے کونوں اور پالاموں کے چیرو اور کھیرواڑ قبیلوں نے انگریزوں کے خلاف بغاوت کی اور کئی مہینوں تک گوریلا جنگ جاری رکھی۔

شمالی ہندوستان

اُس وسیع میدان مین جو بنگال کی سرحد سے پنجاب تک پھیلا ہوا ہے بڑے پیمانے پر بغاوت ہوئی۔ جو لوگ اس کی وسعت کو کم کر کے پیش کرنے کی طرف مائل تھے انھیں بھی یہ تسلیم کرنا پڑا کہ اُس علاقے میں بغاوت نے کم سے کم ایک عمومی تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اودھ،

---

[1] کے اور ملیسن محولہ بالا، جلد چہارم، صفحہ 304

روہیل کھنڈ، بندیل کھنڈ، الہ آباد، آگرہ اور میرٹھ کی کمشنریوں اور مغربی بہار میں ''زیادہ تر لوگوں نے انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کی'' اور ''عام لوگوں اور سپاہیوں کی بغاوتیں قریب قریب ایک ہی وقت ہوئیں''۔[1]

ڈف نے ڈاکٹر ٹویڈی کے نام اپنے خط مورخہ 10 دسمبر 1857 میں بڑی صحت کے ساتھ اس کی نوعیت کو پیش کیا تھا۔ ''اس بات کی تصدیق ہر نیا حادثہ کرتا ہے کہ یہ بغاوت ایک ایسی بغاوت ہے جو کسی فوری وجہ کی بنا پر وجود میں نہیں آئی۔ یہ ایسی بغاوت ہے جس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک غیر فطری صف میں لا کھڑا کیا ہے، ایسی بغاوت جس کو اودھ کی پوری آبادی ہوا دے رہی ہے اور جاری رکھے ہوئے ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ انداز سے جس سے ہمدردی اور جس کی حمایت آس پاس کے قریب قریب آدھے صوبے کر رہے ہیں''۔[2]

بہار

اس علاقے کے مشرقی حصے یعنی بہار میں بغاوت کی پہلی چنگاری سنتھال پرگنے میں واقع روہنی میں نظر آئی جہاں ہندوستانی سپاہیوں نے اپنے اپنے افسروں پر حملہ کیا۔ جلد ہی پورے بہار میں بغاوت کی آگ پھیل گئی جہاں بے اطمینانی پہلے سے پائی جاتی تھی۔ گنگا پار کے شمالی ضلعوں میں پورنیا سے چمپارن تک یہ چنگاریاں بھڑک کے شعلے بن گئیں۔ شاہ آباد، پٹنہ اور گیا کے اضلاع وہ خاص خاص مرکز تھے جہاں بغاوت کا سب سے زیادہ اثر پڑا۔ جگدیش پور کے بابو کنور سنگھ اور اُن کی موت کے بعد اُن کے بھائی امر سنگھ نے باغی فوجوں کی قیادت کی۔ کچھ مدت کے لیے بہار کے حصوں میں برطانوی حکومت کی جگہ باغیوں نے لے لی۔

بغاوت شروع تو ہوئی تھی ہندوستانی فوج میں لیکن جلد ہی سول آبادی اُس کی لپیٹ میں آ گئی۔ ایک انگریز فوجی افسر نے لکھا تھا ''پہلے تو یہ محض فوجی بغاوت لگی لیکن جلد ہی اُس کی نوعیت بدل گئی اور اُس نے قومی بغاوت کی شکل اختیار کر لی۔ بہار کے راجپور گاؤں میں اور بنارس، اعظم گڑھ، گورکھپور کے ضلعوں، پورے دوآبے میں جو الہ آباد، کانپور، میرٹھ اور آگرہ کمشنریوں پر مشتمل

---

[1] ایضاً، جلد پنجم، صفحہ 293

[2] ڈف۔ اے، محولہ بالا، صفحہ 220

ہے ہماری حکومت ختم کردی گئی اور ہمارے خلاف اعلان جنگ کیا گیا۔"[1] پٹنہ ڈویژن کے کمشنر سیموئلس نے بنگال کی حکومت کو لکھا کہ "شاہ آباد میں اس تحریک نے ایک فوجی بغاوت کا وقار حاصل کرلیا ہے۔"[2] ٹریلر نے حکومت کو اطلاع دی تھی کہ "چھپرا کے مغرب کے ضلعوں میں لوگ کھلم کھلا بغاوت کررہے ہیں۔"[3]

بہار کے ہندو اور مسلمان شانے سے شانہ ملا کر لڑے۔ 46-1845 میں بھی وہ حکومت کے خلاف مشترکہ اقدام کرچکے تھے۔ جب 1857 کی بغاوت شروع ہوئی تو انھوں نے اپنے مشترکہ محاذ کو برقرار رکھا۔ یہ اتحاد حکمرانوں کے مفاد کے منافی تھا اور وہ اُسے مسلمانوں کی سازش تصور کرتے تھے جو ہندوؤں کی شکایتوں سے فائدہ اُٹھارہے ہیں۔ لیکن اُس میں کسی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ دونوں مذہبی فرقوں سے تعلق رکھنے والوں نے بہار اور ملک کے دوسرے حصوں میں تلوار اُٹھائی تھی۔ جہاں تک بہار کا تعلق ہے اس کی تصدیق پٹنہ کے کمشنر ٹیلر نے کی جو پہلے ہی مشورہ دے چکا تھا کہ پولیس کے پرانے دستوں کو برطرف کردیا جائے اور نئے دستے کھڑے کیے جائیں "جن میں کوئی راجپوت، برہمن یا مسلمان بھرتی نہ کیا جائے۔"[4] بہار میں بغاوت کی عام نوعیت کے پیش نظر تمام شمالی اور جنوبی بہار میں مارشل لا نافذ کردیا گیا۔

مولویوں اور پنڈتوں دونوں نے باغیوں کی ہمت افزائی کی۔ پٹنہ کمشنری میں پیر علی کی طرح کے مسلمان رہنماؤں نے شورش کو ہوا دی۔ راجپوت اور مسلمان زمیندار دونوں باغیوں کی صفوں میں شامل ہوگئے۔

صادق پور کے مولوی، جو نامدار خاں کے وارث تھے، نرہٹ کا زمیندار اور نوادا، جہان آباد، راجگیر، امرتھو، امانا وغیرہ کے ہندو اور مسلم زمینداران سب نے اشتراک عمل کیا۔

---

[1] The Mutiny of the Bengal Army (دسمبر 1857) (جی۔ بی۔ ملیسن)، صفحہ 53۔ اقتباس کے۔ کے۔ دت History of Freedom Movement in Bihar جلد 1 صفحہ 10

[2] سیموئلس، ایس۔ اے، Brief Narative of Events Connected 10th the Removal of Taylor دت ایضاً صفحہ 10۔

[3] دت، ایضاً، صفحہ 18۔

[4] ایضاً، صفحہ 17

بہار کے سرکردہ رہنما تھے ضلع شاہ آباد میں واقع جگدیش پور کے معمر بابو کنور سنگھ، وہ اس تحریک کے مرکزی کردار تھے۔ اُن کی بہادری، تنظیمی صلاحیت اور فوجی سوجھ بوجھ نے اُن کے دشمنوں کو بھی متاثر کیا۔ تمام گروہوں نے اُن کے ساتھ تعاون کیا چاہے وہ پیر علی، یوسف علی، امداد دین وغیرہ کی قیادت میں ہوں یا دہلی کے حامی یعنی علی کریم، وارث علی وغیرہ کی قیادت میں۔ جب دیناپور کے سپاہیوں نے بغاوت کی تو انھوں نے دہلی کے بادشاہ کے نعرے بلند کیے اور کنور سنگھ کو اپنا کمانڈر بنایا۔ کنور سنگھ کا مرکز تھا بہار اور وہاں سے انھوں نے ریوا، باندہ اور کاپی تک اپنی سرگرمیاں بڑھائیں اور کانپور کے ضلع میں انگریزوں کے خلاف لڑائی میں نانا صاحب کی امداد کی۔ کانپور سے وہ لکھنؤ گئے اور اُس کے بعد بہار واپس چلے گئے جہاں ایک معرکے کی جنگ کے بعد اپریل 1858 میں اُن کا انتقال ہو گیا۔

اتر پردیش

اتر پردیش میں (جو اُس زمانے میں صوبہ جات شمال، مغرب و اودھ کہلاتا تھا) بغاوت کا جذبہ سب سے زیادہ شدید تھا۔ یہ سپاہیوں کا وطن تھا اور وہ علاقہ تھا جسے مغل سلطنت کا دل کہنا چاہئے۔ بہار ہندوؤں کے مقدس مقامات اور اُن کی قدیم اور وسطی تہذیب کے مشہور مرکز واقع تھے یعنی دہلی، آگرہ، لکھنؤ، متھرا، اجودھیا، پریاگ اور بنارس۔ یہ شہر ہیں جن کے نام ناقابل فراموش یادوں کو جنم دیتے ہیں۔ اُن کے ناموں کے ساتھ ہندوستان کے لوگوں کے پرجوش عزائم اور عظیم کارنامے جڑے ہوئے ہیں۔ دہلی کا لال قلعہ ماضی کی عظمت اور شان و شوکت کی علامت تھا۔

اتر پردیش کی آٹھ کمشنریوں میں سے ہر ایک میں شورش پھوٹ پڑی تھی اور بہت سے علاقوں میں برطانوی حکومت ختم ہو گئی تھی۔ بے چینی اور ہلچل بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی لیکن 10 مئی 1857 کو میرٹھ میں شروع ہونے والی بغاوت نے پورے صوبے میں عام شورش پھیلا دی۔ کچھ مقامات پر، جہاں کمپنی کی فوجیں نہیں تھیں، عالم لوگوں نے پہل کی جبکہ دوسرے مقامات پر پہلے ہندوستانی سپاہیوں کی رجمنٹوں نے بغاوت کی اور اس کے بعد عام لوگ اُس میں شریک ہو گئے۔

سول آباد کے رہنما مالکان اراضی کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ صوبے کے مغربی حصوں میں گوجر، جاٹ اور رانگڑ پیش پیش تھے۔ لیکن اس تحریک کے اہم حامی تھے راجپوت یعنی چوہان، بائی، بچگوئی، گوڑ، پنوار وغیرہ جو پورے علاقے میں پھیلے ہوئے تھے۔ روہیلکھنڈ کے روہیلے اور پورے صوبے کے مسلمان زمیندار اس میں شامل ہو گئے اور حقیقت یہ ہے کہ وہ بغاوت کی روح رواں تھے۔ شہروں اور دیہات میں لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کرنے میں مولویوں اور پنڈتوں نے اہم رول ادا کیا جیسا کہ وہ بہار میں کر رہے تھے۔

ہر جگہ باغیوں نے بڑی تعداد میں برطانوی حکومت کا مقابلہ کیا۔ فوج کے سپاہیوں کے علاوہ دیسی حکمرانوں اور سرداروں کے بہت سے سپاہیوں اور زمینداروں کے عملوں نے بغاوت میں حصہ لیا۔ محاصرہ کے دوران مٹکاف کے اندازے کے مطابق دہلی میں 40,000 سے لے کر 60,000 تک سپاہی موجود تھے۔ کانپور میں نانا صاحب کے جھنڈے کے نیچے تقریباً 58,000 مجاہد جمع ہو گئے تھے جن میں سے تقریباً 20,000 سپاہی تھے۔ خان بہادر خاں کی کمان میں کئی ہزار راجپوت اور روہیلوں کی فوج تھی۔ فیض آباد کے ضلعوں میں شنکر پور کے رانا بینی مادھو سنگھ کے 15,000 نجی سپاہی تھے اور تقریباً 85,000 باغی انگریزوں کے خلاف لڑ رہے تھے۔ گورکھپور کی کمشنری میں گجادھر سنگھ کی قیادت میں 51000 باغیوں نے ترائی کے جنگلوں میں رہ کر حکومت کا مقابلہ کیا۔ گورکھپور کے ناظم محمد حسن خاں کے ساتھ دس سے بارہ ہزار تک فوج تھی جن میں سے آدھے سپاہی تھے۔ یہ بات مبالغے پر مبنی نہیں ہوگی اگر کہا جائے کہ لڑائی میں عملی حصہ لینے والوں کی تعداد پانچ لاکھ سے زیادہ تھی۔ ظاہر ہے کہ پانچ لاکھ تعداد بڑی تعداد ہوتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تمام مالکان اراضی بغاوت میں شامل نہیں ہوئے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ زمینداروں کی خاصی تعداد نے اس جدوجہد میں حصہ لیا۔ مثال کے طور پر گورکھپور کے میر محمد حسن اور سلطان پور کے مہدی حسن کے نام لیے جا سکتے ہیں جن کی سرگرمیوں نے بہت سے ہندو اور مسلمان غیر مطمئن سرداروں کو تحریک میں شامل ہونے پر آمادہ کر دیا۔ بہرائچ، گونڈہ، پردا اور چندوسی وغیرہ میں خاص طور سے بہت بدامنی پھیل گئی۔ باندا میں ''ایک گاؤں بھی ایسا نہیں تھا جو کسی حد تک تحریک سے وابستہ نہ تھا۔''[1]

---

[1] Narrative of Events in Banda مورخہ 11 ستمبر 1857، از ایف۔ او رمین، مجسٹریٹ باندہ

دہلی

میرٹھ میں 10 مئی 1857 کو خطرے کی گھنٹی بجی، باغی فوجیں دہلی کی طرف بڑھیں اور بہادر شاہ سے انھوں نے درخواست کی کہ وہ ہندوستان کے شہنشاہ کی جائز حیثیت اختیار کریں۔ ابتدا میں وہ اس کے لیے تیار نہیں تھے لیکن شدید خطرات کے باوجود انھوں نے کانٹوں کا تاج پہن ہی لیا۔ اس کا فوری اثر ہوا۔ کمپنی کے دعوے بے نقاب ہوگئے۔[1] قانون اور اخلاق کی نظر میں کمپنی محض غاصب تھی۔ اُس نے اُس بادشاہ کے خلاف بغاوت کی تھی جس نے اُسے محصول کنندہ محاصل کے عہدہ پر مقرر کیا تھا یعنی بنگال کی دیوانی عطا کی تھی۔ اب کمپنی کے خلاف یہ الزام ثابت ہو چکا تھا کہ اُس نے اطاعت سے منہ موڑا اور اپنے مالک کے خلاف تشدد سے کام لیا۔ برطانوی حکومت کے خلاف اور اُس کو اکھاڑنے کے لیے ہر طرف ایک شورش پھیل گئی۔ اس کے اثرات اُن تمام چھاؤنیوں کے علاوہ، جہاں ہندوستانی سپاہی مقیم تھے، پورے ہندوستان کے بہت سے شہروں اور گاؤں میں محسوس کیے گئے۔

شمالی ہندوستان کے وسطی علاقے میں اس بغاوت نے ایک عوامی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ پورے اتر پردیش بشمول اودھ، بہار کے بہت سے ضلعوں، چھوٹا ناگپور، وسطی ہند، مالوا، بندیل کھنڈ اور صوبہ جات متوسط میں لوگوں نے تلوار اٹھالی۔ ہر جگہ جنگ وجدل کا منظر دکھائی دینے لگا۔ لوگ غم و غصے کے جذبات سے مغلوب ہوگئے اور دردناک مظالم کیے گئے۔ دہلی وہ مرکز تھا جس کی طرف اس علاقے کے تمام لوگوں کی نظریں اٹھتی تھیں۔ بہادر شاہ کے تاج وتخت قبول کرنے کے بعد لوگوں کو ایک ایسا مرکز مل گیا جہاں برطانوی حکومت کو ختم کرنے کی کوشش کرنے والے جمع ہوگئے۔ سپاہیوں کی باغی رجمنٹوں کا اولین کام تھا دہلی کی طرف بڑھنا اور باغی رہنماؤں نے مغل شہنشاہ کی نیابت کا اعلان کر دیا۔

دہلی کا محاصرہ 11 مئی سے 20 ستمبر تک جاری رہا۔ انگریزوں نے 20 ستمبر کو شہر پر قبضہ

---

[1] Proceeeding of the Trial of Bahadur Shah، کلکتہ Press of Mutiny Papers 1921۔ سین۔ ایس۔ این، محولہ بالا، صفحات 69-75 ملیسن، کرنل جی۔ بی۔ 1857-58 History of the Indian Mutiny، (لندن 1879) جلد دوم، صفحات 72-73 جلد سوم، صفحہ 387

کرلیا۔ اس زمانے کے واقعات بہادری اور غداری، سول انتظام اور فوجی کاروائیوں کی بڑھتی ہوئی دشواریوں خاص خاص مشیروں کے اختلافات اور کچھ رہنماؤں کی اٹل ثابت قدمی کی ملی جلی کہانیاں سناتے ہیں۔ اُن سب کے درمیان بہادر شاہ کی شخصیت تھی جو اتحاد اور شہر میں امن و امان کے خواہش مند تھے۔ اور محاصرہ ختم کرنے کے لیے زوردار اقدامات کے خواہاں۔ سرکاری فرائض پورے کرنے اور تمام سول اور فوجی معاملات میں فیصلے کرنے کی غرض سے ایک کونسل مقرر کی گئی تھی۔ یہ کونسل فوج اور سول حکام کے نمائندوں پر مشتمل تھی۔

ابتدا میں فوج کی قیادت مغل شہزادے کر رہے تھے لیکن جولائی کے شروع میں جب بخت خاں بریلی سے دہلی آ گئے تو اعلیٰ کمان اُن کے سپرد کر دی گئی۔ لیکن یہ لڑائی دو غیر مساوی فریقین کی لڑائی تھی۔ ایک طرف ایک منظم طاقت تھی جس کے وسائل روز بروز بڑھ رہے تھے۔ دوسری طرف وہ فوج تھی جو شہر کے حدود میں محصور تھی، جس کے سپاہی اور افسر ناتجربہ کار تھے۔ اور جنگی وسائل دن بدن کم ہوتے جا رہے تھے۔ ان تمام دشواریوں کے باوجود دہلی نے سخت مقابلہ کیا اور محاصرہ کرنے والی فوج پر بار بار حملے کیے۔ ایک وقت تو دہلی والوں نے خود محاصرہ کرنے والوں کو محصور کر لیا تھا، لیکن پنجاب سے آنے والی بڑی کمک نے پانسہ پلٹ دیا اور دہلی کو اطاعت قبول کرنی پڑی۔

آس پاس کے ضلعوں کی قسمت دہلی سے جڑی ہوئی تھی۔ گوڑگاؤں کے ضلع میں وہاں کے سرداروں اور عام لوگوں نے شہنشاہ کا ساتھ دیا۔ دہلی کی ہمدردی میں حصار اور روہتک میں بھی بغاوت پھوٹ پڑی اور اُن کا بھی وہی حشر ہوا جو دہلی کا ہوا۔

دہلی کے باہر ہونے والی بغاوت

دہلی میں بغاوت کے جو شعلے بھڑکے تھے انھوں نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ پہلے وہ دہلی کے آس پاس کے ضلعوں میں پھیلی۔ سردھنہ اور باغپت میں 11 اور 12 مئی کو بغاوتیں ہوئیں۔ رڑکی 13 مئی کو آزاد کرا لیا گیا اور 26 مئی کو بلند شہر میں ایک مغل گورنر مقرر کیا گیا۔ مظفر نگر میں 14 مئی کو، علی گڑھ میں 20 مئی کو اور سہارن پور میں 30 جون کو بغاوتیں پھوٹ پڑیں۔ اس طرح صوبے کی زیادہ تر مغربی کمشنریوں میں شورش پھیل گئیں۔ روہیل کھنڈ

میں بغاوت مئی میں شروع ہوئی اور خان بہادر نے 31 مئی کو انتظام سنبھال لیا۔ بریلی کے بعد رام پور، مرد آباد، امروہہ، بجنور، بدایوں اور شاہجہاں پور میں بغاوتیں ہوئیں۔ فرخ آباد میں سپاہیوں نے نواب تفضّل حسین خاں کی اطاعت قبول کرلی اور فتح گڑھ اور سیتا پور بھی اُن کے زیر نگیں آ گئے۔

آگرہ

آگرہ کمشنری آگرہ، متھرا، مین پوری اور اٹاوہ کے اضلاع پر مشتمل تھی۔ آگرہ صوبے کا صدر مقام تھا اور لیفٹنٹ گورنر وہاں رہتا تھا۔ دہلی سے بغاوت کی خبر آنے کے فوراً بعد وہاں بھی طوفان کے آثار نظر آنے لگے۔ علی گڑھ اور بلند شہر کے واقعات نے 23 مئی کو مین پوری میں اور 20 مئی کو اٹاوہ میں بغاوت شروع کردی اور جلد ہی باغیوں کا آگرے پر قبضہ ہوگیا۔ بھرت پور کی فوج نے جولائی کے شروع میں بغاوت کردی۔ باغیوں نے آگرے کے قریب ساسیاہ کے مقام پر انگریزی فوجوں کو 8 جولائی کو شکست دی اور لفٹنٹ گورنر اور آگرے میں رہنے والے انگریزوں نے قلعہ میں پناہ لی۔ مئی کا مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہاتھرس، متھرا اور دوسرے قریبی اضلاع میں بغاوت شروع ہوچکی تھی۔

الٰہ آباد کی کمشنریوں میں بغاوت پہلے ہی شروع ہوچکی تھی اور یہاں دونوں فریق کچھ انتہائی نفرت انگیز کارروائیوں کے مرتکب ہوئے۔ لیکن جلد ہی جب مولوی لیاقت علی نے فوجی قیادت سنبھال لی تو پورے کے پورے دیہی علاقے میں شورش پھوٹ پڑی۔

''اس شخص نے جو ذات کے اعتبار سے بنکر اور پیشہ کے اعتبار سے مدرس تھا، گاؤں میں اپنے انتہائی تقدس کی بنا پر عزت حاصل کرلی۔ بغاوت شروع ہونے کے بعد پرگنہ چائل کے زمینداروں نے اُن کی قیادت قبول کرلی اور اُن کی سربراہی میں شہر کی طرف بڑھے۔ وہاں انھیں دہلی کے بادشاہ کی طرف ضلع کا گورنر مقرر کردیا گیا''۔[1] فتح پور، باندا اور ہمیر پور بھی جلد ہی بغاوت میں شامل ہوگئے۔

---

[1] تتمہ Narrative Events of Allahabad مورخہ 17 ستمبر 1858 از ایچ۔ ڈی۔ ژلک، جوائنٹ مجسٹریٹ شاہجہاں پور۔

کانپور

لیکن کانپور میں، جو کمپنی کی فوجی حلقے کا صدر مقام تھا دل دہلا دینے والے نفرت انگریز واقعات رونما ہوئے۔ سپاہیوں میں 14 مئی سے ہیجان واشتعال پایا جاتا تھا اور وہ اپنے بال بچوں کو واپس گھروں کو بھیج رہے تھے۔ خیال تھا کہ 24 مئی کو بغاوت شروع ہوگی جو عید کا دن تھا۔ لیکن حقیقت میں بغاوت 4 جون کو شروع ہوئی۔ باغیوں نے خزانہ چھین لیا، جیل کا پھاٹک کھول دیا اسلحہ خانے اور سرکاری دفاتر پر قبضہ کرلیا اور دہلی کی طرف کوچ کر دیا۔ نانا صاحب کو رہنما چُنا گیا اور عظیم اللہ کو اُن کا مشیر خاص مقرر کیا گیا۔ ابھی وہ کلیان پور تک ہی پہنچے تھے کہ پروگرام تبدیل ہوگیا اور کانپور کو واپسی کا حکم دیا گیا۔ باغیوں نے ویلر کے کیمپ پر حملہ کیا اور تین ہفتے کے محاصرے کے بعد انھیں ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ نانا صاحب کو پیشوا بنا دیا گیا۔

جھانسی

بندیل کھنڈ مرہٹہ سلطنت کا حصہ رہ چکا تھا۔ اس میں جھانسی اور باندا شامل تھے جن پر مرہٹہ والیان ریاست حکومت کرتے تھے۔ جھانسی کے گنگا دھر راؤ کا انتقال 1854 میں ہوا۔ اُس نے کوئی وارث نہیں چھوڑا۔ ڈلہوزی نے 1817 کے معاہدے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اُس ریاست کا الحاق کرلیا۔ بیوہ رانی لکشمی بائی کی کوششیں بے اثر ثابت ہوئیں۔ اُس وقت اور زیادہ تلخی پیدا ہوگئی جب مندروں کی معافیاں ختم کردی گئیں۔ مایوسی نے جان پر کھیل جانے کی دعوت دی۔ رانی کے ایک ملازم برہمن لکشمن راؤ نے سپاہیوں کو بھڑکایا جنھوں نے 4 جون کو مقامی افسروں کی حکم عدولی شروع کردی اور تشدد اور قتل وغارت پر اتر آئے۔ رانی کو ریاست کا والی مقرر کیا گیا۔ انھوں نے بڑی بے جگری کے ساتھ باغیوں کی قیادت کی بہادری کے ساتھ انگریزی فوجوں کے خلاف لڑیں اور میدان جنگ میں ایک سپاہی کی طرح شہید ہوئیں۔

باندہ کے نواب نے بھی، جو پیشوا خاندان کا ایک رکن تھا باغیوں کا ساتھ دیا اور اپنی ریاست کھودی۔

بنارس

شمال مغربی صوبہ جات کی مشرق کی طرف آخری کمشنری تھی بنارس۔ وہ شہر صرف ہندوؤں کا مقدس مقام اور مہاراجا کا مستقر ہی نہیں تھا بلکہ دہلی کے شاہی خاندان کے کچھ افراد بھی وہاں رہتے تھے۔ مئی کے شروع میں انگریز افسروں نے چنار جانے کا منصوبہ بنالیا تھا چونکہ وہاں بدامنی نہیں پھیلی تھی اس لیے یہ ارادہ ترک کر دیا گیا۔ لیکن 21 مئی کو وہاں بغاوت پھوٹ پڑی۔ سپاہیوں سے 4 جون کو اسلحہ واپس لے لیے گئے جس کی وجہ سے فوراً بغاوت شروع ہوگئی۔ مارشل لا نافذ کر دیا گیا لیکن دیہی علاقے باغیوں کے ہاتھوں میں رہے۔ ''دیہاتی سماج کی سطح پر وہ عظیم تحریک اُبھرنے لگی جس نے وہیں جنم لیا تھا۔''[1]

اعظم گڑھ میں شعلے پہلے ہی سے بھڑک رہے تھے جونپور میں 5 جون کو بغاوت پھوٹ پڑی اور لدھیانہ کی سکھ رجمنٹ نے اُس میں حصہ لیا۔ گورکھپور میں 6 جون کو سپاہیوں نے حکم ماننے سے انکار کر دیا۔ دوسرے دن قیدیوں نے جیل کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی اور سپاہیوں نے خزانے پر قبضہ کرنے کا منصوبہ ناکام بنا دیا گیا اور انھیں ہتھیار ڈالنے پڑے پھر بھی ضلع میں بدامنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ غازی پور میں شورش پھوٹ پڑی تھی اور سنگھاہی میں سپاہی بغاوت کر چکے تھے۔ اگست کے شروع میں حالات نے بدتر شکل اختیار کر لی اور انگریزوں کو گورکھپور سے ہٹنے پر مجبور ہونا پڑا۔ اُس کے بعد کنور سنگھ کی طوفانی مہم کے نتیجے میں انگریزوں کو اعظم گڑھ سے بھی ہٹنا پڑا۔

اودھ اور لکھنؤ کا محاصرہ

الحاق کے بعد برطانوی حکام کی لوٹ کھسوٹ کی بنا پر اودھ بڑے دکھوں میں مبتلا ہو گیا تھا۔ اُن کے خلاف یہ الزام لگائے گئے تھے کہ ''انھوں نے لکھنؤ کے شاہانہ محلوں کو اصطبلوں اور کتے خانوں میں تبدیل کر دیا، یہ کہ بادشاہ کے مصاحبوں کی نازک اندام بیٹیوں کو بے گھر اور بے سہارا بنا دیا، یہ کہ خزانوں کے قفل توڑ کر انھیں لوٹ لیا گیا، یہ کہ شاہی خاندان کے نجی املاک کو نیلام

---

[1] کے اور ملیسن محولہ بالا، جلد دوم، صفحہ 175

کردیا گیا اور یہ کہ بہت سی ایسی باتیں کی گئیں جو نہ صرف بادشاہ کی رعایا کے لیے توہین آمیز ہیں بلکہ خود ہمارے لیے شرمناک تر ہیں۔''[1]

ان الزامات کی تحقیقات کرانے کی کیننگ کی کوششوں کو لکھنؤ میں مقیم اس کے نمائندے نے ناکام بنا دیا۔ اس کی وجہ سے بے اطمینانی اور بڑھ گئی۔

واجد علی شاہ کی معزولی اور جلاوطنی نے لوگوں میں سخت غم و غصہ پیدا کر دیا تھا۔ ایسے لوگوں کی کمی بھی نہیں تھی جو حالات سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ اُن میں سے ایک تھے مولوی احمد اللہ شاہ جنھوں نے 57-1856 کے موسم سرما میں شمالی صوبوں کا دورہ کیا اور لوگوں کو جہاد کے لیے تیار کیا۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے لکھنؤ اور اودھ کے دوسرے اضلاع میں بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کیں۔ نانا صاحب کے ساتھ عظیم اللہ بھی لکھنؤ گئے۔

اپریل کی 3 تاریخ کو حکم عدولی کے آثار نظر آنے لگے اور بغاوت کی تیاری ہونے لگی لیکن سپاہیوں سے اسلحہ واپس لے لیے گئے۔ نانا صاحب اور عظیم اللہ نے اودھ کے دوسرے اضلاع کا بھی دورہ کیا۔ دہلی سے آنے والی خبروں نے انگریزوں کو خطرہ سے آگاہ کر دیا تھا۔ انھوں نے فوراً ضروری حفاظتی انتظامات کیے۔ لیکن مئی کے آخری ہفتے میں طوفان پھوٹ پڑا اور 30 تاریخ کو سپاہیوں کی بغاوت شروع ہوگئی۔ شعلوں نے لکھنؤ کو اپنی لپیٹ میں لے لیا اور جلد ہی سیتاپور (30 جون)، محمدی (4 جون)، لکھیم پور کھیری (4 جون)، فیض آباد (5 جون)، بہرائچ (9 جون)، سلطان پور (9 جون) اور گونڈا (10 جون) تک پھیل گئے۔ چنانچہ مہینہ ختم ہونے سے پہلے اودھ میں ایک ضلع بھی ایسا نہیں تھا جو باغیوں کے قبضے میں نہ آ گیا ہو۔

لکھنؤ میں واجد علی شاہ کے گیارہ سالہ بیٹے برجیس قدر کو اُن کی ماں حضرت محل کی ولایت میں ولی مقرر کیا گیا۔ انتظام ایک کمیٹی کے سپرد تھا جو ہندو اور مسلمان مشیروں پر مشتمل تھی۔ انھیں معلوم ہوا کہ انگریزوں نے ریزیڈنسی کی قلعہ بندی کر لی ہے اور وہاں وہ کمک کے آنے کا انتظام کر رہے ہیں۔ انقلابیوں کی حکمت عملی کا تقاضہ تھا کہ انگریز فوج کو لکھنؤ میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ اور محصور دستے تک غذائی اجناس نہ پہنچنے دی جائیں تاکہ فاقوں کی تاب نہ لاکر وہ ہتھیار ڈال

---

[1] ایضاً، جلد اول، صفحہ 297

دیں۔ ریزیڈنسی کے لیے جنگ جون 1857 کے وسط سے شروع ہوئی اور فریقین کی ہار جیت کے ساتھ 21 مارچ 1858 تک جاری رہی بالآخر انگریزی فوج نے لکھنؤ پر قبضہ کرلیا۔ مولوی احمد اللہ شاہ آخری دم تک بہادری کے ساتھ لڑتے رہے۔ حضرت محل ہاتھی پر بیٹھ کر میدان جنگ میں اپنی فوج کی ہمت بڑھاتی تھیں۔ جب لکھنؤ ہاتھ سے نکل گیا تو مولوی احمد اللہ شاہ نے گوریلا جنگ شروع کی۔ روہیل کھنڈ میں داد شجاعت دیتے تھے اور کبھی اودھ میں۔ لیکن جب انھوں نے محمدی کو اپنا مستقر بنالیا تو پوون کے راجہ نے اُن سے غداری کی اور انھیں قتل کر دیا۔ حضرت محل نے سپرد ہونے سے انکار کر دیا اور اپنا پیچھا کرنے والی انگریزی فوج سے لڑتی ہوئی نیپال چلی گئیں۔

فیض آباد میں، جو اُس زمانے میں لکھنؤ کے بعد سب سے اہم شہر سمجھا جاتا تھا، نیٹو انفنٹری کی 22 ویں رجمنٹ کی چھاؤنی تھی۔ وہاں 15 ویں بے ضابطہ رسالے کا ایک دستہ اور نیٹو انفنٹری کا گھوڑوں سے لے جانے والا توپ خانہ بھی تھا۔ اس چھاؤنی میں بغاوت شروع ہوگئی۔ اعظم گڑھ اور بنارس کے انقلابی اُن سے آ کر مل گئے اور تعلقداروں نے اُن کی حمایت کی مولوی احمد اللہ شاہ نے اس تحریک میں جان ڈال دی۔ بڑے دشوار حالات میں باغی بہادری کے ساتھ لڑے لیکن لکھنؤ پر انگریزوں کا قبضہ ہوجانے کے بعد اُن کی مزاحمت ختم ہوگئی۔

قصہ مختصر جب بغاوت شروع ہوئی تو انگریزی حکومت قریب قریب مفلوج ہو کر رہ گئی۔ پورے دوآبے میں اُن کا اقتدار ختم ہوگیا۔ لیکن بدقسمتی سے بغاوت کے رہنماؤں میں آپسی تعاون کی کمی اور پورے صوبے کے لیے یکساں نظم حکومت قائم کرنے کی عدم صلاحیت نے اُن کے انقلابی جوش کو بارآور ہونے سے محروم رکھا۔

گنگا وادی کے باہر اور مغرب کی طرف کئی مقامات پر انگریزوں کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

پنجاب

میرٹھ میں 10 مئی کو بغاوت شروع ہونے، سپاہیوں کے 11 مئی کو دلی کی طرف بڑھنے اور بہادر شاہ کے آزاد اختیارات سنبھال لینے کی بنا پر جلد ہی پنجاب میں ایک بڑا بحران شروع ہوگیا۔ انگریزی سلطنت میں پنجاب کا حال ہی میں الحاق ہوا تھا اور یہ بتانا مشکل تھا کہ سکھ

سرداروں اور برطرف شدہ سکھ سپاہیوں کا ردعمل کیا ہوگا۔ افغانوں کا رویہ بھی انگریزوں کے لیے بڑی پریشانی کا باعث تھا۔ سکھ سلطنت ختم ہونے کے بعد پشاور اور سرحدی علاقہ، جو رنجیت سنگھ نے افغانوں سے چھین لیا تھا انگریزوں کے زیرنگیں آ گیا۔ خیال تھا کہ افغان ممکن ہے کہ انگریزوں کی دشواریوں سے فائدہ اُٹھا کر کھویا ہوا علاقہ پھر حاصل کرنا چاہیں۔ رائے بریلی کے بعد سید احمد نے جہاد کی جو تحریک چلائی تھی اس کی چنگاریاں پوری طرح ٹھنڈی نہیں ہوئی تھیں اور انھیں ہوا دے کر آسانی سے شعلوں میں تبدیل کیا جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ قبائل میں سرکش عناصر موجود تھے مثلاً مغرب کی طرف رانگر اور صوبے کے مشرقی حصوں میں پہاڑی لوگ، حصار ریواڑی اور گوڑگاؤں کے لوگ دشمنی پر آمادہ تھے۔

بالائی صوبوں میں بغاوت میں ہندوستانی سپاہیوں کی رجمنٹیں پیش پیش تھیں۔ پنجاب میں بھی بہت سی رجمنٹیں موجود تھیں۔ دو رجمنٹیں اُن بہادر سپاہیوں پر مشتمل تھیں جنھوں نے کئی لڑائیوں میں داد شجاعت دی تھی۔ لیکن انگریزوں کو شبہ تھا کہ وہ بغاوت کے اُن منصوبوں سے ہمدردی رکھتے ہیں جو پک رہے تھے۔

چنانچہ پنجاب میں صورت حال بہت نازک تھی۔ لیکن ستلج کے اس طرف کی ریاستوں کے سکھ سردار اور مغربی اضلاع کے مسلمانوں نے بھی بڑی ثابت قدمی کے ساتھ انگریزوں کی مدد کی۔ کشمیر کے مہاراجہ جلاب سنگھ کو ''جھانسا دے کر اطاعت پر آمادہ'' کر لیا گیا تھا اور پنجاب میں انگریزوں کی قسمت کا فیصلہ اُس کے ہاتھ میں تھا۔ پرانے سکھ امرا کو مکمل شکست نے سراسیمہ کر دیا تھا اور وہ تیزی کے ساتھ ختم ہو رہے تھے۔ پنجاب میں بڑے بڑے مالکن اراضی نہیں تھے اس لیے کہ ''مسلم سلطنت'' پٹھان فاتحین اور بعد میں سکھ حکمرانوں نے مقامی سرداروں کو اُس قسم کے اختیارات سے کبھی نہیں نوازا جیسے اودھ کے تعلقداروں یا بنگال کے زمینداروں کو حاصل تھے اور اس لیے وہ کبھی مالکان اراضی کی حیثیت حاصل نہیں کر سکے۔''[1] برطرف شدہ سکھ سپاہی قیادت سے محروم تھے اور امداد کے لیے اُن کی درخواستوں کا پنجاب کے سرداروں پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ زمانہ امن میں قابل برطانوی افسروں کے ایک گروہ نے لوگوں کی دشمنی کو برطانوی حکومت کی مدح

---

[1] بیڈن پاول، بی۔ ایچ، The Land Systems of British India جلد دوم، صفحہ 617۔

وستائش میں تبدیل کر دیا تھا۔ انھوں نے بہ نظر احتیاط لوگوں کو غیر مسلح بھی کر دیا تھا۔

جہاں تک افغانوں کا تعلق تھا اُن کے حکمراں دوست محمد کی حمایت دولت کے زور پر حاصل کر لی گئی تھی۔ اُس کے لیے ''انگریز قوم کی نفرت کے مقابلے میں انگریزوں کی دولت کا پیار زیادہ اہم تھا۔''[1]

اس کے علاوہ اگرچہ ہندوستانی سپاہیوں کی تعداد بہت تھی پھر بھی یورپین پیدل فوج، رسالہ اور توپ خانہ کا تناسب بھی خاصا تھا۔ کُل 59,656 سپاہیوں میں سے جو اُس صوبے میں مقیم تھے، ہندوستانی اور پنجابی (زیادہ تر باضابطہ) تھے، 35,900 پنجابی (بے ضابطہ) 13,430 اور یورپین 10,336 علاوہ ازیں فوجی پولیس کے سپاہیوں کی تعداد تقریباً 9000 تھی۔ ہندوستانی باضابطہ سپاہیوں میں کچھ پنجابی تھے۔ زیادہ تر یوروپین فوج یا تو شملہ اور انبالہ یا پشاور کی وادی میں تھی۔

لیکن جس بات سے انگریزوں کو سب سے زیادہ فائدہ ہوا وہ یہ تھی کہ ہندوستانی انقلابیوں کے سامنے نہ تو کوئی واضح مقصد تھا اور نہ اُن میں اتفاق رائے تھا۔ انگریز افسروں نے جو خط پکڑے تھے اُن سے انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ ''بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ بغاوت کا منصوبہ بنایا گیا ہے''۔[2] چنانچہ میرٹھ میں 10 مئی کو بغاوت ہونے کی خبر سنتے ہی انھوں نے بڑے جوش اور عزم کے ساتھ کارروائی شروع کر دی۔ دوسرے دن انھوں نے پوری کی پوری ہندوستانی فوج کو، جو دو پیدل رجمنٹوں اور ہلکے رسالے کے دو دستوں پر مشتمل تھی، پریڈ کے میدان میں حاضر ہونے کا حکم دیا اور اُن سے اسلحہ واپس لے لیے۔ لاہور بچ گیا اور دوسروں کے لیے ایک مثال قائم کر دی گئی۔

دوسری طرف پنجاب کے باغی رہنما تاج الدین[3] نے 29 مئی 1857 کو شہنشاہ بہادر شاہ

---

[1] کے اور ملیسن محولہ بالا، جلد دوم، صفحہ 316

[2] کوپر ایف The Crisis of the Punjab from May until the fall of Delhi (لندن 1858)، صفحہ 7

[3] خارجہ خفیہ مشورہ، نمبر 1-3، 18 دسمبر 1857۔

کو جو عرضداشت بھیجی تھی اُس کا جواب نہیں دیا گیا۔ اُس نے اپنے خط میں 10 مئی کے بعد پنجاب کے حالات کا ذکر کیا تھا اور کہا تھا کہ تمام ہندوستانی سپاہی باغیوں سے ملنے کی خواہش مند ہیں۔ یہ کہ پنجاب کے سردار مذبذب ہیں اور یہ کہ گرمی کے موسم نے انگریزوں کے لیے لڑائی کی سنبھالنا برداشت کرنا مشکل بنا دیا ہے۔ اُسے اس امر کا یقین تھا کہ اگر ایک باصلاحیت افسر کی کمان میں پانچ چھ ہزار سپاہی بھیج دیے جائیں تو پورے پنجاب سے، بشمول پشاور، انگریزوں کو نکالا جاسکتا ہے۔

لاہور میں انگریز حکام کے جرأت مندانہ طریق عمل کی تقلید دوسرے فوجی مراکز میں بھی کی گئی یعنی جھیلم، سیالکوٹ، امرتسر اور گورداس پور خلعت علزئی کی رجمنٹ کے ہندوستانی سپاہیوں کے علاوہ تمام دوسری چھاؤنیوں سے اسلحہ واپس لے لیے گئے اور انھیں برطرف کر دیا گیا۔ انگریزی پیدل فوج کی رائفلوں اور اُن کے توپ خانوں کی توپوں کے پیش نظر اسلحہ واپس کرنے کے حکم سے سرتابی ممکن نہیں تھی۔ لیکن یہ کام آسانی سے نہیں ہوا۔

نویں بے ضابطہ رسالے میں بغاوت ہوئی۔ یہ وہ رجمنٹ تھی جس نے افغانستان میں بڑے کارنامے سرانجام دیے تھے۔ اس کو اس قدر قابل اعتماد سمجھا گیا کہ دہلی کے خلاف لڑنے کے لیے اُسے بھیجا گیا۔ لیکن جلد ہی یہ معلوم ہوا کہ وہ ہندوستانیوں سے ہمدردی رکھتے ہیں اس لیے انھیں پنجاب واپس جانے کا حکم دیا گیا۔ جب وہ کالا باغ پہنچے تو انھوں نے بغاوت کر دی۔ اُن کا رہنما وزیر خاں ''رجمنٹ کا سب سے پرانا ممتاز رسالدار تھا'' جھنگ کے مقابل باغیوں کی انگریزوں سے جنگ ہوئی جس میں بہادر رسالدار اور اُس کے سپاہی سبھی مارے گئے۔

میاں میر میں ہندوستانی رسالے نے گھوڑوں کے زین واپس کرنے سے انکار کر دیا اور جس دن اُن کے ہتھیار واپس لیے گئے اُس کے دوسرے دن برطرف کی جانے والی رجمنٹ کے 1400 سپاہیوں کے ساتھ فیروز پور چلا گیا۔ انگریزوں سے اُن کی لڑائی ہوئی جس میں 100 انگریز مارے گئے۔

میاں میر کے سپاہیوں سے اسلحہ واپس لینے کی خبر نے پنجاب میں مقیم ہندوستانی سپاہیوں کو خوفزدہ کر دیا اور وہ بغاوت پر مائل ہو گئے۔ اُن میں سے بہت سے خود کو بے سہارا سمجھتے تھے۔ دہلی

پہنچنے کے ارادے سے وہ اپنی بارکوں سے نکل کھڑے ہوئے۔لیکن دہلی دور تھا۔اُن کا پیچھا کیا گیا اور انھیں موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔چھبیسویں نٹو انفنٹری کو سخت سزا دی گئی۔اُن میں سے 282 جنگ کے دوران گرفتار کر لیے گئے۔انھیں اجنالا لایا گیا اور وہاں فیصلہ کیا گیا کہ سزائے موت دی جائے دس دس کر کے سپاہی پکارے جاتے تھے،اُن کی مشکیں کسی جاتی تھیں اور قتل گاہ کی طرف لے جایا جاتا تھا جہاں گولی سے اُڑانے والا دستہ تیار کھڑا تھا۔[1] اس طرح دوسو سینتیس نے جام شہادت پیا۔اُن میں سے کچھ خاموش تھے اور کچھ ناچتے گاتے قتل گاہ کی طرف جا رہے تھے بقیہ سینتالیس نے اُس قلعہ کے باہر آنے سے انکار کر دیا جہاں انھیں قید کیا گیا تھا۔لیکن جس وقت قلعہ کا دروازہ توڑ کر انگریز سپاہی اُس میں داخل ہوئے تو ''وہ سب قریب قریب مر چکے تھے''۔[2]

ایک نبرد آزما طاقت کے طور پر ہندوستانی فوج ختم ہوگئی۔اُس کی جگہ اتنی ہی نئی بھرتی ہونے والی سکھوں، آفریدیوں، خٹکوں اور مہمندوں کی رجمنٹوں نے لے لی۔لیکن پنجاب کی دشواریاں محض فوج تک محدود نہیں تھیں کلو کی پہاڑیوں میں راجہ پرتاپ سنگھ اور اُن کے بھائی ویر سنگھ نے بغاوت کی۔لیکن انھیں شکست ہوئی،مقدمہ چلا اور سزائے موت دی گئی۔ برطرف رجمنٹوں کی یعنی جہلم کی 14ویں انفنٹری، سیالکوٹ کی 46ویں اور میاں میر کی 26ویں انفنٹری کے سپاہیوں نے لڑائی کا فیصلہ کیا جو جموں کی پہاڑیوں کی طرف چلے گئے تھے۔انھوں نے راوی کو پار کیا اور مادھوپور کے قصبے میں داخل ہوگئے جو بڑی دوآبہ شہر کا صدر مقام تھا۔لیکن سکھ پہرہ داروں نے انھیں بھگا دیا۔سیالکوٹ میں سپاہیوں نے اسٹیشن پر قبضہ کر لیا اور دیہات میں پھیل گئے لیکن یوروپین ''خدا کی مہربانی سے بچ نکلے جس نے باغیوں کی گولیوں کا رُخ موڑ دیا''۔[3]

ستمبر میں کھرل، کٹھی، بنو دوسرے مسلم قبیلوں کے بیس سے تیس ہزار تک افراد نے بغاوت کردی جو مسلم ملتان میں 3000 مربع میل کے رقبے میں آباد تھے۔انھوں نے بہاول پور اور فیروز پور سے اسلحہ حاصل کیے تھے۔انھوں نے اچانک حملہ کر کے پولیس کی چوکیوں پر قبضہ کر لیا،

---

[1] کوپر،محوّلہ بالا،صفحہ 161

[2] ایضاً،صفحہ 162

[3] خارجہ خفیہ مشورہ نمبر 79-80، 28 مئی 1857۔

اُن سے اسلحہ چھین لیے، لاہور اور ملتان کے درمیان سلسلۂ مواصلات کاٹ دیا اور لوگوں سے چندہ وصول کرنے لگے۔ اُن کے خلاف جو ملٹری پولیس بھیجی گئی تھی اُسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ انھوں نے بے ضابطہ رسالے کو بھی چیچا وطنی کے سرائے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اُس کے بعد باغی گوگیر کے ریگستانوں کی طرف چلے گئے جہاں انھیں برطانوی فوج نے گھیر لیا اور گاجر مولی کی طرح کاٹ ڈالا۔[1]

سندھ

انگریزوں نے امیروں کو جس طرح ہٹایا تھا اُس کی یاد لوگوں میں بے اطمینانی کا سبب بن گئی تھی اس لیے سندھ بھی بغاوت میں شامل ہو گیا۔ ہیرات کلے شاہی خاندان کے ایک رکن اور شکارپور میں نظر بند وظیفہ خوار شہزادہ پیر محمد ایک اور سردار امام بخش اور ایک وظیفہ خوار الف خاں نے مل کر برطانوی حکومت کو معزول کرنے کی کوشش کی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکے۔

راجستھان

اٹھارہویں صدی میں راجپوتانہ کے حالات میں انتشار پایا جاتا تھا۔ وہ زمانہ انحطاط اور سرکردہ قبائل کے سرداروں کے باہمی رقابت کا دور تھا۔ کچھ چھوٹی چھوٹی ریاستوں اور جاگیروں کے علاوہ وہاں چار اہم ریاستیں تھیں۔

مارواڑ کا سیسودیا ایک قدیم قبیلہ تھا جن کو راجپوتوں میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔ حالانکہ اُن کی بڑی عزت کی جاتی تھی لیکن وہ سب سے الگ تھلگ رہتے تھے اور دوسرے خاندانوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کرتے تھے۔ وہ دہلی کی سیاست سے بھی دور رہتے تھے۔ 1857 میں مہارانا سروپ سنگھ اُودے پور کا راجہ تھا۔ جئے پور کے کچھاہوں نے ایک بڑی سی ریاست قائم کر لی تھی اور اُس وقت ولی ریاست تھا مہاراجہ رام سنگھ، اُس خاندان کی ایک شاخ الور پر حکومت کرتی تھی۔

---

[1] پنجاب کے چیف کمشنر کے سیکریٹری کا مراسلہ حکومت ہند کے خارجہ امور کے سکریٹری کے نام، 3 اکتوبر 1857 خارجہ خفیہ مشورہ نمبر 445-452، 18 دسمبر 1857 کیو براؤن، جے، The Punjab and Delhi in 1857 جلد دوم، صفحہ 200-223۔

جودھ پور میں مہاراجہ تخت سنگھ راٹھور حکومت کرتا تھا لیکن لوگ اُسے پسند نہیں کرتے تھے اور اپنا نہیں سمجھتے تھے۔ مہاراجہ مان سنگھ کے عہد میں جودھ پور نے اپنی آزادی کے لیے شہرت حاصل کر لی تھی اس لیے کہ مہاراجہ نے انگریزوں کے خلاف جسونت راؤ ہلکر کی مدد کی تھی۔ اس نے سندھ کے امیروں اور ناگپور کے اپا راؤ کی بھی مدد کی تھی۔ جب اُسے برطانوی ریزیڈنٹ رکھنے پر مجبور کیا گیا اور اُس کے دو مذہبی مشیروں کو گرفتار کر لیا گیا تو اُس نے بددل ہو کر گدّی چھوڑ دی اور سنیاس لے لیا۔

بوندی اور کوٹا کے راجہ ہدا راجپوت تھے۔ ٹونک میں ہنڈاری رہنما امیر خاں کے خاندان کا ایک فرد حکومت کر رہا تھا۔

مندرجہ بالا ریاستوں کے علاوہ کئی چھوٹی چھوٹی راجپوت ریاستیں بھی تھیں۔ اس کے علاوہ بہت سے جاگیردار تھے جو نام کو والیان ریاست کے اطاعت گزار تھے بڑی حد تک خود مختار، بدقسمتی سے والیان ریاست اور جاگیرداروں کے مراسم خوشگوار نہیں تھے۔ برطانوی حکومت کی پالیسی تھی جاگیرداروں کے خلاف والیان ریاست کی حمایت کرنا۔ وہ جاگیروں کے داخلی معاملات میں مداخلت کرتے تھے تاکہ رعایا پر جاگیرداروں کے فیوڈل اختیارات کو محدود رکھا جا سکے۔ جاگیردار اپنے مالکوں کے ساتھ انگریزوں سے بھی غیر مطمئن تھے جو اُن کی پشت پناہی کرتے تھے۔

جہاں تک والیان ریاست کا تعلق تھا وہ بڑی دشواریوں میں مبتلا تھے۔ مرہٹوں کے حملوں اور خراج کے مطالبوں کی بنا پر وہ بہت نقصان اُٹھا چکے تھے اور جب انگریزوں نے مرہٹوں کو شکست دی تو انھوں نے اطمینان کا سانس لیا اور برطانوی اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ لیکن مالک بدلنے کے بعد انھیں آہستہ آہستہ معلوم ہوا کہ اگرچہ مالک باضابطہ انداز سے کام کرتے ہیں لیکن مطالبوں کی حد تک اُن میں اور مرہٹوں میں کوئی فرق نہیں۔ زیادہ بری بات یہ تھی کہ انگریز والیان ریاست کے اختیارات کم کرنے میں بڑی سنگدلی سے کام لیتے تھے اور چونکہ اُن کے پاس بڑی طاقت تھی اس لیے مزاحمت نہیں کی جا سکتی تھی۔

اُن ریاستوں میں جو چھاؤنیاں قائم کی گئی تھیں وہ ان کی آزادی کے لیے خطرہ بن گئی تھی۔

اُن کی فیوڈل فوجیں برطرف کردی گئی تھیں اس لیے وہ انگریزی حکومت کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ چونکہ اُن کے رسم ورواج میں مداخلت کی جاتی تھی اس لیے اُن کے دلوں میں مذہب و مراسم کو برقرار رکھنے کے تعلق سے خدشات پیدا ہوگئے تھے۔

1857 سے پہلے فتنہ وفساد سر اُٹھا چکا تھا۔ اُس کی وجہ تھی مان سنگھ کی سرتابی ونگار پور کے جسونت سنگھ کی معزولی، جودھ پور میں راٹھور بھیم جی کا لڈ پر حملہ اور جئے پور میں کیپٹن بلیک کا قتل۔ سیکر، کھیالی اور کھیتری میں بغاوتیں ہوئی۔ میواڑ، مارواڑ اور سیکھادلی کے جاگیر دار اور سول آبادی غیر مطمئن تھی۔ بانکی داس کی طرح کے شاعر اور سوریہ مشر اور ان کی طرح کے دانش ور لوگوں کے جذبات کو مشتعل کررہے تھے۔

والیان ریاست کے باہمی اختلافات اور حکمرانوں اور جاگیرداروں کے آپسی جھگڑوں کے علاوہ انگریز حکمراں اپنی فوجی طاقت پر بھروسہ رکھتے تھے۔ اجمیر میں اُن کا ایک بڑا اسلحہ خانہ تھا۔ جس کی نگرانی ہندوستانی پیدل فوج کی کمپنیاں کرتی تھیں، نصیر آباد اور نیمچ میں دو اہم چھاؤنیاں تھیں اور چھوٹی چھوٹی چھاؤنیاں ارن پوری، دیولی اور دیسا میں تھیں۔

حالانکہ ضابطے کے رو سے راجپوتانہ کا انتظام شمال مغربی صوبہ جات کے لفٹنٹ گورنر کی ذمہ داری تھی لیکن عملاً اختیارات گورنر جنرل کے ایجنٹ اور اودے پور، جے پور، جودھ پور اور کوٹا میں مقیم ایجنٹوں کو حاصل تھے۔

میرٹھ کی بغاوت کی خبر جب راجپوتانہ پہنچی تو چھاؤنیوں میں مقیم ہندوستانی سپاہیوں کی رجمنٹوں، ریاستوں کے ملازم، راجپوت سپاہیوں اور جاگیرداروں نے علم بغاوت بلند کردیا۔ عام لوگوں میں اُن کے لیے بڑا ہمدردی کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ پہلی بغاوت 28 مئی کو نصیر آباد میں ہوئی۔ اُس کے بعد 3 جون کو نیمچ میں بغاوت ہوئی۔ پھر تو بدامنی پھیلتی ہی چلی گئی۔ اجمیر پر حملہ کیا گیا۔ اس حملے کی قیادت ابو نے کی تھی۔ ارن پورہ میں سپاہیوں نے بغاوت کردی اور مندسور پر شہزادہ فیروز شاہ نے قبضہ کرلیا۔ جودھ پور میں ''لوگوں میں پھیلی ہوئی بے چینی کو خاکی سادھوؤں نے تقویت پہنچائی جو جگہ جگہ جاتے تھے اور محل میں بھی مدعو کیے جاتے تھے''۔ لیکن بدامنی کے اصل مرکز تھے کوٹا اور جودھ پور کی باج گزار جاگیر اُوا۔

سب سے پہلے ارن پورہ کی فوج نے بغاوت کی۔ جلد ہی جاگیردار بھی اس میں شامل ہوگئے۔ اُوا کے ٹھاکر کشن پال سنگھ ہی نے اُن کا ساتھ دیا اور میواڑ اور مارواڑ کے جاگیرداروں اور اسوپ النسیاوس، گولار، روپ نگر، سلپر وغیرہ کے سرداروں نے اُس کی حمایت کی۔ انھوں نے مہاراجہ جودھ پور کی بھیجی ہوئی فوج کو شکست دی اور شہنشاہ کے سامنے اپنی شکایتیں پیش کرنے کی غرض سے دہلی کی طرف کوچ کر دیا۔ راستے میں انھیں مجبوراً نرنول کے مقام پر جنگ کرنی پڑی جس میں انھیں شکست ہوئی۔ لیکن ستمبر میں دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوجانے کے بعد اُن کی ہمتیں ٹوٹ گئیں۔

راجستھان میں انگریزوں کے خلاف انقلابی تحریک کا سب سے اہم مرکز تھا کوٹا۔ وہاں پولیٹکل ایجنٹ میجر برٹن کو قتل کر دیا۔ افسروں میں جئے دیال اور اُن کے بھائی ہر دیال نے تحریک کی رہنمائی کی۔ ریزیڈنسی کا محاصرہ کرلیا گیا اور مہاراؤ کو قریب قریب حراست میں لے لیا گیا۔ یہ حالات کئی مہینے تک جاری رہے یہاں تک کہ جنرل رابرٹسن نے پانچ ہزار پانچ، انگریز سپاہیوں کی مدد سے جن کے ساتھ ایک کرولی کا دستہ بھی تھا، باغیوں پر حملہ کیا، بہت نقصان پہنچایا اور شکست دی۔ اُن کے رہنماؤں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ اُن تاجروں اور دستکاروں پر جرمانے کیے گئے جن کے متعلق شبہ تھا کہ تحریک سے ہمدردی رکھتے ہیں اور جئے دیال کو توپ سے اڑا دیا۔

حالانکہ کھلی بغاوت کچل دی گئی تھی پھر بھی بہت سے راجپوت باغیوں کی امداد کرتے رہے۔ تانتیا ٹوپے نے راجستھان میں پناہ لی اور سیمبر اور کوٹھاریا کے سرداروں نے مہاجرین کی امداد کی۔

وسطی ہند

سینٹرل انڈیا ایجنسی کئی چھوٹی بڑی ریاستوں پر مشتمل تھی جو بہار اور چھوٹا ناگپور سے راجپوتانہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اتر پردیش اُن کے شمال میں تھا۔ چنانچہ یہ ریاستیں اُن علاقوں میں گھری ہوئی تھیں جہاں بغاوت ہو رہی تھی۔ اس ایجنسی میں ہندوستانی فوجوں کے خاص خاص مرکز تھے گوالیار، اندور، بھوپال اور مہو۔ جب بغاوت کی خبر وہاں پہنچی تو والیان ریاست کے ناموافق رویے کے باوجود ہندوستانی سپاہیوں نے اپنے ساتھیوں کی حمایت میں بغاوت کر دی اور

زیادہ تر اضلاع میں بدامنی پھیل گئی۔ ساگر، جبل پور، نرسنگھ پور، ہوشنگ آباد، لوگا نگ، ناگپور وغیرہ میں شورش پھوٹ پڑی۔ وہاں سپاہیوں نے بغاوت کردی اور اُن کی حمایت پانی پور کے راجہ اور گونڈ راجہ شنکر شاہ کی طرح کے کچھ دیسی حکمرانوں نے کیا۔

گوالیار کے مہاراجہ انگریزوں کا وفادار تھا۔ کلکتہ کے ایک حالیہ دورے کے وقت اُسے برطانوی راج کی قوت نے بڑا متاثر کیا تھا۔ لیکن گوالیار میں مقیم ہندوستانی سپاہیوں کا رجمنٹ باغیوں سے ہمدردی رکھتی تھی۔ یہ سپاہی باغیوں کے ساتھ خون اور ذات کے رشتے رکھتے تھے۔ اُن کی تعداد آٹھ ہزار سے زیادہ تھی۔ جب انھوں نے 14 جون کے جھانسی کے قتل عام کی خبر سُنی تو انھوں نے بغاوت کردی۔ لیکن اُن کی کامیابی عارضی تھی۔ انگریزوں نے حالات پر قابو پالیا اور مہاراجہ کو گدی پر بحال کردیا۔

بھوپال کے سردار اور امرا وہاں کی حکمراں سکندر بیگم سے خوش نہیں تھے۔ قدرتی بات ہے کہ ملحقہ برطانوی علاقوں میں ہونے والی بغاوت کو انھوں نے غنیمت سمجھا۔ انھوں نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ غیر مطمئن باغیوں کا ساتھ دیا اور کئی موقعوں پر ولایتوں یعنی پٹھانوں اور ریاست کی فوج کو اُکسایا کہ وہ انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کردیں۔

گورنر جنرل کے ایجنٹ کرنل ڈیورنڈ نے وسطی ہند کی بغاوت کے متعلق 13 اگست کے تبصرے میں اپنے خیالات مندرجہ ذیل الفاظ میں ظاہر کیے ''امن وامان بحال کرنے اور جہاں جہاں انتشار پایا جاتا ہے اُس کو ختم کرنے کے لیے ہمارے پاس محدود وسائل ہیں۔ گوالیار کا دستہ ہمارے ہاتھ سے نکل گیا ہے اور اپنے اچھی طرح توپ خانے کے ساتھ سندھیا کے ہاتھ میں چلا گیا ہے اور اس کا حکم بجالائے گا۔ ہوسکتا ہے کہ وہ ہماری مخالفت کرے۔ وہ کبھی کبھی ہماری خواہش (کذا) نہیں کرسکتے ہیں۔ مالوا میں پورا کا پورا رسالہ، جس میں آٹھ سو اچھے اچھے گھوڑے ہیں، ہاتھ سے نکل چکا ہے اور اندور میں پیدل فوج نے اتنی بدتمیزی سے کام لیا کہ اُس پر شبہ نہ کرنے کا امکان باقی نہیں رہا ہے۔ بھوپال کا دستہ، اندور میں نازیبا اور غدارانہ حرکتیں کرنے کے بعد، اب سیہور میں کھلی ہوئی بغاوت کررہا ہے۔ بھیلوں کا دستہ دوبارہ جمع ہورہا ہے...... بگورے ......اب ایک توپ، ایک تلوار اور ایک بندوق ایسی نہیں ہے جس کو امن وامان اور برطانوی اقتدار

بحال رکھنے کے لیے استعمال کیا جاسکے۔''[1]

اس اجمالی بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہمالیہ سے نربدا تک اور کلکتہ سے پشاور تک پورا شمالی ہند انقلابی شورش کا مرکز بنا ہوا تھا۔ مختلف علاقوں میں شورش کم یا زیادہ ہوسکتی تھی لیکن کوئی حصہ بے چینی سے خالی نہیں تھا۔

جنوبی ہند

مہاراشٹر دکن اور جنوبی ہند میں بھی کئی جگہ پر شورشیں ہوئیں۔ وسطی ہند میں اندور، سور، مہو، دھار، امنجھیرا وغیرہ میں بغاوت ہوئی اور حکومت کے لیے پریشانی کا باعث بن گئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ علاقہ مہاراشٹر سے ملا ہوا تھا جہاں بڑی ''بے چینی'' پائی جاتی تھی۔ آزادی کے خاتمے، پیشوا کی حکومت کے زوال اور پونا کی حیثیت کم ہوجانے کی بنا پر، جو مرہٹہ حکومت کا مستقر تھا، لوگ بددل ہوگئے تھے۔ وہ تاریخی خاندان خاص طور سے متاثر ہوئے تھے جنھوں نے قدیم ریاست کے معاملات میں اہم رول ادا کیا تھا۔ انام کمیشن کے فیصلے کے مطابق بہت سی ریاستوں کی ضبطی، زمینداریوں کے مالکوں کے قدرتی وارث نہ ہونے کی صورت میں وارث کو گود لینے کی ممانعت اور نانا صاحب اور پٹوردھن سرداروں سے خاندانوں کے باہمی قریبی رشتوں کی بنا پر خطرناک صورت حال پیدا ہوگئی تھی۔

نوجوان شہزادہ پرتاپ سنگھ، الفنسٹن نے ستارا کی گدی پر بٹھادیا تھا، آزادی پسند طبیعت رکھتا تھا اور انگریز افسر اُس پر شبہ کرتے تھے۔ 1839 میں اسے معزول اور جلاوطن کردیا گیا۔ انصاف کے لیے اُس کی درخواستیں رد کردی گئیں اور اُس کے وارث کی 1848 میں موت کے بعد ریاست کا الحاق بمبئی پریزڈنسی میں کرلیا گیا۔ مرہٹوں کی سرزمین کا جنوبی حصہ انام کمیشن کی سرگرمیوں کے نتیجے میں اور کولہاپور 1844 کی بغاوت کے بعد عائد کیے جانے والے بھاری جرمانے کی بنا پر مایوسی کا شکار تھا اور انگریزوں سے وہاں کے لوگوں کو بڑی شکایتیں تھیں۔ چھوٹا سے چھوٹا واقعہ ان عناصر کو ''مرتا کیا نہیں کرتا'' کے مصداق بغاوت پر آمادہ کرسکتا تھا۔ حقیقت میں ایسا ہی ہوا۔

---

[1] خارجہ مشورہ، نمبر 87، 89، 29 جنوری 1858

اسیر گڑھ، ہربان پور، اورنگ آباد، بلگام، کولہاپور اور بمبئی کے ہندوستانی سپاہیوں اور غیر مطمئن مسلمانوں نے مل کر بغاوت کا منصوبہ بنایا۔ ستارہ میں شیواجی کے خاندان کے ایک قدیم اور وفادار ملازم رنگو باپو جی کپتے نے رموشی، منگ اور کولی رنگروٹ بھرتی کیے اور انگریزوں کو نکالنے اور پرتاپ سنگھ کے بیٹے شاہو کو گدی پر بحال کرنے کے لیے مرہٹہ سرداروں میں سے کچھ کی حمایت حاصل کرلی۔ کندل کے نانا رموشی راجہ، کراد کے دولت راؤ ہری پوار کولہاپور کے تاتیا فدنس اور دوسرے سرداروں نے حمایت کا وعدہ کیا۔ شورام، ککلرنی اس کا روح رواں تھا اور انگو باپو جی کے بیٹے ستیارام کے سپرد عام نگرانی کا کام کیا گیا تھا۔ ایک راجپوت سپاہی مان سنگھ کو پیغام پر مقرر کیا گیا کہ وہ سپاہیوں کی رجمنٹوں کی حمایت حاصل کرے۔ بدقسمتی سے سازش کا علم ہو گیا اور سازش کرنے والے قتل کردیے گئے۔

کولہاپور، بلگام اور دھاروار میں بڑی بے چینی تھی۔ کانپور میں نانا صاحب کی بغاوت کی خبر نے ہندوستانی سپاہیوں کی رجمنٹوں میں بڑی اشتعال پھیلادی تھی۔ بغاوت 31 جولائی کو پھوٹ پڑی۔ کچھ سپاہیوں نے دو دفعہ کولہاپور پر قبضہ کرنے کی کوششیں کیں لیکن وہ کامیاب نہ ہوسکے۔ دسمبر میں ایک دفعہ پھر کوشش کی گئی۔ اس دفعہ انھیں اتنی کامیابی حاصل ہوئی کہ شہر پر قبضہ ہو گیا اور اُس کے دروازے بند کردیے گئے۔ لیکن برطانوی فوجوں نے ایک دروازہ بارود سے اُڑا دیا اور شہر اور راجہ کے محل پر قبضہ کرلیا۔ راجہ کے بھائی کو قید کرکے سندھ بھیج دکیا گیا۔ بلگام میں ایک منشی نے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کیا لیکن بغاوت شروع ہونے سے پہلے انگریزوں کو اس کا علم ہو گیا اور شورش فرو کردی دگئی۔

بمبئی میں تین ہندوستانی رجمنٹ تھیں۔ انھوں نے محرم کے موقع پر بغاوت کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔ لیکن پولیس کا ڈپٹی کمشنر فورجٹ اس کے لیے تیار تھا اور اُس کے اقدامات نے سازش کو ابتدائی مراحل ہی میں ختم کردیا۔

نارگنڈ کے سردار نے جس کے دل میں انام کمیشن کی کارروائیوں نے خطرات پیدا کردیئے تھے، بغاوت کی اور حکمرانوں کے غیظ وغضب کا نشانہ بن گیا۔ سوانت داری کے دیسائیوں نے اپنے جنگلوں میں واقع قلعوں سے حکومت کی مخالفت شروع کی لیکن بالآخر انھیں شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔

لوگوں کی سرگرمیوں میں تال میل کی کمی اور برطانوی حکمرانوں کی حکمت عملی اور ہوشیاری نے ان شعلوں کو بڑے پیمانے پر پھیلنے سے روک دیا، مرہٹوں کی سرزمین کے جنوبی حصے میں ہونے والی بغاوت ایک چھوٹے سے واقعہ سے زیادہ کچھ نہیں تھی جو سرداروں، زمینداروں اور تھوڑے سے شمالی ہند کے سپاہیوں تک محدود تھی۔ مرہٹوں اور مہاروں اور پوربیا سپاہیوں میں کوئی چیز مشترک نہیں تھی اور اس لیے ان کی بات کا مقامی لوگوں نے اثر قبول نہیں کیا۔

بمبئی کے تاجروں اور تھوڑے سے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کو اس انقلاب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

حیدرآباد اور مدراس کی بغاوت

دہلی کے مغل حکمراں سے ہمدردی کی بنا پر نظام کے علاقے کی مسلم آبادی بہت بے چین تھی۔ مولوی جہاد کی تبلیغ کررہے تھے جس کے نتیجے میں روہیلہ فوج اور اُس کے بہت سے ہمدردوں نے بغاوت کردی اور برطانوی ریزڈنسی کی طرف بڑھے۔ لیکن نوجوان نظام اور اُس کا معمر وزیر اعظم سالار جنگ انگریزوں کے وفادار رہے اور باغی کچل دیئے گئے۔

مدراس کی پریسیڈنسی میں بے چینی تو کم نہیں تھی لیکن قیادت کا فقدان تھا۔ ہندوستانی سپاہی نیچی ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے جنھیں ذاتوں کے خلاف کی جانے والی زیادتیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، پھر ایک بات یہ بھی تھی کہ رعیت داری نظام کے قیام نے اُس طبقے کو ختم کردیا تھا۔ جو حکومت کرنے کی روایات کے قابل تھے۔ مغربی تعلیم پائے ہوئے لوگ اس تحریک کے خلاف تھے اور اُس کو رجعت پسند تحریک سمجھتے تھے۔

اس کے باوجود دہلی میں مغل حکومت کی بحالی کی خبر نے جنوب کے لوگوں میں ہلچل پیدا کردی۔ مسلمان سپاہیوں کو اس سے بڑی خوشی ہوئی۔ عام مسلمانوں کا رویہ تہدید آمیز تھا۔ کرنول، کڑپا اور مالابار میں مسلمانوں کی خاص آبادی تھی۔ ارکاٹ ویلور اور ترچنا پلی کرناٹک سے نوابوں کی حکومت میں رہ چکے تھے اور اُن حکومت کی یاد تازہ تھی جو حال میں ختم ہوئی تھی۔ حیدرآباد اور میسور میں غیر مطمئن گروہ موجود تھے۔

پورے مدراس میں باغی سرگرم عمل تھے۔ مثال کے طور پر نیٹو انفنٹری کی تیرھویں رجمنٹ

میں ایک براہمن سادھو پکڑا گیا جو برطانوی حکومت کے اختتام کا اعلان اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو اتحاد کی تلقین کر رہا تھا۔ سرکاری رپورٹ میں کہا گیا تھا [1] کہ بنگال کمانڈر کے بہت سے سپاہی اس پریسیڈنسی کے مختلف حصوں میں موجود ہیں جن کا مقصد ہے ''ہمارے سپاہیوں سے ملنا اور جھوٹی اور بدباطنی پر مبنی افواہیں پھیلا کر اُن کے دلوں میں حکومت کی طرف سے شک وشبہات اور نفرت پیدا کرنا۔''

ستمبر 1857 میں صورت حال تشویشناک ہوگئی تھی۔ لیکن حکومت مدراس نے اشتعال کو فرو کرنے اور امن بحال رکھنے کے لیے مناسب اقدامات کیے۔ ریاست کے خلاف جرائم کی سرسری سماعت کے لیے 1857 کے ایکٹ نمبر 14 کے تحت احکام جاری کیے گئے، فوجی عدالتیں قائم کی گئیں تاکہ اُن سپاہیوں کے خلاف عدالتی کارروائی کی جاسکے جو قواعد شکنی کے مرتکب ہوں اور تمام مرکزوں میں پولیس میں نئی بھرتی کی گئی۔ اس طرح اکا دکا شورشیں فرو کردی گئیں۔ حالانکہ لوگوں کے جذبات نے حکومت کو بڑی تشویش میں مبتلا رکھا لیکن بڑے پیمانے پر تشدد نہیں پھیل سکا۔

VII تبصرہ

ہندوستان کی مجموعی صورت حال کا مطالعہ اس بات میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں چھوڑتا ہے کہ بغاوت وسیع پیمانے پر ہوئی تھی، یہ کہ سپاہی اور سول آبادی دونوں نے اس میں شرکت کی اور یہ کہ دونوں نے ملکر بدیسی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کی۔ کچھ حکمرانوں کے خیال اور توقع کے برعکس مسلمانوں اور ہندوؤں نے اشتراک عمل کیا۔ حالانکہ کچھ مقامات پر فرقہ وارانہ اختلافات بھی رونما ہوئے پھر بھی مجموعی اعتبار سے دونوں نے شانے سے شانہ ملا کر جنگ کی اور ایک دوسرے کی پوری پوری حمایت کی۔ بہادر شاہ ظفر نے بقرعید کے موقع پر گائے کی قربانی کی ممانعت کردی اور خان بہادر روہیل کھنڈ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات پیدا کرنے کی انگریزوں کی کوششوں کو ناکام بنادیا۔ زیادہ تر باغی رہنماؤں نے بہادر شاہ کو ہندوستان کا جائز شہنشاہ تسلیم

---

[1] عدالتی مشورے، 3 ستمبر 1857 روداد دسمبر 1081A کا اقتباس (مدراس کے ریکارڈ آفس میں فوجی محکمہ 1857 کی کارروائی کی جلد)

کرلیا۔ باغیوں کی قائم کی ہوئی حکومت میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل تھے۔ ہندوؤں کے مقدموں کا فیصلہ کرنے کے لیے ہندو ججوں کی عدالتیں قائم کی گئیں۔ اور مسلمانوں کے لیے قاضی مقرر کیے گئے۔ جہاں کہیں بھی اعلان جہاد کیا گیا اُس میں اس امر کی وضاحت کر دی گئی کہ جہاد محض عیسائی حکمرانوں کے خلاف کیا جائے گا۔

بغاوت کے اسباب بہت سے تھے۔ کمانڈنٹ جے، مارٹن نے لکھا ہے ''اس وسیع سلطنت کو فتح کرنے کے لیے مفید تھا کہ وہ نظام جس پر اب تک عمل کیا گیا لیکن وہ اس پہلے دھکے کو بھی برداشت نہ کرسکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملک کے اندر اُس کے پاس وہ مضبوط امدادی عناصر نہیں تھے جن پر وہ بھروسہ کرسکتا اور جن کی مدد سے ایک فریق دوسرے فریق کے خلاف لڑسکتا۔ چونکہ کمپنی میں خود کو بحال و برقرار رکھنے کی صلاحیت نہیں تھی چنانچہ وہ اپنے وطن (انگلستان) کی مدد کے بغیر اس بغاوت پر قابو پانے کی سکت نہیں رکھتی تھی اس لیے کہ اپنی قدیم علیحدگی پسندی پر عمل کرتے ہوئے اس نے بامقصد تصورات کے پر چار کو نظر انداز کیا یا اُن ملکوں مین جن پر اُسے غلبہ حاصل ہوگیا تھا مغربی تہذیب کی شجر کاری سے احتراز کیا۔ چونکہ اُسے اپنی رعایا کی خوشحالی، اخلاق اور زندگی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی اور برآمدات، درآمدات، اجارہ داریوں، تنخواہوں اور منافعوں کے علاوہ کسی اور بات سے سروکار نہیں تھا اس لیے ہندوستانیوں کو مہذب بنانے کے بجائے اس نے محض اُن کا استحصال کیا۔ اُن لوگوں کو وہ تعلیم اور مہارت مہیا کرنے کی بجائے جو آزادی کے خواہش مندوں میں تحریک پیدا کرتے ہیں اُس نے وہاں کے لوگوں کو حکومت خود اختیاری کے نا قابل بنا دیا۔ یہ پالیسی چالاکی پر مبنی ہوسکتی ہے لیکن اس کو فیاض سے تعبیر نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے یہ بات قرین انصاف ہے کہ ہندوستان کی کمپنی کی بدباطنی، جاہ طلبی، خودغرض اور ہر قسم کے استحصال بالجبر کے لیے مذمت کی گئی ہے۔''[1]

ہندوستان کے لوگوں پر ایک صدی تک کی جانے والی اس قسم کی حکومت کا نتیجہ تباہ کن ہونا ضروری تھا جس کی لپیٹ میں پورا ملک آ گیا۔ الگوینڈر ڈف نے ٹھیک ہی کہا ہے ''ہر وہ شخص جس نے عمداً آنکھیں بند نہیں کر لی ہیں یہ جانتا ہے کہ اُن سینکڑوں اور ہزاروں مقامات پر بھی

---

[1] مارٹن۔ جے۔ کمانڈنٹ، محولہ بالا، صفحات 445-440

جہاں حسنِ انتظام یا قدرت کی مہربانی سے بغاوت نہیں ہوئی وہاں بھی بے اطمینانی اور بڑے غدارانہ جذبات اور باغیانہ احساسات کا اظہار کیا گیا اور وہاں بھی حکام کو بہت سے خطرات و خدشات کا سامنا کرنا پڑا۔''[1]

اپنے غیر ضروری اطمینان قلب کی بنا پر انگریز جس فریب میں مبتلا ہو گئے تھے 1857 کی بغاوت نے اُسے پاش پاش کر دیا۔ اس تحریک نے اُن پر روشن کر دیا کہ محکوموں کو طاقت کے ذریعے اطاعت پر مجبور تو کیا جا سکتا ہے لیکن طاقت کے ذریعے کسی کو وفادار نہیں بنایا جا سکتا ہے۔

اس عظیم بغاوت کی وسیع نوعیت کی بنا پر ظاہر ہے کہ تال میل اور منصوبہ بندی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آنے والے طوفان کا کچھ نہ کچھ احساس ہندوستانی رجمنٹوں کو تھا۔ اس قسم کے واقعات جیسے چپاتیاں یا سُرخ کنول کے پھول تقسیم کرنا اس امر کی نشاندی کرتے ہیں۔ نانا صاحب کے مشیر خاص عظیم اللہ خاں، مولوی احمد اللہ شاہ جنھوں نے اودھ میں اہم رول ادا کیا، مشہور و معروف مولوی فضل الحق خیر آبادی اور بہت سے دوسرے مولویوں کے روابط ظاہر کرتے ہیں کہ ایک عام تحریک کے لیے صلاح مشورے کے بعد کوششیں کی گئیں۔ حالانکہ ایران اور روس کے ساتھ مراسلت کی کہانی دور از کار معلوم ہوتی ہے لیکن اس امر کا ثبوت کافی ملتا ہے بہادر شاہ نے کئی دیسی حکمرانوں اور سرداروں اور ہندوستانی فوج کے کارکنوں سے بھی خط و کتابت کی۔ اس قسم کی افواہیں گشت کر رہی تھیں کہ ایک مقررہ دن تمام چھاؤنیوں میں فوجیں بغاوت اور انگریزوں پر حملہ کریں گی۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ بغاوت کے لیے 31 مئی کا دن مقرر کیا گیا جس کا شمار شمالی ہند کے گرم ترین دنوں میں ہوتا ہے اور اس لیے ملک کے بدیسی حکمرانوں کے خلاف بغاوت کے لیے بہت موزوں تھا۔ بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرٹھ میں جب سپاہیوں نے مقررہ دن سے تین ہفتے پہلے ہی بغاوت کر دی تو اس پر بہادر شاہ کو تعجب ہوا اور وہ قبل از وقت بغاوت میں حصہ لینے کے سلسلے میں تذبذب کا شکار ہو گئے۔

مختلف مواقع پر رہنماؤں میں تال میل دیکھنے میں آیا اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی قسم کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ مثال کے طور پر کانپور کی لڑائی میں شہزادہ فیروز، گوالیار کی فوج، بابو کنور سنگھ اور

---

[1] ڈف اے، محولہ بالا، صفحہ 280

دوسروں نے نانا صاحب کی مدد کی۔ بہادر شاہ نے راجوں، نوابوں اور راجستھان، پنجاب اور شمالی ہند کے سرداروں کو اپنے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کی دعوت دی لیکن انھیں خاطر خواہ جواب نہیں ملا۔ خاص طور سے اودھ کے اخبارات نے تال میل کے نظریے کی حمایت کی۔ ملک کے مختلف حصوں میں وہ جاتے تھے جس کی وجہ سے دہلی اور دوسرے مراکز کی خبریں پھیل رہی تھیں۔

حالانکہ معمر بہادر شاہ جو گدّی پر بیٹھے محض نام کے شہنشاہ تھے پھر بھی تاریخ کے فیصلہ کُن بحران میں اُن کا نام جادو کا سا اثر رکھتا تھا۔ پرانے جھگڑے جنہوں نے پچھلے سو سال سے ملک کو پریشان کر رکھا تا، عارضی طور سے بھلا دیئے گئے۔ عقیدت اور وفاداری کے بیان کیے گئے اور اطاعت کے عہد کی تصدیق نو ہوئی۔ واجد علی شاہ کے بیٹے برجیس قدر نے، جن کے اسلاف نے شہنشاہ کی اطاعت سے منہ موڑ کر بادشاہ کا خطاب اختیار کر لیا تھا، والی کی حیثیت سے گدّی پر بیٹھنے کے بعد اعلان کیا کہ وہ دہلی کے حکام کی پوری پوری تعمیل کریں گے۔

خان بہادر خاں نے، جو حافظ رحمت خاں کے پوتے تھے جس نے دوآبے میں اپنے لیے ایک ریاست حاصل کر لی تھی، جب روہیل کھنڈ کا انتظام سنبھالا تو انھیں دہلی کے شہنشاہ کا وائسرائے تسلیم کیا گیا۔ وہ بڑی فوجی سوجھ بوجھ رکھتے تھے، انگریزوں کی فوجی طاقت سے واقف تھے اور اُن سے مقابلہ کرنے اور انھیں شکست دینے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ اس کا ثبوت مندرجہ ذیل حکم عام سے ملتا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انھوں نے جاری کیا تھا ''کافروں کے باضابطہ دستوں کا مقابلہ نہ کیجئے اس لیے کہ نظم وضبط اور بندوبست کی حد تک وہ آپ سے برتر ہیں اور اُن کے پاس بڑی بڑی توپیں ہیں۔ لیکن اُن کی نقل وحرکت پر نظر رکھیے، دریاؤں کے تمام گھاٹوں کی حفاظت کیجئے اُن کے مواصلات کاٹ دیجیے، رسد روک دیجیے، اُن کی ڈاک اور چوکیاں کاٹ دیجیے اور اُن کے کیمپوں کے قریب رہیے۔ انھیں چین سے نہ بیٹھنے دیجیے۔''[1]

پیشوا باجی راؤ دوم کے بیٹے نانا صاحب نے اُس وقت اختیارات سنبھال لیے جب کانپور میں فوجوں نے بغاوت کی اور دہلی کی طرف بڑھنے لگے اس لیے کہ ''مغل شہنشاہیت کی بحالی سے

---

[1] اقتباس، رسل۔ ڈبلو۔ ایچ محولہ بالا، صفحہ 73

اُن کی بڑی توقعات وابستہ تھیں۔''[1] بغاوت کے شروع ہونے سے پہلے اپنے مشیر عظیم اللہ خاں کے ساتھ نانا صاب نے ایسے حالات میں دہلی اور لکھنؤ کا سفر کیا تھا جنھوں نے انگریز افسران کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا کر دیے تھے۔ باندا کے نواب علی بہادر نے، جو نانا صاحب کی عملی حمایت کر رہے تھے۔ شاہ گڑھ کے راجہ کے نام ایک خط میں لکھا تھا ''خدا کے فضل سے شہنشاہ کی حکومت قائم ہوگئی ہے۔''[2] میسور کے جڈیشیل کمشنر، مسٹر ایچ۔ بی۔ ڈورو کے سامنے بیان دیتے ہوئے سیتارام باوا نے کہا ''نانا صاحب اور مان سنگھ نے دہلی کے بادشاہ سے خط وکتابت کی اور یہ طے ہوا کہ بادشاہی مسلمان کو ملے اور دیوان گیری ہندوؤں کے حصے میں آئے۔''[3]

ان بیانوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ نانا صاحب کوشش کر رہے تھے کہ شہنشاہ کے ساتھ مل کر کام کریں۔

پٹنہ، الٰہ آباد، لکھنؤ، کانپور، فرخ آباد، بریلی وغیرہ کے حکمراں اپنے القاب کی تصدیق کے لیے دہلی پر نظریں جمائے ہوئے تھے اور دہلی کی کوشش تھی کہ تمام طبقوں میں تال میل پیدا کیا جائے چاہے وہ ہندوستانی سپاہیوں کی رجمنٹ ہو یا ہندوستانی راجہ نواب اور امیر۔ شہنشاہ نے فوجوں کو ہدایتیں جاری کیں اور شمالی ہندوستان کی کئی حصوں سے عرضداشتیں قبول کیں یعنی راجپوتانہ، مالوا، صوبجات متوسط، شمالی مغربی صوبجات اور اودھ اور بہار سے پٹیالہ اور گوالیار کے راجوں، راجستھان کے راجوں، کشمیر کے مہاراجہ گلاب سنگ اور دوسرے ہندو مسلم سرداروں کو نجی خط بھی لکھے گئے۔ کچھ نے اطاعت ظاہر کی لیکن بہت سوں نے یا تو کوئی بہانہ بنا دیا یا راست عمل سے گریز کیا اس لیے کہ اُن کے خیال میں بغاوت کی کامیابی کے امکانات بہت کم تھے اور ناکامی کی صورت میں اُن کی تباہی لازمی تھی۔

---

[1] کے اور ملیسن، محولہ بالا، جلد دوم، صفحہ 234

[2] Freedom Strugle in Utter Pradesh جلد سوم، صفحہ 161

[3] ایضاً جلد اول، صفحہ 374

مدراس[1] میں باغیوں نے ''بادشاہ دہلی زندہ باد'' کے نعرے لگائے۔ حیدرآباد اور پنجاب میں ہندوستانی رجمنٹوں سے اسلحہ واپس لے لیے گئے تھے لیکن بہت سے برطرف شدہ سپاہی دہلی کی طرف چل پڑے۔ نانا صاحب نے جب پیشوا کا لقب اختیار کیا تو راجپوتانہ، وسطی ہند اور مہاراشٹر میں سرداروں کے دل خوشی سے بھر گئے اس کے باوجود یہ تسلیم کرنا پڑ گیا کہ اگر کوئی منصوبہ بنایا گیا تو وہ معمولی نوعیت کا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسا کوئی رہنما منظر عام پر نہیں آیا جو تحریک کی قیادت کے لئے ضروری تنظیمی صلاحیت رکھتا ہو۔ باغی بہادر تھے اور داد شجاعت دے سکتے تھے لیکن نظم وضبط کا اُن میں فقدان تھا۔ نہ کوئی لڑائی کا معقول منصوبہ تیار کیا گیا تھا، نہ وہ یہ جانتے تھے کہ یہ کام کتنا بڑا ہے۔ فوجی ضرورتوں کا بھی انھیں پورا احساس نہیں تھا اور روپے اور جنگی سامان کی فراہمی کا کوئی معقول انتظام نہیں کیا گیا تھا۔ حکومت اور فوج کی دیسی تنظیم نہیں کی گئی تھی جس کا تقاضا اُس وقت کے حالات کرتے تھے۔ بغاوتیں تو بہت سی ہوئی لیکن کسی ایسے جامع پروگرام میں انھیں منسلک نھیں کیا جا سکا کہ مل کر وہ مشترک مقصد حاصل کر سکیں۔

عظیم بغاوت قریب دو سال تک جاری رہی اور اس دوران بہت سے اچھے اور بُرے واقعات ہوئے۔ ایک طرف اگر شجاعت اور مقصد سے لگن، بے جگری کے ساتھ مقابلہ کرنے اور سپر اندازی پر عزت کی موت کو ترجیح دینے کے واقعات دیکھنے میں آئے تو دوسری طرف بزدلانہ بے رحمی، غداری، نااہلی، بزدلی اور بیوقوفی کے نمونے بھی سامنے آئے۔ سرکردہ مردوں اور عورتوں میں کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے ثابت قدمی، وفاداری، دشوار حالات میں تدبّر سے کام لیے، دشمن کی چالوں کو ناکام بنانے اور جنگی کارروائیوں کے دوران مہارت سے کام کرنے کی اہلیت کا ثبوت دیا۔ اسی کے ساتھ یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بہت سے وہ بھی تھے جنھوں نے ڈر کے یا تو نجی فائدے کی خاطر تحریک میں حصہ لیا تھا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ غداری کرنے کو تیار رہتے تھے۔ ان لوگوں کا طرز عمل ملک کے حسین دامن پر ایک داغ رسوائی کے سوا کچھ نہیں۔

---

[1] The Friends of India مورخہ 10 ستمبر 1857 صفحہ 867 سفر اسلم نمبر 1376، مورخہ 25 ستمبر 1857 از قائم مقام چیف سکریٹری، فورٹ سینٹ جارج بنام سی ہیڈن، سکریٹری حکومت ہند، جس میں 150 ویں مدراس نیٹو انفنٹری مقیم مدراس باغیانہ رویے کا ذکر کیا گیا تھا۔

آخرالذکرواقعات کوبھُلا دینا ہی اچھا ہے۔[1] لیکن تاریخ اُن پرجوش مردوں اور عورتوں کو کبھی نہیں بھلاسکے گی جنھوں نے ملک کو بدیسی حکمرانوں کی غلامی سے آزاد کرانے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کردیا۔ دہلی کے شاہی خاندان نے اس تحریک کوایک ایسانمائندہ عطا کیا جو ماضی کی شاندارروایات کے ناقابل نہیں تھا۔شہزادہ فیروزشاہ ابھی صرف تئیس چوبیس سال کے تھے جب غدرشروع ہوالیکن اپنی کم عمری کے باوجودوہ ایک کامیاب رہنما ثابت ہوئے۔انھوں نے مندسور میں علم بغاوت بلند کیااور وسطی ہند میں انگریزی فوجوں کے خلاف لڑتے رہے۔وہاں سے نکلنے کے بعدوہ اترپردیش میں نمودار ہوئے اورروہیل کھنڈ اور اودھ میں جنگیں کیں۔ وہاں شکست پانے کے بعدراجپوتانہ میں تانتاٹوپے کی فوجوں سے جاکرمل گئے،انگریزوں کی بڑی بڑی فوجوں سے جنگ کی اوراپنے پیچھا کرنے والوں سے بچ کرسرونج کے جنگل میں پناہ لی۔اُس وقت تک بغاوت ختم ہوچکی تھی اور ملکہ وکٹوریہ کا اعلان جاری ہو چکا تھا جس میں اُن لوگوں کو معاف کردینے کاوعدہ کیا گیا تھا جو اطاعت کرلیں۔اس اعلان کی بڑی تشہیر کی گئی تھی۔حالانکہ انھیں بہت دشوار حالات کا سامنا کرنا پڑرہا تھالیکن انھوں نے اپنی عزت نفس،آزادیؤ یااپنے خاندان کے وعدوں کوذلت آمیز اورشرمناک قید پرترجیح دی۔وہ ایک بہادرسپاہی تھےاورآخری سانس تک اپنے ملک کے روشن مستقبل پراُن کا اعتماد باقی رہا۔جلاوطنی میں اُن کا انتقال ہوا۔

روہیل کھنڈ میں حافظ رحمت خاں کے پوتے خاں بہادرخاں نے،جن کی عمرستر سال تھی، دہلی کے شہنشاہ کے وائسرائے کا عہدہ سنبھال لیااوراتنی مدبرانہ سوجھ بوجھ کے ساتھ ہندوؤں اور مسلمانوں پرحکومت کی کہ اُن میں اختلافات پیدا کرنے کی دشمن کی تمام کوششیں ناکام ہوکررہ گئیں۔انھوں نے بڑی مہارت کے ساتھ روہیل کھنڈ کی حفاظت کی اورشکست کھانے اورترائی کے جنگلوں میں پناہ لینے سے پہلے انگریزی فوج کے اُن چاردستوں کوشکست دی جو بریلی کی

---

[1] ہندوستانیوں پر برطانوی فوجوں کے مظالم اور انگریزوں پر ہندوستانی سپاہیوں کے مظالم کی صرف چندمثالیں پیش کی گئی ہیں کے A History of Sepoy War in India جلددوم،صفحات 284،368،373اور بعد کے صفحات رسل،صفحات 42-43 ایڈورڈ ٹامسن Meethu sili of the melal صفحہ 56، خارجہ سیاسی مشورہ،نمبر 28, 30 دسمبر 1857 (سپلیمنٹ)

طرف بڑھ رہے تھے۔ ایک غدار نے انھیں گرفتار کروا دیا۔ اُن پر مقدمہ چلا اور سزائے موت دی گئی۔ انھوں نے ایک محبّ الوطن بہادر کی طرح جان دی اور آخر تک نہایت بہادری اور بے جگری کا مظاہرہ کیا۔

اودھ میں ایک بہادر خاتون حضرت محل نے، جو واجد علی شاہ کی بیگم تھیں بغاوت میں یادگار رول ادا کیا۔ انھوں نے اپنے گیارہ سالہ بیٹے برجیس قدر کی طرف سے اقتدارِ اعلیٰ سنبھال لیا۔ وہ باغیانہ تحریک کی روحِ رواں بن گئیں۔ انھوں نے نہ صرف انتظامی ڈھانچہ ترتیب دیا اور سرکاری کام سرانجام دیے بلکہ ریزیڈنس پر حملے کی قیادت بھی کی۔ جب لکھنؤ چھوڑنے پر مجبور ہوگئیں تو انھوں نے شاہجہاں پور کی طرف بڑھنے کی کوشش کی تاکہ وہاں مولوی احمد اللہ شاہ کی حمایت کرسکیں۔ لیکن اس میں وہ کامیاب نہ ہوسکیں اور نیپال کی سرحد کے جنگلوں کی طرف چلی گئیں۔ انھوں نے بڑی بازی لگائی تھی لیکن وہ ہار گئیں۔ حالانکہ میدانِ جنگ میں انھیں شکست ہوئی لیکن انھوں نے اپنی عزتِ نفس کو برقرار رکھا۔ انھیں پینشن کی پیش کش کی گئی جسے انھوں نے منظور نہیں کیا اور بدیس میں گمنامی کی موت کو ترجیح دی۔

شیر بہادر کنور سنگھ سپہ سالاری کی اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ایک حقیقی راجپوت زمیندار کی طرح وہ کشادہ دل اور بہادر انسان تھے۔ رعیت اُن کی پوجا کرتی تھی اور خود وہ برطانوی حکومت کے شدید دشمن تھے۔ روہی میں 12 جون کو ہونے والے سپاہیوں کی بغاوت نے اسّی سال کے اس بزرگ سپاہی کے لئے بانگِ درا کا کام کیا۔ انھوں نے شاہ آباد کے ضلع میں برطانوی حکومت کو معزول کرایا اور اپنی حکومت قائم کرلی۔ جب دشمن کے دباؤ کی بنا پر وہ شاہ آباد پر اپنا قبضہ بحال نہ رکھ سکے تو اپنے سپاہیوں کے ساتھ روہتاس کی پہاڑیوں کی طرف چلے گئے اور انگریزی مواصلات کے لیے خطرہ بن گئے۔ مرزا پور کے جنگلوں میں سے گزر کے وہ ریوا پہنچے۔ اُن کو امید تھی کہ راجہ کی حمایت حاصل کرلیں گے۔ جب وہ اس میں کامیاب نہ ہوسکے تو باندہ گئے اور وہاں سے کالپی گئے تاکہ نانا صاحب سے مل کر کانپور پر حملہ کرسکیں۔ یہ منصوبہ بھی کامیاب نہ ہوسکا اور وہ لکھنؤ چلے گئے جہاں اُن کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ اس کے بعد وہ اعظم گڑھ کی طرف بڑھے، انگریزی فوج کو شکست دی اور شہر پر قبضہ کرلیا۔ ایک بڑی انگریزی فوج کے آنے کے بعد

انھوں نے شہر خالی کر دیا اور غازی پور کے قریب گنگا پار کر کے ایک دفعہ پھر بہار میں داخل ہو گئے۔ اُن کا آخری کارنامہ تھا اپنے وطن جگدیش پور کے قریب دشمن کو ایک بڑی شکست دینا۔ اس جنگ میں انگریزوں کا بڑا نقصان ہوا۔ برطانوی کمانڈر اور کئی دوسرے افسر مارے گئے اور باغیوں نے اُن کی کچھ توپیں چھین لیں۔ لیکن اس شاندار کامیابی سے زخمی شیر زیادہ دن تک اپنا دل خوش نہ کر سکا۔ غیر معمولی مشقت نے انھیں تھکا دیا تھا اور پچھلی لڑائی میں لگنے والے زخموں نے انھیں کمزور کر دیا تھا۔ بالآخر 26 اپریل 1858 کو اُن کا انتقال ہو گیا۔ اُن کے بھائی امر سنگھ کی قیادت میں جنگ دسمبر 1859 تک جاری رہی۔

ایک اور انتھک سپاہی تھے تاتیا ٹوپے جن کا اصل نام تھا رام چندر پندورنگا۔ انھوں نے مرہٹوں کی ابتدائی گوریلا جنگ کی روایات ورثہ میں پائی تھیں اور اس غیر مساوی لڑائی میں، جو نہایت دشوار حالات میں دو سال تک جاری رہی تھی انھوں نے اپنی اہلیت کا بہترین مظاہرہ کیا۔ بجلی کی سی سرعت کی طرح وہ جگہ جگہ پہنچتے اور بغاوت کے شعلے بھڑکاتے تھے، اپنے مخالفوں کی حکمت عملیوں کو ناکام بناتے اور انھیں شکست دیتے تھے، جم کر جنگ کرنے سے بچتے تھے، شکست کے بعد بچ نکلتے تھے اور اپنا پیچھا کرنے والے دشمنوں کو چکر میں ڈال دیا کرتے تھے۔ ایک بڑی برطانوی فوج وسطی ہند اور راجپوتانہ میں اُن کا پیچھا کرنے میں مصروف تھی جہاں وہ کبھی پیچھے ہٹتے تھے اور کبھی آگے بڑھتے تھے۔ شکست سے اُن کا جوش کم نہیں ہوتا تھا اور تباہی اور بربادی کے خوف سے اُن کی وفاداری میں کمی نہیں آتی تھی۔ اُن کا انجام افسوسناک ہوا۔ اُن کے ایک دوست نے اُن کے ساتھ غداری کی۔ ایک برطانوی عدالت میں، جسے اُن کے مقدمے کی سماعت کا اختیار حاصل نہیں تھا اس لیے کہ وہ انگریزی رعایا نہیں تھے، اُن پر مقدمہ چلایا گیا اور موت کی سزا دی گئی۔ ایک بہادر برہمن کی طرح انھوں نے پھانسی کا پھندا اپنے ہاتھ سے گلے میں ڈالا اور بڑی شان بے نیازی کے ساتھ پھانسی کے تختے پر کھڑے ہو گئے۔

بندیل کھنڈ میں باغیوں کی رہنما تھیں جھانسی کی رانی لکشمی بائی جن کی یاد نے بجا طور سے اس تحریک کے گرد رومانی کہانیاں بنادی ہیں اور جن کے شجاعت کے کارناموں کا ذکر گاؤں کے شاعروں کے گیتوں میں ملتا ہے۔ ''اس نوجوان، پرجوش، خوددار، منت سماجت سے عاری اور

سمجھوتہ نہ کرنے والی رانی'' کو برطانوی کام کی بے رحمی اور بیجا شک وشبہ نے بغاوت میں حصہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ ان کی بے جا مخالفت نے رانی کے غصے کو بھڑکایا اور جب برطانوی فوج نے بڑھ کے جھانسی کا محاصرہ کر لیا تو انھوں نے بڑی بہادری کے ساتھ اُس کا مقابلہ کیا۔ ''سڑک سڑک، گھر گھر اور کمرے کمرے میں بڑی سخت لڑائی ہوئی اور شہر کی حفاظت کرنے والے شیروں کی طرح لڑے۔'' اس سے پہلے کہ قلعے پر حملہ آوروں کا قبضہ ہو ہر شخص کے جسم کے ٹکڑے ہو چکے تھے۔ لیکن رانی بچ کے نکل گئیں اور کالپی پہنچیں۔ جب کالپی پر بھی انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو انھوں نے اور اُن کے ساتھ تاتیا ٹوپے نے گوالیار پر قبضہ کرنے کا جرأت آمیز منصوبہ بنایا۔ یہ خیال ''اتنا ہی نیا اور جرأت آمیز تھا جتنا ارکاٹ پر قبضہ کرنے کا یادگار منصوبہ۔''[1] گوالیار پر اُن کا قبضہ تو ہو گیا لیکن وہ زیادہ دن تک اُس پر قابض نہ رہ سکے اس لئے کہ مختلف سمتوں سے برطانوی فوج کے دستے اُس پر حملہ کر رہے تھے۔ کوٹا کی سرائے سے گوالیار آنے والی سڑک کی حفاظت کرنے کے لئے رانی اپنے سپاہیوں کے ساتھ شہر کے باہر نکلیں۔ اُس لڑائی اور رانی لکشمی بائی کی بہادری کے ساتھ جان دینے کی کہانی بغاوت کے سرکاری برطانوی مورخ ملیسن کے الفاظ میں بیان کی جانی چاہیے۔ اُس نے لکھا ہے ''مردانہ لباس پہنے اور گھوڑے پر سوار جھانسی کی رانی دن بھر اپنی فوجوں کی ہمتیں بڑھاتی دیکھی گئیں۔ جب ایک ایک انچ آگے بڑھتی ہوئی برطانوی فوجیں درّے میں سے گذر گئیں اور جب چوٹی پر پہنچنے کے بعد اسمتھ نے رسالے کو حملہ کرنے کا حکم دیا تو جھانسی کی رانی نے برطانوی رسالے کے سپاہیوں کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کیا۔ جب اُن کے ساتھی انھیں چھوڑ کر بھاگے تو اُن کی کوشش کے باوجود اُن کا گھوڑا بھی دوسروں کے ساتھ بھاگ نکلا۔ اُن کے ساتھ شاید وہ بھی بچ کر نکل جاتیں لیکن چھاؤنی کے قریب ایک نہر پار کرتے ہوئے اُن کے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور گر گیا۔ رسالے کے سپاہی نے، جو اُن کا پیچھا کر رہا تھا، بغیر یہ جانے ہوئے کہ وہ عورت ہیں اُن پر تلوار سے وار کیا۔ وہ گریں اور پھر اُٹھ نہ سکیں۔ اُس رات اُن کے جاں نثار ساتھیوں نے اس خیال سے اُن کا جسم جلا دیا کہ انگریز یہ ڈینگ نہ مار سکیں کہ انھوں نے رانی کو گرفتار کر لیا۔

---

[1] ہومس، محولہ بالا، صفحہ 517

چاہے وہ اُن کی لاش ہی کیوں نہ ہو۔‘‘[1] لکشمی بائی کی بہادری کی یہ کہانی کبھی فراموش نہیں کی جاسکے گی۔

مندرجہ بالا کے علاوہ بھی بہت سے لوگ تھے جن کے نام بہادری کے کارناموں، مزاحمت کی تنظیم اور بغاوت کی تحریک کے لیے یادرکھے جائیں گے۔ اس قسم کی ایک شخصیت تھی بخت خاں جو دہلی کی فوجوں کے کمانڈر اِن چیف تھے اور جنھوں نے انتظامی کونسل کی تنظیم کی تھی۔ ایک اور تھے احمد اللہ شاہ جن کے متعلق اُن کے دشمن بھی کہتے تھے کہ ’’بڑی صلاحیتوں کے مالک، بہت بہادر، راسخ ارادہ رکھنے والے انسان اور باغیوں میں سب سے اچھے سپاہی ہیں۔‘‘[2] الٰہ آباد کے مولوی لیاقت علی نے، جو بہت معمولی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، شہر پر دہلی کے بادشاہ کی طرف سے حکومت کی۔

مرکزی کردار تھے شہنشاہ بہادر شاہ اور نانا صاب وہ دونوں ہندوستان کی تاریخ کے دو مشہور حکمراں خاندانوں کے وارث تھے۔ بہادر شاہ کے بزرگ ایسی سلطنت پر حکومت کر چکے تھے جس کی شہرت دوسو سال تک پوری دنیا میں رہی تھی۔ نانا صاحب کا تعلق ان پیشواؤں کے خاندان سے تھا جنھوں نے کاویری سے اٹک تک مرہٹی راج پھیلا دیا تھا۔ بدقسمتی سے یہ نام بہت سی نزاعی بحثوں کا نشانہ بن گئے ہیں۔

بہادر شاہ اور نانا صاب مزاج کے اعتبار سے بہادرانہ کارناموں سے مناسبت نہیں رکھتے تھے اور انھیں جو رول ادا کرنا پڑا اُس کے انتخاب میں اُن کی مرضی کو دخل نہیں تھا۔ یہ رول محض حالات کی دین تھا۔

جس وقت تحریک کی قیادت کرنے پر بہادر شاہ کو مجبور کیا گیا اُس وقت اُن کی عمر اسّی سال سے زیادہ تھی۔ پوری زندگی انھوں نے دہلی کے لال قلعہ کے محل میں گوشہ نشینی میں گزاری تھی جہاں تخت پر بیٹھنے کے بعد وہ مصاحبوں میں گھرے رہتے تھے۔ انگریزوں پر اُن کا انحصار تھا جو ذاتی اخراجات کے لئے انھیں سالانہ پینشن دیا کرتے تھے۔ انھیں سرکاری معاملات کا کوئی تجربہ

---

[1] کے اور ملیسن محولہ بالا، جلد پنجم، صفحہ 154-155

[2] ملیسن، کرنل، جی، بی History of the Indian Mutiny جلد دوم، صفحہ 541

نہیں تھا اس لئے کہ وہ ایسے بادشاہ تھے جس کی کوئی سلطنت نہیں تھی۔لیکن اُن میں اہلیت کی کمی نہیں تھی۔ وہ خود بھی ہندی اور اردو کے اچھے شاعر تھے اور شاعروں اور ادیبوں کی سر پرستی کیا کرتے تھے۔

یہ عجیب بات ہے کہ اس عمر میں اور ایک خصوصی پس منظر کے باوجود انھوں نے وہ موقف اختیار کیا جس کی ذمہ داریوں کو پورا کرنا اُن سے کہیں زیادہ کم عمر رکھنے والے انسان کے لئے بھی دشوار ہوتا۔لیکن انھیں داد دینی پڑتی ہے کہ ایک دفعہ اس پُرخار راستے میں قدم رکھنے کے بعد انھوں نے کبھی پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھا۔ زیادہ تعجب تو اس بات پر ہے کہ انھوں نے مختلف مذہب سے تعلق رکھنے والے دہلی کے لوگوں کو متحد کرنے، محصور شہر دہلی میں امن امان قائم رکھنے، اپنی رعایا کی ہمتیں بڑھانے اور آخر دم تک لڑائی جاری رکھنے کی خاطر اپنی فوجوں کی ہمت افزائی کرنے کی انتھک کوششیں کیں۔ لیکن اُن کو ایک بہت بڑی طاقت سے مقابلہ کرنا پڑا اور اُن کا انجام افسوسناک ہوا۔اُن کی نظروں کے سامنے اُن کے بیٹوں کو گولیاں ماری گئیں اور انھوں نے اپنی زندگی کے آخری سال اپنی ملکہ کے ساتھ اپنے ملک سے دور جلاوطنی کے عالم میں برما میں گزارے۔

نانا صاب آخری پیشوا باجی راؤ دوم کا پسر متبنّی تھے۔ جب باجی راؤ انگریزوں کا باج گزار ہوگیا تو غلامی کی زنجیریں اُسے گراں گزرنے لگیں۔ نانا ایک آزاد امیر کی حیثیت سے زندگی گزارتے تھے جس کے مشاغل تھے سماجی دلچسپیاں، تفریحات اور کھیل تماشے۔ جب بغاوت نے انھیں ایک دوراہے پر لا کھڑا کیا تو انھوں نے بادلِ نخواستہ باغیوں کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ انھیں سیاسی رہنما تسلیم کرلیا گیا تھا لیکن اصل طاقت دوسروں کے ہاتھوں میں تھی۔ شکست کے بعد انھیں نیپال کی سرحد کی طرف جانا پڑا۔ انھوں نے ہتھیار ڈالنے سے انکار کردیا اور بڑی خودداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا ''جب تک میری جان میں جان ہے اُس وقت تک تم سے لڑائی جاری رہے گی چاہے مارا جاؤں، قید ہوں یا پھانسی پاؤں۔ میں جو کچھ بھی کروں گا تلوار کے ذریعے کیا جائے گا۔'' اُس کے بعد وہ نیپال کے جنگلوں میں ہمیشہ کے لئے کھو گئے۔

بغاوت ناکام ہوگئی۔ اُس کے رہنماؤں کو پھانسی دے دی گئیں۔ ناکامی کی قیمت انھیں

آزادی اور جائداد کی ضبطی کی صورت میں ادا کرنی پڑی۔ جانبدار مورخوں نے بدقسمتی سے اُن پر مظالم اور غیر انسانی کارروائیوں کے الزامات لگائے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ اُن میں سے کسی[1] نے نہ اُس قتل عام کا منصوبہ بنایا تھا اور نہ حکم دیا تھا جو اس بغاوت کی تاریخ پر ایک بدنما دھبا بن گیا ہے۔ اُن کا اصل مقصد تھا بدیسی حکومت کا تختہ الٹنا۔ زیادہ شرمناک کارروائیاں یا تو سپاہیوں نے کی تھیں جن پر مذہبی جنون طاری تھا اور جو بہت زیادہ خائف تھے یا اُن بدمعاشوں اور جرائم پیشہ لوگوں نے جنھیں جیلوں سے رہا کر دیا گیا تھا اور جو قتل و غارت کرنا چاہتے تھے۔ اسی کے ساتھ ایسے

---

[1] (الف) کانپور میں ہونے والے مظالم میں نانا صاحب کے مبینہ حصے کے متعلق اس بات کو ایک انگریز خاتون مسز ہورٹسینٹ کا بیان ثابت کرتا ہے۔ اُس کا داماد، جو برطانوی فوج کا ایک اعلیٰ افسر تھا، ستی چوراہا گھاٹ، کانپور کے حادثے کا شکار ہوا تھا۔ اُس کا کہنا ہے کہ نانا صاحب نے 108 دوسرے انگریزوں کے ساتھ اُسے بھی باغیوں کے ہاتھوں قتل ہونے سے بچایا تھا اُس نے لکھا ہے ''میں نے پہلی مرتبہ اُس شخص کو اسوقت دیکھا تھا۔ اگر کوئی شخص اُس کے متعلق کچھ کہتا ہے یہ اُس کی مرضی ہے لیکن میں اس قتل عام کے سلسلے میں اُس کو میں ملزم نہیں گردانتی ہوں۔ مجھے تو ایک صاف دل، سیدھا سادا اور خوش اخلاق بتیس سالہ نوجوان معلوم ہوا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اگر اُس کے حکم کی تعمیل کی جاتی تو نہ کوئی قتل کیا جاتا اور نہ کسی کا مال و اسباب لوٹا جاتا۔''

(i) سرگزشت مسز ہورٹسنٹ، خانم انگلیسی، دربلوہ ہندوستان (فارسی مخطوطہ۔ فارسی سے ترجمہ 1311 ہجری (1853) درتہران، از محمد یوسف، اعتماد السلطنت وزیر اطلاعات، مترجم مخصوصی اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایران، ابن محمد جعفر کجر دوالو۔

(ii) ایام غدر یعنی مسز ہورٹسنٹ خام انگلیسی کی دردناک سرگزشت (مندرجہ بالا کا اردو ترجمہ از مولوی سید جعفر حسین اور مطبوعہ دارالاشعت پنجاب، لاہور، 1933)

(ب) اس طرح جھانسی کی رانی کی بت گناہی 20 اگست 1889 کو ثابت ہوگئی جب ایک انگریز مارٹن نے اپنے پسر متبنی دمودر راؤ کو لکھا ''تمہاری ماں کے ساتھ نہایت غیر منصفانہ اور بے دردی کا سلوک کیا گیا۔ اُن کے ساتھ کتنا ظلم کیا گیا ہے۔ یہ میرے علاوہ کسی کو نہیں معلوم ہے۔ انھوں نے جھانسی کے یورپین باشندوں کے اس قتل عام میں کوئی حصہ نہیں لیا تھا جو جون 1857 میں ہوا تھا۔'' پراسنس، جھانسی سنستھان چاپ مہارانی لکشمی بائی، صفحہ 125 سین، محولہ بالا، صفحات 279-280۔

ہندوستانیوں کی بھی کمی نہ تھی جنھوں نے انسانیت کا ثبوت دیا اور جن کا رویہ قابل ستائش تھا۔[1]

کمپنی کی فوجوں کی افسروں کی کارروائیاں بھی اتنی ہی غیر انسانی تھیں جن کے ذکر سے بھی دکھ ہوتا ہے۔ وہ بڑے پیمانے پر ناقابل یقین خفیف الحرکاتی کے مرتکب ہوئے۔ جرم کی تفتیش کیے بغیر ہزاروں انسانوں کو پھانسیاں دے دی۔ جن کو سزائیں دی گئیں اُن کی کسی انسانی جذبے کا پاس کیے بغیر تذلیل کی گئی، گاؤں کے گاؤں تباہ کر دیے گئے۔ یہ وہ کہانی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اخلاق اور انسانی جذبات سے مُبرّا تھے۔ یہ صورت حال زیادہ سنگین شکل اختیار کر لیتی ہے جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ وہ نظم وضبط سے بیگانے نہیں تھے بلکہ ایسی منظم حکومت کے ترتیب یافتہ افسر تھے جو اپنے مذہب اور تہذیب کی برتری پر اصرار کرتی تھی۔

بغاوت کی ناکامی غیر متوقع نہیں تھی۔ اس کو منفی نظریات نے جنم دیا تھا۔ اس کا محرک کوئی مثبت تخلیقی تصور نہیں تھا۔ اس کے سامنے کسی اعلیٰ سماجی نظام یا اعلیٰ نظام کا تصور نہیں تھا۔ وہ تو ایک ہنگامی نشہ تھا نہ کہ لوگوں کی ایک منظم اور مستقل تبدیلی کی کوشش۔ چونکہ یہ ایک بلا قصد ہنگامی حادثہ تھا اس لیے اس تحریک کے پیچھے کوئی مستحکم تنظیم کام نہیں کر رہی تھی۔ اُس کے پاس نہ کوئی منصوبہ تھا اور نہ روپیہ تھا۔ باغیوں کے اتحاد کی بنیاد تھی بدیسی حکومت کے ختم کرنے کی خواہش۔ لیکن باغی وسطی جذبات وافکار سے اتنے سرشار تھے کہ اُن کے ذہنوں میں اُس نے ایک نجی شکل اختیار کر لی تھی۔ بدیسی حکومت کو ختم کرنے کے معنی سمجھے گئے بدیسیوں کو ختم کرنا اور آزادی کا مفہوم یہ سمجھا گیا کہ اُن کی ذاتی حکومت بحال کی جائے جنھیں بدیسیوں نے حقوق واستحقاق سے محروم کر دیا تھا۔ دشمن کے سیاسی نظام کی نوعیت کو وہ نہ سمجھ سکے اور یہ بات بھی اُن کی سمجھ میں نہیں آئی کہ افراد کا قتل نظام کی شکست وریخت کے مترادف نہیں ہوتا ہے۔ یہ تو کسی قدر سمجھ لیا گیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا تعاون ضروری ہے۔ لیکن وہ یہ بات نہ سمجھ سکے کہ قوم کی بنیاد ایک فطری اتحاد ہوتا ہے اور یہ کہ اُن آزاد اکائیوں کا عارضی تعاون اس کے لئے کافی نہیں ہے۔ یہ بات بھی اُن کی نظر سے

---

[1] جے ڈبیو۔ برلے، علی گڑھ کے مجسٹریٹ نے 17 نومبر 1858 کو لکھا تھا کچھ لوگوں کی جانیں حقیقت میں بڑے عجیب انداز سے بچیں۔ جہاں انسانیت سوز کارروائیاں کی جارہی تھیں وہیں کچھ ہندوستانیوں نے بڑی شرافت کا ثبوت دیا۔"

پوشیدہ رہی کہ کسی جدید طاقت کے خلاف کامیابی حاصل کرنے کے لئے ایک اعلیٰ سیاسی نظام میں مختلف فرقوں کا امتزاج ضروری ہے۔

جس مقصد کے لئے وہ لڑے اس کو غیر منصفانہ نہیں قرار دیا جا سکتا ہے لیکن اتنا کافی نہیں تھا۔ باغیوں میں نظم و ضبط کی کمی تھی اور اُن کی وفاداریوں میں بھی زیادہ جان نہیں تھی۔ ذہنی اعتبار سے بھی وہ دشمنوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ اُن کے مخالفوں کی فوجی تکنیک سائنس پر مبنی تھی اور اُن کا سوچنے اور عمل کرنے کا انداز زیادہ منطقی اور معقول تھا۔ فوجی حکمت عملی اور تدابیر کے تعلق سے انگریزی فوج ہندوستانیوں سے بہت بہتر تھی۔ برطانوی کمانڈر تربیت یافتہ سپاہی تھے جنھیں جنگ کا بہت تجربہ حاصل تھا۔ یہ فوجیں اعلیٰ درجہ کی منظم حکومت ہند کے احکام کی تعمیل کر رہی تھیں۔ جس کی پشت پر برطانوی لوگوں کی اور برطانوی حکومت کے بڑے بڑے وسائل تھے۔ جب تک کمپنی کی حکومت کے مرکزی ڈھانچے کام کر رہے تھے اُس وقت تک آس پاس کے علاقوں کا ہاتھ سے نکل جانا اُس کے لئے مہلک ثابت نہیں ہو سکتا تھا اور جب تک سمندر پار سے کمک آرہی تھی اُس وقت تک ہندوستان میں برطانوی حکومت کا طوفان کچھ نہیں بگاڑ سکتے تھے۔ 1857 کی بغاوت آخری کوشش تھی جس کے ذریعے ایک ناکارہ نظام اپنی گذشتہ شان و شوکت دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ بغاوت کی موت نے نئی طاقتوں کی سرگرمیوں اور نئے سماج کے معرضِ وجود میں آنے کے لئے میدان تیار کر دیا۔

تیسرا باب

ہندوستانی درمیانی طبقہ

I۔ تغیر پذیر ڈھانچہ

ہندوستان میں آنے والے یورپی تاجر ایک نئی تہذیب کے نمائندے تھے۔ ان کی معاشی سرگرمیوں کے مقاصد اور طریق کار، اُن کی تجارتی کاموں کی تنظیم اور اُن کے کام کرنے کے طریقے ہندوستانیوں کے طریقوں سے مختلف بھی تھے اور اُن کے لیے اجنبی بھی۔ وہ لوگ یورپی ممالک سے آئے تھے جہاں کا سماجی اور سیاسی پس منظر مختلف تھا۔ اخلاق و رسوم، مذہب و تہذیب اور ذہنی رویوں اور رجحانوں میں وہ ہندوستانیوں سے بعد المشرقین رکھتے تھے۔ یورپی تاجروں اور مشنریوں کی آمد ہندوستانیوں کے ساتھ اُن کے روابط نے سماجی تبدیلی کے عمل کو جنم دیا جو وقت گزرنے اور مشرق اور مغرب کے درمیان تجارت بڑھنے کے ساتھ ساتھ تیز تر ہوتا گیا۔ جب اٹھارھویں صدی کے وسط میں انگریزوں نے بنگال کو فتح کر لیا تو یہ عمل ایک نئے مرحلے میں داخل ہو گیا۔ ہندوستان کی سیاست و سماجی زندگی، معیشت اور تہذیب پر مغرب کا اثر زیادہ گہرا اور دور رس ہو گیا۔

یوں تو تبدیلی پلاسی کی جنگ سے پہلے شروع ہو چکی تھی لیکن ابتدا میں اس کی رفتار دھیمی تھی۔ 1757 سے 1833 تک اس تبدیلی کی سمت کا واضح تعین ہو گیا اور اُس کی رفتار بڑھ گئی۔ سماج کی نئی شکل اور نئے تصورات کی اہم خصوصیتیں لوگوں کے ذہنوں میں ہیجان پیدا کر رہی تھیں۔ اس دوران ہندوستان کے مختلف علاقے ایک دوسرے کے قریب آنے لگے اور سماجی گروہوں کی درجہ بندی ٹوٹنے لگی۔ ذات پات کے نظام کی سختی میں کمی آئی اور روایتی دیہی معیشت نے خود کفالت اور علیحدگی کی قدیم نمایاں خصوصیتیں کھو دیں۔

اس تبدیلی کا تجربہ سب سے پہلے بنگال کو ہوا۔ اُس کے بعد ہندوستان کے دوسرے حصے جب برطانوی حکومت میں آنے لگے تو وہاں بھی اس قسم کی تبدیلی ہوئی یہاں تک کہ پورا ملک ایک سیاسی نظام کے تحت متحد ہو گیا۔ اس نے قومی شعور کے نشوونما کے لئے ایک ضروری شرط پوری کر دی۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ برطانوی حکومت نے سماجی تبدیلی بھی پیدا کی۔ قدیم طبقوں میں سے، جن میں ہندوستانی سماج بٹا ہوا تھا، نئے نئے گروہ ابھرے جو دولت، تعلیم اور پیشے کے اعتبار سے مختلف ہونے کے باوجود کچھ مشترک خصوصیتیں رکھتے تھے جن کی بنا پر انھوں نے ایک سماجی طبقے کی شکل اختیار کر لی۔ اس طبقے نے نئی توقعات وعزائم کے ساتھ انفرادی، سماجی اور سیاسی طرز عمل کے نئے تصورات کو بھی جنم دیا۔ اس نئے طبقے کو متوسط طبقے کا نام دیا گیا حالانکہ اپنی تشکیل، ساخت اور فلسفے کے اعتبار سے وہ مغرب کے متوسط یا بورژوا طبقے کے ساتھ وسطی ہند کے درمیانی طبقے سے بھی مختلف تھا۔

لیکن ایک طرح سے ہندوستانی متوسط طبقہ مغرب کے متوسط طبقے سے بڑی مماثلت رکھتا ہے۔ یورپ کے متوسط طبقے نے فیوڈل مالکان اراضی کی طاقت توڑی، بادشاہوں کی مطلق العنانیت کا تختہ الٹا اور کلیسا کے اختیارات ختم کیے۔ اُس نے انفرادی آزادی، آزاد مقابلے اور سرمایہ دارانہ کاروبار کے اصولوں کو فروغ دیا۔ ہندوستان کا ابھرتا ہوا متوسط طبقہ معاشی میدان میں تو وہ رول ادا نہیں کر سکا جو یورپ کے متوسط طبقے نے ادا کیا لیکن سیاسی میدان میں اُن دونوں کے رول بڑی حد تک یکساں تھے۔ عام لوگوں میں قومی شعور پیدا کرنے، قومی آزادی کی تحریک چلانے اور بالآخر ملک کو بدیسی حکومت سے آزاد کرنے کا سہرا اس طبقے کے سر ہے۔

II۔ ہندوستانی متوسط طبقے کی ابتدا

ہندوستان میں جدید متوسط طبقے کا ارتقا دو کارروائیوں کی بنا پر عمل میں آیا۔ایک طرف قدیم حکمراں طبقہ ختم کر دیا گیا اور دوسری طرف مالکان اراضی، تاجروں اور دانشوروں کا ایک نیا گروپ وجود میں آ گیا۔قدیم بالائی طبقے کی شکست وریخت برطانوی فتح کا راست نتیجہ تھی۔تاجر طبقے کی تشکیل برطانوی حکومت کے قیام اور برطانوی تعلیم کے رواج کی مرہون منت تھی۔

جدید ہندوستانی متوسط طبقے کا وجود ہندستان میں برطانوی کاروبار کی بنا پر عمل میں آیا۔جیسا کہ ہونا چاہیے تھا۔یہ پہلے نئے نئے آباد کیے جانے والے مدراس، بمبئی اور کلکتہ کے شہروں میں ظاہر ہوا اور اُس کے بعد اُن شہروں میں نظر آیا جو برطانوی کاروباری سرگرمیوں اور نظم ونسق کے ذیلی مرکز بن گئے تھے۔پریسی ڈنسی شہر ہر اعتبار سے نئے تھے۔وہ محض تجارت اور صنعت کے مرکز نہیں تھے۔وہاں انگلستان کی طرح کی میونسپل تنظیمیں تھیں جو شہریوں کے کاموں کو منضبط کرتی تھیں اور اُن کی خاص خاص ضرورتیں پوری کرتی تھیں۔مفاد عامہ اور معاشی سرگرمیوں کے اعتبار سے وہ مغربی تھیں۔ان شہروں کے ہندوستانی باشندوں کے تصور ورجحان، پیشہ اور تعلیم کو ان کاموں نے متاثر کیا۔اُن کے طور طریق میں تہذیبوں، معیشتوں اور رجحانات کی آمیزش ہونے لگی۔[1] عقید اور طور طریق کے معیارات کے اعتبار سے شہری علاقوں کا ہندوستانی متوسط طبقہ دیہات سے عام لوگوں سے مختلف نظر آنے لگے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی دیکھ ریکھ میں جن شہروں نے نشوونما پائی اُن میں کلکتہ کا رول سب سے اہم ہے۔کلکتہ تاجروں، بنکروں اور تکنیکی کارکنوں کا گھر بن گیا، صنعت کا مرکز بن گیا اور داخلی اور بدیسی تجارت کی ایک بڑی منڈی بن گیا۔کلکتہ سے یورپی تصورات، طور طریق، رواج اور ادارے بنگال میں پھیل گئے۔جس وقت سیاسی جھگڑوں، وراثت کی جنگوں اور مرہٹوں کے حملوں نے بنگال میں انتشار پھیلا رکھا تھا اُس وقت آس پاس کے لوگوں کے لیے کلکتہ جائے پناہ بن گیا۔

---

[1] دومعیشتوں کے تصور کو بوکے، جے، ایچ نے تعارف کرا دیا ہے۔ Economics and Economic Policy of Dual Societies نیویارک 1953

روزگار کے متلاشی برطانوی تجارتی مراکز کی طرف مائل ہوئے اور کلکتہ کے کچھ سرکردہ باشندوں نے اپنے ہم وطنوں کو وہاں آنے پر آمادہ کیا۔لکشمی کانت مجمدار اور اس وقت کے مہاراجہ نابا کرشنا دیب نے بہت سے برہمنوں کو وہاں آباد ہونے کی دعوت دی۔ست گاؤں، بالی شہر اور تبور سے تاجر وہاں آئے اور گماشتے دلال، بچولیے، دست کار، تاجر، تکنیکی عملہ اور مزدور کام اور منافع کی تلاش میں جوق در جوق وہاں پہنچنے لگے۔تبور سے جو تاجر آئے اُن میں سے سیٹھ اور بیساکھ سبع پہلے آئے تھے۔انھوں نے سوتانوتی میں ایک کپڑے کی منڈی قائم کرلی۔

اس کے نتیجے میں کلکتہ تیزی سے ترقی کرنے لگا۔جس وقت کمپنی نے اس کے حقوق لگان داری خریدے تھے اُس وقت اس کی آبادی دس ہزار سے کم تھی لیکن 1756 تک وہ بڑھ کر سوا لاکھ ہو چکی تھی۔ابتدا میں پکے مکان نہیں تھے۔1756 میں تقریباً پانچ سو پکے مکان تھے جو مختلف سڑکوں اور گلیوں میں بکھرے ہوئے تھے۔زمین کا لگان 300 روپیہ سالانہ سے بڑھ کے 16,000 روپیہ سالانہ سے زیادہ ہو چکا تھا اور مجموعی آمدنی 900 روپیہ سے بڑھ کر تقریباً 50,000 روپیہ ہوگئی تھی۔[1]

یورپی تجارت اور متوسط طبقے کا فروغ

بنگال میں ہندوستانی متوسط طبقے کا فروغ کلکتہ میں انگریزوں کی تجارتی اور سیاسی سرگرمیوں سے جڑا ہوا تھا۔اس کا کردار اُن کے خصوصی کاموں نے تشکیل کیا تھا جو اُسے سرانجام دینے پڑتے تھے۔اس کی ترقی اور ساخت کا انحصار کمپنی کی سرگرمیوں کے مقاصد اور طریق کار میں ہونے والی تبدیلیوں پر تھا۔اس طبقے کے ارتقائی عمل کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ کمپنی کی تاریخ اور اُن مراحل کا اجمالی بیان کیا جائے جن سے اس کی تجارت گزری۔

کمپنی کی سرگرمیوں کا پہلا مرحلہ محض تجارتی تھا جو 1757 میں پلاسی کی جنگ کے ساتھ ختم ہو گیا۔بنگال کی فتح کے بعد یہ تجارتی ادارہ تیزی کے ساتھ ایک انتظامی ادارے میں تبدیل ہونے لگا۔یہ عبوری دور تقریباً تیس سال پر محیط تھا یعنی جنگ پلاسی سے 1785 وارن ہسٹنگز کی واپسی

---

[1] اے۔اے۔کے A Short History of Calcutta in MC Causes of India جلد ہفتم، صفحہ 64, (1902)

تک۔تیسرے مرحلے میں ہندوستان میں برطانوی حکومت کی ایک مستقل عمارت تعمیر کی گئی اور یہ ختم ہوا 1833 میں کمپنی کی تجارتی سرگرمیوں کے اختتام کے ساتھ۔آخری مرحلہ 1857 کی بغاوت کے نتیجے میں1858 میں ختم ہوگیا۔

ابتدائی دور میں جب کمپنی اپنی تجارت کو بڑھانے میں مصروف تھی اس وقت وہ ہندوستانیوں کی امداداور تعاون حاصل کرنے پر مجبور تھی اور تجارت کے پھیلاؤ کے نتیجے میں زیادہ سے زیادہ ہندوستانی اُس کے حلقہ اثر میں آگئے تھے۔ وہ مختلف حیثیتوں سے کام کرتے تھے یعنی ٹھیکیدار دادنی تاجر،ایجنٹ یا بانیاں،صراف،امدادی عملہ، ملازم وغیرہ۔ ان تجارتی رشتوں کے مرحلے میں انگریز تاجروں کے ساتھ اُن کے تعلقات ضروری تھے اس لئے کہ کمپنی نے ہندوستانی مال حاصل کرنے کے لئے اُن لوگوں کواستعمال کرنے کا طریقہ اختیار کیا تھا جواُس کے ملازم نہیں تھے۔

ہندوستانیوں کے لئے یہ طریقہ اجنبی نہیں تھا۔لیکن ہندوستان میں پائے جانے والے حالات سے مطابقت پیدا کرنے کی غرض سے کمپنی کواس میں ترمیم کرنی پڑی تھی۔کمپنی بچولیوں کے ذریعے کام کرتی تھی۔یعنی دادنی تاجروں کے ذریعہ پیداکاروں سے روابط قائم کرتی تھی۔ چونکہ انگریز تاجر بدیسی تھے، ہندوستانی مصنوعات کے حالات سے واقف نہیں تھے اور یہاں کے لوگوں کی زبان نہیں جانتے تھے اس لئے ہندوستانی بچولیوں کا استعمال ناگزیر تھا۔دادنی تاجرکو اُس مال کی 10 سے 70 فیصدی تک قیمت پیشگی مل جاتی تھی جو کمپنی یا انفرادی خریدارکومہیا کرنا ہوتا تھا۔(انفرادی خریدار وہ کمپنی کا ملازم ہوتا تھا جس کواس امر کی اجازت دی جاتی تھی کہ اپنی قلیل آمدنی میں ذاتی تجارت کے منافع یا آزادتاجرانہ مہم سے اضافہ کرے)خوددادنی تاجر بنکروں اور دوسرے پیداکاروں سے اُن کی پیداوار حاصل کرنے کا معاہدہ کرنے کے بعد پیشگی رقم دے دیتا تھا۔ مال اور رنگوں میں لایا جاتا تھا اور کوٹھوں میں بھر دیا جاتا تھا جہاں اُس کی نوعیت اور مقدار کی جانچ کی جاتی تھی۔اور اُس کے بعد یا تو وہ لے لیا جاتا تھا یا رد کر دیا جاتا تھا۔ جو مال پسند کر لیا جاتا تھا اُسے برآمد کرنے کے لئے کلکتہ کے گوداموں کو منتقل کر دیا جاتا تھا۔

دادنی تاجر دلالوں سے کام لیتا تھا جو بشرطِ ضرورت ذیلی دلالوں سے کام لیتے تھے۔اُن کا کام تھا بنکروں اور پیداکاروں کے گاؤں میں جانا، اپنی نگرانی میں مال جمع کروانا، اُس کی جانچ

پڑتال کرنا اور قیمتیں طے کرنا۔ اس طرح ہندوستانی تاجروں اور اُن کے گماشتوں کو منافع کمانے کے بڑے مواقع ملتے تھے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ مال کی قیمت پر انھیں 2 سے 4 فیصدی تک جائز کمیشن ملتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ اپنی حیثیت سے فائدہ اُٹھا کر دوسرے فریق سے بھی منافع کماتے تھے۔ اوّل تو دستکار اپنے افلاس اور مول بھاؤ کرنے کی سکت نہ رکھنے کی بنا پر اُن کے رحم و کرم پر ہوتا تھا۔ دوسرے یہ کہ یورپی تاجر اپنی عدم واقفیت اور باہمی رقابت کی بنا پر پر اُن کے ہاتھوں میں کھیلتا تھا۔ بیدردانہ طریق کار، داؤ پیچ اور منافع کی لالچ کا جہاں تک تعلق دادنی تاجر مغرب کے قدیم تاجر قسمت آزماؤں کے مشابہہ تھا۔ ملک کے اُبھرتے ہوئے متوسط طبقے کی ابتدا اُن سے ہوئی۔ کمپنی کے سیاسی طاقت حاصل کرنے سے پہلے بھی اُن کے ہاتھوں میں بہت کاروبار آچکا تھا۔ مثال کے طور پر 52-1751 میں 1,58,756 روپے کی مالیت کے ٹھیکے دیے گئے اور 3,52,054 روپے کا مال رقم ادا کر کے خریدا گیا۔ یہ دونوں معاملے بڑی حد تک دادنی تاجروں کے ذریعے کیے گئے تھے۔

ہندوستان کے بچولیوں کے پاس منافع کمانے کا ایک اور ذریعہ تھا بدیسی تجارت جو تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ ہندوستان میں ہونے والی درآمدات کا اوسط 1667 اور 1672 کی درمیانی مدت میں تھا 53,000 ,2 پاؤنڈ سالانہ جو 1664 اور 1681 کی درمیانی مدت میں بڑھ کے 4, 47,710 پاؤنڈ فی سال ہو گیا تھا۔ 1708 کے بعد ان درآمدات کی قیمت میں بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ اگر ہم 1907 اور 1917 کی درمیانی دس سالہ مدت میں پائی جانے والی قیمتوں کو بنیاد بنائیں اور اُنھیں 100 قرار دیں تو دوسری دس سالہ مدت میں درآمدات کی قیمت کا اشاریہ 150 ہو گیا تھا۔ تیسری میں 153 چوتھی میں 158 اور پانچویں میں 219۔

اسی مدت یعنی 1707 س لغایت 1757 میں ہندوستان سے ہونے والی برآمدات کی مالیت دگنی ہو چکی تھی یعنی 1708 میں برآمدات کا اشاریہ اگر 100 تھا تو 1757 میں بڑھ کر 193 ہو گیا تھا۔

اس کے معنی تھے کمپنی اور دوسرے یورپی تاجروں میں ہندوستانی تاجروں کی خدمات کی مانگ بڑھ گئی۔ اُس وقت جو تاجر خاندان موجود تھے وہ اس بڑھی ہوئی مانگ کو پورا کرنے سے قاصر تھے۔ بہت سے نئے خاندان، جن کے پاس نہ کوئی تجارتی تجربہ اور نہ روایت، اس میدان

میں کود پڑے تاکہ یورپی تجارت نے جو مواقع مہیا کیے تھے اُن سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ تاجر نئے نئے متوسط طبقے کے پہلے اور غالب عناصر بن گئے۔

ایک اور گروہ جو اس طبقے کا جز بن گیا وہ تھا صرافوں کا گروہ۔ وہ مقامی تجارتی برادری کا لازمی جز تھا۔ ان بدیسی اور ہندوستانی تاجروں کو جو کاروبار کرتے تھے مختلف کرنسیا استعمال کرنی پڑتی تھیں۔ بدیسیوں کو عام طور سے زیادہ تر ہندوستانی مال جنس، زر یا بلین کے عوض خریدنا ہوتا تھا جو وہ اپنے وطن سے درآمد کرتے تھے۔ اس طرح بہت سی چاندی، کچھ سونا اور مختلف قسم کی کرنسیاں ہندوستانی منڈیوں میں آتی تھیں اور یہ ضروری تھا کہ کوئی ادارہ ہو جو اُن کی قیمت کا فیصلہ کر سکے اور معیاری کرنسی میں انھیں تبدیل کر سکے۔ اس کے علاوہ ہندوستان میں زر کی صورت حال تاجروں کے لیے بڑی پریشان کن تھی اس لئے کہ تقریباً 900 قسم کے سکّے ملک میں چل رہے تھے۔ ان سکوں کو پرکھنا، وزن کرنا اور کھرے کھوٹے کا فیصلہ کرنا ایک تکنیکی عمل تھا اور یہ کام تھا صراف کا۔ تجارت میں کتنی پریشانی ہوتی تھی اس کا اندازہ اُن سکوں کی فہرست سے لگایا جا سکتا ہے جو اُس وقت رائج تھے۔ مثال کے طور پر ہندوستانی سکوں میں تو بنگال سکہ، روپیہ مدراس کا، آرکاٹ روپیہ اور بمبئی کا روپیہ جن میں سے ہر ایک کا وزن اور اس میں چاندی کی مقدار مختلف تھی، بنگال کی سونے کی مہر تھی، مدراس اسٹار اور تین سوامی پکواڈا تھے۔ اور مختلف شہنشاہوں کے زمانوں کے سونے اور چاندی کے سکے تھے اور سنوت روپئے تھے۔ اس کے علاوہ یوری کرنسیاں تھیں یعنی ڈچ رکس ڈالر، اسپینی ڈالر، جرمن کراؤن، ڈچ فلورین، فرانسیسی مورے، پرتگالی ملرے وغیرہ وغیرہ۔ ظاہر ہے کہ زر کے مبادلے کے کاروبار کی گنجائش بھی بہت تھی اور وہ منافع بخش بھی تھا۔ لیکن صرافوں نے بنک کاری اور روپیہ قرض دینے کے کاروبار کا اضافہ کر کے اسے وسیع تر بنا دیا تھا۔ تجارت میں ہونے والے اضافے سے تاجروں کی طرح صرافوں نے بھی فائدہ اُٹھایا۔ اُن کی خدمت کی مانگ اُس وقت تک بڑھتی رہی جب تک یورپی ایجنسی کے مراکز قائم نہیں ہو گئے اور اس گروہ کے بہت سے رکن بڑی دولت کے مالک نہ بن بیٹھے۔

اس طبقے کا ایک اور حصہ اُن کاروباری لوگوں کا گروہ تھا جنھوں نے کچھ اشیا کی حد تک کمپنی سے داخلی تجارت کا اجارہ لے لیا تھا۔ اُن میں مندرجہ ذیل شامل تھے۔ کھالوں، سندور اور آتش

بازی کا کاروبار کرنے والے اور تمبا کو، بھانگ، پرانا لوہا، رال، پرانی رسیوں کا سن وغیرہ بیچنے والے۔ اُن میں سے کچھ کے پاس عرق کشید کرنے کا لائسنس تھا اور دوسرے جہازوں کی درزیں بند کرنے یا ملاحوں کے صندوقوں کی مرمت کرنے کا کام کرتے تھے۔

اُن کے بعد تکنیکی کام کرنے والے آتے تھے۔ ہندوستانیوں کا ایک گروہ پیداوار کے ترقی یافتہ طریقے استعمال کرتا تھا جنھیں کمپنی نے رواج دیا تھا۔ 1678 میں کمپنی کچھ رنگ ریزوں کو لائی تاکہ خام ریشم کے رنگ کو بہتر بنایا جاسکے۔ اُن کے ساتھ کچھ ریشم کا دھاگہ بٹنے والے اور بنکر بھی آئے۔ اُس کے بعد کپاس، نیل اور شکر کی صنعتوں کو ترقی دی گئی اور زراعت اور مصنوعات کے کام کو فروغ دیا گیا۔ جہازوں کی مرمت، ہگلی دریا کے سروے اور نقشہ سازی اور دوسری کارروائیوں نے نئی تکنیک کا علم حاصل کرنے اور اُس پر عمل کرنے کے مواقع فراہم کردیے۔ کچھ ہندوستانیوں نے انجینئروں، اورسیروں، رنگرانوں، منیجروں، انسپکٹروں، ڈپٹیوں اور ماتحتوں کے تکنیکی عہدے حاصل کرلیے۔

خاصی تعداد میں ہندوستانی مترجم کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ بہت سے ہندوستانی دلالوں اور بانیانوں کے فرائض ادا کرنے لگے جو انفرادی یورپی اور ایک عام خاندان کے درمیان بچولیے کا کام کرتے تھے۔

ایک گروہ اُن کا بھی تھا جو انتظامی فرائض ادا کرتے تھے یعنی لگان وصول کرنا اور محاصل اور مالگزاری کی وصولی کرنا اس لئے کہ 1757 میں کلکتہ کی مجموعی آمدنی ایک لاکھ روپے سے زیادہ تھی۔ کمپنی کے کاموں سے قریبی تعلق رکھنے والوں میں وکیل شامل تھے جو ہندوستانی حکومتوں کے حکام سے مذاکرات کرنے میں کمپنی کی نمائندگی کرتے تھے۔ ان کے علاوہ دیوان، زمینداری کچہری (مشترکہ عدالت) کے مشیر، ’’سیاہ فام زمیندار‘‘ یا انگریز کلکٹروں کے ہندوستانی ماتحت بھی تھے۔

چنانچہ اٹھارھویں صدی کے نصف اول میں جو متوسط طبقہ ابھر رہا تھا وہ بہت سے ایسے گروہوں پر مشتمل تھا جو اُن یورپی کمپنیوں کے انتظامی اور تجارتی معاملات کے تعلق سے بہت سے مختلف فرائض ادا کرتے تھے جن میں سے برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے سب سے زیادہ اہمیت

حاصل کرلی تھی۔

ظاہر ہے کہ اُن سماجی گروہوں کے افراد کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے جن پر ابھرتا ہوا متوسط طبقہ مشتمل تھا۔لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ طبقے میں زیادہ تعداد تاجروں کاروباری لوگوں اور یورپی تاجروں کے تجارتی گماشتوں کی تھی۔اس طبقے کے فروغ کا اندازہ لگانے کے لئے موٹے طور سے تجارتی اعداد وشمار کو بنیاد بنایا جاسکتا ہے۔اُن سے اُن لوگوں کی حقیقی تعداد تونہیں معلوم ہوتی ہے جو کمپنی کے لیے کام کررہے تھے لیکن ہونے والی تبدیلیوں کے رجحانات واضح ہوجاتے ہیں۔ اُن سے یہ نتیجہ اخذ کرنے میں ہم حق بجانب ہوں گے کہ مال کی برآمد درآمد اور متعلقہ کاروباری اور انتظامی سرگرمیوں میں اضافے کے بعد ان کاموں میں لگے ہوئے ہندوستانیوں کی تعداد بھی بڑھ گئی ہوگی۔

انگلستان میں فروخت ہونے والے ہندوستانی اور مشرقی مال کی مقدار ظاہر کرتی ہے کہ 1708 اور 1757 کی درمیانی مدت میں اُن کی برآمد دُگنی ہوگئی تھی۔اصل اشیا میں کپڑا سب سے اہم تھا۔دوسری اشیا تھیں چائے،کافی،بنگال کا خام ریشم،شورہ نیل،شکر،پٹ سن وغیرہ۔

انگلستان اس کے عوض ہندوستان کو زرنقد اور تجارتی مال برآمد کیا کرتا تھا جس کا تناسب معمولاً تین اور ایک ہوا کرتا تھا۔مثال کے طور پر 1708 اور 1717 کی درمیانی دس سالہ مدت میں 9,66,253 پاؤنڈ کے بقدر تجارتی مال اور 3,60,122 پاؤنڈ کے بقدر زرنقد ہندوستان کو برآمد کیا گیا تھا۔ 1747 اور 1757 کی درمیانی دس سالہ مدت میں یہ بڑھ کر بالترتیب 25,31,245 پاؤنڈ اور 56,44,245 پاؤنڈ ہوگیا تھا۔اٹھارھویں صدی کے نصف اول میں (1708 لغایت 1757) مجموعی اعتبار سے تجارتی مال میں 60 فیصدی کا اور زرنقد میں 68 فیصدی کا اضافہ ہوا۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کے ساتھ بھی انگریز تاجر،مہم کار اور بلا اجازت تجارت کرنے والے اور دوسری یورپی قومیں یعنی پرتگالی،ڈچ،فرانسیسی اور ڈین بھی تجارت کرتے تھے۔ان کے علاوہ ایشیائی لوگ مثلاً افغان، وسطی ایشیا کے لوگ ، ایران،عرب اور آرمینیا کے باشندے بھی تجارت میں مصروف تھے۔

بدیسی تجارت، داخلی تجارت اور صنعت کو فروغ دیتی تھی۔ اس کے نتیجے میں ساحلی تجارت بہت بڑھ گئی اور بنگال کی برّی تجارت میں بہت اضافہ ہوگیا جو سڑکوں اور دریاؤں کے ذریعے کی جاتی تھی۔ چنانچہ تجارت کے بہت سے دھارے مل گئے جس کی وجہ سے کاروباری طبقے نے طاقت حاصل کر لی۔

تجارت کے فروغ نے نہ صرف ہندوستانی متوسط طبقے کو وسعت دی بلکہ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ مغربی اداروں اور طریقوں کے ساتھ اس طبقے کے روابط نے ایک نئے ذہنی رجحان کو جنم دیا۔ تجارت میں مشترک سرمائے کی تنظیمیں ایک نیا تجربہ تھیں جن میں حصہ داروں کو محض ایک سیکولر رشتہ متحد کرتا ہے اور اُن کے اتحاد کی بنیاد کسی فرقہ، ذات یا خاندان کا رشتہ نہیں ہوتا ہے۔ حساب اور تجارت کے مغربی طریقوں اور پیداوار کی ترقی یافتہ تکنیکیوں نے بھی انھیں متاثر کیا۔

تجارت اور صنعت کی طرح انتظامی معاملات میں بھی کلکتہ برطانوی مہم کا اصل مرکز بن گیا تھا۔ وہاں مغرب کی طرح کی ایک ادارتی تنظیم موجود تھی۔ برطانوی نوآبادی کا انتظام ایک صدر اور کونسل کے سپرد تھا جس میں کمپنیاں اور ذیلی کمیٹیاں تھیں۔ 1726 میں کلکتہ کی کارپوریشن کا قیام عمل میں آیا جس میں ایک میر اور نو ایلڈر مین تھے۔ کئی انتظامی اور عدالتی اُمور کے لئے میر کی عدالت قائم کی گئی۔ کچھ کاموں کے لئے بورڈ مقرر کیے گئے۔ زمینداری کچہری میں ہندوستانیوں کے مقدمات کی سماعت ہوتی تھی۔ اور زمیندار (انگریز کلکٹر) انتظامی، مالیاتی اور عدالتیں فرائض ہندوستانی ماتحتوں کی مدد سے سر انجام دیا کرتا تھا۔ جو ہندوستانی تجارتی یا انتظامی کاموں میں انگریزوں کے قریب آ گئے اُن کے ذہنوں کو ان تبدیلیوں نے متاثر کیا۔ یہ قدرتی امر تھا کہ یہ نیا طبقہ سب سے پہلے کلکتہ میں ابھرے۔ لیکن جب تجارتی اور انتظامی سرگرمیاں کلکتہ کے باہر پھیلنے لگیں تو مشترکہ پیشے اور مشترکہ رجحان رکھنے والے لوگ منظر عام پر نمودار ہونے لگے اور انھوں نے ملک میں ایک نمایاں سماجی اور معاشی طبقے کی داغ بیل ڈالی۔

کلکتہ کا پھیلاؤ

کلکتہ کا پھیلاؤ اُن کی حیثیت کی نشاندہی کرتا ہے۔ جس وقت سراج الدولہ نے اُس شہر پر قبضہ کیا تھا (1757) اُس وقت کلکتہ ایک خاصا بڑا شہر تھا جس کی آبادی تقریباً ایک لاکھ پچیس ہزار

نفوس پر مشتمل تھی۔ چھپروں کا قدیم گاؤں، سڑکوں، گلیوں اور کوچوں کی بھول بھلیاں میں تبدیل ہو چکا تھا جہاں خوبصورت پکے مکان اور نفیس باغات تھے۔ اُن میں بہت سے مکان اور باغ نئے طبقے کے مالدار اراکین کی جائیداد تھے۔

III۔ذات کے اعتبار سے نئے طبقے کی بناوٹ اور سماجی رویہ

سماجی نقطۂ نظر سے سب سے بڑی تبدیلی جو نئے طبقے کو پرانے طبقے سے ممیز کرتی تھی، وہ یہ تھی کہ ذات پات کے سماجی کاموں سے معاشی کاموں کو علیحدہ کیا جانے لگا۔ نیا متوسط طبقہ محض ویشہ ذات یا قدیم کاروباری برادری تک محدود نہیں تھا۔ ہر ذات کے لوگ تجارت اور ملازمت کرنے لگے تھے، تاجروں، بنک کاروں، دلالوں اور حاکموں میں برہمنوں کے ساتھ جو اعلیٰ ترین ذات سے تعلق رکھتے تھے، کائستھ اور ویدیا بھی تھے۔ نچلی ذاتوں میں سے سوبرنا جانک، سدگوپ اور دوسرے لوگ تھے۔ یہاں تک کہ اُن میں سے ایک دھوبی تھا۔[1] ایک نئی سماجی حرکت پذیری نے ذات پات سے مملو ہندوستانی سماج کو ہلا دیا۔ کم سے کم شہری علاقوں میں یہ ضرور ہوا۔ حالانکہ کھانے پینے اور بیاہ شادی کو ایک مخصوص حلقے تک محدود رکھنے میں راسخ عقیدہ رکھنے والوں نے ان بندشوں کو توڑنے کی مدت تک مخالفت کی۔

رہن سہن کی سہولتوں میں خاص تبدیلیاں ہونے لگیں۔ شہروں میں یوروپیوں کے قریب رہنے والے ہندوستانی مغربی انداز کے گھر اور باغات پسند کرنے لگے۔ ان کے گھروں کی بناوٹ، داخلی ساز وسامان اور اشیائے ضرورت سے مغربی اثر ظاہر ہونے لگا۔ اُس زمانے میں کانٹے، چھری، پستول عینکوں، میزوں، کرسیوں، چائے دانیوں اور پلیٹوں وغیرہ کا بڑھتا ہوا استعمال ظاہر کرتا ہے کہ وہ نئے طریقے سیکھ رہے تھے۔

---

[1] لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس تبدیلی کو وہ لوگ پسند نہیں کرتے تھے جو پرانے خیال کے تھے۔ مرشد آباد کے سیٹھ جو جینی تھے، دوسری ذاتوں کے لوگوں کو ساجھیدار نہیں بناتے تھے۔

ہندوستانی نودولیتے اُن بدیسیوں کی نقل کرتے تھے جن کے وہ مددگار خادم تھے۔ چنانچہ تاجروں کے قدیم طبقے کے ہندوستانی اطوار واخلاق ختم ہو گئے اور عہد وسطیٰ کے منکسر المزاج اور خائف تاجر کے برعکس، جو ہمیشہ بادشاہ اور اُس کے حاکموں سے ڈرتا رہتا تھا اور اپنی حیثیت کو ظاہر نہ کرنے پر مجبور تھا، اُس کا جانشین اپنی دولت کا مظاہرہ کرنے لگا۔ وہ پالکی میں سفر کرتا تھا، مٹن اور بگھی رکھتا تھا اور ملازموں میں گھرا رہتا تھا۔ وہ دعوتیں کرنے کا شوقین تھا۔ خصوصاً یورپی مہمانوں کو وہ اپنے گھر بلاتا تھا اور اُس کے سامنے اپنی اہمیت کا مظاہرہ کرتا تھا۔ تجارت کے معاملے میں وہ زیادہ دیانت داری سے کام نہیں لیتا تھا۔ اُس کی نظر میں منزل یعنی دولت کی فراہمی راستہ کا جواز تھی۔ اُس نے پیشے کی روایتی پابندیاں توڑ دی تھیں اور ہر اُس تجارتی سرگرمی میں حصہ لینے کی صلاحیت پیدا کر لی تھی جس میں تیزی کے ساتھ بڑا منافع کمایا جا سکے۔

نئے ماحول میں پرورش پانے والے یہ لوگ اپنی نئی حیثیت کے تحفظ میں بڑے چوکس رہتے تھے۔ وہ اُن حالات کے حامی تھے جنھوں نے انھیں دولت جمع کرنے، دولت سے مستفید ہونے اور اپنی اہمیت کو محسوس کرنے کا موقع دیا تھا۔ رفتہ رفتہ اُس پرانے نظام سے اُن کا لگاؤ ختم ہوتا گیا جس کے تحت انھوں نے زندگیاں بسر کی تھیں اور جو نئے نظام کے برعکس انھیں قدیم و فرسودہ معلوم ہونے لگا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب کمپنی کا جھگڑا مغل حکومت سے شروع ہوا تو انھوں نے بدیسی کی حمایت کی جس کی پرامن اور منظم حکومت کو وہ مغل مطلق العنان بادشاہوں کی ذاتی حکومت پر ترجیح دیتے تھے۔ حب الوطنی کے جذبات ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے اور فوری ذاتی نفع کا خیال اُن کے احساسات پر چھایا ہوا تھا۔

اُس ابتدائی زمانے میں بنگال پر پڑنے والے برطانوی اثرات نے اُس رجحان کو ظاہر کر دیا تھا جو برطانوی حکومت کی پوری تاریخ کا ایک نمایاں عنصر رہا ہے یعنی کچھ لوگوں کی ہمت افزائی کرنا اور انھیں آگے بڑھانا اور زیادہ تر لوگوں کو نظر انداز کرنا۔ اس نے متوسط طبقے اور دانشوروں میں انقلابی، سماجی اور ذہنی رجحانات کو جنم دیا لیکن فی الجملہ ملک کی معاشی اور سیاسی ترقی پر توجہ نہیں دی جو عام لوگوں کا معیار بلند کرنے اور عہد وسطی سے جدید عہد کی طرف بلا رکاوٹ اور مکمل عبور کا واحد ذریعہ ہو سکتی تھی۔

IV۔ مدراس اور بمبئ میں ہونے والی تبدیلیاں

جو تبدیلیاں بنگال میں ہو رہی تھیں ویسی تبدیلیاں مدراس اور بمبئ میں بھی ہو رہی تھیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہاں تبدیلیاں کسی قدر چھوٹے پیمانے پر ہوئیں۔

حالانکہ مدراس کی نوآبادی کلکتہ سے پچاس سال پہلے وجود میں آئی تھی اور کھلے ہوئے سمندر کے ساحل اور مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال کو جانے والے راستوں پر واقع ہونے کی بنا پر اُس کو کئی فوائد بھی حاصل تھے پھر بھی وہ مغربی اثرات کے ایک مرکز کی حیثیت سے کلکتہ کا مقابلہ نہ کر سکی۔

اُس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اُس علاقے کے سیاسی حالات زیادہ سازگار نہیں تھے۔ صدی کے ختم ہونے سے پہلے انگریز وہاں اپنی حکومت قائم نہ کر سکے۔ بنگال کے برعکس مدراس کے آس پاس کا علاقہ قریب قریب اٹھارھویں صدی کے اختتام تک ہندوستانی حکمرانوں کے زیرنگیں رہا۔ اُس وقت تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے طریقوں اور مقاصد میں بڑی تبدیلی آ چکی تھی۔ چنانچہ مدراس کو غیر مضبوط سامراج کی اُس طوائف الملوکی اور انتشار کا سامان نہیں کرنا پڑا جو دیوانی کے بعد برسوں میں بنگال میں دیکھنے میں آیا۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہاں کا سماجی ماحول، جس میں انھیں کام کرنا پڑا۔ بنگال میں پائے جانے والے ماحول سے زیادہ مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ مدراس بھی اُس طرح کا نیا شہر تھا جیسے کلکتہ پھر بھی کلکتہ میں غیر کاروباری ذاتوں کو تجارت میں داخل ہونے کے مواقع ملے لیکن جو لوگ مدراس آئے وہ روایتوں میں زیادہ بندھے ہوئے تھے اور سماجی تبدیلی کے لئے تیار نہیں تھے۔ دائیں بازو اور بائیں بازو کی ذاتوں میں ہونے والے جھگڑے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے کاروبار میں برہمنوں کو شامل کرنے کے خلاف ناراضگی کا اظہار ظاہر کرتا ہے کہ شمال کے مقابلہ میں وہاں سماجی بندشیں زیادہ تھیں۔

لیکن مختلف ماحول اور مختلف سیاسی حالات کے باجود مدراس میں ہونے والی تبدیلیوں کی نوعیت اور سمت بنگال ہی کی طرح کی تھی۔ یورپی تاجروں یعنی پرتگالیوں، ڈچوں، ڈینیوں،

فرانسیسیوں اور انگریزوں کی قائم کی ہوئی فیکٹریوں کی باہمی رقابت اور یورپی تجارت کے فروغ کے ویسے ہی سماجی نتائج سامنے آئے جیسے بنگال میں دیکھے گئے۔

مدراس میں قلعہ سینٹ جارج کی تعمیر کے بعد انگریز اپنی تجارت کو فروغ دینے میں مصروف رہے۔ انھوں نے تجارت کے وہی طریقے استعمال کیے جو بنگال میں کیے گئے تھے۔ تجارت اور حاصل کئے ہوئے علاقے کے انتظام کے معاملات میں اُن کی ضروریات یکساں تھیں۔ تجارت کرنے اور شہروں اور گاؤں کا انتظام سنبھالنے کے لیے انھیں ہندوستانیوں سے مدد لینی پڑی۔ اس نے ہندوستانیوں کے ایک ماتحت طبقے کو جنم دیا جو دولت اور حیثیت رکھتا تھا اور بنگال کے متوسط طبقے کے مشابہ تھا۔

ہندوستان سے برآمد کیے جانے والے مال کی خرید اور انگلستان سے درآمد کی جانے والی اشیا کی فروخت کے لئے کمپنی نے دادنی تاجروں کی خدمت حاصل کیں۔ مدراس میں انھوں نے چیف مرچنٹ کا دفتر قائم کیا جو دوسرے تاجروں اور گماشتوں کے ساتھ مل کر مال مہیا کرتا تھا اور انگلستان سے آئے ہوئے زرنقد و رتجارتی مال کو فروخت کرتا تھا۔ انھیں کمپنی پیشگی رقم دیتی تھی وہ یہ رقم بنکروں، رنگریزوں اور چھپائی کرنے والوں کو دیتے تھے جو مال مہیا کرنے کی ذمہ داری لیتے تھے۔ بہت سے دوسرے تاجر بھی اس کام میں شریک تھے اس لیے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت کے علاوہ بہت سے کمپنی کے ملازمین بغیر اجازت تجارت کرنے والے اور دوسرے قسمت آزمائی کرنے والے بھی جو مدراس آگئے تھے خاصے بڑے پیمانے پر نجی تجارت کرتے تھے۔ عام ہندوستانی تاجر جو ایسٹ انڈیا کمپنی اور اُس کے ملازمین کے ایجنٹ کے طور پر کام کرتا تھا وہ دوباش کہلاتا تھا یعنی دو زبانیں جاننے والا، تاجروں میں کچھ کو ٹھیکیدار مقرر کیا جاتا تھا جنھیں پان اور تمباکو کی اجارہ داری کا ٹھیکہ دیا جاتا تھا یا وہ کمپنی کی زمینات کا لگان وصول کرتے تھے یا مثال کے طور پر عرق بنانے کا لائسنس حاصل کر لیتے تھے۔[1]

---

[1] 1724 میں جب کمپنی نے چنتادری پٹہ حاصل کیا اور وہاں بنکروں کو آباد کیا تو چلمبی مدالیار اور ونولا نرائن چنی نے بستی کو بسانے کے لیے رقم دی۔ یورپی لوگوں کے ساتھ تجارت اور صنعت میں شرکت کرنے کے نتیجے میں دولت حاصل کرنے والے خاندانوں کی تعداد پورے ملک میں بہت تھی۔

مدراس کی ابتدائی تاریخ میں دو باشوں نے اہم رول ادا کیا۔ شروع میں وہ یورپی لوگوں اور ہندوستانیوں کے درمیان مترجم کا کام کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ تجارت میں حصہ لینے لگے اور دلال بن گئے۔ کاروباری بچولیوں کی حیثیت سے انھوں نے اثر اور وقار حاصل کرلیا۔

بہت سے ہندوستانی کمپنی کے عہدیدار تھے۔ شہر میں تین بڑے حاکم تھے۔ (1) سربراہ یا ادھیکاری جس کا کام تھا امن وامان بحال رکھنا، مالگزاری وصول کرنا اور چولٹری میں مقدمات کی سماعت کرنا (2) محاسب یا کنا کاپلے جو ادھیکاری کا مددگار تھا (3) کوتوال یا پدا ناٹک جو سڑکوں اور میلوں کی نگرانی کرتا تھا اور اُن پر نظر رکھتا تھا اور چوروں کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کرتا تھا۔

کچھ ہندوستانیوں کو دیسی حکمرانوں اور سرداروں کے درباروں میں ایلچی یا وکیل کے طور پر مقرر کیا جاتا تھا۔ کچھ دوسروں کو انتظامی کاموں یا انگریزوں کے قائم کئے ہوئے اداروں میں ملازمت مل گئی تھی۔ 1689 میں جب عدالت قائم کی گئی تو گورنر کو جج ایڈوکیٹ کا عہدہ دیا گیا جس کی مدد چار جج کرتے تھے جن میں سے ایک ہندوستانی تھا۔ اسی طرح مدراس کی کارپوریشن میں تین ہندو ایلڈر مین تھی۔ ایک اور اہم خدمات اُس وقت ہندوستانیوں کو ملی جب ہندوستانی سپاہی بھرتی کیے گئے اور اُن کے کمانڈنگ افسر ہندوستانی مقرر کیے گئے۔

چنانچہ مدراس پریسیڈنسی میں کاروباری طبقے سے تعلق رکھنے والے اور دوسرے ہندوستانیوں کو دولت کے ساتھ اثر ورسوخ حاصل کرنے کے مواقع ملے۔ حالانکہ وہاں کے حالات بنگال سے مختلف تھے پھر بھی جنوب مشرقی علاقے میں برطانوی تجارت کے فروغ نے متوسط طبقے کے نشوونما میں مدد دی۔ بنگال اور مدراس کی تجارت کے اعداد کا مقابلہ ظاہر کرتا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی راج قائم ہونے سے پہلے نگال سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ [1]

[1] بال کرشن، محولہ، صفحہ 817 سن 1757 کے بعد حالات بدل گئے۔ مدراس کے مقابلے میں برطانوی تجارت زیادہ تیزی کے ساتھ بڑھی جس کی وجہ سے جنوب کے مقابلے میں بنگال میں زیادہ طاقتور متوسط وجود میں آ گیا۔

	بنگال	مدراس
1708 لغایت 1717	9, 33,139 پاؤنڈ	19, 36,275 پاؤنڈ
1718 لغایت 1727	15, 58,652 پاؤنڈ	15, 65,208 پاؤنڈ
1728 لغایت 1737	15, 74,794 پاؤنڈ	21, 50,019 پاؤنڈ
1738 لغایت 1747	23, 46,386 پاؤنڈ	24, 95,249 پاؤنڈ
1748 لغایت 1757	26, 62,454 پاؤنڈ	31, 33,150 پاؤنڈ
میزان کل	90, 74,465 پاؤنڈ	1, 15,69,901 پاؤنڈ

بمبئی میں معاشی ترقی اور نیا طبقہ

بمبئی کا جزیرہ جو پرتگالیوں نے 1534 میں گجرات کے بہادر شاہ سے حاصل کیا تھا 1661 میں انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا اور 1668 میں کمپنی کو منتقل ہو گیا تا کہ وہ ''اُس پر آزادی کے ساتھ جاگیردار کے لگان دار کی حیثیت سے قابض رہے۔ اور ہر سال 30 ستمبر کو دس پاؤنڈ بطور لگان ادا کرے۔''

انگریزوں کے تحت اس شہر نے تیزی کے ساتھ ترقی کی۔ ایک چھوٹی سی نو آبادی سے بڑھ کر اس نے ایک پردیسی بندرگاہ کی حیثیت حاصل کر لی۔ 1668 میں اس کی آبادی تقریباً دس ہزار تھی جو 1675 میں بڑھ کر ساٹھ ہزار اور 1701 میں ڈیڑھ لاکھ ہو گئی۔ آبادی میں اضافے سے زیادہ اہم تھی وہاں ہونے والی نوعی تبدیلی۔ جس وقت یہ شہر ایسٹ انڈیا کمپنی کو منتقل کیا گیا تھا اُس وقت اُس کی آبادی کچھ آدی واسیوں (کولی اور بھنڈاری)، خالص پرتگالیوں، تھوڑے سے نیم پرتگالیوں، جو توپا کہلاتے تھے، ہندوستانی عیسائیوں (زیادہ تر نیچی ذاتوں کے ہندوستانی جنھوں نے مسیحی مذہب قبول کر لیا تھا) کنبیوں، دھیدوں، مہاجرون، کچھ باہر سے آکر بسنے والے ہندوؤں اور مسلمانوں اور ایک دو پارسیوں پر مشتمل تھی۔

انگریزوں نے تجارت کو فروغ دیا تو اُس کے نتیجے میں بنکروں، دست کاروں اور تاجروں کا ایک نیا طبقہ بڑی تعداد میں وہاں آکر آباد ہو گیا۔ آنے والے سبھی لوگ کم حیثیت نہیں تھے۔ گجرات سے بنیا تاجر آئے اور آس پاس کے علاقوں سے بنجارے، سنار، لوہار، دست کار وہاں

آ کر آباد ہو گئے۔ پارسیوں کی آمد کو خصوصی اہمیت حاصل تھی۔

اس طرح وہاں کے اصلی باشندوں میں، جو غالباً دراوڑی نسل کے لوگوں کے آنے سے پہلے سے وہاں آباد تھے، نہ صرف آس پاس کے علاقوں بلکہ شمالی اور جنوبی ساحلی علاقوں سے آنے والے لوگوں کا اضافہ ہو گیا جن میں دراوڑی نسل کے لوگ بھی تھے اور مرہٹے اور گجراتی بھی۔ ان کے علاوہ حبشہ، عرب اور مڈغاسکر سے آنے والے غلام بھی تھے۔ ہندو مسلم، پارسی اور عیسائی مذاہب کی اچھی نمائندگی تھی۔ ہندوستان کے کاروباری ذاتوں میں سے گجراتی، بھاٹیہ اور پارسی تاجروں نے شہر کی سماجی اور معاشی ترقی میں اہم رول ادا کیا۔[1]

بمبئی کے کاروباری فرقے کی جو فہرست مل بورن نے تیار کی تھی اُس میں 16 پارسی، 15 ہندو، 4 مسلمانوں تاجر، 2 پارسی چینی ایجنٹ اور 6 پارسی جہاز سازوں کے نام درج ہیں جو انیسویں صدی کی ابتدا میں وہاں تھے۔ جہازوں کے مالکوں میں اُس نے 9 پارسیوں اور ایک مسلمان کا ذکر کیا ہے۔

اٹھارھویں صدی میں بمبئی کی تجارت نے تیزی کے ساتھ ترقی کی۔ 1708 لغایت 1717 اور 1748 لغایت 1757 کی دس سالہ مدتوں کے درمیانی زمانے میں درآمد کیا جانے والا مال بہ اعتبار مالیت دگنا ہو گیا تھا یعنی تقریباً دس لاکھ پاؤنڈ سے بڑھ کر اُس کی مالیت بیس لاکھ پاؤنڈ ہو گئی تھی۔ بمبئی ایک پھلتے پھولتے تجارتی طبقے کا گھر بن گیا تھا۔ اس طبقے کے اراکین مختلف ذاتوں اور مذہبوں سے تعلق رکھتے تھے لیکن اُن کے معاشی مفادات مشترک تھے۔

لیکن بمبئی کے فروغ نے مدراس اور کلکتہ سے مختلف راستہ اختیار کیا۔ آخر الذکر دونوں شہر محض داخلی اور خارجی تجارت کے بندرگاہ ہی نہیں تھے بلکہ مقامی صنعت کے بڑے مرکز بھی تھے۔ اُن کے گوداموں میں علاقے کی پیداوار اکٹھا کی جاتی تھی۔ اس کے برعکس بمبئی محض ایک بندرگاہ تھا جہاں مال آتا تھا اور آگے بھیج دیا جاتا تھا۔ وہاں کوئی مصنوعات تیار نہیں ہوتی تھیں۔

---

[1] بمبئی کے کسٹم ماسٹر نے 1759 میں مختلف فرقوں کی ایک فہرست تیار کی تھی۔ اُس میں مندرجہ ذیل شامل ہیں۔ برہمن، رگ ویدی، گجراتی، یجرویدی اور وشنو، بربھو، بنئے، دستکار، سنار، تانبے کا کام کرنے والے لوہار وغیرہ۔ پنچ کلشی، بنداری، عیسائی، پارسی اور مسلمان۔ ان کے علاوہ نیچی ذاتوں کے بہت سے لوگ۔

اس کے علاوہ مدراس اور کلکتہ کی آبادی قریب قریب ایک نوعی تھی لیکن بمبئی کی آبادی کا بڑا حصہ اُن لوگوں پر مشتمل تھا جو باہر سے آ کر وہاں آباد ہو گئے تھے اور اس لیے مختلف نسلیں اور ذاتیں پائی جاتی تھیں۔

شہری آبادی اور روایتی سماج کی تبدیلی

تینوں شہروں یعنی کلکتہ، مدراس اور بمبئی کی نمو یکساں خطوط پر ہوئی۔ اُن کی داخلی ترقی کے ساتھ تینوں پریسیڈنسیوں کو جوڑنے کا عمل بھی شروع کر دیا گیا۔ جوں جوں ساحلی اور سمندری تجارت بڑھتی گئی ہندوستانی تاجر اُس میں زیادہ حصہ لینے لگے۔ بنگالی مدراسی، پارسی اور گجراتی تاجروں میں روابط قائم ہوئے اور مفادات کی ہم آہنگی کا احساس پیدا ہونے لگا۔

تجارت کے ان مرکزوں کا قیام ایک روایتی تبدیلی نہیں تھی انھوں نے اُن نئی طاقتوں کی علامت کی شکل اختیار کر لی تھی جو مشرق اور مغرب کے باہمی روابط کے نتیجے میں معرض وجود میں آئی تھیں۔ یہ نئے شہر یورپ اور ہندوستان کے درمیان بڑھتی ہوئی تجارت کے فعال مرکز ہی نہیں تھے بلکہ تجارت کے نئے دستور ایک نئی سماجی معاشی تنظیم اور رہن سہن اور کاروبار کے نئے طریقوں کی مثالیں بھی پیش کرتے تھے۔ ہندوستانی تاجر بدیسی کاروباری لوگوں سے تعاون کرتے تھے اور اس طرح انھیں جو نئے نئے مواقع ملتے تھے اُن سے فائدہ اُٹھا کر دولت حاصل کرتے تھے دوسری طرف وہ لوگ تھے جو وقت کے ساتھ تبدیل نہیں ہوئے اور پرانے رسم ورواج سے چمٹے رہے رفتہ رفتہ ختم ہو گئے اور اُن کی جگہ تجارت، صنعت پیشوں اور ملک کے نظم ونسق میں نئے نئے داخل ہونے والوں نے لے لی۔ قدیم ہندو سماج میں کسی شخص کے پیشے اور کاروبار کا تعین وہ ذات کرتی تھی جس میں وہ پیدا ہوتا تھا لیکن نئے حالات میں پیشے اور کاروبار کے انتخاب کی حد تک ذات کی بندشیں ڈھیلی ہو گئی تھیں۔ غیر کاروباری ذاتوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ تجارت کرنے لگے تھے۔

V۔قدیم اشرافیہ اور کاروباری طبقات کا زوال

متوسط طبقے کے ارتقا کا دوسرا مرحلہ بڑی اہمیت کا حامل تھا۔ اس کی ابتدا 1757 میں جنگ پلاسی سے ہوئی۔ برطانوی فتح نے نئے سماجی رجحانات کو تقویت پہنچائی اور نہ صرف ہندوستانی معیشت بلکہ ہندوستانی سیاسی نظام میں بھی ایک انقلاب برپا کر دیا۔

بنگال کی مغل حکومت کا تخت اُلٹ دیا گیا اور اُسے اختیار و اقتدار سے محروم کر دیا گیا۔ حکمراں طبقے سے جس کا انحصار سرکاری ملازمت پر تھا حقوق و حیثیت چھن گئی اور اس طرح ہندوستانی سماج منتخب افراد سے محروم ہو گیا۔

مالکان اراضی سے سیاسی کام چھین لیے گئے۔ انھیں عوامی، سیاسی اور انتظامی ذمہ داریوں سے سبکدوش کر دیا گیا۔ سیاسی طاقت کے تمام مرکز ختم کر دیے گئے اور ہندوستانی سیاسی نظام کی جڑیں کاٹ دی گئیں۔

سیاسی رجحان رکھنے والے سماج کے بالائی طبقے کے فنا ہو جانے کا اثر ہندوستانی سماج کی طبقاتی ساخت پر پڑا۔ ہندوستان کی سیاسی بالائی طبقے کی جگہ بدیسیوں نے لے لی یعنی برطانوی حکمراں قدیم کاروباری طبقہ جزوی طور سے نئے تجارتی طبقے میں ضم ہو گیا جو یورپ کے ساتھ ہندوستان کی تجارت سے اپنی روزی کماتا تھا اور نئے متوسط طبقے کا بنیادی جز تھا۔ کسان اور دست کار بدحالی کے شکار تھے اور بے مہارت مزدوروں کے ساتھ سب سے نچلے طبقے سے متعلق تھے یعنی محنت کش غریبوں کے طبقے سے۔ چنانچہ ہندوستان کی آبادی دو طبقوں میں بٹ گئی۔ یعنی ایک چھوٹا سا متوسط طبقہ جو مندرجہ ذیل مختلف عناصر پر مشتمل تھا اور محنت کش عوام جو آبادی کا بڑا حصہ تھے۔ پہلا طبقہ رفتہ رفتہ باحیثیت طبقہ بن گیا جس میں باصلاحیت لوگ تھے۔ دوسرا طبقہ یعنی شہری اور دیہاتی محنت کش عوام زیادہ غربت و افلاس کے شکار ہوتے گئے۔ متوسط طبقے نے فائدہ اُٹھایا لیکن فی الجملہ عام لوگوں کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔ ان متضاد تبدیلیوں نے سماجی طور طریق اور اخلاقی اور ذہنی رویوں کو متاثر کیا۔

فتح کا زراعت پر یہ اثر پڑا کہ لگان داری کی کچھ ظاہری اشکال تو باقی رہیں لیکن نئے نظام

نے قدیم اداروں کے کردار اور روح کو پوری طرح بدل دیا۔ زمینداروں، جاگیرداروں اور تعلقداروں کا اراضی رکھنے والا قدیم طبقہ اشرافیہ ایک ایسی تنظیم تھی جس کی بنیاد تھی ملازمت حالانکہ یہ حقیقت ہے کہ اٹھارھویں صدی میں اس کی نوعیت بہت واضح نہیں رہی تھی۔ زمینداری کا نیا نظام محض ایک تجارتی کاروبار تھا جس میں دیہی رشتوں کا انحصار ملازمت کے بجائے منافع پر تھا۔ زمیندار محض ایک منافع خوار ہوکر رہ گیا تھا۔

تجارت اور صنعت کے میدان میں جو انقلاب آیا وہ یہ تھا کہ پوری کی پوری بڑی تجارت اور خصوصیت کے ساتھ وہ بڑی تجارت جس کا تعلق بیرونی کاروبار سے تھا بدیسیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ ہندوستان کے آزاد تاجر، بنک کار اور سرمایہ کار ختم ہوگئے۔ لیکن درمیانی حیثیت کا کاروبار کرنے والوں کا ایک بڑا گروہ وجود میں آگیا جو تاجروں کے علاوہ گماشتوں، ذیل ٹھیکیداروں اور امدادی کام کرنے والوں پر مشتمل تھا۔ قدیم ہندوستانی صنعت کے زوال اور بدیسی صنعت کے مقابلے کا اثر ہندوستان کی کاروباری برادری کے بالائی حصے کی آمدنی پر پڑا۔

تجارتی طبقے کے نشیب وفراز

بنگال کے تجارت کے تین حصے تھے یعنی داخلی، ساحلی اور سمندری یا یورپ اور مشرق بعید کی تجارت۔ 1757 تک داخلی تجارت پوری کی پوری ہندوستانی تاجروں کے ہاتھوں میں تھی۔ بری یا بحری راستوں سے آنے والے مال کو ہندوستانی تاجر خرید لیتے تھے اور بنگال میں فروخت کیا کرتے تھے۔ وہ ہندوستان کے مختلف حصوں اور سرحد پار کے ملکوں کو بنگال کا مال بھیجا کرتے تھے۔ برآمد کرنے کے لیے ہندوستانی اشیا حاصل کرنے میں وہ یورپی کمپنیوں کی مدد کرتے تھے۔

اس وقت ہندوستان کی ساحلی اور سمندری تجارت زیادہ تر بدیسیوں کے ہاتھوں میں آچکی تھی جنھوں نے سمندروں پر اقتدار حاصل کرلیا تھا اور عربوں اور دوسرے بحری تاجروں کو نکال باہر کیا تھا۔ ہندوستان کے مغربی اور مشرقی ساحلوں پر واقع زیادہ تر بندرگاہوں میں انھوں نے اپنی فیکٹریاں قائم کرلی تھیں۔ لیکن 1757 تک یورپین محض دو قسم کی تجارت کرتے تھے یعنی ساحل اور بحری، کسٹم ڈیوٹی کے تعلق سے انھوں نے ہندوستانی حکمرانوں سے اہم رعایتیں حاصل کرلی تھیں۔ مثال کے طور پر کمپنی کی سند کی بنا پر اُس کا مال ہندوستانی حکام کے کسٹم کے معائنے اور

کسٹم کی ادائیگی سے محفوظ رہتا تھا۔اس طرح تجارت منافع بخش بن گئی اور سال بہ سال بڑھ رہی تھی۔

1757 کے بعد انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی حیثیت یک لخت بدل گئی۔جس ملک کے ساتھ ابھی تک وہ محض تجارت کرتی رہی تھی اب اس کی مالک بن بیٹھی۔

فتح کے نشے نے انھیں سرشار کر دیا اور آسانی اور تیزی کے ساتھ حاصل کی جانے والی دولت کا خیال بڑا دلکش تھا۔ چنانچہ کمپنی کے ملازمین نے تمام معاہدوں اور سمجھوتوں کو پس پشت ڈال دیا نواب کے ساتھ ذلت آمیز برتاؤ کرنے لگے اور عام لوگوں کی حفاظت کو بڑی بے دردی کے ساتھ نظر انداز کر دیا۔ داخلی تجارت پر وہ بالجبر قابض ہو گئے۔

کلائیو نے 1765 میں کورٹ آف ڈائرکٹرز کو لکھا تھا ''اس میں کوئی تعجب نہیں ہے کہ دولت کی حرص نے اُس کو حاصل کرنے کے پیش پا افتادہ ذرائع کو قبول کر لیا یا یوں کہئے کہ آپ کی طاقت کو آلہ کار بنا کر انھوں نے اختیار حاصل کر لیا کہ جہاں معمولی بد دیانتی اُن کی انتہائی حرص کا ساتھ نہ دے سکے۔تو وہ بالجبر دولت حاصل کریں۔''[1] ورلسٹ نے کہا ''ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دولت کی لالچ میں ہمارے سب ملازمین اس حد تک مبتلا ہیں کہ ملک کی حکومت کی طرف منصفانہ رویے اور ملک کی طرف اپنے فرض کو یکسر بھول بیٹھے ہیں۔''[2]

میر جعفر کی یادداشتوں اور میر قاسم کے احتجاجوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میر قاسم نے شکایت کی ''ہر پرگنے، ہر گاؤں اور ہر فیکٹری میں وہ (برطانوی گماشتے) نمک، پان، گھی، چاول، پیال، بانس، مچھلیاں، ترکاریاں، ادرک، شکر، تمباکو، افیم اور دوسری بہت سی اشیا خریدتے اور بیچتے ہیں۔''[3]

انگریزوں نے چار سو سے زیادہ فیکٹریاں کھول لی تھیں اور اُن کے گماشتے نہ صرف تجارت

---

[1] کلائیو کا خط کورٹ کے نام، مورخہ 13 ستمبر 1765، H.C third report select committee 1772-73 صفحہ 73 صفحہ 391

[2] ورلسٹ View of Bengal H، صفحات 128-129

[3] پریسیڈنٹ کے نام میر قاسم کا خط، اقتباس، این کے سہنا Economic History of Bengal جلد 1 صفحہ 69

میں مداخلت کرتے تھے بلکہ زمینداروں کے ساتھ بڑا برا برتاؤ کرتے تھے اور کسانوں اور دست کاروں پر مظالم توڑتے تھے۔ وہ انھیں زیادہ قیمتیں ادا کرنے پر مجبور کرتے تھے اور مندی کی قیمت سے 30 سے لے کر 40 فیصد تک کم پر اُن کا مال خریدتے تھے۔

حالانکہ وارن ہیسٹنگز اور ونسٹیارٹ کو یقین تھا کہ نواب کی شکایتیں حق بجانب ہیں پھر بھی کونسل کی اکثریت نے انصاف پر حرص کو ترجیح دی اور شکایتیں رد کردیں۔ اُس کے جواب میں میر قاسم نے ہندوستانی تاجروں کے مال پر چنگی منسوخ کردی تاکہ اُن پر انگریز تاجروں سے زیادہ بار نہ پڑے۔ اپنی رعایا کے مفادات کے تحفظ کی بنا پر اسے تخت سے دست بردار ہونا پڑا۔ اُس کے وارثوں کے سامنے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں تھا کہ وہ اُن حقوق کی تصدیق کریں جو ہندوستانی تاجروں کے لیے مہلک اور ہندوستانی حکومت کے مالی نقصان کا باعث تھے۔

کمپنی کے ڈائرکٹروں نے نجی تجارت کی غیر منصفانہ نوعیت کو سمجھا اور کلائیو نے کوشش کی یہ تجارت ایک سوسائٹی کے ذریعہ کی جائے۔ ڈائرکٹروں کے احکام کی تعمیل میں سوسائٹی ختم کردی گئی۔ لیکن قیادت نہیں ختم کی جاسکی اس لئے کہ کمپنی کے تمام اعلیٰ عہدہ دار اس میں ملوث تھے۔ انگریزوں کی دیکھا دیکھی دوسرے یورپین بھی نجی تجارت کرنے لگے جن سے کمپنی کے ملازمین ملے ہوئے تھے اور انگریز ملازمین کے نجی منافع اُن کے گھروں تک پہنچانے کے عوض اُن سے ساز باز کرتے تھے۔ اُن دونوں نے مل کر ہندوستانی تاجروں کو تباہی کی حد تک پہنچا دیا۔

چنانچہ 1757 کے بعد انگریزوں کی سمندری تجارت داخلی تجارت کے ساتھ گڈمڈ ہوگئی اور کمپنی کی سرکاری تجارت اُس کے ملازمین کی نجی تجارت کے ساتھ مل گئی۔ اس سے کمپنی کو بھی بہت نقصان ہوا۔ اور آزاد ہندوستانی تاجروں کو بھی۔ لیکن نجی تجارت کرنے والے یورپین تاجروں نے دولت حاصل کرلی اور اُن کے ہندوستانی گماشتے خوشحال ہوگئے۔ ان میں کمپنی کے گماشتے اور انفرادی تاجروں کے بانیان شامل تھے۔

کاروبار میں بچولیوں کی بڑھتی تعداد کی وجہ یہ تھی کہ کمپنی نے مال حاصل کرنے کے طریقے بدل دیے تھے۔ 1753 ہی میں کمپنی تجارت کے پرانے طریقے ترک کر چکی تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے حکام اور دادنی تاجروں دونوں کو اندازہ ہوگیا تھا کہ ہندوستانی تاجر بہت آزاد و سخت گیر

ہیں اور اپنے معاہدوں کی پابندی کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ ہندوستانی تاجروں کا خیال تھا کہ تجارت کی شرائط غیر اطمینان بخش ہیں، کمیشن ناکافی ہے اور ڈچوں اور فرانسیسیوں کے برعکس انگریز تحکم پسند اور لالچی ہیں۔ 1749 میں ان میں سے کچھ تاجروں نے بڑی بڑی پیشگی رقمیں لیے بغیر مال دینے سے انکار کردیا تھا۔ اُن پر یہ الزام لگایا گیا تھا کہ مختلف اشیا کی قیمتیں مقرر کرنے کے سلسلے میں وہ سازش کرتے ہیں۔ کمپنی کی تجارت کا لحاظ کیے بغیر اپنا نجی کاروبار رکھتے ہیں۔ اور ڈچوں کو مال مہیا کرتے ہیں جو انگریزوں کے تجارتی رقیب تھے۔ چنانچہ 1753 میں دادنی تاجر کی جگہ گماشتے نے لے لی جو کمپنی کا ملازم تھا اور محض کمپنی کا کام کرتا تھا۔ رقمیں اس کے ذریعہ سے لی جانے لگیں۔ وہ نقد رقم لے کر اورنگ میں مال خریدتا تھا، کوٹھیوں میں اُن کی پرتال اور درجہ بندی کرتا تھا اور اس کے بعد کلکتہ کے گودام کو مال بھیج دیتا تھا۔ نئے مقرر ہونے والے گماشتوں کے علاوہ تاجروں کا ایک اور گروہ تھا جو بانیان کہلاتے تھے اور زیادہ تر کمپنی کے ملازمین اور آزاد یورپین تاجروں کی نجی تجارت اور گھریلو معاملوں میں مدد کرتے تھے اور ہر قسم کا کام کرتے تھے۔

بانیان مترجم تھا، حساب رکھتا تھا، اعلیٰ سکریٹری تھا سب سے بڑا دلال تھا، رقم مہیا کرتا تھا اور مجموعی اعتبار سے رازدار تھا۔ گھریلو ملازم اس کے ذریعہ نوکر رکھے جاتے تھے اور وہ اُن میں نظم و ضبط قائم رکھتا تھا۔ وہ اپنے مالک کا ہر طرح کا کاروبار چلایا کرتا تھا۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ اپنے مالک پر اُسے وہ تمام اختیارات حاصل تھے جو ملک میں تنظیم املاک، ساہوکار اور داشتہ کو مجموعی اعتبار سے حاصل تھے اور بڑی آسانی کے ساتھ وہ عام بات چیت میں وہ کچھ کہہ دیا کرتا تھا جو اُس کا مالک اپنی زبان سے کہنے کی ہمت نہیں کرسکتا تھا۔

یہ حیثیت اتنی منافع بخش تھی کہ بہترین ہندو خاندان کے افراد بھی یورپین لوگوں کی ملازمت کرتے تھے اور اس ملازمت کو حاصل کرنے کی خاطر رشوت بھی دیتے تھے۔ جس کی بنا پر انھیں بہت سے فوائد حاصل ہوجاتے تھے۔ یعنی یورپینوں پر اثر، خود اپنی سماج میں بڑی حیثیت اور اپنے مالک کے دستخط سے فائدہ اُٹھا کر کسٹم ڈیوٹی ادا کیے بغیر تجارت کرنے کے مواقع۔

وہ دادنی تاجر جو انگریزی کمپنی کی سرپرستی سے محروم ہوچکا تھا دوسرے یورپی تاجروں کو مال

مہیا کرتا رہا۔ یعنی فرانسیسیوں، ڈچوں اور جنگ آزادی تک امریکیوں کو اور اپنے نقصان کی تلافی دوسرے طریقوں سے کرتا رہا یعنی مُلک کی داخلی تجارت کو ترقی دے کر کمپنی کے بانڈوں کا سٹہ کر کے اور اونچی شرح سے سود لیے جانے والے کمپنی کے قرضوں میں روپیہ لگا کے۔

1757 سے پہلے نوابوں کے نافذ کردہ ضابطوں کی رو سے کمپنی کے ملازمین کی نجی قیادت کم ہو گئی تھی۔ کسٹم ڈیوٹی صرف کمپنی کے درآمد اور برآمد کیے ہوئے مال پر نہیں لگتی تھی۔ اس کا اطلاق نہ تو مُلک کی داخلی تجارت پر تھا اور نہ نجی تاجروں کی خرید وفروخت پر 1757 کے بعد گماشتوں اور بانیانوں کو بڑی آزادی مل گئی تھی اور انگریز تاجروں کے ایجنٹوں کی حیثیت سے اُن کے سامنے بڑا امیدان کھل گیا جو ہر قسم کی تجارت کے لئے کسٹم ڈیوٹی سے مستثنیٰ ہونے کے دعویدار تھے اور اس پر عمل کیا کرتے تھے چاہے وہ کمپنی کا مال ہو یا نجی تاجروں کا۔ اس اجازت نامے کا جس کی رو سے کمپنی کا مال معائنے اور کسٹم ڈیوٹی ادا کرنے سے مستثنیٰ ہوتا تھا اور ہر قسم کے کاروبار کے لئے آزادی سے استعمال کیا جاتا تھا۔

صدر سے لے کر ایک چھوٹے سے مُحرر تک کمپنی کا ہر ملازم اپنا حق سمجھتا تھا کہ وہ اجازت نامے کو استعمال کرے۔ اور اُس کے ہندوستانی ایجنٹ اس لوٹ کھسوٹ میں شامل ہوتے تھے۔ وہ تجارت کرنے میں اپنے مالک کے نام سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ حالانکہ تجارت خود اُن کے سرمایے سے ہوتی تھی کبھی کبھی اجازت نامے کے حق کو قابل فروخت شے سمجھا جاتا تھا۔ جس کی قیمت 25 روپے سے 200 روپیہ تک وصول کی جاتی تھی۔ اجازت نامے کے غلط استعمال نے نجی تجارت کو بہت بڑھا دیا اور بنگال کی کاروباری سرگرمی میں ہندوستانیوں کے حصے میں اضافہ کر دیا۔ حالانکہ ہندوستان کی حیثیت ایک طفل کی تھی۔ پھر بھی بہت سی صورتوں میں اس سے اُسے بہت فائدہ ہوتا تھا۔

ہندوستان کی تجارت کے فروغ اور اس کی بناوٹ میں ہونے والی تبدیلی کے جو نتیجے سامنے آئے اُن میں سے ایک تھا حیدرعلی اور ٹیپوسلطان کے ساتھ جنگ جو مالابار اور کارومنڈل کی ساحلوں پر انگریزوں کے بڑھتے ہوئے غلبے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ دوسرا نتیجہ تھا یورپی جہازرانی اور ہندوستانی اور ہندوستان میں مقامی جہاز سازی کی صنعت کا فروغ۔ اس صنعت میں بمبئی سب

سے پیش پیش تھا۔ جس کو فروغ دینے میں پارسیوں نے اہم رول ادا کیا۔ لوجی واڈیا (1735) پہلا جہاز ساز تھا۔ ملک کے بیڑے کے بہت سے جہاز سورت، دمن اور بمبئی میں بنائے گئے تھے۔ بنگالی اس میدان میں کچھ بعد میں داخل ہوئے یعنی 1760 کے لگ بھگ۔ بنگال میں پہلا جہاز 1769 میں سمندر میں اُتارا گیا تھا۔ امریکہ کی جنگ نے نئے عوامل مہیا کر دیے اور 500 ٹن کا نان سچ 1781 میں ہگلی میں اُترا 1781 اور 1803 کی درمیانی مدت میں 56 جہاز اور 92 کشتیاں بنائی گئیں۔ اس صدی کے ختم ہونے سے پہلے ہندوستان کے بنے ہوئے ایک ہزار اور تیرہ سوٹن کے جہاز سمندروں میں چل رہے تھے۔

بنگال میں جہاز سازی کی صنعت پر انگریز تاجروں نے اجارہ داری حاصل کر لی تھی اور یہ قدرتی امر تھا کہ ملک کی تجارت کے لیے مال کی بار برداری کا کام بھی اُن کے ہاتھوں میں آ گیا۔ مغربی ایشیائی ممالک اور چین کو برآمد کیے جانے والے مال کے سلسلے میں یورپینوں نے غالب حیثیت حاصل کر لی تھی۔ تجارت کے اس منافع بخش شعبے سے بڑی حد تک ہندوستانی نکال دیے گئے تھے۔

ایک اور نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے تین علاقے یعنی بنگال، مشرقی ساحلی علاقہ اور مغربی ساحلی علاقہ ایک دوسرے سے منسلک ہو گئے۔ 1790 میں ہندوستان کے بندرگاہوں کے درمیان آزاد تجارت شروع ہوگئی جس کی وجہ سے وہ معاشی اعتبار سے ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔

اگرچہ بنگال اور مغرب ساحل کے درمیان تجارت کم ہوگئی مگر کارومنڈ ساحل کے ساتھ تجارت بڑھ گئی۔ مدراس نہ صرف برما اور ملایا کو کیے جانے والے برآمدات کا اہم مرکز بن گیا بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی اور چین سے ہونے والی بڑھتی ہوئی تجارت کا مستقر بھی بن گیا۔ لیکن تجارت میں اضافے سے فائدہ ہندوستانیوں کے بجائے انگریز تاجروں کو ہوا۔

اُن تبدیلیوں کا مُضر اثر بنگال کی حیثیت پر پڑا۔ کمپنی کی تجارتی سرگرمیوں کی نوعیت بدل گئی۔ اب ہندوستانی اشیا کی برآمدات کے لیے رقم اُس بلین کے ذریعہ مہیا کی جاتی تھی جو انگلستان سے آتا تھا بلکہ مال خریدنے کے لیے بنگال کے صوبے کی آمدنی استعمال کی جاتی تھی۔ اس طرح استعمال کی جانے والی رقم کا اندازہ دس سے لے کر پندرہ لاکھ پاؤنڈ سالانہ تک لگایا

جاتا ہے۔ کچھ برسوں میں ہندوستان میں کمپنی کے علاقے کی توسیع ہوگئی جس پر فاضل آمدنی خرچ ہونے لگی اور مال خریدنے کے لئے کمپنی کو قرض لینا پڑا۔ یہ قرض سال بہ سال بڑھتا رہا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں زرنقد آنا کم ہوگیا۔ اس زمانے کے معاشی نظریوں کے مطابق زرنقد برآمد کرنا بہت بُرا سمجھا جاتا تھا اور چونکہ تجارت کرنے کے لئے ایک نیا راستہ مل گیا تھا اس لئے ہندوستان کو زرنقد بھیجنا ضروری نہیں تھا جب تک کہ خصوصی حالات اُس کے منافی نہ ہوں۔ 57-1756 میں ہندوستان بھیجے جانے والے بلین کی مالیت تقریباً 8,00,000 پاؤنڈ تھی۔ اگلے سال وہ آدھا رہ گیا اور 1781 تک اُس کی مالیت گھٹ کے محض 5000 پاؤنڈ رہ گئی۔

نہ صرف یہ کہ بنگال میں چاندی آنا بند ہوگئی بلکہ اس کے برعکس وہاں سے چین کو برآمد کی جانے لگی۔ اگر پلاسی سے پہلے ورلسٹ کے مطابق کسان آرام سے تھا، دستکار کی ہمت افزائی ہوتی تھی، تاجر دولت مند تھے اور دیسی حکمراں مطمئن تھا۔[1] تو غیر منضبط سامراج (1757 لغایت 1785) کے تاریک دور میں حالات یکسر بدل گئے تھے۔

مقامی بنک کاری کا زوال

ہندوستان کی بدیسی تجارت کی ساخت بدلنے کا ایک اور نتیجہ ہوا یعنی ہندوستانی بنک کاری اور صرافوں کے طبقے کا زوال۔ ملک کے قدیم معاشی نظام میں وہ ایک ضروری اور مفید کڑی کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہ ملک کے اندرونی حصوں سے مرکز کو آمدنی کی رقمیں بھیجا کرتے تھے۔ ھنڈیاں جاری کیا کرتے تھے۔ جن کی وجہ سے تجارت کرنے میں سہولت ہوتی تھی اور حاجت مندوں کو، جن میں حکومت اور زمیندار دونوں شامل تھے قرض دیا کرتے تھے۔ زر کا مبادلہ کرنے والے کرنسیوں کا مبادلہ کرنے کی ضروری خدمات سرانجام دیتے تھے اور منڈیوں کی دلالی کرتے تھے۔ اٹھارھویں صدی میں بنگال ایک اہم ترین بنک کار تھا۔ جگت سیٹھوں کا خاندان جو نواب کی زرکی پالیسی کنٹرول کرتا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان کے تجارتی حالات کے پیشِ نظر ہر سال مجبوراً بڑی مقدار میں بلین درآمد کرتی تھی۔ لیکن وہ صرافوں کو بٹا یا مبادلے کا کمیشن نہیں ادا کرنا چاہتی تھی۔ اس لئے اُس نے معیاری سکّے ڈھالنے کی اجازت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ مدراس

[1] ورلسٹ، ایچ اکورٹ کے نام خط 5 اپریل 1779

میں تو یہ اجازت جلدی مل گئی مگر بنگال میں یہ اجازت 1756 میں مل پائی۔ لیکن 1763 کے بعد کرنسی کا سوال اپنی اہمیت کھو چکا تھا، اس لئے کہ میر قاسم کی معزولی کے بعد نظم ونسق انگریزوں کے ہاتھوں میں رہ گیا تھا اور کرنسی پر جگت سیٹھوں کا کنٹرول ختم ہو چکا تھا۔

وارن ہسٹنگز نے کوشش کی کہ کلکتہ کی ٹکسال کے علاوہ تمام دوسری ٹکسالوں کو ختم کر دیا جائے تاکہ سکّہ سازی میں یکسانیت پیدا ہو جائے۔ مگر اس میں اُسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ٹکسال اندرونی ملک کی ضروریات پوری نہیں کر سکتی تھی اور مالکان آراضی اور کسانوں کو دوسری کرنسیوں پر بہت زیادہ بٹا دے کر معیاری کرنسی حاصل کرنی پڑتی تھی۔ اس کے علاوہ استعمال ہونے والی کرنسیوں کے تعلق سے ہر ضلع کو کچھ مسائل کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ 1787 میں کلکٹروں نے اپنی رپورٹوں میں کہا تھا کہ صوبے بھر میں قریب قریب ہر ضلع اور پرگنے کی کرنسی مختلف ہے۔[1] ان حالات سے صراف فائدہ اُٹھاتے تھے انھوں نے مُلک کے زرنقد پر کنٹرول حاصل کر لیا تھا۔ ہر ضلع میں اپنی ایجنسیوں کا جال بچھا دیا تھا اور صوبے کی معیشت میں بڑا اثر دخل رکھتے تھے۔ وہ وقت پر روپئے کی صورت میں مالگزاری ادا کرنے کے سلسلے میں زمینداروں کی مدد کیا کرتے تھے۔ زمینداروں کی طرف سے حکومت کو ادا کی جانے والی رقموں پر وہ سود لیتے تھے۔ اگر زمیندار مقررہ وقت کے اندر رقم واپس نہیں کرتا تھا تو اسے مزید رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔

اندرون ملک مبادلے میں استحکام پیدا کرنے اور مالگزاری کی ادائیگی کو آسان بنانے کے لئے ہسٹنگز نے ایک اور کوشش کی جس کے نتیجے میں 1773 میں جنرل بنک کا قیام عمل میں آیا جس کا انتظام حصوری مل اور دیوان چند کے سُپرد تھا۔ کلکٹروں کے حکم کی تعمیل میں یہ بنک ختم کر دیا گیا۔

لیکن اندرون ملک سے آمدنی کی رقموں کو بھیجنے کا معقول و مناسب ذریعہ صراف نہیں تھے۔ جگت سیٹھوں کے زوال کے بعد ہندوستانی بنک کار بھی اس فرض کو پوری طرح ادا کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ پہلی بات یہ تھی کہ انگلستان میں تجارت کی عام کساد بازاری نے بنک کاری کے کاروبار کو بھی متاثر کیا تھا۔ اور دوسری بات یہ تھی کہ ہسٹنگز کے زمانے میں یورپی تاجروں نے اپنی کمپنیاں قائم کر لی تھی۔ 1770 میں مسز الکز ینڈر اینڈ کمپنی نے بنک آف ہندوستان قائم کیا۔

---

[1] مہتا جے۔ سی Economic Annual of Bengal صفحہ 142

اس کے لئے کمپنی کے ملازمین نے رقمیں دیں۔ جب اُن کی نجی تجارت ختم ہونے لگی تو انھوں نے یا تو ملازمت سے استعفیٰ دے کر ایجنسیوں کا کاروبار شروع کر دیا یا اس کام کے لئے اپنی رقمیں دوستوں کو دے دیں۔ یورپی، بنکوں اور ایجنسیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے ہندوستانی بنک کاروں کا کاروبار ختم کر دیا۔ نجی بنکوں نے وہ کچھ حاصل کر لیا جو وارن ہسٹنگز کے ضابطوں سے حاصل نہیں ہو سکا تھا۔[1]

چنانچہ ہندوستان کے متوسط طبقے کی تاریخ میں 1757 اور 1785 کی درمیانی مدت کو بیک وقت عروج و زوال کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ کچھ پرانے گواہوں نے اپنے قدیم پیشے کھو دیئے اور معاشی اعتبار سے وہ گر گئے۔ دوسروں نے موقع سے فائدہ اُٹھایا اور سماجی اور معاشی اعتبار سے ترقی کر گئے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ٹھیکیداروں کی حیثیت سے قدیم کاروباری طبقے کا کام ختم ہو گیا اور اس کے رکن جلد ہی تاجر ایجنٹوں کی حیثیت سے محض ایسٹ انڈیا کمپنی کا مال اکٹھا کرنے کا کام کرنے لگے۔ ہندوستان کی داخلی تجارت درہم برہم ہو چکی تھی۔ اس لئے کہ کمپنی نے نمک اور افیم کی تجارت پر اجارہ داری حاصل کر لی تھی اور کلائیو نے بہار میں شورہ بنانے کا اجارہ میر قاسم سے حاصل کر لیا تھا۔ جب نیل درآمد کیے جانے والے مال کا ایک اہم حصہ بن گیا تو یورپینوں نے اُس کے ٹھیکے محض اپنے لئے حاصل کر لیے۔ ہندوستان کے متوسط طبقے کا بڑی ساحلی تجارت میں اب بہت کم حصہ رہ گیا تھا۔ ایجنٹوں کا کام کرنے کے علاوہ وہ زیادہ تر کمپنی کے بانڈ اور قرض کا کام کرتے تھے۔ اور مبادلہ زر کرتے تھے۔ 1769 میں جب کمپنی نے ہندوستانی بچولیوں کے ذریعہ تجارت کرنے کا طریقہ ختم کر دیا تو تجارت کے اور دروازے اُن پر بند ہو گئے ورلسٹ کے الفاظ میں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ''بہت سے لوگوں نے تجارت میں روپیہ پھنسانے سے انکار کر دیا۔'' خوش قسمتی سے اُن کے لئے سرمایہ کاری کا ایک اور راستہ کھل گیا اور وہ زمین میں روپے لگانے لگے۔

---

[1] مہتا۔ ایچ Early European Banking in India لندن 1927، صفحات 84-165-175

IV زرعی معیشت میں تبدیلی اور آراضی رکھنے والے متوسط طبقے کا عروج

مال گزاری کے برطانوی نظام میں ہونے والی تبدیلیوں کے نتیجے میں بنگال کی زرعی معیشت میں جو تبدیلیاں ہوئی اُن کی کہانی بار بار سنانا ضروری نہیں۔ لیکن اُن کے سماجی عواقب کو ظاہر کرنے کے لئے جو انقلابی نوعیت کے تھے اس تبدیلی کے خاص واقعات پر غور کر لینا چاہیے۔

ہندوستان کے نظام آراضی سے انگریز اس وقت واقف ہوئے جب انھوں نے تین گاؤں یعنی کلکتہ، گوند پور اور سلطانوتی کے زمیندارانہ حقوق حاصل کر لیے۔ بعد میں انھوں نے کچھ اور گاؤں بھی حاصل کر لیے تھے 1757 میں چوبیس پرگنہ کا ضلع اُن کے حوالے کر دیا گیا۔ اور وہ ایک انگریز زمیندار فرنک لینڈ کے ذریعہ اس کی مال گزاری وصول کرنے لگے۔ 1759 میں ضلع سے زیادہ مالگزاری وصول کرنے کی نیّت سے انھوں نے نیلام عام کے ذریعے زمینداروں کا ٹھیکہ دینا شروع کر دیا۔ حقیقت میں یہ ایک ایسی جدت تھی جس کے دوررس نتائج سامنے آئے۔ ورلسٹ نے کہا ہے کہ ہندوستانی اس کو ایک ظالمانہ فعل اور ہندوستان کے رواجوں کے خلاف سمجھتے تھے۔ نیلام عام کے ذریعہ آراضی کی فروخت نے زمینات سٹے بازوں کو منتقل کر دیے جو کسانوں کا خون چوسنے لگے اور طرح طرح کے جھانسے دینے لگے۔ پرانے زمینداروں پر اعتماد و اعتبار نہیں کیا جاتا تھا۔ چنانچہ اس بات کے تجربے کیے گئے کہ ان کی وصول کی ہوئی لگان کی رقم کی تصدیق جوتے داروں سے کی جائے۔ کمپنی نے اپنے ملازمین کے ذریعے براہ راست جو انتظام کیا وہ اس قسم کی اطلاعات حاصل کرنے میں ناکام رہا اور سروے اور دستاویزات کے معائنے کا کام دیر طلب تھا۔ چنانچہ اس مسئلے کو آسانی کے ساتھ ٹھیکہ دے کر حل کر لیا گیا۔ لیکن ٹھیکیدار کمپنی کے ملازم اور بانیان تھے جو محض منافع میں دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ زمینداروں سے بڑے زمیندار بن گئے اور مالکان آراضی کی وسطی تنظیم میں انھوں نے رخنہ ڈال دیا۔ قدیم زمیندار طبقے کے خصوصی میدان میں ایک نیا سماجی عنصر داخل ہو گیا۔

جو کام ایک ضلع کے محدود علاقے میں کیا گیا تھا وہ پورے بنگال میں پھیل گیا۔ 1765 میں میر قاسم نے بردوان، مدناپور اور چٹا گانگ کے تین ضلع انگریزوں کے حوالے کردیئے لیکن شرط یہ تھی کہ قدیم زمینداروں اور اجارہ داروں کو بحال و برقرار رکھا جائے۔ پھر بھی بردوان میں انگریز ریزڈینٹ نے نیلام عام کے ذریعے مال گزاری کا ٹھیکہ دینا شروع کیا جس کے تباہ کن نتائج ہوئے۔ بہت کم قدیم زمینداروں بلکہ باحیثیت اور باکردار لوگوں نے بھی بولی لگائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محکمہ مال کے محاسبوں اور محرروں نے منافع بخش زمینداریوں کا ٹھیکہ لے لیا۔ ورلسٹ نے ''حریص بد بخت'' سے تعبیر کیا ہے۔ ان میں کمپنی کے بہت سے ملازم شامل تھے۔ یعنی جان اسٹوون، ہوبل اور بولٹس۔

کمپنی نے جو مثال قائم کی تھی اس پر عمل میر قاسم نے اُن علاقوں میں کیا جن پر اُس کی حکومت تھی۔ وہ مالی مشکلات میں گرفتار تھا جس کی بڑی وجہ تھی انگریز اعلیٰ عہدہ داروں کی تحفوں اور معاوضوں کے لیے ہوس اور کمپنی کے ملازمین کی نجی تجارت۔ اپنے مالی نقصان کو پورا کرنے کے لئے اُس نے زمین سے زیادہ سے زیادہ مالگزاری حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے بچولیوں کو برطرف کردیا، عامل مقرر کیے اور انھیں غریب کسانوں کے ساتھ من مانی کرنے کی اجازت دے دی۔ قانون گویوں اور اُن کی دستاویزات کو نظرانداز کردیا گیا اور تشخیص مال گزاری لوٹ مار بن گئی۔ میر قاسم کی ناداری نے ایک ایسے عمل کو جنم دیا جس کے نتیجے میں بنگال کی دیہی معیشت بدل کے رہ گئی۔

اس کی جگہ انتظام سنبھالنے والے انگریزوں نے نہ صرف اس طریقے کو جاری رکھا بلکہ مطالبے میں اضافہ کردیا اور وصول میں زیادہ سختی برتنے لگے۔ 1764 میں انھوں نے تین سال کے لئے زمینوں کا ٹھیکہ دینے کا رواج شروع کیا اور بے حیثیت اور بے کردار لوگوں کو نیلام میں بولی بولنے کی اجازت دی۔ بقول ورلسٹ ''لاتعداد خونخوار عفریتوں کو لوٹ مار کی اجازت دی گئی۔ جنھوں نے غموں سے چور لوگوں سے روپے چھین کر پہلے سال کا مطالبہ ادا کیا'' دوسرے نیلام میں صرف زمین کا 2/5 حصہ فروخت کیا جاسکا۔ لیکن یہ حصہ یورپی عہدہ داروں اور اُن کے بانیانوں نے مختلف ناموں سے خریدا تھا۔

اس کی بنا پر کسانوں پر ظلم توڑے جانے لگے۔ جب کمپنی نے بنگال کی دیوانی حاصل کر لی تو مظالم میں اور اضافہ ہوگیا۔ ملک کی بڑی دولت کا بھوت کمپنی کے سر پر سوار تھا۔ وہ اپنے حصہ داروں اور ملازموں کے لئے اور انگلستان کے لئے بھی حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ہندوستان میں مقیم کمپنی کے ملازمین پرانی حکومت کے حکام کی دیانت اور ناداری پر یقین نہیں رکھتے تھے، زمیندار، اجارہ دار، قانون گو، عامل اور چودھری ناقابل اعتماد سمجھے جاتے تھے۔ کمپنی کو سب سے زیادہ فکر تھی حرص اور بے اعتمادی کی لیکن ابتدا میں پرانے حکام کو برطرف نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ہندوستانی حاکم بھی محسوس کرتے تھے کہ وہ اپنے عہدوں پر صرف اس صورت میں قائم رہ سکتے ہیں اگر وہ نئے مالکوں کو مطمئن رکھ سکیں۔ چنانچہ اپنے بڑے بڑے مطالبوں کو وصول کرنے کے لیے پہلے کمپنی نے عاملوں کو استعمال کیا۔ جنھیں ماتحتوں کا تقرر کرنے اور بڑی بڑی مالگزاری ادا کرنے پر ذمہ داروں کو مجبور کرنے کے لئے اختیار دے دیے گئے۔ 1969 میں عاملوں کی دیکھ بھال کے لئے نگراں مقرر کئے گئے اور سرکاری حکام کو حکم دیا گیا کہ وہ مالگزاری کے ٹھیکوں سے دست بردار ہوجائیں۔ لیکن تمام خرابیوں کی جڑ یعنی بڑے بڑے مطالبوں کو جوں کا توں رکھا گیا۔ جب کہ علی وردی خاں کا مجموعی مطالبہ جس میں مالگزاری اور دوسرے محاصل دونوں شامل تھے۔ 1755 میں 1,76,68,166 روپے تھا۔ اور حقیقی وصولی غالباً اس سے بھی بہت کم لیکن کمپنی نے عظیم قحط 1770-71 کے سال میں جو مطالبہ وصول کیا وہ 1,94,61,684 روپے تھا۔[1]

اس خیال کے پیش نظر کہ بنگال کی خرابیوں کی وجہ ہی ہر سال کیا جانے والا قلیل المدتی بندوبست اور مال گزاری، وصول کرنے کا طریقہ وارن ہسٹنگز نے 1772 میں پانچ سالہ

---

[1] اس قحط کے، جس میں بہت سے لوگ مرے اور بڑی تباہی ہوئی، بڑے دوررس نتائج ہوئے۔ فوراً تقریباً ایک تہائی آبادی ختم ہوگئی۔ کسانوں اور دستکاروں اور خصوصیت کے ساتھ بنکروں کی ایک بڑی تعداد موت کے گھاٹ اُتر گئی۔ اس کا امکان ہے کہ اُن میں سے پچاس فی صدی مر گئے۔ بنگال کا ایک تہائی علاقہ پھر جنگل بن گیا جہاں جنگلی جانور رہنے لگے۔ محنت کش طبقے زمین اور صنعت میں جو بیک وقت کمی ہوئی اُس کا اثر بنگال کی معیشت پر پڑنا ضروری تھا۔ پھر بھی اس تباہی کو اس امر کی اجازت نہیں دی گئی کہ وہ کمپنی کی مالگزاری میں کمی کر سکے۔

بندوبست کا فیصلہ کیا۔ چارلس گرانٹ کے مطابق ''اس خیال سے کہ مُلک میں چھپے ہوئے وسائل وجود میں آئے اور اس خیال سے بھی کہ مالگزاری کے اضافہ کو لوگ آسانی سے برداشت کرلیں گے یہ فیصلہ کیا گیا بنگال کی زمینات کو پانچ سال کے لئے ٹھیکے پر دیا جائے۔ اور ان کا زیادہ سے زیادہ معاوضہ وصول کرنے کے لیے اُن ٹھیکوں کا عام نیلام کیا گیا۔ کلکتہ کے بانیان، ساہوکار اور مہم جو سب سے زیادہ بولیاں لگانے والوں میں تھے۔''[1]

مالگزاری وصول کرنے کا طریقہ بھی بدل دیا گیا۔ عامل 1770 میں ہٹا دیے گئے تھے اور نگراں، جنھیں بعد میں کلکٹر کا نام دیا گیا تھا، دیوانوں کی مدد سے وصولی کا کام کرنے لگے تھے۔ 1773 میں کلکٹروں کی جگہ صوبائی کونسلوں نے لے لی جن کی مدد ایجنٹ کرنے لگے۔

وارن ہسٹنگز کے فیصلے نے مختلف قسم کے لگان داروں کو مختلف انداز سے متاثر کیا۔ حقیقی کھیت جوتنے والوں میں تین قسم کے کاشتکار تھے۔ (1) وہیں کے رہنے والے کسان جو اپنی زمین جوتتے تھے۔ (خود کاشت) جس کا لگان وہ زمیندار کو ادا کرتے تھے۔ (2) وہ کسان جو اپنے ایک گاؤں میں تھے اور دوسرے گاؤں کی لگان پر لی ہوئی زمین میں کھیتی کرتے تھے۔ (پائے کاشت) (3) ان کے علاوہ وہ کسان تھے جو ٹھیکے پر زمین جوتتے تھے (کھلار)۔

زمین یا تو ریاست کی ہوتی تھی جو خالصہ کہلاتی تھی۔ یا حکومت کی زیر نگرانی ہوتی تھی یا جاگیر ہوتی تھی۔ یعنی ایسی زمین جس کی مالگزاری تنخواہ یا مدد معاش کے عوض دی جاتی تھی اور جس کا کچھ فی صدی حصہ حکومت کو ادا کیا جاتا تھا۔ یا زمینداری ہوتی تھی جو موروثی جائداد تھی اور خراج ادا کرتی تھی۔ یا تعلقہ جائداد ہوتی تھی جو زمینداریوں میں سے کاٹ کر نکالی جاتی تھی اور جاگیرداروں اور زمینداروں کے ماتحت ہوتی تھی۔ آخرالذکر کی دو قسمیں ہوتی تھیں۔ اُن میں سے ایک حضوری کہلاتی تھی جو اپنی مال گزاری براہ راست مرکزی حکومت کو ادا کرتی تھی اور دوسری مذکوری کہلاتی تھی جس پر اصل زمیندار کو اختیار حاصل ہوتا تھا۔ پھر کئی قسم کی خیراتی جائدادیں ہوتی تھیں جو مذہبی اور تہذیبی مقاصد کے لئے وقف ہوتی تھیں اور لاخراج یعنی ہر قسم کے بار سے مستثنیٰ کہلاتی تھیں۔

---

[1] گرانٹ چارلس State of Society in Asia صفحہ 14

زمین کے ٹھیکے کے نظام نے اُن رشتوں میں انتشار پیدا کردیا جو حکومت، درمیانی ایجنٹ اور رعیت کے درمیان مدتوں سے چلے آرہے تھے۔ زمیندار، تعلقدار اور سٹے باز سب ٹھیکیدار بن گئے۔ جن زمینداروں نے اپنی جائدادوں کا ٹھیکہ حاصل کرلیا وہ معاہدے کی شرائط پوری نہیں کر پائے۔ اُن کے ٹھیکے سزاولوں (ایجنٹو) کے سپرد کردیے گئے۔ جو کم حیثیت لوگ تھے اور زمینداروں اور کسانوں دونوں کے ساتھ سختی سے پیش آتے تھے۔ راج شاہی کی رانی بھوانی نے اپنے ٹھیکیداروں دولال روئے اور امریت سنگھ اور پورینا کی رانی نے اپنے ٹھیکیداروں حضوری مل اور دون دت اور اُن کے ایجنٹوں کے خلاف جو شکایتیں کیں وہ اس قسم کے برے سلوک کی مثالیں ہیں۔ تشخیص مالگزاری کی بہت اونچی شرح کی بنا پر بہت سی زمینداریاں وقت پر مالگزاری ادا نہ کرسکیں اور کئی زمینداریوں کے مطالبوں میں تخفیف کی گئی۔

ٹھیکوں کی بنا پر تعلقدار نے زمینداروں سے چھٹکارا پالیا۔ واقعہ یہ ہے کہ بہت سے زمیندار خود اپنی جائدادوں کے ٹھیکیداروں کے شکمی بن گئے۔ ٹھیکے پہ دی جانے والی بھی زمینات کو انتقال کے سلسلے میں تمادی سے مستثنٰی کردیا گیا۔ اسلئے کہ حکومت اس لین دین کو ٹھیکیدار کا نجی معاملہ تصور کرتی تھی۔ چنانچہ آزاد جائدادیں ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگیں۔ اور زمین جائداد قابل فروخت شے بن گئی۔

اس صورت حال سے کمپنی کے ملازمین اور ان کے ''بانیان'' کو فائدہ ہوا۔ سلہٹ کے ٹھکیرے اور مونگیر کے بیٹ مین کی طرح کے کلکٹروں او دوسرے کلکٹروں نے خود اپنے ضلعوں میں کبھی مصنوعی ناموں سے اور کبھی اپنے ''سیاہ ایجنٹو'' کے ناموں سے جائدادوں کے ٹھیکے لئے۔

انگریزوں اور ہندوستانیوں کے لئے رشوت کا بڑا ذریعہ ٹھیکیدار بن گئے۔ بارویل نے دکھن شاہ باز پور کے نمک کے ٹھیکے کے جوڑ توڑ میں تقریباً 1,00,000 روپے بنائے۔ سرکٹ کی کمیٹی کے دوسرے اراکین نے بھی اس طرح فائدہ اٹھایا۔ ہندوستانیوں میں کانتی بابو (وارن ہسٹنگز کا ''بانیان'') کو 40,432 روپے سانتی رام کو (میڈلٹن کا دیوان) 47,000 روپے اور بھوانی متر کو (گراہم کا دیوان) 34,000 روپے دربار خرچ کے طور پر پرانی بھوانی کے پسر مستثنٰی راج شاہی کے راجہ رام کوشل سے ملے۔ اس امر کا تخمینہ لگا گیا کہ جن حکام پر بندوبست کی ذمہ داری تھی

انھیں ملنے والی مجموعی رقم 42,00,000 روپئے تک پہنچتی ہے۔[1]

بڑے مطالبے کو پورا کر سکنے کے بہانے ٹھیکیدار کمپنی کے حکام سے چھوٹ لے لیا کرتے تھے۔ وہ اُن معاہدوں سے خفیہ طور سے مستفید ہوتے تھے اور اس لئے بڑی خوشی سے چھوٹ دے دیتے تھے۔ کچھ ٹھیکیدار اس حیثیت سے کام کرتے تھے۔ لیکن بہت سے تو ایسے تھے جنھوں نے کچھ رقموں کے عوض اپنے نام دے دیے تھے۔ کچھ بانیان زمینداروں کے ضامن بن جاتے تھے اور جب کوئی زمیندار مالگزاری ادا نہیں کرتا تھا تو ضامن کو ٹھیکیدار بنا دیا جاتا تھا۔ اور زمیندار اُس کا شکمی ٹھیکیدار بن جاتا تھا۔

جہاں تک کسانوں کا تعلق تھا اُن کا جتنا بھی خیال کیا جاتا تھا یا اُن کے ساتھ جتنی بھی ہمدردی دکھائی جاتی تھی اُس کے مقابلے میں اُن کے دُکھ بہت زیادہ تھے۔ ٹھیکیدار کوئی ایسی چیز برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے جس کا اثر اُن کے منافعوں پر پڑے۔ عامل ناموں نے انھیں اختیار دیا تھا کہ وہ زمینداری کے پٹّوں کو ختم کر دیں اور نئے پٹے کر لیں اور زمیندار کو محض ایک ناکارہ حیثیت دار انسان بنا دیں جو صرف مشاہرہ حاصل کرنے کا حقدار تھا۔ قانون گو اطلاعات حاصل کرنے اور زمینات پر حکومت کا کنٹرول برقرار رکھنے کا سب سے زیادہ قابل اعتماد ذریعہ تھا جو ادائیگی اور بقایا کے حساب اور حقوق اور رسیدات و مطالبات کا ریکارڈ رکھتا تھا اور جائیداد اور اس کے انتقال کا کھاتا تیار کرتا تھا۔ نئے انتظامات کے تحت اُن کی افادیت اور ملازمت ختم ہوگئی اور زمینداروں کی جو نگہداشت وہ کرتے تھے وہ قصّہٗ پارینہ بن گئی۔ پٹواریوں پر جب قانون گویوں کی نگرانی ختم ہوگئی تو انھوں نے روپے کمانے اور کسانوں پر مظالم توڑنے کی غرض سے ٹھیکیداروں کے ایجنٹوں کے ساتھ ساز باز کرنی شروع کر دی۔ ایجنٹ اور زمینداروں کے چھوٹے موٹے حاکم اُن پر جبر وظلم کرتے تھے۔ اور حاکموں کی طرف سے اُن پر جو دباؤ پڑتا تھا۔ وہ اُس دباؤ کو کسانوں کے کندھوں پر ڈال دیا کرتے تھے۔

ٹھیکیداری کی بنا پر دیہی معیشت کی تباہی کے خطرے اور حکومت کی آمدنی کے اصل ذریعے

---

[1] وارن ہیسٹنگز نے رانی سے ایک لاکھ، اودھ کے نوابوں اور بنارس کے راجہ سے سولہ لاکھ اور پچھتر ہزار روپئے حاصل کئے اور ولسنی نارٹ نے تین لاکھ روپے لیے۔

کے ختم ہو جانے کے خوف کی بنا پر وارن ہسٹنگز نے 1776 میں ایک آئینی کمیشن مقرر کیا جس کے سپرد تحقیقات کرنے اور تدار کی اقدامات کی سفارش کرنے کا کام کیا گیا۔ اُس کی سفارش پر ٹھیکیداری کا طریقہ ختم کر دیا گیا اور زمینداری کے منصوبے کی تجدید کی گئی۔ لیکن اُس وقت تک بہت نقصان ہو چکا تھا اور زمینداری کے روایتی ادارے کی تشکیل ممکن نہیں تھی۔ اس کی بہت سی وجوہ تھیں۔

پہلی بات تو یہ تھی کہ اس ادارے کی وہ قدیم اور لازمی خصوصیت ختم ہو چکی تھی جنھوں نے اسے زندگی اور وقار عطا کیا تھا۔ اب زمیندار پر جان و مال کے تحفظ کرنے، گاؤں والوں کے حقوق کی حفاظت کرنے اور جھگڑے چکانے کی ذمہ داری نہیں تھی۔ اب وہ دیہی سماج میں اتحاد کرنے والا عنصر نہیں رہا تھا۔ اس کا کام کسانوں سے لگان وصول کرنے اور حکومت کو تشخیص شدہ مالگزاری ادا کرنے تک محدود ہوتا جا رہا تھا۔ اب گاؤں کے لوگ اسے اپنا ایسا سرپرست نہیں سمجھتے تھے جسے اُن کی فلاح و بہبود کی فکر ہو، جو اُن کی خوشیوں اور غموں میں شریک ہو، جو اُن کے میلوں اور تہواروں کا انتظام کرے اور جو اُن کی تہذیبی اور تعلیمی سرگرمیوں پر توجہ دے۔

دوسری بات یہ تھی کہ بدیسیوں کے ہاتھوں میں سیاسی طاقت آجانے کے بعد جنھوں نے ہندوستانی سماج کے بجائے بدیسی ذرائع سے اپنے اختیارات حاصل کیے تھے، اُس کی حیثیت بہت کم ہو گئی تھی۔ ٹھیکیداری کے طریقے کے رواج نے اس نظام کی بنیادیں ہلا دی تھیں۔ ٹھیکیدار اُس پہ حکم چلاتا تھا۔ اُس کے ماتحت اب نئے مالکوں کی اطاعت کرنے لگے تھے۔ تعلقدار حکومت کو براہ راست مالگزاری ادا کرتے تھے۔ تیسری بات یہ تھی کہ کمپنی کے بڑے بڑے مطالبوں نے اُس کی کمر توڑ دی تھی۔ بہت سی زمینداریاں اور تعلقداریاں جو مطالبات ادا نہ کر سکیں تقسیم ہو گئیں اور بانیان، حکام مال اور مہاجنوں کے طبقوں سے تعلق رکھنے والے ٹھیکیداروں کے ہاتھوں میں آ گئی۔ ان کی غربت و افلاس کی بنا پر اُن کی افادیت، اثر اور ساکھ ختم ہو گئی۔

اس کے علاوہ مالگزاری کے انتظامی ڈھانچے میں اکثر ہونے والی تبدیلیوں، تشخیص اور وصولی کے طریقوں اور خصوصیت کے ساتھ زمین جائداد کی طرف نئے حکمرانوں کے رویّے نے، ایک ایسا نجی معاملہ سمجھتے تھے جس کا فیصلہ عدالتیں کر سکیں، اس میں انتشار پیدا کر دیا۔ رہن، بیع اور

ہبہ روزمرہ کے معمول بن گئے اور زمین جائداد ایک ایسی شے بن گئی جس پر رسد اور مانگ کے قانون کا اطلاق ہوتا ہے۔

آخری بات یہ کہ روایتی بالائی طبقے کی زمین کی ملکیت کی اجارہ داری ختم ہوگئی۔ اب زمین کو جنگی خدمات یا علم و پاکبازی یا برکت ایزدی حاصل کرنے کے لئے تلاوت کا انعام نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اب دستاویزات ملکیت چمکتی ہوئی تلواروں سے نہیں لکھی جاتی تھیں بلکہ کھوٹے سکوں کے ذریعہ مرتب کی جاتی تھیں۔ جس زمینداری نظام کی ابتدا 1777 میں کی گئی وہ قدیم ادارہ محض عکس تھا۔ اس نظام کے تحت ٹھیکیدار ختم کردیے گئے اور جہاں تک ممکن ہوسکا زمین کا بندوبست زمینداروں کے ساتھ کیا گیا۔ انھیں نئی سندیں دی گئیں جن میں لگان داری کی شرائط درج تھیں۔ ایک شرط یہ تھی کہ بقایا کی صورت میں حکومت کے مطالبے کی وصولی کے لیے زمین کے حصے فروخت کیے جاسکتے ہیں۔ اُن میں یہ بھی کہا گیا تھا کہ بدانتظامی کی صورت میں مالگزاری وصول کرنے کے لئے حکومت سزاوال مقرر کرے گی۔ پچھلے تین سال کی اوسط وصولی کی بنیاد پر مال گزاری تشخیص کی جاتی تھی۔ چنانچہ پچھلی صورت سے زیادہ تشخیص سے زمینداروں کا پیچھا نہیں کٹا اور حکومت کی مقرر کی ہوئی تاریخوں پر مال گزاری کی قسط ادا کرنے کے لئے انھیں مجبوراً مہاجنوں پر انحصار کرنا پڑا۔ انھیں روپیہ حاصل کرنے کے لیے یا تو زمینداری کو رہن کرنا پڑتا تھا یا ٹھیکے پر دینا ہوتا تھا۔ زمینداروں کی مالی حالت خراب ہونے کے باوجود تاجر انھیں قرض دینے پر آمادہ ہوجاتے تھے اس لیے کہ ملک کے ہر حصہ میں اُن کی تجارت کم ہوگئی۔ اور روپے کو استعمال کرنے کا کوئی دوسرا ذریعہ اُن کے پاس نہیں تھا۔

1777 سے 1785 تک اُصولاً موروثی زمینداروں کو تسلیم کیا جاتا رہا اور ہر سال یہ سمجھ کر اُن کے ساتھ بندوبست کیا جاتا رہا کہ وہ اس وقت تک زمین کے مستقل مالک سمجھیں جائیں گے جب تک وہ حکومت کے ساتھ اپنے عہد و پیماں پورے کرتے رہیں۔

انتظامیہ میں وارن ہسٹنگز نے جو آخری تبدیلی کی وہ یہ تھی کہ 1781 میں صوبائی کونسلوں کو منسوخ کردیا اور کلکٹر بحال کردیے گئے۔ بندوبستوں کی نگرانی کرنے کے لئے پانچ اراکین پر مشتمل ایک مالگزاری کی کمیٹی تشکیل کی گئی جس کا صدر مقام کلکتہ تھا۔ اس کے مباحث کا فوری نتیجہ

یہ ہوا کہ تشخیص مال گزاری میں 26,00,000 روپئے کا اضافہ کر دیا گیا۔ مدت ختم ہونے کے بعد معلوم ہوا کہ حکومت کی توقعات پوری نہیں ہوئیں۔ مالگزاری کا نظام ملک کے لئے تباہی کا باعث ثابت ہو رہا تھا۔ مالگزاری کے انتہائی بڑے مطالبے، جن پر ہر سال نظر ثانی کی جاتی تھی، اور یہ سخت شرط کہ وقت پر روپیہ ادا کیا جائے زمینداروں کو تباہ کر رہے تھے اور اُن کی زمینداریوں پر قرض کا نا قابل برداشت بوجھ بڑھتا جاتا تھا۔

کارنواس۔ بندوبست استمراری اور دوسری اصلاحات

اس الجھے ہوئے نازک مسئلے کو حل کرنے کی ذمہ داری کارنواس پر ڈالی گئی۔ اُس نے اصلاحات کا بیڑا اٹھایا تا کہ معیشت اور تجارت کی توسیع کر کے کمپنی کی ساکھ بحال کی جائے اور ملازمین کی دیانت داری اور کارکردگی کی بنیاد پر ایک با قاعدہ انتظامیہ کا نظام قائم کیا جائے۔ انگلستان کے مفادات کا تحفظ کرتے ہوئے وہ برطانوی حکومت کی ہندوستانی رعایا کے لئے ایک پاک وصاف انتظامیہ مہیا کرنا چاہتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ برطانوی حکومت کا وقار واستحکام اُسی حد تک فوجوں پر منحصر ہے جس حد تک سول ملازمین کی کارکردگی۔ اُس کی کارروائیوں کا اثر سرگرمیوں کے تین اہم شعبوں پر پڑا یعنی مال گزاری، عام انتظام، اور تجارت۔ جن وجود کی بنا پر کارنواس نے بندوبست استمراری نافذ کرنے کا فیصلہ کیا وہ حفاظتی بھی تھیں اور سیاسی بھی۔ ایک معاشی وجہ یہ تھی کہ کمپنی کی تجارتی سرگرمیوں کا انحصار تھا زمین سے ہونے والی یقینی آمدنی پر اس لئے کہ اُس طرح مال خریدنا ممکن نہیں تھا جیسے پہلے باہر سے آنے والے بلین اور تجارتی مال کی بنیاد پر خریدا جاتا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہندوستان سے انگلستان کو فاضل آمدنی بھیجنے کا واحد ذریعہ تھا، برآمدات، سرجان شور نے کہا تھا کمپنی تاجر بھی ہے اور اُس ملک کی حکمراں بھی۔ اوّل الذکر حیثیت سے وہ پوری تجارت اپنے ہاتھ میں لیتی ہے اور آخر الذکر حیثیت سے ملک کی آمدنی اپنے مصرف میں لاتی ہے۔ یورپ کو آمدنی ملک کی اُن اشیا کی شکل میں بھیجی جاتی ہے جنھیں وہ خریدتی ہے۔'' [1]

لیکن آمدنی کو یقینی بنانے کے لئے ضروری تھا کہ تشخیص مالگزاری اور وصولی کے طریقے میں

---

[1] شور، سرجان رو داد، 18 جون 1789، دیکھئے پانچویں رپورٹ تدوین از ڈبلو، ترمنگز (1917) جلد دوم، صفحہ 32

بار بار ہونے والی تبدیلیاں روکی جائیں۔یعنی دوسرے الفاظ میں زمین کی ملکیت اور اُس کی ذمہ داریوں کا تعین کیا جائے۔ مال گزاری کے نظام میں کیے جانے والے تجربوں اور کمپنی اور نجی تاجروں کی تجارت میں ہونے والی تبدیلیوں نے بنگال کو بہت نقصان پہنچایا تھا۔ بنگال کو سکھ چین کی بڑی ضرورت تھی۔کارنواس کو اس کا یقین تھا کہ بنگال کی تجارت کو توسیع دینے سے پہلے وہاں کی زراعت کو ترقی دینی چاہئے۔اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے دو باتیں ضروری تھیں۔پہلی بات یہ تھی کہ ہندوستانیوں کے ایک ایسے نئے طبقے کی تلاش کی جائے جو اُن زمینوں کو حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتے ہوں جن سے پرانے زمیندار بے دخل کیے جا چکے تھے۔اور دوسری یہ کہ اس قسم کے عوامل اُن کے سامنے رکھے جائیں جو زمینوں میں روپیہ لگانے پر انھیں آمادہ کردیں۔ نیا طبقہ پہلے سے ہی موجود تھا۔ یہ طبقہ ان تاجروں پر مشتمل تھا جنھوں نے تجارت سٹے اور دوسرے طریقوں سے خاص سرمایہ اکٹھا کرلیا تھا اور ہندوستانی تجارت کی کساد بازاری کی بنا پر وہ روپیہ منافع بخش انداز سے نہیں لگا سکتے تھے۔بندوبست استمراری نے روپیہ لگانے کے لئے نئے راستے کھول دیے۔کارنواس نے ڈائرکٹروں کو لکھا تھا کہ حکومت چونکہ اپنے قرضوں کا چکوتا کررہی ہے اس لئے اس کا خیال ہے کہ حاصل ہونے والے سرمائے کو استعمال کرنے کے دوسرے ذرائع موجود نہ ہونے کی بنا پر حق ملکیت کے تحفظ کا اعلان ہوجانے کے بعد وہ روپیہ زمین جائداد خریدنے پر صرف کیا جائے گا۔[1] اُسے یہ بھی توقع تھی کہ جن لوگوں کو یہ معلوم ہوگا کہ مال گزاری کا ایسا تعین ہوگیا ہے جس میں آئندہ کوئی تبدیلی نہیں کی جائے گی تو نقد روپیہ نہ صرف زمین خریدنے پر خرچ کیا جائے گا بلکہ زراعت کی ترقی کا باعث بھی بنے گا جس کی وجہ سے پیداوار بڑھے گی اور برطانوی تجارت کو فائدہ ہوگا۔

زمینداروں کے ایسے طبقے کی تشکیل کے سیاسی فوائد بھی بہت تھے جن کو زمین پر مطلق حق ملکیت حاصل ہو۔توقع کی جاتی تھی کہ دولت مند ہندوستانیوں کا ایک ایسا طبقہ معرض وجود میں آجائے گا جو برطانوی حکمرانوں کا وفادار ہوگا اور سیاسی عزائم سے مبرّا، کارنواس کو امید تھی۔جب

[1] کارنوس بنام کورٹ آف ڈائرکٹرس 6 مارچ 1792

زمینداروں کے قبضے میں منافع بخش ذمہ داریاں ہوں گی جب تاجر اور صنعت کار منافع بخش تجارت میں مصروف ہوں گے اور جب ہر قسم کے لوگ آزادی کے ساتھ اپنے اپنے مذہبی رسوم ادا کر سکیں گے تو مدتوں سے کچلی ہوئی ہندوؤں کی تمام نسلیں اور اُن کو کچلنے والے مسلمان اس حکومت کی تبدیلی کو یکساں طور سے پسند کریں گے جس کے تحت انھوں نے یہ بے حساب فوائد حاصل کیے اور آئندہ بھی حاصل کرنے کی توقع رکھتے ہیں۔''[1]

لیکن اس کے نتائج توقع کے مطابق نہیں ہوئے۔ اُس کی کئی وجہ تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ کمپنی کو چونکہ زیادہ مال گزاری حاصل کرنے کی ضرورت تھی اس لئے کارنواس کو بہت زیادہ مالگزاری تشخیص کرنی پڑی۔[2] دوسری بات یہ کہ اُس نے وصولی کے جو طریقے مقرر کیے وہ سخت اور ظالمانہ تھے تیسری بات یہ کہ اُس نے بڑے بھائی کے جن کا قاعدہ ختم کر دیا اور جائیداد کے تیزی کے ساتھ ٹکڑے نجرے ہونے لگے۔ آخری بات یہ کہ حق ملکیت کو مطلق بنا دینے اور زمینداروں کو کسانوں کی املاک کی ترقی اور فروخت کے اختیارات عطا کرنے کی بنا پر زمین پر حق ملکیت کی لازمی نوعیت بدل گئی۔

کارنواس نے جو انتظامی اقدامات کیے ان کے پیچھے ہندوستانیوں پر مکمل عدم اعتماد کا جزبہ کارفرماں تھا۔ اُس نے لکھا تھا'' حالانکہ ہماری توقع ہے کہ ہماری رعایا ہندوستان کے سب سے زیادہ خوش وخرم لوگ ہوں پھر بھی اس امر کی سفارش کسی طرح نہیں کر سکتا ہوں کہ دیسی لوگوں کو ضوابط کی تشکیل میں حصہ لینے کی اجازت دے دی جائے۔[3] جس نظام کی داغ بیل اُس نے ڈالی اُس میں تمام معاشی اور انتظامی پالیسیاں بنانے کا کام انگریزوں کے سپرد کیا گیا تھا اور اُن کے عمل درآمد کے اختیارات بھی انہی کو سونپے گئے تھے۔ اُس نے کورٹ آف ڈائرکٹرس سے کہا تھا۔'' اس بات کو تسلیم کیا جانا چاہئے کہ یوروپیوں کی ایک بڑی اور منظم جماعت کے بغیر ان

---

[1] 11 فروری 1893 کی روداد، مذکورہ اسپنیال 'In Bengal Cornawas 'A صفحات 73-172

[2] 1720 مالگزاری کا مطالبہ 1, 40,11,339 1790 مالگزاری کا مطالبہ 2, 59,28,208، 1793 مالگزاری کا مطالبہ 2, 28,00,989

[3] اسپنیال A محولہ بالا، صفحہ 172۔ 11 فروری 1793 کی روداد

بیش بہا علاقوں پر ہمارا اقتدار غیر محفوظ رہے گا۔"[1] اس پالیسی کا اطلاق فوج اور سول خدمات دونوں پر کیا گیا۔

بنگال کی فتح کے بعد زیادہ تر اعلیٰ عہدوں پر ایسٹ انڈیا کمپنی کے یورپین ملازموں کو منتقل کر دیا گیا۔ 1760 اور 1786 کے درمیانی عبوری دور میں جو عہدے ہندوستانیوں کے پاس تھے۔ رفتہ رفتہ وہ بھی چھین لیے گئے بالآخر کارنواس نے ان عہدوں کے بلکہ کئی ماتحت عہدوں کے بھی دروازے ہندوستانیوں کے لیے بند کر دیے۔

کارنواس کے نظام کی بنیاد مفروضوں پر قائم تھی۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اس کا خیال تھا کہ ایشیائی لوگوں پر انگریزوں کو برتری حاصل ہے اور اس کے نتیجہ کے طور پر وہ سمجھتا تھا کہ ہر چیز کو زیادہ سے زیادہ انگریزی رنگ دیا جائے۔ اُسے یہ بھی خطرہ تھا کہ ذمہ دار عہدوں پر ہندوستانیوں کا تقرر کرنے کی بنا پر سلطنت کو ہمیشہ خطرہ لاحق رہے گا۔ اُس نے اعلان کیا تھا۔ "ان اہم ذمہ داریوں کے لئے بنگال کے لوگوں پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔"[2]

لیکن دوسری وجہ سے قطع نظر معاشی بنیاد پر بھی یہ ممکن نہ تھا کہ ماتحت عہدوں پر یوروپینوں کا تقرر کیا جا سکے۔ انگریزوں نے جس قسم کا انتظام قائم کیا تھا اُس میں عدالت اور پولیس کے فرائض اور دوسرے کام زمینداروں سے سرکاری ملازمین کو منتقل کر دیے گئے تھے۔ جسکی وجہ سے انتظامیہ کے ماتحت شعبوں یعنی شعبۂ مال، عدلیہ، پولیس، تعمیرات عام وغیرہ میں اس قسم کے ملازمین کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی جیسے امین، منصف، تھانیدار، تحصیل دار وغیرہ جن کی زیادہ سے زیادہ تنخواہ 250 روپے ماہوار ہوتی تھی۔ بہت سے ہندوستانیوں کا تقرر دیوان، نائب دیوان، گماشتہ، ہیڈ محرر، سرشتہ دار، جمعدار وغیرہ کی حیثیت سے کیا گیا۔ جن کی تنخواہیں 3 روپے سے 8 روپے ماہوار سے لے کر 100 روپیہ ماہوار تک تھیں۔

ہندوستانی وکیلوں کا نیم سرکاری روزگار شروع کیا گیا جنھیں عدالتوں میں مقدمات کی پیروی کرنے کی اجازت دی گئی اور جن کی فیس حکومت نے مقرر کی۔

---

[1] ہنسٹر ڈبلیو، ویلو، لارڈ کارنواس Ruler of India Series صفحہ 89

[2] اسپنیال 'A' محولہ بالا، صفحہ 169

اس ملک کے باسیوں پر اس پالیسی کا مضر اثر پڑا۔ بالائی طبقوں کے لیے روزگار کے پرانے راستے بند ہو چکے تھے اور اعلیٰ انتظام کے طریقوں کا تجربہ حاصل کرنے اور حکومت کی وسیع پالیسیاں تشکیل کرنے کے مواقع انھیں ملتے نہیں تھے اس کی وجہ سے متوسط طبقے کا کردار اور نقطۂ نظر محدود ہو کر رہ گیا اور زمیندار قیادت کے نمو میں رکاوٹ پڑ گئی۔ اسپنیال نے کارنواس کی انتظامیہ کے متعلق لکھتے ہوئے کہا تھا ''اس لیے کارنواس کے نظام نے ان لوگوں کو ابھارنے کے بجائے جو کمپنی کی حکومت میں آگے تھے اور حقیر بنا دیا۔''[1]

تجارتی شعبوں میں جس پالیسی پر عمل کیا گیا اس کے نتائج بھی کچھ اس قسم ہوئے۔ کئی نظاموں کا تجربہ کیا گیا لیکن کوئی کلیتاً اطمینان بخش نہیں ثابت ہوا۔ دادنی تاجروں، گماشتوں اور دلالوں کی ہندوستانی ایجنسیوں کی بنا پر خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں جن کا تدارک کرنے کے لیے یورپی تاجروں پر مشتمل ایک بورڈ آف ٹریڈ قائم کیا گیا۔ پھر اس کی جگہ فیکٹریوں کے یورپی سربراہوں کو ٹھیکے دینے کا طریقہ شروع کیا گیا۔ وہ بھی کامیاب نہ ہو سکا۔ 1787 میں کارنواس نے ایجنسی کے طریقے کو رواج دیا اور دو سال بعد اسے عمومی بنا دیا۔ انگریزوں نے ایجنسی ہاؤس بنائے۔ جس میں بہت سے کمپنی کے ملازمین شامل ہوگئے۔ کچھ ملازم تو اپنے کاموں سے سبکدوش ہو گئے تا کہ ایجنسی ہاؤس کے منیجر یا ڈائرکٹر بن سکیں۔ ایجنسی ہاؤس کے لئے خاص بڑی رقمیں کمپنی کے ملازموں کی یافت میں سے آئیں۔ جنھوں نے اپنی بچت کی رقمیں اُن میں سے لگادیں۔ اُن میں ہندوستانیوں کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ اس نئے نظام کی حمایت میں کہا جاتا تھا کہ ہندوستانی ان میں روپیہ لگانا نہیں چاہتے ہیں۔ یا اُن کی مالی حالت ایسی نہیں ہے کہ وہ روپیہ لگا سکیں۔ یہ بات غلط تھی۔

جب 1788 میں کمپنی کی ملازمین کی نجی تجارت ختم کردی گئی تو 13 سو ملازمین تجارت سے محروم ہوگئے۔ ایجنسی ہاؤسوں کو اس سے فائدہ ہوا۔ اس لئے سنجیدگی سے مقابلہ کرنے والوں کا گروہ ختم ہو گیا۔

1789 میں ایجنسی ہاؤسوں کی تعداد اور اُن کی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ وہ ملک کی تجارت کو کنٹرول کرنے لگے، نیل اور شکر کی صنعت میں سرمایہ کاری کرنے لگے، سرکاری ٹھیکے حاصل کرنے

---

[1] اسپنیال 'A' محولہ بالا، صفحہ 174۔

لگے۔سرکاری سیکٹروں کا سٹّا کرنے لگے، اور بنک کاری اور بیمے کا کاروبار کرنے لگے۔انگلستان جانے والے جہازوں کے افسروں کے نجی مال کی دیکھ بھال کا کام انھوں نے سنبھال لیا، ہنڈیوں کا لین دین کرنے لگے اور بدیسی کمپنیوں کی وکالت کرنے لگے۔انھوں نے لندن میں اپنے وفاتر کھول لیے جو اُن کی بھیجی ہوئی رقموں کو وصول کرتے تھے اور اُنھیں رقمیں مہیا کرتے تھے۔ملک کی تجارت خاص طور سے اُن کی گرفت میں آگئی تھی۔

اس نئے نظام کو رواج دینے کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ کمپنی کی بدیسی تجارت سے ہندوستانی محروم ہوگئے۔گماشتے، دلال اور پائکار بے روزگار ہوگئے اور مال کی فہرستوں سے ہندوستانیوں کے نام مٹ گئے۔اُن کے لئے روزگاری کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک سو ایجنٹ بے روزگار ہوگئے جو 1789 میں ڈھاکہ میں کام کرتے تھے۔جوں جوں ایجنسی کا طریقہ فروغ پاتا گیا اور تجارت اور بنک کاری کے زیادہ تر کاموں پر کنٹرول حاصل کرتا گیا ترقی کا یہ راستہ ہندوستانیوں پر بند ہوتا گیا۔

اُبھرتے ہوئے متوسط طبقے کو اُن دشواریوں کا سامنا نہیں کرنا پڑا اس لئے کہ دوسرے یورپین تاجر اُن سے کام لیتے رہے۔اُس کی وجہ یہ تھی کہ ایجنسی ہاؤسوں کے مقابلے میں ہندوستانی ایجنٹ کم خرچ بھی تھے اور زیادہ بامروت بھی، ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ ان کی رقابت سے بھی ایجنٹوں کو فائدہ پہنچا۔

دوسرے طریقوں سے بھی ہندوستانی اپنے نقصان کی تلافی کرلیتے تھے، ایک بات تو یہ تھی کہ تجارت کا مطلق حجم اور اُس کی مالیت بڑھتی رہی۔حالانکہ ہندوستان کے برآمدات کی نوعیت بدلنے لگی۔خام ریشم حاصل کرنا برطانیہ کا ایک قومی پراجکٹ بن گیا۔ٹھیکے پر بنوائے ہوئے مال کی جگہ کپاس، خام ریشم، شکر، نیل، پٹسن اور دوسرے خام مال نے لے لی۔تیار شدہ ریشم کا انگلستان میں داخلہ ممنوع تھا اور اُس کے لیے سخت سزائیں مقرر کی گئیں تھی۔اُس کی جگہ کمپنی کی خرید میں سب سے اہم شے نیل بن گیا۔

برطانیہ کے آزاد تاجروں نے، جو بڑے پیمانے پر ہندوستانی تجارت میں حصہ لیتے تھے، ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری پر اعتراضات شروع کیے۔آزاد تاجر ہندوستانی مال زیادہ قیمتوں

پر خرید سکتے تھے۔ اس کی ذمہ یہ تھی کہ کمپنی کے مقابلہ میں وہ زیادہ آسانی کے ساتھ اپنا مال یورپ کے براعظم میں فروخت کر سکتے تھے۔ اُن کا زیادہ مال سستے بدیسی جہازوں کے ذریعہ براہ راست کوپن ہیگن، اُسٹنڈ اور لگ ہارن کی طرح کے یورپی بندرگاہوں کو بھیجا جاتا تھا۔ چنانچہ اس میں کوئی تعجب نہیں کہ 1790 کے لگ بھگ ڈھاکہ سے ہونے والے نجی برآمدات کی مالیت تھی 14 لاکھ روپئے (سکہ وقت) جب کہ کمپنی کے برآمدات کی مالیت تھی، صرف سات لاکھ روپئے۔ اس زمانے میں نجی تجارت نے بڑا فروغ پایا۔ 1781 اور 1790 کی درمیانی مدت میں ہندوستان کے برآمدات میں کمپنی کا حصہ کل کا 14 فیصدی تھا اور درآمدات میں تقریباً 18 فیصدی۔ دوسری طرف نجی برآمدات 10 فیصدی سے بڑھ کر 43 فیصدی ہو گئے۔

تجارت کے فروغ کے واقعات دلچسپ ہیں 77-1776 میں ہندوستان کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے برآمدات کی مالیت تھی 26,893 ,6 پاؤنڈ (مال، اسباب اور بلین) 86-1785 میں وہ بڑھ کر 53,482 ,12 پاؤنڈ ہوگئی۔ (مال، اسباب اور ابلین) اور 94-1793 میں 13,46,104 پاؤنڈ یورپ سے ہندوستان کو ہونے والے مجموعی برآمدات (1781 لغایات 1791) کی مالیت تھی 93,610 ,23 پاؤنڈ جس میں کمپنی کا حصہ 46,770 ,3 پاؤنڈ یا 14 فیصدی تھا۔ اُسی مدت میں ہندوستان سے آنے والے کُل مال کی قیمت فروخت تھی 31,669 ,73 پاؤنڈ جس میں سے کمپنی کا حصہ 196295 پاؤنڈ تھا یورپ سے ہندوستان کو ہونے والے مجموعی برآمدات (1781 لغایت 1791) کی مالیت تھی۔ 93,61 ,23 پاؤنڈ جس میں کمپنی کا حصہ تھا 3, 46,770 پاؤنڈ یا 14 فیصدی۔ اسی مدت میں ہندوستان سے آنے والے کُل مال کی قیمت فروخت تھی 31,669 ,73 پاؤنڈ جس میں سے کمپنی کا حصہ تھا 295 ,1,96 پاؤنڈ یا تقریباً 27 فیصدی۔[1]

بدیسیوں کی ساحلی اور بری تجارت کی ہندوستانی تاجر طبقے کے فروغ کا باعث ہوئی درآمد اور برآمد کے لئے مال میں اضافہ ہو گیا جس نے مال کی مانگ اور رسد میں اور اندرون ملک اُس کی

---

[1] ترپاٹھی، ایلش Trade and Finance in the Bengal Presidency سن 1793، 1833، 1956 صفحہ 30-29

تقسیم میں اضافہ کر دیا۔ چونکہ سرکاری حکام کے علاوہ کسی اور یورپین کو ملک میں رہنے کی اجازت نہیں تھی اس لئے زیادہ تر تجارت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آ گئی۔

تجارت کے طریقوں میں جو تبدیلی ہوئی اُسی قسم کی تبدیلی بنک کاری اور قرض کے میدانوں میں بھی ہوئی۔ کمپنی کے ابتدائی برسوں میں (1788 تک) ہندوستانی بنک کاروں اور صرافوں کا کاروبار بہت اچھا تھا۔ اس لئے کہ انگریزی تجارت کا انحصار تھا انگلستان سے لائی جانے والی جنس زر پر اور مختلف قسم کی کرنسیوں کے استعمال پر کمپنی نے بڑی کوشش کی تھی کہ مغل حکومت اُسے اپنا سکّہ ڈھالنے کی اجازت دے دے تا کہ مختلف قسم کے سکوں کی تعداد کم کی جا سکے۔ لیکن 1757 کے بعد ہی وہ سکّے ڈھالنا شروع کر سکی۔ 1757 کے بعد بلین کی درآمد بند ہونے چینی مفاد میں بنگال سے جنس زر کے نکاس، مدراس اور بمبئی پریسیڈنسیوں کے خسارے کو پورا کرنے کی خاطر دی جانی والی امداد اور برآمد کرنے کے لئے زیادہ سے زیادہ اشیا خریدنے کے کمپنی کے ملازمین کے بڑھتے ہوئے مطالبوں نے کرنسی کی ادائیگی اور گردش زر کے مسائل پیدا کر دیے۔ اُن کو حل کرنے کی کوشش میں تجربے کیے گئے۔ لیکن وہ بے سود ثابت ہوئے۔ 1786 میں سکوں کے لیے سونا استعمال کرنا شروع کیا۔ لیکن تین سال بعد اُس کو ترک کر دیا۔ ٹک سالیں بند کر دی گئیں۔ صرف ایک کو سکّے بنانے کی اجازت دی گئی۔ لیکن اُس کے بنے ہوئے سکّوں کی گردش محدود تھی اور اضلاع کو اپنے لیے کرنسی کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ ان مواقع سے صرافوں نے فائدہ اٹھایا اور کرنسی اور مبادلہ کا اجارہ حاصل کر لیا اور اضلاع میں اپنی ایجنسیاں قائم کر دیں۔ وہ ایک ایسا طبقہ بن گئے جو زمینداروں کے لئے بڑا کارآمد تھا جن کے لئے نقد لگان وصول کرنا اور وقت پر مال گزاری ادا کرنا دشوار ہو گیا کارنواس نے اُن کا اثر بھی کم کرنے کی کوشش کی۔ اس نے افراتفری کو دور کرنے کے اقدامات کیے جس نے انھیں پھلنے پھولنے کا موقع دیا تھا۔ اُس نے کئی شہروں میں ٹکسالیں کھولیں اور کرنسی کی اصلاح کو سونے اور چاندی کا تناسب سولہ اور ایک مقرر کیا گیا اور دو دھاتیت کا تجربہ کیا گیا۔ کوڑی کی جگہ جو سب سے کم قیمت کی روایتی ازنی تھی، تانبے کے پیسے کو رواج دیا گیا۔ اُس کی جزوی وجہ تھی کرنسی میں اصلاح کے خواہش اور جزوی وجہ تھی انگلستان سے اور زیادہ تانبا درآمد کرنا جس سے ظاہر ہے کہ انگلستان کے تاجروں اور جہازی کمپنیوں کو فائدہ ہوا۔

ان اصلاحات نے مقامی بنک کاروں کے کاروبار کو بڑا دھکا پہنچایا اور اُن کا زیادہ تر کاروبار ایجنسی ہاؤسوں اور جدید بنکوں کو منتقل ہو گیا جو وجود میں آ گئے تھے۔

مقامی بنک کاروں اور نئے بنکوں مثلاً بنگال بنک اور جنرل بنک کے درمیان مقابلہ برابری کا نہیں تھا۔ آخر الذکر کو حکومت کی سر پرستی اور حمایت حاصل تھی۔ وہ ہندوستانی بنکوں پر سبقت لے گئے۔ اس لئے کہ وہ کاغذ کی کرنسی کو جاری کرنے اور اُس کا انتظام کرنے کے کاموں سے واقف تھے۔ یہ طریقہ حقیقت میں یورپی طریقہ تھا اور ہندوستانی اُسے پوری طرح سمجھ نہیں پاتے تھے۔ اس کے علاوہ بدیسی اور بڑی حد تک داخلی تجارت بھی بدیسیوں کے ہاتھوں میں آ گئی تھی جس کے نتیجے میں مقامی بنکوں کا بہت سا کاروبار ختم ہو گیا۔

لیکن بنک کاری کے کاروبار کی کمی کی جزوی تلافی کمپنی کو مال مہیا کرنے کے طریقے نے کر دی۔ پلاسی کے بعد کچھ مدت تک مال خریدنے کے لئے بنگال کی آمدنی استعمال کی جاتی رہی۔ لیکن انتظامی اخراجات اور جنگ وغیرہ کے لئے روپے کی مانگ بڑھ جانے کے بعد معلوم ہوا کہ بنگال کی آمدنی اُس سب اخراجات کے لئے کافی نہیں ہے۔ اُس کے بعد کمپنی کی تجارت کے لئے قرض لینے کا طریقہ شروع کیا گیا۔ دوسرے اخراجات کے لئے بھی خزانے کے سرٹیفکیٹ اور بانڈ جاری کئے جانے لگے۔ اُس وقت جس قسم کے حالات تھے ان میں قرض صرف اونچی شرح سود پر ہی مل سکتا تھا۔ 12 فی صدی سود غیر معمولی سود نہیں سمجھا جاتا تھا۔ ان سرٹیفکیٹوں اور بانڈ پر کمیشن بنگال میں 18 فی صدی سے لے کر مدراس اور بمبئی میں 30 فی صدی تک تھا۔ اُس نے اُن ہندوستانی تاجروں کے جو بدیسی اور ساحلی تجارت اور مبادلے کے کاروبار سے محروم کر دیے گئے تھے ایک موقع فراہم کر دیا کہ وہ کمپنی کے قرضوں اور بانڈوں میں اپنا روپیہ لگائیں۔

''رپورٹ آن اکسٹرنل کامرس آف بنگال'' میں کہا گیا تھا۔ ''پہلے کا بزدل ہندو اب دور دراز کے سمندری سفر کے جواب دہ کی حیثیت سے روپیہ قرض دیتا ہے۔'' دنیا کے مختلف ملکوں میں سٹہ کرتا ہے اور بیمے کے مختلف حصوں میں نیل کی کوٹھیاں شروع کرتا ہے اور کاروبار کے تعلق سے برطانوی قوانین سے اُتنی ہی واقفیت رکھتا ہے جتنی عام طور سے یورپی تاجر رکھتے ہیں۔''[1] کارنواس کو

---

[1] ترپاٹھی محولہ بالا صفحہ 136

معلوم ہوا کہ زیادہ تر سرکاری سکورٹیاں ہندوستانی تاجروں کے ہاتھوں میں ہیں۔ چنانچہ انتظامی اور تجارتی طریقوں کی تبدیلی نے ماتحتوں کے ایک ایسے طبقے کو جنم دیا جو انتظامی اور معاشی دونوں میدانوں میں یورپین مالکوں کی خدمت کرتے تھے۔ ایسے ملازمین کا ایک خاصہ بڑا گروہ وجود میں آ گیا جو مغربی انتظامی طریقوں اور امور عامہ کے کاموں سے واقف تھے۔ وہ قوانین اور ضوابط کے نفاذ میں مدد کرتے تھے اور حکومت کے جدید اور دوروسطی کے اصولوں کے فرق سے واقف تھے۔ حکمرانوں کی تہذیب اور طور طریقے اور خود اپنے طور طریقوں کے فرق نے اُن کے ذہنوں میں قومیت اور نسل کے اختلافات کا شعور پیدا کیا۔ اُن میں سے کچھ کے پاس کافی دولت جمع ہوگئی تھی اور دوسروں نے اپنی سرکاری حیثیتوں کو استعمال کر کے غیر منقولہ جائداد حاصل کر لی یعنی کلکتہ اور دوسرے شہروں میں مکانات اور باغات اور دیہات میں زمین۔ وہ داخلی تجارت، کاروبار یا ملازمت بھی کرتے رہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوہرے فرائض ادا کرنے کے لئے کارنواس نے جو انتظامی ڈھانچہ بنایا تھا وہ بغیر کسی تبدیلیوں کے 40 سال تک جاری رہا۔ 1830 تک سپریم کونسل کی نگرانی میں بورڈ آف ٹریڈ تجارتی فرائض سرانجام دیتا رہا جس نے اضلاع میں تجارتی پریزڈنٹ مقرر کر دیے تھے۔

1813 کے بعد بھی جب ہندوستانی تجارت پر کمپنی کی اجارہ داری ختم ہوگئی تھی اور تجارت بہت کم ہوگئی تھی۔ صرف ریزڈنٹوں کی تعداد میں ترمیم کی گئی اور اُسے کم کر دیا گیا۔ عام انتظامی ڈھانچے یعنی مال گزاری، پولیس اور عدالتوں میں تھوڑی بہت تبدیلی کی گئی انتظامی اور عدالتی اختیارات کی علیحدگی میں کمی کی گئی اور کلکٹر کے اختیارات میں خاصہ اضافہ کر دیا گیا جو ضلع میں حکومت کا سب سے بڑا نمائندہ بن گیا۔ عدالت اور پولیس کے محکموں کی بھی تنظیم نو کی گئی اور اُن میں بڑی بڑی تبدیلیاں کی گئیں۔ خصوصیت کے ساتھ فوج داری کے میدان میں قانون اور نظم و نسق کے اُس ڈھانچے کے اندر کمپنی کی حکومت کام کرتی رہی اورر ملک کی معاشی اور دوسری سرگرمیاں جاری رہی۔

1793 میں کارنواس کی سبکدوشی اور 1813 میں کمپنی کے چارٹ کی تجدید کی درمیانی مدت بڑی کش مکش کا زمانہ تھا۔ یورپ میں برطانیہ عظمی کو فرانس کے ساتھ قریب قریب مسلسل جنگ کرنی

پڑی نپولین کی یورپ کی فتوحات اور براعظم کے اپنے نظام کی تشکیل نے، جس میں برطانیہ کو یورپی تجارت سے کاٹ دیا گیا تھا، ہالینڈ کی طرح کے یورپی ملکوں کو انگلستان کے خلاف کر دیا تھا۔ بعد میں ریاست ہائے متحدہ امریکہ بھی کھل کر مخالفت کرنے لگا۔ ہندوستان میں میسور کے حکمرانوں اور مرہٹہ وفاق سے جنگیں ہو رہی تھیں۔

مغرب اور مشرق میں برطانیہ کے اہم مفادات کے لیے جو خطرہ پیدا ہو رہا تھا اُس کے دو مقاصد تھے۔ یعنی برطانیہ کی سیاسی قیادت کو ختم کرنا اور مشرق کی تجارت پر اُس کی اجارہ داری کو مٹانا۔ اس زمانے کے گورنر جنرل ویلزلی، منٹو اور مارکوز آف ہسٹنگز ان مسائل کی اہمیت سے اچھی طرح واقف تھے اور انھیں جب بھی محسوس ہوا کہ کمپنی کے ڈائرکٹر معاشی وجوہ کی بنا پر سامراجی مفادات کو نظرانداز کرنے لگے تو انھوں نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے ایسے اقدامات کیے جو اُن کے مالکوں کی خواہشات کے منافی تھے۔

اس قسم کی صورت حال میں یہ بات ناگریز تھی کہ تجارتی اور سامراجی امور گڈ مڈ ہو جائے اور یہ کہ ایک تقاضے دوسرے پر اثرانداز ہوں۔ ان امور کی بنا پر ہندوستان میں کمپنی کی نوآبادیات اور مقبوضات کی معیشت میں تبدیلیاں ہوئیں جن سے ہندوستان کے لوگوں کے لیے اہم نتائج برآمد ہوئے۔

تجارت کے میدان میں کئی میلانات نمایاں ہو گئے۔ یورپ اور ہندوستان میں لڑی جانے والی جنگوں کے باوجود ہندوستان کی مجموعی تجارت یعنی داخلی، ساحلی اور بدیسی تجارت میں اشیا اور مالیت دونوں اعتبار سے اضافہ ہوتا رہا۔ انگلستان کے علاوہ کئی دوسرے یورپی ممالک بھی ہندوستان کے درآمدات و برآمدات میں ساجھی دار تھے۔ اُن میں اہم تھے فرانس، ہالینڈ، پرتگال اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ۔ برطانیہ کی پالیسی تھی یورپ کے ممالک کے بندرگاہوں سے پوری تجارت کو لندن کی طرف موڑ دیا جائے۔ اور جوں جوں جنگ میں شدت پیدا ہوتی گئی اور لڑنے والی قوموں کے شہری ہندوستانی تجارت سے کٹتے گئے برطانیہ کا حصہ بڑھتا گیا۔ یوں بھی ہوا کہ جہاں تک برطانوی حکومت کا تعلق تھا اُس میں اُس امر کا میلان پایا جاتا تھا کہ زیادہ سے زیادہ تجارت ایسٹ انڈیا کمپنی سے آزاد تاجروں کو منتقل کی جائے اور اس طرح اجارہ داری آزاد تجارت میں تبدیلی ہونے لگی۔

تجارت میں روپیہ لگانے کے طریقوں کے تعلق سے اختلافات بھی تھے۔ایسٹ انڈیا کمپنی نے پہلے تو انگلستان سے آنے والی جنس زر کے ذریعے باہر لے جانے کے لئے مال خریدنے کی کوشش کی اور 1757 کے بعد اُس کے لئے بنگال کی فاضل آمدنی استعمال کی۔لیکن جب جنگوں اور بڑھتے ہوئے انتظامی عملے کی وجہ سے فاضل آمدنی کم ہوگئی تو اسے برطانوی مال کے درآمدات کو فروخت کر کے اور قرض لے کر اس آمدنی میں اضافہ کرنا پڑا۔

کچھ برس تو ایسے آئے کہ اُسے خریدے ہوئے مال کی قیمت ادا کرنے کے لئے انگلستان سے بلین منگانا پڑا۔ چونکہ اس تمام مدت میں کمپنی کو بڑھتی ہوئی مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔اس لئے کبھی کبھی تو اس کی خرید کی مقدار دس لاکھ پاؤنڈ سالانہ سے کم ہوگئی۔جس کا اُس نے منصوبہ بنا رکھا تھا۔اُس پر قرض تیزی سے بڑھتا گیا اور سود کی اونچی شرح جو کمپنی کو مجبوراً ادا کرنی پڑتی تھی آمدنی پر ایک بڑا بار بن گئی اور مال خریدنے کے لئے حاصل کی جانے والی رقم کو اُس نے کم کر دیا۔

برطانوی کمپنی بڑی حد تک انگلستان سے آنے والے مال تجارت پر اس کے لئے انحصار کرتی تھی کہ ہندوستان سے برآمد کرنے کے لئے مال حاصل کرنے اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا انگلستان سے بلین لانے سے بچتی تھی۔لیکن دوسری بدیسی کمپنیاں اپنے خریدے ہوئے مال کی قیمت ادا کرنے کے لئے بڑی تعداد میں بلین درآمد کرتی تھیں۔ایسٹ انڈیا کمپنی زیادہ سے زیادہ ایجنسی ہاؤسوں پر انحصار کرتی تھیں۔لیکن دوسری بدیسی کمپنیاں رقمیں اور مال دونوں چیزیں حاصل کرنے کے لئے ہندوستان بنک کاروں اور تاجروں کی سرپرستی کرتی تھیں۔

برطانیہ کے نجی تاجروں کی سرگرمیوں کا مضر اثر کمپنی کی تجارت پر پڑا۔جو اُس کی اجارہ داری کے خلاف تھے۔اور مندرجہ ذیل طریقوں سے اس میدان میں اُس کے اقتدار کی بیخ کنی کر رہے تھے۔سامان حاصل کرنے کی حد تک وہ زیادہ قیمتیں دے کر کمپنی سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتے تھے اور پھر دوسرے ملکوں کے جہاز اور ترسیل زر کے ذریعے استعمال کر کے اس کی تلافی کر لیتے تھے تاکہ یورپ میں کمپنی کے مقابلے میں سستا مال فروخت کر سکیں۔کمپنی کے جہازوں کے مال کے کرائے کو کم کروانے کے لئے انھوں نے اپنے جہاز بنائے تھے۔

کمپنی کی تجارت کی تنظیم میں ہونے والی تبدیلی اور نجی تاجروں کی بڑھتی ہوئی تجارت نے ہندوستان کے تجارتی طبقے کے کاروبار کو متاثر کیا۔ برطانیہ کی بدیسی تجارت میں اُس کا حصہ کم ہوگیا اور ساحلی تجارت بڑی حد تک اُس کے ہاتھ سے نکل گئی۔ جس چیز نے اُسے زندہ رکھا وہ داخلی تجارت پر اُس کی گرفت تھی۔ اس کے علاوہ یورپی اور امریکی تاجر اُس کی سرپرستی کرتے تھے۔ برطانیہ کے قائم کردہ بنکوں اور یکساں کرنسی نے ہندوستانی بنک کاروں اور صرافوں کو متاثر کیا۔ لیکن دوسری طرف اُنھیں کمپنی کے بانڈوں اور قرضوں میں روپیہ لگانے اور بدیسی تاجروں کو روپیے قرض دینے کے مواقع ملے۔ پھر بھی اُن کی حیثیت کم ہوگئی اور وہ برطانوی اور یورپین کمپنیوں کے بچولیے، دلال اور ہرکارے بن کر رہ گئے۔ جب 1792 میں کارنواس نے تقریباً بارہ لاکھ پاؤنڈ کا کمپنی کا قرض چکا دیا تو زمین اور جائداد میں لگانے کے لیے ایک بڑی رقم اُن کے ہاتھ آگئی۔ بندوبست استمراری، جن کا اعلان 1793 میں کیا گیا تھا، اُن تاجروں اور سٹے بازوں کے لئے ایک بروقت نعمت ثابت ہوا۔

نمو کے اس مرحلے میں متوسط طبقے کی حیثیت کا اندازہ لگانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس زمانے کے ہندوستانی تجارت اور مالیات کے کچھ واقعات پر غور کرلیا جائے۔ پچھلی چوتھائی صدی (67-1766 لغایت 93-1792) کے مقابلے میں دو چارٹرایکٹوں (1793 اور 1913) کے درمیانی برسوں میں ہندوستان کے ساتھ برطانوی تجارت کا اضافہ مندرجہ ذیل اعداد سے دیکھا جاسکتا ہے۔

زمانہ 67-1766 لغایت 93-1792

انگلستان سے ہونے والی برآمدات 8.1 ملین پاؤنڈ سالانہ انگلستان میں ہونے والے درآمدات 8 .3 ملین پاؤنڈ سالانہ۔

زمانہ 94-1793 لغاسیت 10-1909

انگلستان سے ہونے والی برآمدات 235 ملین پاؤنڈ سالانہ انگلستان میں ہونے والے درآمدات 6 ملین پاؤنڈ سالانہ۔ پچھلے دور کے مقابلے میں 1793 اور 1810 کی درمیانی مدت میں تجارت تقریباً دُگنی تھی۔ پہلے دور میں ہر سال اوسطاً 27 جہاز باربرداری کے لئے استعمال کئے

جاتے تھے۔ لیکن دوسرے دور میں اُن کی تعداد بڑھ کے 49 ہوگئی تھی۔[1] صرف بنگال سے برآمدات جو 1796 میں 5. 1 بلین پاؤنڈ ہوگئے اور درآمدات اسی مدت میں 8. ملین پاؤنڈ سے بڑھ کر 15. 3 ملین پاؤنڈ ہوگئے۔[2]

کمپنی کی درآمدی اور برآمدی تجارت نجی تاجروں کے جن میں برطانوی اور دوسرے یورپین تاجر دونوں شامل تھے، مقابلے میں کیسی تھی۔ وہ 18061802 تک کے برسوں کی ذیل میں دکھائی جارہی ہے۔

ہندوستان میں ہونے والے درآمدات۔ ہندوستان سے ہونے والے برآمدات

	پاؤنڈ	پاؤنڈ
ایسٹ انڈیا کمپنی	40,23,552	46,01,224
لندن کے آزاد تاجر	23,60,653	46,01,391
دوسرے یورپین تاجر	13,54,62	14,71,771
امریکہ	30,65,287	30,27,233
برطانوی ایشیا	9,46,431	41,75,855
غیر برطانوی ایشیا	40,90,645	54,93,922
کل میزان	**1,58,40,630**	**2,21,01,396**

چنانچہ ہندوستان کے درآمدات میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا حصہ تقریباً ایک چوتھائی تھا اور ہندوستان سے ہونے والے برآمدات میں پانچویں حصے سے بھی کم۔

ان برسوں میں (1802 تا 1608) پوری دنیا کو برطانوی نوآبادیات کے برآمدات 38,34,532 پاؤنڈ سے بڑھ کر 90,99,841 پاؤنڈ ہوگئے[3] اور پوری دنیا سے نوآبادیات

---

[1] یہ اعلان ایشئے کے History of England upto 1500 کے اعداد کے ضمیمے سے لئے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ دیکھئے Report of Select Committee on East India Afforts 1830 جلد 2 صفحہ 786

[2] ملبورن Oriented Commera جلد 2 صفحات 150-51

[3] ملبورن محولہ بالا جلد 2 صفحہ 180

میں درآمدات 75,11,878 پاؤنڈ سے بڑھ کے 93,13,73 پاؤنڈ ہوگئی۔[1] 1796-97 اور 1813-14 کی درمیانی مدت میں صرف کلکتہ کی بندرگار سے ہونے والے برآمدات میں دوسوتیس فی صدی کا اور درآمدات میں تین سوتیس فی صدی اضافہ ہوگیا۔ نجی تاجروں کا کلکتہ سے لندن کو ترسیل زر 1796-97 میں ایس۔ آر۔ 5, 07,910 سے بڑھ کر 1814-15 میں 1,21,42,283 ہوگیا تھا۔[2] اُن کے درآمدات میں ایسی رفتار سے اضافہ نہیں ہوا۔ 1796-97 میں مال تجارت اور بلین کی مالیت تھی۔ ایس۔ آر۔ 50,60,53 اور 1813-14 میں تھی۔ 53,76,775 (محض مالی تجارت)۔[3]

حالانکہ اس بڑھتی ہوئی تجارت سے منافع زیادہ تر برطانوی اور دوسرے بدیسی تاجر کمار ہے تھے پھر بھی اُس سے ہندوستان کے تجارتی طبقے کو بھی فائدہ ہوا اور اُن کی تعداد اور دولت میں اضافہ ہوگیا۔ ہندوستانی تاجروں میں سے جنھوں نے حکومت کے مالی لین دین سے فائدہ اُٹھایا اور اپنا روپیہ بانڈوں اور سیکورٹیوں میں لگایا انھوں نے بڑا منافع کمایا۔ جنگوں نے کمپنی کو مجبور کردیا زیادہ شرح سود پر روپیہ قرض لے اور سود کی شرح بڑھ کے 12 فی صدی ہوگئی۔ اُس کے علاوہ منہائی کی شرح وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی تھی۔

قرضوں کے تعلق سے جب حکومت کی پالیسی بدلی تو اُس کا اثر ہندوستانی اصل کاروں پر پڑا۔ ایجنسی ہاوس کی حمایت کرنے کے لئے حکومت نے فیصلہ کیا کہ نہ صرف اصل رقم بلکہ ہندوستانی قرضوں کا سود بھی انگلستان میں حاصل کیا جاسکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرض اُن کے ہاتھوں میں آنے لگے اور اُن میں ہندوستانیوں کا حصہ کم ہونے لگا۔ پھر بھی 1801 میں ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں ایس۔ آر۔ 1, 89,45,000 کی مالیت کی دستاویزات تھیں اور یورپیوں کے پاس

---

[1] ایضاً صفحہ 152

[2] 1813-14 کے سال کے اعداد تھے۔ ایس۔ آر 3, 54,79,688 لیکن ایسا لگتا ہے کہ وہ غیر معمولی برس تھا۔ اس لئے جو اعداد دیئے گئے ہیں وہ 1814-15 کے ہیں

[3] 1833 (Select Committee Report on East India Afforts) جلد دو، صفحہ۔ 1796-99 کے اعداد بنگال کمرشیل رپورٹس 1795۔ 1801 سے لئے گئے ہیں

ایس۔آر 6,69,20,000 کی۔[1]

جس وقت کارنواس نے اپنے عہدے کا جائزہ لیا اُس وقت ہندوستانی قرض قریب قریب آٹھ ملین پاؤنڈ کا تھا۔ اُس کے بعد وہ کچھ کم ہوا۔ لیکن میسور کی جنگ کی وجہ سے پھر بڑھ گیا اور 1792 میں 9.1 ملین پاؤنڈ ہوگیا۔ جنگ ختم ہونے کے بعد وہ پھر کم ہوکر 9.7 ملین پاؤنڈ رہ گیا۔ لیکن ویلزلی کی توسیع پسندانہ پالیسی نے اُسے پھر تیزی کے ساتھ بڑھادیا۔ 1798 میں وہ گیارہ ملین پاؤنڈ سے زیادہ تھا اور 1799 میں تقریباً 13 ملین پاؤنڈ ہوگیا تھا۔ 1801 تک یہ بڑھ کر 18.5 ملین پاؤنڈ ہوگیا تھا اور 30 اپریل 1804 کو اس کی رقم تھی 27 ملین پاؤنڈ۔[2]

قرض کی کمی زیادتی کا اثر ملک کی معاشی زندگی پر پڑا۔ پہلی بڑی کمی 1792 میں ہوئی اور جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے بندوبست استمراری کا نفاذ بھی اُس وقت کیا گیا۔ اُس کے بعد اُس میں جو تبدیلیاں ہوئیں اُن کی بنا پر یا تو نئے زمینداروں کو یہ لالچ ہوئی کہ وہ زمین بیچ کر قرض میں روپیہ لگائیں جس میں زمین کے مقابلے میں زیادہ منافع تھا، یا جب قرض پر سود کی شرح کم ہوگئی تو انھوں نے قرض کا چکوتا کرکے دوبارہ روپیہ زمین میں لگایا۔ اس کارروائی نے زمین کو قابل فروخت شے بنادیا۔ یہ ایسا واقعہ تھا جو ہندوستان کی سماجی زندگی کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔

بنگال میں زمینداروں کے نئے طبقے کی ابتدا

بندوبست استمراری کے نتائج اُس کے نفاذ کے فوراً بعد کے برسوں میں ظاہر ہونے لگے۔ اٹھارھویں صدی میں زراعتی پیداواروں کی قیمتیں بڑھنے لگی تھیں۔ مثال کے طور پر اول درجے کے چاول کی قیمت پچاس سال میں (1728 تا 1776) ایک من 10 سیر فی روپیہ کے بجائے سولہ سیر فی روپے ہوگئی۔ موٹے چاول کی قیمت تین من کے بجائے 32 سیر فی روپے ہوگئی تھی۔ اور گھی کی قیمت ساڑھے دس سیر کے بجائے تین سیر ہوگئی تھی۔[3]

---

[1] ترپاٹھی 'A' Trade and Finance in the Bengal Presidency صفحہ 81

[2] 1833 (Select Committee Report on East India Afforts) جلد، صفحہ 42

[3] Select Committee of the House of Commons, 1782-83 صفحہ 15 دیکھئے۔ بی۔ بی۔ مترا۔ Middle Clases صفحہ 93

جہاں تک بنگال کا تعلق تھا 1770 کے قحط کی تباہ کاری کی تلافی کی جا چکی تھی اور 1713 سے آبادی بڑھنے لگی تھی۔ زمین اور جوتنے والے کا تناسب کسان کے خلاف جا رہا تھا۔ یہ رجحان اُس کے بعد ہمیشہ جاری رہا۔ بڑھتی ہوئی قیمتوں اور بڑھتی ہوئی آبادی کی بنا پر زمین کی قیمتیں بھی بڑھنی چاہئے تھی لیکن بڑی عجیب بات یہ ہے کہ بڑھنے کے بجائے زمین کی قیمت گری۔ 1796-97 میں زمین کی قیمت 15 سال کی خرید کے برابر تھی۔ 1796-97 میں گھٹ کے 12 سے 13 سال تک کی فروخت کے برابر ہوگئی اور 1797-98 میں اُس میں اور گراوٹ آئی اور وہ ساڑھے نو سال کی خرید کے برابر رہ گئی۔[1] اس کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ مالگزاری کی انتہائی اونچی شرح تشخیص نے زمین کو غیر منافع بخش بنا دیا تھا۔ سٹے بازوں نے زمینوں کو سستے داموں پر اُن پرانے زمینداروں سے خرید لیا جو سرکاری مالگزاری ادا کرنے کے قابل نہیں تھے اور زمینوں کو کم قیمت پر بیچنے کے لئے مجبور تھے۔

نئے خریدار بھی وقت پر حکومت کا مطالبہ ادا نہ کر سکے اور اُن کی زمین نیلام ہوگئیں۔ جو لوگ مالگزاری وقت پر ادا نہ کر سکے اُن میں سب سے بڑے زمیندار شامل تھے۔ یعنی نادیا، راج شاہی، دیناپور، بشنوپور اور کوسی جورا کے راجہ۔ کچھ زمینداریوں کی خاصی قیمتیں کم ہوگئی اور کچھ ٹکڑے ٹکڑے ہوگئیں۔

بہت زیادہ مطالبے کے خلاف عام طور سے لوگ چیخ و پکار کرتے تھے جس کی وصولی میں بڑی سختی برتی جاتی تھی۔ ابتدا میں زمینداروں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ کیا جاتا تھا، اُنھیں حراست میں لے لیا جاتا تھا اور دوسرے طریقوں سے پریشان کیا جاتا تھا۔ بعد میں مالگزاری ادا نہ کرنے کے سلسلے میں سزائے قید کا طریقہ ترک کر دیا گیا۔

1796-97 میں جو زمین فروخت کی گئی اس کی مالگزاری 14 لاکھ روپئے سے زیادہ تھی۔ اُس کے دوسرے برس جو زمین فروخت کی گئی اُس کی مالگزاری تقریباً 23 لاکھ روپئے تھی۔ اس امر کا تخمینہ لگایا گیا ہے کہ ''بنگال کی کل زمین کا ایک تہائی سے لے کر آدھا تک حصہ فروخت میں برتی

[1] گورنر جنرل بہ اجلاس کونسل کا مکتوب کورٹ (مالگزاری) کے نام 23 ستمبر 1798

جانے والی سختیوں کے ساتھ بیچ دیا گیا۔''[1] پکائن نے اپنے سفر کے دوران دیکھا کہ پرانے زمینداروں کی جگہ نئے مالکان آراضی لے رہے ہیں۔ جو تاجر، ایجنٹ اور سرکاری حکام کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔

نئے لوگوں میں مالکان آراضی کے ایجنٹ بہت دلچسپ لوگ تھے۔ ایک ضرورت کے نتیجے میں وہ ظہور میں آتے تھے۔ زمینداروں کو جب یہ محسوس ہوا کہ وہ کسانوں سے لگان آسانی کے ساتھ وصول نہیں کر سکتے ہیں لیکن سرکاری مطالبہ بہر حال ادا کرنا ہے اور قرقی اور نیلامی کا سامانا کرنا ہوگا تو انھوں نے زمینداروں کو پٹیوں میں تقسیم کر دیا اور انھیں اُن لوگوں کے ہاتھ فروخت کر دیا جنھیں مالک کی تعین کردہ مالگزاری ادا کرنی تھی۔ پٹے داروں نے انھیں اور چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں تقسیم کیا اور ٹکڑے درپٹے داروں کے ہاتھوں فروخت کر دئے۔ درپٹے داروں کے تحت اور ذیلی ایجنٹ تھے۔

اس طرح سے درمیانی لوگوں کا ایک بڑا طبقہ وجود میں آ گیا جو کلکتہ کے رہنے والے تھے۔ اس لئے کہ یہ فروخت کا کام صرف کلکتہ میں کیا جاتا تھا اور بغیر کسی اطلاع کے اور سال میں ایک سے زیادہ مرتبہ کیا جاتا تھا۔

زمینداریوں کے ٹکرے ہوتے رہے۔ سو سال کے عرصے میں بہت سی بڑی بڑی زمینداریوں کے ٹکرے ہو چکے تھے اور 1872 تک اُن کی تعداد 1,54,200 ہو گئی تھی۔[2] زمینداروں میں بہت کم تعداد ایسے دولت مند لوگوں کی تھی جن کے پاس 20,000 ایکڑ سے زیادہ زمین تھی۔ تقریباً 10 فی صدی زمیندار باحیثیت تھے لیکن تقریباً 90 فی صدی چھوٹے مالکان تھے۔

جو بات انھیں عہد وسطی کے زمینداروں سے غیر کرتی تھی وہ یہ تھی کہ انھیں زمینداریوں میں محض معاشی دلچسپی تھی۔ مالکوں کو اُن زمینوں پر مطلق حقوق حاصل تھے۔ جو اُن کے قبضے میں تھیں۔ انھوں نے کسانوں کے قریب قریب تمام حقوق ختم کر دیے تھے اور انھیں اختیار حاصل تھا

---

[1] ہنٹر، Bengal Ms records تعارف۔

[2] مشرا۔ بی۔ پی۔ محولہ بالا صفحہ 131۔

کہ عدالت میں چارہ جوئی کیے بغیر لگان وصول کرسکیں۔ اُن میں بہت سے غائب باش مالکان آراضی تھے جو گاؤں میں اپنے اور گاؤں والوں کی خوشی اور غم میں شریک ہونے کے بجائے کلکتہ کے محلوں میں آرام و آسائش کی زندگی گزارتے تھے اپنے منافعوں سے زراعت کو ترقی دینے کے بجائے وہ انھیں تجارت اور لین دین کے کاروبار میں لگاتے تھے۔ وہ انگریزوں کے رہن سہن کی نقل کرنے لگے اور انگریزی تعلیم کے حامی ہوگئے۔ جس کی وجہ سے اُن کے بیٹوں اور عزیزوں کے لئے سرکاری ملازمتوں کے دروازے کھل گئے تھے اور انگریز حکام اور تاجروں سے تعلقات بڑھانے میں آسانی پیدا ہوگئی تھیں۔ پُرانے رسم و رواج سے انھوں نے بالکل منہ موڑ لیا۔ سماج میں حرکت پیدا ہوگئی تھی۔ حیثیت کی جگہ معاہدہ لے رہا تھا۔ ہوسکتا تھا کہ زمیندار اپنی دولت صنعتیں قائم کرنے کے لئے استعمال کرتے۔ لیکن کاروباری جذبے کی کمی ایک انجانے کام میں روپیہ لگا کر اُسے خطرے میں ڈالنے کے خیال اور انگریز حکمرانوں کی پالیسیوں کی بنا پر[1]، جو اس میں مانع آئی تھیں۔ ان میں سے کوئی صنعت کاروں کا طبقہ وجود میں نہ آسکا۔

بنگال کے صوبے میں متوسط طبقے کا سب سے بڑا حصہ تھا وہاں کے زمیندار۔ وقت گزرنے کے ساتھ جب رفتہ رفتہ مالگزاری کا کچلنے والا دباؤ کم ہوا تو اُن کی فاضل آمدنی میں اضافہ ہونے لگا۔ گاؤں کی پیداوار کی قیمت مسلسل بڑھتی رہی، آبادی میں اضافہ ہوتا رہا اور زمین کی قیمت چڑھتی رہی۔ بندوبست استمراری، جو ابتدا میں انتشار پھیلانے والا اقدام تھا، اُس کے بعد استحکام کا سبب بن گیا۔

بدقسمتی سے کسانوں کے لئے اس کے نتائج خراب ثابت ہوئے اور اُن کی معاشی حالت بری طرح خراب ہوگئی۔ اس کے علاوہ برطانوی حکومت کی تادیبی پالیسی اور انگلستان میں ایسی

---

[1] ان میں سے سب سے اہم تھی۔ مالیاتی پالیسی۔ سب سے پہلے بری تجارت کے راہداروں حمل نہ صرف نئی صنعتوں کی نشوونما میں مانع آئے بلکہ موجودہ صنعتوں پر بھی بھاری ضرب 1848 کے بعد جب انگلستان نے آزاد تجارت کا طریقہ اختیار کیا تو ہندوستان کو بھی تجارت میں مداخلت کرنے پر مجبور کیا گیا۔ حالانکہ اسوقت انگلستان ایک ترقی یافتہ ملک تھا۔ اور ہندوستان غیر ترقی یافتہ ملک۔ اس قسم کی ملک دشمن اور ناقابل پالیسی کے تحت صنعت ترقی نہیں کرسکتی تھی۔

سرمایہ دارانہ صنعتوں کی نشوونما نے جن میں مشینوں کا استعمال ہوتا تھا دست کاروں اور صناّعوں اور خصوصیت کے ساتھ سوت کاتنے والوں اور بنکروں کی ایک بڑی تعداد کو بے روزگار بنا دیا۔ اُن کی وجہ سے زمین پر بوجھ بڑھ گیا اور کھیت مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔

انیسویں صدی کے اوائل میں متوسط طبقہ

1813 تک ہندوستان کے خاص خاص خدوخال نمایاں ہو چکے تھے۔ سماجی منظر پر جو چیز نمایاں تھی وہ تھی بدیسیوں کی ایک چھوٹی سی اولی گارکی جو بلا شرکت غیرے طاقت، دولت اور وقار کی مالک تھی اور حکومت کے تمام فرائض ادا کرتی تھی۔ لیکن اس بات کو ناپسند کرتی تھی کہ ملک کے باشندے طاقت یا ذمہ داری میں شریک کیے جائیں۔ حکمراں اولی گارکی ہستی، طاقت اور استحکام کا انحصار برطانوی لوگوں کی طاقت اور ہمت پر اور ہندوستان کے لوگوں کے عدم اتحاد اور سستی پر تھا۔ انگلستان میں اُن کی حیثیت کچھ سہی لیکن ہندوستان میں انگریز ایک ایسا طبقۂ اشرافیہ تھے جو دوسروں سے الگ تھلگ رہتے تھے، امن وامان بحال رکھنے میں مستعدی سے کام لیتے تھے، لیکن فطری طور سے اپنی رعایا کے مفادات کو ترقی دینے کے بجائے اپنے ملک کے مفادات کو ترقی دینے کی فکر میں رہا کرتے تھے۔ ہندوستانی سماج اُن تیزی کے ساتھ بڑھتے ہوئے لاکھوں انسانوں پر مشتمل تھا جو ہندوستان کے گاؤں میں رہتے تھے۔ اُن کا معیار زندگی حد درجہ نیچا تھا اور اُن کی زندگی کی غمناک حقیقتیں تھیں غُربت، بیماری، جہالت اور توہم پرستی۔ برطانوی حکومت میں اُن کی تعداد میں اضافہ ہوا لیکن اُن کی معاشی حالت خراب تر ہوگئی۔

بدیسی حکمرانوں اور ہندوستانی عوام کے درمیان تھا متوسط طبقہ جو مشتمل تھا زمیندار شرفا، تاجروں اور پیشہ وارانہ گروہوں پر۔ حالانکہ شروع میں وہ ایک منظم گروہ نہیں تھے۔ پھر بھی زمیندار شرفا دانش وروں یعنی آزاد پیشہ اختیار کرنے والوں اور سرکاری ملازموں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ بہت سے زمیندار بھی تجارت کرتے تھے۔ اس معنی کر وہ متوسط طبقہ تھے کہ حکمراں اولی گارکی اور ہندوستانی عوام کے درمیان اُن کی جگہ تھی۔ اس حد تک وہ ایک نیا طبقہ تھے کہ وہ سختی کے ساتھ باقاعدہ ذاتوں میں بٹے ہوئے نہیں تھے۔ حالانکہ اُن میں قدیم بالا کی طبقے کو غلبہ حاصل تھا۔ اُن میں حرکت تھی جس کی بنا پر پیشہ اور کام بدل سکتے تھے۔ شروع میں اُن کی تعداد

کم تھی۔لیکن وہ بڑھتے اور یکجا ہوتے گئے۔ ہندوستان کے مختلف حصوں میں مختلف گروہوں اور فی الجملہ اس طبقے کی طاقت یکساں نہیں تھی۔لیکن سماج پر اُن کا اثر ان کی تعداد کے تناسب سے زیادہ تھا۔اس طبقے کے اگوا دستہ تھے تعلیم یافتہ لوگ۔

VII نئے متوسط طبقے کا نمو(1813 تا 1833)

1813 اور 1833 کے چارٹرا یکٹوں کی بنا پر نجی تاجروں نے کمپنی کی اجارہ داری پر فتح حاصل کرلی۔ پہلے ایکٹ کی رو سے کمپنی ہندوستانی تجارت سے محروم ہوگئی۔اور دوسرے ایکٹ کی رو سے اُس کی تمام تجارتی سرگرمیاں ختم ہوگئیں۔

اس دوران ہندوستان کی بدیسی تجارت کی نوعیت بالکل بدل گئی تھی۔پہلی بات تو یہ تھی کہ اس کے دروازے سب کے لئے کھل جانے کی وجہ سے اس کا حجم اور مالیت بہت بڑھ گئی تھی۔دوسری تبدیلی یہ ہوئی کہ سوتی کپڑے اور ریشم کی مصنوعات برآمد کرنے کی بجائے اب ہندوستان خام مال اور زرعی پیداواریں برآمد کرنے لگا۔1800-1799 میں ہندوستان نے 6,587 من کپاس برآمد کی تھی۔لیکن 30-1829 میں اس کی مقدار بڑھ کے 1,34,933 من ہوگئی اس طرح 1800-1799 میں 35,509 من نیل باہر بھیجا گیا تھا۔لیکن 30-1829 میں یہ مقدار بڑھ کے 35,399 ,1 ہوئی اسی کے ساتھ ہندوستان میں کپڑے کی درآمد جو 1815 میں 18,308 گز تھی۔1831 میں بڑھ کے 5,21,19,844 گز ہوگئی۔تجارت کی ساخت میں جب تبدیلی ہوئی تو ہندوستانی بچولیوں کے کاموں میں بھی تبدیلی ہوئی انھوں نے بدیسی تجارت میں اپنا حصہ کھو دیا جو پوری کی پوری یورپیوں کے ہاتھوں میں چلی گئی۔

اس قسم کی دشواریوں کا سامنا ہندوستانی بینک کاروں کو بھی کرنا پڑا۔یورپین بنکوں نے، جو داخلی تجارت میں روپیہ لگانے کے غرض سے قائم کئے گئے تھے۔[1]

اُس نے مخصوص میدان تک اپنی سرگرمیاں محدود رکھنے سے انکار کردیا ہے۔اپنے منافع

[1] بنگال بنک کا قیام 1784 میں عمل میں آیا۔اور جنرل بنک نے 1781 میں کاروبار شروع کیا۔

بڑھانے کی غرض سے انھوں نے داخلی تجارت میں روپیہ لگانے کے ساتھ ترسیل زر کے میدان میں مقامی بنک کاروں کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔ شروع میں اُن کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکیں اور 1791 میں کارنواس اور اُس کے بورڈ نے مقامی اداروں کی موجودگی میں یورپین بنکوں کی افادیت پر شبہ ظاہر کیا۔[1] لیکن دونوں میں مقابلہ برابری کا نہیں تھا۔ یورپین بنکوں کو ریاست کی سرپرستی حاصل تھی اور اُن کے پاس سرمایہ بھی بہت زیادہ تھا۔ بحران کی صورت میں حکومت اُن کی مدد کرتی تھی۔ مثال کے طور پر 1791 میں جب بنک کاری کے کاروبار کی عام ناکامی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا حکومت نے انھیں قرض دیے۔ اب انھیں بدیسی تاجروں کی سرپرستی بھی حاصل ہونے لگی تھی جو ہندوستانی بنک کاروں کے بجائے اُن کے ساتھ کاروبار کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1813 تک یورپین بنک نہ صرف بدیسی تجارت میں پوری طرح جم گئے تھے بلکہ داخلی تجارت میں روپیہ لگا کر ترسیل زر کر کے اور سرکاری قرضوں کی حمایت کر کے اپنی تجارتی سرگرمیوں میں اضافہ کرنے لگے۔ اس دوران ہندوستانی بنک کاروں کی سرگرمیاں کم ہوتی گئیں۔ کرنسی کی اصلاح نے ہندوستانی بنک کاروں پر آخری ضرب لگائی۔ 1815 میں کمپنی نے چاندی کا روپیہ بنانا شروع کیا اور 1835 تک یہ معیاری سکہ تمام برطانوی مقبوضات میں رائج ہو گیا۔ مبادلہ زر، نجی ٹکسالوں اور مختلف قسم کے سکّوں پر بٹا لینے کے دن ختم ہو گئے اور صرافوں کے ہاتھوں سے کام نکل گئے۔ کچھ برس پہلے تک ہندوستانی بنک کار کمپنی کے قرضوں میں روپیہ لگا کر منافع کماتے تھے۔ مثال کے طور پر 91-1790 کی جنگ میسور اور 03-1802 کی جنگ مرہٹہ کے دوران انھوں نے سرکاری کاغذ خریدے تھے اور کمپنی کے سب سے بڑے لین دار بن گئے تھے۔ لیکن 1813 کے بعد اگرچہ 16-1815 اور 29-1828 کی درمیانی مدت میں اگرچہ 17.3 ملین پاؤنڈ کا اضافہ ہوا مگر اُس میں ہندوستانیوں کا حصہ بہت کم ہو گیا۔

ان تبدیلیوں کا مضر اثر تجارتی اور مالیاتی طبقوں پر پڑا۔ اُن میں کچھ نے مجبوراً زرعی پیداواروں کی تجارت شروع کر دی اور دوسرے گاؤں میں لین دین کا کاروبار کرنے لگے۔ لیکن کچھ نے برطانوی مقبوضات کے باہر کے ہندوستانی علاقوں میں تجارت وصنعت شروع کر کے یا

---

[1] سنہا، محولہ بالا صفحہ 134

زمینات میں اپنا روپیہ لگا کے خود کو بچا لیا۔[1]

تجارت میں نئے نئے مواقع سامنے آنے لگے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ تجارت کی آزادی کے ساتھ اُس کا حجم بڑھ گیا تھا۔ مثال کے طور پر صرف کلکتہ کے درآمدات جو 14-1813 میں ایک کروڑ پچیس لاکھ معیاری روپے کے تھے 29-1828 میں بڑھ کے 3 کروڑ معیاری روپے کے بقدر ہو گئے۔ سوتی کپڑے کے درآمدات جو 1814 میں 1,09,480 پاؤنڈ کے بقدر تھے 1828 میں 16,21,650 پاؤنڈ ہو گئے۔

اس کے علاوہ اور اشیا بھی درآمد کی جاتی تھیں۔ مثلاً بیر اور شرابیں، لوہے کی سلاخیں اور بولٹ، مٹی کے برتن، شیشہ، چمڑا، گھوڑے کا ساز، مشینیں، لوہے کے برتن، چھری، کانٹے، دوائیں، جستہ کے برتن، بندوقیں اور پستول۔[2]

حالانکہ درآمد کی تھوک تجارت پر یورپیوں کی اجارہ داری تھی لیکن اندرون ملک ان اشیا کی تقسیم کا کام زیادہ تر ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں تھا۔ بدیسی تجارت سے اُن کی بے دخلی کی اس سے کچھ تلافی ہوگئی اور پریسیڈنسی ٹاؤن کے تاجروں اور اندرون ملک کے کاروباری طبقے کو اس سے فائدہ ہوا۔

کچھ شعبوں میں ہونے والے نقصانات کے باوجود وہ طبقہ مجموعی اعتبار سے خوش حال تھا جو تجارت اور کاروبار کر رہا تھا۔

زمین رکھنے والا متوسط طبقہ بھی اس دوران بڑھتا رہا۔ مالگزاری کے ناقابل برداشت بوجھ کی بنا پر زمینداروں کا پرانا طبقہ بے دخل کیا جا چکا تھا اور اُن کی جگہ تاجروں، سرکاری ملازموں، بانیانوں اور گماشتوں نے لے لی تھی۔ یہ لوگ شہری تھے اور اُن کے مفادات اور نقطۂ نظر بھی شہری تھے۔ اُن کے لیے زمین ایک پیشے کے بجائے منافع حاصل کرنے کا ذریعہ تھی۔ خوش قسمتی سے جلد زرعی حالات بہتر ہونے لگے۔ 1820 کے لگ بھگ زمین کی قیمت بڑھنے لگی اور 1821 کے

---

[1] بدڈ آر۔ ایم۔ سلکٹ کمپنی کے سامنے شہادت، ہاؤس آف کامنز Outer Territories Report from Select Committee صفحہ 32

[2] سلکٹ کمپنی (1833) شہادت، جلد دوم، مسٹر کرافورڈ کی شہادت، صفحہ 511

ضابطوں نے صورت حال کو اور بہتر بنا دیا۔ مالگزاری ادا نہ کرنے کی صورتوں میں زمین کی فروخت کا رواج کم ہونے لگا۔ لیکن لگان داریوں میں بھی اضافہ ہوگیا جن کی وجہ سے بچولیوں کی تعداد بہت بڑھ گئی جو خود بھی نئے زمینداروں کی طرح شہر کے رہنے والے تھے۔

لاخراج (لگان معاف) زمینات پر دوبارہ قبضہ ہو جانے اور شہری خریداروں کے قبضے میں آجانے کی بنا پر بہت سے عالموں اور مذہبی رہنماؤں کی گذر بسر کا ذریعہ تھیں۔ زمین رکھنے والے طبقے کی طاقت میں اضافہ ہوگیا۔ حالانکہ اس سے اُن لوگوں کو بڑی تکلیف اور دکھوں میں مبتلا کر دیا جو مذہب اور علم کی نمائندگی کرتے تھے۔ اس کا مضر اثر روایتی تعلیم اور اخلاق پر پڑا۔

بنگال کے دیہی علاقے میں جو تبدیلی ہوئی وہ اُس تک محدود نہیں رہی۔ اڑیسہ کے پڑوسی صوبے پر بھی اسی کا اثر پڑا جو اس وقت بنگال کا حصہ تھا۔ اڑیسہ میں زمین کلکتہ کے تاجروں نے خرید لیں، اور صوبے کے زیر کاشت علاقے کا بڑا حصہ غیر ذمہ داروں کے ہاتھ آ گیا جن کو محض اُن سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنے سے دلچسپی تھی۔[1]

چنانچہ زرعی سماج کی ساخت میں بڑی تبدیلی ہو رہی تھی، فرین آف انڈیا نے 1839 میں اس کے متعلق لکھا تھا ''دیسی کلکٹر نہ صرف علاقے کا مالک بن بیٹھا، بلکہ بار بار اس کو تبدیل کیا گیا ہے، یہاں تک کہ دیہاتی آبادی کے بالائی اور زیریں طبقوں کا ہر رشتہ اگر ٹوٹا نہیں ہو تو ڈھیلہ ڈھالا ضرور ہو گیا ہے۔ چھوٹا مالک آراضی اپنے حقوق، اپنی بے وقوفی اور اپنی حساس ازادی کے ساتھ اب صفحہ ہستی سے مٹ چکا ہے۔ اب صرف بڑے زمیندار اور یتیم غلام کسان باقی رہ گئے ہیں۔''[2]

مدراس اور بمبئی میں دیہاتی سرمایہ داروں کی ابتدا

رعیت داری بندوبست کے مضبوط نظام کی بنا پر مدراس اور بمبئی کی پریسیڈنسی میں زمینداروں کا طبقہ وجود میں نہیں آسکا لیکن ان علاقوں میں بچولیوں کا ایک نیا طبقہ ظاہر ہوا۔ یہاں بندوبستوں میں زمین کو چھوٹے چھوٹے کسانوں میں بانٹ دیا گیا تھا جو اُسے سدھارنے

---

[1] فیس کمیشن 1867، بنگال، بہار اور اُڑیسہ کے متعلق رپورٹ پیرا گراف 48

[2] دی فرینڈ آف انڈیا، 17 جنوری 1829 صفحہ 34

کے لئے وسائل اور موسمی حالات کی بنا پر نمودار ہونے والے حالات کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے۔ضرورت کے وقت قرض دینے والوں کی موجودگی ناگریز تھی اور بمبئی کے دکن کے اضلاع کے گاؤں میں قرض دینے والا مارواڑی آ گیا۔ مدراس میں اس ضرورت کو قرض دینے والے برہمنوں نے پورا کیا۔

چنانچہ دیہاتی سرمایہ داروں کا ایک طبقہ وجود میں آ گیا۔ جو زمینداروں، مالکان اراضی اور لین دین کا کاروبار کرنے والوں پر مشتمل تھا۔ وہ کسانوں کی ضرورتوں سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ اس طبقے نے انگریزی تعلیم کی مانگ کو بڑھا دیا۔جس کی وجہ سے منافع بخش روزگار کے راستے کھل جاتے تھے۔ایلن برو نے کہا تھا۔انگریزی کے معنی ہیں روپیہ۔

VIII 1833 کا چارٹر ایکٹ اور متوسط طبقے کا فروغ

1833 کے چارٹر ایکٹ کے تحت ایسٹ انڈیا کمپنی کی کاروباری سرگرمیاں ختم کر دی گئیں۔ ہندوستان میں برطانوی مقبوضات کا انتظام کرنے کے لئے اب اُسے برطانوی تاج کا ایجنٹ بنا دیا گیا۔لیکن اس تبدیلی کا نہ انتظام کی نوعیت پر کوئی اثر پڑا اور نہ ہندوستانی سماج کی ساخت پر۔ تبدیلی کے رجحانات تو وہی رہے۔لیکن اُن کی رفتار بڑھ گئی۔سماجی تبدیلی کی بنیاد 1833 تک مستحکم ہو چکی تھی لیکن بڑھتی ہوئی تجارت اور باغات، ریلوں اور دوسرے ہندوستانی کاموں میں برطانوی سرمائے کی اصل کامیابی کے نتیجے میں اور روز وسیع تر ہوتے نظم ونسق کے مطالبوں نے اُسے اور ترقی دی۔

اُن برسوں میں ہندوستان کی بدیسی تجارت میں بڑا اضافہ ہو گیا۔ ہندوستان نے انگلستان کو ہونے والے برآمدات کی مالیت جو 1840 میں 12.60 ملین پاؤنڈ تھی 1860 میں بڑھ کر 27.96 ملین پاؤنڈ ہو گئی اور انگلستان سے ہندوستان میں ہونے والے درآمدات کی مالیت اسی مدت میں 5.832ن پاؤنڈ سے بڑھ کے 24.28 ملین پاؤنڈ ہو گئی۔ ہندوستان سے ہونے والے برآمدات میں کپاس کی مالیت تھی 5.64 ملین پاؤنڈ یعنی کل برآمدات کا چوتھا حصہ، افیم 9.05 ملین یا تیسرا حصہ اور غلہ 3.59 ملین یا تقریباً آٹھواں حصہ۔ اس تجارت میں

ہندوستانیوں کا راست حصہ کم ضرور تھا۔ لیکن ایسا بھی نہیں کہ اُسے نظر انداز کیا جاسکے۔ کچھ ہندوستانی ازخود یا یورپی برآمد کنندا گان کے ذیلی ایجنٹوں کی حیثیت سے زرعی پیداوار برآمد کرتے تھے۔ اس تجارات کا اہم حصہ تھی افیم جس میں ان کا بڑا حصہ تھا۔ 7 دسمبر 1846 سے 12 جولائی 1847 تک کے مندرجہ ذیل اعداد اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

یوروپیوں اور امریکنوں نے	5,715
بنگالیوں نے لیکن غالباً یورپیوں کے لئے بنگال	5,150
بنگالیوں نے غالباً اپنے حساب میں	1,505
مارواڑیوں، مغلوں اور پارسیوں نے	7,94
یہودیوں نے افیم کی پٹیاں خریدیں:	2,175
کُل تعداد......	**21,639**

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مارواڑیوں، مغلوں اور پارسیوں کے ہاتھوں میں تقریباً کل کی ایک تہائی تجارت تھی۔ مارواڑیوں، مغلوں اور پارسیوں کے بعد اس تجارت میں بنگالیوں کا نمبر تھا۔[1]

برطانوی مال کے بڑھتے ہوئے درآمدات نے تقسیم کے ذرائع کو ضروری بنادیا تھا۔ پریسیڈنسی شہروں اور بڑی بڑی چھاؤنیوں میں جہاں یورپین خریدار پائے جاتے تھے۔ انگریزی مال کا اسٹاک رکھنے والے زیادہ یورپین تھے۔ بمبئی میں پارسیوں اور گجراتیوں سے اور کلکتہ میں پارسیوں اور بنگالیوں نے اس تجارت میں تھوڑا بہت حصہ پایا تھا۔ لیکن اندرون ملک مالی تجارت کی تقسیم کا کام ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں تھا۔ اُن ہندوستانی تاجروں کی سماجی حیثیت جلد بڑھ گئی۔ جنھوں نے اس نئے کاربار میں روپیہ لگایا تھا اور ایم۔ برڈ نے شمالی مغربی صوبجات کے کاروباری طبقے کی دولت کی تصدیق مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے۔

(1) شمالی مغربی صوبجات کے حصوں میں ہندوستانیوں نے بڑا سرمایہ جمع کرلیا ہے۔ وہ کئی اشیا کا سٹّا کرتے ہیں۔ مرزاپور اپنی دولت کے لئے بدنام ہے۔ اور اسی طرح بنارس بھی بدنام

---

[1] ''وی فرینڈ آف انڈیا'' 29 جولائی 1847، صفحہ 467

ہے۔ جہاں تک آگرے کا تعلق ہے میں نے دولت کی اس سے بڑی علامت اور شہر کی خوشحالی کہیں نہیں دیکھی جیسی آگرے میں نظر آئی۔ لیکن کہیں بھی وہ لوگ اپنی دولت کا کوئی حصہ مصنوعات کے لئے استعمال نہیں کرتے ہیں۔'' مزید سوال کے جواب میں مسٹر برڈ نے بنارس کے موتی رام کے خاندان اور لکھنؤ کے شاہوں کا ذکر کیا جن میں سے ہر ایک کے پاس چالیس لاکھ پاؤنڈ سے زیادہ ہیں۔[1]

ہندوستانیوں نے یورپین تجارتی کمپنیوں اور بنکوں میں بھی تھوڑا سا حصہ کر لیا۔ مثال کے طور پر مسٹر لانگرویل کلارک کے ساتھ دوارکا ناتھ ٹیگور بھی یونین بنک کا ڈائرکٹر بن گیا تھا۔ اسی طرح کلکتہ کے یورپین اور ہندوستانی تاجروں نے 1840 میں ایسٹ انڈیا نیوی گیشن کمپنی لندن کے صدر مسٹر۔ ٹی۔ اے کورس کو دعوت دی تھی کہ ہندوستان اور انگلستان کے درمیان سمندری سفر کی خاطر ہندوستان میں ایک جہاز کمپنی بنائیں۔[2]

1833 تک انگلستان صنعتی اعتبار سے دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ ملک بن چکا تھا۔ صنعتی انقلاب جو دوسرے ملکوں سے پہلے انگلستان میں آیا تھا، نپولین کے خلاف جنگوں میں اُس کی کامیابی کی ایک بڑی وجہ تھی۔ اس نے پوری دنیا میں سلطنت کو پھیلانے کے لئے عوامل پیدا کر دیے تھے اور انگلستان کو اتنا دولت مند بنا دیا تھا کہ وہ تمام برّاعظموں میں اپنا سرمایہ لگا سکتا تھا۔ مصنوعات اور سرمائے کی برآمد کا دور شروع ہو چکا تھا۔

یورپینوں کی صنعتی سرگرمیوں کی نمو

اٹھارھویں صدی کے آخری ربع ہی میں برطانوی سرمایہ ہندوستان کے مصنوعات کی صنعت میں داخل ہو چکا تھا۔ مثال کے طور پر جب انگلستان اور یورپ کی دوسری منڈیوں میں نیل کی مانگ بڑھی تو 1779 میں اُس کی پیداوار برطانوی سرمائے سے شروع کی گئی۔ 1780 اور 1802 کی درمیانی مدت میں کمپنی نے نیل کی خرید پر بڑی بڑی رقمیں خرچ کیں اور دس لاکھ پاؤنڈ

---

[1] 1853 Fourth Report from the Select Committee on Indian Territory صفحات 43-42

[2] دی انگلش۔ اینڈ ملٹری گزٹ، 27 اگست 1840

پیشگی ادا کردیئے۔[1] اس کے بعد سوتی کپڑا بنانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن وہ کچھ ہی دن بعد ختم کردی گئی۔[2] اس کے بعد یورپین مشینوں اور یورپین تکنیک کی مدد سے بنگال میں چھپائی اور لکھنے کا کاغذ بنانے کی بھی کوشش کی گئی۔[3]

لیکن 1833 تک منصوبہ بند طریقہ سے اصل کاری کی گئی نہ اس کی سرگرمی کی سمت کا تعین کیا جاسکا۔ 1833 میں چارٹر کی تجدید کے وقت ایسٹ انڈیا کمپنی کے حالات کے متعلق تفتیش کرنے کی غرض سے پارلیمنٹ کی جو سلیکٹ کمیٹی بنائی گئی تھی اس کے سامنے جو شہادتیں پیش کی گئیں جن میں انگلستان کی تجارتی اور صنعتی انجمنوں کی شہادتیں شامل تھیں۔ اُن سے ہندوستان میں سرمایہ لگانے اور یورپینوں کی بستیاں بسانے کی خواہش ظاہر ہوئی۔ کہا گیا تھا کہ مالی فائدہ کے علاوہ اصل کاری اور یورپیوں کی آبادی کی وجہ سے ہندوستان پر انگلستان کی معاشی اور سیاسی گرفت مضبوط تر ہوجائے گی۔[4]

اب قومی پالیسی کی صراحت کی جاچکی تھی۔ ہندوستان کو ایسی شکل دینی تھی کہ وہ برطانوی سلطنت کی نوآبادی بن سکے اُس کے سپرد برطانوی صنعتوں کے لئے خام مال پیدا کرنے اور برطانیوں کی پیدا کردہ اشیائے صرف کی کھپت کرنے کا کام کیا گیا۔

اُن مصنوعات کے لئے برطانوی سرمائے کا استعمال ممنوع قرار دیا گیا جو برطانوی مصنوعات سے مقابلہ کرسکتی تھیں۔ اور اس لئے طے کیا گیا کہ سرمایا باغات (نیل۔ چائے۔ کافی)، ریلوے جہاز رانی کمپنیوں، بنکوں اور بڑی بڑی تجارتی کمپنیوں میں لگایا جائے۔

کمپنی نے اس پالیسی کے عمل درآمد میں مدد دی۔ یورپینوں کو زمین حاصل کرنے اور اُس پر قابض رہنے، مزدور بھرتی کرنے اور باغات کو ترقی دینے کے لئے ہر قسم کی سہولت مہیا کی گئی۔

---

[1] ٹوسن Economic Development of Oversease Empire صفحہ 294

[2] ڈاکٹر والک کا خط مورخہ 12 فروری 1834 Report of Committee جلد دوم، حصہ دوم، صفحہ 20، 665

[3] ڈاکٹر والک ایضاً

[4] سلیکٹ کمیٹی کے سامنے پیش کی جانے والی شہادت، جلد دوم، حصہ اوّل مزید دیکھئے صفحہ B برائے چارس سکان کی روداد مورخہ 19 فروری 1829 اور ولیم بینٹک کی روداد 30 مئی 1829

ڈاکٹر والک نے 1822 میں کافی کے باغدار کی حیثیت سے دوسروں کی رہنمائی کی اور 1824 میں کافی کے یورپین باغداروں کو اپنے نام سے زمین پر قابض ہونے کا حق دے دیا گیا۔[1]

دوسرا بڑھتا ہوا کاروبار تھا چائے کا۔ برطانیہ کو چین سے جب چائے کی درآمد غیر یقینی ہوگئی تو انگریزوں نے ہندوستان میں چائے کی کاشت کے امکانات پر غور کرنا شروع کیا۔

ڈاکٹر والک نے 1832 ہی میں کہا تھا۔ ''اگر ہم سامنے آنے والے تمام حالات پر غور کریں تو ہم یقینی اس قسم کی امید کر سکتے ہیں کہ اچھا انتظام کرنے کی صورت میں عزت مآب ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقبوضات میں جلد ہی چائے کے پودے کی کاشت وسیع پیمانے پر کی جاسکتی ہے اور ہمیں متمدن زندگی کے سب سے بڑے آرام و آرائش کے لئے ایک مطلق العنان قوم کی مرضی اور تلون مزاجی پر انحصار نہیں کرنا پڑے گا۔''[2] 1834 میں کورٹ نے ایک کمیٹی کے تقرر کی اجازت دے دی تا کہ وہ غور وخوص کے بعد ہندوستان میں چائے کی کاشت کو رواج دینے کے لئے منصوبہ تیار کرے۔ 1838 میں پہلی مرتبہ ہندوستان کی چائے بازار میں آئی۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ترقی تیزی کے ساتھ کی گئی۔ 1850 میں 1876 ایکڑ میں چائے کے باغات تھے جن کی سالانہ پیداوار 2,16,000 پاؤنڈ تھی۔ 1859 میں یہ اعداد بڑھ کے بالترتیب 7,599 ایکڑ اور 2,05,689 پاؤنڈ ہو گئے تھے۔ صنعت میں تیزی کے ساتھ ہونے والی ترقی کی بنا پر آسام میں زمین کے لئے باغداروں میں مقابلہ بڑھ گیا اور زمین کی قیمت میں اضافہ ہو گیا۔

ایک اور چیز کپاس تھی۔ جس کی ہندوستان میں کاشت کی بڑی ہمت افزائی کی گئی۔ لیکن کپاس کی کاشت میں نجی برطانوی سرمائے نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اس کی کاشت میں اضافہ کرنے کی ذمہ داری کمپنی پر ڈال دی گئی۔ اس لئے کہ کپاس کی کاشت کی ہمت افزائی برطانیہ کے

---

[1] حکومت بنگال تھویز، 7 مئی 1824 مزید ڈاکٹر والک کا خط سینٹ جارج کے نام Report (1833) Select Committee نتیجہ 2 صفحہ 665

[2] ڈاکٹر والک کی رائے مورخہ 3 فروری 1832 جو ہندوستان کے پہاڑوں پر تجارتی مقاصد سے چائے کے پودے کی کاشت کے امکانات کے متعلق بورڈ کنٹرول نارتھ انڈین افیرز کے صدر عزت مآب چارلس گرانٹ کی فرمائش پر ضبط تحریر میں دی گئی۔

اس منصوبے میں پوری طرح آتی تھی کہ ہندوستان میں نوآبادیاتی معیشت قائم کی جائے۔ 1829 ہی میں کورٹ آف ڈائرکٹر کی توجہ ''خصوصیت کے ساتھ اس موضوع کی طرف مبذول کرائی گئی۔ (ہندوستان میں پیدا ہونے والی کپاس کو بہتر بنانے کی طرف) اور اس طرف بھی کہ برطانیہ عظمیٰ کو اُس خام مال کے لئے، جس پر اُس کی سب سے بیش قیمت مصنوعات کا انحصار ہے، بدیسی ملکوں سے آزاد کرانے کے لئے ہندوستان کی طرف دیکھا جائے۔''[1]

لیکن اس میں شک نہیں کہ کپاس کی کاشت میں اضافہ ہوجانے سے انگلستان اور ہندوستان دونوں کو فائدہ ہوا۔ جیسا کہ بمبئی کے گورنر سر جان مالکم نے کہا تھا ''ہمارے کچھ بہترین اضلاع کی خاص پیداوار ہے کپاس۔ ہمیں اپنے مقبوضات کے زرعی وسائل میں اضافہ کرنے اور اُس کے نتیجے میں سرکاری آمدنی بڑھانے کے لئے اس کو ترقی دینے پر خصوصی طور سے غور کرنا چاہئے۔''[2] کپاس کی کاشت کی ریاستی ہمت افزائی کی پالیسی پر عمل ہندوستان میں کمپنی کی حکومت کی بقیہ مدت میں ہوتا رہا۔ بلکہ اُس کے بعد بھی جاری رہا۔ 1862 کی امریکہ کی خانہ جنگی نے، جس کی وجہ سے اُس ملک سے انگلستان آنے والی کپاس کی درآمد ختم ہوگئی۔ اس پالیسی کو اور تقویت دی۔ جنگ کے دوران ہندوستان سے کپاس کے برآمدات بڑھ گئے اور اُن کی وجہ سے کچھ دن کے لئے غیر متوقع طور پر کپاس پیدا کرنے والے علاقے کے کسان خوش حال ہوگئے۔

اندرون ملک کپاس کی پیداوار اور اس کی خرید دونوں ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں رہیں۔ اس کی وجہ سے بچولیوں کا ایک ایسا گروہ وجود میں آگیا جو خصوصیت کے ساتھ بمبئی پریسیڈنسی کے دکن کے اضلاع میں صوبجات متوسط میں اور برار میں کپاس کی کاشت اور تجارت میں روپیہ لگاتے تھے۔ وہ لوگ بھی جن کے پاس سرمایہ کم تھا کپاس کا کاروبار کرنے لگے اور اُس کی کاشت اور تجارت دونوں سے بہت دولت کمائی۔

اٹھارھویں صدی کے آخر سے بنگال میں ریشم کی صنعت کا زوال شروع ہوگیا۔ لیکن اٹلی کے کچھ باشندوں اور خاص طور سے مسٹر نٹو کی کوششوں سے پچھلی صدی کی تیسری دہائی کے دوران

---

[1] بمبئی کو کورٹ آف ڈائریکٹرز کا مراسلہ مورخہ 18 فروری 1829

[2] بمبئی پریسی ڈنسی کے اس کے انتظام پر عام روداد مورخہ 30 نومبر 1830

بمبئی دکن میں کامیابی کے ساتھ ریشم کی پیداوار کو ترقی دی گئی ایک دفعہ پھر سرمائے کے دیسی لوگ اس کی طرف کھینچتے۔ وہ اس تجارت کی حمایت کرنے کے لئے آگے بڑھے جس کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ اس میں کامیابی ہوگی۔[1]

کپاس، نیل، افیم، چائے اور کافی کی کاشت بڑھی تو زمینداروں اور چھوٹے تاجروں کو بھی فائدہ ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ ہندوستان کی رائے عامہ کے روشن خیال رہنماؤں مثلاً رام موہن رائے اور دوارکا ناتھ ٹیگور نے بھی اس کی حمایت کی۔ ٹیگور نے کہا ''مجھے معلوم ہوا ہے کہ نیل کی کاشت اور یورپینوں کے قیام سے عام ہندوستانیوں کو بہت فائدہ ہوا ہے۔ زمیندار دولت منداور خوش حال ہو گئے ہیں اور کسانوں کے مادی حالات میں سدھار آیا ہے اور انھیں اتنی سہولتیں حاصل ہوگئی ہے جتنی میرے عام ہم وطنوں کو اُن علاقوں میں نصیب نہیں جہاں نیل کی کاشت اور تیاری کا کام نہیں کیا جاتا......[2]'' اس طرح رام موہن رائے نے تصدیق کی کہ بنگال کے سفر کے دوران انھوں نے دیکھا کہ نیل کی کوٹھیوں کے آس پاس رہنے والے دیسی لوگ اُن لوگوں کے مقابلے میں جو وہاں سے دور رہتے ہیں زیادہ بہتر کپڑے پہنتے ہیں اور بہتر حالات میں زندگی گزارتے ہیں...... مجموعی اعتبار سے انھوں نے (نیل کے باغداروں نے) اس ملک کے عام لوگوں کو اس سے زیادہ فائدہ پہنچایا جتنا یورپینوں کے کسی دوسرے طبقے نے پہنچایا۔ چاہے وہ ملازمت میں ہوں یا نہ ہوں۔''[3]

انتظامیہ اور ہندوستان کے متوسط طبقے کی نمو 1833 تا 1858 ہندوستانی متوسط طبقے کے وجود میں آنے میں جس نے مدد کی وہ محض بڑھتی ہوئی تجارت نہیں تھی۔ اس کی تعداد بڑھانے اور اس میں اتحاد پیدا کرنے میں برطانوی عوام اور انتظام اور انگریزی تعلیم نے بھی اتنا ہی اہم رول ادا کیا۔

ہندوستانیوں کو تمام اعتماد اور ذمہ داری کے عہدوں سے علیحدہ رکھنے کی کارنواس کی پالیسی کی

---

[1] ایضاً پیرا گراف 198

[2] ترپاٹھی، املیش، محولہ بالا، صفحہ 234

[3] ہاؤس آف کامنز کی سلکٹ کمیٹی کی رپورٹ 1833، صفحہ، ہندوستان میں یورپینوں کا طریقہ کار

بنا پر اُن کو ملک کے سول انتظامیہ میں محض ماتحت اور کم تنخواہ والے عہدوں پر تقرر کیا جاتا تھا۔

لیکن محض یورپینوں کے ذریعہ ملک کا انتظام چلانا، نہ صرف مہنگا بلکہ مصلحت کے خلاف بھی تھا۔ چنانچہ بنارس اور اُس کے آس پاس کے اضلاع میں قانون گو اور نائب تحصیلدار کا عہدہ بحال رکھا گیا تھا اور اُن پر ہندوستانیوں کا تقرر کیا جاتا تھا۔ اس طرح بمبئی اور مدراس کی پریسیڈنسیوں میں پرگنے کی سطح کے حکام مال ہندوستانی تھے۔ 1803 میں صدر امین کا عہدہ شروع کیا گیا اور اُس سال ہندوستانی صنعتوں کے اختیارات بڑھا دیے گئے۔ لارڈ ہسٹنگز نے ان حکام کو باضابطہ سرکاری تنخواہ دار حکام بنا دیا اور اُن کی تنخواہوں میں اضافہ کر دیا۔ بینٹک کے زمانے حکومت میں سب جج کا عہدہ شروع کیا گیا۔ اس طرح اس کے زمانہ حکومت میں شمالی مغربی صوبجات کے محکمہ مال میں ڈپٹی کلکٹروں کی حیثیت سے ہندوستانیوں کا تقرر کیا گیا۔

روزگار کے معاملے میں ہندوستانیوں کے خلاف امتیاز کی پالیسی 1833 میں باضابطہ طور پر ختم کر دی گئی۔ نئے چارٹر کی ایک دفعہ میں کہا گیا تھا کہ آئندہ ریاست کے کسی عہدوں پر تقرر کے لئے کسی شخص کو رنگ، ذات، مذہب جائے پیدائش کی بنا پر نااہل نہیں قرار دیا جائے گا۔ جہاں تک اقرارنامے کی پابندی اور ملازمتوں کا تعلق تھا یہ اصول محض ایک نیک خواہش کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ لیکن کمپنی کی مالی دشواریوں نے بینٹک کو اس پر مجبور کر دیا کہ وہ ماتحت ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی تعداد بڑھا دے۔ 1828 میں حکومت ہند کی ملازمت میں مجموعی طور سے 1,97 ہندوستانی تھے 50-1849 میں ہندوستانیوں کی تعداد بڑھ کے 2, 813 ہو گئی تھی۔

تعداد کے علاوہ ہندوستانی حکام کی تنخواہ 250 ماہوار سے زیادہ نہیں تھی۔ بینٹک نے صدر امین کی تنخواہ 250 تا 500 روپیہ اور اعلیٰ صدر امین کو 500 تا 600 مقرر کی۔ 1813 میں پہلی مرتبہ فیصلہ کیا گیا کہ ان حکام کو جو اقرارنامہ کے پابند نہیں ہیں، ڈپٹی مجسٹریٹ کے عہدوں پر مقرر کیا جائے۔ 1849 میں تقریباً 493 حکام کو 240 پاؤنڈ فی سال یا 300 روپیہ ماہانہ مل رہے تھے (1835 سے 1849 تک شرح مبادلہ تھی 15 روپئے فی پاؤنڈ)۔

تعلیمی نظام کو انتظامی ضرورتوں کے مطابق ڈھالا گیا۔ وہ وکیل جو صدر دیوانی عدالت میں مقدمات کی پیروی کرتے تھے، اور وہ بھی جو ضلع عدالتوں میں پریکٹس کرتے تھے، کلکتہ، مدراس

اور بنارس سنسکرت کالج کے طالب علموں میں سے ہوتے تھے۔ بعد میں دیوانی عدالتوں میں پریکٹس کرنے کے لئے فارسی اور سنسکرت کا جاننا ضروری نہیں رہا۔ صرف اس کی ضرورت تھی کہ وہ کمپنی کے نئے ضوابط سے واقف ہوں۔ اور انگریزی زبان جانتے ہوں۔ جس میں زیادہ تو ضوابط بنائے جاتے تھے۔ چنانچہ 1826 میں فیصلہ کیا گیا کہ سرکاری ادارے کے پڑھے ہوئے دیسی طالب علم جو اس امر کی باضابطہ سند رکھتے ہوں کہ ہندو اور مسلم قوانین، برطانوی حکومت کے ضابطوں سے اچھی طرح واقف ہیں انھیں کسی شہر یا ضلع کی عدالت میں وکیل کی حیثیت سے مقدمات کی پیروی کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے۔ اس طرح کسی سرکاری ادارے میں حاصل کی جانے والی تعلیم نے دیسی لوگوں کے لئے نہ صرف سرکاری ملازمتوں کے دروازے کھول دیئے بلکہ قانون کا پیشہ بھی اُن کے لئے کھل گیا۔ جو اُس وقت تک اُن لوگوں کا خصوصی اجارہ سمجھا جاتا تھا جو اُن دو کالجوں کے طالب علم ہوتے تھے۔ جہاں مشرقی زبانوں اور ہندو اور مسلم قوانین کی تعلیم دی جاتی تھی۔

بیس سال تک 1833 کے چارٹر کے دفعات پر عمل نہیں کیا گیا تھا۔ اُس کے بعد 1853 میں جب پارلیمنٹ میں 1853 کے انڈیا بل پر بحث ہوئی تو بلیکٹ اور جان برائٹ نے کمپنی کی ملازمتوں میں ہندوستانیوں کو لینے کا سوال اٹھایا۔ بلیکٹ نے اس پر افسوس کا اظہار کیا کہ اگرچہ 1833 کے چارٹر ایکٹ کو منظور کرتے وقت اس کی وضاحت کردی گئی تھی پھر بھی ہندوستانیوں کو اقرارنامہ کی پابند ملازمتوں سے عمداً علیحدہ رکھا گیا۔ اُن دونوں نے کیمرون کا حوالہ دیا جو اُس وقت ایگزیکیٹو کونسل کا ممبر اور لاکمیشن کا صدر تھا۔ اُس نے 1848 میں کہا تھا۔ ''موجودہ چارٹر ایکٹ کو ہندوستان کے لوگ ایک مذاق سمجھتے ہیں۔''[1] اُن دونوں نے ڈاکٹر چکرورتی کا ذکر کیا جو اُن چار ہندوستانیوں میں شامل تھا جنھیں دوارکا ناتھ نے 1844 میں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیجا تھا۔ ڈاکٹر چکرورتی نے طب میں انگلستان میں نمایاں حیثیت حاصل کی۔ مسٹر کیمرون اور سرائے ربانی نے کورٹ آف ڈائرکٹرز کو ایک خط لکھا جس میں اُن سے درخواست کی گئی تھی کہ ڈاکٹر

---

[1] پارلیمنٹ کا مباحثہ، تیسرا سلسلہ، جلد 127 صفحات 1333-1318۔

چکرورتی کو اقرار نامے کی پابندی میں طبی ملازمت کے لئے نامزد کر دیا جائے۔ کورٹ آف ڈائریکٹر اقرار نامہ کی پابند ملازمت میں ڈاکٹر چکرورتی کے تقرر کی درخواست کا جواب دینے سے بچا اور جن لوگوں نے سفارش کی تھی انھیں صرف اتنی اطلاع دی کہ اس کا تقرر ایک ایسے عہدے پر کر دیا گیا ہے جو اقرار نامے کی پابندی ملازمت سے مشاہر کی حد تک اگر برتر نہیں ہے تو برابر ضرور ہے۔''[1]

یہ کہا گیا کہ اس صورت حال کی طرف فوری توجہ دی جانی چاہئے۔ اس کی وجہ صرف اتنی نہیں تھی کہ ہندوستانیوں کے ساتھ ناانصافی ہو رہی تھی بلکہ یہ صورت حال خود انگلستان کے لئے خطرناک امکانات کی حامل تھی۔ جیسا کہ کرنل سائکس نے 1849 میں کہا تھا'' میں نہایت دیانتداری اور خلوص نیت کے ساتھ اپنے اس خیال کو ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں ہماری حکومت اور مالی خوش حالی کے لئے یہ بات انتہائی خطرناک ہے کہ ہم لگاتار انعاموں اور لگان معاف زمینوں پر قبضہ کر کے عام لوگوں کو اس خطرے میں مبتلا کر رہے ہیں کہ ہم ایک طرف تو حکومت کو نوکر شاہی کی حکومت بنانا چاہتے ہیں اور دوسری طرف انھیں نیم غلاموں کی قوم بنانا چاہتے ہیں۔''[2]

روشن خیال انگریزوں کے احتجاج کے باوجود ہندستانیوں کو اعلیٰ عہدوں سے علیحدہ رکھنے کی پالیسی پر 1858 کے ملکہ کے اعلان کے بعد بھی عمل ہوتا رہا۔ لہٰذا ہندو پیٹریاٹ کے ایک نامہ نگار نے 1860 میں لکھا تھا'' یہ عجیب بات ہے کہ آپ (یعنی انگلستان) ہندستانیوں کو یورپ کی تاریخ اور فلسفہ پڑھاتے ہیں لیکن اپنے ملک کی حکومت میں حصہ لینے کی انھیں اجازت نہیں دیتے۔''[3] اُس نامہ نگار نے انگلستان کو رومن سلطنت اور غدر کی بھی یاد دلائی اور اُس سے کہا کہ اس سلسلے میں اپنی غلطیوں کا تدارک کرے۔

---

[1] ایضاً۔

[2] ڈاکٹر والک کا خط، ایضاً۔

[3] ہندو پیٹریارٹ میں 7 جنوری 1860 کو چھپنے والا ایک خط جس پر دی۔ ایم۔ ڈی کے دستخط تھے۔

اعلیٰ سول اور فوجی عہدوں سے ہندوستانیوں کو علیحدہ رکھنے کی وجہ یہ تھی حکومت کو ہندوستانیوں پر اعتماد نہیں تھا۔ 1861 کے سول سروس بل کے متعلق فرینڈ آف انڈیا کی مندرجہ ذیل رائے اعلیٰ عہدوں کے لئے ہندوستانیوں کے مطالبے کی طرف حکومت اور یورپین حکام کے رویے کو ظاہر کرتی ہے۔

''تمام باعزت دیسی لوگوں کو تنخواہوں میں اضافے کے لئے جو اس وقت عہدوں پر فائز ہیں اور ہر ہائی کورٹ میں ایک ہندوستانی جج کے لئے ہم لڑتے رہے ہیں۔ لیکن جب تک نصیحت کو قبول کر کے ہندوستان کے لوگ یہ ثابت نہ کریں کہ وہ اعلیٰ عہدوں کے لئے اخلاقی صفات رکھتے ہیں سر چارلس ٹریومین کی طرح کے ضدی حکمراں کے لئے ممکن ہوگا کہ وہ ایک ایسے طبقے کو جنم دے جو سپاہیوں کی فوج سے زیادہ ریاست کے لئے خطرناک ہوگا اور جن سے خود اُن کے ملک کے لوگ اُس سے زیادہ نفرت کریں گے۔ جتنی اس وقت وہ پولیس اور عملے سے کرتے ہیں۔ جس مقامی شریف آدمی کے پاس دولت اور اہلیت ہے اُسے عزت تنخواہ اور حیثیت سے مستفید ہونے دیا جا سکتا ہے۔ لیکن کبھی اس کے ہاتھ میں طاقت نہیں دی جانی چاہئے۔''[1] ان ہندوستانیوں پر اس عدم اعتماد اور جائز حق سے انھیں محروم رکھنے کی پالیسی جو تعلیم و تربیت کی بنا پر حکومت کے تحت اعلیٰ عہدوں پر مقرر کئے جانے کے اتنے ہی اہل تھے جتنے یورپین، ایک ایسا اہم عنصر تھا جن سے ملک کے مختلف حصوں کے لوگوں میں اتحاد کا رشتہ استوار کر دیا۔ اُن میں یگانگت پیدا کر دی اور قومی احساس کو تیز بنا دیا۔

شمالی ہندوستان میں متوسط طبقہ

شمالی ہندوستان میں متوسط طبقے کے ارتقا نے اُس سے مختلف راستہ اختیار کیا جو بمبئی کلکتہ اور مدراس کے بندرگاہی شہروں میں کیا تھا، جہاں سب سے پہلے اس ملک میں یورپینوں کی تجارتی سرگرمیاں شروع ہوئی تھیں۔ برطانوی فتح کے بعد مدت تک وہ علاقے جو اَب اتر پردیش اور دہلی پر مشتمل ہیں ملک کی بڑھتی ہوئی بدیسی تجارت میں شریک ہو سکے نہ ساجھی دار بن سکے۔ لیکن انگریزوں کے آنے سے پہلے ان علاقوں میں ایک پھلتا پھولتا تجارتی طبقہ تھا اور مرزا پور، آگرہ،

---

[1] دی فرینڈ آف انڈیا 25 جولائی 1861، صفحہ 815۔

لکھنؤ اور دہلی کی طرح کے شہر نہ صرف اہم تجارتی مرکز تھے بلکہ ان شہروں میں ایک دولت مند اور باثر متوسط طبقہ پایا جاتا تھا جو تاجروں اور کاروبار کرنے والوں (جو اندرون ملک تجارت کرتے تھے)، بنک کاروں، انتظامی افسروں، درباریوں اور درس وتدریس کا کام کرنے والوں پر مشتمل تھا۔ پلاسی کی جنگ کے بعد جب ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازموں نے اندرون ملک کی تجارت کا اجارہ حاصل کرلیا اور اس کے بعد 1803 میں جب انگریزوں نے آگرہ کا الحاق کرلیا تو شمالی ہند کے تجارتی طبقوں پر کاری ضرب لگی۔ بمبئی اور کلکتہ تجارت اور کاروبار کے نئے مرکز بن گئے اور گنگا جمنا کے کناروں پر واقع اندرون ملک کی تجارت کے مرکزوں نے اپنی سابق اہمیت کھودی۔ جب تاجروں کا سابق پیشہ ختم ہوگیا تو انھوں نے زمین، لین دین اور کاروبار اور سٹہ بازی کی طرف توجہ کی۔[1] حکومت کو روپیہ قرض دینا اور اس کے عوض زمینوں پر قبضہ دخل پانا اس علاقے کے تجارتی طبقے کا پرانا دستور تھا۔ برطانوی علاقوں میں یہ بات ممکن نہیں رہی تھی، اس لئے تاجروں نے ہندوستانی ریاستوں کے حکمرانوں اور امرا کو روپیہ دینا شروع کیا۔ اور نظام دوسرے دیسی حکمرانوں کے علاقوں میں روپیہ قرض دے کر اور اس کے عوض زمینوں پر قبضہ دخل حاصل کر کے انھوں نے بڑے منافع کمائے۔ اس کے علاوہ آگرہ اور دہلی کے تجارتی خاندانوں نے شکر، کپاس، مشینی اشیا، دھاتیں اور دوسری بہت سی چیزوں کی تجارت کرنے لگے۔[2] موتی رام لکھنؤ کے شاہ اور دہلی کے سری کرشن گڑھ والے کے خاندان 1857 کی بغاوت تک اپنی دولت کے لئے مشہور

---

[1] دیکھئے ہندوستان کے معاملات کے متعلق سلکٹ کمپنی کے سامنے آر۔ ایم۔ برڈ کی شہادت دیکھئے۔

From the Report Select Committee on Indian Territories.

[2] ایضاً۔

سوال: مسٹر بنکس اس تجارت کی نوعیت کیا ہے۔ جس سے وہ اتنے بڑے بڑے منافع کماتے ہیں؟

جواب: مسٹر برڈ ''پہلے وہ حکومتوں کو بہت روپیہ قرض دیتے تھے اور اس کے عوض زمین حاصل کر لیتے تھے۔ لیکن ابھی بہت سے خاندان ان علاقوں میں بڑا روپیہ کمارہے ہیں۔ جن کو بدیسی علاقہ کہا جاتا ہے۔ نظام کے علاقے میں اور دوسرے علاقوں میں روپیہ کمانے کا حاصل ذریعہ تو یہ ہے یعنی اونچی شرح سود پر حکومت کو روپیہ قرض دینا۔ اور اس کے عوض زمینات پر قابض ودخیل ہوجانا، لیکن میرا خیال ہے کہ آگرہ میں شکر، کپاس مشینی اشیا، دھاتوں اور بہت سے دوسری چیزوں کی تجارت کی جاتی ہے۔

تھے۔ 1853 میں موتی لال کی املاک کی مالیت چالیس لاکھ پاؤنڈ[1] سمجھی جاتی تھی اور اسوقت کے برطانوی حکمراں دہلی کے گڑ والا خاندان کو شمالی ہندوستان کا راتھس چائیلڈ سمجھتے تھے۔

جیسا کہ بنگال میں ہوا تھا اتر پردیش کی کچھ بڑی بڑی بنک کاری اور تجارتی فرمیں یورپی بنکروں اور تجارتی کمپنی کے مقابلے کی وجہ سے جب تجارت سے نکال دی گئیں تو انھوں نے ہندوستانی ریاستوں میں بڑی بڑی زمینداریاں حاصل کرلیں۔ دہلی کے گڑ والوں کی طرح کے دوسرے تاجروں کو جنھوں نے بغاوت کے دوران مغل شہنشاہ کی مدد کی تھی سزا دی گئی اور انگریزوں نے اُسے ختم کر دیا۔[2] کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے لین دین کا کاروبار یا چھوٹی چھوٹی دوکانیں شروع کردی جو متوسط طبقہ پریسیڈنسی۔شہروں میں وجود میں آ گیا تھا ویسا اُس زمانے میں اتر پردیش میں نہ اُبھر سکا۔

آگرہ اور اودھ میں مغربی تعلیم کا رواج بھی آہستہ آہستہ ہوسکا۔ بغاوت کے بعد بھی اودھ کے زمیندار مدت تک انگریزی تعلیم سے متنفر رہے۔ تجارتی طبقوں نے بھی ان تھوڑی بہت تعلیمی سہولتوں سے فائدہ نہیں اٹھایا جو حکومت نے مہیا کی تھیں۔ 61-1860 میں شمال مغربی صوبجات میں ایک گورنمنٹ اسکول تھا جس میں 127 طالب علم تھے۔ اس کے برعکس بنگال میں 45 اسکول تھے۔ جن میں 5,309 طالب علم تھے۔ پنجاب میں 21 اسکول تھے۔ جن میں 1,714 طالب علم تھے۔ مدراس میں 11 اسکول تھے جن میں 2,027 طالب علم تھے اور بمبئی میں 2 اسکول تھے جن مین 618 طالب علم تھے۔[3] 62-1861 میں شمال مغربی صوبجات میں 5

---

[1] ایضاً۔

[2] 1857 میں انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لئے غلوں سے بھری کشتیوں کے علاوہ سیٹھ رام داس گڑ والا نے مغل شہنشاہ کو بڑے بڑے قرض دیے۔ لیکن جن انگریز حکام نے اُس سے اس قسم کی درخواست کی تو اُس نے انکار کر دیا۔ بغاوت فرو ہونے کے بعد انگریزوں نے اس کے گھر کو تخت وتاراج کر ڈالا اور جائداد ضبط کر لی۔

[3] ہندوستان میں تعلیمی حالت کے متعلق نوٹ از۔اے۔ایم۔منڈاتھ دیکھئے Selector from Educational Records of the Govt. of India جلد اوّل تعلیمی رپورٹ (این۔اے۔آئی 1960) صفحہ 40

گورنمنٹ کالج تھے لیکن اس سال کی تعلیم کے متعلق سرکاری رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ لیکن ان کو کالج کا نام دینا مناسب نہیں ہے اس لئے کہ دستور اور نصاب تعلیم وغیرہ کے اعتبار سے ان پر اسکول کا نام زیادہ صادق آتا ہے۔[1]

تجارت اور اعلیٰ تعلیم دونوں کے اعتبار سے حالات بہت سازگار نہیں تھے اُن عناصر میں سے ایک قانون تھا جنھوں نے ہندوستان کے مختلف خطوں میں پائے جانے والے متوسط طبقے میں یگانگت کا احساس پیدا کیا اور قومی شعور کی نشوونما کی۔ ہندوستان کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پورے ہندوستان کے لئے یکساں قوانین اور ضوابط بنائے گئے۔ اور فوجداری قوانین کے ضابطے اور عدالتی کارروائی کے قوانین تیار کئے گئے اور تمام صوبوں میں اور سب فرقوں کے لئے اُن کا نفاذ کیا گیا تو سب ہندوستانیوں نے محسوس کیا کہ وہ ایک مشترکہ نظام میں شریک ہیں۔ ان قوانین کے عمل درآمد میں ہندوستانی صرف اس وجہ سے شریک نہیں تھے کہ فریقین کے مقدمات پر اُن کا اطلاق ہوتا تھا۔ بلکہ اُن کی شرکت کی وجہ یہ بھی تھی کہ اُن کے عمل درآمد میں ہندوستانی افسر حصہ لیتے تھے اور ہندوستانی وکیل اُن کی تشریح میں عدالتوں کی مدد کرتے تھے۔ جب موکل، وکیل اور جج یکساں قوانین کا عمل درآمد یکساں انداز سے کرنے لگے تو اُس کا لازمی نتیجہ ہوا کہ اُن کے مفادات رویے بھی یکساں ہوگئے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ہندوستان کی سیاسی تحریک میں وکیلوں کا طبقہ پیش پیش تھا ایک طرف تو قانون، نظم ونسق، تعلیم، اخبارات اور ادب قومی یکجہتی کے آلہ کار تھے۔ دوسری طرف مواصلات کی ترقی کل ہند سطح پر اس کی کامیابی کی ضامن بن گئی۔

ریلیں اور قومی اتحاد

بمبئی، مدراس اور بنگال کے متوسط طبقوں میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ لیکن جب تک وہ آسانی اور تیزی سے ایک دوسرے کے ساتھ روابط پیدا نہیں کر سکتے تھے اُس وقت تک مشترک قومی جذبات پیدا ہو سکتے تھے نہ مشترک رائے عامہ وجود میں آسکتی تھی اور نہ اُن پر اتحاد عمل ہوسکتا۔ چنانچہ ریلوں کی ترقی کو قومی شعور کے ارتقاوترقی میں ایک سنگ میل سے تعبیر کیا جاسکتا

---

[1] ایضاً، صفحہ 30

ہے۔جس کی بنا پر ملک کے مختلف حصوں میں رہنے والے لوگوں میں مواصلات اور ایک دوسرے سے میل جول ممکن ہوسکا۔

ہندوستان میں ریلوں کی تعمیر جو 1853 میں شروع کی گئی، یورپ، کناڈا اور امریکہ میں ریلوں کی گرم بازاری کے بعد ہوئی۔انیسویں صدی کی چوتھی دہائی تک انگلستان دوسرے ملکوں کو سرمایہ برآمد کر رہا تھا۔یہ سرمایہ زیادہ تر امریکہ اور کناڈا کو ریلوں کی تعمیر کے لئے بھیجا جا رہا تھا۔ان اصل کاریوں کی وجہ سے نہ صرف سرمایہ کو منافع بخش طریقے سے استعمال کیا جاسکا جو بصورت دیگر بیکار رہتا، بلکہ برطانوی تکنیکی مہارت اور برطانوی صنعت کے لئے نئی نئی منڈیاں بھی کھُل گئیں۔ریلیں بن جانے کی وجہ سے انگلستان زیادہ آسانی کے ساتھ اور کم خرچ پر غذائی اجناس اور زرعی خام مال حاصل کرسکتا تھا اور زیادہ آسانی سے اپنی مصنوعات امریکہ اور کناڈا کی منڈیوں تک پہنچا سکتا تھا۔

جہاں تک ہندوستان کا تعلق تھا ریلوں کی تعمیر سے ایک اور فائدہ بھی اُٹھایا جاسکتا تھا جیسا کہ لارڈ ڈلہوزی نے 1853 میں اپنی مشہور روداد میں اس کے متعلق لکھا تھا اور جن کی تصدیق 1857 کی بغاوت کے دوران پیش آنے والے واقعات نے کردی، سول شورش یا برطانوی حکومت کی سیاسی طاقت کے ساتھ مقابلہ کرنے کی صورت میں فوجوں کو تیزی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ لانے لے جانے کے لیے ریلیں ضروری ہیں۔اس ملک میں ریلیں تعمیر کرنے کا کام نجی کمپنیوں کے سپرد کردیا گیا جو انگلستان میں بنائی گئی تھیں۔تعمیر کے لئے انھیں ٹھیکے دئے گئے جن میں دوسری رعایتوں کے علاوہ یہ شرط بھی رکھی گئی تھی کہ حکومت سرمائے پر 5فی صدی منافع کی ضامن ہوگی۔1848-49 میں ضمانت شدہ سرمایہ محض ایک لاکھ روپئے تھا۔1851-52 میں وہ بڑھ کر ایک کروڑ تین لاکھ ہوگیا اور 1860-61 میں 34 کروڑ 16 لاکھ روپئے۔اُس کے بعد وہ تیزی سے بڑھنے لگا۔ملک میں پہلی ریلوے لائین 1853 میں بنائی گئی۔1853-54 میں صرف 21 میل لمبی ریلوے لائین پر مسافر سفر کرسکتے تھے۔اُس کی لمبائی 1860-61 میں 839 میل اور 1869-70 میں 4,265 ہوگئی۔1872 تک پریسیڈنسی شہروں کو ریلوں سے جوڑا جاچکا تھا

اور تینوں پریسیڈنسیوں کی شہری آبادی کے لئے اندرون ملک راست ریلوں کا سلسلہ مہیا کیا جاچکا تھا۔ پریسیڈنسی شہروں کو جوڑنے والی ریلوں کا اثر قومی اتحاد کے عمل پر پڑا اور اگلے تیس سال میں جو ذیلی ریلوے لائینوں کا جال بچھا دیا گیا اُس نے اس عمل کو مکمل کر دیا۔ صدی کے اختتام تک ملک میں 23,783 میل لمبی ریلوے لائن بچھائی جا چکی تھی۔

چوتھا باب

نئی تعلیم اور مغربی تہذیب کا اثر

سیاسی طاقت رکھنے والے قدیم بالائی طبقے کے ختم ہونے کے بعد نیا متوسط طبقہ پیش پیش ہوگیا۔ یہ فطری امر تھا کہ ابتدا میں اس طبقے کے مختلف حصے سمجھتے تھے کہ انھیں انگریزی حکومت سے فائدہ ہوا۔ تاجروں کی دولت زمینداروں کی آمدنی، سرکاری ملازمین کی تنخواہیں اور پیشہ ورلوگوں کی یافت کے ذرائع زیادہ تر انگریزوں کی دین تھے اور اس لئے وہ اپنے فائدہ پہنچانے والوں کے لئے جذبہ احسان مندی رکھتے تھے لیکن جوں جوں وقت گزرتا گیا اور حکمرانوں نے ہندوستان کے سابق فاتحین کی پیروی کرنے کا کوئی ارادہ ظاہر نہیں کیا، جو اس ملک میں آباد ہو گئے تھے اس کو اپنا مستقل گھر بنالیا تھا، یہاں کے سماج میں گھل مل گئے تھے۔ اور جنھوں نے یہاں کی تہذیب کو اپنالیا تھا تو رفتہ رفتہ وہ مایوسی کا شکار ہونے لگے۔

ایک طرف تو برطانوی فتح کے نتیجے میں بالائی طبقہ ختم ہوگیا اور دوسری طرف برہمن یا قدیم دانش ورطبقہ اپنی اہمیت کھو بیٹھا۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس کی جزوی وجہ تھی سرپرستی کے ذرائع یعنی بادشاہوں کے، صوبیداروں کے، سرداروں کے اوزمینداروں کے درباروں کا ختم ہوجانا اور

دوسری وجہ تھی کمپنی کا لگان معاف زمینوں پر دوبارہ قبضہ کر لینا جو مذہبی عالموں کی گذر بسر کے لئے دی گئی تھیں۔ گذر بسر کا روایتی ذریعہ کھو دینے کے بعد وہ جہاں بھی انھیں مل سکا کوئی دوسرا کام یا روزگار ڈھونڈنے پر مجبور ہو گئے۔ بقول ایس۔ کے۔ ڈی ''قدیم تہذیب اور قدیم علم کی جڑوں پر کلہاڑی چلائی گئی۔ وہ اثرات ناپید ہو گئے۔ جنھوں نے ہندو تہذیب کے اعلیٰ ترین تصورات کو جنم دیا تھا۔ وہ اثر بڑھ گیا جو توہم پرستی اور مضحکہ خیز تصورات کو رواج دیتا ہے۔[1]

فتح کے معاشی نتائج نے بھی تبدیلی کی وجوہ کو تقویت پہنچائی۔ زرعی میدان میں زمیندار اور کسان کے درمیان ایک نئے قسم کا رشتہ قائم ہو گیا تھا اور زمین پر ملکیت سے رشتوں کی نوعیت بدل گئی تھی۔ زرعی لین دین میں بھی روپے اور مقابلے کا استعمال ہونے لگا تھا۔

صنعت کے میدان میں روایتی مصنوعات کی بنا اور ہندوستان کو ایک منڈی میں تبدیل کر دینے کے نتیجے میں جہاں انگلستان کے کارخانوں کے بنے ہوئے سامان کا تبادلہ ہندوستان کے خام مال سے کیا جاتا تھا، یہاں ایک مثالی نو آبادیاتی معیشت اپنی تمام تر سماجی برائیوں کے ساتھ قائم ہو گئی۔

ان تبدیلیوں نے ابتدائی پیداواروں کے لئے مطالبہ بڑھا دیا۔ اس لئے کہ آبادی بڑھ رہی تھی اور درآمدات اور گھریلوں اخراجات کے لئے رقمیں ادا کرنی تھیں۔ مال تقسیم کرنے کا کاروبار تیز تر ہو گیا اور داخلی اور خارجی دونوں قسم کی تجارتوں کا مجموعی حجم بڑھ گیا۔ جس نے متوسط طبقے کو تقویت پہنچائی۔ ملی جلی معاشی اور سیاسی تبدیلی نے ہندوستان کے لوگوں کے اتحاد کی بنیاد ڈالی۔ مواصلات یعنی سڑکوں، ریلوں، ڈاک اور تار کی توسیع کی بنا پر مختلف علاقوں کے ہندوستانی ایک دوسرے کے بہت نزدیک آ گئے انھوں نے مختلف علاقوں کے نئے سماجی گروہوں کو ایک دوسرے سے منسلک کیا اور ایک منتظم اکائی کی تشکیل کی طرف مائل ہوئے۔

اس طرح عملی یعنی سیاسی اور معاشی زندگی کے میدان میں مغرب کا قدیم مشرق سے بڑا سخت تصادم ہوا۔ اس کے ساتھ ذہنی اور اخلاقی سطح پر بھی اس نے ملمع سازی کی۔ اقدار کا وہ بڑا نام

---

[1] ڈی۔ ایس۔ کے History of British Literature in the 19th Century کلکتہ یونیورسٹی 1919 صفحہ 31۔

جسے صدیوں سے ہندوستانی اپنے سینوں سے لگائے ہوئے تھے یعنی مذہبی، اخلاقی اور جمالیاتی اقدار کو للکارا گیا۔ اور ان تمام میدانوں میں ہندوستان میں ردعمل ہوا۔ جواب تین قسم کے تھے۔ پرانے خیالات رکھنے والوں نے انھیں حق بجانب قرار دیا، لبرل ذہن رکھنے والوں نے اُن کی اصلاح کرنی چاہی اور شدت پسندوں نے انھیں ردکردیا لیکن کسی کا نقطۂ نظر کچھ سہی اس چیلنج کا مقابلہ کرنے کے لئے جو اسلحہ استعمال کئے گئے یعنی تنقید اور معقولات کے اسلحہ وزیادہ تر مغرب سے مستعار لئے گئے تھے۔ اس طرح ذہنی ایجاد کی ایک زیریں لہر کو فروغ ہوا۔

ایک طرف تو اس تصادم نے ہندوستان اور غیر ہندوستان کے درمیان دوری کا احساس پیدا کیا اور دوسری طرف یہ شعور پیدا کیا کہ اُن کا تعلق ایک سیاسی برادری سے ہے جو نوعیت کے اعتبار سے دور وسطیٰ کے نظام سے مختلف ہے جس سے فرد کو قرابت داری یا کسی مذہبی فرقے سے جوڑا جاتا تھا۔ اس تصادم نے ایک ایسے سیاسی اتحاد کا احساس پیدا کیا جو ذات اور مذہب سے ماورا تھا۔ اور ایک ایسی مشترک قوم کے تصور سے وابستہ تھا جو مشترک وطن رکھتی ہے۔ اس طرح ایک ایسی قوم کا تصور پیدا ہوا جو دوسری قوموں سے مختلف ہے اور ایسی علاقائی برادری کا تصور وجود میں آیا جس میں تمام گروہ اور فرقے شامل ہیں۔

ظاہر ہے کہ ابتدا میں یہ شعور غیر متشکل تھا اور اس کا مفہوم واضح نہیں تھا۔ لیکن وقت گذرنے کے ساتھ اس کے خدوخال زیادہ واضح ہونے لگے اور اس کی چاہت کا یقین ہوگیا۔

II علم کا روایتی تصور

قومی شعور کی تشکیل میں ماضی نے عجیب وغریب مگر دلچسپ رول ادا کیا۔ ماضی طویل بھی تھا اور نشیب وفراز سے بھرا ہوا بھی۔ سوال یہ تھا کہ ہندوستان کو ماضی کے کس حصہ کو زندہ اور بیش بہا سمجھنا چاہئے۔ اس کا انتخاب آزادی کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا تھا اس کے یقین کا انحصار کئی باتوں پر تھا یعنی سوچنے کے روایتی طریقے مغرب کا اثر اور نئی زندگی کے شدید مطالبات۔ اس کے فیصلے میں لاشعوری اور نیم شعوری عوامل بھی شامل تھے اور بالقصر فیصلے کا ارادہ بھی۔ قومی شعور کو ماضی اور حال کے تانے بانے سے بنایا گیا تھا۔

قومی شعور کس طرح وجود میں آیا، اپنی خصوصی انفرادیت کو ابھارا اور ادب، فن، سماجی اور مذہبی اصلاحات اور راہ ورسم کی نئی شکلوں میں کس طرح اظہار پایا۔ کس طرح تعلیم، اخبارات اور نشر واشاعت کے دوسرے ذرائع سے اس کا پرچار کیا گیا۔ کس طرح اُس کی بنا پر سماجی اصول اور سیاسی تصورات وجود میں آئے۔ ان موضوعات کا جائزہ آئندہ ابواب میں لیا گیا ہے۔

اُن تہذیبی عناصر میں جنھوں نے ہندوستانی ذہن کو سب سے زیادہ متاثر کیا۔ اور زندگی کے نئے ذہنی، جمالیاتی، سماجی، اخلاقی اور مذہبی مسائل کے طرف نئے رجحانات کو جنم دیا، مغربی علم کی اشاعت کو اونچی جگہ دینی پڑے گی۔ اس تصادم کی پوری اہمیت کو سمجھنے کے لئے یہ بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ اٹھارھویں صدی کے آخری میں جو مغربی علم ہندوستان پہنچا وہ نوعیت کے اعتبار سے اُسے روایتی ہندوستانی علم سے بہت مختلف تھا جو یہاں اُس وقت پایا جاتا تھا۔ دوسری بات یہ ہے کہ علم کا تصور اور علم کی تلاش کا مقصد دونوں نظاموں میں یکساں نہیں تھا۔ تیسری بات یہ ہے کہ مغربی علم ایک کھُلے سماج کا کام تھا اور کسی مخصوص طبقے تک محدود نہیں تھا۔ مشرق میں علم بند گروہوں تک محدود تھا۔

ان اختلافات کی جزئیات کا جائزہ لینے کی کوشش ضروری نہیں ہے۔ لیکن اس بات کو دھیان میں رکھنا چاہئے کہ جدید مغربی علم لازمی طور سے سائنسی، معروضی، تنقیدی اور غیر تحکمی ہے اور اُسے عقلی اور استدلالی طریقوں سے حاصل کیا جاتا ہے لیکن قدیم ہندوستانی دانشمندی کی بنیاد تھی، وجدان، ہدایت، موضوعی بصیرت، مراقبہ اور دھیان جو آخر میں روشنی اور یقین کی شکل اختیار کر لیتے تھے۔ اس دانشمندی کے مطابق علم دو قسم کا ہوا اعلیٰ اور ادنیٰ۔ اعلیٰ علم کے مقابلے میں جس کا تعلق حقیقت مطلق سے ہے، ادنیٰ علم کی قدر و قیمت کم ہے۔ اس لئے کہ اس کا موضوع بدلتا رہتا ہے اور عارضی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کا مقصد اپنی خودی کو پہنچاننا جو شعور کا موضوع اور ثانوی حیثیت سے معروض ہے۔ یہ اُس میں مصروف ہے جو وقت، مکان اور علیت سے ماورا ہے۔ اس لئے وہ مظہر کی طرف توجہ دینے کے لئے وقت نکال نہیں سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اگرچہ ہندوستان میں ریاضیات، فلکیات اور طب کی طرح کی طبعی سائنسوں میں کچھ ترقی کی گئی اور منطق، صرف ونحو، فن خطابت، قانون، فلسفہ وغیرہ کے متعلق کچھ طبع زاد کتابیں بھی پیدا کیں۔ لیکن تجرباتی مطالعے اور تجربی

سائنس کو بقدرِ ضرورت ترقی نہ دے سکا۔

روایتی علم کو ایک مکمل وحدت تصور کیا جاتا تھا۔ اس کو حاصل کرنے میں اُس کی بنا پر اور دشواری پیدا ہوگئی کہ اس کے لئے سنسکرت کا علم ایک ضروری شرط تھا اور لفظیات کی بہتات اور الجھی ہوئی صرف ونحو کی وجہ سے اُس کا پڑھنا آسان نہیں تھا۔ چنانچہ اس علم کو حاصل کرنے کے لئے جو شرطیں ضروری تھیں انھوں نے اس امر کو ناگزیر بنا دیا کہ چین کے مان دانیوں کی طرح اس کے پرستاروں کا حلقہ بھی چھوٹا اور منتخب ہو۔ انھیں اپنی گذر بسر کے لئے کام کرنا ضروری نہیں تھا اس لئے کہ حکومت یا سماج کا یہ فرض تھا کہ ان کی جزگری کرے۔ حالانکہ دنیاوی اعتبار سے وہ غریب تھے لیکن روحانی اعتبار سے وہ دولت مند تھے اور سماج ان کی بڑی عزت کرتا تھا۔ سب تو نہیں مگر اُن میں سے زیادہ برہمن تھے اور کچھ ہندو کی دوسری ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن پر عالموں کا طبقہ مشتمل تھا۔ حالانکہ اعلیٰ تعلیم کے جویا اور استاد کسی ذات یا فرقے سے متعلق ہو سکتے تھے۔

تعلیم یافتہ مسلمان بھی برہمن ذہن کی کچھ صفات کے حامل تھے۔ مسلمانوں کے لئے دو قسم کے علم تھے یعنی علم معرفت اور دنیاوی علم۔ پہلا علم لادُنی، وجدانی اور دل پر اثر ڈالنے والا تھا۔ داخلی نظم وضبط کے دشوار طریقے سے اس کو حاصل کیا جاتا تھا جس میں روحانی ترقی کے کئی مراحل تھے۔ اسی میں ترک خواہشات، حواس پر قدرت حاصل کرنا اور مادی اور دنیاوی اشیا سے قطع تعلق کرنا شامل تھا۔ اُن شرائط کو زیادہ لوگ پورا نہیں کر سکتے تھے اس لئے اعلیٰ علم کے حقیقی پرستاروں کی تعداد کم تھی۔

دوسرے قسم کے علم کی حیثیت کم تھی۔ لیکن مسلمان عالم اُسے بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ابتدائی مراحل میں انھوں نے یونانی تصورات کے مطالعہ پر بڑی توجہ دی تھی اور سائنس کے مختلف شعبوں میں اپنی طرف سے اضافے بھی کئے تھے۔ ہندوؤں کے مقابلے میں وہ تجربی اور دنیاوی علوم کے مطالعے میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے اور زیادہ مستعد تھے۔ ریاضیات اور حیاتیات کی سائنسوں اور تکنیکی دریافتوں میں وہ ہندوؤں سے آگے نکل گئے تھے۔ تاریخ کی تحقیق وتفتیش پر انھوں نے بہت توجہ دی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ فن تاریخ نویسی، سوانح نگاری اور جغرافیہ میں انھوں

نے یونانیوں اور رومنوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔طبعی سائنسوں میں وہ یورپ کے استاد تھے۔

باطنی علم اور مافوق التجربہ فلسفے میں ہندو ذہن زیادہ درک رکھتا تھا۔ اور اس کی دین بہت زیادہ تھی۔مگر فطرت اور مظاہر کے متعلق اُس کا علم بہت محدود تھا۔لیکن حقیقت یہ ہے کہ انیسویں صدی سے بہت پہلے ہندو اور مسلمان دونوں اُس منزل تک پہنچ چکے تھے، جہاں طبعی علم کے فروغ کا سلسلہ رُک گیا تھا۔سائنسوں یعنی طب، ریاضیات، فلکیات، کیمیا وغیرہ میں ہندوؤں کا علم محض لکیر کا فقیر بن چکا تھا۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے اُن کے مفکر، موجد اور معیاری کتابوں کے مصنف قریب قریب سب غیر ہندوستانی مسلمان تھے جو چودھویں صدی سے پہلے گذرے تھے ہندوستان میں انھوں نے محض شارحین اور حاشیہ نویس یا تلخیصات کے مرتبین پیدا کئے۔

خلافت پر ترکوں کے غلبے اور اُس کے بعد مشرق میں منگولوں کے ہاتھوں بغداد کی فتح و تاخت اور اٹبریا کے جزیرہ نما میں عیسائی ریاستوں کے قیام نے اسلامی ممالک میں سائنٹسٹوں کی ترقی پر مہلک ضرب لگائی۔اس کے بعد کی مسلم ریاستوں مثلاً ایران کے صوفیوں اور ہندوستان کے مغلوں نے، جو اپنی دولت اور شان و شوکت کے لئے دور دور تک مشہور تھے، ان سائنٹسٹوں کی ترقی کے سلسلے میں کچھ نہیں کیا۔

ہندو اور مسلمان عالموں کے طبقے زیادہ تر اپنے اپنے محوروں پر گھومتے رہے۔کچھ کو چھوڑ کے انھوں نے آپس میں علم کا لین دین نہیں کیا اور اس طرح ایک دوسرے کے ذہنوں پر جلا کرنے میں ناکام رہے۔اس کے علاوہ اٹھارھویں صدی سیاسی طوائف الملوکی اور ذہنی انتشار کی صدی تھی اُس پرآشوب زمانے میں، جب جنگ اور تشدد کا رواج عام تھا سامنتوں کا فروغ ممکن نہیں تھا۔ لیکن برطانوی فتح نے جب امن و امان قائم کر دیا تو علم کے فروغ کی ابتدائی شرف پوری ہوگئی۔ فاتحین اپنے ساتھ ایک نئے قسم کا علم لائے تھے جس کے بیج زرخیز ذہنوں پر گرے۔

III عیسائی مشنوں کی ابتدائی سرگرمیاں

پلاسی کی جنگ سے پہلے کے زمانے میں ذہنی تبدیلی کی دو خاص ایجنسیاں تھیں۔کاروباری لین دین اور انتظامی کاموں میں ہندوستان پر یورپی تاجروں کا اثر۔ یورپینوں کے رہن سہن کے

طریقے اور تجارت کرنے کے انداز نے ہندوستانی ذہن کو متاثر کیا اور اُن کے ساتھ رہ کر کچھ ہندوستانیوں نے انگریزی زبان سیکھ لی۔لیکن اُن کی تعداد محدود تھی۔اُس کی وجہ یہ تھی کہ اُس ابتدائی دور میں جو انگریز ہندوستان آئے تھے اُن کے لئے یہ بات زیادہ مفید تھی کہ وہ ملک کی زبانیں اور خصوصیت کے ساتھ فارسی زبان سیکھیں جو اُن حکمرانوں کی زبان تھی جن سے اُن کا سابقہ پڑتا تھا اور جن سے وہ اجازت نامے اور دوسری مراعات حاصل کرتے تھے۔

عیسائی مشنری ہندوستان میں دین عیسوی کی تبلیغ کرنے کے لئے آئے اور مسیحی ماحول میں ہندوستانی بچوں کو تعلیم دینے کے لئے انھوں نے اسکول کھولے۔ ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کی تاریخ بہت پرانی ہے جس کی ابتدا پہلی صدی عیسوی سے ہوتی تھی۔لیکن جدید عہد میں اُس کی تجدید اُس وقت ہوئی جب پرتگالی مالابار کے ساحل پر اُترے۔اٹھارھویں صدی میں جب یورپ کی پروٹسٹنٹ ریاستیں استمراری طاقتوں کی حیثیت سے اُبھریں تو رومن کیتھولک سرگرمیوں کا زوال شروع ہو گیا۔

جب رومن کیتھولک مشنوں کا کام ختم ہونے لگا تو یورپ کی پروٹسٹنٹ ریاستوں نے اپنے عقائد کے مطابق دین عیسوی کی ترویج واشاعت میں دلچسپی لینی شروع کی۔ یورپ کی پروٹسٹنٹ ریاستوں میں اس قسم کی انجمن، فرقے اور مذہبی گروہ معرض وجود میں آ گئے جنھوں نے دینی کام میں بڑا جوش وخروش ظاہر کیا۔

پروٹسٹنٹ یورپ میں مذہبی احیا نے ڈنمارک کے بادشاہ فریڈرک ولیم چہارم کو باہر کے ملک کو مشن بھیجنے کی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ کر دیا۔اُس نے اسپنر کی تحریک سے متعلق دو جرمن پادریوں زنکن بالگ اور پلوتشیو کو ہندوستان جانے کی دعوت دی۔زیکن بالگ 1706 میں ہندوستان پہنچا اور ٹرانکو بار میں اُس نے ڈینش تامل مشن کی بنیاد ڈالی۔اس نے تامل زبان سیکھی، تامل کتابیں چھاپنے کے لئے ایک پریس درآمد کیا اور انجیل کا ترجمہ چھاپا۔اُس نے ہندوستانی اور دوغلے یورپین بچوں کے لئے ایک اسکول بھی قائم کیا۔

پروٹسٹنٹ مشن کو اس حد تک کامیابی ہوئی کہ اُس نے نچلی ذاتوں کے بہت سے لوگوں کو عیسائی بنالیا، ہندوستانی پادریوں کی ایک جماعت کو جنم دیا اور مدراس (فورٹ سینٹ جارج) اور کڈالور (فورٹ سینٹ ڈیوڈ) میں مشن کے مرکز کھول دیے۔

عیسائی مشن تعلیمی میدان میں

جہاں تک ہندوستان میں مغربیت کی نشر و اشاعت کا تعلق ہے جنوب میں رومن کیتھولک اور پروٹسٹنٹ دونوں قسم کے مشنوں کا کام کوئی بڑی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

عیسائی مذہب کی تبلیغ اور تعلیم دونوں کے اعتبار سے مشنریوں کی سرگرمیاں بڑی حد تک ہندوؤں کے نچلے طبقوں تک محدود تھیں اور بااثر بالائی طبقے پر اُن کا اثر بہت کم پڑا جب نوبل نے دعویٰ کیا کہ وہ برہمن اور پانچویں وید کو ظاہر کرنے والا ہے تو اُس کی اُن عجیب وغریب طریقوں کا برہمنوں پر کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ نیا متوسط طبقہ ابھی تک وجود میں نہیں آیا تھا۔

لیکن بنگال میں صورت حال مختلف تھی۔ اٹھارھویں صدی کے وسط تک ہندوستانیوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو چکا تھا جو اُن انگریزوں کے طریقوں میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ جو اُن کے درمیان رہتے تھے۔ جب 1757 میں بنگال میں انگریزی حکومت قائم ہوگئی اور کچھ برسوں بعد جب برطانوی نظم ونسق میں تنظیم پیدا کی گئی تو حالات تیزی سے بدلنے لگے۔ ایسے نئے گروہ معرض وجود میں آگئے جو کام تو مختلف کرتے تھے لیکن انحصار حکمرانوں پر رکھتے تھے۔

ابتدائی مراحل میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے تبلیغ دین کے کاموں میں کوئی دلچسپی نہیں لی۔ حالانکہ 1798 کے چارٹر میں فیکٹریوں کے پادریوں کو ہدایت کی گئی تھی کہ ''وہ مقامی زبانیں سیکھیں تاکہ اُن ہندوؤں کو پروٹسٹنٹ مذہب کی تعلیم اچھی طرح دے سکیں۔ جو کمپنی کے ملازم یا غلام ہوں گے۔''[1] پھر بھی کمپنی منافعے کمانے میں اتنی زیادہ مصروف تھی کہ اس ہدایت پر دھیان نہیں دیا گیا۔

پلاسی کے بعد بنگال میں پروٹسٹنٹ مشنریوں نے سنجیدگی کے ساتھ اپنا کام شروع کیا۔ ڈینش مشن کا کیرستندر 1758 میں کلکتہ پہنچا اور کلایو نے اُسے مشن شروع کرنے کی اجازت دے دی۔ لیکن اُس کا کام بڑی حد تک انگریزوں اور اُن دوغلوں تک محدود رہا ''جو پورتوگیز'' کہلاتے تھے۔ پھر بھی اُس نے ایک اہم ہندو دہلی کے گنیش داس کو عیسائی بنا لیا جو کلکتہ کے سپریم کورٹ میں فارسی کا مترجم تھا۔

---

[1] رشٹر، جے A History of missions in India ترجمہ ایس ایچ مور (1908) صفحہ 129۔

انگلش چرچ کے مشنریوں کی آمد سے پہلے کمپنی کے پادری بھی ہندوستان میں تبلیغ دین کا کام شروع کر چکے تھے۔ وہ برطانوی یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ تھے اور اُس کی بنا پر تعلیمی معاملات میں دلچسپی لیتے تھے۔ مثلاً ڈیوڈ براؤن (متوفی 1812) فورٹ ولیم کالج کا پرووسٹ مقرر کیا گیا تھا۔ اُس نے کلکتہ کے ہندو نوجوانوں کے لئے ایک اقامتی اسکول بھی کھولا تھا۔ میزی مارٹن (متوفی 1812) نے کلکتہ، دینار پور اور کانپور میں کام کیا۔ اُس نے نئے عہد نامے کا ترجمہ اردو، فارسی اور عربی میں کیا اور اسکول قائم کئے۔ ڈینیل کوری نے جو آگرہ اور اُس کے بعد بنارس میں تعینات کیا گیا تھا راجہ جئے نرائن گھوسال کو اسکول کھولنے پر آمادہ کر لیا جو اتر پردیش میں پہلا اسکول تھا جہاں انگریزی پڑھائی جاتی تھی۔

مشنریوں کا دوسرا اہم گروپ وہ تھا جس میں ولیم کیری اُس کے دو ساتھی شامل تھے۔ کیری 1793 میں اُس وقت کلکتہ پہنچا جب مشنوں کی طرف سے کمپنی کا رویہ واضح طور سے مخالفانہ ہو چکا تھا۔ پرتگالیوں کا حشر وہ دیکھ چکے تھے اور اس کو سمجھتے تھے کہ تبلیغ مذہب کے کام کو بڑھانے کا نتیجہ بغاوت، خانہ جنگی اور عام بے چینی کی صورت میں سامنے آئے گا۔ سب سے زیادہ اس بات سے خائف تھے کہ اونچی ذات کے کسی دیسی سپاہی نے اگر مذہب تبدیل کیا تو اُس کا لازمی نتیجہ ہوگا فوج کی برطرفی اور ہندوستان میں انگریزی راج کا زوال۔''[1]

ریچرڈ کے مطابق اس تبدیلی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ وارن ہسٹنگز اور فلپ فرانسیسی کی طرح کے انگریز حکام نے مسیحی اخلاق کو خیر باد کہہ دیا تھا، مستشرقین مشرقی مذہب اور فلسفے کی تعریف کرتے تھے۔ اور کمپنی نے اُن یورپینوں کو رہنے کی ممانعت کر دی تھی جو اُس کی ملازمت میں نہیں تھے یا اُس کا جاری کردہ پاسپورٹ نہیں رکھتے تھے۔

چنانچہ کیری کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن 1798 میں جب جان مرش مین اور ولیم وارڈ بھی آ گئے تو وہ سب سیرم پور میں آباد ہو گئے جو اس وقت کلکتہ سے شمال کی طرف بیس میل کی دوری پر ایک ڈینش نو آبادی تھی۔ نئے بنگال کے ذہن کی تشکیل میں اُن کی مُشترکہ

---

[1] شپلن تشر نے 1802 میں ہندوستان میں پائے جانے والے عام احساس کے متعلق جو کچھ بیان کیا ریچرڈ، محولہ، صفحہ 131۔

کوششوں کو بڑا دخل ہے۔ بنگال میں بیداری پیدا کرنے میں، جس کا مقابلہ کچھ پہلوؤں کی حد تک یورپ کی نشاۃ ثانیہ سے کیا گیا ہے سیریم پور کے مشنریوں کا حصہ کم نہیں ہے۔

کیری کو علم حاصل کرنے کا بے اندازہ شوق اور سائنسی معلومات میں غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اُس نے سنسکرت، بنگالی، مراٹھی، ہندی وغیرہ میں دسترس حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اُس نے نئے عہد نامے کا ترجمہ بنگالی میں کیا اور جلد ہی ایک باصلاحیت زبان دان کی حیثیت سے شہرت پائی۔ ویلزلی نے ہندوستانی سول اور مغربی ملازمتوں کے امیدواروں کی تربیت دینے کے لئے 1801 میں فورٹ ولیم کالج قائم کیا جس میں بنگالی کے استاد کی حیثیت سے اُس کا تقرر کیا گیا۔ اُس ملازمت نے اُس کی ادبی اور سائنسی سرگرمیوں کو تیز تر کر دیا۔ اُس نے صرف ونحو کی ایک کتاب اور ایک سنسکرت کی لُغت تیار کی اور والمیکی رامائن اور دوسری سنسکرت کی قدیم کتابوں کے نئے ایڈیشن مرتب کئے۔ اس کے علاوہ وہ ہندوستانی نباتات کا بڑا ہی سرگرم طالب بن گیا۔

جدید بنگالی کی ابتدا کے سلسلے میں کیری نے جو بڑے بڑے کام کئے اُن میں سے ایک یہ تھا کہ جدید بنگالی نثر کی بنیاد اُس نے ڈالی۔ کیری سے پہلے بنگال میں شاعری کا بیش بہا خزانہ موجود تھا لیکن اٹھارھویں صدی میں اس میں زوال کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ جہاں تک بنگالی نثر کا تعلق تھا اُس میں کوئی بیش بہا کام نہیں ہوا تھا۔ کیری نے بنگالی صرف ونحو لکھی جو اس موضوع پر پہلی کتاب تو نہیں تھی لیکن حقیقت میں سائنسی بنیادوں پر ضرور لکھی گئی تھی۔ یوں ہالا یڈ اُس سے پہلے بنگالی صرف ونحو کے متعلق ایک کتاب لکھ چکا تھا۔ ان دو کتابوں نے بنگالی نثر کی شکل کا تعین کیا۔ صرف ونحو اور لُغت کے علاوہ اس کی تحریروں میں کئی نصابی کتابیں شامل ہیں۔ مثلاً کھتوپ کاتن (گنگو) اور اتہاس مالا (کہانیاں)۔

کیری محض ایک مصنف ہی نہیں تھا بلکہ اُس نے اپنے گرد مصنفوں کا ایک حلقہ بنا لیا تھا۔ مثلاً مری تیون جیا، رام رام بو، راجیولوچن، چندی چرن، موہن پرشاد ٹھاکر اور دوسرے مصنف۔

یہ پنڈت اور منشی بنگال کے ادبی نشاۃ ثانیہ کے اگوا دستے تھے کیری کی سرگرمیاں محض ادب تک محدود نہیں تھیں۔ وہ اصلاحات کا پرجوش حامی بھی تھا۔ عام ہندو دھرم میں بہت سی شرمناک خرابیاں پیدا ہو گئی تھی جنھیں دور کرنا ضروری تھا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم کو اُس نے بہت بڑھایا۔

کیری کے دو ساتھیوں یعنی مارش مین اور وارڈ نے بڑے پر جوش انداز میں اُس کی حمایت کی۔ مارش مین مُعلم تھا اور اُس نے اور اس کی بیوی نے لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے اسکول شروع کئے جو جدید تعلیم کے مرکز بن گئے۔ مسز ہنّا مارش مین نے سیرم پور میں اور دوسرا کلکتہ میں لڑکیوں کا اسکول قائم کیا۔ سیرم پور کے مشنریوں کی قائم کی ہوئی بیپٹسٹ ٹیمپل اسکول سوسائٹی نے لڑکیوں کے لئے کلکتہ، ڈھاکہ، چٹاگانگ اور دوسرے شہروں میں اسکول قائم کئے۔

وارڈ طباعت کا کام جانتا تھا اور اُس نے پہلا چھاپا خانہ قائم کیا۔ جس نے بنگالی حروف کے لئے ٹائپ تیار کئے۔ اس نے سیریم پور میں ایک بڑا چھاپا خانہ قائم کیا جس میں ایک کاغذ سازی کارخانہ اور ایک ٹائپ ڈھالنے کا کارخانہ بھی شامل تھا۔ اس چھاپے خانے میں نہ صرف سیریم پور کے مشنریوں اور فورٹ ولیم کالج کے استادوں کی تیار کی ہوئی کتابیں چھاپی جاتی تھیں بلکہ کول بروک جیسے عالموں اور اس برغ جیسے سائنس دانوں کی بھی۔ اس چھاپے خانے کی وجہ سے ممکن ہو سکا کہ سیریم پور سے بنگالی اور انگریزی کے اخبارات اور رسائل شائع کئے گئے۔

چنانچہ سیریم پور کے مشنریوں کے پہلے گروہ نے ہندوستان کو مغربی فکر سے روشناس کرانے کے لئے کئی طرح کی کوششیں کیں۔ اُن کے جانشین تھے جان کلاکسارش مین (1794-1877) جو ہندوستان کی تاریخ کے متعلق ایک کتاب کا مصنف اور فلکیات اور جغرافیہ کی ایک کتاب کا مترجم تھا۔ فیلکس کیری (1726-1822) ولیم کیری کا بیٹا، اُس نے پہلی بنگالی انسائیکلو پیڈیا تیار کی جس میں انسانی جسم کی ساخت، طب اور کیمیا پر ابواب اور تکنیکی اصلاحات کی فرہنگ شامل تھی۔ ولیم ٹیس (1792-1845) جس نے بنگالی میں طبعی فلسفے اور طبعی تاریخ پر کتابیں لکھیں اور دو جلدوں میں بنگالی زبان کا جائزہ لیا۔

بہت سے دوسرے مشنریوں نے بنگال میں مغربی علم کے بڑھتے ہوئے حجم میں اضافہ کیا یعنی انگریزی کتابوں اور سائنسی موضوعات پر لکھی جانے والی کتابوں کے ترجمے کئے۔ اُن کے ادبی کارناموں کا معیار جو بھی ہو لیکن اس واقعہ سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ہندوستانی فکر کو نئے عوامل مہیا کئے اور قرون وسطی کے بندھنوں کو توڑنے میں ہندوستانی ذہن کی مدد کی۔

IV مشنریوں کے سرگرمیوں کا نیا دور

انگریزی تعلیم کا رواج

1813 میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو ایک نیا چارٹر دیا گیا۔ جہاں سے ہندوستان میں مشنریوں کی سرگرمیوں کی تاریخ کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے۔ چارلس گرانٹ اور ولیم ولبرفورس کی طرح کے مشنریوں کے طاقت ور دوستوں نے پارلیمنٹ کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ چارٹر میں ایک ایسی دفعہ کو شامل کرلیا جائے جس کی رو سے ''ان لوگوں کو از روئے قانون سہولتیں فراہم کی جائیں جو اُن فیض رساں ارادوں کو پورا کرنے کی خاطر ہندوستان جانا چاہتے ہیں۔ یا وہاں رہنا چاہتے ہیں۔'' یعنی مفید علم کو رواج دینے اور مذہبی اور اخلاقی سدھار کی خاطر۔ اُس میں یہ بھی کہا گیا کہ کلکتہ میں اُسقف کا حلقۂ اختیار قائم کیا جائے جس کے اخراجات کے لئے ہندوستان کی علاقائی آمدنی میں روپیہ دیا جائے۔

چارلس گرانٹ جو ہندوستان میں کمپنی کے تحت اہم عہدوں پر فائز رہ چکا تھا اور جس نے بہت دولت پیدا کی تھی، کچھ برسوں کے لئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائرکٹرز کا صدر ہوگیا تھا۔ اُس نے 1792 میں ہندوستان کے لوگوں اور تہذیب کے خلاف فردِ جرم تیار کی تھی جو 1797 میں شائع کی گئی اور اُس وقت بڑے پیمانے پر اُس کی نشر و اشاعت کی گئی جب چارٹر زیر غور تھا۔ سرجان شور اور کلفام فرقے کے دوسرے بااثر اراکین حمایت اور غلامی کی مخالفت کے لئے مشہور ولبرفورس کی پرجوش وکالت کی بنا پر انگلش مشنری سوسائیٹیوں کو اس امر کی اجازت مل گئی کہ پورے برطانوی علاقے میں بلا کسی رکاوٹ کے اپنا کام جاری رکھیں۔ بہت سے مشنری اور پادری بلاتاخیر ہندوستان بھیجے گئے اور انھوں نے شمال اور جنوب میں کئی مقامات پر اپنے مرکز قائم کرلئے۔ تعلیم پھیلانے کے کام میں یورپ اور امریکہ کی سوسائٹیوں نے بھی برطانوی مشنوں کا ہاتھ بٹایا۔

1813 کے چارٹر کے بعد جو سب سے اہم پادری ہندوستان آیا وہ الگزینڈر ڈف تھا۔ (1806-1878) اُس کے ساتھ ہندوستان میں مشنریوں کے کام کا دوسرا مرحلہ شروع ہوا اور

دوسرے مشنریوں کے مقابلے میں اُس نے گہرے نقش چھوڑے۔ بنگال کو مغربی طور طریق سے متعارف کرانے میں بھی اس کا حصہ اتنا ہی اہم ہے۔ 1830 میں جب وہ ہندوستان پہنچا تو ڈف نے دیکھا کہ یہاں مشنریوں کا کام سُست ہے۔ عیسائی مذہب مقبول کرنے والے محض غریب اور کچلے ہوئے لوگ تھے۔ ڈف کے سامنے اہم سوال یہ تھا کہ ''با اثر طبقوں یعنی ہندوستان کی بالائی ذاتوں تک رسائی حاصل کرنے کا کوئی امکانی ذریعہ ہے کہ نہیں؟'' اس کا جواب اُس کی سمجھ میں آیا وہ یہ تھا کہ اس کا امکانی ذریعہ ہے تعلیم اور یہ کہ ہندوستانیوں تک مغرب کی عیسائی تہذیب کا پیغام پہنچانے کے لئے محض انگریزی زبان پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔[1] اُس نے کہا ''میں ایک دفعہ پھر اس بات کو دہراتا ہوں کہ انگریزی زبان وہ ذریعہ ہے جو ہر قسم کی ترسیل کے آلا کار کی حیثیت سے پورے ہندوستان میں حرکت پیدا کر دے گی۔[2] اس لئے انگریزی زبان جاننا ہندوستانیوں کے لئے بہت ضروری ہوگا۔ کیا ہندوستان کے وہ بالائی طبقے جنھوں نے ابھی تک علم وحکومت کے میدان میں دوسروں کی قیادت کی ہے ''انگریزی کی طرف بے نیازی کا رویہ اختیار کریں گے۔'' اس کا جواب ہے 'نہیں'۔ قدیم بالائی طبقات ممکن ہے بدیسی زبان کو حقیر سمجھیں لیکن نیا متوسط طبقہ ان مواقع سے فائدہ اٹھانے کے لئے بے چین ہے جو نیا نظام انھیں دے رہا ہے۔ انگریزی اُس تصویر کی طرح جو دولت اور اثر کے نئے نئے میدان کھول دیتا ہے۔ مادی فوائد سماجی حیثیت اور ذاتی وقار میں اضافہ کر دیں گے۔

ڈف نے فیصلہ کر لیا کہ مشنری کام کا نیا رُخ ہونا چاہئے اسکولوں اور کالجوں کے ذریعہ ہندوستانی نوجوان کو مسیحت کے زیر اثر لانا۔ اُسے اُمید تھی کہ اُس کے ذریعہ وہ ہندوستانی سماج کے بالائی حلقوں تک رسائی حاصل کر سکے گا ہندوستان کے لوگوں کو مسیحت کے متعلق عام معلومات فراہم کر سکے گا اور بہترین ہندوستانی خاندانوں سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کو عیسائی بنا سکے۔

ڈف نے رام موہن رائے سے ملاقات کی۔ مغرب کے نمائندے اور انگریزی تعلیم کے

---

[1] ایچڑ۔ جے محولہ بالا، صفحہ 177

[2] الیگزینڈر ڈف کی تقریر جنرل اسمبلی میں 25 مئی 1835۔ دیکھئے سین۔ پی، Western Influence in Bengal Literature (کلکتہ یونیورسٹی۔ 1932، صفحہ 75)

ذریعہ ہندوستانی توہم پرستوں کو عیسائی بنانے کی پرجوش حامی کی ملاقات اُس زمانے کے سرکردہ ہندوستانی سے ہوئی جو نئے دور کا نقیب تھا اور خود بھی بڑی سختی کے ساتھ اس خیال پر قائم تھا کہ مادروطن کی کوئی عظمت کو بحال کرنے کے لئے جدید علم کا پھیلانا ضروری ہے۔ دونوں کے مقاصد میں بعد المشرقین تھا۔ اول الذکر اس اقدار کو ختم کرنا چاہتا تھا جنھیں ہزاروں سال سے ہندوستان اپنے سینے سے لگائے ہوئے تھے اور آخر الذکر چاہتے تھے کہ قدیم دین کو صدیوں کی خرابیوں اور برائیوں سے پاک کر کے جادواں بنادیں۔ پھر بھی فوری مقصد کو پورا کرنے یعنی مغربی تعلیم کو پھیلانے کی خاطر دونوں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کو تیار ہو گئے۔ 1830 میں ڈف نے اپنا اسکول کھولا جہاں انجیل کی تعلیم کو ایک اہم مقام حاصل تھا۔

اس میں شک نہیں کہ الگزینڈر ڈف عجیب وغریب انسان تھا جس کا حکومت اور ہندوستانی سماج پر دوررس اثر پڑا وہ انگریزی تعلیم کی زوردار وکالت کرتا تھا۔ اُس نے مشن اسکولوں کا ایک جال بچھا دیا جہاں عیسائی مذہب کی تعلیم کے ساتھ مغربی علم پڑھائے جاتے تھے۔ کلکتہ کے اہم خاندانوں یعنی مکرجی، بنیرجی، چکرورتی، گھوش، مجمدار، دت، سرکار، ناتھ، گنگولی وغیرہ سے تعلق رکھنے والے بہت سے ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے میں اُس نے کامیابی حاصل کی۔ اُن میں سے کچھ نے بنگال میں خاص اہمیت حاصل کر لی مثلاً کرشن موہن بنرجی، گوپی ناتھ مندی، ہیش چندر گھوش، آنند چندر مجمدار اور لال بہاری ڈے۔

انگریزی تعلیم کے لیے ڈف کی حمایت ہی اہم وجہ تھی جس نے بینٹک کو 7 مارچ 1835 کی مشہور تجویز جاری کرنے پر آمادہ کیا۔ جس میں انگریزی تعلیم کی موافقت میں حکومت کی نئی پالیسی کا اعلان کیا گیا تھا اور اس فیصلے کا بھی اعلان کیا گیا تھا کہ کمپنی کے ڈائرکٹروں نے جو رقم منظور کی ہے وہ یورپین سائنس اور ادب کی ترویج اور برطانوی تہذیب کو ترقی دینے پر صرف کی جائے گی۔

اُس کے کام ہندوستان میں مشنوں کی پالیسی پر بھی اثر انداز ہوئے۔ پورے ملک میں مشنری سوسائٹیوں کی مدد سے ایسے کالج وجود میں آگئے جہاں مغربی اور مغربی ادب سائنس کی تعلیم دی جاتی تھی۔ بمبئی میں ولسن کالج 1832، مدراس میں کرسچن کالج 1837، ناگپور میں ہسلوپ

کالج 1844، آگرہ میں سنت ہانس کالج 1853 اور سوٹیم میں نوبل کالج 1841 ڈف کی جنرل اسمبلی کے ادارے 1830 کے خطوط پر قائم ہوئے جو بعد میں 1908 اسکاٹش جرچیز کالج کلکتہ میں ضم ہوگئی۔

انیسوی صدی کے وسط میں مشنریوں نے جو کام کئے اُن کا جائزہ لیتے وقت اُن کی دوہری یعنی تعمیری اور تخریبی نوعیتوں کو دھیان میں رکھنا چاہئے۔ تعمیری کاموں میں اہم ہیں۔ تعلیمی ادبی کام، سماجی اصلاح اور طبی سہولتیں۔

جہاں تک تعلیم کا تعلق ہے اس بات کو نہیں بھولنا چاہئے کہ جدید ابتدائی اسکولوں کا قریب قریب پورا نظام عیسائی مشنوں کی مدد سے چل رہا تھا، یہ کہ ہائی اسکولوں میں تعلیم پانے والے طالب علموں کی نصف تعداد، اُنکے اسکولوں میں بڑھتی تھی اور یہ کہ کالجوں کی بڑی تعداد کے اخراجات وہ برداشت کررہی تھی۔ عورتوں کی تعلیم اور اُن کے رہنے کے لئے اقامات گاہوں کا نظام بڑی حد تک اُن کی ذمہ داری تھی۔

اس کے علاوہ نثری اسلوب اور نثری ادب کی تخلیق بڑی حد تک مشنریوں کی دین ہے۔ جدید ہندوستانی زبانوں میں ایسے لکھنے والوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی جنھوں نے سنجیدہ خیالات کے اظہار کے لئے نثر کا مناسب اسلوب پیدا کرلیا ہو۔ اس میدان میں اولیت کا سہرہ مشنریوں کے سر ہے۔ نثر کی تخلیق کرنے والوں میں وہ لوگ شامل تھے جنھوں نے انجیل کا ترجمہ ہندوستانی زبانوں میں کیا یعنی کیری، براؤن، نیولن، اسکنر، بیلی، گرون ڈرٹ وغیرہ۔ انھوں نے صرف ونحو کی کتابیں اور لغت تیار کئے اور اس طرح زبانوں کی ہیئت اور موضوع کا تعین کیا۔ اُن کی ادبی کاوشیں محض مذہبی رسالوں اور کتابوں تک محدود نہیں تھیں بلکہ انھوں نے اسکولوں کے لئے نصابی کتابیں تیار کیں۔ بین کے پلگرمس پروگریس کی طرح کی کتابوں کے ترجمے کئے اور ہندوستان کے مذاہب، ذاتوں اور دیومالاؤں کا بیان کتابوں میں کیا۔

تعلیم کے میدان میں ہندوستان میں عورتوں کے لئے اسکول، کالج اور اقامت گاہیں کھولنا خصوصی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لئے کہ وسطی دور کے ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم پوری طرح نظر انداز کی گئی تھی۔ گھروں اور سماج میں اُن کا جو اثر ہے اُس کے پیش نظر اُن کی تعلیم کی قدر و قیمت

اُس سے کہیں زیادہ ہے جو اُن کی تعداد ظاہر کرتی ہے۔ تعلیم یافتہ عورتوں نے ملک کی عوامی زندگی میں روز افزوں حصہ لیا اور آزادی کی جدوجہد میں پوری طرح شریک ہوئیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی بیداری کا پہلا مرحلہ عیسائی مشنوں کا مرہونِ منت تھا۔

اگر اُن کے مثبت رول سے نظر ہٹا کر مشنریوں کے دوسرے کاموں پر توجہ دی جائے، تو یہ معلوم ہوگا کہ نتائج کی حد تک وہ بھی اُتنے ہی مؤثر تھے لیکن وہ نتائج مختلف قسم کے تھے۔ یہ تھے اُن کے تبلیغی کام جن میں عیسائی مذہب کے عقیدوں اور اصولوں کی تبلیغ اور دوسرے ہندوستانی مذاہب پر اُن کے خطیبانہ حملے شامل تھے۔ تعلیم میں ابھی اُس مقصد کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھا جاتا تھا۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ ''جب کوئی استاد چاہئے وہ ہندو ہو، مسلمان ہو یا عیسائی ہو سائنس اور ریاضیات کا درس دیتا ہے۔ تو وہ لوہے کی ایک سلاخ سے ہندو دھرم کے مٹی کے بنے ہوئے برتنوں کو پاش پاش کرتا ہے۔''[1]

اٹھارھویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں کے نصف اوّل کے پروٹسٹنٹ مشنری مذہب میں آنے والے انقلاب کے دور کے پیداوار تھے جس کی ابتدا پیٹرم اور مورونیزم سے ہوئی اور میتھاڈازم تک پھیل گیا۔ س یہ احیا اور جذبات کے افراط کا زمانہ تھا۔ اُن کا عقیدہ تھا عیسائی اخلاق اور راست بازی کے ذریعہ ترقی کرنا اور مسیحی اصولوں کے ذریعہ سماج کی اصلاح کرنا اور دنیا کو سدھارنا۔ کلیسی فرقہ کے اراکین کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اسکول، جیل کا نظم و ضبط، بچت کے بنک، راستے، گاؤں کے کتب خانے، گاؤں کی آمدورفت اور گرجا کی عمارتیں ان میں سے ہر ایک کچھ زمانے کے لئے ان کے وسیع المشرب پروجیکٹوں میں تھے۔ انسانی دلچسپی کے ہر کام کی کوئی نہ کوئی نگرانی کرتا تھا اور دنیا کے ہر خطے میں اُن کے نمائندے تھے۔[2]

احیا پرستی کی شراب تیز ہے اور جو پروٹسٹنٹ مشنری ہندوستان آئے اُنھیں اس نے سرشار کر دیا تھا۔ اُن میں عیسائی مذہب کی اصلاح کرنے والوں کا شدید تعصب اور سختی سرایت کر گئی

---

1. اشروک، جے۔ اے۔ South India Mission و (ویسٹ منسٹر 1710) صفحہ 227

2. اورٹون جے۔ ایچ The Frangehra revival in the 18 Century تاریخ کلیس کے ادوار، صفحہ 48

تھی۔ ولبرفورس کی طرح وہ بھی سمجھتے تھے کہ ہندوستان ''تاریکیوں کا مسکن اور پست و ذلیل علاقہ ہے اور ہندوستان کی توہم پرستی کے بے اندازہ گہرائی پر شدید کراہیت کے اظہار میں'' اس کے ہمنوا تھے۔ چنانچہ ہندودھرم، اسلام اور ہندوستان کے دوسرے مذاہب کی مذمت کرنے میں وہ احتیاط سے کام نہیں لیتے تھے۔ اُن کی تقریر میں اور تحریر میں ہندوستانی مذاہب و اخلاقی طور طریق، رواجوں، تیوہاروں، تقریبوں اور رہن سہن کے خلاف گالیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں کسی کو نہیں بخشتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر مذہب کی حیثیت سے وہ اسلام پر زیادہ تنقید نہیں کر پاتے تھے تو وہ اُن کی سیاست کی مخالفت کرکے اس کمی کو پورا کر لیتے تھے۔ بہرحال انگریزوں نے ہندوستانی سلطنت مسلمانوں سے جیتی تھی اور انھیں اپنا دشمن سمجھتے تھے۔ اُس وقت اُن دونوں میں صرف اتنا فرق تھا کہ ہندوؤں کو وہ زیادہ چالاک اور نرم تصور کرتے تھے اور مسلمانوں کو زیادہ گھمنڈی اور ہمت والے۔

V تعلیم کی طرف حکومت کا رویہ

اپنی برائیوں کے باوجود مشنریوں کی تعلیمی سرگرمیوں نے وہ ضرورت پوری کردی جس کو ہندوستان کے اُبھرتے ہوئے نئے طبقے محسوس کررہے تھے۔ انھیں معلوم ہوا کہ افادیت اور سماجی وقار دونوں کے اعتبار سے انگریزی زبان کا جاننا ضروری ہے۔ تجارتی کاموں میں انھیں انگریز تاجروں سے سابقہ پڑتا تھا اور اُن سے خود انہی کی زبان میں بات کرنا ظاہر ہے کہ زیادہ مفید تھا۔ اس کے علاوہ ملازمت کے تعلق سے بھی چاہے وہ بدیسیوں کی نجی کمپنیوں میں یا کمپنی کے انتظامیہ میں انگریزی سے نابلد ہندوستانی کے مقابلے میں انگریزی جاننے والے ہندوستانیوں کو ترقی کے زیادہ مواقع ملتے تھے۔ انگریزی جاننا ویسے بھی مفید تھا۔ اس لئے کہ اُس کی بنا پر ایک ہندوستانی آسانی کے ساتھ انگریزوں سے راہ و رسم پیدا کرسکتا تھا اور اس طرح خود اپنے طبقے کے لوگوں میں ایک نمایاں حیثیت حاصل کرسکتا تھا۔ انگریزوں کو بھی اس میں سہولیت تھی اگر وہ کسی ہندوستانی تاجر ایجنٹ یا ماتحت کے ساتھ انگریزی زبان میں کاروباری گفتگو کرسکتے تھے۔

پہلے کچھ ہندوستانیوں نے انگریزوں کے ساتھ رابطہ کی بنا پر انگریزی سیکھ لی۔ اس کے بعد

اُن نجی اسکولوں میں انگریزی سیکھی جو انگریز چلا رہے تھے۔ کمپنی کے فوج سے بھاگے ہوئے لوگوں اور انگریز تاجروں نے بھی بہت سے ہندوستانیوں کو انگریزی سکھائی۔ ابتدا ہی میں مشن اسکول قائم ہو چکے تھے انھوں نے انگریزی میں تعلیم دی۔ جوں جوں یہ زبان پھیلتی گئی ویسے ویسے اس کی مانگ بڑھتی گئی۔ جب کمپنی بنگال کے صوبے کی حکمراں بن گئ تو انگریزی کی تعلیم کے لئے محرکات پیدا ہو گئے۔ جن انگریز افسروں پر انتظام کی ذمہ داری ہوتی تھی انھیں فارسی سیکھنی پڑتی تھی۔ اُن کے لئے فارسی سیکھنا خاصا دشوار کام تھا۔ اس لئے وہ ملازمت کے تعلق سے انگریزی جاننے والے ہندوستانیوں کو ترجیح دیا کرتے تھے۔ چنانچہ دونوں میں انگریزی زبان کو رواج دینے کی خواہش پائی جاتی تھی۔

جب انگریزی زبان کے متعلق ہندوستانیوں کی معلومات میں اضافہ ہوا تو وہ انگریزی ادب اور سائنس کی بھی قدرت و قیمت سمجھنے لگے۔ افادیت کے تصور میں ذہنی تلاش کا اضافہ ہو گیا جس نے انگریزی سیکھنے کی خواہش اور بڑھا دی۔

فارسی کا استعمال بہر حال ختم ہونا تھا۔ اب وہ حاکموں کی زبان نہیں رہی تھی۔ وہ محکوموں کی بھی زبان نہیں تھی۔ مسلمانوں کی مذہبی زبان تھی عربی اور ہندوؤں کی سنسکرت۔ اس میں شک نہیں کہ کئی سو سال تک تعلیم یافتہ مسلمانوں اور تعلیم یافتہ ہندوؤں نے فارسی کی آبیاری کی تھی لیکن نئ حکومت کے زمانے میں اس کی افادیت کا زمانہ ختم ہو رہا تھا۔

انگریزی حکومت کے ابتدائی برسوں ہی میں یہ خیال تقویت پا رہا تھا کہ انگریزی کو حکومت کی زبان ہونا چاہئے۔ چارلس گرانٹ کی طرح کے لوگ اس خیال کی وکالت کر رہے تھے اس لئے کہ اُن کا خیال تھا کہ ''ظلمت زدہ'' ہندوستانیوں کی تجارت کا واحد ذریعہ مغربی علم کی روشنی اُن تک پہنچانا اور وہ ذریعہ جس سے یہ روشنی پہنچائی جا سکتی ہے انگریزی زبان ہے۔ گرانٹ نے کہا ''ہمارے مشرقی مقبوضات...... وہ ہمارے ہیں ہم ان پر مدتوں سے قابض ہیں۔ بہت سے انگریز وہاں کے مقامی لوگوں کے درمیان رہتے ہیں۔ ہماری زبان وہاں اجنبی نہیں اور اُس کو زیادہ پھیلانا ایک قابل عمل امر...... سب سے پہلے انگریزی سکھائی جانی چاہئے جو دوسرے علوم کو سکھانے کا ذریعہ ہے..... محکوموں کو حاکموں کے مماثل بنانے کا بین ذریعہ ہے حاکموں کی زبان کو

رواج دینا۔"[1]

اس کی کچھ اور وجوہ بھی تھیں۔ حکام کا کہنا تھا کہ مالگزاری یا سیاسی انتظام کے معاملات میں محکوم لوگوں کی اصلاحات استعمال کرنا حاکموں اور محکوموں کے درمیان ترسیل خیالات کے ایک آسان راستے کو نظر انداز کرنا اور ایسے اعلیٰ عہدیداروں تک رسائی حاصل کرنے سے انھیں محروم رکھنا جو اُن کی زبان نہیں جانتے ہیں، محض حماقت ہے۔

آخری بات یہ تھی کہ مغربی ادب اور سائنس کا علم نہ صرف اُن کی ذہنی غلامی کو ختم کردے گا بلکہ تمام معاملات میں معقولیت پسندی کو رواج دے گا، زمین، آب وہوا اور حالات سے مناسب انداز میں فائدہ اٹھانے کی اہلیت بڑھا دے گا اور زندگی کی آسائشوں اور آسانیوں میں اضافہ کردے گا۔

گرانٹ کو یہ خوف بھی نہیں تھا کہ تعلیم کا فروغ برطانوی سلطنت کے خاتمے کا باعث ہوگا۔ اُس کا خیال تھا کہ مغربی تعلیم کی بنا پر حکمراں اور محکوم ایک دوسرے کو زیادہ سمجھ سکیں گے۔ ہندوستان کے لوگوں میں جذبۂ احسان مندی پیدا ہوگا اور ہندوستان میں برطانوی تجارت بڑھ جائے گی۔

لیکن جہاں تک کمپنی کے کورٹ آف ڈائریکٹرز کا تعلق تھا اُن دلیلوں میں سے کسی کا اثر انھوں نے قبول نہیں کیا۔ وہ اپنی حکومت کے استحکام پر تعلیم کے مضر اثرات سے خائف رہے۔ اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر انگریزی حکومت خود انگلستان کے لوگوں کی تعلیم کے متعلق کچھ نہیں کر رہی ہے تو ہندوستانی رعایا کی تعلیم کا خرچ برداشت کرنا کمپنی کے لئے قبل از وقت ہے۔

چنانچہ 1765 سے 1813 تک کمپنی نے عام تعلیم کی اہمیت افزائی کرنے کے سلسلے میں کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ لیکن کمپنی کا یہ خیال ضرور تھا کہ ہندوستانی حکمرانوں کے ہاتھوں سے اختیارات منتقل ہونے کے بعد اُس کے پیش روؤں کے کچھ فرائض ادا کرنے کی ذمہ داری اُس پر ہے یعنی عالموں کی سرپرستی اور مدرسوں اور ٹولوں میں اعلیٰ تعلیم کے لئے اوقاف کی۔ اس کی ضرورت بڑھ

---

[1] گرانٹ، سی، Observation on the State of Society Among the Asiatic Subjects of Great Britain دیکھئے Report of the Committee of House of Common on the Affairs of the East India Company 16 اگست 1832 تا ضمیمہ 1۔

جانے کی ایک وجہ یہ تھی کہ قانون کے نفاذ اور انصاف کرنے کے لئے ایسے عالموں کی ضرورت پڑتی تھی جو ہندو اور مسلم قوانین سے اچھی واقفیت رکھتے ہوں۔

چنانچہ وارن ہسٹنگز نے 1780 میں کلکتہ مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ اُس کا مقصد تھا کلکتہ کے مسلمانوں کو خوش کرنا۔[1] اور ریاست کے ذمہ دار اور منافع بخش عہدوں کے لئے مسلمان شرفا کے بیٹوں کو تیار کرنا۔ جن پر اس وقت بھی زیادہ تر ہندو فائز تھے اور عدالت کے لئے بنا صلاحیت حکام پیدا کرنا۔

اُس کے بعد ریزیڈنٹ جوناتھن ڈنکن نے 1791 میں بنارس سنسکرت کالج قائم کیا اُس کے مقاصد کچھ اُسی قسم کے تھے جیسے کلکتہ مدرسہ کے یعنی ہندوؤں کو خوش کرنا۔ ویلزلی کے فورٹ ولیم کالج کا مقصد جو 1801 میں کھولا گیا تھا کمپنی کے انگریز سول ملازمین کو تعلیم دینا تھا۔ لیکن اس کے اساتذہ سے درسی کتابیں، صرف ونحو کی کتابیں اور ہندوستانی زبانوں کی نصاب تیار کرنے اور دوسری زبانوں میں کتابوں کے ترجمے کرنے کا بھی کام لیا گیا۔ اس کا اصل کارنامہ تھا ہندوستانی ادب اور خصوصیت کے ساتھ نثر کو ترقی دینا۔

کلکتہ مدرسہ اور بنارس ہندو کالج کے قیام، ہندوستانی کی کلاسیکی زبانوں میں دلچسپی لینے والے انگریز عالموں مثلاً ولکنس، ولیم جونس، کولبروک وغیرہ کی تحقیق وتفتیش اور انگلستان میں تعلیم کے متعلق بڑھتے ہوئے جوش کا اثر ہندوستان کے حاکموں کے خیالات پر بھی پڑا۔ 1811 میں لارڈ منٹو نے ایک روداد لکھی جس میں ہندوستان کے لوگوں میں ادب اور سائنس کے روز افزوں زوال کی طرف توجہ دلائی گئی تھی جس کی وجہ اُس کے بقول تھی، ''اُس قسم کی ہمت افزائی کی کمی جو مقامی حکومتوں کے تحت والیان ریاست، سرداروں اور دولت مند افراد کی طرف سے کی جاتی تھی۔''[2] اور اُس نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ برطانوی حکومت ہندوؤں کے ادب کی آبیاری میں ناکام تھی۔

---

[1] ہوویل کرتے Educational in British India کلکتہ 1872

[2] لارڈ منٹو کی روداد مورخہ 6 مارچ دیکھئے یو۔اے۔این۔ Indian Eduaction in Parliamentary Paper حصہ 1832، (1952)، 144

1813 تک انگلستان کی رائے عامہ اس حد تک بیدار ہو چکی تھی کہ چارٹر میں ایک دفعہ شامل کی گئی کہ ''وہ رقم ایک لاکھ روپے (10000 پاؤنڈ) سے کم نہیں ہوگی جو ہر سال ادب کی ترقی، ہندوستانی عالموں کی ہمت افزائی اور ہندستان میں برطانوی علاقوں کے باشندوں میں سائنسوں کے علم کے رواج اور ترویج کے لئے مختص کی جائے گی۔

لیکن اس دفعہ پر 1823 تک عمل نہیں کیا گیا۔ 1813 سے 1833 تک کسی ایک سال میں 10,000 پاؤنڈ کی پوری رقم خرچ نہیں کی گئی۔ اُس کے بعد تعلیم کے اغراض و مقاصد اور طریقوں کے متعلق کمپنی کے حاکموں میں اختلافات رونما ہو گئے۔ بالآخر میکالے کے مشورہ پر بینٹک نے 7 مارچ 1835 کی تجویز منظور کر کے اس نزاع کو ختم کیا۔

VI غیر سرکاری ایجنسیوں کا کام

عام تعلیم کی طرف سے کمپنی اور اُس کو فروغ دینے کی خواہش کے باوجود درمیانی زمانہ محض بے کاری کا نہ تھا جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے تعلیم کے میدان میں مشنریوں نے تھوڑا بہت کام کیا تھا۔

مشنریوں کے علاوہ خود ہندوستانی بھی جدید تعلیم کی ضرورت کو محسوس کرنے لگے تھے۔ حالانکہ اُن کے پاس وسائل کم تھے اور مواقع بھی انھیں زیادہ حاصل نہیں تھے۔ لیکن ہندوستانی لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے مغربی تعلیم کا انتظام کرنے کے سلسلے میں خوش قسمتی سے انھیں سرکاری اور غیر سرکاری انگریزوں کا تعاون حاصل تھا۔

ان تعاون کا سب سے پہلا نتیجہ تھا 1817 میں ہندو کالج یا ودیالیہ کا قیام۔ ہندوستان میں مغربی تعلیم کے سب سے بڑے حامیوں میں شامل تھے رام موہن رائے اور ڈیوڈ ہیر جو گھڑی سازی اور زیورات بیچنے کا کام کرتا تھا اور کلکتہ میں آباد ہو گیا تھا تا کہ اپنی زندگی تعلیم، سماجی اصلاح اور برل اداروں کے لئے وقف کر دے۔ ڈیوڈ ہیر کی بڑی خواہش تھی کہ وہ انگریزی زبان و ادب اور یورپین سائنسوں کی تعلیم دینے کے لئے ایک کالج قائم کرے۔ اپنے سیکولر نقطۂ نظر اور سنسکرت کو نظر انداز کرنے کے باوجود اسے بہت سے اہم ہندوؤں کا اور سر ایڈورڈ ہائڈ ایسٹ کی حمایت

حاصل ہوگئی جو کلکتہ و چیف کورٹ کا چیف جسٹس تھا۔ اُن کی مدد سے اُس نے ایک کمپنی بنائی اور روپیہ جمع کیا۔ رام موہن رائے نے اس کمیٹی سے علیحدہ رہنا مناسب سمجھا، اس لئے کہ ہندو دھرم اور سماجی اصلاح کے تعلق سے اُن کے ترقی پسند خیال کو لوگ ناپسند کرتے تھے۔

اس طرح جو کالج معرض وجود میں آیا وہ محض ہندو طالب علموں کے لئے تھا۔ اُس کے طالب علموں کی تعداد جلد بڑھنے لگی اور 1828 تک اُس میں 436 طالب علم ہو گئے تھے۔ اس دوران اس کا انتظام ناکارہ لوگوں کے ہاتھوں میں آ گیا جس کی وجہ سے جنرل کمیٹی کو مداخلت کرنی پڑی اور ایک وزیر مقرر کر دیا گیا۔ بالآخر حکومت نے اسے اپنے ہاتھ میں لے لیا اور 1855 میں پریسیڈنسی کالج میں ضم کر دیا۔

رام موہن رائے جو انگریزی تعلیم کے بڑے پرجوش حامی تھے، 17-1816 میں اپنے خرچ سے ایک انگریزی اسکول قائم کر چکے تھے جہاں اُن کے بیٹے رام پرساد اور اُن کے دوست مہارشی دوارکا ناتھ ٹیگور کے بیٹے ربندر ناتھ ٹیگور نے تعلیم پائی۔ اسکول کے علاوہ انھوں نے ویدانت کالج بھی قائم کیا جہاں جدید فکر کی روشنی میں ہندو فلسفے اور دوسرے علوم کا مطالعہ کیا جاتا تھا۔

ہندو کالج کے ابتدائی زمانے میں عقیدہ و نظریہ کے متعلق اُس کے طالب علم ہندوؤں کے پرانے خیالات کی ضرورت سے زیادہ کھلم کھلا عدول حکمی کے لئے بدنام ہو گئے تھے۔ تغیر کی ہوا چلنے لگی تھی۔

ایک اور غیر سرکاری ایجنسی جو تعلیمی کام کر رہی تھی کلکتہ اسکول سوسائٹی تھی جو 1819 میں ابتدائی تعلیم کے لئے اسکول قائم کرنے اور استادوں کو تربیت دینے کی خاطر قائم کی گئی تھی۔ 1823 میں اُسے حکومت کی طرف سے مالی امداد ملی۔

جدید تعلیم پھیلانے کے سلسلے میں نجی کوششوں کی کامیابی نے ظاہر کر دیا کہ تعلیم کی مانگ تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ کمپنی کی حکومت کو جو ابھی تک تعلیمی معاملات میں دلچسپی نہیں لے رہی تھی مجبوراً اس مسئلے کی طرف توجہ مبذول کرنی پڑی۔

VII انگریزی تعلیم کی کامیابی

اڈم نے جو عارضی طور سے گورنر جنرل کا عہدہ سنبھالے ہوئے تھا 1823 میں تعلیمات عامہ کی ایک کمیٹی مقرر کی جس کے دس رکن تھے۔ جن میں ایچ۔ آئی پرنسب اور ایچ۔ ایم ولسن بھی شامل تھے اور اُن کے ہاتھوں میں ایک لاکھ روپیہ سالانہ کی گرانٹ بقایا جات اور اُس وقت موجود اداروں کے لئے منظور ہونے والی رقمیں دیں۔

اس کمیٹی کے سامنے دو سوال تھے۔ پہلا تھا دی جانے والی تعلیم کے نوعیت کا فیصلہ کرنا اور دوسرا تھا اس امر کا تعین کرنا کہ یہ تعلیم کس کو دی جائے۔ سوال یہ تھا کہ تعلیم کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے روایتی علوم تک محدود رکھا جائے جو سنسکرت اور عربی زبانوں میں پائے جاتے ہیں یا اس کی توسیع مغربی سائنسوں اور مغربی زبان اور ادب تک کی جائے۔ دوسرا سوال تھا کہ آیا تعلیم کو مختلف بالائی طبقوں تک محدود رکھا جائے یا اس اسکیم میں عام لوگوں کو بھی شامل کیا جائے۔

کمپنی میں مستشرقین کو غلبہ حاصل تھا جو بڑی سختی سے اس رائے پر قائم تھے کہ ''یہ دیکھتے ہوئے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں میں ابھی تک اس قسم کے میلانات پائے جاتے ہیں اور کسی مفید بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے لئے ذرائع موجود نہیں ہیں اس لئے ہمارے خیال میں یہ بات ضروری ہے اور سرکاری ادارے بالترتیب ان طبقات کو ہمیں امید ہے (زیادہ دن تک نہیں) مسلم اور ہندو ادب سائنس کی تعلیم دیں گے۔''[1]

اُن کی مخالفت کورٹ آف ڈائریکٹرز کر رہا تھا۔ جو بینتھم کے شاگرد جیمس مل بشپ ہیر اور انگریز انڈوڈف کی طرح کے کئی عیسائی مشنریوں اور رام موہن رائے کی قیادت میں ہندوؤں کے ترقی یافتہ طبقے کے زیر اثر عمل کر رہا تھا۔ رام موہن رائے نے لارڈ امیرہیسٹ کو ایک سخت خط لکھا تھا جس میں کلکتہ کے سنسکرت کالج کی مخالفت کی تھی اور سنسکرت پڑھانے کی مذمت کی تھی۔ اس بات کی طرف سے اشارہ کرنے کے بعد کہ اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا ہے کہ نوجوان کی زندگیوں کے بہترین بارہ سال بیکرن (ویاکرن) اور سنسکرت کی صرف ونحو کی باریکیوں کو سمجھنے میں

---

[1] کورٹ آف ڈائریکٹرز کو کمیٹی کا جواب 18 اگست 1824، دیکھئے ہوویل، اے۔ محولہ صفحہ 17

صرف ہوجائیں۔''[1] یا ویدانیت کے یا میمنا یا نیا یا کے خیالی گھوڑے دوڑائے جائیں جو نوجوانوں کے سماج کے اچھے رکن بننے میں معاون نہیں ہوتے ہیں۔ رام موہن رائے نے مزید کہا ''لیکن چونکہ حکومت کا مقصد ہے مقامی آبادی کی ترقی اس لئے اس کو تعلیم کے زیادہ لبرل اور روشن خیال نظام کو فروغ دینا چاہئے جس میں ریاضیات طبعی فلسفے، کیمیا، انسانی جسم کی ساخت کا علم اور دوسری مفید سائنس شامل ہے۔ یہ کام معینہ رقم سے کیا جاسکتا ہے۔ یورپ میں تعلیم پائے ہوئے باصلاحیت اور باعلم حضرات کو ملازم رکھا جاسکتا ہے، اور ایسا کالج قائم کیا جاسکتا ہے جس میں ضرورت کی کتابیں، آلات اور دوسری اشیا موجود ہوں۔''[2]

گورنر جنرل کی کونسل کے نئے قانون ساز ممبر کی حیثیت سے جب میکالے 1834 میں ہندوستان آیا تو اس مخالفت کو اور تقویت مل گئی۔ وہ تعلیم کی کونسل کا صدر مقرر کیا گیا اراس کے اختیارات واثرات کی بنا پر انگریزی تعلیم کا پلہ بھاری ہوگیا۔ اُس نے 2فروری 1835 کو اپنی مشہور روداد گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹک کو پیش کی اُس کی دلیلوں اور متوازن جملوں کے اسلوب سے متاثر ہوکر بینٹک نے اُس پالیسی کو منظور کرلیا جس کی سفارش میکالے نے کی تھی۔ اس کے علاوہ میکالے نے وہ واقعات پیش کئے تھے جو اس طریقے کار کی حمایت کرتے تھے۔ مثال کے طور پر یہ کہ ہندوستانی انگریزی تعلیم کے حامی ہیں اور اُس کو حاصل کرنے کا خرچ برداشت کرنے کو تیار ہیں جب کہ سنسکرت اور عربی پڑھنے کے لئے انھیں رقمیں دینا ہوتی ہیں اور ان کے نوجوانوں نے کمیٹی کے سامنے عرضداشت پیش کی ہے جس میں اپنی زبوں حالی کی طرف توجہ مبذول کرائی۔ اس لئے سنسکرت کالج میں مدتوں وہاں کے وسیع لغات کا مطالعہ کرنے کے بعد بھی اس کی کوئی امید نہیں کہ اُن کے حالات بہتر ہوسکیں جب کہ اسکول بک سوسائٹی کی چھاپی ہوئی 31,000 انگریزی کی کتابیں دوسال میں بک گئیں سنسکرت اور عربی کی اتنی کتابیں تین سال میں نہیں بکی ہیں اُن کی طباعت کے اخراجات تو درکنار اُن کو دو مہینے تک گودام میں رکھنے کے

---

[1] The English work of Raja Ram Mohan Ray تبدین گھوش جے۔سی۔جلد (کلکتہ 1901) صفحہ 326

[2] ایضاً صفحہ 327

اخراجات بھی نہیں نکل سکیں۔''[1]

بینٹک اس پر آمادہ ہوگیا کہ حکومت جو رقم خرچ کرنا چاہتی ہے وہ مفید علم کی تعلیم دینے پر صرف کی جائے اور اس طرح وہ اس خیال سے متفق ہوگیا کہ ہندوستانیوں کے اُبھرتے ہوئے طبقے کو تعلیم دینے کا مقصد ہے مغربی علوم کو رواج دینا۔ جس کی وجہ سے ایک ایسا طبقہ وجود میں آجائے گا جو خون اور رنگ کے اعتبار سے ہندوستانی ہوگا لیکن مذاق، رائے، اخلاق اور ذہن کے اعتبار سے انگریز ہوگا۔'' یا معمولی لفظوں میں کہا جاسکتا ہے کہ جدید ذہن رکھنے والا ہندوستانی ہوگا۔

یہ فیصلہ ہندوستان کی رائے عامہ کے مطابق تھا۔ جو جنگ اور امن کے معاملات اور انتظام و صفت کے طریقوں میں مغربی فاتحین کی مسلمہ برتری سے متاثر تھی۔ اُن کے صحت مند طبعی میلانات نے اُن پر یہ بات روشن کردی کہ ترقی کی منزل تک پہنچنے کا راستہ زندگی کے متعلق نئے نقطۂ نظر، نئے انداز فکر اور نئے طور طریق کا راستہ ہے۔ نئے طبقے کی توقعات کے سب سے نمایاں شارح تھے رام موہن رائے۔ لیکن بہت سے کٹّر اور دقیانوسی خیالات رکھنے والے ہندوستانی بھی اس کی ضرورت محسوس کرنے لگے تھے۔ اور انھوں نے بھی مغربی تعلیم اور علم کے پرچار کی اسکیموں کی حمایت کی۔

ہندوستانیوں میں انگریزی تعلیم کے رواج نے برطانوی انتظامیہ کی ضرورتیں بھی پوری کر دیں۔ ماتحت خدمات پر بہت سے ہندوستانیوں کا تقرر ایک انتظامی ضرورت تھا۔ مغربی انداز سے سوچنے کی تربیت نے ایک مغربی انتظامی ڈھانچے کا کام آسان بنادیا۔ اس کی وجہ سے اعلیٰ برطانوی نظام کو رعایا کی زبان سیکھنے کے دشوار عمل سے بڑی حد تک نجات مل گئی۔ اس کے علاوہ یہ بھی سمجھا جاتا تھا کہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں مغربی ادب و سائنس کا مذاق بڑھے گا اور مغربی علم کی جو قدر اُن کے دلوں میں پیدا ہوگی اُس کی وجہ سے اُن میں ان لوگوں کے لئے دوستانہ جذبہ احسان مندی پیدا ہوجائے گا جنھوں نے جدید علم کا تحفہ اُن میں دیا ہے۔ اس خطرہ کو وہ محض مبالغہ آرائی کرنے پر غیر حقیقی خطرہ سمجھتے تھے کہ تعلیم انھیں آزادی کا مطالبہ کرنے پر اکسائے گی۔ انگریزی تعلیم کو رواج دینے کی وجوہ ظاہر تھی۔ الفنسٹن نے لکھا تھا کہ ''مقامی باشندوں کے مذہبی

---

[1] ٹرولین، سی۔ ای۔ On the Education of the People of India لندن 1838 صفحہ 9

جذبات کی نزاکت نے ہمارے سامنے اس خطرے کو لا کھڑا کیا ہے اور ہمارے رعایا کے درمیان مکمل علاحدگی کے بنا پر ہماری حکومت کی بنیاد جس حد تک کمزور ہے اُس کا تقاضہ ہے کہ ہم اس خامی کو دور کرنے کی خاطر کچھ اقدامات کریں۔ ہمارے سامنے واحد راستہ یہ ہے کہ معقول تعلیم کا انتظام کر کے ہم اُن کے تعصّبات کو دور کریں اور اپنے اصول اور خیالات اُن تک پہنچائیں۔[1]

بمبئی کے گورنر سر جان مالکم نے 1838 میں لکھا تھا۔ ''میری رائے میں ہندوستان کے باشندوں میں تعلیم پھیلانے کا ایک بڑا مقصد ہے اپنی انتظامیہ کے ہر شعبے میں انھیں شامل کرنے کے لئے زیادہ گنجائش نکالنا، اخراجات کو کم کرنے، انتظام کو بہتر بنانے اور تحفظ کے لئے میں اس کو ضروری سمجھتا ہوں۔[2]

کورٹ آف ڈائریکٹرز نے اپنے خط مورخہ 5 ستمبر 1827 میں انگریزی تعلیم کا مقصد ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔ ''ملک کے کاروبار اور حکومت کے اہم محکموں میں مقامی باشندوں کو ملازم رکھنے کی روز افزوں مانگ کے پیش نظر بہتر تعلیم کا پہلا مقصد ہونا چاہئے ایسے لوگوں کی ایک جماعت تیار کرنا جو سرکاری فرائض سرانجام دے سکیں۔ ہمیں یقین ہے کہ تعلیم کا مجوزہ نصاب نہ صرف اعلیٰ قسم کی ذہنی صلاحیت پیدا کرے گا بلکہ جو اس سے مستفیض ہوں گے اُن کا اخلاقی معیار بھی بلند ہو جائے گا اور آپ کو ایسے ملازم مل جائیں گے جن کی راست بازی پر آپ زیادہ اعتماد کر سکیں اور ذمہ داری کے عہدے انھیں سونپ سکیں۔''[3]

اس کے بعد اپنے خط مورخہ 29 ستمبر 1830 کورٹ آف ڈائرکٹرز نے ایک دفعہ پھر تعلیم کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا جس کا مقصد ''ایسے لوگوں کا طبقہ بنانا ہے جو اپنی ذہنی صلاحیت اور اخلاق کی بنا پر ہندوستان کے سول انتظام میں اعلیٰ عہدوں پر مقرر کئے جانے کے قابل ہوں۔''[4]

چنانچہ 1835 تک ہندوستانیوں کی ذہنی بے چینی، انتظامی ضرورتوں، عیسائی مشنریوں اور

---

[1] الفسٹن کی روداد، مورخہ 13 دسمبر 1823 دیکھئے یو اے۔ این محولہ بالا صفحہ 209

[2] ایضاً صفحہ 223

[3] بنگال کے گورنر جنرل اجلاس کونسل کے نام کورٹ آف ڈائرکٹرز کا خط مورخہ ستمبر 1837 ایضاً صفحہ 160

[4] ایضاً، صفحہ 169

سرکاری اور غیر سرکاری لوگوں میں لبرل افراد کی ترغیب اور اُن کے قائم کئے ہوئے انگریزی کے اسکولوں کی مقبولیت نے گورنر جنرل کو میکالے کی خاص خاص تجاویز منظور کرنے پر آمادہ کر دیا۔

لیکن اگر چہ بینٹک نے یورپین ادب اور سائنس کا انتخاب کر لیا اور انگریزی تعلیم کے لئے رقم منظور کر لی لیکن اُس نے مشرقی علوم کی تعلیم دینے والے اداروں کو ختم کرنے کی سفارش نہیں منظور کی۔ وہ کلکتہ اور بنارس کے سنسکرت کالجوں کو مالی امداد دیتا رہا۔ لیکن مشرقی علوم کے طالب علموں کو وظیفے دینے اور مشرقی کتابوں کی طباعت پر روپیہ خرچ کرنے کا طریقہ اُس نے ختم کر دیا۔ آکلینڈ نے مشرقی کتابیں چھاپنے کا طریقہ جاری رکھا۔ مشرقی اور مغربی تعلیم کے حامیوں کا جھگڑا اس کی 24 نومبر 1839 کی روداد نے ختم کر دیا جس میں کہا گیا تھا کہ مشرقی تعلیم کے موجودہ ادارے جاری رکھے جائیں گے اور اس امر کا یقین دلایا گیا تھا کہ منظور شدہ رقم کی حد تک مشرقی زبان کی کتابیں تیار اور طبع کی جاتی رہیں گی۔ اسی کے ساتھ اُس میں بینٹک کے اس فیصلے کی دوبارہ تصدیق بھی کی گئی تھی کہ مغربی علوم کی تعلیم کو فروغ دیا جائے گا۔

اس زمانے میں دو اور متعلقہ مسائل نے بڑی نزاعی شکل اختیار کر لی تھی۔ پہلے کا تعلق تھا ذریعہ تعلیم سے اور دوسرے کا عام لوگوں میں تعلیم پھیلانے سے۔ ان دونوں کے فیصلوں کے دوررس قسم کے تہذیبی، سماجی اور سیاسی نتائج ہوئے۔

جہاں تک ذریعہ تعلیم کا تعلق تھا اُس کے متعلق تین رائے پائی جاتی تھی۔ ایک مدرسہ فکر کے لوگوں کا خیال تھا کہ ہائی اسکول اور یونیورسٹی کی تمام تعلیم انگریزی زبان کے ذریعہ دی جائے۔ دوسرے مکتب فکر کے لوگوں کا خیال تھا کہ علم کے مغربی شعبوں کی تعلیم کا ذریعہ ہندوستان کی کلاسیکی زبانیں یعنی سنسکرت، فارسی اور عربی ہونی چاہئیں۔ تیسرے مدرسہ فکر کے لوگ اس مقصد کے لئے بولی جانے والی زبانوں یعنی بنگالی، ہندی اور اردو کو مناسب موزوں سمجھتے تھے۔

پہلے قسم کے لوگوں میں پیش پیش تھا چارلس گرانٹ اس کا خیال تھا کہ فائدہ کے لحاظ سے انگریزی زبان کو فوقیت حاصل ہے۔ انگریزی نہ صرف نئے تصورات کی کلید ہے بلکہ توقع کی جاتی ہے کہ غلطیوں کے اُس پلندے کا شیرازہ بھی بکھیر دے گی جس کو ہندو دھرم کہا جاتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ فاتحین کی زبان کی تعلیم مفتوح لوگوں کو اپنے مماثل بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔

لیکن حکومت کو انگریزی کے حق میں تیار میکالے کی وکالت نے کیا۔ اُس نے بولی جانے والی زبانوں کی مذمت کی اور کہا کہ ادبی اور سائنسی علوم کی ترسیل کی اُن میں صلاحیت نہیں ہے اور اس لئے اعلیٰ تعلیم کے لئے اُن کا استعمال کسی طرح مناسب نہیں۔ ''کسی بھی یورپین لائبریری کی ایک الماری قدر و قیمت کے اعتبار سے ہندوستان اور عرب کے تمام مقامی ادب کے برابر ہے۔''[1]
انگریزی زبان کی تعریف و ستائش کرنے کے بعد اُس نے انگریزی کے استعمال کی سفارش کی اس لئے کہ ''ہندوستان میں انگریزی وہ زبان ہے جو حکمراں طبقہ بولتا ہے۔ حکومت کے صدر مقامات پر مقامی لوگوں کا بالائی طبقہ بھی اسے بولتا ہے۔ اس کا امکان ہے کہ یہ زبان مشرق کے تمام سمندروں میں کاروباری زبان بن جائے۔''[2]

سر چارلس ٹریولین نے جو تعلقات عامہ کی کمپنی کا رکن اور میکالے برادر نسبتی تھا، انگریزی کو استعمال کرنے کے حق میں دو اور دلیلیں دیں۔ اُس کا خیال تھا کہ انگریزی کی تعلیم کا اثر یہ ہوگا کہ ہندوستانی زبانیں مالا مال ہوجائیں گی۔ اُن میں اتحاد پیدا ہوگا اور اس طرح ہندوستان کے تہذیبی اتحاد کی رفتار تیز ہوجائے گی۔ اُس نے کہا ''سر چشمے سے اکتساب فیض کرکے ایک ہی سانچے میں دوبارہ ڈھل کے مشترک سائنس، مذاق کا مشترک اصلاحات کے ساتھ قومی زبانوں اور قومی مزاج میں استحکام پیدا ہوجائے گا۔ قوم کا ہر حصہ جو ادبی اکتسابات کرے گا۔ وہ سب کے فائدے کی خاطر مشترک ذخیرے میں بلا تاخیر شامل کرلئے جائیں گے اور ہم ایک متحد اور روشن خیال قوم وہاں چھوڑیں گے جہاں ہمیں فرقوں میں بٹے ہوئے لوگ ملے تھے جنھیں ذات پات کے نظام نے علیحدہ علیحدہ سماجوں میں بھی بدحواس کر رکھا تھا اور اُس ادبی نظام نے اُن کے جذبات کو پست کردیا تھا جس کا مقصد انسانی ذہن کو فروغ دینے کے بجائے اُس کی ترقی میں رکاوٹ ڈالنا تھا۔''[3]

---

[1] شارپ (ایچ) Selection From Educational Records حصہ 1781 (کلکتہ 1920)، صفحہ 109

[2] ایضاً کورٹ آف ڈائرکٹرز کا خط، صفحہ 110

[3] ٹریولینسی۔ محوالہ بالا، صفحہ 135

اُسے اُمید تھی کہ انگریزی تعلیم ہندوستانیوں کو انگریزی حکومت کے پُرجوش حامی بنادے گی۔ ''ہماری طرح تعلیم پائے ہوئے، ایک ہی طرح کی چیزوں میں دلچسپی لینے والے اور ہماری طرح کے کاموں میں لگے ہوئے لوگ ہندوؤں سے زیادہ انگریز بن جائیں گے۔ جس طرح رومن صوبے دار فرانسیسیوں اور اٹلینوں سے زیادہ رومن بن گئے تھے۔''[1]

اُس کی پیش گوئی کے پہلے حصے کو واقعات نے بڑی حد تک صحیح ثابت کر دیا۔ لیکن اُس کا دوسرا حصہ ٹریویلین توقع سے کسی قدر مختلف ثابت ہوا۔ پھر بھی میکالے اور ٹریویلین کی پیش گوئی مجموعی اعتبار سے حیرتناک حد تک صحیح ثابت ہوئی۔ پھر بھی یہ کہنا شاید زیادہ صحیح نہ ہو کہ اپنی کھال کے رنگ کے علاوہ ہندوستانی ہر اعتبار سے انگریز کا چربہ بن گیا۔ یا یہ کہ انگریزی تعلیم نے برطانوی راج کے تعلق سے ہندوستانیوں کی وفاداری میں اضافہ کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ صورت حال اس کے برعکس ثابت ہوئی۔

مستشرق جو سنسکرت اور عربی کے استعمال پر زور دے رہے تھے وہ ہارے ہوئے مقدمے کی وکالت کر رہے تھے۔ ان زبانوں میں ادب اور فلسفے کا کتنا ہی سرمایہ کیوں نہ ہو اور اُن کی مقدس تحریروں کی بنا پر لوگ اُن کا کتنا ہی احترام کیوں نہ کرتے ہوں۔ پھر بھی اُن کے استعمال کا کوئی امکان نہیں تھا۔ انھیں ہندوستانیوں کا کوئی بڑا فرقہ نہیں بولتا تھا اُن کا علم تھوڑے سے لوگوں تک محدود تھا اور اُن پر قدرت حاصل کرنے کے لئے بہت مدت اور محنت درکار ہوتی تھی جس کے لئے نہ حکمراں تیار تھے نہ محکوم۔

ہندوستانی زبانوں کو نظر انداز کیا گیا

بہت سے حلقوں نے مغربی علوم سکھانے کے لئے بولی جانے والی زبانوں کے استعمال پر زور دیا۔ ولسن اور شیکسپیئر کی طرح کے کچھ عام کمیٹی کے اراکین اس کی موافقت میں تھے۔ مالکم، منزو اور الفنسٹن نے اس کی حمایت کی۔ کلکتہ کی ورنا کولر سٹیمندی نے جسے کچھ بااثر ہندوستانیوں نے قائم کیا تھا، اس وقت بھی ہندوستانی زبانوں کے فروغ پر زور دیا جب بینٹک انگریزی کے حق میں فیصلہ کر چکا تھا۔ انھوں نے اس امر کی دلیلیں دیں کی ہندوستانی زبانوں کے ذریعہ سینکڑوں

---

[1] ٹریولینیسی۔سی۔ای محولہ، بالا، صفحہ 190

اسکولوں کے نصاب کی تعلیم دی جاسکتی ہے اور یہ کہ ہندوستانی ادب کی ترقی پر اس کے مضر اثرات پڑیں گے۔ بمبئی کی مثال اُن کے سامنے موجود تھی جہاں زیادہ تر سیکنڈری اسکولوں میں ہندوستانی زبانوں کے ذریعہ تعلیم دی جاتی تھی۔

یہ بات تسلیم کرتے ہوئے کہ ہندوستانی زبانوں کے ذریعہ تعلیم پر خرچ بھی کم ہوگا اور ہندوستانی ماسٹروں کے روزگار کے نقطۂ نظر سے یہ زیادہ مفید بھی ہے۔ آکلینڈ نے اس سفارش کو اس بنا پر منظور کرنے سے انکار کردیا کہ ''ہندوستانی نوجوان ہمارے اسکولوں میں اس لئے نہیں آئیں گے کہ ہم انھیں دیسی زبانوں کی ساخت کی تعلیم دیں۔''[1]

1847 میں ذریعہ تعلیم کے سوال پر بمبئی میں جدوجہد ہوئی جس میں ایک طرف انگریزی ہائی کورٹ کا جج اور بورڈ آف ایجوکیشن کا صدر سرارسکن پیری تھا اور دوسری طرف کرنل جروس، جگن ناتھ، شنکر شیٹ اور بورڈ کے ہندوستانی اراکین تھے۔ جگن ناتھ شنکر شیٹ نے بورڈ کو یکم مئی 1847 کو پیش کی جانے والی اپنی روداد میں کہا تھا اگر ہمارا مقصد ہے تعلیم پھیلانا اور ایک قوم کی حیثیت سے ہندوستان کے باشندوں کے ذہنوں پر اُجالا کرنا ہے تو میرا خیال یہ ہے کہ خود اُن کی زبان میں انھیں تعلیم دے کر یہ مقصد حاصل کیا جانا چاہئے۔ ہم اپنی عورتوں تک تعلیم کے فوائد پہنچانے کے لئے کون سا دوسرا ذریعۂ تعلیم استعمال کرسکتے ہیں میں ایک دفعہ پھر کہتا ہوں کہ میں انگریزی کی تعلیم کے خلاف بالکل نہیں ہوں لیکن میرا خیال ہے کہ عام لوگوں کی رسائی اس حد تک نہیں ہوسکتی ہے۔[2] اور اس بات کی وضاحت بھی کی گئی کہ تعلیم حاصل کرنے کے ذریعہ کی حیثیت سے ہندوستان کی بولی جانے والی زبانیں انگریزی کے مقابلے میں زیادہ مفید ہے۔ اس سلسلے میں حکومت سے رجوع کیا گیا۔ جس نے ایک حکم کے ذریعہ انگریزی کو کالج کی سطح پر ذریعہ تعلیم بنادیا اور مادری زبان کو ثانوی سطح پر ذریعہ تعلیم برقرار رکھا۔ 1833 کے بعد بمبئی اور مدراس پریسیڈنسیوں پر گورنر جنرل کی نگہداشت ونگرانی کے اختیارات میں اضافہ ہوگیا اور بمبئی کے نظام تعلیم کو بنگال کے نظام کے مطابق بنانے کے لئے انھیں استعمال کیا گیا۔

---

[1] آکلینڈ کی روداد، مورخہ، نومبر 1839 پر 271 (شارپ ایچ۔ محولہ، صفحہ 163)

[2] جے۔ جے۔ اے۔ تعلیمی ریکارڈوں کے انتخابات، حصہ دوم، 1859 کلکتہ 1822

چنانچہ بولی جانے والی زبانوں کو دھکا پہنچا اور انگریزی اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنادی گئی۔ یہ کہا جاتا ہے کہ انگریزی نے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو، جن کی مادری زبانیں مختلف ہیں۔ایک ایسی مشترک زبان مہیا کردی جسے وہ مشترکہ مقاصد کے لئے استعمال کرسکتے ہیں اور اس طرح ہندوستان کے تمام حصوں کو اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کا ایک ذریعہ مل گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انگریزی تعلیم نے مشترکہ ذہنی رویوں اور زندگی کے مسائل کے متعلق ایک مشترکہ نظر کو جنم دیا اور اس طرح وہ ہندوستانی اتحاد کو فروغ دینے اور ہندوستانی قومیت کے شعور کو تقویت پہنچانے میں معاون ثابت ہوئی۔ یہ بتانا دشوار ہے کہ ذریعۂ تعلیم کے طور پر اگر انگریزی کے ساتھ مادری زبان بھی استعمال کی گئی ہوتی تو یہ مفید نتائج سامنے آتے یا نہیں۔ بہرحال اس پر بھی سنجیدگی کے ساتھ غور نہیں کیا گیا۔ زبان کے سوال پر زیادہ تر افادیت کے نقطۂ نظر سے غور کیا گیا۔ جس کے معنی ایک طرف تو تھے حاکموں کی سہولت اور دوسری طرف ملازمتوں کے لئے لوگوں کو بھرتی کرنا۔

انتظامی سہولت کی خاطر حکومت نے ثانوی اور اعلیٰ تعلیم پر توجہ دینے اور فی الجملہ ہندوستان کے تمام لوگوں کی تعلیم کو نظر انداز کرنے کا رویہ اختیار کیا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ اپنی حکومت کے ابتدائی زمانے میں ایسٹ انڈیا کمپنی ایسے عالموں کی خدمت حاصل کرنے میں دلچسپی رکھتی تھی جو ہندو اور مسلم قانون سے واقف ہوں۔ چنانچہ تعلیمی پالیسی میں تصورات کو غلبہ حاصل تھا۔ اس کے بعد ایک تبدیلی ہوئی اور مقصد یہ قرار پایا کہ عدالت، مال اور پولیس کے محکموں میں نئے نئے عہدوں کے لئے تعلیم یافتہ ماتحتوں کی خدمات حاصل کی جائیں۔ اُن بالائی طبقوں کو مطمئن اور آسودہ خاطر بنانا قرین مصلحت سمجھا گیا۔ جو اپنے آبائی روزگار سے محروم ہو چکے تھے اور تعلیم کے ذریعہ اپنے کو ملازم کا اہل بنانا چاہتے تھے۔ یہ توقع کی جاتی تھی کہ تہذیب و تعلیم کے اثرات تعلیم یافتہ بالائی طبقوں سے عوام تک پھیل جائیں گے۔

ان نظریات کے زیرِ اثر اور حسب ضرورت رقم نہ ہونے کی وجہ سے کمپنی نے عام تعلیم کے منصوبوں کو رد کر دیا جو الفسٹن اور منزو نے بنائے تھے۔ الفسٹن نے 1823 کی اپنی روداد میں اسکول کی تعلیم کی ایسی توسیع کی تجویز کی تھی جو مقامی آبادی کے زیری طبقوں کو اس امر کی امید دلا سکے کہ (اسکولوں کی زیادہ تعداد) اُن کے لئے تعلیم کے ذرائع فراہم کریں گی۔[1]

---

[1] الفسٹن روداد مورخہ 13 دسمبر 1823۔ یو۔ اے۔ این، محولہ بالا، صفحہ 197

منزو نے زور دے کر کہا تھا۔ ''اگر ہم لوگوں کو تعلیم دینے کا تہہ کر لیں اگر ہم اس راہ میں ثابت قدم رہیں اور اگر ہم اسکولوں کو تحصیلداریوں تک محدود نہ رکھیں بلکہ اُن کی تعداد اتنی بڑھا دیں کے وہ چھوٹے چھوٹے رقبوں میں بھی ہوں تو مجھے یقین ہے کہ ہماری کوششیں بالآخر کامیاب ہوں گی۔[1]

یہ بڑی بدقسمتی کی بات تھی کہ لوگوں کو عام تعلیم کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کیا گیا۔ اس نے وقت کو پیچھے ڈھکیل دیا۔ اس فیصلے کا مضر اثر مقامی تعلیمی نظام پر پڑا۔ اڈم نے اُن واقعات کی روشنی میں جو اُس نے جمع کئے تھے، زور دے کر یہ بات کہی کہ انیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں بنگال میں بہت سی پاٹھ شالائیں اور مکتب موجود تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ قریب قریب ہر گاؤں میں پڑھنا لکھنا سکھانے کا کوئی نہ کوئی انتظام موجود تھا۔ گورنر جنرل لارڈ ہسٹنگز نے 1815 میں لکھا تھا ''اس بات کا ثبوت کہ مقامی حکومتیں تعلیم عامہ کے اہم مقصد سے بے خبر نہیں تھیں۔ بہت سی معافیاں اور کسی خاص نوعیت کے طالب علموں کی تعلیم کے لئے عام مدارس میں دیئے جانے والے عطیات پیش کرتے ہیں۔ لیکن قائم شدہ اداروں کو نظر انداز کرنے کے عام رویے کے بنا پر جو ابھی تک انگریزی حکومت کا وطیرہ رہا ہے ان رقموں کے استعمال پر نظر نہیں رکھی جاسکی اور اس بے توجہی کی بنا پر مقامی افراد نے اُن رقموں کو ذاتی ملکیت میں تبدیل کرلیا۔''[2]

دوسری بات یہ کہ حکومت چونکہ عام لوگوں کی تعلیم کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر چکی تھی جو محض بولی جانے والی زبانوں کے ذریعہ دی جاسکتی تھی اس لئے زبانوں کو ترقی دینے کی ضرورت بھی نہیں محسوس کی گئی۔ خصوصاً جب بینٹک نے یہ فیصلہ کر دیا اور مٹکاف اور آکلینڈ نے اس کی تصدیق کر دی کہ ثانوی اور کالج کی سطح پر انگریزی ذریعہ تعلیم ہوگی۔ ابتدائی تعلیم کو فروغ دینے کے لئے ہارڈنج نے اقدامات کئے اُن میں کامیابی نہیں ہوئی۔

---

[1] (منزوٹی) روداد، مورخہ 10 مارچ 1826 شارپ، ایچ محولہ بالا صفحہ 72

[2] لارڈ میور کی روداد، مورخہ 2 اکتوبر 1815 شارپ، ایچ محولہ بالا۔ صفحہ 26

انگریزی تعلیم کا فروغ

1835 کے بعد مجوزہ خطوط پر سرعت کے ساتھ ترقی ہوئی۔ انگریزی پھیلنے لگی۔ 1835 اور 1838 کے درمیانی مدت میں تعلیمی کمپنی کی نگرانی اور اداروں کی تعداد بڑھ گئی اور طالب علموں کی تعداد قریب قریب دُگنی ہوگئی۔

سر چالس ٹریلولین نے لکھا ''انگریزی تعلیم کی حمایت کی زوردار لہر آ گئی ہے۔ اسکول قائم کرنے کے لئے اتنی درخواستیں آئیں کہ ہمارے لئے سب کو پورا کرنا مشکل ہوگیا۔ جو اسکول قائم کئے جا چکے ہیں اُن میں سے بہت سوں میں داخلے کے لئے اتنے امیدوار سامنے آئے کہ ہم سب کے لئے جگہ نہیں نکال سکے۔''[1]

سماچار درپن کے مطابق کلکتہ میں دوسو ہندوستانی اتنی اچھی طرح انگریزی استعمال کر سکتے تھے جیسے خود اپنی مادری زبان۔ جے سدھرلینڈ، سر جان شور ہولٹ میکری اور دوسروں نے اس کی مقبولیت کی شہادت دی ہے۔ مشنری رجسٹر نے لکھا تھا کہ تینوں پریسیڈنسیوں میں اُس کی مانگ بڑھ رہی ہے۔ چار ہزار ہندوستانیوں نے پارلیمنٹ کو ایک عرضداشت پیش کی تھی جس میں حکومت سے درخواست کی گئی کہ وہ سول ملازمتوں کے لئے انگریزی کو لازمی بنادے۔ ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے 1832 میں تجویز پیش کی کہ انگریزی پر قدرت حاصل کرنا ملازمت کے لئے ایک ضروری شرط قرار دی جائے۔

1833 کے چارٹر میں ایک دفعہ شامل تھا جس میں کہا گیا تھا کہ ہندوستان کے لوگ بلا لحاظ مذہب، پیدائش، سلسلہ نسب یا رنگ ہر عہدہ حاصل کرنے کے مستحق ہوں گے۔

بینٹک سمجھتا تھا کہ کمپنی کو مالی خسارہ سے بچانے اور ایسے لوگوں کے ذریعہ انتظام چلانے کے لئے ہندوستانیوں کو ملازم رکھنا ضروری ہے جو یہاں کے لوگوں کے مزاج اور رسم و رواج سے واقف ہوں۔ چنانچہ اس نے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے لئے ڈپٹی کلکٹر کا عہدہ کھول دیا جس کی تنخواہ 500 روپے تک ہوتی تھی۔ 1836 میں لارڈ آکلینڈ اور اس کی کونسل نے فیصلہ کیا کہ فوج داری دیوانی اور مال کے مقدموں میں کارروائی فارسی کے بجائے لوگوں کی اپنی زبانوں میں

---

[1] ٹریولین، سی، محولہ بالا، صفحات 82-81

کی جانی چاہیے اور 1837 کے ایکٹ نمبر 29 کے ذریعہ فارسی کا استعمال ختم کردیا گیا۔ 1844 میں انگریزی کو ملازمتوں کے لئے ایک ضروری شرط بنادیا گیا اور احکام جاری کیے گئے کہ اچھے طالب علموں کی فہرستیں تیار کی جائیں اور عہدے پر کرنے کے لئے سرکاری دفتروں میں انھیں گشت کردادیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس سے انگریزی کو اور تقویت ملی۔

متوسط طبقوں میں تعلیم کا فروغ محض جن کی ذمہ داری حکومت نے قبول کی تھی، بنگال میں بہت ہوا۔ اور اتنا ہی برطانوی حکومت میں شامل ہندوستان کے دوسرے حصوں میں ہوا۔

بمبئی میں تعلیم

بمبئی پریسیڈنسی میں انگریزی تعلیم نے جو راستہ اختیار کیا وہ بنگال سے مختلف تھا۔ وہ علاقہ جس پر یہ پریسیڈنسی مشتمل تھی۔ زیادہ تر 1818 کی آخری مرہٹہ جنگ کے بعد انگریزوں کے زیرنگیں آیا تھا۔ اس سے پہلے یوریشین اور عیسائی بچوں کی تعلیم کے لئے بمبئی کے جزیرے میں اسکول قائم کئے جاچکے تھے۔ لیکن مرہٹوں کے علاقہ پر قبضہ ہوجانے کے بعد حکمرانوں کو ہندوستانیوں کی تعلیم کے مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ ماؤنٹ اسٹورڈ الفنسٹن نے محسوس کیا کہ لوگوں کے اخلاق اور مادی حالات کو سدھارنے کے لئے تعلیم ضروری ہے۔ چنانچہ اُس نے سروے کروایا جس نے ظاہر کیا کہ صورت حال ناگفتہ بہ ہے۔ اُس وقت سوال یہ تھا کہ ابتدا کیسے کی جائے اور لوگوں میں مغربی تعلیم کو کیسے رواج دیا جائے۔

الفنسٹن کی رائے تھی۔ چونکہ انگریزی زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کی مانگ محض بمبئی کے شہر تک محدود ہے اس لئے مغربی علوم کو پھیلانے کے لئے ہندوستانی زبانوں کو استعمال کیا جائے گا۔ (2) یہ کہ ابتدائی تعلیم کا منصوبہ بند نظام قائم کیا جائے کہ یہ انگریزی تعلیم پھیلانے سے زیادہ مفید ہے۔ اور (3) یہ کہ اعلیٰ مشرقی علوم کا مناسب انتظام کیا جائے۔[1]

پہلا قدم تھا اُن اعلیٰ طبقوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے جو پیشوا کا دربار ختم ہوجانے کی وجہ سے سرپرستی سے محروم ہوگئے تھے۔ 1821 میں پونا میں ایک سنسکرت کالج کا قیام، اُس کے بعد 1832 میں تعلیم کو فروغ دینے کے لئے بمبئی نیو اسکول اینڈ بک سوسائٹی قائم کی گئی۔

---

[1] (منزوٹی) روداد، مورخہ 10 مارچ 1826 شارپ، ایچ محولہ بالا صفحہ 72

1827 میں اُس کا نام بدل کر بمبئی نیو ایجوکیشن سوسائٹی کر دیا گیا۔ اس سوسائٹی نے جدید ہندوستانی زبانوں کی نصابی کتابیں تیار کر کے، استادوں کو تربیت دے کے اور انگریزی پڑھانے کے لئے اسکول کھول کر قابل قدر خدمات سرانجام دیں۔ اس سوسائٹی کی کوششوں سے بمبئی تھانے، پنسویل اور پونے میں چار ضلع انگریزی اسکول کھولے گئے جن کے ہیڈ ماسٹر یورپین تھے اور مختلف اضلاع میں تقریباً 15 ابتدائی اسکول شروع کئے گئے جن میں انگلستان اور ہندوستان کی تاریخ، جغرافیہ، حساب، الجبرا، جومیٹری، ٹریگنومنٹری، فلکیات اور طبعی فلسفہ کی طرح کے مضامین طالب علموں کی مادری زبان کے ذریعہ پڑھائے جاتے تھے۔

نیو ایجوکیشن سوسائٹی کے علاوہ حکومت خود بھی کالج چلاتی تھی۔ اُن میں سے ایک تھا پونے کا سنسکرت کالج جس کی 1837 میں تنظیم نو کی گئی اور تمام ذاتوں کے طالب علموں کے لئے اُس کے دروازے کھول دیے گئے۔ دوسرا تھا۔ بمبئی کا الفنسٹن انسٹی ٹیوٹ جس کے لئے روپیہ جزوی طور سے بمبئی کے لوگوں نے جمع کیا تھا اور جزوی طور سے 1834 میں کمیٹی کے ڈائرکٹروں نے دیا تھا۔ اس کالج کا مقصد تھا سول ملازمتوں کے لئے ہندوستانیوں کو ترتیب دینا۔ اس انسٹی ٹیوٹ کے لئے طالب علم ضلع انگریزی اسکول مہیا کرتے تھے۔

1840 میں نیو ایجوکیشن سوسائٹی ختم کر دی گئی اور تمام تعلیمی اداروں کی نگرانی کے لئے ایک بورڈ آف ایجوکیشن قائم کیا گیا جس کے سات رکن تھے جن میں سے تین ہندوستانی تھے۔ اس بورڈ نے، جس کا صدر بمبئی ہائی کورٹ کا چیف جسٹس سرارسکن پیری تھا، ایک دفعہ پھر انگریزی تعلیم کا سوال اُٹھایا۔ اس نے جو پالیسی اختیار کی وہ تھی، اسکولوں میں ہندوستانی اور انگریزی زبانوں کی مشترکہ تعلیم مگر اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ انگریزی رہی۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ ہر ضلع کے صدر مقام اور دوسرے شہروں میں، جہاں اس کو حق بجانب سمجھا جائے اچھے انگریزی اسکول قائم کرنے پر روپیہ خرچ کیا جائے پیری کی پسندیدہ پالیسی اور بنگال کے دباؤ کی بنا پر ہندوستانی زبانوں کے ذریعہ مغربی علوم کو مقبول بنانے کا تجربہ ترک کر دیا گیا اور انگریزی کے ذریعہ اعلیٰ تعلیم دینے کے معاملے میں بمبئی بھی بنگال کے نقش قدم پر چلنے لگا۔ اس کے باوجود بمبئی بورڈ آف ایجوکیشن بہت سے ایسے اسکول چلاتا رہا۔ (1853 میں 216) جہاں ہزاروں طالب علم (1853 میں 12000) اپنی

مادری زبانوں کے ذریعہ تعلیم حاصل کرتے تھے۔

بمبئی میں انگریزی تعلیم کو رواج دینے میں مشنریوں کی کوششوں کو بھی دخل تھا۔ مشنوں نے بہت سے شہروں مثلاً پونے، احمد نگر، سورت اور راج کوٹ میں انگریزی پڑھانے کے اسکول کھولے اور بمبئی میں ولسن کالج قائم کیا۔ جہاں 1852 میں تقریباً چار سو طالب علم تھے۔ ابتدائی برسوں میں انگریزی تعلیم کے معاملے میں سب سے پیش پیش تھا پارسی فرقہ جیسا کہ ہاؤس آف کامنس کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے گواہوں کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ انھوں نے کہا ''قریب قریب سبھی پارسی انگریزی بولتے ہیں۔ وہ عام طور سے اپنے بچوں کو انگریزی پڑھاتے ہیں اور اُن میں سے بہت یورپینوں کی طرح فراٹے سے انگریزی بولتے ہیں۔''[1]

مدراس پریسیڈنسی میں تعلیم

مدراس پریسیڈنسی میں مغربی تعلیم پھیلانے والی تین ایجنسیوں یعنی مشنریوں، حکومت اور ہندوستانی عوام میں سے اس میدان میں سب سے پہلے عیسائی مشنریوں نے قدم رکھا۔ پروٹسٹنٹ مشنریوں اور سوسائٹی فار پروموٹنگ کرسچن کالج نے مختلف مقامات پر یعنی مدراس، کٹوالور، تجور اور ترچناپلی میں اسکول کھولے۔ جن میں ہندوستانی بچوں کو تعلیم دی جاتی تھی اسکولوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے تھوڑی تھوڑی امداد ملی تھی۔

انیسویں صدی کی دوسری دہائی میں مشنریوں نے پوری پریسی ڈنسی میں انگریزی پڑھانے کے لئے اسکول قائم کرنا شروع کئے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ایسے ابتدائی درجہ کے اینگلو ورنا اسکول بھی قائم کئے جن میں انگریزی پڑھائی جاتی تھی۔ ٹریولین کے مطابق 1838 تک ''انگریزی نئی چیز نہیں رہی ہے۔ اس کی مانگ بہت ہے۔ اور ہزاروں آدمی اُسے جانتے ہیں۔''[2]

اس میدان میں مشنریوں کی سرگرمیاں اتنے وسیع پیمانے پر تھیں کہ 1854 میں پورے ملک کی

---

[1] پارلیمنٹری دستاویزات 32-1831 کالم 6 ضمیمہ 85-311 تک کلی جی۔ ٹی English Education and Oregion India Nationals نیویارک 1944، صفحہ 61

[2] ٹریولین۔ سی۔ ایس۔ محولہ بالا صفحہ 179

تعلیم مشنری سوسائٹی کے ہاتھ میں تھی۔ صرف تین ادارے تھے اور کچھ دیسی اسکول۔[1]

ان اسکولوں کے علاوہ مشنریوں نے سیمنریز بھی قائم کیں جو اسکول اور کالج کے درمیان تھیں جہاں انگریزی ادب میں یورپین سائنسوں کی تعلیم دی جاتی تھی۔ لیکن عیسائی درسیات اور مقدس کتابوں پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔

انھیں ہندوستانی مناظر استاد اور مشنریوں کی تربیت گاہیں سمجھا جاتا تھا۔ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں اُن کا حصہ تھا جنرل اسمبلی ادارہ جس کی بنیاد انڈرسن نے مدراس میں ڈالی تھی۔ (جس کا نام بعد میں مدراس کرشچین کالج ہو گیا) اسکاٹش ایسٹبلشڈ چرچ اور لندن مشنری سوسائٹی نے دوسرے اداروں کی بنیاد ڈالی۔

دوسری ایجنسی یعنی کمپنی کی حکومت نے سرٹاس منزو کی گورنری کے زمانے میں اس پر توجہ دی۔ اُس نے محسوس کیا کہ پریسیڈنسی میں اگرچہ اسکول تو بہت سے ہیں لیکن ان کا معیار بہت پست ہے سرپرستی اور روپیہ کی کمی کی بنا پر وہ زوال پذیر ہیں۔ ویدک پاٹھ شالاؤں کی نگرانی برہمنوں کے سپرد تھی۔ جس کے پاس عموماً زمینداروں یا سابق حکومتوں کی دی ہوئی معافیاں تھیں۔ تعلیم کے فوائد سے زیادہ تر برہمن فرقہ مستفید ہوتا تھا۔ حالانکہ اُن کی آبادی ہندوؤں کی مجموعی آبادی کا بارہواں حصہ تھی۔ پھر بھی ہر چار زیر تعلیم طالب علموں میں سے ایک برہمن ہوتا تھا۔[2]

1826 میں منزو نے تعلیم عامہ کا ایک بورڈ قائم کیا تاکہ ہر کلکٹریٹ میں دو بڑے اسکول اور ہر تعلقہ میں ایک چھوٹی حیثیت کا اسکول کھولا جائے۔ اس تحقیقات کے نتیجے میں ''جو اُس نے شروع کرائی تھی، معلوم ہوا کہ پریسیڈنسی میں ہر پانچ سو لڑکوں کے لئے ایک دیسی اسکول ہے اور یہ کہ اسکول جانے کی عمر کے بچوں کی ایک تہائی تعداد ان دیسی اسکولوں میں تعلیم پا رہی ہے''[3]

تعلیم کے اغراض و مقاصد کے تعلق سے منزو کا خیال تھا کہ مادری زبان کے ذریعہ عام لوگوں کی

---

[1] اریٹ ناٹ۔ پی۔ جے۔ .Selection From The Records of The Modern Govt صفحہ 127۔ میک کلی۔ B.T محولہ بالا، صفحہ 124

[2] ستیہ آنند۔ History Education in Modras Presidency (مدراس 1894) صفحہ 3

[3] Selection From the Records of the Govt. of Modern

تعلیم کی ہمت افزائی کی جانی چاہئے۔ بدقسمتی سے اس کی اسکیم کامیاب نہ ہوسکی۔ اور 1836 میں اسکول ختم کردئے گئے اور منزو کے بورڈ کی جگہ کمپنی آف نیوایجوکیشن تشکیل کی گئی۔

بینٹک کی پالیسی کے مطابق جس کی حمایت کورٹ آف ڈائرکٹرز نے کی تھی ازسرنو کام شروع کیا گیا۔ فیصلہ کیا گیا کہ سب سے موثر انداز کی تعلیم ہی اعلیٰ درجے کے تھرڑے سے اسکولوں کے ذریعہ دی جانی چاہئے۔ عام تعلیم دینے کا منزو کا خیال ترک کردیا گیا۔ تو 1840 میں سرکاری ملازموں میں تقرری کے امیدواروں کے عام امتحانات کی تنظیم ونگرانی اور تعلیم کے لئے ایک کونسل تشکیل کی گئی۔ اس کونسل کو ہدایت کی گئی کہ وہ روپیہ اس کالج پر جو مدراس یونی ورسٹی کے نام سے مشہور تھا، اور 1841 میں قائم ہوا تھا اور کچھ ضلع اسکولوں اور نجی اسکولوں پر خرچ کرے۔

کونسل کے منصوبے کی حمایت ایک یادداشت کے ذریعہ کی گئی جس پر تقریباً ستر ہزار ہندوستانیوں کے دستخط تھے اس کالج کا نصاب کلکتہ کے ہندو کالج کے نصاب کے مطابق تھا جس میں مغربی سائنس، فلسفہ اور تاریخ شامل تھے۔ 1854 میں اُس میں پانچ سو سے زیادہ طالب علم تعلیم پارہے تھے۔ اس کے طالب علموں نے ملازمت اور مفاد عامہ کے کاموں میں امتیاز حاصل کیا۔ ترچناپلی، سونی پٹم، ویلیری اور کالی کٹ یعنی دراوڑی زبان کے علاقے میں ایک اعلیٰ صوبائی اسکول کھولنے کا منصوبہ کامیاب نہیں ہوسکا۔ 54-1853 میں صرف دو انگریزی اسکول کھولے جاسکے یعنی ایک کڈالور میں اور دوسرا راجہ مندری میں۔

تیسری ایجنسی یعنی ہندوستانی عام لوگوں نے 1842 میں مدراس میں پاچیپا کالج کے قیام سے اپنی کوششوں کی ابتدا کی۔ اس کالج کے لئے روپیہ ایک خیراتی وقف سے حاصل کیا جسے ایک دولت مند ہندو پاچیپا نے قائم کیا تھا۔ متولیوں نے کونجی درم اور چڈم برم میں بھی اسکول قائم کئے جو اس کالج کی شاخیں تھیں۔

شمالی ہندوستان میں تعلیم

شمالی ہندوستان کے صوبوں میں جن کا نیا الحاق کیا گیا تھا۔ تعلیم کی رفتار سست تھی جو حالات بنگال میں تعلیم پھیلانے میں معاون ثابت ہوئے تھے وہ بڑی حد تک شمالی مغربی صوبجات اور اودھ میں نہیں پائے جاتے تھے۔ کلکتہ روز افزوں بدیسی تجارت کا مرکز تھا اور وہاں بہت سے

انگریز تاجر آباد تھے۔ سرکاری محکموں اور تجارت میں ملازمت کے بہت مواقع تھے۔ ہندوستانی مغربی علوم سیکھنے کے خواہش مند تھے اور اس مانگ کو پورا کرنے کے لئے بہت سی ایجنسیاں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہی تھی۔

بنگال کے باہر یہ حال نہیں تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مجموعی اعتبار سے لوگ انگریزی تعلیم کے خلاف تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ انگریزی تعلیم کو عیسائی مشنریوں کی سرگرمیوں کا جز سمجھتے تھے اور اسکولوں کو تبدیل مذہب کے ذرائع تصور کرتے تھے۔ بہار میں انگریزی کے لئے لوگوں میں کوئی جوش نہیں پایا جاتا تھا۔ اور اس لئے اسکول کھولنے کی کوششوں میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ بنگال کے گورنر جنرل کی روداد مورخہ 19 نومبر 1858 کے مطابق اسکولوں کے انسپکٹر جنرل کے دفتر کو شیطان کا دفتر خانہ کہا جاتا تھا۔

شمالی مغربی صوبجات میں تعلیم کی نگرانی کا کام 1843 تک کلکتہ کی تعلیم عامہ کی جنرل کمیٹی کے سپرد رہا۔ حالانکہ اس سے سات سال پہلے بنگال پریسیڈنسی سے اُس صوبے کو علیحدہ کیا جاچکا تھا۔ چنانچہ اس کے باوجود کہ اُس کی مانگ بہت کم تھی انگریزی تعلیم کو فروغ دیا جاتا رہا۔ بنارس کے سنسکرت کالج میں انگریزی کی تعلیم شروع کی گئی۔ آگرہ میں 1824 میں کالج قائم کئے جاچکے تھے اور 1835 سے پہلے ہی اُن میں انگریزی تعلیم دی جانے لگی تھی، گورکھپور سے اجمیر تک چودہ انگریزی اسکولوں کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا۔

لیکن 1823 میں جب ٹامسن شمالی مغربی صوبجات کا لفٹینٹ گورنر مقرر کیا گیا۔ تو اس نے پالیسی کو بدلنے کا فیصلہ کیا۔ اُس نے دیکھا کہ اسکولوں کے طالب علم انگریزی کے حق میں نہیں ہیں۔ چنانچہ اُس نے اُس میں سے آٹھ کو بند کرنے اور اہم مراکز یعنی آگرہ، بنارس اور دہلی میں کالج اور بریلی، اجمیر اور ساگر میں اسکول قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ لیکن ان کالجوں اور اسکولوں کی بھی پذیرائی نہیں ہوئی۔ لیفٹننٹ گورنر نے لکھا ''کہ بالائی طبقات یا حکومت کے مختلف محکموں میں ہندوستانی اعلیٰ افسروں میں سے بہت کم نے ابھی تک تعلیم کے فوائد کو اس حد تک پہنچانا ہے کہ وہ حکومت کے تحت چلنے والے انگلوورناکلر کالجوں میں اپنے بچوں کو بھیجنے کے لئے آمادہ ہو جائیں۔[1]

---

[1] مک کلی، محولہ بالا، صفحہ 100

اُن کے بجائے سماج کے زیریں طبقوں سے آنے والے طالب علموں سے اسکول کالج بھرے ہوئے تھے۔

ٹامس تعلیم کے دیہی نظام کے حق میں تھا۔ اور اُس کو سدھارنا چاہتا تھا۔ اُس کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی روپیہ کی کمی۔ چنانچہ اُس نے ابتدائی اسکولوں کو چلانے کے لئے زمینداروں کے ساتھ کئے گئے رضا کارانہ معاہدوں کی رو سے مقامی محصول عائد کئے اور اس کے بعد روپیہ سرکاری خزانے سے ادا کیا۔ اس کے بعد تجویز کیا گیا کہ ہر تحصیل میں ایک اسکول کھولا جائے جن میں مادری زبان کے ذریعہ ہندی، اردو، حساب، تاریخ، جغرافیہ، جومیٹری اور دوسرے مضامین پڑھائے جائیں۔ معائنے اور ہدایت کاری کا ایک تفصیلی نظام بنایا گیا جسے اُس زمانے کے گورنر جنرل ڈلہوزی اور کورٹ آف ڈائرکٹرز کی منظوری حاصل ہوگئی۔ یہ نظام دوسرے صوبوں میں محکمہ تعلیم کی تشکیل کے لئے ایک مثال بن گیا۔

لیکن ''غدر شروع ہونے سے کچھ پہلے تک لوگ پڑھتے تھے کہ انگریزی ایک مردہ زبان ہے جسے کالج کی دیواروں کے باہر شائد ہی کوئی بولتا ہو'' [1] حکومت بھی تعلیم پھیلانے کی زیادہ کوشش نہیں کر رہی تھی۔

جہاں جہاں حکومت اسکول کھولنے میں کامیاب نہیں ہوئی تھی وہاں اسکول کھول کے مشنریوں نے حکومت کے کام میں مدد دی۔ امریکن پریسبیٹرین بورڈ نے لدھیانہ، سہارن پور، جالندھر، انبالہ، لاہور اور فرخ آباد میں اسکول کھولے جن میں انجیل کے ساتھ انگریزی ادب، سائنس اور دوسرے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ انھوں نے الہ آباد کا گورنمنٹ اسکول اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُسے کالج بنا دیا۔ دوسری مشنری سوسائٹیوں نے یہی کام دوسرے مقامات پر کیا۔ چرچ مشنری سوسائٹی نے آگرہ میں سینٹ جانس کالج قائم کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1854 تک مشنری اداروں کی تعداد بائیس ہوگئی۔ جن میں تقریباً ساڑھے سترہ سو طالب علم تعلیم پاتے تھے۔ یہ تعداد قریب قریب اتنی ہی تھی جتنی تمام سرکاری اداروں میں تعلیم پانے والے طالب علموں کی۔

---

[1] مک کلی، محولہ بالہ، صفحہ 95

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ پنجاب میں پائے جانے والے دیسی تعلیم کے نظام میں وہاں کے رہنے والے تینوں فرقوں کے لئے تین قسم کے اسکول تھے۔ ہندوؤں کو ہندی پڑھائی جاتی تھی، مسلمان عربی میں قرآن کے علاوہ فارسی ادب کی تعلیم پاتے تھے اور سکھ گرمکھی میں گرو گرنتھ صاحب پڑھتے تھے۔ اس قسم کے اسکول لڑکیوں کے لئے بھی تھے جہاں اُستانیاں اُن کو تعلیم دیتی تھیں۔ جب انگریزوں نے پنجاب کا الحاق کیا تو امرتسر میں ایک انگریزی اسکول قائم کیا گیا اور مشنریوں نے کئی اہم شہروں میں اسکول کھولے۔

VIII وڈ کا 1854 کا مراسلہ

بورڈ آف کنٹرول کے صدر کے 1854 کے مراسلے نے تعلیم کی بوسیدہ عمارت کی بنیاد مضبوط کردی۔ اس مراسلے کی بنیاد تھی ہندوستان میں تعلیم کے فروغ کے تعلق سے ہاؤس آف کامنز کی سلیکٹ کمیٹی تحقیق و تفتیش۔ اس میں اس بات کو دہرایا گیا تھا کہ تعلیم کا مقصد ہے اخلاقی اور مادی خوشحالی، اعلیٰ درجہ کی اہلیت پیدا کرنا اور قابل اعتماد سرکاری ملازمت حاصل کرنا، ملک کے وسائل کو ترقی دینے اور دولت اور تجارت میں اضافہ کرنے کی خواہش پیدا کرنا اور اس کے ساتھ اُن بہت سی اشیا کا بڑی مقدار میں حصول جو ہماری مصنوعات کے لئے ضروری ہیں اور جنھیں ہماری آبادی کا ہر طبقہ بڑے پیمانے پر صرف کرتا ہے اور برطانوی مزدوروں کی پیداوار کی قریب قریب کبھی نہ ختم ہونے والی مانگ۔[1]

تعلیم کی نوعیت کے متعلق نزاع کو وڈ نے ان الفاظ کے ساتھ ختم کردیا ''ہمیں پرزور الفاظ میں اعلان کردینا چاہیے کہ ہم ہندوستان میں جس تعلیم کو فروغ دینا چاہتے ہیں وہ ایسی تعلیم ہے جس کا مقصد ہے ترقی یافتہ فنون، سائنس، فلسفہ اور یورپ کے ادب کی ترویج یا مختصراً کہا جاسکتا ہے یورپی علوم کی ترویج۔[2]

---

[1] وڈ کا تعلیمی مراسلہ 19 جولائی 1854

کس زبان کے ذریعہ تعلیم دی جائے کے متعلق مراسلے میں کہا گیا تھا۔ ''چنانچہ ہمارا خیال ہے کہ انگریزی زبان کے ساتھ ہندوستان کی دیسی زبانوں کو بھی یورپی علوم کے پھیلانے کا ذریعہ بنایا جائے''[1] عملاً اس کے معنی تھے۔ اعلیٰ جماعتوں میں انگریزی کا استعمال اور عام لوگوں کے لئے ہندوستانی زبانوں کا استعمال۔

جہاں تک تعلیم کی توسیع کا تعلق تھا۔ مراسلے کی بنا پر (1) 1857 میں کلکتہ، بمبئی اور مدراس میں لندن یونیورسٹی کے نمونے کی تین یونیورسٹیاں قائم کی گئیں جو امتحان لینے کا ادارہ تھا۔ (2) ورنا کلر اور انگلوورنا کلر کلر اسکولوں کی تعداد بڑھ گئی اور (3) شمالی مغربی صوبجات کے لئے ٹامس کے منصوبے کے مطابق دیسی قسم کے اسکولوں کے ذریعہ ابتدائی تعلیم کی توسیع ہوئی۔

اس مراسلے میں اس امر کا انتظام کیا گیا تھا کہ ہر صوبے میں ایک ڈائرکٹر کے تحت، جس کی امداد کے لئے معائنہ کرنے والا عملہ حسب ضرورت مقرر کیا جائے، محکمۂ تعلیمات قائم کئے جائیں تا کہ اسکول کی تعلیم کی اسکیم پر اچھی طرح عمل کرنے کی اس تجاویز کا مناسب طور سے عمل درآمد کیا جاسکے۔ لیکن وڈ نے حسب ضرورت رقمیں فراہم کرنے کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اور اس کے بعد کا ایک حصہ عام لوگوں اور نجی ایجنسیوں کے شانوں پر ڈال دیا۔ اس مقصد کے لئے انگریزی نظام کے خطوط پر امدادی عطیوں کا طریقہ شروع کیا گیا جس سے بڑی حد تک اُس وقت مشن اسکول مستفید ہوئے۔

ہندوستانی تعلیم کے رجحانات

1813 سے 1858 تک تعلیم میں بڑی توسیع ہوئی۔ 1813 میں جو رقم منظور ہوئی تھی۔ وہ دس ہزار پاؤنڈ یا ایک لاکھ روپیہ تھی۔ لیکن 57-1856 میں بنگال، مدراس، بمبئی، شمالی مغربی صوبجات اور پنجاب کے پانچ صوبوں میں ہونے والا خرچ بڑھ کے دو لاکھ پاؤنڈ یا بیس لاکھ روپئے سے زیادہ ہو گیا تھا۔ اس کا بہت بڑا جز بنگال کے حصے میں آیا۔ اسے چورانوے ہزار پونڈ سے زیادہ تعلیم پر خرچ ہونے والی کل رقم کا تقریباً نصف حصہ ملا۔ اس توسیع کے نتیجے میں 1854

---

[1] ایضاً

میں تقریباً 180 انگریزی ادارے ہندوستان میں تھے جن میں 30،000 طالب علم تعلیم پارہے تھے۔

چنانچہ چار دہائیوں میں جو تعلیمی نظام قائم کیا گیا۔ اس کی کچھ نمایاں خصوصیتیں ہندوستان کے لوگوں کے ارتقا پر بہت اثر انداز ہوئیں۔ اہم ترین خصوصیات تھیں۔ (1) سماج کے بالائی طبقوں تک تعلیم محدود رہی اور عام لوگوں کو نظر انداز کیا گیا۔ (2) اسکولوں اور کالجوں دونوں میں اعلیٰ تعلیم میں ذریعۂ تعلیم کے طور پر انگریزی زبان کا انتخاب کیا گیا۔ (3) تعلیم کا بڑا مقصد یورپی علوم سیکھنا سمجھا گیا اور (4) تعلیم کی نوعیت محض علمی رہی۔ عملی اور تکنیکی تربیت کو نظر انداز کیا گیا۔

یہ درست ہے کہ تعلیمی پالیسی کے تعلق سے تمام اعلانات میں کہا گیا تھا کہ تعلیم کا مقصد ہے ملک کی اخلاقی اور مادی ترقی لیکن اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ تعلیمی ایجنسیوں کے فوری مقاصد مختلف تھے۔ حکومت ماتحت ملازمتوں کے لئے رنگروٹ تیار کرنا چاہتی تھی، مشنری تعلیم کو ہندوستانی سماج تک رسائی حاصل کرنے اور اُن تک صرف حق پہنچانے کا ذریعہ سمجھتے تھے، انگریزی کے لئے ہندوستانیوں کی خواہش کی بنیاد بڑی حد تک مادی مفادات تھے۔ اُن کے لئے انگریزی کے معنی تھے روپیہ۔ اس میں شک نہیں کہ حکومت کے مطالبات اور رقم کی کمی اصل وجہ تھی لوگوں کے ایک چھوٹے سے حلقے تک تعلیم کو محدود رکھنے کی۔ پھر بھی پالیسی سازوں کے ذہنوں کو کم حیثیت طبقوں کو نظر انداز کرنے کے عام رجحانات نے بھی متاثر کیا تھا۔ اگر دیہی سماج میں کسان کو مالکان اراضی اور صرافوں کی چیرہ دستیوں سے محفوظ نہیں رکھا گیا۔ اور شہروں میں دست کاروں اور مزدوروں پر توجہ نہیں دی گئی تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اُن کی تعداد اور افلاس کو اُن کی تا حیات جہالت کے لئے اچھا بہانہ سمجھا گیا۔

نئی تعلیم کی خرابیاں

اس طرح ہندوستانی متوسط طبقے کو تعلیم کی توسیع سے فائدہ ہوا جو سماج میں باحیثیت سمجھے جاتے تھے۔ بہت دن تک تعلیم یافتہ طبقے کی اہلیت محض دو میدانوں تک محدود رہی یعنی پیشے اور سرکاری ملازمتیں۔ آزاد پیشوں میں شامل تھے۔ وکالت، ڈاکٹری اور معلمی۔ حالانکہ اس بات کا بہت چرچا تھا کہ ذات، رنگ اور مذہب کی بنا پر کوئی امتیاز نہیں برتا جائے گا، اور 1833 کے

چارٹر میں ایک دفعہ شامل تھی جس میں یکساں مواقع کا یقین دلایا گیا تھا۔ پھر بھی ملازمتوں میں جن اعلیٰ ترین عہدوں تک پہنچنے کی توقع ہندوستانی کر سکتے تھے وہ تھے سب جج اور ڈپٹی کلکٹر کے عہدے۔ اقرارنامے کی پابند ملازمتوں کے متعلق تو وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

عام لوگوں کی بے اندازہ جہالت کا بار سماج پر پڑ رہا تھا۔ یہ سماجی، معاشی اور سیاسی ترقی کے راستے میں حائل تھا۔ یہی بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ لوگوں کے لئے جدید تعلیم کی قیمت دیسی نظام تعلیم کی تباہی کی صورت میں ادا کرنی پڑی جو کتنا ہی مبادی کیوں نہ سہی پھر بھی بہت سے لوگوں کو حرف شناس بنا دیتا تھا۔ دور وسطیٰ سے باہر قدم رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ جدید علم حاصل کیا جائے اور اس تحفے کے لئے ہندوستان کو ممنون ہونا چاہئے۔ لیکن جہالت کے جس اندھیرے میں عام لوگ کھڑے رہے اس کے جدید کاری کے اثر کو بڑی حد تک کم کر دیا۔

اعلیٰ تعلیم کے ذریعہ کی حیثیت سے انگریزی کا استعمال کچھ ایسے سوالوں کو جنم دیتا ہے جن کا جواب دینا آسان نہیں ہے۔ سرکاری کام کے لئے فارسی کی جگہ انگریزی نے لے لی۔ یعنی ایک بدیسی زبان کی جگہ دوسری بدیسی زبان آ گئی۔ جس کی بین وجہ یہ تھی کہ بولی جانے والی کوئی دوسری زبان کل ہند حیثیت نہیں رکھتی تھی۔ شمال دکن اور جنوب کے شہروں میں اردو اچھی طرح جانی جاتی تھی۔ لیکن اُس کے پاس نثری ادب بہت کم تھا۔ ہندی کی بولیوں اور خصوصیت کے ساتھ برج بھاشا کو وسیع علاقے میں فروغ دیا گیا تھا۔ لیکن تجارت یا دفتری کاموں کے لئے کوئی معیاری زبان یا نثری اسلوب پیدا نہیں ہوا تھا۔ بولی جانے والی زیادہ تر دوسری زبانیں بھی اسی طرح کے تشکیلی مرحلے سے گزر رہی تھیں۔ سنسکرت بہت ترقی یافتہ تھی وہ کسی علاقے میں نہیں بولی جاتی تھی اور عالموں کے ایک چھوٹے سے حلقے تک محدود تھی۔ مغربی علوم کی سنسکرت کے ذریعہ ترسیل میں ناقابل عبور عملی دشواریاں حائل تھیں۔ برطانوی حکمرانوں کی دلیل تھی کہ اگر فارسی ریاست کی زبان ہو سکتی تھی اور اُس کو مختلف فرقوں کے وہ لوگ پڑھ سکتے تھے جو نظم و نسق میں دلچسپی رکھتے تھے، تو نئے حکمرانوں کی زبان انگریزی اُس کی جگہ کیوں نہیں لے سکتی ہے۔ خصوصاً جب کہ تمام دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں وہ جدید علم کی دولت زیادہ رکھتی ہے اور اُن پر اُسے فوقیت

حاصل ہے۔اس وجہ سے بہت سے ہندوستانی بھی اُس کی قدر کرتے تھے اور اپنی کلاسیکی زبان پر ترجیح دیتے تھے۔

ان وجوہ کی بنا پر نئے حکمرانوں کے سامنے کوئی دوسرا راستہ باقی نہیں رہا۔ اس فیصلے کے نتائج وعواقب اچھے بھی تھے اور بُرے بھی۔ اس میں شک نہیں کہ ملک کے ہر حصے میں جب ہندوستانیوں نے انگریزی زبان سیکھ لی تو مواصلات میں آسانی پیدا ہوگئی اور ایک جہتی کے عمل کی رفتار تیز ہوگئی۔ یہ ایک نیا تصور تھا، مغربی ادب کے زیر اثر تقویت ملی۔ اُن یورپینوں کی مثال نے ہندوستانیوں کو بھی متاثر کیا جو جنگ اور امن کے کاموں میں اپنے ملک کے مفادات کو سامنے رکھتے تھے اور اپنی مادر وطن کی کامیابی اور ناموری کے لئے کوشاں رہتے تھے، انگریزی ادب اور تاریخ کے مطالعے نے جو وطن پرستار جذبات اور خیالات سے بھرے ہوئے ہیں تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے ذہنوں پر گہرا اثر ڈالا۔

انگریز حکمرانوں نے ہندوستان میں جس انتظامی اور معاشی اتحاد کو جنم دیا اس نے اتحاد کے احساس کو اُبھارا اور انگریزی زبان اور تعلیم نے اُس کو جلد بالغ نظری عطا کر دی۔

پھر بھی انگریزی زبان کے غلبے نے ہندوستانی زبانوں کی ترقی روک دی۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے جو انگریزی پڑھتے تھے لکھتے تھے اور بولتے تھے مدتوں اپنی مادری زبانوں کو نظر انداز کیا۔ یہ درست ہے کہ تمام زبانوں میں ایسا ادب پیدا ہوا جس کا انحصار بڑی حد تک فطری صلاحیتوں پر ہوتا ہے۔لیکن کسی ادب یعنی سائنس، فلسفہ اور تاریخ سے اُن کے دامن خالی رہے۔ یوں تو ہندوستانی تعلیم ہمیشہ بڑی حد تک علمی رہی لیکن جب بولی جانے والی ایک زبان (سنسکرت، عربی اور فارسی) کی جگہ نہ بولی جانے والی دوسری زبان (انگریزی) نے لے لی تو اُس نے ذہن کے لفظی اور نظریاتی رجحان میں اضافہ کر دیا۔ چنانچہ انگریزی تعلیم کا دوہرا اثر ہوا۔ یعنی دانشوروں اور جاہل عوام کے درمیان باہمی شناخت کی خواہش بھی پیدا ہوگئی اور تعصّباتی دوری بھی۔ اس دوہرے اثر کا نتیجہ ہے گھر کے اندر اور گھر کے باہر کسی فرد کے طور طریق اور قومی یکجہتی میں پائی جانے والی کوتاہیوں کی ذمہ داری بڑی حد تک اس پر ہے۔ جب آپ باہر ایک زبان استعمال کریں اور گھر میں دوسری تو ذہنی دیانتداری کا باقی نہ رہنا ایک ناگزیر عمل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح قومی یکجہتی ضرور مجروح ہوگی۔ جب آپ اہم معاملات کے لئے وہ زبان استعمال کریں گے

جو عام لوگوں کی زبان نہیں ہے۔ ایسی صورت میں شناخت کا احساس دھندلا پڑ جاتا ہے۔ جہاں تک باہری طبقوں کی تعلیم پر اصرار کا تعلق ہے۔ یہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی سماجی معاشی ساخت کا ایک حصہ تھا۔ 1857 کی عظیم بغاوت تک برطانوی پالیسی کا مقصد تھا بالائی طبقوں کو اپنے ساتھ لانا۔ چنانچہ کسانوں کی قسمت پر مالکان اراضی کی خوشنودی حاصل کی جاتی تھی اور جو طبقہ طاقتور روزگار سے محروم ہوگیا تھا اُن کی خواہشوں کو پورا کرنے کے اقدامات میں بڑا جوش دیکھا جاتا تھا، یہ بات اس رجحان سے مطابقت رکھتی تھی کہ محض انگریزی اور چند حقوق یافتہ لوگوں کی تعلیم کو اہمیت دی جائے۔ آبادی کے بہت بڑے حصے کو جہالت کے اندھیروں میں ٹھوکریں کھانے اور قدیم زبانوں کی ٹھنڈی ٹھنڈی روایات میں ٹھٹھرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا تھا۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ نیا تعلیم یافتہ طبقہ بڑی حد تک قدیم ہندو بالائی طبقے پر مشتمل تھا۔ بنگال میں برہمنوں اور کائستھوں کی اکثریت تھی، بمبئی میں برہمنوں، کائستھوں اور پارسیوں کی اور مدراس میں محض برہمنوں کی۔ فی الجملہ مسلم بالا طبقہ دور رہا۔

مسلمانوں کے پس ماندگی کے اسباب

1845 میں 17,350 طالب علموں[1] میں سے جو برطانوی ہند کے سرکاری اداروں میں تعلیم پا رہے تھے کم سے کم 13,699 ہندو تھے۔ مسلمانوں کی تعداد تھی 236 اور 1,789 طالب علموں کا تعلق دوسرے مذہب سے تھا۔ بہ اعتبار پریسیڈنسی 8,138 طالب علم بمبئی کے اسکولوں میں اور کالجوں میں تھے۔ 7,536 زیریں صدی صوبجات میں اور 2,186 شمال مغربی صوبجات میں[2] 1856-57 میں سب سے زیادہ روپیہ بنگال میں خرچ کیا جارہا تھا۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل نقشے ظاہر ہوتا ہے۔[3]

---

[1] ان اعداد میں وہ طالب علم شامل نہیں ہیں جو مدراس ہائی اسکول میں تعلیم پا رہے تھے وہاں اس سال 133 ہندو 21 مسلمان اور 12 عیسائی پڑھتے تھے۔

[2] تعلیمی اداروں میں طالب علموں کی تعداد اور ذاتوں کا نقشہ جسے سرکاری خرچ پر تیار کیا جاتا تھا ہاؤس آف کامنز کو پیش کیا، Parliamentary Paper 1847-48(20)

[3] دی فرینڈ آف انڈیا، 7 فروری 1861، صفحہ 144۔

صوبہ	کل آمدنی پاؤنڈ	تعلیم پر ہونے والا خرچ	تعلیمی خرچ کُل آمدنی کے فی صد کی حیثیت
بنگال	1,12,02,641	94,322	.841
مدراس	47,18,036	34,222	.725
بمبئی	46,00,478	35,243	.766
شمالی مغربی صوبجات	27,24,141	33,060	1.213
پنجاب	10,57,987	14,487	1,369

تعلیم پر خرچ ہونے والی رقم (مطلق اعداد میں) بمبئی اور مدراس پریسیڈنسیوں کے مقابلے میں بنگال میں تین گنا تھی۔ 1861 میں بنگال کے اسکولوں میں جو طالب علم پڑھتے تھے۔اُن کے مندرجہ ذیل تعداد میں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی تعلیم سے زیادہ فائدہ بنگال ہندنے اُٹھایا۔

کلکتہ یونیورسٹی کے 1861 کے انٹرینس امتحان کے نتائج۔[1]

اُسی یونیورسٹی کے اس سال کے بی۔اے کے امتحان میں 39 طالب علم شریک ہوئے جن میں 13 کامیاب ہونے والے طالب علموں میں سے 11 ہندو تھے،ایک عیسائی تھا اور ایک مسلمان تھا۔[2]

جب بھی موقع ملتا تھا ہندو اور پارسی بڑی آسانی کے ساتھ انگریزی پڑھنے کے لئے تیار ہوجاتے تھے۔اس کا اطلاق خصوصیت کے ساتھ پریسیڈنسی شہروں پر ہوتا تھا لیکن مسلمان اور خاص طور سے اندرون ملک کے مسلمان اس کی طرف عموماً غفلت برتتے تھے۔ بہار اور اودھ میں، جہاں کے مسلمان مالکان اراضی اپنے بچوں کو انگریزی پڑھانے کے لئے وسائل رکھتے تھے۔انگریزی تعلیم کو خصوصیت کے ساتھ ناپسند کیا جاتا تھا۔مثال کے طور پر 1867 میں لکھنؤ میں ہونے والے وائے سرائے کے دربار میں 260 تعلقدار موجود تھے۔ جب کہ 1769 میں

---

[1] ایضاً 31۔جنوری 1861،صفحہ 119

[2] ایضاً 31۔جنوری 1881،صفحہ 119

تعلقدار گھرانوں کے صرف 70 بچے اسکولوں میں پڑھتے تھے۔[1] مسلمانوں میں انگریزی اسکولوں کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ بنگال میں بھی انگریزی تعلیم سے مُستفید ہونے کے متعلق سے وہ ہندوؤں سے بہت پیچھے تھے۔ 1860 میں کلکتہ میں مسلمانوں کے دو تعلیمی ادارے تھے۔ یعنی لولنگا مدرسہ اور طلبے الہ لائبریری سوسائٹی۔ جہاں تک طالب علموں کی تعداد اور تعلیم کے معیار کا تعلق تھا۔ یہ ادارے ہندو اسکولوں اور کالجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ مسلمان رہنما اس پس ماندگی کے دو اسباب بتاتے تھے (1) یعنی مسلمانوں کا تعصب جو انگریزی تعلیم حاصل کرنے میں مانع آیا۔ اور (2) حکومت کی بے توجہی[2] بمبئی اور مدراس میں بھی انگریزی تعلیم سے زیادہ فائدہ پارسیوں اور ہندوؤں نے اُٹھایا خاص طور سے برہمنوں، کائستھوں، سرسولوں اور دوسری کاروباری ذاتوں نے 1860 میں ہندوستانی متوسط طبقے کا تعلیم یافتہ حصہ زیادہ تر ہندوؤں پر مشتمل تھا۔ اور مسلمانوں کی تعداد بہت ہی کم تھی۔

متوسط طبقہ مغربی قسم کے اسکول میں گیا مغربی تصورات حاصل کئے اور ایک مشترک زبان یعنی انگریزی کا استعمال سیکھا۔ یکساں معاشی اور سیاسی حالات تو پہلے ہی سے موجود تھے۔ اُن کی تعلیم مشترکہ شہریت کی پہچان میں معاون ہوئی۔ وقت گزرتا گیا اور اس تعلیم یافتہ طبقہ کی جو مشترکہ قومیت کا احساس رکھتا تھا تعداد اور اثر میں اضافہ ہوتا رہا اور اپنے حقوق سے واقف ہو چکا تھا۔ اور جلد ہی اُس نے اپنی تنظیم شروع کی تاکہ حکمرانوں کے سامنے مانگیں پیش کر سکیں۔

---

[1] ایضاً 16 ستمبر 1866 صفحہ 1084

[2] ایضاً 11 جولائی 1869، صفحہ 158

پانچواں باب

اخبارات اور رائے عامّہ

I ہندوستان میں صحافت کی ابتدا

ہندوستان کے برطانوی مقبوضات کے مختلف حصوں میں ایک طرف ایسے گروہ معرض وجود میں آرہے تھے جن کے مفادات اور رہن سہن کے طریقے نئے تھے اور تعلیم کا ایک نیا نظام اُن کے خیالات احساسات کو نئے سانچوں میں ڈھال رہا تھا۔ اور دوسری طرف ملک ان مغربی ذرائع اور طریقوں میں متعارف ہوتا جارہا تھا جو اُن خیالات کے پرچار میں معاون ہورہے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ گروہ ایک دوسرے کے قریب آتے گئے اور اُس کے نتیجے میں ہندوستانی رائے عامہ شکل پاتی گئی۔ ان خیالات کا اظہار جدید منظم انداز سے اخباروں میں ہوا۔ سیاسی انجمنوں کے ذریعے حکومت کو پیش کی جانے والی یادداشتوں اور عرضداشتوں سے ہوا۔ اور عام لوگوں کے حقوق کو عدالتی کارروائی کے ذریعہ تسلیم کروانے کی کوششوں سے ہوا۔ ابھی پلاسی کی جنگ کو مشکل سے ساٹھ سال ہوئے تھے اور ہندوستان کا بڑا حصہ قدیم حکومتوں کی گرفت میں تھا کہ نئے خیالات کی لہریں اُٹھنا شروع ہوگئیں۔ نئے طریقوں میں سب سے اہم تھا چھاپہ خانہ اور ذرائع میں مواصلات کا فروغ یعنی ریلیں، سڑکیں، نہریں، ڈاک اور تار۔

ہندوستان میں چھاپہ خانے شروع کرنے کا سہرا پرتگالیوں کے سر ہوا۔ جنھوں نے 1550

میں دو چھاپہ خانے درآمد کئے۔ انھیں مذہبی کتابیں چھاپنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ جنوب میں اور چھاپہ خانہ قائم کئے گئے۔ سترھویں صدی میں بھیم جی پارکھ نے بمبئی میں ایک چھاپہ خانہ درآمد کیا۔ انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی نے 1674 میں بمبئی میں چھاپہ خانہ کھولا۔ اٹھارھویں صدی میں مدراس، کلکتہ ہگلی اور بمبئی کے علاوہ ایک دو مقامات پر شمال ہندوستان میں بھی چھاپہ خانے قائم کئے گئے۔ چھاپے خانے قائم ہوجانے کے بعد کتابیں، کتابچے اور رسالے چھپنے لگے۔ کچھ افراد اور مشنری سوسائٹیوں نے اُن کے فوائد کو سمجھا اور اپنے اپنے چھاپہ خانے شروع کر دیے۔

1766 میں ولیم بولٹ نے اعلان کیا وہ ایک آزاد اخبار نکالنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ لیکن اخبار جاری نہ ہوسکا۔ چودہ سال بعد 1780 میں جے۔ اے۔ ہکی نے اپنا ہفتہ وار رسالہ بنگال گزٹ شروع کیا جو کلکتہ جرنل اڈورٹائزر بھی کہلاتا تھا اور ہکز گزٹ کے نام سے زیادہ مشہور تھا۔ ہکی نے کچھ یورپیوں اور وارن ہسٹنگز اور الیجہ اسپہ کی طرح کے بڑے بڑے حاکموں پر رکیک جملے لکھ کر حکومت کو ناراض کر دیا۔ اُس کے خلاف پہلا قدم تو یہ اٹھایا گیا کہ محکمہ ڈاک کی خدمات سے اُسے محروم کر دیا گیا۔ پھر اُس کا پریس ضبط کرلیا گیا۔ اس کے بعد اُس کی صحافتی سرگرمیاں ختم ہوگئیں۔ اس کے بعد اور اخبارات نکلے۔ وہ اکثر اُن انگریزوں کے حق میں آواز اُٹھاتے تھے جو حکومت سے غیر مطمئن ہوتے تھے۔ حکومت کی پالیسی اور کارروائیوں پر تنقید صاحبان اقتدار کی ناراضگی کا باعث ہوتی تھی۔ اور کبھی کبھی اُن کی شائع کردہ خبریں خاص طور سے قومی خبریں مصلحت کے منافی اور حکومت کے مفادات کے خلاف سمجھی جاتی تھیں؛ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان ابتدائی اخبارات کے ساتھ حکومت کے مراسم میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔ اُن میں کئی کو حکومت کی ناراضگی کا سامنا کرنا پڑا۔ اور کچھ مدیروں کو سرسری کارروائی کے بعد ہندوستان سے نکال دیا گیا۔ مثلاً ولیم ڈومین، چارلس میکلن اور کچھ مدت بعد جیمس سلک بکنگھم۔

ویلزلی اُن کارروائیوں سے مطمئن نہیں تھا۔ چنانچہ اُس نے اخبارات کا سختی کے ساتھ سینسر کیا۔ اور لارڈ ہسٹنگز کے زمانے تک حالات اخبارات کے لئے سازگار نہیں تھے۔ 1818 مین ہسٹنگز نے اخبارات کو سینسر کرنے کا محکمہ توڑ دیا۔ لیکن اخبارات کے تعلق سے مندرجہ ذیل ضابطے بنا دیئے۔

اخبارات کے مدیروں کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت آنے والی خبروں کی اشاعت ممنوع قرار دی گئی ہے۔

نمبر 1۔ آنرایبل کورٹ آف ڈائریکٹرز یا ہندوستانی حکومت سے تعلق رکھنے والے انگلستان کے دوسرے کسی حاکم کے اقدام اور کارروائی کے خلاف تنقید یا مقامی حکومت کی سیاسی کارروائیوں پر تبصرہ یا کونسل کے اراکین سپریم کورٹ کے ججوں یا کلکتہ کے لارڈ بشپ کے کسی سرکاری اقدام کے خلاف اہانت آمیز رائے زنی۔

نمبر 2۔ مباحثے جن سے مقامی آبادی کے دلوں میں ہتک یا خوف پیدا ہو کہ ان کے مذہبی تصورات یا رواجوں میں مداخلت کا ارادہ کیا جا رہا ہے۔

نمبر 3۔ انگریزی یا دوسرے اخبارات کے ایسے ٹکڑوں کی نقل جو مندرجہ بالا عنوانات کے تحت آتے ہیں یا کسی اور طرح ہندوستان میں برطانوی طاقت یا شہرت کے لئے مُضر ہیں۔

نمبر 4۔ کسی شخص کی ذاتی زندگی کے بُرے پہلوؤں کو پیش کرنا اور کسی کے متعلق اس قسم کی باتیں کہنا جو سماج میں فتنہ وفساد پیدا کریں۔

ان پابندیوں سے ظاہر ہوتا ہے، لارڈ ہسٹنگز یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ اخبارات کے سینسر کو بالکل ختم کر دینے کی منظوری کورٹ آف ڈائریکٹرز کو نھیں دے گا۔ اُس نے اپنی روداد میں اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ رائے عامہ کی طرف کے ذمہ دارانہ رویے کی نشوونما کی اہمیت نے اُسے متاثر کیا ہے۔ کورٹ آف ڈائریکٹرز نے گورنر جنرل کی کاروائی کو ناپسند کیا اور خیال ظاہر کیا کہ اشاعت سے پہلے سنسر کرنے کا پرانا طریقہ جاری رہنا چاہئے۔ لیکن بورڈ آف کنٹرول نے یہ مراسلہ روک لیا۔

اُس سال جیمس سلک بکنگھم نے کلکتہ جرنل شروع کیا جس نے اپنے مضامین کی عمدگی اور شگفتگی کی بنا پر اور بڑی جرأت کے ساتھ سرکاری کمپنیوں کو تشت از بام کر کے ہلچل مچادی۔ یہ پرچہ نہ انگریزوں بلکہ ہندوستانیوں میں بھی مقبول ہوگیا۔ ہم عصر پرچوں میں غالباً یہ سب سے زیادہ بکتا تھا۔ اُس کی صاف گوئی نے آڈم، بیلی اور لارڈ ہسٹنگز کی کونسل کے دوسرے اراکین کو بہت ناراض کر دیا۔ جوں ہی ہسٹنگز اپنے عہدے سے ہٹا اور آڈم نے انتظام سنبھالا اس نے حکم جاری

کیا کہ ہر اخبار کے ناشر کو لائسنس لینا چاہیے۔ جب یہ کارروائی بھی بکنگھم کی سرگرمیوں کو نہ روک سکی تو اُسے ہندوستان چھوڑنے کا حکم دے دیا گیا۔

اس کی تفصیلات بیان کرنا ضروری تھیں کہ کس طرح اخبارات کے ان مدیروں اور ایک ضرورت سے زیادہ حساس مطلق العنان حکومت کے درمیان اخبارات کی آزادی کے لئے کشمکش ہوئی جو اس کی کارروائیوں کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ اور صاحبان اقتدار پر تنقید کرتے تھے۔ یہ ضرور ہے کہ اُس زمانے کے انگریزی کے اخباروں میں ہندوستانیوں کی دلچسپی کا مواد بہت کم ہوتا تھا۔ اُن کے پڑھنے والوں کا حلقہ بہت محدود تھا۔ اور اُن ہندوستانیوں کی تعداد بہت کم تھی جو انھیں پڑھا کرتے تھے۔

پھر بھی عام لوگوں کی تعلیم کے لیے اخباروں کے استعمال کے تصور نے دوسروں کو بھی متاثر کیا۔ لارڈ ہسٹنگز ادبی فروغ کا حامی تھا۔ وہ اخبارات کی افادیت کا قائل تھا۔ وہ دشواریاں رفتہ رفتہ ختم ہوتی جارہی تھیں جنھوں نے صحافتی سرگرمیوں میں روک لگا رکھی تھی اور ہندوستانیوں کا ایک ایسا حلقہ معرض وجود میں آگیا تھا جو اپنے ہم وطنوں کو تربیت دینے کی ضرورت کو محسوس کرتا تھا۔

ہندوستانی اخبارات کی ابتدا

مشنری بنگالی زبان میں ایسے نثری اسلوب کو جنم دینے کی کوشش کررہے تھے جو سنجیدہ موضوعات پر گفتگو کرنے میں معاون ثابت ہوسکے۔ 1816 میں گنگا دھر بھٹاچاریہ اور ہرچند رائے نے کلکتہ سے ایک اخبار نکالا جس کا نام تھا بنگال گزٹ۔ بدقسمتی سے یہ پہلا اخبار زیادہ دن تک نہ چل سکا۔

ہندوستانی زبان میں اخبار نکالنے کے سلسلے میں حقیقی پہل سیرم پور کے مشنریوں نے کی 1818 میں رگ درشن ڈرتے ڈرتے نکالا گیا جو بنگالی زبان کا پہلا رسالہ تھا۔ اس میں محض ادبی، سائنسی اور تاریخی مضامین شائع ہوتے تھے اور انگریزی اور بنگالی دونوں زبانیں استعمال کی جاتی تھیں۔ لیکن یہ رسالہ صرف تین سال تک چل سکا۔ بنگالی کا ایک ہفتہ وار پرچہ سماچار درپن بھی 1818 شروع ہوا جسے ڈاکٹر مارش مین کچھ بنگالی ادیبوں کی مدد سے مرتب کرتا تھا۔ یہ پرچہ 1818 سے 1841 تک ہر سنیچر کو شائع ہوتا رہا۔ اس کے بعد وہ بند ہوگیا۔ اور 1851 میں دوبارہ نکلنا

شروع ہوا۔ لیکن اُس کے کچھ دن بعد اس کی اشاعت ختم ہو گئی۔ اس میں بہت سے موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ جس نے اس کے قارئین کو ایک نئی دنیا سے متعارف کر دیا تھا۔ یعنی یورپی اور امریکی معاملات کے متعلق اطلاعات، غبارے، دوخانی، جہاز اور پودوں کے متعلق سائنسی معلومات اور سوانح۔ لیکن اس کی خصوصی نوعیت تھی ہندو اور عیسائی مذاہب پر مباحث۔

اُسی سال (1818) سیرم پور مشن نے ایک انگریزی کا اخبار نکالا جس کا نام تھا فرینڈ آف انڈیا۔ مشنریوں کی سرگرمیوں نے اخبار نکالنے کے سلسلے میں دوسروں کی بھی ہمت افزائی کی۔ جن لوگوں نے مواقع سے فائدہ اُٹھایا اُن میں جیمس سلک بکنگھم کے علاوہ تارا جندت اور بھوانی چرن بندوپادھیا کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ آخر الذکر ایک بنگالی ہفتہ وار سمواد کوٹری نکالتے تھے۔ اس کا پہلا شمارہ 4 دسمبر 1821 کو شائع ہوا تھا۔ رام موہن رائے کا قریبی تعلق کولٹری سے تھا اور وہ اُس میں برابر لکھتے رہتے تھے۔ انھوں نے اس پرچے کو ہندوؤں کی سماجی اور مذہبی اصلاح کا نقیب بنا دیا۔ اُن کے وہ مضامین اس میں شائع ہوئے جن میں انھوں نے ستی کی رسم کی مذمت کی تھی۔ ان مضامین نے ہندوؤں میں اشتعال پیدا کر دیا۔ جس کی وجہ سے پرچے کو نقصان ہوا۔ کلکتہ جرنل نے 14 فروری 1823 کے شمارے میں لکھا تھا ''وہ پرچہ جو اتنا خطرناک سمجھا جاتا تھا اور جس کے متعلق خیال تھا کہ بارود کی سرنگ میں چنگاری کا کام کر کے پورے ہندوستان میں دھماکے کا باعث بن جائے گا۔ آج بے یارومددگار ہے اور زمین پر پڑا ہوا ہے۔ ہماری رائے میں اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اُن کے رسم و رواج اور خاص طور سے ہندو بیواؤں کو جلانے کی رسم کی مخالفت کر کے اُس نے مقامی لوگوں کو ناراض کر دیا۔[1]

سمواد کوٹری وقفے وقفے سے تقریباً دس سال تک نکلتا رہا۔ اس کا جو حشر ہوا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انیسویں صدی کے نصف میں اصلاحات کا راستہ کتنا دشوار راستہ تھا۔

سمواد گوٹری کے علاوہ رام موہن رائے ہندو دھرم کو عیسائی مشنریوں کے حملوں سے بچانے کے لئے ایک اور پرچہ نکالنا شروع کیا۔ یہ پرچہ برہمنی رسالہ یا برہمنی سیوادھی کہلاتا تھا۔ اس میں بنگالی اور انگریزی دونوں زبانوں میں مضامین شائع ہوتے تھے۔ اس کے صرف تین شمارے

---

[1] بندوپادھیا برجندر ناتھ بنگلہ مسایک پترا (بنگلہ ساہتیہ پریشد) (کلکتہ 1948) صفحہ 10 حاشیہ 4

شائع ہوئے۔اس کے بعد یہ بند ہو گیا۔ان شماروں میں رام موہن رائے نے ہندو اور مسلم مذہب کے خلاف مشنریوں کے الزامات کا جواب دیا اور اُن کی سرگرمیوں کی مذمت کی۔انھوں نے سڑکوں پر کھلم کھلا تبلیغ کرنے اور طرح طرح کے لالچ دلا کر غریبوں کو عیسائی بنانے کی مخالفت کی۔ انھوں نے بڑے غصے کے ساتھ لکھا کہ مشنری حکمراں طبقے کی رکنیت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں اور اُن محکوم لوگوں کے درمیان تبلیغ کا کام کرتے ہیں۔جو ماتحتوں سے بہت خائف ہیں۔دو فارسی کے اخبار بھی نکلتے تھے یعنی جام جہاں نما، مرات الکبیر۔یہ اخبار بھی رام موہن رائے کے اشارے پر نکالے گئے تھے۔اُن تمام اخبارات میں زیادہ تر مذہبی مسائل پر بحث کی جاتی تھی۔

رام موہن رائے کے پرچوں کے اسلامی نوعیت نے رجعت پرست اور رسم و رواج سے لپیٹے لوگوں کو اُن کا مخالف بنا دیا۔ اور انگریز مشنریوں نے اور ہندو دھرم کے ہندوستانی محافظوں کی بحث نے حکمرانوں کو خائف کر دیا۔گورنر جنرل کی کونسل کے کچھ اراکین نے روداد یں لکھیں۔ جن میں اخباروں کے خلاف سخت کاروائی کرنے کی سفارش کی گئی۔انھیں یہ ڈر تھا کہ رائے عامہ میں خلل پڑ رہا ہے۔اور عمل کی فکر تھی مختلف طبقوں کے درمیان پائے جانے والی بے چینی کوئی بری شکل نہ اختیار کر لے۔ترقی پسند اخبارات خصوصی پریشانی کا باعث تھے اور اُن پر حکومت نے خاص طور سے توجہ دی۔ ولیم بڑودتھ بیلی نے اپنی روداد مورخہ 10 اکتوبر 1822 میں لکھا ہے ''لیکن اخبارات کی آزادی چاہے کسی آزاد ریاست کے لئے وہ کتنی ہی ضروری کیوں نہ ہو۔ میرے خیال میں اس ملک میں ہمارے اداروں اور ہندوستان میں ہماری حکومت کی غیر معمولی نوعیت سے مطابقت نہیں رکھتی ہے۔''[1] بیلی کا خیال تھا ''یہ بات نہ قرین عقل ہے نہ سیاسی اعتبار سے درست کہ ہندوستانی رعایا کو اس امر کی اجازت دی جائے کہ آزادی کے ساتھ ہندوستان کی زبانوں میں انگریز حکمرانوں کے کردار یا سرکاری کاروائیوں پر اُن مختلف مذاہب کی تقابلی خوبیوں پر جن میں ہر ہندوستانی کی آبادی کے مختلف الخیال لوگ عقیدہ رکھتے ہیں، تقریر یا تحریر کے ذریعہ رائے زنی یا اعتراض کریں۔''

چنانچہ 1823 جان ایڈم نے قائم مقام گورنر جنرل کی حیثیت سے ایک ضابطہ کا نفاذ کیا جس

---

[1] برنس، مارگاریٹا The Indian Press لندن، جارج ایلن انڈ الفون 1940، صفحہ 106

میں اخبارات کی آزادی کم کردی یہ حکم دیا گیا کہ کوئی اخبار کتابچہ یا کتاب جس میں سرکاری اطلاعات درج ہوں یا سرکاری اقداموں اور کارروائیوں پر اعتراض کیا گیا ہو۔بغیر لائیسنس حاصل کئے شائع نہیں کی جاسکتی ہے۔ لائیسنس حاصل کرنے کے لئے ایک حلف نامہ داخل کرنا پڑتا تھا۔ جس میں ناشر طابع اور مالک کے نام درج کئے جاتے ہیں۔ اور مندرجات کے متعلق اطلاع فراہم کی جاتی تھی۔ لائیسنس منسوخ کیا جاسکتا تھا۔اور بغیر لائیسنس کے چھاپنے کی صورت میں 400 روپیہ جرمانہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ چنانچہ حکومت کی اجازت کے بغیر کتاب یا اخبار چھاپنا اور چھاپے خانے کو استعمال کرنا ایک قابل تعزیر جرم قرار دیا گیا۔

آزادیٔ اخبارات کے متعلق رام موہن رائے کی رائے

رام موہن رائے نے اس ضابطہ کے خلاف احتجاج کیااور سپریم کورٹ میں ایک عرضداشت پیش کی جس میں ضابطے کی منسوخی کی درخواست کی گئی تھی انھوں نے اپنی درخواست میں لکھا تھا کہ یہ ضابطہ نہ صرف علم کی نشر واشاعت میں مانع آئے گا بلکہ اسی کی وجہ سے لوگ افسروں کی ناانصافیوں اور غلطیوں کو حکومت کی نظر میں لاسکیں گے۔انھوں نے یہ لکھا تھا کہ ''ہر اچھا حکمراں جو انسانی کوتاہیوں کا قائل ہو اور دنیا کے دائمہ حاکم کا احترام کرتا ہو۔ بڑی سلطنت کے نظم ونسق میں غلطیوں کے امکان کا احساس ضرور رکھتا ہوگا اور اس لئے اسے یہ فکر ہوگئی کہ ایسے تمام معاملات کی طرف اُس کی توجہ دلانے کے مواقع ہر فرد و بشر کو حاصل ہونا چاہئے۔جن میں اُس کی مداخلت ضروری ہو۔اس اہم مقصد کو حاصل کرنے کے لئے واحد مؤثر طریقہ ہے اشاعت کی مکمل آزادی۔''[1]

سپریم کورٹ نے یہ درخواست خارج کردی رام موہن رائے نے اجلاس کونسل کو اپیل بھیجی۔انھوں نے کونسل کی توجہ اُس تکلیف دہ صورت حال کی طرف دلائی جو ہندوستان کی حکومت نے پیدا کردی تھی۔انھوں نے لکھا تھا ''مقامی انتظامی حکام نے ایک اہم ترین معاملہ میں قانون سازی کے اختیارات یکلخت حاصل کرلیے اور اس بات کی نشاندہی کئے بغیر کہ ہم نے ان سے

---

[1] The English Works of Raja Ram Mohan Ray تروین جے۔سی۔گھوش، جلد 2 (کلکتہ ایس۔کے۔لائبریری اینڈ کو) 1910، صفحہ 286

ناجائز فائدہ اٹھایا ہے۔ ہمیں قدیم قانونی حقوق سے محروم کردیا۔ اور ہمارے سول حقوق پر اس قسم کا حملہ کیا جس کی نظیر بنگال میں انگریزی راج کی تاریخ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس کے لیے ایسا اقدام کیا گیا جس سے یا تو ملک معظم کی وفادار رعایا کے سول حقوق اور استحقاق کی طرف ان کی مکمل بے توجہی ظاہر ہوتی ہے یا موجودہ حکومت سے ہمارے لگاؤ کے متعلق بے بنیاد مشکوک و شبہات کو ہوا دینے کا ارادہ۔ [1]

اس مدلل اپیل کا بھی وہی حشر ہوا۔ کونسل نے مداخلت کرنے سے انکار کردیا۔ اس کے باوجود یہ اپیل ایک دلچسپ دستاویز کا حکم رکھتا ہے۔ اس کے متعلق مس کولٹ نے کہا ہے اس کو ہندوستان کی تاریخ کا سب سے اہم استغاثہ کہنا چاہئے۔ اپنے اسلوب اور استدلال کی بنا پر یہ دستاویز مشرق میں انگریزی تہذیب کے فروغ میں ایک باوقار سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔'' [2] اس نے ان خطوط کا یقین کرایا ان پر پوری کی پوری انیسویں صدی میں ہندوستانی حکومت کی سیاسی تحریک چلنے والی تھی۔

II ہندوستانی اخبارات اور ان کی محدود نشوونما

حکومت کی پالیسی تبدیل کرانے میں ناکامی کا زیادہ اثر اخبارات پر نہیں پڑا ہندوستانی رائے عامہ اخبارات کی قدر و قیمت سے واقف ہوگئی تھی۔ اور پابندیوں کے باوجود جو 1835 تک جاری رہیں بہت سے اخبارات معرض وجود میں آگئے جن کی ادارت ہندوستانیوں اور یورپینوں کے سپرد تھی۔ بندوا پادھیائے نے تقریباً تیس بنگالی اخباروں کی فہرست دی ہے جنھیں اس زمانے میں لائیسنس ملا۔ [3] اُن میں سے کچھ ماہ وار تھے لیکن زیادہ تر ہفتہ وار تھے۔

ہندوؤں کے قدامت پرست گروہ کی طرف سے جو اخبارات نکالے گئے اُن میں سماچار

---

[1] ایضاً صفحات 287-88

[2] سوفیہ ڈی، Life and Letters of Raja Ram Mohan Ray کلکتہ (تیسرا ایڈیشن 1962)، صفحہ 177

[3] بندوپادھیا برجندر ناتھ محولہ بالا، صفحات 7-8

فیدر کا شامل تھا۔جس کی ادارت بھوانی چرق بندوپادھیائے کے سپرد تھی جو سمواد کوٹری کے مدیروں میں شامل رہ چکے تھے۔ 1823 میں یہ اخبار ستی کے خلاف رام موہن رائے کی تحریک کی مخالفت میں نکالا گیا تھا۔ یہ اخبار رجعت پسند دھرم سبھا کا حامی تھا۔کسی نہ کسی طرح یہ 1857 تک جاری رہا۔لیکن سبھا کے ختم ہوجانے کے بعد اس کا اثر کم ہو گیا تھا۔دوسرا اخبار سمواد پورنا چندرودالیا جو کئی سال تک جاری رہا۔ابتدا میں ایک ماہ وار ادبی اور سیاسی رسالہ تھا لیکن بعد میں ہفتہ وار ہو گیا۔اور پھر ہفتہ میں تین مرتبہ نکلنے لگا اور بالآخر روزنامہ ہو گیا۔ایک اہم ادیب اور شاعر ایشور چندر گپتا ہفتہ وار سمواد پربھاکر کا مدیر تھا جو بعد میں روزنامہ ہو گیا۔ یہ اخبار ہندوستانی سماج میں عورت کی حیثیت کے تعلق سے پرانے خیالات کا اظہار کرتا تھا۔کئی جانے پہچانے ادیب اس کے لکھنے والوں میں شامل تھے۔اپنی ادبی زندگی کے ابتدائی زمانے میں رادھا کان، دیب پرسنا کمار ٹیگور، جے گوپال ترک کم، ناول نگار، بنکم چندر چٹرجی اور نیل درپن کے مصنف دین بندھومترا اس میں لکھا کرتے تھے۔

پرانے خیال کے کئی اور اخبار بھی نکالے گئے۔لیکن وہ زیادہ دن تک جاری نہ رہ سکے۔

روشن خیال اخباروں میں سمواد کوٹری کے علاوہ بنگال ہیرالڈ بھی تھا۔اس کا پہلا شمارہ 1829 میں شائع ہوا۔اس میں چار زبانوں میں مضامین شائع کئے جاتے تھے۔یعنی انگریزی، فارسی، ہندی، بنگالی میں۔اس کے معاونوں میں تھے آر۔ایم۔مارٹنم، دوارکا ناتھ ٹیگور۔ پرسنا کمار ٹیگور، رام موہن رائے وغیرہ۔ ہیرالڈ کے بانیوں کی سرپرستی میں 1830 میں بنگادوت بھی نکالا گیا۔ گیانندیش ایک روشن خیال ہفتہ وار تھا جس میں مذہب اور سائنس کے متعلق مضامین شائع کئے جاتے تھے۔ روبرٹ ماٹگری۔مارٹن اور نیل رتن۔ڈی۔ اس کے مشترکہ مدیر تھے۔ اس پر حکومت کا عذاب نازل ہوا۔اور سرکاری احکام کے خلاف رائے ظاہر کرنے کے تعلق سے اُسے تنبیہ کی گئی۔

گیانندیش بنگال کا آرگن تھا۔ یہ گروہ ہندو کالج کے سابق طالب علموں اور دیروزیو کے طالب علموں پر مشتمل تھا۔وہ ایک اخبار انگریزی میں بھی شائع کرتے تھے جس کا نام تھا انکوائر۔یہ دونوں اخبار بنگال میں نشاۃ ثانیہ کے پیش رو تھے۔

وگیان سمواد میں جو ماہوار رسالہ تھا، سائنس پر مضامین کے تراجم چھاپے جاتے تھے۔ مستشرق۔ایچ ولسن نے پشوالوی کو جنم دیا جو ایک سائنسی رسالہ تھا اور طبی تاریخ پر مضامین شائع کرتا تھا۔

فارسی کے اخبار

کلکتہ سے دوسری زبانوں کے اخبارات بھی نکلتے تھے۔فارسی میں کئی اخبار نکلے جو اس وقت سرکاری زبان تھی اور بالائی طبقے میں بڑے پیمانے پر سمجھی جاتی تھی۔ رام موہن رائے کا مراۃ الاکبر 1822 میں شروع ہوا۔ اپنی پالیسی کا اعلان کرتے ہوئے اس نے لوگوں کو توجہ مندرجہ ذیل امور کی طرف دلائی۔کلکتہ میں پائی جانے والی آزادی اور تحفظ حقوق کی برابری جو قوانین نے اونچے اور نیچے کی درمیان قائم کردی ہے اور عام لوگوں کو تعلیم دینے،سماج کو سدھارنے اور اُن کی شکایتوں کے تدارک کے لئے حکومت تک لوگوں کے احساسات اور جذبات کو پہنچانے کے لئے اخبار نکالنے کی ضرورت کی وضاحت کی۔

فارسی کا دوسرا اخبار تھا جام جہاں نُما اس کا مدیر تھا فش سداسکھ اور ناشر ولیم پیٹرس ہاپ کنز اور اینڈ کمپنی کچھ برسوں تک اس کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرپرستی حاصل رہی۔لیکن اس کے بعد یہ سرپرستی نامعلوم اسباب کی بنا پر ختم ہوگئی۔ فارسی کے ساتھ اُس کا اردو ضمیمہ بھی شائع کیا جاتا تھا۔ اُس کا نام بھی جام جہاں نما تھا۔اس میں مضامین کے علاوہ انگریزی فارسی اور نظموں کے ترجمے بھی شائع کئے جاتے تھے۔ اُن کے علاوہ کئی اور فارسی کے اخبار تھے۔مثلاً شمس البکر جس کے بانی تھے منی رام ٹھاکر اور ماتھر موہن (1823) سیرم پور کے عیسائی مشنریوں کا سیرم پور اخبار (1826)، آئینہ اسکندر (1831) ماہ عالم افروز (1832) جس کا مدیر تھا ایم وہاج الدین۔ سلطان اخبار 1835 جسے لکھنؤ کا رجب علی شائع کرتا تھا۔اور مہر چند 1841 جو ہفتہ میں تین مرتبہ شائع ہوتا تھا۔ کچھ فارسی اخبار حکومت پر سخت تنقید کرتے تھے۔اور اُن امور کی مذمت کرنے میں نہیں ہچکچاتے تھے جن پر اعتراض کرنا وہ ضروری سمجھتے تھے۔انگریز حکام کے خلاف ہندوستانی ابتدا میں اپنے غصہ کا اظہار کس طرح کرتے تھے اس کی کچھ مثالیں قابل غور ہیں۔ ماہ عالم افروز میں ایک انگریز افسر کی خبر شائع کی گئی جو شکار کھیلنے گیا تھا اور غلطی سے ایک عورت کو گولی ماردی تھی۔

مجسٹریٹ نے اُسے رہا کر دیا اور تنبیہ کرنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ اخبار نے لکھا تھا مجسٹریٹ نے نسلی پائیداری سے کام لیا اور قاتل کو رہا کر دیا۔ جو ایک دولت مند انسان ہے۔ ایک بے گناہ شخص کی موت کے لئے نہ اُسے مجرم گردانا نہ قصوروار ٹھہرایا۔ سلطان اخبار نے عدالت کے چھوٹے موٹے اہلکاروں کی شکایت کی جو اپنی بد اطواری کی بنا پر لوگوں کی تکلیفوں کا باعث تھے لیکن انگریز افسران کے خلاف شکاتیوں پر توجہ نہیں دیتے تھے

سلطان اخبار نے برطانوی سلطنت اور اودھ کے حالات کا موازنہ کیا اُس نے بتایا کہ برطانوی حکومت کے ذمہ دار تکلیفوں میں مبتلا ہیں یہ کہ کلکتہ کے شہر میں جتنے قتل ہوئے ہیں اُتنے قتل اودھ کی پوری سلطنت میں نہیں ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ ہر برطانوی عدالت میں رشوت کا بول بالا ہے۔ حکمرانوں کی طرف ہندوستانیوں کے جذبات کیا تھے۔ اس کی تصدیق اُن خیالات سے ہوتی ہے جو کریم خاں کی پھانسی کی خبر پر ظاہر کئے گئے تھے جسے دہلی کے ریسی ڈنٹ ولیم فریزر کے قتل کی پاداش میں 1830 میں پھانسی دی گئی تھی۔ لوہارو کے نواب شمس الدین کو بھی مجرم گردانا گیا تھا لیکن جس دن اسے پھانسی دی گئی کوئی مرد، عورت اور بچہ امیر یا غریب پھانسی کا منظر دیکھنے کے لئے نہیں آیا اور اس طرح دہلی کے شہریوں نے نواب کے ساتھ ہمدردی اور اس کو دی جانے والے سزا کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا۔

ہندی کے اخبار

کچھ بنگالی کے اخباروں نے بنگالی کے ساتھ ہندی میں بھی خبریں اور مضامین شائع کرنے کی کوشش کی لیکن پہلا ہندی کا اخبار 1826 میں شروع ہوا۔ اس کو کانپور کے پنڈت جگل کشور شکلہ نے شروع کیا۔ جو صدر دیوانی عدالت میں ایک ماتحت اہلکار تھا یہ پرچہ ڈیڑھ سال تک جاری رہا۔ اُس کے بعد حمایت کی کمی کی بنا پر ختم کر دیا گیا۔

1830 کے ختم ہونے تک صرف کلکتہ میں بنگالی کے تین روزنامے ایک ہفتے میں تین مرتبہ شائع ہونے والا اخبار، دو ہفتے میں دو مرتبہ شائع ہونے والے اخبار۔ سات ہفتے وار اور ایک ماہ نامہ شائع ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ انگریزی زبان میں 13 اخبار نکلتے تھے۔ انگریزی کے اخباروں کو یورپین باشندے خریدتے تھے۔ لیکن اُن کے قارئین میں تھوڑے سے ہندوستانی بھی

شامل تھے۔ ان میں سے کچھ اخباروں نے طوفانی زندگی گذاری اس لیے کہ وہ نہ صرف سرکاری کاروائیوں پر تنقید کرتے تھے بلکہ سرکاری احکام پر ذاتی جمع بھی کیا کرتے تھے۔ ہکی اور جیمس سلک بکنگھم کی روداد یں حکومت اور تنقید کرنے والے اخباروں کے تصادم کو ظاہر کرتی ہیں۔

اخبارات کی آزادی کی بحالی

بکنگھم کا اخبار کلکتہ جرنل نہ صرف آزادیٔ رائے کا حامی تھا بلکہ سرکاری کاروائیوں پر بڑی نڈری کے ساتھ تنقید بھی کرتا تھا۔ یہ اخبار ہندوستانی اخبارات کی شرارت اور اُن میں سے کچھ مندرجات کی فہرست بھی شائع کرتا تھا۔ بکنگھم سے رام موہن رائے کی دوستی تھی۔ اُس کی مثال نے ہندوستانی اخبارات کی خاصی ہمت افزائی کی۔

حکام کے درمیان پائے جانے والے اختلافات اور بینٹک کی جزوی نے جو اشتعال پیدا کر دیا تھا اُس کی وجہ سے گورنر جنرل کے لبرل خیالات کے باوجود کوئی فیصلہ کن قدم نہیں اُٹھایا جاسکا۔ کلکتہ کے کئی صحافیوں کی طرف سے جن میں زیادہ ہندوستانی تھے 9 فروری 1835 کو گورنر جنرل اجلاس کونسل کی خدمت میں ایک عرضداشت پیش کی گئی۔ جس میں 1823 کے ضابطے اور اس کے تحت بنائے جانے والے قاعدوں کو منسوخ کرنے کی درخواست کی گئی تھی۔ بینٹک نے تسلیم کیا کہ اخبارات کے تعلق سے قانونی حیثیت قابل اطمینان نہیں اور اس کو بدلنے کا وعدہ کیا۔ لیکن اس سلسلے میں کچھ کرنے سے پہلے وہ ریٹائر ہو گیا اور مٹکاف نے ذمہ داری سنبھال لی۔

بینٹک کے زمانۂ حکومت میں ہندوستان کے حالات میں ایک نیا موڑ آ گیا۔ اب برطانوی سرمائے کی اصل کاری زراعت اور صنعت میں ہونے لگی تھی اور ہندوستان کو اس طرح ترقی دی جانے لگی تھی کہ وہ انگلستان کو خام مال مہیا کر سکے اور اُس کی مصنوعات خرید سکے۔ حکومت کی سول ملازمتوں میں زیادہ ہندوستانی بھرتی کئے جانے لگے تھے۔ ستی کی رسم ختم کرنے کی سماجی اصلاحات کی جا چکی تھیں۔ انگریزی تعلیم تیزی کے ساتھ پھیل رہی تھی جس کے نتیجے میں سرگرمیاں بڑھ گئیں تھیں اور زیادہ بحث و مباحثہ ہونے لگا تھا اور کئی اخبارات شروع ہو چکے تھے۔ پرانی قدروں پر نظرثانی کی جارہی تھی۔ پرانے سماجی رواجوں اور مذہبی عقیدوں پر تنقیدی نظر ڈالی

جارہی تھی۔ اور ادبی اظہار کی حیثیت و مواد بدل رہے تھے۔

سر چالس مٹکاف نے 1835 میں ایک جرأت مندانہ قدم اُٹھایا اور اخبارات کی آزادی بحال کردی جس کہ وجہ سے کورٹ آف ڈائریکٹرز اُس سے ناراض ہوگیا۔ بظاہر سرکاری حکام دو گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک گروپ بقول سر تھامس منرو سمجھتا تھا کہ ''آزاد اخبار اور بدیسیوں کی حکومت ایسی چیزیں ہیں جن میں کوئی مطابقت نہیں اور جو زیادہ مدت تک دوسرے کا ساتھ نہیں دے سکتے۔''[1] اُن کے مطابق ''آزاد اخبار آزاد ادارے لازم وملزم ہیں۔ اس کے برعکس آزاد اخبار ایک مطلق العنان اور اُس سے زیادہ ایک بدیسی حکومت کے قدرتی طور سے مخالف ہوتے ہیں۔''[2]

دوسرے گروہ کی رائے مختلف تھی۔ اُن میں سر چالرس ٹریولین شامل تھا جو خود بھی انڈو قیلوس کے فرضی نام سے اخبارات میں مضامین لکھ چکا تھا۔ اور اس کا قائل تھا کہ سرکاری حاکم پر رائے عامہ کا اچھا اثر پڑتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ نمائندہ اسمبلی کی عدم موجودگی میں خرابیوں کو ظاہر کرنے اور عام لوگوں کے احساسات کو جاننے کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔

ہندوستانی اخبارات پر سے پابندیاں ہٹانے کے متعلق جو شکوک وشبہات پائے جاتے تھے مٹکاف نے انھیں پس پشت ڈال دیا اور کہا ''ہندوستان کو برطانوی حکومت کا جز بنائے رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اُس کے باشندوں کو جہالت کے اندھیرے میں رکھا جائے تو ہماری حکومت اس ملک کے لئے ایک لعنت ہے اُسے ختم ہونا چاہئے۔''[3]

چنانچہ اس طرح شروع ہونے والا آزادی کا یہ دور رائے عامہ اور اخبارات کی ترقی میں بڑا معاون ثابت ہوا۔ بہت سے اخبارات وجود میں آ گئے۔ حالانکہ اُن میں سے اکثر تھوڑے دن کے بعد ختم ہوگئے۔ ان اخبارات میں روزنامے، ہفتہ میں دو بار اور تین بار شائع ہونے والے اخبار، ماہنامہ اور سال میں چار دفعہ شائع ہونے والے مجلّے شامل تھے۔ ابتدائی دنوں میں اُن کے

---

[1] ایم برنس، محولہ بالا، صفحہ 251 بمبئی کے گورنر لارڈ الفنسٹن کی روداد مورخہ 24 جون 1857 کا اقتباس

[2] ایضاً

[3] ایضاً، صفحہ 222

پڑھنے والوں کی تعداد کم تھی۔ لیکن اُن کا اثر اس سے کہیں زیادہ تھا۔ جتنا اُن کی تعداد سے معلوم ہوتا ہے۔

1835 اور 1857 کی درمیانی مدت میں ایک سو سے زیادہ اخبار نکلنا شروع ہوئے۔ اُن کے مندرجات فکر و عمل کے ہر میدان پر محیط ہوتے تھے۔ یعنی مذہب، اخلاق، رسم و رواج، ادب، سائنس، عالمی حالات، تاریخ، معاشیات اور سرکاری انتظام۔ اگر جمہوری عمل کی روح ہے بحث و مباحثہ اور دلیل دے کر لوگوں کو آمادہ کرنا تو ہندوستانی تیزی کے ساتھ اُس حق کو سیکھتا رہا تھا۔ یہ بات ناگزیر تھی کہ انیسویں صدی کے نصف اول میں پائے جانے والے حالات میں یہ عمل متوسط طبقے تک محدود رہا اور یہ کہ صحافت کے علاوہ تعلیم و ادب کے میدان میں بھی بنگال پورے ہندوستان سے آگے رہا۔

بمبئی پریسیڈنسی کے اخبارات

بمبئی میں اخبارات کلکتہ کے بعد شروع ہوئے۔ پہلا انگریزی کا اخبار ہفتہ وار بمبئی ہیرالڈ 1789 میں شروع ہوا۔ اور اُس کے ایک سال بعد بمبئی کریر شروع ہوا۔ بمبئی گزٹ، جو سرکاری اخبار بن گیا 1791 میں نکلنا شروع ہوا۔ 1792 میں اُسے ہیرالڈ میں ملا دیا گیا۔ ظاہر ہے کہ انگریزی زبان کے اخبارات میں وہ خبریں شائع ہوتی تھیں جن سے انگریزوں کو دلچسپی ہوتی تھی۔ مثلاً برطانوی پارلیمنٹ کی بحثیں، انگلستان اور یورپ کے دوسرے ملکوں کے کوائف، ہندوستانی حکمرانوں کے منصوبے اور یورپین لوگوں کی سماجی خبریں۔ ان اخبارات کو حکومت ریکارڈ کے طور پر اپنے اعلانات کی اشاعت کے لئے استعمال کرتی تھی۔ اسی کے ساتھ وہ اُس زمانے کی برطانوی حکومت پر اُن لوگوں کی تنقید بھی شائع کرتے تھے جو کمپنی کے اعلیٰ حکام کے حقوق یافتہ حلقے کے باہر ہوتے تھے۔ اُن کی تنقید کا کچھ اثر حکومت کی کارروائیوں پر پڑتا تھا۔

ہندوستانیوں کے اخبار کی بمبئی میں 1812 میں داغ بیل پڑی جب فریدوں جی مرزبان نے گجراتی سماچار پریس قائم کیا۔ پہلا گجراتی اخبار بمبئی سماچار 1822 میں اس چھاپہ خانے میں چھپا۔ 1837 میں وہ روزنامہ ہو گیا۔ اخبارات کی طرف حکومت بمبئی کا رویہ اتنا ہی غیر ہمدردانہ تھا

جتنا بنگال میں۔ خاص طور سے الفنسٹن سختی کے ساتھ اخبارات پر کنٹرول رکھنے کا حامی تھا۔ بمبئی گزٹ نے سپریم کورٹ کی کاروائی پر اعتراض کرکے حکومت کو ناراض کردیا۔ چنانچہ اُس کے مدیر سی۔ جے۔ فیر کو ملک بدر کردیا گیا۔ 1825 میں وہ ضابطہ منظور کیا گیا جس کی رو سے اخبارات کے مالکوں، مدیروں اور ناشروں کو اپنے نام درج رجسٹر کرانے پڑے۔

پھر بھی اخبارات کی تعداد بڑھتی رہی۔ اپنے فرقے کی تعلیم کے لئے پارسیوں نے دو اخبار شروع کئے۔ ان کے کیلنڈر کے سوال نے اُن میں اشتعال پیدا کردی تھی۔ ان کا ایک گروہ جو قدیمی کہلاتے تھے دستور ملا فیروز کے حامی تھے، یہ تسلیم کرتا تھا کہ ہندوستان کے پارسی جس کیلنڈر کو استعمال کرتے ہیں اُس میں ایک مہینے کی غلطی ہے۔ دوسرا گروہ جو شاہنشاہی کہلاتا تھا۔ رائج الوقت کیلنڈر کا حامی تھا۔ ان اخبارات کے کالموں میں اس مسئلے پر بحث ہوتی رہتی تھی۔

1830 میں نوروجی دوراب جی چندارو نے گجراتی کا ایک ہفتہ وار اخبار بمبئی ورتمان شروع کیا۔ تیرہ مہینے کے بعد وہ ہفتہ میں دو بار شائع ہونے لگا۔ 1831 میں پرسٹن جی مالک کے موتی والا نے گجراتی میں ایک ہفتہ وار اخبار جام جہاں نما نکالنا شروع کیا جو کچھ مدت بعد روزنامہ ہوگیا۔

بمبئی کے اخبارات میں ایک دلچسپ اضافہ اس وقت ہوا جب 1801 میں 15 روزہ راست گرفتار نکلنا شروع ہوا جس کے مدیر تھے دادا بھائی نوروجی اور مالی امداد کر رہے تھی خورشید جی گاما۔ اگلے سال دادا بھائی کاؤس جس نے اخبار سوداگر نکالنا شروع کیا مرہٹی کا پہلا اخبار تھا۔ بمبئی درپن جسے 1832 میں بال شاستری جھمیکر نے شروع کیا، اس کے دستور عمل میں کہا گیا تھا ''اپنے ہم وطنوں میں انگریزی ادب سیکھنے کی خواہش پیدا کرنے کے خیال سے اور ملک کی خوشحالی اور اس کے باشندوں کی آسودہ حالی کے تعلق سے آزاد مباحث عامہ کا میدان کھولنے کی غرض سے کچھ مقامی لوگ جو بمبئی کے رہنے والے ہیں ایک اخبار نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ جس کا نام ہوگا بمبئی درپن۔ اس اخبار کو نکالنے کا بڑا مقصد ہے ہندوستانیوں میں یورپین ادب کے مطالعہ کا شوق پیدا کرنا اور یورپین علوم کی اشاعت کرنا۔ اس کی افادیت بڑھانے کے لئے اس کے ہر صفحہ پر دو کالم ہوں گے ایک انگریزی میں دوسرا مراٹھی میں اس اخبار نے اپنا عہد پورا کرنے کی کوشش

کی۔لیکن 1840 میں جب وہ بند ہوا تو اُس نے اعلان کیا۔'' اس اخبار کی اشاعت کے اسباب تھے مراٹھی میں اخبار کا شوق پیدا کرنا اور مذہب اور سیاست کے معاملات میں اپنے روشن خیالی پر مبنی جذبات پیدا کرنا۔ جو ہمارے ہم وطنوں کی ترقی کا باعث ہو۔

1840 میں بال شاستری نے ایک ماہوار رسالہ کت درشن نکالنا شروع کیا۔جس کا مقصد تھا تعلیمی تہذیبی اور سائنسی موضوعات پر بحث کرنا۔قریب قریب اس زمانے میں اس کے ساتھی بھاؤ مہاض نے پربھاکر نکالنا شروع کیا۔ 1842 میں مشنریوں نے دونا نوادیا خرید لیا۔ پونے سے نکلنے والا اخبار تھا دینان پرکاش جو 1829 میں شروع ہوا۔

مدراس پریسیڈنسی کے اخبار

مدراس پریسیڈنسی سے نکلنے والا پہلا انگریزی کا اخبار تھا مدراس کوائر جو 1780 میں شروع ہوا، اس کو حکومت کی سرپرستی حاصل ہوگئی۔اور اُس میں سرکاری اعلانات چھپنے لگے۔ 2 سال بعد اس کے مدیر یویڈ نے اُس سے قطع تعلق کرلیا۔اور ہرکارو شروع کیا۔اس کے بعد 1897 میں ہفتہ وار مدراس گزٹ شروع ہوا اور ایک مستند اخبار انڈین ہیرالڈ کچھ دن بعد شائع ہونے لگا۔حکومت مدراس نے بھی اخبارات کی طرف شک وشبہ کا ویسا ہی رویہ اختیار کیا۔ جسے دوسری پریسیڈنسیوں میں شروع کیا گیا۔اخبارات پر کنٹرول رکھنے کے لئے لائیسنس اور سنسر شپ کے طریقے پر عمل کیا گیا اور نافرمان ایڈیٹروں کو ملک بدر کردیا گیا۔

مدراس میں اخبار کی ترقی کی رفتار سُست تھی۔ 1808 تک ہندوستانی زبانوں میں نکلنے والے اخبارات کی تعداد کم تھی۔ 1877 تک 126 اخبار نکلنے لگے تھے۔ مدراس سے کئی اردو اور فارسی کے اخبارات بھی شائع ہوتے تھے۔مثلاً ازل الاخبار، ناشر الاخبار۔آفتاب عالم تاب، جامع الاخبار وغیرہ۔

شمالی ہندوستان کے اخبار

شمالی صوبے انگریزی حکومت میں کچھ مدت بعد شامل ہوئے۔اور انیسویں صدی کی دوسری دہائی کے بعد وہاں اخبارات نکلنا شروع ہوئے کانپور انگریزوں کا ایک اہم فوجی مرکز بن گیا تھا۔

کانپور ایڈورٹائز 1822 میں اور افن بس 1828 میں شروع ہوا۔ 1835 میں میرٹھ سے یونی ورسل میگزین شائع ہونا شروع ہوا۔ 1832 میں انگریزی کا ہفتہ وار اخبار دلی گزٹ شروع ہوا۔ اور اس کے بعد 1838 میں دہلی ایڈورٹائز رنکلا جس نے 1806 میں اپنا نام بدل کر انڈین ٹائمس رکھ لیا۔ بنارس سے ریکارڈر شائع ہوا۔

اس علاقے میں اردو اور فارسی کے اخبار تھے۔ فارسی زبان کے اخبار میں شامل تھے۔ زیدۃ الاخبار (1823)، مہر میتر (1841) سراج الاخبار (1841) اور احسن الاخبار (1844) وغیرہ۔ اردو کے اخباروں میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں آگرہ اخبار۔ دہلی اخبار۔ سید الاخبار، صادق الاخبار۔ کریم الاخبار، اسد الاخبار۔ بنارس اخبار آفتاب ہند، کوہ نور وغیرہ۔

واقعہ یہ ہے کہ 1848 تک شمال مغربی صوبجات میں تقریباً ڈیڑھ درجن چھاپے خانے قائم ہو چکے تھے اور دو کے علاوہ سب کے سب اخبار چھاپتے تھے۔

فارسی کے اخباروں میں سراج الاخبار جس کا مالک اور مدیر منشی واجد علی خاں تھا بہت ذمہ دار اور باخبر اخبار تھا۔ لیکن اس کا جھکاؤ قدامت پرستی کی طرف تھا۔ حالانکہ وہ اپنے خیالات کا اظہار بڑی احتیاط کے ساتھ اور متوازن زبان میں کرتا تھا۔

ہندوستانی زبان کے دوسرے اخباروں میں پنجاب کا کوہ نور اہم تھا۔ جسے منشی ہرسکھ رائے نے شروع کیا تھا، بنارس کے باغ و بہار میں طب، تاریخ، فلکیات اور دوسرے موضوعات پر مضامین شائع ہوتے تھے۔ منشی سدا سکھ لال نے دو اخبار نکالے۔ ایک اردو میں (نور الجہاد) دوسرا ہندی میں (یدھ پرکاش) دونوں کی ادارت بڑی قابلیت کے ساتھ کی جاتی تھی۔

دو ماہناموں کا ذکر بھی کر دیا جائے یعنی قرآن السعدین اور فوائد الناظرین جو دہلی کے مطلع العلوم پریس میں چھپتا تھا۔ اُن میں یورپین سائنسوں سے بحث ہوتی تھی۔

اخباروں کے رول کے دو پہلو تھے۔ ایک وہ حکومت کی پالیسیوں اور کاروائیوں پر اثر انداز ہوتے تھے۔ اور دوسری طرف عام لوگوں میں روشن خیالی اور تعلیم پھیلاتے تھے۔

III اخبارات اور حکومت

شروع شروع میں ہندوستانی اخبارات حکومت پر اعتراض کرنے سے بچے۔ لیکن رفتہ رفتہ کارنواس اور اس کے جانشینوں کی پالیسی کا اثر ظاہر ہونے لگا اور ہندوستانیوں کو اس بات سے تکلیف ہونے لگی کہ ہندوستانی حکمرانوں کے زمانوں میں انھیں جو سرپرستی حاصل تھی اس سے وہ محروم ہو گئے تھے۔ مالگزاری کے تعلق سے سخت پالیسیوں اور معافی کی زمینوں کو واپس لینے کی بنا پر بڑی بے چینی پھیل گئی۔ عام بے اطمینانی میں سب سے زیادہ اضافہ ہندوستانی سرحدوں پر نمودار ہونے والے حالات نے کر دیا۔ مثلاً ایرانی فوجوں نے ہرات کا محاصرہ کر لیا تھا۔ نیپال اور برما کے خلاف فوجی کاروائی کی جا رہی تھی، اور ہندوستانی حکمرانوں کے درباروں میں نیپال دربار کے ایلچی خفیہ طور سے آ رہے تھے۔

اس بے اطمینانی کے انعکاسات اخباروں میں نظر آنے لگے۔ خاص طور سے ہندوستانی زبانوں اور بالخصوص اردو اور فارسی کے اخباروں میں۔ حکومت پر صاف صاف مگر معتدل انداز سے اعتراض کرنے کا سلسلہ جام جہاں نما نے شروع کیا۔ ریفارمر کے صفحات حکومت کی کاروائیوں پر اعتراضات سے بھرے ہوتے تھے۔ 1845 میں اس اخبار کی سرگرمیوں کی وضاحت اس طرح کی گئی تھی ''سیاست میں ریفارمر نے پہلے برطانوی حکومت کے خلاف معاندانہ اور غیر امتیازی تشدد کا رویہ اختیار کریا اور ان علاقوں میں پائی جانے والی انتہائی شدت پسندی پر بھی فوقیت لے گیا۔ اُس نے ہندوستان کی تمام خرابیوں کا علاج یہ تجویز کیا کہ جمہوریت اور ایک ناگفتہ بہ قسم کی ایسی اولی گارکی کا آمیزہ بنایا جائے۔''[1]

فی الجملہ ہندوستانی اخبارات کا لہجہ معتدل ہوتا تھا۔ لیکن وہ حکومت پر اعتراض کرتے رہتے تھے۔ لیکن کبھی کبھی سلامت طبع اُن کا ساتھ چھوڑ دیتی تھی۔ اور وہ صاف گوئی پر اُتر آتے تھے۔ اس قسم کا ایک موقع اُس وقت آیا جب حکومت نے اُس قانون میں ترمیم کرنا چاہی جس کی رو سے ہندو کی جائیداد ضبط ہو جاتی تھی جو عیسائی مذہب قبول کر لیتا تھا۔ ہندوؤں نے 1845 میں ایک

---

[1] دی کلکتہ ریویو، جلد 7، 78-1877، صفحہ 288

عرضداشت حکومت کو پیش کی جس میں سخت الفاظ استعمال کئے گئے تھےلیکن اس کا کوئی اثر نہیں ہوا۔اُس پر بہت ہنگامہ ہوااور ہندوستانی اخبارات کے متعلق کہا گیا کہ ’’وہ بہت گندہ ذہن ہیں اور حکومت اور تمام حکام کے خلاف دشنام طرازی کرتے ہیں۔وہ توہین آمیز مضامین شائع کرتے جو کبھی کبھی تو لوگوں کو بغاوت پر اُکساتے ہیں۔‘‘[1]

ان دہشت انگیز اور مبالغہ آمیز خیالات کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے نصف اوّل میں ہندوستانی اخبارات کا سیاسی اثر محدود تھا۔حکومت جانتی تھی کہ کلکتہ میں اخبار پڑھنے والوں کا حلقہ چھوٹا سا ہے۔اور اُس کے باہر تو اور بھی چھوٹا ہے۔زمینداروں کو اُن سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔وہ برہمنوں کو تحفے تحائف دینے اور توہم پرستی پر بہت روپیہ خرچ کرتے تھے۔لیکن اخبار کی قیمت اور ڈاک خرچ پر ڈیڑھ روپے مہینہ صرف کرنے کو تیار نہیں تھے، عام لوگ سیاسی معاملات سے بے خبر تھے۔حکومت کا خیال تھا کہ ہندوستان کی رائے عامہ میں اتفاق نہیں ہے۔ اور اس لیے ’’اس بات کا خطرہ بہت کم تھا کہ تمام مذہبوں، ذاتوں اور طبقوں سے تعلق رکھنے والے ہندوستانی آپس میں تعاون کر سکیں۔‘‘[2]

پھر بھی ہندوستانی سماج میں اخبارات کا اثر بڑھ رہا تھا۔فرینڈ آف انڈیا نے اپنے 8 نومبر 1838 کے شمارے میں لکھا تھا ’’ان کا (ہندوستانی اخبارات کا) اثر تہذیب کا ایک طاقتور آلہ کار بن گیا ہے۔جب کوئی قوم مدتوں سے محوخواب ہو تو ترقی کا پہلا مرحلہ ہوتا ہے انھیں نیند سے جگانا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی اخبارات اس وقت یہ کام پہلے کے مقابلے میں زیادہ سرانجام دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔اس زمانے میں بھی یہ اثر بڑھتا رہا جب اُن پر پابندیاں لگی ہوئی تھیں۔اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندوستانی اخبارات ان مسائل پر بحث کرتے تھے جو لوگوں کے مفادات پر اثر انداز ہوتے تھے۔لیکن وہ سیاسی یا انتظامی مسائل پر نہیں۔اس لئے کہ برطانوی حکومت کے ابتدائی زمانے میں ہندوستانی متوسط طبقہ برطانوی اقتدار کو چیلنج کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔سرکاری کارروائیوں اور پالیسیوں پر رائے زنی کرتے وقت وہ بڑی احتیاط سے کام لیتے

---

[1] ایڈ، ایل۔آر۔ہاؤس آف لارڈس کی سلیکٹ کمیٹی کے سامنے شہادت 15 جون 1852 (2604)

[2] ایضاً نمبر 2701

تھے۔لیکن مذہب، سماجی رسوم اور تعلیم کے مسائل پر بحث کی جاتی تھیں اور اُن کے اچھے اور بُرے پہلوؤں پر کھل کر بات کی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے مختلف حصوں میں رونما ہونے والے واقعات پر کئے جانے والے اظہار خیال نے ایک نیا شعور پیدا کر دیا۔ جس میں ایشیا اور یورپ کے ممالک اور بالخصوص انگلستان سے آنے والی خبروں سے تقابلی گہرائی پیدا کرتا تھا۔''

بینٹک کے بعد کے زمانے میں ہندوستانی اخبارات اور بالخصوص فارسی اخبارات زیادہ صاف گوئی سے کام لینے لگے۔ جام جہاں نما کے متعلق فرینڈ آف انڈیا نے شکایت کی تھی کہ ہندوستانی اخبارات کی وفاداری ترقی رواداری کی عام روش کے خلاف مستثنیٰ کا حکم رکھتا ہے۔ دوسرے شہروں میں اس اخبار کے پڑھنے والوں کا ایک وسیع حلقہ تھا اور زیادہ تر ہندوستانی والیان ریاست اس کے خریدار تھے۔ 1840 میں فرینڈ آف انڈیا نے فارسی اخبارات کی انتہا پسندی کا مقابلہ ہندو اخبارات کی دوستی اور وفاداری سے کرتے ہوئے لکھا تھا۔ ان میں زیادہ تر ملک کے موجودہ حکمرانوں پر نہایت رکیک حملے ہوتے ہیں۔[1] 1857 میں بمبئی کے اخبارات کے متعلق اظہار کرتے ہوئے فرینڈ آف انڈیا نے لکھا تھا۔ ''اس عہد کا خاصہ یہ ہے کہ انگریز صحافیوں کو یہ شبہ ہونے لگا کہ ہندوستانی مدیر بھی ہندوستان کے حالات کے متعلق قریب قریب اُتنی ہی واقفیت رکھتے ہیں جتنی خود وہ رکھتے ہیں اور یہ کہ کبھی کبھی اُن کی رائے پیش کرنا مفید ثابت ہوسکتا ہے۔[2]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ عام ہندوستانی اخباروں کا اثر بڑھتا جا رہا تھا۔ اُن کی تحریروں میں زیادہ سنجیدگی پیدا ہوگئی تھی اور وہ دلائل سے کام لینے لگے تھے۔ انیسویں صدی کے نصف اول کے اخبارات کی تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ولیم ڈگبی نے کہا تھا کہ ہندوستانی اخبارات کو ''اُن ہندوستانی عام لوگوں کا اعتماد حاصل ہوگیا جن سے اُن کا ربط قائم ہے اور ان اخبارات کالموں میں جو کچھ لکھا جاتا ہے اس کو اس احساس کا اظہار سمجھنا چاہئے جس کے پس پشت بڑی طاقت ہے۔'' اُس نے مزید کہا ''بالواسطہ سے اُن کا بہت اثر پڑتا ہے۔ حقیقت میں یہ

---

[1] دی فرینڈ آف انڈیا 20 دسمبر 1840

[2] ایضاً، 19 ستمبر 1850

اخبارات ابھی بہت کم عمر میں لیکن اُن میں غیر معمولی حد تک امکانات پائے جاتے ہیں۔''[1]

ہندوستانی سماج پر ان اخبارات کا اثر اور بھی زیادہ پڑا۔ انھوں نے ان برائیوں کا پردہ فاش کیا جو ایک ناسُور کی طرح ملک کو کھوکھلا کر رہی تھیں۔ ایسا کر کے انھوں نے لوگوں میں ایک نیا احساس پیدا کیا۔ اور سماجی خرابیوں اور انفرادی برائیوں کے مضر اثرات کو دور کرنے میں معاون ثابت ہوئے۔

58-1857 کی بغاوت کے دوران پریسیڈنسی شہروں کے وہ اخبارات متاثر نہیں ہوئے جنھیں نئی تعلیم پائے ہوئے لوگ نکال رہے تھے۔ اس لئے کہ اُن کا خیال تھا کہ لوگوں کی ترقی کے لئے برطانوی ادارے ضروری ہیں۔ لیکن اردو اور فارسی اخباروں اور خاص طور سے دہلی اور پنجاب کے اردو اور فارسی اخباروں نے برطانوی کے خلاف جذبات اُبھارنے اور حکومت کے خلاف لوگوں کو مشتعل کرنے میں اہم رول ادا کیا۔ لیجیس لیٹیو کونسل کے اجلاس منعقد 13 جون 1857 میں لارڈ کیننگ نے من جملہ دیگر امور یہ کہا ''غالباً یہ بات پوری طرح سمجھی نہیں گئی ہے اور نہ لوگوں کو معلوم ہے کہ پچھلے کئی ہفتوں میں مقامی اخبارات نے اطلاعات کے بہانے کس حد تک ہندوستان کے مقامی لوگوں میں بغاوت کا زہر بھر دیا ہے۔ یہ کام بڑی جفاکش، چالاکی اور مکاری کے ساتھ کیا گیا۔''[2]

---

[1] دی کلکتہ ریویو، 1877 صفحات 365-364

[2] ایضاً۔ اپریل 1908، صفحات 209-208

چھٹا باب

سماجی اصلاح

I جدید تہذیب کا اثر

پچھلے ابواب میں ہندوستان کے سیاسی، معاشی اور سماجی اداروں پر برطانوی حکومت کے انتظام اور معاشی اقدامات کے اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان تبدیلیوں کا ایک نتیجہ تھا متوسط طبقے کا وجود میں آنا۔ یہ بھی بتایا جاچکا ہے کہ اس طبقے نے تعلیم کے مختلف ذرائع سے جدید نقطہ نظر کس طرح حاصل کیا۔ یعنی اُن اسکولوں اور کالجوں سے جہاں مغربی علوم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ تہذیبی انجمنوں، کتابوں، اخباروں اور رسالوں سے اور یورپین، مشنریوں تاجروں، حاکموں وغیرہ کے ساتھ راست روابط سے یہ اداریاتی اور نظریاتی اثرات حکمراں طبقے یعنی سول اور فوجی حاکموں، گورنروں اور گورنر جنرل، ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں، بورڈ آف کنٹرول کے نگراں وزیروں کا بینہ، پارلیمنٹ اور اُن انگریزوں کے رویوں اور عقیدوں کا نتیجہ تھے۔ ہندوستان کی سلطنت کے معاملات میں دلچسپی لیتے تھے۔ یہ قدرتی امر ہے کہ اس قسم کے رویے حکومت کے معاملات میں دخیل ہوتے تھے اور اُس کی پالیسیوں اور کارائیوں کی نوعیت کا تعین کرتے تھے۔

ان رویوں کی اصل بنیاد تھی سامراجی مفادات کا ادراک جو ہندوستان میں برطانوی حکمرانوں کی تمام کارروائیوں کی اصل وجہ بھی تھا۔ اور پورے کے پورے اُن کے دورِ حکومت میں تحریکِ عمل کا اصل ماخذ بھی۔ لیکن اس بڑے سبب کے علاوہ مختلف افراد اور گروہ ہندوستانی تہذیب کے متعلق ہندوستانی کردار کے متعلق محکوموں کی طرف حاکموں کے فرائض کے متعلق اور حکومت کی پالیسیوں اور کارروائیوں کے متعلق مختلف تصورات رکھتے تھے۔ یوں تو برمحل سیاق و سباق میں مختلف خیالات کا ذکر کیا جائے گا۔ پھر بھی یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جن لوگوں پر حکومت کی پالیسی کی تشکیل کی ذمہ داری تھی اُن کے عام رویوں پر غور کر لیا جائے۔

ہندوستان کی فتح نتیجہ تھی اٹھارہویں صدی میں تجارت پر اصول نفع رسانی کے اطلاق کا۔ ایسی نفع رسانی کا مقصد قومی طاقت کی نمو اور ضرورت پڑنے پر جنگ کے ذریعہ تجارت کی توسیع۔ تجارت کے مفادات کے لئے ہندستان کو فتح کرنے کے بعد یہ قدرتی امر تھا کہ برطانوی معیشت کے مفاد میں اُس کا استعمال کیا جائے، چنانچہ ہندوستان میں برطانوی راج کا بڑا مقصد تھا سامراجی مفادات کو فروغ دینا۔

ابتدائی زمانے میں یعنی فتح بنگال کے فوراً بعد کے برسوں میں سامراجی مفادات کو کمپنی کے ملازمین کے نجی اور ذاتی فوائد کے برابر گردانا گیا۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی کمپنی کو اپنے منافعوں سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔ دولت حاصل کرنے کی کھلی چھوٹ دے دی گئی۔ جس نے ہندوستان میں نراجی کیفیت پیدا کر دی اور انگلستان کی عوامی زندگی میں بددیانتی کا خطرہ پیدا کر دیا۔

برک کی وجہ سے اس سامراجی بدنظمی کی جگہ زیادہ ذمہ دار محتاط سامراج نے لینی شروع کر دی جس نے انگلستان کے طویل المدت مفادات پر توجہ مرکوز کی۔ یہ تبدیلی اُس وقت ہوئی جب منافع رسانی سے صنعت کاری کی طرف محفوظ تجارت سے آزاد تجارت کی طرف مطلق العنانی سے بورژوا حکومت کی طرف اور اٹھارھویں صدی کی اخلاقی بے اعتدالی اور مذہبی بے حسی سے اخلاقی اصلاح اور مذہبی جوش کی طرف سماج سفر کر رہا تھا۔ اس مرحلے میں برطانوی حکمرانوں کا اصل مقصد تھا حکومت کا پائدار ڈھانچہ بنا کے اور ہندوستانی معیشت کو برطانوی مقاصد کے تابع کر کے انگلستان کے معاشی مفادات کو فروغ دینا۔ چارلس گرانٹ نے جو 1794 سے 1823

تک ایسٹ انڈیا کمپنی کے مشیروں میں اصل اختیارات کا مالک تھا، معاشی سامراج کے اصولوں کی وضاحت مندرجہ ذیل الفاظ میں کی تھی "محکوم علاقے کو وہ نظام نظم و نسق اپنانا چاہیے۔ جس کو اقتدار اعلیٰ رکھنے والی ریاست اپنے عام مفادات کے پیش نظر مجموعی اعتبار سے بہترین سمجھتی ہو۔"[1]

اسی زمانے سامراجی مزاج کا اظہار توسیع پسندی کے ذریعہ ہوا۔ دیسی حکمرانوں کو جنگوں پر مجبور کیا گیا اور وسیع علاقوں کا الحاق کرلیا گیا۔ لیکن یہ بھی محسوس کیا گیا کہ اگر ہندوستان سے زیادہ نفع حاصل کرنا ہے اگر برآمد کرنے کے لئے یہاں زیادہ خام مال پیدا کرنا اور اگر انگلستان کے مصنوعات کی کھپت یہاں بڑھانی ہے تو یہ ضروری ہے کہ ملک کی مادی اور اخلاقی ترقی کے لئے اقدامات کئے جائیں اور مال گزاری کے نظام عوامی نظام اور تعلیم وغیرہ کی تنظیم کی جائے۔ الغرض حکومت کا باضابطہ نظام قائم کیا جائے۔

دوسرے مرحلے میں کمپنی کا اجارہ دارانہ کاروبار پوری طرح ختم کردیا گیا۔ اور سرکاری عدم مداخلت کا دور شروع ہوا۔ لیکن عدم مداخلت کے اصول کا اطلاق صرف اُن صورتوں میں کیا جاتا تھا جو انگلستان کی معیشت کے لئے مفید ہوتی تھیں۔ جہاں یہ سمجھا جاتا تھا کہ حکومت کی مداخلت ضروری ہے وہاں یہ اصول بالائے طاق رکھ دیا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ہندوستان آنے والے برطانوی مال پر کسٹم ڈیوٹی کم کردی گئی۔ لیکن انگلستان جانے والے ہندوستانی مال پر بھاری ڈیوٹی بحال رہی۔ نجی صنعتی کاروبار میں مداخلت نہیں کی جاتی تھی پھر بھی حکومت اس قسم کے اقدامات کرتی تھی جس سے انگلستان کی ضرورت کے خام مال کی ذرائع پیداوار کی ہمت افزائی ہو۔

اینگلو، امریکی جنگ کے دوران (1812-1814) ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں بہتر کپاس کی پیداوار میں اضافہ کیا۔ اُس کے بعد اُس نے آسام میں چائے کے باغات لگانے شروع کئے۔ اور پھر انھیں نجی تاجروں کے حوالے کردیا۔ اس طرح ریاست نے ریلوں میں نجی سرمایہ لگانے کی ہمت افزائی کرنے کی خاطر پانچ فی صد منافع کی ضمانت کی۔ اس طرح دونوں نظاموں کے تحت ہندوستانی مفادات قربان کردیئے گئے۔ منافع رسائی کے دور میں ہندوستان

---

[1] دیکھئے پیرس۔جی۔ڈی۔ British Attitude Towards India 1748 لغایت 1857 (آکسفورڈ 1961)

صنعت کے مقابلے میں برطانوی صنعت کا تحفظ کیا گیا اور عوام مداخلت کے زمانے میں برطانوی مصنوعات کے مقابلے میں ہندوستانی مصنوعات کا تحفظ سے انکار کر دیا گیا۔

یہ دور 1857 کی عظیم بغاوت تک جاری رہا انگلستان میں لبرازم کی فتح کے دور سے مطابقت رکھتا ہے۔ ہندوستان میں شمالی مغرب کی طرف ملک کی قدرتی سرحد تک مشرق میں برما تک انگریزی حکومت کی سرحدوں کو پھیلا کر اور ہندوستانی حکمرانوں کے علاقوں میں تخفیف کر کے انگلستان کے سامراجی مفادات کی توسیع کی گئی۔

معاشی میدان میں اس زمانے میں دو قسم کی تبدیلیاں ہوئیں۔ پہلی بات تو یہ کہ زیادہ تر ریلوں اور باغات میں برطانوی سرمایہ لگانے کا منافع بخش کاروبار ہندوستان نے مہیا کر دیا۔ دوسری بات یہ کہ معیشت کا نوآبادیاتی نظام قائم ہو گیا۔ جس کی بنا پر ہندوستان ابتدائی اشیا پیدا اور مہیا کرنے لگا اور برطانوی مصنوعات کی منڈی بن گیا۔

اس زمانے کا سامراج روشن خیال مطلب پرستی پر مبنی تھا۔ بینٹک نے دور رس سماجی اصلاحات کیں۔ انگریزی تعلیم کو فروغ دینے کا فیصلہ کر کے مغربی تصورات کو بڑھاوا دیا۔ اور ماتحت ملازمتوں کے لئے انھیں بھرتی کر کے ہندوستانیوں کی دلجوئی کی۔ اُس نے قوانین کو منضبط کر کے اور ہندوستانیوں اور انگریزوں کے خلاف عدالتی کاروائی میں پائے جانے والے بین اختلافات کو دور کر کے ایک بہتر حکومت کی طرح ڈالی۔

ڈلہوزی نے جو پروگرام شروع کیا اُس کے دو مقاصد تھے۔ یعنی ہندوستان کی معاشی ترقی اور برطانوی راج کی بنیادوں کی مضبوطی، مفاد عامہ کے کام بڑے پیمانے پر شروع کئے گئے جن میں سڑکیں، نہریں اور آبپاشی کے ذرائع تعمیر کرنا شامل تھا۔ اندرون ملک سے بندرگاہوں تک خام مال لانے، ملک کے اندر برطانوی مال تقسیم کرنے اور فوجوں کو بہ آسانی ایک جگہ سے دوسرے جگہ لے جانے کے لئے ریلیں شروع کی گئیں۔ وڈ کے مراسلے نے تعلیم کی توسیع کے لئے نئے عوامل مہیا کر دیئے۔

1858 تک قدیم ہندوستان سیاسی اعتبار سے مر چکا تھا۔ اور نئے ہندوستان کے خدوخال اُبھرنے لگے تھے۔ جو ایک تازہ قوت کے مظہر تھے۔ یہ ضروری معلومات ہوتا کہ ہم اُس جذبے

کو اچھی طرح سمجھ لیں جس نے نئے سماج میں جان ڈالی تھی۔ اور اس نئی زندگی کے اُن ترجمانوں کی نشوونما پر نظر ڈالیں جن کے ذریعہ سماج نے اپنے مناصب پورے کئے۔ اس صورت حال کی تشکیل میں دو قسم کے عناصر کارفرما تھے یعنی ایک بدیسی تہذیب کا اثر اور ہندوستانی کی داخلی زندگی کی حرکت۔

مغرب کا اثر معمول کے مطابق اور پر امن انداز سے نہیں پڑا بلکہ ایک فوجی فتح کا نتیجہ تھا جس نے دو تہذیبوں کے نمائندوں کے درمیان رشتوں کا تعین کیا۔ فتح کا لازمی نتیجہ تھا کہ فاتحین میں ایک سلطنت رکھنے کا غرور اور برتری کا احساس پیدا ہوا اور مفتوحوں میں ناراضگی۔ مزاحمت یا اطاعت مندی کا جذبہ ابھرا۔ اُس نے اُن میں احساس کمتری اور خود اظہاری کی خواہش کبھی پیدا کردی۔ ان حالات میں یہ ممکن نہ تھا کہ معمول کے مطابق انسانی تعلقات اُن میں قائم ہوسکیں۔ اس ہتک آمیز دعوے نے لوگوں کی خوشحالی کے لئے اقدامات کرنے کے تعلق سے وہ عقل کل رکھتے ہیں اور ملک کے باشندوں کی طرف اُن کے ناقابل برداشت تحکمانہ رویے نے لوگوں میں اُن کے خلاف تعصب راز داری اور غیر معمولی شک وشبہے کے جذبات پیدا کردیئے۔

یہ حالات ایک پر سکون مربوط ورمکمل سماجی ارتقا کے لئے سازگار نہیں تھے۔ بدقسمتی سے مغرب اور مشرق کا ملن ہندوستان میں متشدد تصادم کے حالات میں ہوا۔ اور جدید تصورات حاصل کرنے اور بالآخر آزادی پانے کے عمل میں کج روی پیدا کردی۔

سامراج کی برتری کے ہمیشہ کئے جانے والے دعوے اور اس کے خلاف ہندوستان کے ردعمل کی طویل اور تکلیف دہ کہانی لوگوں کے لئے ناقابل یقین ہوتی اگر مسلم واقعات اُس کی شہادت نہ پیش کرتے۔

ابے ڈوبوا کا چٹکلا کہ ’’جہاں ہر چیز دل کو خوش کرتی ہے وہاں محض انسان برابر ہوتا ہے۔ سامراجی رویے کی اجمالی تعریف کرتا ہے۔ جو برطانیہ کے حکمرانوں کے حلقوں میں قریب قریب عام تھا۔ ہر قسم کے خیالات رکھنے والے لوگ یعنی کنزروٹیو لبرل، مسیحی، انسان دوست، حکام، تاجر، سیاست داں، پیشہ ورانہ طبقوں کے اراکین غرض کہ انگریزوں کے تمام فرقے، کچھ قابل تعریف مستثنیات کے علاوہ ہندوستان کے لوگوں اور اُن کی مذہبی سماجی، اخلاقی اور تہذیبی رسوم کے متعلق

جو خیالات رکھتے تھے وہ سرپرستانہ ستایش سے شدید مدت تک حاوی ہوتے تھے۔

لیکن برطانوی حکومت کے ابتدائی زمانے میں کچھ حکام نے ہندوستان کے فلسفے اور ادب کی تعریف بھی کی تھی۔ مثال کے طور پر ولکنسن کے بھگوت گیتا کے ترجمے کے پیش لفظ میں وارن ہسٹنگز نے لکھا تھا۔ ''مجھے یہ کہنے میں بڑا تذبذب ہے کہ گیتا بڑی اختراع و ایجاد کا کام نہیں ہے۔ ایسی کتاب جس میں بے مثال اعلیٰ تصورات، براہین، دلائل اور اسلوب پایا جاتا ہے۔ انسانوں کے تمام معروف مذاہب میں یہ دینیات کا واحد نمونہ ہے جو مسیحی دینیات سے بڑی مطابقت رکھتا ہے۔ اور اُس کے بنیادی عقائد کی پوری طرح عکاسی کرتا ہے۔''[1]

لیکن وارن ہسٹنگز کے زمانے میں بھی جیسا کہ اُس نے خود کہا ہے۔ ہندوستانیوں کے متعلق انگریزوں میں جو رویہ پایا جاتا تھا وہ انھیں ''ایسے لوگ سمجھتا تھا جو وحشیانہ زندگی کی سطح سے شاذ ہی اونچے تھے۔''[2] لیکن ہسٹنگز کے ہم عصروں میں اہم لیکن قدامت پرست فلسفی برک بھی شامل تھا۔ وہ تاریخی عمل کا احترام کرتا تھا اور اداروں کو اضافی سمجھتا تھا۔ اُس نے ہندوستانی معاشرے اور اُس کے قوانین پر ہمدردی کے ساتھ غور کیا۔ اور ہندوستانی تہذیب کی اعلیٰ قدر کو پہنچانا۔ اُس کے پیرو بھی ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی اداروں کی عزت کرتے تھے۔ لیکن اُن کی تعداد کم تھی اور ہندوستان کے معاملات پر اُن کا کوئی اثر نہیں پڑا۔

قدامت پرست مکتبِ خیال کے تصورات سے ملتے جلتے تصورات مستشرقین بھی رکھتے تھے جن میں چارلس ولکنسن اور بنگال کی ایشیاٹک سوسائٹی بانی سر ولیم جونس بھی شامل تھا۔ جس نے کالی داس کی شکنتلا، منوسنکھا تہوپ اوشا اور دوسری کتابوں کا ترجمہ انگریزی میں کیا اور سنسکرت زبان کی خوبیوں کے متعلق اچھی رائے رکھتا تھا۔ اُس نے سنسکرت کی عجیب و غریب ساخت کی تعریف کی جو یونانی سے زیادہ مکمل، لاطینی سے زیادہ جامع اور دونوں سے زیادہ نفیس ولطیف ہے۔

---

[1] بھگوت گیتا یا ارجن کے ساتھ کرشن کا مکالمہ اٹھارہ لیکچروں میں حواشی کے ساتھ جس کا سنسکرت یا برہمنوں کی قدیم زبانوں سے ترجمہ کیا گیا، از چارلس ولکنسن (لندن 1775) دی کلکتہ ریویو، جلد 3، ، 1845 صفحہ 234

[2] ایضاً

مستشرقین کے علاوہ کئی حکام نے بھی ہندوستانی ادب کا مطالعہ کیا تھا۔لیکن ان میں سے بہت کم ایسے تھے جو منزو کی اس بات سے اتفاق کرتے ہوں کہ اگر دونوں ملکوں کی تہذیبوں کا تبادلہ کیا جا سکے تو انگلستان کو بڑا فائدہ ہوگا۔

II برطانوی حکام کا رویہ

اُن لوگوں کے برعکس جو ہندوستانی تہذیب کے متعلق اچھا خیال رکھتے تھے۔ بڑی تعداد اُن لوگوں کی تھی جو اُس کی خدمت کرتے تھے۔ اُن میں سامراجی سیاست داں بین تھا۔ مانٹ برل، عیسائی مشنری اور اُن کے دنیادار پیرو اور انسان دوست شامل تھے۔

کارنواس سے کیننگ تک شاید ہی کوئی گورنر جنرل ایسا ہو جس کا ہندوستانیوں کے متعلق اچھا خیال ہو۔ کارنواس تو ہندوستانیوں کو اتنا ذلیل سمجھتا تھا کہ اُس نے ذمہ دار عہدوں کے دروازے ان پر یکسر بند کر دیئے تھے۔ ویلزلی ایسی شاندار سلطنت کی تصدیق پیش کرنا چاہتا تھا جس کے سامنے مغلوں اور رومنوں کی شان وشوکت ماند پڑ جائے۔ چھوٹی چھوٹی مقامی ریاستوں کی آزادی ختم کرنے میں اُسے ذرا بھی پس و پیش نہیں ہوا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہندوستانی حکمرانوں کی مطلق العنانی اور نا اہلی کے مقابلے میں برطانوی نظام بہتر ہے۔

منٹو اور ہسٹنگز دونوں سلطنت کو تقویت دینا چاہتے تھے، دونوں نے اُس کو توسیع دینے اور ہندوستان کے دکھی لوگوں کے دُکھ دور کرنے کی خاطر فوجی مہمات میں حصہ لیا۔

بینٹک، مٹکاف اور میکالے پیرو تھے بینتھم کے اور تیزی کے ساتھ ہندوستان کو نئی شکل دینے کی وکالت کرتے تھے۔ جس کو وہ لوگ ادھام اور مطلق العنانی کی سرزمین میں تصور کرتے تھے۔ اصلح پسند بینٹک برطانوی حکومت کے نظام سے غیر مطمئن تھا اور اُس کو سدھارنا چاہتا تھا۔ لیکن وہ ہندوستان کے لوگوں سے اور بھی زیادہ غیر مطمئن تھا۔ اُس کے مطابق ملک ''ایک سرے سے دوسرے تک بُرائی، جہالت، مظالم، مطلق العنانی، وحشیانہ اور ظالمانہ رسم و رواج کی لعنت میں مبتلا تھا۔ جو ہر قسم کی ایشیائی بدنظمی کے تحت موقوں سے نمو پا رہے تھے۔''[1]

---

[1] بینٹک مخطوط، عام محکمے کی روداد میں، صفحات 50-249 (14 اکتوبر 1833ء) اقتباس، پیر، جی۔ ڈی محولہ بالا صفحہ 162

یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ میکالے ہندوستانی ادب کے متعلق کتنی حقارت آمیز رائے رکھتا تھا۔ اُس نے بڑی صاف گوئی کے ساتھ اس امر کا اقبال کیا تھا کہ وہ ہندوستانیوں کو ''ایسی نسل سمجھتا ہے جسے تین ہزار سال کی مطلق العنان پجاریوں کے ہتھکنڈوں نے غلامی اور ادہام پرستی کے گڑھے میں دھکیل دیا تھا۔''

فرقوں نے اپنے افادیت پسندانہ اصولوں کی بنا پر ہندوستانی سماج کو برے رواجوں سے پاک کرنے کی کوشش کی یعنی بیواؤں کو جلانے، بچوں کو قربان کرنے، غلامی اور چرک پوجا کے ظالمانہ رسوم سے۔ اُن کا خیال تھا کہ مغربی تعلیم ہندوستان کو اخلاقی اعتبار سے سدھار دے گی اور بقول سر چارلس تریولین ''ہندو دھرم اور اسلام کی چولیں ہلا دیں گی۔ اور ہندوستان میں ہی ہماری زبان، ہمارے علوم اور بالآخر ہمارے مذہب کی جڑیں مضبوط کرے گی۔[1] انھوں نے اخبارات پر پابندیاں کم کر دیں۔ اور آزادی اظہار کی ہمت افزائی کی۔ انھوں نے سرکاری اداروں کو بینتھم کے فلسفے کے مطابق ڈھالنے اور امن، نظم، اور اچھی حکومت قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس کے باجود حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی تہذیب اور ہندوستانی سماجی اور سیاسی اداروں کے لئے اُن کے دلوں میں شدید حقارت کا جذبہ پایا جاتا تھا۔ اور وہ چاہتے تھے کہ جلد سے جلد ہندوستان میں مغربی تصورات کو رواج دیں۔ ایلن برو کے ساتھ امن و اصلاح کا لبرل دور ختم ہو گیا۔ اور نئی فوجی مہموں اور سلطنت کو توسیع دینے کا دور ایک دفعہ پھر شروع ہوا جو اُس وقت تک جاری رہا جب تک ڈلہوزی نے اس کام کو مکمل نہیں کیا۔

ایلن برو ایک ٹوری سامراجی تھا۔ اور روس کے خطرے کے خلاف برطانوی سلطنت کی حفاظت کو اپنا سب سے اہم کام سمجھتا تھا۔ اُس زمانے میں روس تیزی کے ساتھ ایشیائے وسطیٰ میں پیش قدمی کر رہا تھا۔ وہ پامرسٹن کا پیرو تھا جو کہ سکون اور سکھوں کو برطانوی سلطنت کی سرحدوں سے زیادہ سے زیادہ دور رکھنا چاہتا تھا۔

دونوں کا خیال تھا کہ ہندوستان کو سامراجی تحفظ کی عظیم فوجی حکمت عملی میں اپنا مجوزہ رول ادا کرنا چاہئے۔ ایلن برو کی نظر میں تمام دوسرے امور اس بڑے مقصد کے تابع تھے۔ اُسے

---

[1] ہیرسنا، بی، ایضاً، صفحہ 161

اصلاحات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی جن کی وکالت لبرل کرتے تھے۔ وہ ہندوستانیوں کو تعلیم دینے کے خلاف تھا۔ دوارکا ناتھ ٹیگور کے ساتھ گفتگو کے دوران اس نے کہا تھا ''آپ جانتے ہیں اگر اُن حضرات کی خواہش پوری ہو جائے جو ہندوستان کے لوگوں کو تعلیم دینا چاہتے ہیں تو ہم تین مہینے بھی اس ملک میں نہیں رہ سکیں گے۔''[1] اگر لوگوں کو تعلیم دی گئی انھیں سول ملازمتیں دی گئیں، سول انتظام اُن کے سپرد کیا گیا اور آزاد اخبارات اور مواصلات ان کے تعاون کے لئے رہیں اور تار برقی سہولتیں انھیں مہیا کی گئیں تو وہ انگریزی حکومت کی اطاعت نہیں کریں گے۔ یہ باتیں تھیں جن سے ایلن برو خائف تھا۔

ڈلہوزی ایک سرکردہ سامراجی تھا۔ لیکن وہ ایلن برو کے مقابلے میں زیادہ معتدل تھا اور اُس کی نظر دور تک جاتی تھی۔ سلطنت کی شان وشوکت اور طاقت کا جہاں تک تعلق تھا وہ کسی طرح ایلن برو سے کم نہیں تھا۔ جس کا ثبوت الحاق کی پالیسی اور وہ اقدامات پیش کرتے ہیں جو اس نے سلطنت کے استحکام اور ہندوستان کی معیشت کو ترقی دینے کے لئے کئے۔ لیکن ہندوستان کے لوگوں کے احساس کا وہ بالکل پاس نہیں کرتا تھا اور نہ اُس ملک سے اُسے محبت تھی۔

لبرلوں کا رویہ

لبرل فلسفی بھی، جو جیریمی بینتھم کے جانشیں تھے۔، اس قسم کے تصوارت رکھتے تھے۔ جیمس مل نے 1817 میں اپنی صحیح تاریخ ہند شائع کی تھی اور 1819 سے 1839 تک کمپنی کے معاملات میں بڑا اثر رکھتا تھا۔ وہ بھی ہندوستان کے مسائل کی حد تک آزادی، مساوات اور نمائندہ حکومت کے اصولوں سے بڑی حد تک منحرف ہو گیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری کی مخالفت کرکے، آزاد تجارت کی پالیسی کی وکالت کرکے، ہندوستان کی حکومت پر یہ اعتراض کرکے کہ ''وہ مطلق العنانی سے زیادہ دور نہیں ہے'' اصلاحات کی سفارش کرکے اور سب سے بڑھ کے جدید تعلیم اور خاص طور سے یورپین سائنسوں کی تعلیم کی افادیت پر زور دے کر اُس نے لبرل تصورات کا اظہار کیا۔ لیکن ہندوستانی سماج اور ہندوستانی تہذیب کو مل اسی حد تک ناپسند

---

[1] کیمرون۔سی۔ایچ The Address to Parliament on the Duties of Great Britain in India (لندن لانگ میز، 1853)، صفحہ 19

کرتا تھا کہ ہندوستانیوں کے لئے اُس کی نظر میں سب سے بہتر حکومت تھی۔''ایک سیدھی سادی مطلق العنان حکومت جس میں یورپین احساس عزت اور یورپین دانش آمیز ہو۔'' وہ ہندوستانی سماج کو غیر متمدن سمجھتا تھا جو عہد وسطیٰ کے یورپین سماج سے حقیر تر قادر پجاریوں اور اوھام پرستی سے بھرا ہوا تھا۔ اُس کے خیال میں ہندو قانون غیر واضح، فضول اور الجھا ہوا تھا۔ ہندو مذہب دہشت ناک، کفاروں اور فضول اور نقصان رسائی رسوم کا مجموعہ تھا۔ اور ہندو علوم میں دلیل و برہان کا فقدان تھا۔

اپنے باپ کے برعکس جان اسٹورٹ مل ادعائیت کا حامل نہیں تھا۔ اور زیادہ لچک دار ذہن رکھتا تھا۔ اُس نے کئی اہم امور میں بینتھم کے فلسفے سے اعراض کیا اور ہندوستان کے اداروں اور تہذیب کے تعلق سے جیمس مل سے اُسے اختلاف تھا۔ ہندوستانی علوم کے متعلق سے اُسے میکالے کے خیالات سے بھی اختلافات تھا کہ اخلاق وعلوم کی تعلیم محض افادی مقاصد کے لیے دی جائے۔ یعنی ملازمتوں کے لئے رنگروٹ بھرتی کرنے کے لئے اور تعلیم کا مقصد محض تعلیم حاصل کرنا نہ ہو یا یہ کہ عام لوگوں کی زبان کے بجائے انگریزی کے ذریعہ تعلیم دی جائے۔ اُس کا خیال تھا کہ کسی قوم کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی تہذیب دوسروں پر تھوپے۔ ہندوستان کی معاشی ترقی کے لئے اُس کی تجاویز اُس کے باپ کے مقابلے میں لبرلزم سے زیادہ مطابقت رکھتی تھیں۔ وہ اس بت کا حامی تھا کہ رنگ کے تعصب کی بنا پر ہندوستانیوں کو جو قانونی حقوق حاصل نہیں تھے وہ انھیں ملنے چاہئیں۔ اور اسے برطانیہ کا اخلاقی فرض سمجھتا تھا کہ وہ ہندوستان کو جدید اداروں اور بالآخر حکومت خود اختیاری کے لئے تیار کرے۔ 1858 میں کی جانے والی زیادتیوں اور بے وردیوں نے اُسے دھکا پہنچایا اور وہ اُس نئے سامراج کو شک و شبہہ کی نظر سے دیکھتا تھا جس کی وضاحت دکے نے Great Btitain یا گوبینو نے Essai Surtmegatti des racs dumanairs میں کی تھی۔ وہ عقل، علم اور روشن خیال اداروں کی نوعیت میں یقین رکھتا تھا نہ کہ رنگ و نسل پر برتری میں۔

حالانکہ اس کے دل میں ترقی کی حقیقی خواہش تھی پھر بھی جان اسٹورٹ مل اُس زمانے میں پائے جانے والے تصورات سے اپنا پیچھا نہیں کٹا سکا۔ یعنی یہ کہ مغربی تہذیب ہندوستانی تہذیب

سے بہتر ہے۔ ہندوستانی حکومت خود اختیاری کے اہل نہیں ہے۔ ہندوستانی سماج زوال پذیر ہے۔اپنے باپ کی طرح اُس کا بھی خیال تھا کہ ہندوستان کے لئے بہترین دستور حکومت ہے ایک سخت مطلق العنانی۔لیکن اُسی میں علم و ذمہ داری کے عناصر ہونے چاہئیں۔

ہندوستانی سماج کے متعلق مشنری تصور

لیکن ہندو دھرم اور اسلام کو سب سے زیادہ بدنام کیا عیسائی مشنریوں اور اُن کے حلیفوں یعنی کلپنا مائٹوں اور انسان دوستی کا دَم بھرنے والوں نے۔ چارلس گرانٹ کا یہ خیال تھا، جو ہندوستان سے رٹائر ہونے کے بعد کورٹ آف ڈائرکٹرز کا بااثر رکن بن گیا تھا۔اور کلا نام فرقے کا حامی تھا، کہ ہندوستان میں عیسائی مذہب کی تبلیغ سے برطانیہ کے سامراجی مفادات پورے ہونگے۔ یعنی سلطنت کی حفاظت ہوگی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی زیادہ خوشحال ہوسکے گی۔ اور ہندوستانیوں میں سلطنت سے لگاؤ پیدا ہوجائے گا۔وہ اس کی وکالت کرتا تھا کہ سلطنت کو تقویت پہچانے کے سب سے بڑے ذریعے کی حیثیت سے مغربی تعلیم کو رواج دیا جانا چاہیے۔اُس نے لکھا تھا:

> ''اپنے ایشیائی علاقوں میں اپنی زبان، اپنے علم، اپنے خیالات اور اپنے مذہب کی جڑیں مضبوط کرکے ہم اس عظیم کام کو حادثات سے محفوظ کرلیں گے۔''[1]

ہندوستان کے متعلق اُس کے خیالات بہت بُرے تھے۔ ہندو سماج کے لئے اُس نے لکھا تھا ''وہ انسانی کردار کی بہت پست اور ذلت آمیز تصویر پیش کرتے ہیں۔''[2] اور ''جہاں تک اخلاق و ادب کا تعلق ہے مسلمانوں کے متعلق بھی اکثر اسی قسم کی رائے ظاہر کرنی پڑتی ہے۔جو اُن میں ملے ہوئے ہیں۔''[3] اُس کے مطابق بنگالیوں میں ''راست بازی، دیانت داری اور صدق دلی کی بڑی کمی ہے۔''اور یہ کہ'' زندگی کے ہر شعبے اور ہر پیشے میں مسلسل دھوکے بازی،

---

[1] گرانٹ، سی، Observation on the State of Society among the Asiatic Subject of Great Britain Particularly with Respect to Moraletic (مرتبہ 1792)

[2] ایضاً 20

[3] ایضاً

دغابازی، میلہ بازی اور تاخیر و تصدیق سے بغیر کسی پس و پیش کے کام لیا جاتا ہے۔''[1] ہندو دھرم کا تو اُس نے بڑا مذاق اُڑایا ہے۔ اور اُس کو بُرا بھلا کہنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ اُس نے ہندو دھرم کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔ ''بُت پرستی جس کی بنا پر ناپاک دیوتاؤں کا ہجوم پیدا ہو گیا ہے۔ لکڑی اور پتھر کے بنے ہوئے راکشش ہیں۔ اس کے اصول غلط اور رسم و رواج بد دیانتی پر مبنی ہیں۔ اس کی توقعات بھی غیر حقیقی ہیں اور خطرات بھی، اس کی رسمیں مضحکہ خیز اور توہمات ذلت آمیز ہیں۔ اور اس کے اساطیر جھوٹ پر اور طور طریق مکر و فریب پر مبنی ہیں۔[2]

غلامی کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کا رہنما ولیم وبرفورس پارلیمنٹ کا بااثر رکن تھا۔ اور چارلس گرانٹ کا رفیق کار۔ 1813 کے چارٹر میں مشنریوں کے داخلے اور تعلیم کے متعلق دفعات کے اضافے پر پارلیمنٹ کو آمادہ کرنے والا وہ تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ سلطنت کا مقصد ہے ہندوستان کے کافروں کو جہالت کے اندھیروں سے نجات دلانا۔ پارلیمنٹ اور عام لوگوں کے سامنے اُس نے ہندوستانی سماج اور مذہب کی تصویر بہت افسردہ کن رنگوں میں پیش کی۔ اُس نے پارلیمنٹ میں کہا ''ہمارا مذہب ارفع و اعلیٰ، پاکیزہ اچھا ہے۔ ان کا مذہب رکیک، عیاشانہ، ظالمانہ ہے۔''[3] مزید کہا کہ ''اس دوران (1793 لغایت 1813) میں نے جو کچھ سنا ہے پڑھا ہے اس نے ہندوستان کے متعلق میرے خیالات میں اضافہ کر دیا ہے۔''

مشنری ایک طرف تو عیسائی مذہب کی تبلیغ کرتے تھے اور دوسری طرف سامراجی جھنڈے کو سربلند رکھتے تھے اور برطانوی تجارت کی حمایت کرتے تھے۔ وہ ہندوؤں کی عبادت، رسوم اور عقائد یعنی ذات پات کے نظام اور عورتوں کے ساتھ برے سلوک کی مذمت کرتے تھے۔

مثال کے طور پر کیری نے لکھا ہے ''میرا خیال ہے کہ عقل و فہم سے اس حد تک دست بردار کوئی قوم نہیں ہوتی ہے۔ جیسے ہندو ہوتے ہیں۔''[4] وارڈ نے ہندوستانی عورتوں کے متعلق کہا ''وہ

---

[1] ایضاً

[2] ایضاً، صفحہ 62

[3] ہنسرڈ XXVI 1831-1832 مورخہ جون 1813

[4] پیرس، جی۔ ڈی۔ محولہ بالا، صفحہ 83

دکھوں سے چور اور غیر تعلیم یافتہ ہیں ایسے جانوروں کی طرح جن پر یا تو بوجھ لادا جاتا ہے یا ذبح کیا جاتا ہے۔''[1]

مشنریوں کی دشنام طرازیوں کی اور مثالیں دینا ضروری نہیں ہے۔ لیکن الگزینڈر ڈف انگلستان سے آنے والے عیسائی معلموں میں بہت اہم ہے۔ اور ہندوستان میں ہونے والے مشنری کاموں پر اُس کا گہرا اثر پڑا تھا۔ یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں آنے والے مشنریوں کے رویوں کی مثال کے طور پر اس کی تحریروں کے کچھ اقتباس پیش کئے جائیں۔ اُس نے ہندوستانیوں کے لیے کہا ''وہ دنیا کے سب سے زیادہ عیاش اور پست ذہنیت کافر ہیں۔'' اور یہ خیال ظاہر کیا کہ ''اس ملک میں غلط کاریوں کا ایک عظیم نظام پایا جاتا ہے جس کو روکے بغیر یہاں راست بازی کا نظام قائم نہیں کیا جاسکتا ہے۔''[2] اُس نے اپنی کتاب India and Indian Mission (ہندوستان اور ہندوستانی مشن) میں لکھا ہے ''غلط مذاہب کے تمام نظاموں میں، جن کی تشکیل پست ذہنیت انسان کی گمراہ قوت اختراع نے کی۔ ہندو دھرم بلاشبہ سب سے عظیم نظام ہے۔''[3] اُس کے نزدیک مشرقی علوم ''وصول مابعدالطبیعاتی موشگافی اور شستگی کی مثالیں ہیں جیسی کہ قرون وسطی کے یورپ کی یونی ورسٹیوں کے معلم پیش کیا کرتے تھے۔''[4]

ایف۔ ایس۔ شور کے مطابق جو کئی حیثیتوں سے ہندوستان میں کام کر چکا تھا۔ یعنی سیشن جج، سول کمشنر اور ایجنٹ ہندوستانیوں کے متعلق انگریزوں کی رائے تھی کہ وہ ''پست ذہنیت اور ذلیل تھے۔ جن میں بہت کم خوبیاں تھیں۔ اور جن کے ادارے رواج اور حکومت خراب تھی۔'' ہندوستانیوں سے انگریز نفرت کرتے تھے اور اس کے ساتھ تکبر اور نخوت سے پیش آتے تھے۔ اور انھیں حقیر سمجھتے تھے۔ اسی قسم کے برتاؤ کی متعدد مثالیں ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ رام موہن رائے کی طرح کی اونچی حیثیت رکھنے والے ہندوستانی بھی اس سے محفوظ نہیں تھے۔ اُس کا خیال

---

[1] ایضاً صفحہ 81

[2] اسمتھ۔ جارج، Life of Alaxandar Daff صفحہ 135

[3] این۔ ایس۔ بوس، The Indian Awakening and Bengal (کلکتہ 1960) صفحہ 87

[4] لیرس جی۔ ڈی۔ محولہ بالا، صفحہ 227

تھا" اس کے برعکس ہم اور ہمارے لوگ خوبیوں کے مجسمے ہیں۔"[1]

اس سرتاسر مذمت میں کبھی کبھی ایسی آوازیں بھی سننے میں آتی تھیں جو اتنی کرخت نہیں تھیں اس قسم کی ایک آواز تھی پُشت ہیر کی۔ اُس کے خیال میں ہندوؤں کی پوجا پاٹ یونانیوں کی ظلمت پرستی سے برتر نہیں تھی۔ اور ہندوؤں کا ذات پات کا نظام رومن کیتھولک کلیسا کے نظام سے زیادہ مطلق العنان نہیں تھا۔ اُس کے خیال میں ہندو فطرتاً رحم دل، جفاکش سنجیدہ اور امن پسند تھے۔ اور اسی کے ساتھ موقع پڑنے پر وہ بہادر اور ہمت والے بھی ثابت ہوتے تھے۔[2] وہ سفید فام لوگوں کی برتری کا قائل نہیں تھا، اور انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان شادیوں کی ہمت افزائی کرتا تھا۔ اُس نے اس امر کی کوشش کی کہ دوسرے مشنری ایسی زبان استعمال نہ کریں جس سے ہندوستانیوں کی قومی خودداری مجروح ہو یا وہ جن کی پوجا کرتے ہیں اُن کی توہین و تذلیل ہو۔ پھر بھی ہندوستانیوں کے ادب کے متعلق اُس کا خیال تھا کہ اس کے لئے "بڑی محنت سے سنسکرت اور اُن کے اسلاف کا فضول بلکہ فضول سے بھی بدتر ادب پڑھنا ہوتا ہے۔"[3]

اس قسم کا رویہ تھا تو سب کا لیکن اعلیٰ افسروں کا رویہ عام ہندوستانیوں تک اُن کے تکبیر کے ذریعہ بالواسطہ پہنچتا تھا۔ لیکن مشنریوں کا رویہ صاف صاف ان پر ظاہر ہو جاتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مشنری تبلیغ کرتے تھے۔ اور وہ اسکولوں، انجمنوں اور بازاروں میں اپنے خیالات ظاہر کرتے تھے۔ اور کتابوں، رسالوں اور اخباروں کے ذریعے مسلسل پرچار کرتے رہتے تھے۔ وہ بڑی بدتمیزی کے ساتھ گفتگو کرتے تھے۔ اور وہ جس طرح اپنی بات کہتے تھے اُس کی وجہ سے نہ صرف ہندوستانیوں میں غم و غصہ ہوتا تھا بلکہ اعلیٰ حکام کے لئے بھی وہ پریشانی کا باعث بن جاتی تھی۔ سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہند، چارلس وڈ نے ارل کیننگ کو لکھا تھا "جہاں تک مشنریوں کا تعلق

---

[1] شور۔ ایف۔ جے Notes of Indian Affair (لندن 1837) صفحہ 4

[2] سیز آرا، Narrative of a Journey through the upper Provinces of India (لندن 1838) صفحہ 270

[3] Nebrs Indian Journal انتخاب جس کا تعارف پی۔ آر کرشنا سوامی نے لکھا (آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس 1923) صفحہ 218

ہے وہ بڑی گڑبڑ مچا رہے ہیں۔ میں انھیں بلا وجہ مشتعل کرنا نہیں چاہتا ہوں اس لئے کہ وہ یہاں (انگلستان) میں چیخ پکار کریں گے۔ جن کو وہ لوگ اچھا اور غیر مضر تصور کرتے ہیں جو ہندوستان کے حالات سے واقف نہیں ہیں۔''[1] مشنریوں کے ساتھ ساتھ سول اور فوجی حکام کی ہمدردیاں تھیں اور اکثر اوقات وہ کھل کر اُن کی طرفداری کرتے تھے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ تبدیل مذہب کے سوال پر حکومت کے ارادوں کے متعلق ہندو اور مسلمان دونوں میں خوف و ہراس پایا جاتا تھا۔

III مغربی چیلنج کا ہندوستانی جواب

اقتدار حاصل کرنے کی جو راست اور بالواسطہ مثالیں سامنے آئیں۔ وہ ہندوستان کے لئے چیلنج کا حکم رکھتی تھیں۔ اس کی وجہ ہے دونوں نسلوں کے درمیان باہمی احترام کے رشتے کی نشوونما قریب قریب ناممکن ہوگئی۔ روایتی اعتبار سے ہندوستان میں سیاسی شعور تھا نہ نسلی احساس۔ لیکن اس کے برعکس انگریز میں بڑا سیاسی شعور پایا جاتا تھا۔ اور وہ اپنے قومی مفادات اور نسلی برتری کا شدید احساس رکھتا تھا۔ دونوں کے تہذیبی اختلافات نے اُن کی نااتفاقی میں اضافہ کردیا تھا۔ مغرب کے حملے نے ہندوستانیوں کو مقابلہ کرنے پر مجبور کردیا۔ اُن کے ردعمل نے کئی شکلیں اختیار کیں۔[2]

قدیم نظام کا ردعمل

ان حلقوں کے لئے جو قدیم نظام کی نمائندگی کرتے تھے انگریزی حکومت کے سیاسی اور مذہبی پہلو سب سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے۔ وہ مغرب پر الزام لگاتے تھے کہ اُس نے دیسی حکمرانوں سے اُن کے علاقے، طاقت اور آزادی چھین لی اور لوگوں کے آبائی مذاہب کے لئے خطرہ پیدا کردیا۔ چنانچہ اس نظام نے بار بار برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کی ناکام کوششیں کیں۔

---

[1] چارلس وڈ کے خطوط، جلد چہارم، خط مورخہ 10 اگست 1860، ای۔ (انڈیا آفس لائبریری)
[2] قدیم نظام کا ردعمل

جن کا نقطۂ عروج تھا 1857 کی عظیم بغاوت۔ برطانوی حکومت کے خلاف خطرناک ترین کوششوں میں سے ایک تھی وہ تحریک جو وہابی تحریک کے نام سے مشہور ہے اور اس کے وسیع تر اثرات۔

متوسط طبقے کا ردِعمل

نئے متوسط طبقے کا ردِعمل اس سے بہت مختلف تھا۔ جن میں کئی گروہ تھے یعنی قدامت پسند، لبرل اور شدت پسند۔ قدامت پرست ہندو و مذہب اور سماجی رواجوں میں کسی تبدیلی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس لئے اُن کا خیال تھا کہ قدیم روایت اُن کی تقدیس کی ضامن ہے اور مذہبی کتابوں نے اور دوسرے لوگوں کے حملوں نے مذہبی رسوم کے تحفظ کے عزم میں اور استقامت پیدا کردی۔ اُن کا کہنا تھا کہ بظاہر چاہے وہ کتنی خراب کیوں نہ ہوں لیکن مذہبی رسوم احکام خداوندی کے مطابق ہیں اور گہری روحانی معنویت رکھتی ہیں۔ اگر تبدیلی کا سلسلہ شروع ہوگیا تو پھر نہ جانے کہاں ختم ہو۔ چنانچہ مسلم رواجوں میں تھوڑی بہت تبدیلی بھی مذہب کے پورے وجود کے لئے خطرہ بن سکتی ہے۔ قدامت پسند اپنے عیسائی مخالفین کا مقابلہ کرتے تھے اور معلمین کی کوششوں کی مداخلت کرتے تھے۔ مغرب کے حملے میں جتنی شدت پیدا ہوئی اُتنا ہی شدید ردِعمل رجعت پسندوں میں ہوتا اور وہ اپنے ہموطنوں میں مقبولیت حاصل کرتے جو انھیں مذہب کے محافظ اور دیش بھگت سمجھتے تھے۔ ہندوستان کی قوم پرستی کے نمو میں رجعت پرستوں کا بڑا حصہ تھا۔

قدامت پرست

اس گروہ کے زیادہ تر جدید تعلیم یافتہ رہنما حالانکہ مذہبی معاملات میں قدامت پرست تھے۔ لیکن تعلیمی، سیاسی اور معاشی معاملات میں خاصے ترقی پسند بھی تھے۔ اُن میں سب سے اہم تھے گوپی موہن دیب کے بیٹے رادھا کانت دیب جو کلایو کے مشہور منشی نابا کرشن دیپ کے پوتے تھے وہ 1784 میں پیدا ہوئے اور بکنگھم کی کلکتہ اکیڈمی میں انھوں نے تعلیم پائی تھی۔ وہ پانچ زبانیں یعنی بنگالی، فارسی، عربی، سنسکرت اور انگریزی جانتے تھے اور مصنف اور عالم کی حیثیت سے بہت مشہور ہوئے۔ اُن کی ادبی دلچسپیاں بہت وسیع تھیں اور سنسکرت سے انھیں بڑا لگاؤ تھا۔ انھوں نے سنسکرت میں ایک قاموسی لغت ترتیب دی جس کا نام تھا شبد کلپ درم اُس کے سات حصے اور ایک ضمیمہ تھا۔ اور چالیس سال میں مکمل ہوئی تھی۔ انھوں نے اسکولوں کے لئے کئی درسی کتابیں

بھی لکھیں اور انگریزی اور فارسی سے ترجمے کئے۔

وہ کئی علمی انجمنوں کے رکن تھے۔ ہندوستان کی زراعت اور باغبانی کی سوسائٹی (اگریکلچرل اینڈ ہارٹی کلچرل سوسائٹی آف انڈیا) کے نائب صدر تھے۔ رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف گریٹ بریٹن اینڈ آیرلینڈ کے کارسپانڈنگ ممبر تھے اور ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال کے رکن تھے۔ اس کے علاوہ وہ ہندو کالج کونسل اور کلکتہ اسکول سوسائٹی کے بھی رکن تھے۔ 1822 میں انھوں نے تعلیم اور علم کے فروغ کے لئے ''گودیا سماج'' کی بنیاد ڈالی۔ 1830 میں ستی کے رواج کو ختم کرنے کے خلاف جدوجہد کرنے کے لئے ''دھرم سماج'' قائم کیا۔ گورنر جنرل لارڈ ولیم بینٹک کو 18 جنوری 1840 کو ایک یادداشت پیش کی گئی۔ جس پر مہاراجہ سری گریش چندر، رادھا مادھب بنرجی، کاشی ناتھ بنرجی وغیرہ کے دستخط تھے۔ اس میں ہندوؤں کے مذہبی رواجوں میں حکومت کی مداخلت کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا۔ اس میں کہا گیا تھا کہ تصورات اور رسم و رواج اُن کی نظر میں مساوی تقدس رکھتے ہیں اور برہمن پنڈتوں کے علاوہ مذہبی کتابوں کی شرح کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔ بینٹک نے مذہبی اور انسانی بنیادوں پر یہ عرض داشت رد کر دی۔ اُس کے بعد دھرم سبھا نے ملک معظم اجلاس کونسل سے رجوع کیا لیکن وہاں بھی اُس کا وہی حشر ہوا۔

حکومت نے 1838 میں جب اخراج زمینات پر قبضہ کرنا شروع کیا تو مالکانہ حقوق کے تحفظ کے لئے زمینداروں کی ایسوسی ایشن وجود میں آئی۔ 1851 میں رادھا کانت برٹش انڈیا ایسوسی ایشن کے صدر چنے گئے جو برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے شکایتیں پیش کرنے کی غرض سے قائم کی گئی تھی۔

بنگال کے عوامی کارکنوں میں رادھا کانت سب سے اہم تھے۔ صوبے کی تمام تعلیمی سرگرمیوں میں انھوں نے بڑھ چڑھ کے حصہ لیا۔ اُن کا شمار ہندو کالج کے بانیوں میں تھا۔ اور 1817 سے 1850 تک تیس سال سے زیادہ وہ اُس کی رہنمائی کرتے رہے۔ انگریز صدر سے اختلافات کی بنا پر ہندو کالج کی انتظامیہ کمیٹی سے مستعفی ہونے کے بعد 1851 میں انھوں نے سنسکرت کالج اور 1853 میں ہندو میٹروپولیٹن کالج قائم کئے۔ انھوں نے بنگال پاٹھ شالائیں قائم کرنے میں بھی مدد دی۔ اور تکنیکی تعلیم کی بڑی حمایت کی۔ وہ تعلیم نسواں کی وکالت کرتے تھے۔

اور عورتوں میں بھی تعلیم پھیلانے کی ہر کوشش کی انھوں نے پرزور حمایت کی چاہے وہ حکومت کی طرف سے کی گئی ہو یا مشنریوں اور دوسرے لوگوں کی طرف سے۔ اپنی تمام تر سرگرمیوں میں رادھا کانت کے پیش نظر دو خیال اپنے تھے۔ یعنی ہندو مذہب کا تحفظ اور عام ہندوستانیوں کی خوش حالی۔ پہلا مقصد حاصل کرنے کے لئے وہ ایک ہندو قدامت پرست کی حیثیت سے کام کرتے تھے اُن کی رہنمائی میں ہندو کالج کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ محض ہندوؤں کو کالج میں داخل کیا جائے، رام موہن رائے کو کمیٹی سے برخواست کیا جائے۔ رام موہن رائے کے پیرو ولیم اڈم کا کالج میں استاد کی حیثیت سے تقرر نہ کیا جائے۔ اور دیروزیو کو ملازمت سے برطرف کیا جائے جس کی وجہ سے طالب علموں میں آزاد خیالی پھیل رہی تھی۔ جب ایک پروفیسر نے عیسائی مذہب قبول کرلیا اور اُس کے ساتھ ایک طالب علم بھی عیسائی ہو گیا تو انھیں اُس سے بڑی تکلیف ہوئی۔ لیکن اس کی وجہ سے کمیٹی کے صدر ڈرنک وائرٹیڈن اور رادھا کانت دیب میں اختلافات رونما ہو گئے۔ اور بالآخر انھیں استعفیٰ دینا پڑا۔

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ رادھا کانت دیب کو ہندو دھرم سے کتنا لگاؤ تھا۔ وہ تبدیلی مذہب کے ہر واقع کو ہندو دھرم پر ایک ضرب تصور کرتے تھے۔ اور اس کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ انھوں نے 1851 میں پتیت اُدھار سبھا قائم کی جس کا مقصد تھا عیسائی ہو جانے والے ہندوؤں کو دوبارہ ہندو دھرم میں داخل کرنا۔ اُس زمانے کے سرکردہ ہفتہ وار انگریزی اخبار ''فرینڈ آف انڈیا'' نے اس سوسائٹی کے قیام کو موجودہ صدی میں رونما ہونے والے اہم ترین واقعات میں سے ایک سے تعبیر کیا تھا۔

رادھا کانت کا انتقال 1867 میں ہوا۔ انھوں نے ہندو فرقے میں عزت نفس اور اپنی قدیم تہذیب پر فخر کا جذبہ میراث کے طور پر چھوڑا۔

شدت پسند

دوسرا گروہ انگریزی پڑھتے ہوئے لوگوں کی پہلی پیڑھی پر مشتمل تھا۔ جن میں پیش پیش تھے ہندو کالج کے سابق طالب علم وہ نوجوان جو بانئے بنگال کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ انھوں نے یورپ کے معقولات پر دسترس حاصل کرلی تھی۔ اور لاک، ہیوم، ریڈ، اسٹورٹ،

براؤن اور بینتھم کی طرح کے فلسفیوں، ٹام پین، والٹیر اور اڈم اسمتھ کی طرح کے سماجی مفکرین اور ڈیوی اور نیوٹن کی طرح کے سائنس دانوں کا مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے رایرٹنس اور گین کی طرح کے انگریز مورخوں، رومانی شاعروں اور نثر نگاروں کو پڑھا تھا۔ کتابوں میں انھوں نے جو کچھ پڑھا تھا۔ اُس کے علاوہ انگریزی کے نوجوان لائق پروفیسر ہنری ڈیروزیو کی تعلیم نے اُن کے ذہنوں کی ساخت بدل دی تھی۔

ڈیروزیو مخلوط نسل کا تھا اُس کا باپ پرتگالی اور ماں ہندوستانی تھی۔ لیکن وہ اپنے کو پوری طرح ہندوستانی سمجھتا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ غیر معمولی اوصاف کا مالک تھا۔ چودہ سال کی عمر میں اُس نے ڈرمنڈ کی نگرانی میں اسکول کی تعلیم مکمل کر لی اور 1823 میں بھاگلپور میں ایک انگریز کمپنی میں کلرک ہو گیا۔ 1827 میں کلکتہ واپس آنے کے بعد صحافت اور ادب میں دلچسپی لینے لگا۔ اُس نے جن رسالوں کی ادارت میں ہاتھ بٹایا وہ تھے انڈیا گزٹ، کلکتہ لٹریری گزٹ، بنگال اینول اور کلیڈوسکوپ۔ اُس نے 1827 میں نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا اور اُسی سال ہندو کالج کے سینئر ڈپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ ماسٹر کی حیثیت سے اُس کا تقرر ہو گیا۔

ایک سال بعد اُس کو ترقی دے کر انگریزی ادب اور تاریخ کا لیکچرار بنا دیا گیا۔ اُستاد کی حیثیت سے اُس کے طالب علم اُس سے بڑی محبت اور لگاؤ رکھتے تھے۔ اور وفاداری کے جذبات کا مظاہرہ کرتے رہتے تھے۔ اُس کے لیکچر اتنے دلچسپ ہوتے تھے کہ نہ صرف اُس کے کلاس کے طالب علم بلکہ کالج کے اونچے درجوں میں پڑھنے والے طلبا بھی انھیں سُننے کے لئے آتے تھے۔ پڑھانے کے علاوہ وہ کالج کے اوقات سے پہلے اور بعد طالب علموں کے مختلف گروہوں سے ملتا تھا۔ اور مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال کرتا تھا۔ طالب علموں کو یہ جلسے اتنے پسند آئے کہ انھوں نے ایک باضابطہ انجمن بنالی جس کا نام تھا ''اکاڈمک ایسوسی ایشن'' (تعلیمی انجمن) اس میں اخلاقیات، مذہب اور سیاست کے بارے میں کھل کر گفتگو کی جاتی تھی۔ ہفتہ وار جلسوں میں کبھی کبھی اہم شخصیتیں بھی شرکت کرتی تھیں مثلاً ڈیوڈ ہیر، سپریم کورٹ کے سر ایڈون ریان اور بشپ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر مل۔ وہ ہر ہفتہ ڈیوڈ ہیر کے اسکول میں بھی اخلاقیات وادبیات پر تقریر کرتا تھا۔

ڈیروزیو اُس قسم کا نادر روزگار اُستاد تھا جس کا تعلیم سے بے لوث لگاؤ، حقیقت سے پیار اور

برائی سے نفرت ہر اُس شخص کو بڑا متاثر کرتی جو اُس کے قریب آتا تھا۔ سقراط کی طرح وہ نتائج سے بے نیاز ہو کر سچائی کے راستے پر چلتا تھا۔ اور سقراط ہی کی طرح اُس میں صلاحیت بھی تھی۔ اپنا جیسا جوش نوجوانوں میں بھی پیدا کر دے۔ سقراط ہی کی طرح نوجوانوں کو گمراہ کرنے کا الزام اُس پر لگایا گیا۔ اور سقراط ہی کی طرح اُس کو سزا دی گئی۔ جب اُس کو کالج سے برطرف کر دیا گیا تو اس نے اپنے کردار کے جواز میں ایک خط ہورس ہلمین ولسن کو لکھا تھا۔ خط میں اُس نے لکھا تھا کہ فلسفے کا درس دیتے وقت وہ بیکن کا طریقہ اختیار کرتا تھا۔ اور زیر بحث موضوع کی موافقت میں اور اُس کے خلاف تمام دلائل پیش کرتا تھا۔ یعنی خدا کے وجود پر بحث کرتے وقت وہ خدا کے وجود کے خلاف ہوم کی وہ دلیلیں پیش کرتا تھا جو کلسنتھر اور فلسفہ کے مکالمے میں درج ہیں۔ اور ان مشکوک کے ابطال میں ڈبوگلز اسٹورٹ اور ایڈ کی دلیلیں پیش کرتا تھا۔ اُس کے تنقیدی طریقے کے نتیجے میں نوجوان طلبا کے ذہنوں میں کشادگی پیدا ہوتی تھی۔ اور پھولوں کی طرح اُن کے ذہنوں کو کھلتے ہوئے، اور اُن کی ذہنی صلاحیتوں کو اوہام سے نجات پاتے ہوئے دیکھ کر اُسے خوشی ہوتی تھی۔ انھوں نے سچائی کو ہر چیز پر ترجیح دینا سیکھ لیا تھا۔

سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جو طالب علم اُس کے قریب آتے تھے۔ ان نوجوانوں میں وہ ہندوستان کی محبت کا شدید جذبہ پیدا کر دیتا تھا۔ اس کی گفتگو اور اس قسم کے شعر۔

میرے وطن تری گزشتہ شان و شوکت کے زمانے میں تیسرے چہرے کے گرد ایک دلکش ہالا تھا۔ ان کے ذہنوں میں اعلیٰ جذبات اور ارفع خیالات کو جنم دیتے تھے۔

ڈیروزیو کے بہت سے طالب علم متوسط طبقے کے اُس حصے سے تعلق رکھتے تھے۔ جو دولت مند نہیں تھے۔ اور کالج کی فیس ادا کر نہیں سکتے تھے۔ اور تعلیم جاری رکھنے کے لئے انھیں کالج یا راجہ رام موہن رائے اور ڈلووہیر کی طرح کے امیر اور دولت مند اشخاص سے مالی مدد لینی پڑتی تھی۔ لیکن وہ باصلاحیت اور باکردار نوجوان تھے۔ انھوں نے اپنے زمانوں کو متاثر کیا۔ ڈیروزیو کی قیادت میں انھوں نے پارتھی تن (پاتھسینم) اور بنگال اسکیٹر کی طرح کے جریدے شائع کئے جو نیا بنگال کہلائے جانے والے گروپ کے آرگن بن گئے۔ اُن جریدوں میں لکھنے والے ہندو مذہب اور سماجی رواجوں پر تنقید کرنے میں بڑی صاف گوئی سے کام لیتے تھے اور عقائد کے

اعلان میں نڈر رہتے تھے۔ وہ حکومت کو بھی معاف نہیں کرتے تھے۔

آزادی تحقیق اور آزادی فکر کے اس جذبے نے، جس کو اٹھارہویں صدی کی یورپی فکر کی مقبولیت نے تقویت پہنچائی اور ہندوستانی سماج کی ادہام پرستی، بیدردانہ اور غیر معقول رواجوں اور عام اخلاقی گراوٹ کے مقابل کھڑا کر دیا۔ ایسی نفرت کو جنم دیا جس نے کبھی کبھی عجیب وغریب شکلیں اختیار کر لیں۔ ان میں سے کچھ نوجوانوں نے کٹرپن کے خلاف احتجاج کے طور پر کھانے پینے میں بندشوں کو توڑنا شروع کیا۔ اُن میں سے کچھ نے محض ذات پات، بُت پرستی، ستی، عورتوں سے بیوپار اور دوسری سماجی خرابیوں کی مذمت پر اکتفا نہیں کیا بلکہ نوجوانوں کے جوش میں خود ہندو دھرم کی بھی مذمت کرنے لگے۔ کچھ عیسائی ہوگئے۔ کچھ نے دینِ فطرت میں پناہ لی اور کچھ نے سب مذاہب کو رد کر دیا۔

مذہب پر اُن کے حملے نے پرانے خیال کے لوگوں کو سراسیمہ کر دیا۔ لیکن اُس سے ایک فائدہ بھی ہوا۔ اس نے پرانے خیال کے لوگوں کو اپنے بنیادی عقیدوں اور اصولوں پر نظر ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ جس کا نتیجہ ہوا فکر کا انقلاب۔

اس کے علاوہ اُن پرجوش نوجوانوں کی دیانت داری اور باوقار طرزِ عمل، احساس اور ذہنی صلاحیت نے سماجی خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کیا۔ اور اُس کا اخلاقی معیار بلند کر دیا۔ وہ برگزیدہ اشخاص تھے جن میں قومی جذبہ یعنی ہندوستان کا پیار سب سے پہلے ظاہر ہوا۔

ڈیروزیو کی شاعری نے اُن کے دلوں کے تاروں کو چھوا۔ جس میں ہندوستان کے شاندار ماضی اور افسوسناک حد تک پست حالی کا ذکر تھا۔ عصری سماج کی شرمناک اور ذلت آمیز حالت کو انھوں نے محسوس کیا اور مختلف طریقوں سے وہ لوگوں کو اُبھارنے اور دیرینہ شوکت کو بحال کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ اُن میں سے کچھ نے صحافت کا پیشہ اختیار کیا۔ کچھ سماجی کاموں میں مصروف ہوگئے۔ کچھ نے ادب کے میدان میں شہرت پائی کچھ نے سائنس کو ترقی دی اور کچھ اچھے باصلاحیت اور دیانت دار انتظامی حاکموں کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ نئے بنگال کے ان شدت پسند معماروں میں مندرجہ ذیل قابلِ ذکر ہیں۔ کرشن موہن بندیودھیایا اسک کرشن ملک، رادھا ناتھ شکور، وکشنا رنجن مکھوپادھیایا، پیارے چند مترا، رام تنولاہری وغیرہ۔

IV راجہ رام موہن رائے کا کام

بنگال کے قدامت پرست اور شدت پسند عناصر کے نظریات کے درمیان راجہ رام موہن رائے نے اپنا راستہ بنایا۔ اُن کی زندگی کا تشکیلی دور دکھوں اور فتنہ وفساد کے زمانے میں گذرا جب بنگال معاشی اور سیاسی انقلاب سے گزر رہا تھا، مشرق کی زوال پذیر تہذیب تر کی اور ترقی پسند مغرب کے عظیم فتوحات نے اُن کے حساس ذہن پر بڑ گہرا اثر ڈالا۔

اٹھارھویں صدی میں بالائی طبقے کے ہندوؤں کا مذہب اپنی قدیم بنیادوں سے ہٹ چکا تھا اُن میں سے کچھ ہی اُپنیشد اور درشن پڑھتے تھے۔ اور وہ بھی پُرانوں میں درج عقیدوں اور رسموں کو نہ صرف برداشت کرتے تھے بلکہ اُن میں عملی حصہ لیتے تھے۔ اعلیٰ وارفع وحدانیت بھلائی جا چکی تھی اور کئی خداؤں اور بندوں کی پوجا کا رواج تھا۔ لاکھوں دیوی دیوتاؤں میں تین یعنی برہم، وشنو اور مہیش اور اُن کی بیویاں سب سے اہم سمجھی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ اَوتاروں اور مقامی دیوتاؤں اور دیویوں پر اُن کا اعتقاد تھا۔ مختلف دیوی دیوتاؤں کے مسلکوں کی بنیادوں پر بہت سے فرقے بن گئے تھے۔ بائیں ہاتھ کے تانترک مسلکوں سے تعلق رکھنے والی رسموں کی طرح کی کچھ رسوم انتہائی مخرب اخلاق تھیں۔ خبیث روحوں اور بھوتوں کا خوف بڑے پیمانے پر پھیلا ہوا تھا۔ انھیں منانے، خوش کرنے اور اُن کا غصہ دور کرنے کا عام رواج تھا۔ انسانی معاملات پرستاروں کے اثر کو آنکھیں بند کر کے تسلیم کیا جاتا تھا اور ہر کام شروع کرنے سے پہلے جوتشی سے مشورہ کیا جاتا تھا۔ زندگی میں تہوار اور یاترائیں اہم رول ادا کرتی تھیں۔ دیوی دیوتاؤں کے علاوہ سانپوں، بندروں، درختوں، دریاؤں اور پتھروں کی طرح جاندار اور غیر جاندار اشیا کی پرستش کی جاتی تھی۔ چرک پوجا کی طرح ظالمانہ رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ اور پرستش کی دوسری مکروہ شکلیں اختیار کی جاتی تھیں۔

ذات پات کے بندھنوں میں سب جکڑے ہوئے تھے اور سماجی نابرابری کو حکم خداوندی سمجھا جاتا تھا۔ بنگالی برہمنوں کو کئی بیویاں رکھنے کا حق حاصل تھا۔ سماج میں عورت کی حیثیت نیچی تھی۔ بیواؤں کو جلانا، بچوں کو دریاؤں میں پھینکنا اور جگن ناتھ کے رتھ کے پہیوں کے نیچے دب کر

جان دینا اچھے عمل سمجھے جاتے تھے۔ ٹیگور کے الفاظ میں ''ہندوستان کی تاریخ مدتوں تک ایک جگہ ٹھہری رہی۔ تھک کر سچائی کی آزاد کھوج کا جذبہ ختم ہو گیا۔ زندگی کی ہر مہم تھم سی گئی اور اُس کو اندر اور باہر سے صاف کرنے کی ذہنی سرگرمی رُک گئی۔ زوال کا احترام کیا جانے لگا۔ اور بدلتے ہوئے وقت کا ساتھ دینے کی ہر کوشش ترک کر دی گئی۔ صحت کی خرابی اور علم کی کمی نے اُس کی زندگی کے قریب قریب ہر چراغ کی روشنی مدھم کر دی تھی''۔[1]

رام موہن رائے، جنھوں نے ان حالات کو بدلنے کے بڑے کام کا بیڑا اُٹھایا تھا، 1774 میں رادھا نگر میں پیدا ہوئے تھے۔[2] اُن کے ماں اور باپ برہمن تھے۔ اُن کے باپ زمیندار تھے۔ اُن کے باپ، دادا اور پردادا، جنھیں رائے رایاں کے خطاب سے نوازا گیا تھا، بنگال کے نوابوں کی ملازمت میں رہ چکے تھے، اُن کی ابتدائی زندگی کے حالات ٹھیک ٹھیک نہیں معلوم ہیں۔ غالباً اُن کی ابتدائی تعلیم گھر پر اور مقامی اسکول میں ہوئی۔ جہاں انھوں نے سنسکرت، بنگالی اور فارسی پڑھی۔ اُس کے بعد وہ فارسی، عربی اور سنسکرت کی تعلیم کی غرض سے پٹنہ اور بنارس گئے۔ اُن کی عمر سولہ سال کی تھی۔ جب وہ تلاش حق میں گھر سے نکلے جو گھر رہ کے انھیں نصیب نہیں ہوا تھا۔ اور شمالی ہندوستان اور ہمالیہ کا سفر کیا۔

غالباً اس سفر کے درمیان انھوں نے بودھ اور لا مائی عقائد کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے رادھا نگر میں اپنے سنسکرت کے اُستاد سے تانترک فلسفہ پڑھا تھا۔ اور فارسی اور عربی کے استادوں سے اسلامی دینیات اور تصوف کا درس لیا تھا۔ ان مذاہب کا تقابلی علم وہ پوری طرح حاصل کر چکے تھے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی مطالعے نے اُن کے ذہن پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ لگتا ہے کہ انھوں نے عربوں کی منطق کا مطالعہ کر کے، جسے دوسروں کے منطق سے بہتر سمجھتے تھے، خود کو مناظروں کے لئے تیار کیا۔''[3] معتزلہ کے فلسفے نے انھیں متاثر کیا تھا۔ اور وہ حافظ اور

---

[1] ماڈرن ریویو، ستمبر 1928 صفحہ 338

[2] ان کی تاریخ پیدائش کے متعلق اختلاف رائے ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ 1772 میں پیدا ہوئے اور کچھ دوسروں کی رائے میں وہ 1774 میں پیدا ہوئے۔

[3] اے گریگور ایک فرانسیسی کتابچے میں دیکھئے The Father of Modern India, Ram Mohan Ray, Centenary Commenation Volume حصہ دوم، صفحہ 29

جلال الدین رومی کے اشعار پڑھنے کے شائق تھے۔

1803 میں اپنے باپ کے انتقال کے لگ بھگ وہ کمپنی کی ملازمت میں داخل ہوئے اور ڈگبی کے دیوان بن گئے۔جس کے ساتھ انھوں نے 1814 تک کام کیا۔ڈگبی سے اُن کی دوستی ہوگئی اور اُس نے انھیں انگریزی پڑھائی۔ڈگبی کے ساتھ انھوں نے جو دس سال گزارے تھے اُس کے دوران انھوں نے مغربی فکرو ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔اور ایک ایسا انداز نگارش پایا جس کی تعریف کرتے ہوئے بینتھم نے کہا تھا۔ایسا اسلوب جس کے ساتھ اگر ایک ہندو کا نام جڑا نہ ہوتا تو میں اُسے زیادہ بہتر پائے ہوئے کسی انگریز کے رشحات قلم سے تعبیر کرتا۔''[1] 1814 میں ڈگبی کے انگلستان واپس جانے کے بعد انھوں نے کلکتہ میں رہائش اختیار کی۔ یہاں انھوں نے عوامی خدمات اور اصلاح کا کام شروع کیا۔ان میں حیرت ناک قوت عمل تھی۔اُن کی دلچسپیاں وسیع تھیں۔انھوں نے مذہب،سماج اور اخلاقیات کے بڑے مسئلوں کے تعلق سے اپنے ذہن کو تیار کرلیا تھا اور اُن کے خلاف جن کو وہ تاریکی اور عدم مقبولیت کی طاقتیں تصور کرتے تھے،معقول عقیدے کی فتح کے لئے جنگ شروع کردی۔

کلکتہ میں سیرم پور کے مشنریوں سے اُن کے روابط ہوگئے۔ہندو دھرم پر اُن کی تنقید نے، جس سے موجودہ عقائد اور رواجوں کی حد تک وہ متفق تھے۔انھیں عیسائی مذہب کے مطالعہ پر اکسایا۔انھوں نے عیسائیوں کی مقدس کتابوں اور کلیساؤں کی تشکیل کردہ دینیات کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کے لئے یونانی، لاطینی اور عبرانی زبانیں سیکھیں اور عیسائی مذہب کے عالموں کی کتابیں پڑھیں۔یسوع مسیح کی تعلیمات انھیں پسند آئیں۔لیکن انجیل کی ادعائیت اور فوقیت کو انھوں نے رد کردیا۔انھوں نے محض ہندو دھرم کا تحفظ ہی نہیں کیا بلکہ معجزوں،تثلیث اور معصومیت کے تصور پر حملے کرکے انھوں نے اس قسم کی غیر منطقی باتوں کے لئے اپنا تحفظ کرنے پر مشنریوں کو مجبور کردیا۔ جیسا کہ بنگال پر کارو کے اڈیٹر کے نام اُن کے خط کے مندرجہ ذیل ٹکڑے سے ظاہر ہوتا ہے۔وہ ہندو دھرم کو عیسائی مذہب سے کم تر نہیں سمجھتے تھے۔

''اگر عقل کی روشنی سے جس کے لئے کرسچن کے کہنے کے مطابق ہمیں انگریزی کا ممنون

[1] جرمی بینتھم کا خط رام موہن رائے کے نام،ایضاً صفحہ 33

احسان ہونا چاہئے۔ اُس کا مقصد ہے مفید میکانکی حقوق کا رواج تو میں اُس کی بات سے اتفاق اور جذبہ احسان مندی ظاہر کرنے کے لئے تیار ہوں۔ لیکن جہاں تک سائنس، ادب اور مذہب کا تعلق ہے، میں یہ تسلیم نہیں کرتا ہوں کہ ہم پر اُن کا کوئی احسان ہے۔ تاریخ کا مطالعہ اس کو ثابت کر سکتا ہے کہ علم کی پہلی شعاعوں کے لئے دنیا ہمارے بزرگوں کی ممنون احسان تھی جو مشرق سے پھوٹیں اور علم وعقل کی دیوی کی کرپا سے آج بھی ہمارے پاس ایک فلسفیانہ اور وسیع زبان ہے، جو ہمیں دوسری قوموں سے ہم عصر کرتی ہے جو بدیسی زبانوں سے لفظیات مستعار لئے بغیر سائنس یا مطلق تصوارت کو ظاہر کر سکتی ہیں۔''[1] چنانچہ انھوں نے فکر وثقاوت کے اہم شعبے میں مغرب کی برتری کے کھوکھلے دعووں کی تردید کی اور اُن ہندوؤں میں خود اعتمادی ایک دفعہ پھر پیدا کر دیا جو مشنریوں اور اُن کے حلیفوں کے حملوں سے گھبرا گئے تھے۔ یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا کہ مغربی تعلیم اور عیسائی تعلیمات کی بنا پر ہندوستانی عیسائی ہو جائیں گے۔

اپنی ابتدائی اور اصل شکل میں ہندو دھرم کا تحفظ کرنے کے ساتھ انھوں نے خرابیوں اور غیر انسانی رواجوں کی اس مضبوط دیوار پر شدید حملہ شروع کیا جو صدیوں کی لاپرواہی اور گراوٹ کی بنا پر دین کے گرد کھڑی ہوگئی تھی۔ اور جس کو مسمار کرنے کی کوشش کبیر، نانک، وادو وغیرہ جیسے مصلحین کر چکے تھے۔ انھیں اس بات کی بڑی تکلیف تھی کہ ''ہندو سماج جو ذات پات، بہت سی بیویاں رکھنے، ستی، بچوں کے قتل اور دوسری خرابیوں سے بھرا تھا۔ اپنی گراوٹ کی انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اخلاق کا معیار انتہائی پست تھا۔ لوگ اپنا وقت فسق اور معجزوں اور کاہلی میں گزارتے تھے۔ اور سماجی جھگڑوں اور پارٹی بازیوں میں مصروف تھے'' اور ''جہالت اور ادہام پرسری ملک کے طول وعرض میں پھیلی ہوئی تھی ملک پر اندھیرا چھایا تھا۔ اور کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ کب دور ہوگا۔''[2]

کلکتہ کے قیام کے پندرہ سال میں اُن کی سرگرمیوں نے سماج میں غیر معمولی تحریک پیدا کی

---

[1] جنھیں پانیتی آفس، الہ آباد نے The English works of Raja Mohan Ray تحفۃ الموحدین کے انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔ 1906، صفحہ 948

[2] ایضاً، جلد 1، صفحہ VII

جس نے شدت پسندی اور قدامت پسندی کی تحریکوں کے ساتھ مل کے متوسط طبقے اور خصوصیت کے ساتھ اُس کے تعلیم یافتہ حصے کے رویوں میں ایک بڑی تبدیلی پیدا کردی۔ جامع رسم پرستی قرون وسطیٰ کے نقطہ نظر کی جگہ فکر و عمل کی ایک نئی قوت نے لے لی۔ اس تبدیلی کی ذمہ داری بڑی حد تک رام موہن رائے کی ہمہ گیر تحریک پر تھی۔ قومی زندگی کا کوئی بھی پہلو ایسا نہیں تھا جس کو انھوں نے متاثر نہیں کیا ہو۔

اُن کے مذہبی تصورات

اُن کے پیش نظر ایک بنیادی مسئلہ یہ تھا کہ اٹھارھویں صدی کے مغربی مفکرین کے معروض، سائنس اور مقبولیت پسند تصورات میں اور حقیقت کے وجدانی، ذاتی اور راست تجربے کے تصور میں، جسے مشرق کا اعلیٰ وارفع علم سمجھا جاتا تھا، کوئی سمجھوتا کریں۔ مغرب کی تجربیت نے ہیوم کے تشکک اور سائنسی تجرید کو جنم دیا تھا۔ جو مادی کائنات کے دعوے کی نفی کرتی تھی، اُس کی رو سے علم حواسی اور انفرادی فضائل تک محدود تھا۔ اس کے برعکس عہد وسطیٰ کا ہندوستانی فلسفہ ذہن کو موضوعات سے خالی قرار دیتا تھا۔ اور مطلق عینیت اور ایسے باطنی علم میں پناہ ڈھونڈتا تھا۔ جس کی بنیاد محض نفی تھی اور جو اختلاف وانفرادی کا ذکر تھا۔ اس مسئلے کا حل سماجی تنظیم اور تعلیم کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

انھوں نے اپنے فارسی کے کتابچے تحفۃ الموحدین میں لکھا تھا جو 4-1903 میں شائع ہوا تھا۔

''ہر مسئلے میں یہ ضروری ہے کہ صحیح اور غلط (اچھے اور بُرے) میں تمیز کرنے کے لئے علم کے اصولوں کی مدد سے دلیل دی جائے اس لئے کہ ہمارے فیاض خالق (خدا) نے علم کی جو دولت دی ہے اُسے غیر ضروری سمجھا نہیں جاسکتا ہے۔''[1]

کنیا اُپنشد کے ترجمے کے تعارف میں روایت اور دلیل کی نزاع کا ذکر کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے ''غالباً بہترین طریقہ یہ ہے کہ ہمیں اُن میں سے کسی کی بھی رہنمائی پر مکمل انحصار نہیں کرنا چاہئے۔ بلکہ دونوں کی مہیا کی ہوئی روش کو مناسب انداز سے استعمال کر کے اپنی

[1] رام موہن رائے، تحفۃ الموحدین 1950ئ صفحہ 13

ذہنی اور اخلاقی صلاحیتوں میں اضافہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔''[1]

اس کے بعد آسا اُپنشد کے ترجمے کے پیش لفظ میں انھوں نے اپنے قارئین سے کہا ''عقل کے مناسب اور اعتدال پسندانہ استعمال کو نظر انداز کئے بغیر اُن کی مقدس کتابوں کے مقصد کا جائزہ لیا جائے اور اُن کی ہدایتوں پر پوری توجہ دی جائے۔''[2] انھوں نے بتایا کہ رسمی مذہب اور الوہی دین میں بڑا فرق ہے۔ اس لئے کہ اوّل الذکر عامیانہ تخیل کا نتیجہ ہے۔ اور آخر الذکر کا مخرج ہے ''روحانی استاد اور صحیح استدلال۔'' پہلا نور سے محروم ہے اور منطقی ضابطے اس میں راہ پا سکتے ہیں۔ یعنی قبضے سے نیچے کی مطابقت، ممکن اور ناممکن کے فرق کو نظر انداز کرنا، اتصال و تفاوت، رسم کے حوالے سے ثابت کرنا یا مرجح کے بغیر ترجیح دینا۔ آخر الذکر کی بنیاد ہی اس واقعہ پر قائم ہے کہ ''ہر شخص میں یہ پیدائشی استعداد ہوتی ہے کہ کسی کی ہدایت اور رہنمائی کے بغیر فطرت کے رازوں کو سمجھ کر اور اُن پر عمل کر کے یہ نتیجہ اخذ کر سکے کہ ایک ایسی ذات موجود ہے جو (اپنی عقل وفہم سے) پوری کائنات پر حکومت کرتی ہے۔''[3]

رام موہن رائے باضابطہ فلسفی نہیں تھے۔ اور انھوں نے روحانی بصیرت اور ذہنی استنباط میں امتزاج کی جو تجویز پیش کی اُس کے علمیاتی اور منطقی مضمرات کا جائزہ نہیں لیا۔ اُس کے باوجود انھوں نے اس راستے میں چراغ جلا دئے۔ اُس کے زمانے سے ہندوستان کے مُفکرین جل رہے ہیں۔ جب کہ شدت پسند بُت شکنی کے جوش میں ہندوستانی روایت کی مخالفت میں ضرورت سے زیادہ آگے بڑھ گئے اور قدامت پرستوں نے ترمیم کی ضرورت کے جدید تعلیم کے مطالبوں پر غور کرنے سے انکار کر دیا۔ رام موہن رائے نے ایک ایسے حل کی طرف اشارہ کیا جس میں ہندوستان کی تہذیب کا امتیازی رول بحال رکھا گیا تھا۔ اور اُس کے قدیم جذبہ آزادی کی تصدیق نو کی گئی تھی اور اُس میں مغرب کے مقبولیت پسندانہ نقطۂ نظر سے مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

---

[1] The English Workd of Raja Ram Mohan Ray جلد 1، صفحہ 50

[2] ایضاً، صفحہ 100

[3] The English Workd of Raja Ram Mohan Ray جسے تحفۃ الموحدین کے انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع کیا گیا، نیتی آفس، الہ آباد، (1960) صفحہ 948

رام موہن رائے نے ہندو دھرم اور اسلام کے مذہبی عقائد اور روحانی نقطۂ نظر کے مطابق اپنے پیش کردہ حل میں انسان کی باطنی زندگی کی حد تک اُس کے وجود کی آزادی پر ایک دفعہ پھر زور دیا۔ لیکن انھوں نے معروضی کائنات تک اس کو پھیلا کر آزادی کی توسیع کر دی جس کی تعلیم مغربی فلسفہ دیتا تھا۔ چنانچہ انھوں نے داخلی اور خارجی دنیا میں انسان کا وقار بڑھا دیا اور اُس کے وجود کو اعتبار و افتخار بخشا۔ اس کا منطقی نتیجہ تھا کہ آزاد مرضی آزاد اداروں کی شکل اختیار کرنے لگے یعنی آزاد سماج اور آزاد ریاست کی۔

آزادی کے اس اصول کا اطلاق قومی زندگی کے تمام شعبوں پر کیا گیا۔ یعنی مذہبی اخلاقی، سماجی اور سیاسی۔ حالانکہ رام موہن رائے نے اس آزادی کی جڑیں ہندوؤں کی مقدس کتابوں اور خاص طور سے اپنشدوں میں تلاش کیں۔ لیکن انھوں نے بلا پس و پیش تمام مذہب سے اصول مستعار لئے جہاں جہاں وہ اُن کے نقطۂ نظر کے حامی نظر آئے۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہبی اور اخلاقی مسائل میں اُن کی ہمدردیاں سب کے ساتھ تھیں اور اُن کا نقطۂ نظر بہت وسیع تھا۔ وہ ہر مذہب کی سچائی پر یقین رکھتے تھے۔ چنانچہ اسلام سے انھوں نے وحدانیت، بُت پرستی کی مخالفت، سماجی مساوات، خدا اور اُس کی صفات کے باہمی رشتے کا نظریہ اور زندگی گذارنے کے طریقوں کو متاثر کرنے والی دوسری چھوٹی باتیں لیں۔ مسیحیت میں وہ اُس کے اخلاقی نظریوں کے معترف تھے اور مسیح کی تعلیمات کا بڑا احترام کرتے تھے۔

حق کی تلاش میں انھوں نے تحفۃ الموحدین لکھی۔[1] جس میں اسلامی فکر اور یسوع کی اُن نصیحتوں سے استفادہ کیا ہے جو عیسائی مذہب کے اختلافی اصولوں کی بنیاد ہیں۔ اُن کے ترجموں کا جن میں کنیا، آسا کتھا، مندو کیا اور مندکا اُپنشدوں کی تلخیص شامل ہیں۔ مقصد تھا ہندوؤں کے اصل مذہب کو دوبارہ زندگی دینا۔ انھوں نے انسانوں کو تمام مذاہب کا احترام کرنے اور کسی کو برا نہ کہنے کی تعلیم دی۔ ان کا کہنا تھا کہ مختلف مذاہب کو سورج کی سفید روشنی کے مختلف رنگ کی شعاعوں میں بکھرنے سے تعبیر کیا جانا چاہئے۔ اس طرح انھوں نے ہندوستان کے اُس بنیادی اتحاد کا خاکہ پیش

---

[1] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے فارسی میں مذہب کے متعلق ایک اور کتاب لکھی۔ جس کا نام تھا مناظرات الادیان

کیا جس کی اساس ہونی چاہیے مختلف فرقوں کے باہمی اعتماد اور تمام مذاہب کو سمجھنے کی کوشش پر۔

صد سالہ جشن کے موقعے پر رام موہن رائے کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا تھا ''رام موہن رائے ہماری تاریخ کے عہد جدید کی ابتدا میں اُس وقت پیدا ہوئے جب ہندوستانی اور بدیسی میں تمیز کرنے کا شعور کم ہی تھا۔ لیکن اُن ابتدائی دنوں میں بھی وہ سمجھ گئے کہ اُن کے دور کا چیلنج تھا اتحاد کا عظیم چیلنج۔ اُن کے فیاض دل کی کشادگی میں جو علم کی روشنی سے منور تھا، سب فرقوں یعنی ہندوؤں، مسلمانوں اور عیسائیوں کے لئے جگہ تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اُن کا دل ہندوستان کا دل تھا اور ہندوستان کی حقیقت کی آئینہ داری وہ کرتے تھے۔ اُن کی نظر میں صرف وہ ہندوستانی کہلانے کا مستحق تھا جو مذہب کے ماننے والے احترام کا کرے اور سب کو قبول کرے۔''[1]

بدقسمتی سے سیاسی حالات اور تہذیبی تبدیلیوں نے اتحاد کی تحریک کی نشو و نما کو روک دیا اور ملک میں علیحدگی پسندی کا رجحان بڑھ گیا۔

مذہب کے میدان میں رام موہن رائے کے دو کارنامے ہیں۔ انھوں نے مذہب کے لازمی اجزا کو اُن اجزا سے علیحدہ کیا جو لازمی نہیں ہیں اور اخلاقی مذہبی فکر کا معقول نظام پیش کیا۔ انھوں نے وہ مضر اور زہریلی جھاڑیاں کاٹ دیں جن کی وجہ سے ہندو سماج کا دم گھٹ رہا تھا۔ انھوں نے اپنے کام کے تعمیری حصے کے تعلق سے بڑی معقولیت پسندی سے کام لیا لیکن برائیوں کو ختم کرنے کے پروگرام میں وہ بڑے نڈر تھے اور صاف گوئی سے کام لیتے تھے۔ برا بھلا کہے بغیر انھوں نے منطقی استدلال سے کام لے کر ہندوؤں کے غیر معقول رواجوں، پوجا کے طریقوں، رسموں اور تقریبوں کی مذمت کی۔ وہ بُت پرستی کو ایسی پوجا سمجھتے تھے کہ جو سماج کی بناوٹ کو تباہ کر دیتی ہے اور ویدوں کے متوں اور اُپنشدوں کی مدد سے بتاتے تھے کہ اگرچہ رسم پرستی کی اجازت ہے لیکن وہ لازمی نہیں ہے اور یہ کہ وہ احکام، احتیاط اور عمل کے ضابطے میں جو عام معقول اصولوں کے منافی ہیں۔ ہندو دھرم سے انھوں نے یہ اصول اخذ کیا کہ انسان اصل میں جز و آمیز دی ہے۔ یعنی اتحاد کی برہما اور یہ کہ انسانی زندگی نظم و ضبط کا ایک طریقہ ہے جو انسان کے فروتر حیثیت سے ترقی

---

[1] The English works ofRaja Ram Mohan Ray جلد 1، صفحہ 6

کر کے انسان سے بالاتر ہو جاتی ہے۔ ہندوؤں سے اُن کا کہنا ہے کہ خدا کی وحدت کے پرانے مسلک، جس کی تعلیم وید دیتے ہیں پھر قبول کریں۔ اور رسم پرستی کی جگہ جس کا مفہوم کھو چکا ہے وہ طریقہ اختیار کریں جو انسان کا حقیقی رشتہ خدائے مطلق سے قائم کر دیتا ہے۔ یعنی مطالعے کے مقدس طریقوں سرون، منن اور ندہناسن پر عمل کریں۔ انھوں نے بلا اختیار، رنگ، نسل اور مذہب پر انسان سے محبت کرنے پر زور دیا۔ اور انسانی خوف کو زندگی کا اعلیٰ ترین اصول ٹھہرایا۔ انھوں نے دین کے نظم وضبط کے پرانے طریقے کی سفارش کی جس سے انسان برے خیالات اور خود غرضی پر قابو پالیتا ہے۔

ایک طرف رام موہن رائے نے ہندوؤں کو نہیں بخشا تو دوسری طرف انھوں نے مسیحیت اور اسلام میں بھی اُن باتوں کو رد کر دیا جو اُن کی رائے میں قرین عقل نہیں تھیں۔ یسوع مسیح کی تعلیمات کی وہ بڑی قدر کرتے اور صلب کے عقیدے کے بڑے معترف تھے۔ یعنی انسانوں کے لئے تکلیفیں برداشت کرنے کے عقیدے کے، لیکن وہ یسوع مسیح کی الوہیت، مثلیت، فرشتوں اور معجزوں کے قائل نہیں تھے، وہ اسلام کی اس غیر رواداری کو ناپسند کرتے تھے کہ اُس نے انسانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا پہلے ''مومن، جو محض اس لئے جنت کے حقدار ہیں کہ وہ خدا کی وحدانیت اور محمدؐ کی رسالت کے قائل ہیں۔ اُن کے اعمال کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ دوسرے ''کافر'' جو کتنے ہی اچھے اور مذہبی کیوں نہ ہوں، مگر چونکہ وہ مقدس کلمہ نہیں پڑھتے ہیں اور محمدؐ کو ''قائم المرسلین'' تسلیم نہیں کرتے ہیں۔ اس لئے وہ دوزخ کے ایندھن میں جلیں گے۔

وہ یہ تسلیم نہیں کرتے تھے کہ دیوتاؤں، دیویوں، فرشتوں اور مافوق الفطرت انسانوں میں ایزدی صفات ہوتی ہے۔

سماجی اصلاح کے تصورات

سماجی عمل کے میدان میں رام موہن رائے کی آزادی پسند ذہن کی خواہش تھی کہ غیر معقول طریقوں اور برے رواجوں سے ہندو سماج کو پاک کیا جائے۔ عہد وسطیٰ کے سماج کی بدترین کارروائیوں میں سے ایک تھی، عورتوں کے ساتھ کیا جانے والا سلوک۔ وہ حق ملکیت سے محروم تھیں۔ انھیں پوری زندگی یا تو بیوہ کی طرح رہنا پڑتا تھا یا مرحوم شوہر کی چتا پرستی ہونا پڑتا تھا اور

کثرت ازواج کے تکلیف دہ نتائج کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔تعلیم اُن کے لئے شجر ممنوع تھی۔زنان خانے کی چاردیواری میں قید رکھی اور مردوں کے تابع اور اُن سے کمتر سمجھی جاتی تھیں۔اور ان کی حیثیت غلاموں سے کسی طرح بہتر نہیں تھی۔رام موہن رائے نے ان حالات کو یکسر بدلنے کی وکالت کی تاکہ عورتیں بھی آزادی کے ساتھ اور باوقار زندگی بسر کرسکیں، وہ اُن کے حق میں قانونی ملکیت میں ترمیم کرنا چاہتے تھے۔اور ستی کی بہیمانہ اور غیر انسانی رسم کو ختم کرنا چاہتے تھے۔انھوں نے بیوہ کی شادی کی اور کئی بیویاں رکھنے کی ممانعت کی وکالت کی۔سب سے زیادہ زور انھوں نے تعلیم نسواں پر دیا۔

ہندو سماج کی ایک اور برائی تھی ذات پات کا نظام جس پر ماضی کی کئی خرابیوں کی ذمہ داری تھی۔اور جس کی وجہ سے ہندوستان کے لوگوں میں اتحاد و یکجہتی پیدا نہیں ہوسکتی تھی۔ذات پات کے نظام نے سماج کو مختلف حصوں میں بانٹ دیا تھا۔اور ان حصوں کی بالائی اور زیریں سطحوں کی درجہ بندی کردی تھی۔اُس کی بنیاد تھی پیدائش کا حادثہ جس کے پیچھے نہ کوئی دلیل تھی اور نہ جس کی پیش گوئی کی جاسکتی تھی۔اُس نے سماجی ڈھانچے کو پست ترین فرقے کی شکل دے دی تھی۔جس کا مقصد تھا محض حیاتیاتی عمل۔اس میں پائی جانے والی شدید تفریق محض ڈھیلی ڈھالی یک جہتی کی اجازت دیتی تھی۔چنانچہ اپنی پوری تاریخ میں ہندو سماج بیرونی حملوں کی مزاحمت کی زیادہ سکت نہ دکھا سکا۔حالانکہ ایک قدیم نظام کی طرح اُس نے طویل عمر پائی۔

رام موہن رائے نے محسوس کیا کہ آزادی، برابری اور مساوات کی بنیاد پر جمہوری سماج صرف اُس وقت قائم کیا جاسکتا ہے جب ذات پات ختم کردی جائیں۔انھوں نے لکھا تھا ''ذاتوں کی تفریق نے اُن میں (ہندوؤں میں) بہت سے فرقے اور ذیلی فرقے بنادیے ہیں۔اور انھیں حب الوطنی کے احساس سے یکسر محروم کردیا ہے'' اور مزید لکھا ''تقریباً نو صدیوں سے ہم ان ذلتوں کا سامنا کررہے ہیں اور ہمارے زوال...... ذات پات کی تقسیم جس کی وجہ سے ہم میں اتحاد نہیں ہوسکا۔''[1]

---

[1] The Father of Modern India یادگار جلد، حصہ دوم، صفحہ 75

ذات اور نسل کی تفریق کو ختم کرنے کے لئے انھوں نے شادی کے سیوا طریقے [1] کی سفارش کی جس کا ذکر مہانروان منتر میں کیا گیا ہے۔

اُن کے سیاسی تصورات

اُن کا زیادہ وقت اور جوش عمل مذہبی اور سماجی اصلاحات میں صرف ہوا۔ لیکن رام موہن رائے کی سرگرمیاں صرف اُنھی تک محدود نہیں تھیں۔ انفرادی اور اجتماعی کار پر آزادی کے اصول کے اطلاق کا منطقی نتیجہ تھا کہ اُس کی توسیع سیاست تک کی جائے۔ ظاہر ہے کہ رام موہن رائے کا آزادی سے پیار محدود نہیں تھا۔ وہ ہندوستان کے ساتھ اُس کا اطلاق پوری دنیا پر کرنا چاہتے تھے۔ جہاں تک خود اُن کے ہموطنوں کا تعلق تھا انھوں نے زندگی کے ہر شعبے میں اُن کی ترقی کے لئے کام کیا اور اصلاح کے لئے اُن کی ہر کوشش کا مقصد تھا آزادی۔ مسٹر ارنوٹ نے انگلستان میں، راجہ موہن رائے کا سکریٹری تھا، راجہ کی اس رائے کا ذکر کیا ہے کہ ہندوستان چالیس سال میں آزاد ہوجائے گا اور یہ کہ برطانیہ کے زیر تعلیم ہندوستان دنیا کے متمدن اور آزاد ملکوں کی صف میں شامل ہوجائے گا۔ 1827 کے جیوری ایکٹ کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے، جس نے عدالتی نظام میں مذہبی اختیارات کو رواج دیا تھا انھوں نے لکھا:

> ''اگر ہندوستان کے پاس اُس ملک (آئرلینڈ) کے علم اور جوش کا ایک چوتھائی حصہ بھی ہوتا تو وہ اپنی دور دراز کی جائے وقوع، اپنی دولت اور اپنی بڑی آبادی کی بنا پر ظاہر کردیتا کہ وہ برطانوی سلطنت کا ایک مفید اور منافع بخش صوبہ، ایک حلیف ہے۔ یا ایک دشمن کی طرح اس کو تکلیف پہنچا سکتا ہے اور اُس کے لئے دشواریاں پیدا کرسکتا ہے۔'' [2]

انھوں نے وکٹرل جک مال سے کہا تھا۔ ابھی ہندوستان کو بہت برسوں تک انگریزی

---

[1] اُس میں متعلقہ مدعہ ہے ''ویوورن۔ اُتر دنا و دیتے'' ورن یا عمر کا کوئی سوال نہیں ہے۔ مہانروان منتر 18، 279 اگر اس طرح کی شادی سے بچے ہوں تو انھیں حق وراثت کے معاملے میں برہما شادی کے بچوں پر ترجیح نہیں دی جاسکتی تھی۔ لیکن اخراجات زندگی کا مطالبہ کرسکتے ہیں۔

[2] ایضاً حصہ دوم، صفحہ 24

حکومت میں رہنا ہے تا کہ جب وہ سیاسی آزادی ایک دفعہ پھر حاصل کرلے تو اُسے بہت کچھ کھونا نہ پڑے۔[1]

سیاسی رجحان کے تعلق سے بینتھم کے پیرو اور سیاسی تحریک کے برطانوی طریقوں کے شاہد کی حیثیت سے انھوں نے خرابیوں کا تدارک کرنے کے لئے سیاسی جدوجہد کا راستہ دکھایا۔اُن کی پہلی احتجاجی تحریک تھی 1823 کے آڈم کے پریس آرڈنینس کے خلاف جس نے اخبارات کی آزادی بہت کم کردی تھی۔انھوں نے حکومت کو پیش کرنے کے لئے ایک یادداشت کا مسودہ تیار کیا جس کو ملٹن کے اریو پاگیٹکا کے معاملے میں پیش کیا جاتا ہے۔1827 میں انھوں نے جیوری ایکٹ کے خلاف احتجاج کیا جس میں مذہبی بنیاد پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں امتیاز کیا گیا تھا۔اور اُس کو منسوخ کرنے کے لئے پارلیمنٹ کو ایک عرضداشت بھیجی۔تین سال بعد انھوں نے اُن زمینوں پر دوبارہ قبضہ کرنے کی تباہ کُن کاروائی کے خلاف اپنی آواز بلند کی جو خیراتی مقاصد کے لئے معافی کے طور پر دی گئی تھیں۔انگلستان کے قیام کے دوران انھوں نے لوگوں کی شکایتوں اور کمپنی کے انتظام کی خرابیوں کے متعلق ایک یادداشت پیش کی اور اُن کو دور کرنے کا مطالبہ کیا۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ رام موہن رائے نے سب سے پہلے احتجاج کرنے کا دستوری طریقہ اختیار کیا جس پر تقریباً ایک صدی تک ہندوستان کے سیاسی رہنما کاربند رہے۔

رام موہن رائے یہ جانتے تھے کہ ہندوستان کی صورت حال متناقض ہے۔ہندوستان اور دوسرے ملکوں کی آزادی کی شدید خواہش اُن کے دل میں تھی۔لیکن ہندوستانی سماج کی کمزوریوں اور خرابیوں کا احساس بھی انھیں تھا۔انھوں نے حکمرانوں کی قوت کا دامن پکڑا۔انھیں توقع تھی کہ لیبرل ترقی پسند اور اصلاح شدہ انگلستان کی تربیت سے ہندوستان کا اخلاقی معیار بلند ہوجائے گا۔ عوامی جذبہ بڑھے گا اور وہ آزادی کے قابل بن جائے گا۔

رام موہن رائے نے جن سیاسی اصلاحات کی سفارش کی اُن کا مقصد تھا اس منزل تک پہنچنا۔وہ آزادی کے فوری مطالبے کے حق میں نہیں تھے۔اُن کا خیال تھا کہ کمپنی کی حکومت کی تنظیم زیادہ معقول اصولوں پر کی جانی چاہئے۔اس دستوری حکومت میں قانون کی عملداری کو سب سے

---

[1] ایضاً حواشی

اونچی حیثیت ملنی چاہئے۔ اور سول آزادیوں اور انفرادی حقوق کی ضمانت کی جانی چاہیے اُن میں زندگی اور آزادی کا حق اور اظہار رائے اور مذہبی عبادت کی آزادی شامل ہونی چاہیے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ جائداد پر فرد کی مطلق ملکیت ہونی چاہیے۔

اس حکومت میں قانون سازی کے اداروں کا جہاں تک تعلق تھا رام موہن رائے علیحدگی اختیارات کے حق میں تھے۔ لیکن ہندوستان میں مجلس قانون ساز کے قیام میں انھیں ناقابل تسخیر دشواریاں نظر آئیں۔ چونکہ ہندوستان کے نمائندوں کے انتخاب کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اس لئے وہ ہندوستان کا نمائندہ ادارہ نہیں ہوسکتا تھا۔ قانون ساز اسمبلی یا کونسل قائم کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس لئے اُس میں حکام غلبہ حاصل کر لیتے۔ یہ بھی مناسب نہیں تھا کہ قانون سازی کا کام کمپنی کی حکومت کے سپرد کر دیا جائے جو ایک تجارتی ادارہ تھی۔ اور کاروبار اور منافعوں میں دلچسپی رکھتی تھی جس کا دور نزدیک کا تعلق عام لوگوں کی بھلائی سے نہیں تھا۔

ان حالات میں انھیں سب سے کم نقصان اس میں نظر آیا کہ قانون سازی کے اختیارات بادشاہ یا اجلاس پارلیامنٹ کے سپرد کر دیے جائیں۔ لیکن یہ ضروری تھا کہ قانون سازی کے اختیار پر تقریبات کا انتظام کیا جائے۔ خاص طور سے ایسی حالت میں جب کہ قانون سازی کرنے والوں اور رعیت کے درمیان نسل وتہذیب کے اختلافات اور جغرافیائی دوری حائل تھی۔ اس کا تدارک کرنے کے لئے ضروری تھا کہ آزاد اخبارات ہوں جو بلاخوف وخطر اور آزادی کے ساتھ لوگوں کے احساسات کو ظاہر کر سکیں۔ مجوزہ قانون کی دفعات کا جائزہ لینے کے لئے عدالت اور مال کے محکموں کے نمائندوں پر مشتمل ایک کمیشن ہو اور اُس کی جانچ پڑتال دولت اور ذہنی صلاحیت رکھنے والے زمیندار اور تاجر کریں چنانچہ اُن قانونوں کے مسودے کو ہندوستان میں حکومت تیار کرے، حکام اور باحیثیت ہندوستانی اُن کا جائزہ لیں اور پارلیمنٹ انھیں منظور کرے۔

کمپنی کی حکومت کے دوران کمپنی کا عدالتی نظام ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور ہر طرف سے اُس پر اعتراضات کئے جاتے تھے۔ ملک کی روایتوں کے وہ خلاف تھا۔ عدالتیں ناقص، مقدموں کے فیصلے ہونے میں دیر لگتی تھی اور رشوت کا عام رواج تھا۔ اس کی اصلاح کے لئے رام موہن رائے نے جامع اصلاحات کا مشورہ دیا یعنی عدالتی فرائض کی انتظامی فرائض سے

علیحدگی۔ ایماندار اور باصلاحیت ججوں کا تقرر جو لوگوں کی زبان سے واقف ہوں، ہندوستانیوں کو زیادہ تنخواہیں دینا، جعل سازی اور دروغ بیانی کے وجود کا تدارک، جیوری کا طریقہ شروع کرنا، نئے طریقے سے قائم کی گئی، پنچایتوں کو بحال کرنا اور عدالت کی کارروائی کی نگرانی لوگوں کے سپرد کرنا۔

حکومت کے انتظامی ادارے کا جہاں تک تعلق تھا رام موہن رائے اس کے حق میں نہیں تھے کہ وہ کمپنی سے تاج کو منتقل ہو جائے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ ہزاروں میل کے فاصلے سے اُس وقت راست حکومت ایک خطرناک عمل تھا۔ جب آمد و رفت کے ذرائع ترقی یافتہ نہیں تھے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی مناسب نہیں تھی کہ جو قانون سازی کرے وہی انتظامی فرائض بھی ادا کرے۔ لیکن حکام کی من مانی کی روایتوں کے خلاف کچھ حفاظتی تدابیر کی جانی چاہئے تھیں۔ مثلاً حکام کی قانونی ذمہ داری جس کا عمل درآمد ججوں کے ذریعہ کیا جائے۔

ریاست کے فرائض کے تعلق سے موہن رائے کا رویہ تجربے پر مبنی تھا۔ وہ انفرادی ملکیت کے حق میں یقین رکھتے تھے۔ اور اُن کا خیال تھا کہ زمین فرد کی ہوتی ہے نہ کہ ریاست کی۔ چونکہ ایک مضبوط متوسط طبقے کے حق میں تھے اس لئے زمینداری نظام کو رعیت داری پر ترجیح دیتے تھے۔ لیکن ایک طرف تو وہ یہ چاہتے تھے کہ بندوبست استمراری کی توسیع کی جائے اور دوسری طرف وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ کسانوں کا لگان بھی اسی طرح مقرر کر دیا جائے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ فوجی بجٹ اور انگلستان میں کئے جانے والے اخراجات میں تخفیف کر کے عوامی صرف میں کمی کی جائے۔

اُصول عدم مداخلت کے نظریے کے برعکس اُن کی خواہش تھی کہ ریاست لوگوں کو تعلیم دے کر اور ستی کی طرح کی سماجی خرابیوں کے خلاف قانون بنا کر سماجی بھلائی کے مثبت اقدامات کرے۔

قومی یکجہتی میں گہری دلچسپی رکھنے والے مرید کی حیثیت سے انھوں نے بغیر کسی تعصب کے اور بھائی چارے کے جذبے کے ساتھ ہندو مسلم تعلقات کے سوال پر غور کیا۔ مسلمانوں کے ہندوستان کو فتح کرنے کے بارے میں انھوں نے لکھا ''غزنی اور غور کے مسلمانوں نے ملک کو سیکڑوں چھوٹی بڑی سلطنتوں میں بٹا ہوا دیکھ کر، جن سے اُن کی رعایا نفرت کرتی تھی، باری باری سے انھیں فتح کر لیا اور اپنی حکومت کے ظالمانہ نظام کو رواج دیا۔ مسلم حکومت کی انفرادی اور من

مانی نوعیت کو ناپسند اور اُس کی غیر قانونی اور ظالمانہ کارروائیوں کی مذمت کرنے کے باوجود انھوں نے تسلیم کیا ''کہ سابق مسلمان حکمرانوں کے زمانوں میں اسی ملک کے باشندوں کو مسلمانوں کے ساتھ ہر قسم کا سیاسی حق حاصل تھا۔ ریاست کے اعلیٰ ترین عہدوں کے لئے اُن کا انتخاب کیا جاسکتا تھا۔ فوجوں کی کمانڈر اور صوبوں کی حکومتیں اُن کے سپرد کی جاتی تھیں اور اکثر وہ حکمرانوں کے مشیر مقرر کئے جاتے تھے۔ اس سلسلے میں اُن کے مذہب یا جائے پیدائش کی بنا پر کوئی ذلت آمیز امتیاز نہیں برتا جاتا تھا انھیں معافی کی آراضی جس پر کوئی مال گزاری نہیں دینی پڑتی تھی اور حکومت کے تحت بڑی سے بڑی تنخواہوں کے ساتھ وہ ملک کے اُن بڑے بڑے علاقوں سے بھی کوئی رقم ادا کئے بغیر مستفید ہوتے تھے جو اعلیٰ اور قابل اعتماد عہدوں سے منسلک تھے اور باعلم اور باصلاحیت لوگوں کو بڑی تنخواہوں اور حیثیت کے عہدے دے کر نوازا جاتا تھا'' لیکن مسلمانوں کی حکومت پر ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کو ترجیح کی وجہ یہ تھی کہ ''سیاسی حیثیت اور طاقت کھو دینے کے باوجود (ہندوستانی) اپنے آبا واجداد کے مقابلے میں اس بات سے زیادہ خوش ہیں کہ انھیں سول اور مذہبی آزادی حاصل ہے۔ مسلمانوں کی حکومت کے متعلق اُن کی اس رائے کو اُن کے موجودانہ مذہب اور مساوات پر مبنی سماجی نظام نے تقویت پہنچائی۔''

اُن کی بین الاقوامیت

سیاست میں رام موہن رائے تنگ نظر نہیں تھے۔ چاہے اُن کے ہم وطن ہوں یا دوسرے ملکوں کے لوگ وہ سب کے لئے آزادی کے خواہاں تھے۔ اُن کے لئے تمام انسان ایک خاندان کی طرح تھے اور وہ ایک قوم کی خوشی یا غم کو پوری دنیا کی خوشی یا غم سمجھتے تھے۔ مثال کے طور پر آسٹریا کے لوگوں نے اسپین کے باسیوں کی آزادی چھین لی۔ تو انھیں اتنا دُکھ ہوا کہ ایک دوست کی دعوت میں شرکت کرنے سے انھوں نے انکار کردیا۔ جب انھوں نے سُنا کہ اسپین میں دستوری حکومت قائم ہوگئی تو انھوں نے ٹاؤن حال میں ایک شاندار دعوت کا انتظام کیا۔ 1830 کے انقلاب فرانس کی خبر سُن کر وہ اتنے زیادہ خوش ہوئے کہ درد کے باوجود سہ رنگا جھنڈا اُڑانے والے فرانسیسی نزیگٹ پر گئے جو خلیج پٹل میں لنگر انداز تھا۔ انگلستان میں جس وقت رفارم بل (اصلاحات

کے بل) پر بحث ومباحثہ ہورہا تھا اور یہ نہیں معلوم تھا کہ اُس کا حشر کیا ہوگا۔ اُس وقت انھوں نے عہد کیا کہ بل اگر نامنظور ہوگیا تو انگلستان کے ساتھ وہ اپنے تعلقات ختم کردیں گے۔ فرانس کے اُمور خارجہ کے وزیر کے نام ایک خط میں انھوں نے لکھا تھا۔ تمام انسان ایک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اور بہت سی موجودہ قومیں اور قبیلے محض اُس خاندان کی شاخیں ہیں[1] اُس خط میں انھوں نے تمام قوموں کی کانگریس منعقدہ کرنے کا منصوبہ بھی پیش کیا تھا۔ یہ بات صرف وہی شخص کرسکتا تھا۔ جس کی ہمدردیاں سب کے ساتھ ہوں۔ اور جو انسان کے مقدر میں بڑی دلچسپی اور دور تک دیکھنے والی نظر رکھتا ہو اور لیگ آف نیشنز سے سو سال پہلے ایسا عالمی تنظیم کا منصوبہ بنا سکتا ہو۔ یہ صحیح ہے کہ ''نسلاً بعد نسل برقرار رہنے والی امن اور دوستانہ جذبات'' کا رام موہن رائے کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا۔ لیکن آئندہ کی تباہی کے خطرے کے خلاف انسان کے پاس اگر کوئی اُمید کا چراغ ہے تو وہ یہی تصور ہے۔

برہمو سماج

رام موہن رائے محض تقریر و تحریر کو کافی نہیں سمجھتے تھے۔ اپنی مذہبی اور سماجی اصلاحات کو دوامی شکل دینے کے لئے انھوں نے ایک انجمن بنانے کا منصوبہ تیار کیا جس کے پابندیوں کے ساتھ جلسے ہوں۔ اور ہندوؤں کی مقدس کتابوں میں درج اصولوں کے مطابق باجماعت عبادت کی جائے یعنی مقدس منتروں اور بھجنوں کو پڑھنا اور سُننا، مذہب کی عظیم حقیقت کو بیان کرنا اور اُس پر عذر کرنا، خدا کی اچھائی اور طاقت پر غور وفکر کرنا، ادنیٰ جذبات اور اُس قادر مطلق کا قرب حاصل کرنے کے لئے مراقبہ کرنا جو کائنات کا حاکم ہے۔

اس سلسلے میں پہلا تجربہ تھا۔ 1816 میں اُلمتہ سبھا کا قیام۔ اس انجمن کی رکنیت ہر مذہب کے ساننے والوں کے لئے کھلی ہوئی تھی۔ اس کے جلسوں میں ویدکی مناجاتیں پڑھی جاتی تھیں اور بھجن گائے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ ساز ایک مسلمان غلام عباس بجایا کرتا تھا۔ ناصحانہ تقریروں کے لئے عالموں کو مدعو کیا جاتا تھا۔ 1826 میں تجربے کا مرحلہ ختم ہوگیا۔ اور برہمو سماج

---

[1] ایضاً صفحہ 117

کی بنیاد پڑ گئی۔ وقت کی دستاویز میں جس کی رو سے سماج کا قیام عمل میں آیا اور عطیات دینے والوں یعنی رام موہن رائے ، دوارکا ناتھ ٹیگور، پرسنا کمار ٹیگور، کالی ناتھ رائے اور رام چندر دیا وگش کی جائداد سوسائٹی کے تین متولیوں کے سپرد کردی گئی۔ سماج کے اغراض و مقاصد اور وقت کی شرائط کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس نے ہندوؤں کی مذہبی تاریخ میں ایک انقلاب برپا کردیا۔ جس کا مقابلہ سولھویں صدی کی بھگتی تحریک کے غیر معمولی واقعات سے کیا جاسکتا ہے۔ اس سماج کا مقصد تھا ''اُس دوامی نا قابل تلاش اور نا قابل تغیر ذات کی عبادت جو کائنات کی خالق اور نگہبان ہے۔'' اُس کے حدود میں کوئی شبیہ، مورتی یا بُت۔ پتھر یا لکڑی کی بنی ہوئی شکل، مصوری کا نمونہ، تصویر یا کسی کے شائبہ کوئی چیز لانے کی اجازت نہیں تھی اور کسی جاندار کی قربانی، کھانے پینے اور کسی مذہب کو بُرا بھلا کہنے کو برداشت نہیں کیا جاتا ہے۔

برہموسماج کے عقائد اور اس کا عبادت اور خدائی خدمت کا طریقہ کچھ اس نوعیت کا تھا کہ اُس میں محض بنگال کے دانش وروں کے لئے کشش تھی۔ لیکن متوسط طبقے کے اُن حصوں میں زیادہ مقبول نہیں تھی جو جدید خیالات سے زیادہ متاثر نہیں تھے اور غیر تعلیم یافتہ عام لوگوں میں تو بالکل مقبول نہیں تھے۔ حالانکہ یہ تحریک عوامی نہیں تھی۔ پھر بھی اُس کا اثر دور تک سرایت کر گیا۔ اس لئے کہ اس کے پیرو بنگال کے سرکردہ اشخاص تھے جن کی سماج میں اونچی حیثیت تھی۔

رام موہن رائے نے اپنی زندگی کے آخری تین سال یورپ اور زیادہ تر انگلستان میں گزارے جہاں وہ نیا مذہبی اور سیاسی کام کرتے رہے۔ ایک عظیم ہندوستانی رہنما کی حیثیت سے انگلستان میں سماج کے مختلف حصوں نے اُن کا خیر مقدم کیا۔ 1833 میں برسٹل میں اُن کا انتقال ہندوستان کے لئے ایک بڑا سانحہ تھا جس نے کارہائے نمایاں کا سلسلہ ختم کردیا۔ جن سے ہندوستان کی توقعات وابستہ تھیں۔

ان کی تحریک اور قیادت سے محروم ہونے کے بعد برہموں سماج پستی کا شکار اور جھگڑوں میں مبتلا ہو گیا۔ دوارکا ناتھ ٹیگور، جن کے سپرد اس کا انتظام تھا پوری توجہ نہیں دے پائے تھے۔ اُس کے بعد اُن کے بیٹے رابندر ناتھ ٹیگور 1843 میں برہموسماج میں شامل ہو گئے۔ لڑکپن

میں انھوں نے رام موہن رائے کو متاثر کیا تھا۔ اور نوجوانی میں اس قسم کی انجمنوں کی رکنیت قبول کر کے جیسے عام معلومات حاصل کرنے کی انجمن اورٹٹوابودہنی سبھا، عوامی سرگرمیوں میں دلچسپی کا اظہار کیا تھا۔ انھوں نے اس کو نئی زندگی عطا کر دی۔ انھوں نے بنگال کے اضلاع میں اُس کی شاخیں قائم کیں۔ اہم شہروں میں مُبلغوں کا تقرر کیا اور اکشے کمار دت کی ادارت میں سماج کے ارگن کے طور پر ٹٹ وابودھنی پتریکا کی اشاعت شروع کی۔

سماج میں فرقہ بندی

رام موہن رائے کے انتقال کے بعد الگزینڈر ڈف کی قیادت میں عیسائی مشنریوں نے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی نظروں میں ہندودھرم کو گرانے کی کوشش بڑھادیں اور عیسائی بنانے کی مہم تیز کر دی۔ سماج اور پتریکا نے اس چنوتی کا مقابلہ کیا۔ برہمو مذہب پر ذہنی پستی کا جو الزام لگایا جاتا تھا اُس کو دور کرنے کے لئے راج نرائن بوس نے اس کی عبادت میں مذہبی جوش پیدا کرنے کی کوشش کی۔ سماج کے عقائد اور اصولوں کو صحیح ثابت کرنے کے لئے اُن کی حمایت میں مضامین اور کتابیں شائع کی گئیں۔ اور رسوم کی وضاحت کرنے کے لئے عہد و پیماں کا تعین کیا گیا۔ لیکن عیسائیوں کے ساتھ نزاعی بحث کی وجہ سے ویدوں کے غلطی سے بری ہونے کے سوال پر سماج فرقوں میں بٹ گیا۔ ربندرناتھ چاہتے تھے کہ سماج کا وہ بنیادی کردار باقی رہے جو رام موہن رائے نے متعین کیا تھا۔ اے۔ کے۔ دت وغیرہ کی طرح کے زیادہ شدت پسند عناصر سے انھیں اختلاف تھا۔ انھوں نے اُس کے رسموں کو ایسی شکل دی جو کٹر ہندو طریقوں سے زیادہ مطابقت رکھتی تھی۔

نوجوان شدت پسندوں کو کیشپ چندر سین 1858 میں سماج کے رکن بن گئے تھے۔ ایک ایسا رہنما مل گیا جو اُن کے سماجی اور مذہبی اصلاحات کے مطالبے سے ہمدردی رکھتا تھا۔ سماج نے اعتدال پر مبنی جو پروگرام منظور کیا تھا وہ اُس سے بہت آگے بڑھ گئے۔ 1866 میں فرقے نمودار ہوئے اور رابندرناتھ ٹیگور کا فرقہ جو آدمی برہموسماج کہلاتا تھا۔ کیشپ چندر سین کے فرقے سے علیحدہ ہو گیا۔ جس نے ہندوستان کا برہموسماج یا نوودھیان کا نام اختیار کیا۔

V ہندوستان کا جدید ذہن اور سیاسی سرگرمی کی ابتدا

قدامت پسندوں، شدت پسندوں اور لبرلوں نے اپنے اپنے طریقے سے ہندوستان کے لوگوں کے ذہنوں میں جدید رجحانات پیدا کرنے میں مدد دی۔ ہندوستانیوں کے روایتی انداز فکر وعمل اور مغربی تہذیب کے ٹکراؤ سے جو مسائل پیدا ہوئے اُن کو اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق حل کرنے کی کوشش انھوں نے کی لیکن اس کی وجہ سے خود تنقید کا سلسلہ شروع ہوا اور ہندوستان کی انفرادیت کا شعور پیدا ہوا جو مغربی قوموں کی انفرادیت سے مختلف تھی۔ اس اختلاف کے علم کے ساتھ ہندوستانی نظریے کی مذہبی بنیاد کی آزادی اور ہندوستانی سماج کے آزاد ذہن پر اُس کے اثرات سے بھی آگاہی ہوئی۔

چنانچہ نئے متوسط طبقے کے دانش وروں کی اگرچہ اصل دلچسپی تو اس دنیا اور اُس دنیا میں انسان کے مقدر کے بنیادی مسائل پر مرکوز تھی پھر بھی ملک کے سماجی اور سیاسی مسائل سے اُن کی وابستگی ناگزیر تھی سماجی مسائل کے حل کے تعلق سے ان میں نقطۂ نظر کا اختلاف تھا۔لیکن جہاں تک سیاسی مسائل کا تعلق تھا یہ اختلافات بہت زیادہ نہیں تھے۔

اُن میں سے زیادہ جوشیلے اور سب سے زیادہ صاف گوئی سے کام لینے والے تھے۔ شدت پسند اُن میں یکساں روی پائی جاتی تھی اور سیاسی سماجی مذہبی اصلاحات کے معاملے میں وہ بڑی سختی سے کام لیتے تھے۔ وہ رجعت پرستی، قدامت پرستی کی مخالفت میں، چاہے وہ ہندوستانی ہو یا برطانوی، کوئی سمجھوتا نہیں کرتے تھے۔ وہ بینتھنم کے اصول آزادی میں یقین رکھتے تھے۔ ان کا نقطۂ نظر وسیع اور سیکولر تھا۔ اور وہ جمہوری طریقوں کو ترجیح دیتے تھے۔ معاشی پالیسیوں میں وہ عوام مداخلت کے حق میں تھے۔ اور تجارت کے کاروباری طریقوں کے خلاف تھے۔ وہ جولائی 1830 کے انقلاب فرانس کے مداح تھے۔ اور ہندوستان کے لئے بھی ایسا ہی انقلاب چاہتے تھے۔ اُن کے ذہنوں نے ہندوستان کو ایک مجموعی اکائی کے طور پر تسلیم کر لیا تھا۔ اور اُن کے دل وطن پرستی کے جذبات سے لبریز تھے۔ شدت پسند شاعر کاشی پرشاد گھوش کے لئے ہندوستان ''دیوتاؤں کی سرزمین'' تھا۔ اور ''میرا وطن'' تھا۔ اور وہ مبارک آزادی کی منزل تک ہندوستان کے پہنچنے کے

خواب دیکھا کرتے تھے۔

شدت پسندوں کی سرگرمیاں بہت پھیلی ہوئی تھیں۔ اُن میں سے ایک تھی۔ اکیڈمک ایسوسی ایشن جس کا ذکر کیا جاچکا ہے۔ جس کے صدر تھے تار چند چکرورتی۔ اس انجمن کے دوسرے عہدہ دار تھے رام گوپال گھوش، پیارے چندر مترا اور رام تنولاہری اس کے جلوس میں بہت سے موضوعات پر پرچے پڑھے جاتے تھے۔ جن میں سیاست بھی شامل تھی۔ ان میں ایک پرچے ''ایسٹ انڈیا کمپنی کی عدالت، فوجداری اور پولیس کی موجودہ حالت'' پر خاصہ ہنگامہ ہوا۔ پرچے میں کہی جانے والی باتوں پر پرنسپل رچرڈسن نے احتجاج کیا اور انجمن کے صدر تاراچند چکرورتی نے اُسے رد کردیا۔ ایک اور انجمن تھی۔ تھیوفلن تھرویک سوسائٹی کشور چندر مترا نے اس کو 1843 میں قائم کیا تھا۔[1]

ایسے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے شدت پسندوں نے دوسرا طریقہ استعمال کیا وہ تھا رسالوں اور اخباروں کی اشاعت۔ جن کا ذکر پہلے کیا جاچکا ہے۔ اُن کے علاوہ تھے یار تھنین، گیاوسال بنگال، اسپکٹیٹر، ہندو پانیر انکوائرا ور کویل۔ اُن کے مضامین نے بنگال میں سیاسی شعور پیدا کرنے میں بڑی مدد دی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ 1833 کے چارٹر ایکٹ اور بینٹک کی لبرل پالیسی نے دستوری تحریک اور حکمرانوں کے اچھے ارادوں کے متعلق رام موہن رائے کے خیال کے تصدیق کردی۔ لیکن بینٹک کے بعد ردعمل شروع ہوا۔ رفتہ رفتہ سیاسی شعور رکھنے والے گروپ مایوس ہونے لگے۔ حکومت کے اقدامات کی تنقید اور خود کفالت کے مطالبے میں شدت پیدا ہونے لگی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاسی طاقت کو ختم کرنے، ہندوستانی مجلس قانون ساز قائم کرنے اور عدالتی نظام میں اصلاح کرنے کے لئے آوازیں اٹھنے لگیں۔ تعلیم پھیلانے اور تکنیکی اسکول قائم کرنے، سول آزادی کا تحفظ کرنے، زمینداروں کی مداخلت بیجا کے خلاف کسانوں کے حقوق کا دفاع کرنے او راعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کا تقرر کرنے کے مطالبے بڑھ گئے۔ رعایا کی طرف حکومت کے فرائض یاد دلائے جانے لگے۔ جن کی خوشحالی کا انحصار اُس کی کارروائیوں پر تھا۔ لوگوں کے قدرتی

---

[1] دی کلکتہ ریویو، دسمبر 1844

حقوق پر زور دیا جانے لگا اور اس پر بھی زور دیا جانے لگا کہ حکومت لوگوں کی مرضی پر منحصر ہوتی ہے۔ وہ لوگ کہتے تھے کہ حکومت کے اختیارات کو عام لوگ تصدیق کرتے ہیں۔ اور اس لئے لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ ان کا ایک نمائندہ مجلس قانون سازی کے ذریعے حکومت کے کاموں میں حصہ لیں۔

اکشے کمار کی جوشدت پسندوں کے ارگن ٹٹ وابودھینی پتریکا کے مدیر تھے۔ وطن کی محبت سے سرشار تھے۔ اُن کا ذہن مغربی فلسفے اور ادب سے بھرا ہوا تھا۔ ریاستی سرگرمی کے متعلق وہ ترقی یافتہ تصورات رکھتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ حکومت سماج کا ایجنٹ ہوتی ہے۔ اور محاصل وصول کرنے کے اس کے حق کی بنیاد ہے افراد کی جان، عزت اور جائیداد کی حفاظت اور مادی، اخلاقی اور روحانی طور سے سماج کی ترقی۔ یہ حکومت کا کام ہے کہ وہ غربت کو دور کرے، دو سال سے پندرہ سال کی عمر تک مفت اور جبری تعلیم مہیا کرے اور شادی، خاندان وغیرہ کی طرح کے سماجی رواجوں میں اصلاح کرے۔

دت حکومت پر شدید تنقید کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ کمپنی کی حکومت میں جرائم بڑھ گئے۔ لوگوں کی تندرستیاں خراب ہوگئیں۔ مذہب کی بیخ کنی ہوئی، قیمتیں بڑھ گئیں۔ اور عام لوگ دکھوں میں مبتلا ہوگئے۔ لوگوں کے دکھوں کا سبب تھا بدیسی حکومت۔

رام موہن رائے کے شاگرو سماج میں بڑا اثر رکھتے تھے۔ اُن میں سب سے اہم تھے ٹیگور خاندان کے افراد (دوارکا ناتھ اور اُن کے بیٹے ربندر ناتھ اور ہرشنا کمار) سینسرا برادران (پیارے چند اور کشوری چند)، ہندو پیٹریاٹ کے دو مُدیر (گریش چندر گھوش اور ہریش چندر مکھرجی) اور رام گوپال گھوش سیاسی میدان میں کچھ اور لوگ بھی اُن کے ساتھ کام کرتے تھے۔

مجموعی اعتبار سے رام موہن رائے کے تصورات کے حامی تھے۔ حالانکہ کچھ معاملات میں انھیں اختلاف بھی تھا۔ مثلاً ہندوستان میں مجلس قانون ساز کا قائم یا ملک میں یورپین لوگوں کی آبادکاری۔ لیکن کام کرنے کے طریقوں میں وہ بڑی وفاداری کے ساتھ اپنے رہنما کی پیروی کرتے تھے لوگوں کی شکایتوں کو دور کرنے کے لئے وہ جلسے کرتے تھے۔ اور عرضداشتیں اور یاد داشتیں پیش کرتے تھے۔

اپنی سرگرمیوں میں انھیں قدامت پرستوں کی حمایت بھی حاصل ہوتی تھی۔ مثال کے طور

پررادھا کانت، دیب رام کمل سین اور بھوانی چرن بندیا پادھیہ نے انجمنوں کے کام میں حصہ لیا۔قومی معاملات میں لوگوں کی دلچسپی بڑھانے کے لئے انھوں نے تحریر وتقریر سے کام لیا۔

بنگال کے جو اخبار شدت پسندوں اور لبرلوں کے تصورات کی اشاعت کرتے تھے وہ تھے سمواد کوٹری، گیانن وشان، سمبر پربھاکر، بنگال اسپکٹیٹر ،ٹٹ وابودھینی پتریکا وغیرہ۔

انگریزی زبان کے اخباروں میں ریفارمر، ہندو انٹیلی جینس اور بنگال ریکارڈ 1848 نے اس سلسلے میں بیش بہا خدمات سرانجام دیں۔

VI مغربی ہندوستان میں سماجی اصلاح

مرہٹوں کے تحت مغربی ہندوستان کی سیاسی تاریخ بنگال کی تاریخ سے مختلف تھی۔اٹھارھویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں پیشواؤں نے اپنی حکومت کی توسیع نہ صرف مرہٹوں کی سرزمین بلکہ وسطی ہندوستان کے ایک بڑے حصے پر بھی کرلی تھی۔ اُس کے بعد دہلی دوآبے کے معاملات میں دخل دینا شروع کیا اور ایک وقت تو پنجاب تک بھی پہنچ گئے۔لیکن 1761 میں مرہٹہ سلطنت کو دھکا پہنچا اور سرداروں پر اُس کی گرفت ڈھیلی ہوگئی۔آپسی جھگڑوں کی بنا پر انگریزوں کو مداخلت کرنے کا موقعہ مل گیا اور 1818 تک اُن علاقوں کا الحاق انگریزوں نے کرلیا جن پر پیشوا حکومت کرتا تھا۔اور خود مختار مرہٹہ سرداروں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرلیا۔ چنانچہ انگلستان کی فتح کے 75 سال بعد مرہٹوں کے علاقوں پر انگریزوں کی حکومت ہوگئی۔

لیکن پیشواؤں کی سولہ سالہ حکومت نے لوگوں کے حالات میں کوئی واضح تبدیلی نہیں کی تھی۔معاشی اعتبار سے مہاراشٹر کی حالت بنگال سے بدتر تھی۔صنعت اور زراعت دونوں میں وہ پس ماندہ تھا۔اور اُس کی تجارت چاہے وہ بدیسی ہو یا داخلی محدود تھی۔اس کے باوجود حکمرانوں اور رعایا میں کوئی نسلی ،لسانی اور مذہبی اختلافات نہیں تھے۔سماج پر جمود طاری تھا۔فکر میں کوئی حرکت نہیں تھی۔اور عقائد اور اداروں میں کوئی ترقی نہیں تھی۔لوگ اوہام پرستی میں مبتلا تھے اور ذات پات کے معاملے میں بڑی سختی برتی جاتی تھی۔انگریزوں کے خلاف جدوجہد حیات میں سماج اور ریاست کی کمزوری پوری طرح ظاہر ہوگئی۔

انگریزوں کی فتح کا اثر مہاراشٹر پر اتنا انقلابی نہیں تھا۔ سیاسی اعتبار سے بالائی حکمراں طبقے کے جو زیادہ تر برہمنوں پر مشتمل تھا، ان کے ہاتھوں سے طاقت نکل گئی۔ اُس علاقے کی معیشت میں زمین کے رعیت داری نظام کی بنا پر مالکان آراضی کا بالائی متوسط طبقہ وجود میں نہ آسکا۔ زمین زیادہ زرخیز نہیں تھی، جس کی بنا پر تجارت نہ بڑھ سکی۔ صرف کپاس ہی ایک ایسی پیداوار تھی جس نے مفت کے فروغ میں مدد دی۔ تعلیم پھیلنے کی رفتار سُست تھی۔ اور ایک ایسے سماج میں مغربی اثر زیادہ سرایت نہ کر سکا جس میں متوسط طبقہ کمزور تھا۔

1818 میں لوگوں پر مغربی اثرات پڑنے کے لئے میدان تیار ہوگیا۔ مفتوح علاقے پر حکومت کا برطانوی نظام قائم ہوگیا۔ ملک کی آمدنی کے ذرائع کے متعلق تفتیش و تحقیق کی جانے لگی۔ عدالتوں کا قیام عمل میں آیا۔ اور ان کی ہدایت کے لئے ضوابط تیار کئے گئے۔ تعلیمی حالات کے بارے میں بھی تحقیق کی گئی اور گورنر کی صدارت میں 1832 میں بمبئی نیو اسکول اینڈ بک سوسائٹی قائم کی گئی۔ الفنسٹن، جو بمبئی پریسیڈنسی کا نیا گورنر مقرر کیا گیا تھا (1819 لغایت 1827) جانتا تھا کہ نئے حکمرانوں کے تحت تبدیلی ناگزیز ہے۔ لیکن اُس کی خواہش تھی کہ ماضی سے رشتہ یک لخت نہ توڑا جائے اور اُس نے ماتحتوں کو رائے دی کہ جن لوگوں کی دیکھ بھال اُن کے سپرد ہے اُن کے جذبات کا احترام کیا جائے۔

الفنسٹن کی احتیاط اور مہاراشٹر کے تمام قدامت پسندانہ ماحول نے سماجی ترقی کی رفتار سُست کردی۔ لیکن برطانوی حکمرانوں نے جس نئی تعلیم کو رواج دیا اُس نے اور مشنریوں کی سرگرمیوں نے لوگوں کے ذہنوں کی کھڑکیاں کھول دیں۔ اور وہ اپنے قدیم اداروں پر شک وشبہ کرنے لگے۔ مرہٹہ عالموں کی نئی نسل مغرب کی معقولیت پسندی سے طبعی سائنسوں میں اُس کی ترقی سے اور اُس کی صنعت و تکنیک اور سیاسی اور انتظامی تنظیم سے بہت متاثر ہوئی تھی۔ فزکس، کیمسٹری، جغرافیہ، تاریخ انگلستان، جسمانی ساخت کی تشریح کے علم وغیرہ کے مطالعے نے تعلیم یافتہ لوگوں کو اظہار رائے کے لئے معیارات مہیا کردیے۔ وہ سماجی نابرابری، اُس کے تہذیبی جمود اور اخلاقی گراوٹ کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے تھے۔ عیسائی مذہب کی تبلیغ کے جوش میں عیسائی مشنری ہندو دھرم کے طریقوں پر حملے کرتے تھے۔ اور تعلیم یافتہ لوگ اس پر

مجبور ہوجاتے تھے کہ وہ اپنے قدیم مذہبی تصورات، سماجی رواجوں اور اداروں کا جائزہ لیں۔ انھوں نے اپنی سماجی زندگی کو معقولیت کی روشنی میں دیکھنے، نابرابری کو دور کرنے اور مذہب اور رواجوں میں اصلاح کرنے کی کوشش کی۔

اعتدال پسند مصلحین

اصلاح کی تحریک میں جگن ناتھ شنکر شیٹ، بال شاستری جمبیکر، وشنو شاستری باپت اور کرشنا شاستری چپ لنکر وغیرہ پیش پیش تھے۔ بال شاستری کے آباواجداد پڑھے لکھے پجاری تھے جو دولت مند خاندانوں میں پران پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ 1812 کے اواخر میں بال شاستری پیدا ہوئے اپنے والد کی نگرانی میں انھوں نے جلد ہی مرہٹی اور سنسکرت پڑھا اور سیکھ لیا۔ 1835 میں اس کم عمر لڑکے کو اُن کے رشتہ دار مزید تعلیم کے لئے بمبئی لے گئے۔ اور نئے قائم ہونے والے انگریزی اسکول میں بھرتی کر دیا۔ وہ نہایت ذہین اور محنتی تھے۔ جلد ہی انھوں نے تمام مضامین میں دسترس حاصل کر لی اور تمام انعامات جیت لیے۔ سترہ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے انھوں نے نہ صرف مرہٹی اور سنسکرت بلکہ انگریزی، گجراتی، بنگالی اور فارسی بھی سیکھ لی۔ اسکول میں ان کے شاندار کارناموں کی بنا پر وہ 1830 میں اسکول بک سوسائٹی میں نیو اسسٹنٹ کے عہدے پر تعنیات ہوگئے۔ اور اپنے روزی رسالوں کے ذریعہ وہ بمبئی کے یورپین عالموں کے سب سے ترقی یافتہ حلقے سے متعارف ہوگئے۔ اُن کے وسیع مطالعے اور مغربی عالموں کے ساتھ اُن کے ربط وضبط نے اُن کی نظر میں وسعت پیدا کر دی اور اُن کے سماجی شعور کو بیدار کر دیا۔ انھوں نے طالب علموں کے لئے اخلاقی اور عام معلومات کی کتابوں کے ترجمے کئے اُس کے بعد انھوں نے ایک سے زیادہ حوصلہ مندانہ اور مفید اقدام کیا، مرہٹی میں ایک ہفتہ وار اخبار بمبئی درپنس نکالنا شروع کیا جس کا پہلا شمارہ 12 نومبر 1832 کو شائع ہوا۔ اور پھر انھوں نے رگ درشن 1840 میں شروع کیا۔

درپن کے پہلے شمارے میں بال شاستری نے لکھا ''اُس ملک میں جہاں سے ہمارے حکمراں آتے ہیں اُس عجیب وغریب مشین کی طاقت سے کام لیا جاتا ہے جس کو اخبار کہتے ہیں۔ یہ لوگوں کے ذہنوں سے غلطی اور جہالت کے اندھیروں کو دور کر رہے ہیں۔ انھیں علم کی

روشنی بخش رہے ہیں۔ اُن تمام ملکوں میں جہاں وقفے وقفے سے چھپنے والے جریدے خریدے اور پڑھے جاتے ہیں۔ لوگوں نے اُن سے بہت فوائد حاصل کئے ہیں۔ انھوں نے ادب اور سائنس کو فروغ کیا ہے اور اُن کی ہمت افزائی کی ہے۔ اُن کی وجہ سے لوگوں کے اخلاق سدھرے ہیں۔ ایک طرف انھوں نے رعایا کو اطاعت کا سبق دیا ہے اور دوسری طرف حکمرانوں کو مطلق العنان اور من مانے طریقے اختیار کرنے سے باز رکھا ہے۔''[1] اُس مضمون میں انھوں نے مزید لکھا ہے ''ہندوستان کے اس حصے میں بھی انگریزی حکومت کے قیام کو زیادہ مدت نہیں ہوئی ہے۔ پھر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو جہالت اور اندھیرے یہاں مدتوں سے چھائے ہوئے تھے وہ دور ہونے لگے ہیں اور وہ دن دور نہیں ہے جب ہم اُن تمام خوبیوں میں اپنے مغربی بھائیوں کا مقابلہ کر سکیں گے جن میں آج وہ ہم سے آگے ہیں۔''[2] انھوں نے کہا کہ درشن کو شروع کرنے کا مقصد تھا ''ذہنوں کو سدھارنا اور مفید علم کی ترویج میں مدد دینا۔''

مہاراشٹر میں مغرب کی لبرل تعلیم کی پہلی پیداوار تھے بال شاستری۔ وہ صرف 34 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ اُن کی عمر نے وفا نہیں کی۔ اور اُن کی ذہنی صلاحتیں پوری طرح نشوونما نہ پا سکیں۔ لیکن اس چھوٹے سے وقفے میں انھوں نے مغربی تعلیم کو مقبول بنانے کی کوشش کی۔ انھوں نے سماجی اصلاح کا کام بھی کیا۔ بیواؤں کی شادیوں، عورتوں کی تعلیم اور دوسرے مذاہب اختیار کر لینے والوں کو دوبارہ ہندو دھرم میں شامل کرنے کی وکالت کی۔ لیکن بال شاستری اور اُن کے ساتھیوں نے اپنی روایت کو ترک نہیں کیا۔ انھوں نے ایسی تبدیلیوں کی سفارش کی جو طریقہ کار اُن مذہبی حکام کے مطابق بنا دیں جن کو رواجوں کے دباؤ میں آکر بھلا دیا گیا تھا۔

شدت پسند

نئی تعلیم پانے والوں میں شامل کچھ باغی اُن اعتدال پسند اصلاحات سے مطمئن نہیں تھے جن کی وکالت شاستری کا مکتب فکر کرتا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ قدیم ہندو روایت اپنی افادیت کھو چکی ہیں۔ جدید ضروریات کے مطابق قدیم روایتوں کی تشریح کو وہ غلط اجتہاد سے تعبیر کرتے

---

[1] جھمبیکر جی۔ Moments and Writing of Bal Shastri (1813 سے 1842) جلد دوم، صفحہ 6

[2] ایضاً، صفحہ 8

تھے۔عیسائی مذہب کی اخلاقی تعلیمات سے وہ متاثر تھے۔چونکہ کائنات کا خالق خدا ہے اس لئے کرشن، بودھ، یسوع اور محمدؐ اُس کے شارح ہیں۔ چنانچہ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ دنیا میں انسان کا صرف ایک مذہب ہونا چاہیے۔جس کی بنیاد ہوں تمام مذاہب کی اخلاقی تعلیمات، رام بال کرشن جیکر، دادو پنڈورنگا تارکھڑ اور اُن کے بھائی آتمارام پنڈورنگا نے 1850 کے لگ بھگ بمبئی میں پرم ہنس منڈلی قائم کرنے میں پہل کی۔اس انجمن کے بنیادی اصول تھے خدا کی وحدانیت اور انسانی برادری۔منڈلی فرد کے اخلاق کو سدھارنے میں دلچسپی لیتی تھی اور قدیم رواجوں اور رسموں کی مذمت کرتی تھی۔انسانی زندگی کے رہنما اصولوں کی حیثیت سے یہ خیرات، سچائی سے پیار، پاک بازی اور رواداری پر زور دیتی تھی۔حالانکہ وہ متاثر تو تھے عیسائی مشنریوں کے کام سے۔مگر وہ اپنا پیغام پھیلاتے تھے مرہٹہ سنتوں کی زبان میں۔لیکن اس کے اراکین رسوائی سے خائف تھے۔اور خفیہ طور سے کام کرتے تھے۔اس تحریک کی آزاد فلسفیانہ بنیاد کبھی نہیں بن سکی۔اور وہ عیسائی رسوم کی ضرورت سے زیادہ نقل کرتے رہے۔اس کے بانیوں میں مشنریوں کی طرح کا کردار اور لگاؤ نہیں تھا۔اور عام لوگ اُن کی طرف سے مشکوک ہوگئے۔1818 میں انجمن ختم ہوگئی۔

مہاراشٹر میں سماجی اصلاح کے ایک بلند قامت چمپئن تھے۔گوپال ہری دیش لکھ جو اپنے اس نام سے زیادہ مشہور ہوئے جو وہ تحریر میں استعمال کرتے تھے۔یعنی ''لوک ہت وادی'' 1833 میں وہ ایک چھوٹے سے جاگیردار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اور زوال پذیر حالات کے تحت پونا میں پرورش پائی۔شہر کی پھیلی ہوئی خوشحالی ختم ہو چکی تھی۔اور برہمنوں اور جاگیرداروں کا خصوصیت کے ساتھ برا حال تھا۔ بالائی طبقوں میں اس پر بحث ہوتی رہتی تھی کہ انگریزی حکومت ہمیشہ قائم رہے گی یا پیشوا ایک دفعہ پھر حکمراں بنے گا۔سماج میں قسمت پرشا کر رہنے کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔جس نے بے حسی پیدا کر دی تھی۔ ''لوک ہت وادی'' کے سپرد فطرت نے یہ کام کیا کہ وہ ان بے معنی تصورات اور بچکانہ خوابوں کو ختم کریں۔لوگوں کے اندر خود کفالت اور نئی تعلیم حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کریں اور ان میں عقل پرستی اور برطانوی فتح کی اہمیت کو سمجھنے کا احساس جگائیں۔

گوپال ہری نئی منزل اور مغربی تعلیم کے پیداوار تھے۔پونا کے نئے گورنمنٹ اسکول کے

وہ ایک ذہین طالب علم تھے اور انھوں نے انگریزی اور تاریخ میں مکمل دسترس حاصل کر لی تھی۔ جس وقت وہ دکن کے سرداروں کے ایجنٹ کے عہدے پر فائز تھے اُس زمانے میں انھوں نے قانون کی تعلیم حاصل کی اور 1852 میں منصف مقرر ہوئے۔ 1856 سے 1861 تک وہ انام کمیشن میں اسٹیٹ کمشنر کے فرائض ادا کرتے رہے۔ اُس کے بعد انھوں نے احمد آباد اور ناسک میں جج کی حیثیت سے کام کیا۔ 1876 میں انھیں دہلی دربار میں مدعو کیا گیا۔ 1878 میں یونی ورسٹی کے فیلو کی حیثیت سے اُن کا تقرر ہوا۔ اور 1880 میں وہ گورنر کی کونسل کے رکن مقرر کئے گئے۔ 1884 میں تقریباً ایک سال تک انھوں نے ریاست رتلام کے فرائض ادا کئے 1892 میں انتقال ہوا۔

1828 سے گوپال ہری نے ہفتہ وار اخبار پربھاکر میں اُس زمانے کے سماجی اور سیاسی مسائل پر مضامین لکھنے شروع کئے جو ''شت پرن'' یا، سو خطوط کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کا مقصد تھا لوگوں کو نیند سے جگانا۔ انھوں نے نئی تعلیم حاصل کرنے اور ملک کے مسائل کو حل کرنے پر زور دیا۔ اُن کے مضامین فکر انگریز ہوتے تھے۔ اور بہت پڑھے جاتے تھے۔ 1877 میں انھوں نے ایک کتاب لکھی جس کا نام تھا ''جاتی بھید'' اس میں ذات پات کی مذمت کی گئی تھی۔ انھوں نے گیتا کی تعلیمات کو مقبول بنانے کے لئے 1878 میں گیتا تبو اور سو بھا شائع کیں۔ 1880 میں ہندوؤں کی مذہبی رسوم کی تنقیدی وضاحت کرنے کے لئے انھوں نے سوادھیا اور ایشولیا ناگر بید سوتر لکھے۔ گرام رچنا یا گاؤں کا نظام میں انھوں نے گاؤں کے حالات کا جائزہ لیا۔ تاریخ اور تاریخی تفتیش و تحقیق میں اُن کی دلچسپی کی مظہر کتابیں ہیں۔ تاریخی قصے اور متفرق اطلاعات (تین جلدیں)، راجستھان کی تاریخ، گجرات کی تاریخ، سوراشٹر کی تاریخ اور سری لنکا کی تاریخ، گجرات کی تاریخ کے آخر میں ایک ضمیمہ شامل ہے جس میں برطانوی حکومت کا مقابلہ دیسی حکومت سے کیا گیا ہے اور اُن کی تقابلی اچھائیوں سے بحث کی گئی ہے۔

''لوک ہت وادی'' سماجی اصلاح کی وکالت کرتے تھے۔ اُن کے قریبی روابط مغربی ہندوستان کی پراتھنا سماج، آریہ سماج اور تھیاسوفیکل تحریک سے تھے۔ وہ عورتوں کے حقوق کی حمایت کرتے تھے۔ تعلیم نسواں کا حامی تھے۔ مہاراشٹر کے دو اہم اخبار دنیان پرکاش اور

اندو پرکاش اور گجرات کے ہتچو کی انھوں نے بڑی ہمت افزائی کی۔ دکن ورنا کلر ٹرانسلیشن سوسائٹی اور گجرات میں اُسی طرح کی تنظیم کی بھی انھوں نے بڑی سرپرستی اور ہمت افزائی کی۔ پندھر پور کے یتیم خانے کے بانی اراکین میں سے ایک وہ بھی تھے۔

''لوک ہت وادی'' مہاراشٹر کے وہ پہلے مصلح تھے جنھوں نے قدیم عقیدوں اور قدیم رسموں کو چیلنج کیا اور اُن نئے بنیادی تصورات اور نئی وفاداریوں کو صدق دل سے قبول کیا۔ جن کا تقاضہ بدلتا ہوا وقت کر رہا تھا۔ عام لوگوں کی بھلائی کے لئے اُن کی خواہش، اُن کی بے لوثی اور سچائی کے لئے اُن کے پیار نے مہاراشٹر کی تحریک اصلاح میں انھیں حقیقی پیش رو بنا دیا ہے۔ ''لوک ہت وادی'' بالائی طبقوں کی جہالت، سستی اور خود غرضی سے نالاں تھے۔ اور اپنے مضامین میں اُن کی مذمت سخت لفظوں میں کرتے تھے۔

انگریزی تعلیم حاصل کرنے والے اُن تھوڑے سے لوگوں میں اُن کا شمار تھا جدید عہد اور اُس کو برقرار رکھنے والے بنیادی تصورات کی اہمیت سے واقف تھے۔ وہ پہلے انسان تھے جنھوں نے مرہٹوں کی شکست اور اُن کے سماجی زوال کے اسباب کو سمجھنے کی کوشش کی۔ انھوں نے بتایا کہ سماج کو اگر ترقی کرنی ہے تو اُسے کون سا راستہ اختیار کرنا چاہئے۔ انھوں نے برطانوی کامیابی کے اسباب کا تجزیہ کیا۔ اُن کے مطابق انسان دوستی اور سماجی خدمت اور طاقتیں تھی جو برطانوی حکومت کی بقا کی ضامن تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان بھی اُن کو قبول کرے۔ ماضی کا بھاری بوجھ اُن کے لئے نا قابل برداشت تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ پرانی وفاداری مضر ہیں۔ پرانے طبقے سماجی دولت میں اضافہ کرنے کے قابل نھیں ہیں۔ لیکن انگریزی حکومت کو پسند کرنے کے باوجود انھوں نے اُس کی عملی خرابیوں کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کیں۔ اُن کا خیال تھا کہ لوگوں میں شراب خوری کی بڑھتی ہوئی لت کی ذمہ داری حکومت پر ہے۔[1] اسی طرح محاصل لگانے اور انصاف کے تعلق سے یورپینوں کی طرف امتیازی رویہ اختیار کرنے پر بھی انھیں اعتراض تھا۔[2]

ہندوستان کے لوگوں کی سیاسی توقعات پر بحث کرنے کے تعلق سے وہ اپنے وقت سے

---

[1] ایضاً، صفحہ 264

[2] گجرات کے تاریخ از ''لوک ہت وادی''، صفحہ 38

بہت آگے تھے۔''اس ملک کے رئیس اور غریب سب کو مل کر ملکہ کے سامنے یہ عرضداشت پیش کرنی چاہئے کہ موجودہ حکومت لوگوں کی خوش حالی کی طرف غفلت برت رہی تھی۔ انگریزی اور ہندوستانی میں بہت اور پرانی تعلیم بے سود تھی۔'' اُن کی رائے میں ترقی کی پہلی شرط یہ تھی کہ معقول اصولوں اور مغربی سماجی قدروں کی بنیاد پر ہندوستانی سماج کی تنظیم نو کی جائے لیکن ہندوستان میں سماج اور معاشی زندگی اور اخلاق مذہب کے تابع تھے۔ چنانچہ اُن کی کوشش یہ تھی کہ مذہب کو دنیاوی امور سے علیحدہ رکھا جائے۔''یہاں کے لوگوں کے عجیب وغریب خیالات ہیں۔ وہ تمام سماجی رسم ورواج کو مذہب سے جوڑ دیتے ہیں۔ خدا کی محبت اور کپڑے پہننا بھی مذہب ہے۔''[1]

انھوں نے اگر برطانوی حکومت کو قبول کیا تو اس کی وجہ یہ تھی وہ جمہوری حکومت کے اصولوں پر قائم تھی۔ جس میں انھیں مُلک کی نجات نظر آئی۔ بہت زیادہ نابرابری پائی جاتی ہے۔ اس نابرابری کو دور کرنے کے لئے ہندوستان میں ایک پارلیمنٹ کا قیام عمل میں لانا چاہیے۔ اُس میں ہر شہر اور ہر ضلع کے دو نمائندے ہوں۔ اُن کا انتخاب سب لوگ اپنی مرضی کے مطابق کریں۔ اس کی بنا پر اس ملک کے لوگوں کے خلاف برطانوی مصیبت ختم ہوجائے گی۔ اور حکومت میں ہمہ جہتی ترقی ہوگی لوگ مطلق العنان حکومت اور ذمہ دار حکومت کے فرق کو سمجھ لیں گے۔ سب کو یہ معلوم ہوجائے گا کہ جمہوریت میں غریب اور امیر اونچی ذات اور نیچی ذات والوں سب کے ساتھ یکساں برتاؤ کیا جانا چاہیے۔ اراکین کا انتخاب بلا امتیاز ذات کیا جانا چاہیے۔ چونکہ برہمن مغرور ومتکبر ہوتے ہیں۔ اس لئے اُن کے نمائندوں کی تعداد کم ہونی چاہیے۔

''جب لوگوں میں سمجھ بوجھ پیدا ہوجائے گی تو وہ برطانوی پارلیامنٹ کی طرح کی اسمبلی کا مطالعہ کریں گے۔ اور اُس کے بعد انگریز اس ملک میں تاجروں کی طرح رہیں گے۔''

''اگر وہ ظلم وزیادتی کریں گے یا ایسے قوانین بنائیں گے جن کی لوگ مخالفت کریں گے تو جس طرح امریکہ کے لوگوں نے کیا وہ بھی اپنی آزادی کا اعلان کردیں گے۔ اور انگریزوں سے کہیں گے کہ وہ ملک سے چلے جائیں۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں دو سو سال لگیں۔ لیکن اس آخری

---

[1] شت پترن، تدبن ایس۔ آر۔ کیلکر (1940)، صفحہ 71

منزل کے متعلق کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔''[1]

جس سیاسی مستقبل کی انھوں نے بشارت دی تھی وہ محض تخیل کی پرواز نہیں بلکہ سوچ بچار کا نتیجہ تھی۔جتنی کم حکومت ہو اُتنا ہی لوگوں کے لئے اچھا ہے۔ انھوں نے کہا ''پس ماندہ ملک میں حکومت مطلق العنان ہوتی ہے یا پدری لیکن متمدن ممالک میں وہ لوگوں کی خادم ہوتی ہے۔''

ہمارے سماجی زوال کو انھوں نے سائنس اور تعلیم کو نظر انداز کرنے کے نتیجے سے تعبیر کیا۔ ''ہم وہی چکی استعمال کرتے ہیں جو ویاس کے زمانے میں استعمال ہوتی تھی۔اور اس ہل سے زمین جوتتے ہیں جس سے پانڈو کے زمانے میں جوتی جاتی تھی۔''[2] برہمنوں کی کاہلی کی انھوں نے مذمت کی ''بھٹ (پجاری) محض ناکارا لوگ ہیں۔ وہ خیرات پر زندگی گزارتے ہیں اور ہمارے سماج میں اس کو قابل قدر سمجھا جاتا ہے یہ دولت کو برباد کرنا ہے۔اس طرح ہم بے وقوف مدعیان علم کی حمایت اور جہالت کی ہمت افزائی کرتے ہیں اس سے بہتر ہے کہ ان لوگوں کو درزی یا بڑھئی کے حرفے کی تربیت دی جائے۔اس کے بعد وہ عزت زندگی گزار سکیں گے۔''

اُن کی رائے میں ''سنسکرت پڑھنا فضول ہے۔اس سے ذہنی انتشار پیدا ہونا ہے۔اس میں بال کی کھال نکالی جاتی ہے۔وہ انسان کو کاہل بنا دیتی ہے۔اور بے مقصد کاموں میں الجھا دیتی ہے۔اُس کے پاس وہ علم نہیں ہے جس کی جدید عہد کو ضرورت ہے۔''[3] انھوں نے اپنے ہم وطنوں سے کہا کہ اُس علم کا خیر مقدم کریں جس کے ذریعہ انگریزوں نے اپنے ہندوستانی مخالفین پر فتح پائی۔

انھوں نے قدیم مذہبی عقائد اور رواجوں پر حملے کئے۔انھوں نے کہا کہ سماجی رویے پر استدلال اور سماجی افادیت کے اصولوں کا اطلاق کیا جانا چاہئے۔قدیم ہندو سماجی نظام میں فرد سماجی فرائض کے نتیجے دبا ہوا تھا۔''لوک ہت وادی'' چاہتے تھے کہ فرد کو اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے اور اپنی عقل اور مرضی کے مطابق کام کرنے کی آزادی حاصل ہونی چاہیے۔

---

[1] ایضاً، صفحات 79،80

[2] ایضاً، صفحہ 109

[3] ایضاً، صفحات 146،148،150

انھوں نے ملک کی بڑھتی ہوئی غربت کے مسئلہ پر بھی توجہ دی۔ ’’ملک میں غربت وافلاس بڑھتا جارہا ہے اور لوگوں کے لئے روزگار حاصل کرنا دشوار تر ہوتا جارہا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی کی وجہ ہے ملک کی صنعت وتجارت کی تباہی۔ انگلستان اور دوسرے مغربی ممالک اس ملک میں مال بھیجتے ہیں اور چونکہ وہ سستا ہے اس لئے لوگ اُسے خریدتے ہیں۔ اگر یہ لوگ اس امر کا عزم کرلیں کہ بدیسی مال کے بجائے سودیشی مال خریدیں گے، یہاں بنائے جانے والی چھتریاں استعمال کریں گے تو ملک کے باسیوں کو روزگار مل جائے اور وہ خوش رہیں۔ ہندوستانیوں کو صرف مصنوعات فروخت کرنی چاہیے اور خام مال بیچنے سے انکار کردینا چاہیے۔ اس وقت یہاں کے لوگ باہر کا مال خریدتے ہیں۔ اور اپنے دست کاروں کو فاقے دیتے ہیں۔ انگریز ہماری منڈیوں میں شیشے کا سامان، کپڑا، کانٹے چھری وغیرہ گھڑیاں اور مشینیں بیچتے ہیں۔ ہمارے دستکاروں کو یہ چیزیں بنانا سیکھنا چاہیے۔ اور گھریلو صرف کے بعد جو کچھ بچے ہیں اُس کو برآمد کرنا چاہیے۔ ہمارے مال انگلستان کے علاوہ دوسرے ملکوں کو بھی جانا چاہیے۔ اس طرح ہم اپنی صنعتوں کی مدد کرسکیں گے اور سب کو روزگار مہیا کرسکیں گے۔[1] ہم کہہ سکتے ہیں۔ ’’لوک ہت وادی‘‘ ایک طرح سے راناڈے اور جوشی کے پیش رو تھے۔ جنھوں نے مہاراشٹر میں سودیشی کی تحریک کو جنم دیا۔

اپنی ایک تحریر میں انھوں نے اپنے مسلک کی مندرجہ ذیل وضاحت کی۔

1۔ ہر شخص کو خلوص قلب سے خدا کی عبادت کرنی چاہیے۔
2۔ مذہب میں داخل کرنے، شادی اور موت کی رسموں کے علاوہ تمام دوسری رسمیں ختم کردینی چاہیے۔ اپنی زبان میں رسمیں ادا کی جائیں اور دعائیں پڑھی جائیں۔
3۔ ہر شخص کو اپنے رائے کے مطابق عمل، تقریر اور تحریر کی آزادی ہونی چاہیے۔
4۔ سماجی اور مذہبی معاملات میں عورتوں اور مردوں کے حقوق مساوی ہونے چاہئیں۔
5۔ رسم کی ادائیگی سے زیادہ اہم ہے اخلاق۔
6۔ کسی شخص کے ساتھ حقارت کا برتاؤ نہ کیا جائے۔ ذات کی بنیاد پر غرور مستحق ہے۔ سب لوگوں کے ساتھ مہربانی کا سلوک کیا جائے۔ سب کے ساتھ اچھائی کی جائے۔

---

[1] ایضاً، صفحات 57-356

7۔ وطن کی محبت اور ملک کی بھلائی کو کبھی نہیں بھولنا چاہیے۔
8۔ لوگوں کے حقوق حکومت کے حقوق سے برتر ہیں۔
9۔ حکومت کے ضوابط اور عقل کے قواعد کی پابندی کی جانی چاہیے۔
10۔ ہر شخص کو علم کے فروغ کے لئے کوشش کرنی چاہیے۔
11۔ انسانی کردار کا ہمیشہ برقرار رہنے والا اصول ہونا چاہیے ''سچائی''۔[1]

ذات پات کے نظام کے خلاف بغاوت

پیشواؤں کے دور حکومت میں برہمنوں نے مذہبی اور سماجی معاملات میں اور ملک کے انتظام میں غالب حیثیت حاصل کر لی تھی۔ کسانوں اور دست کاروں کو حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اُن کو عام طور سے ''کسان ہل چلانے والے اور ہڈیاں چبانے والے'' کہا جاتا تھا۔ برہمن ان کے ساتھ کھاتے نہیں تھے اور انھیں یہ اجازت بھی نہیں تھی کہ سماجی تقریبات میں وہ برہمنوں سے آزادی کے ساتھ مل سکیں۔ سنسکرت کی تعلیم برہمنوں کے لیے مختص تھی۔ وہ اس کو بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ مرہٹی بچے نئے اسکولوں میں تعلیم حاصل کریں۔

یہ قدرتی امر ہے کہ انگریزی حکومت کے ابتدائی دنوں میں سماجی برتری کے برہمنوں کے دعوؤں کے خلاف مخاصمانہ رویہ پایا جاتا تھا۔ جیوتبا پھولے، جنھوں نے برہمنوں کے ان دعووں کے خلاف ایک طاقتور تحریک شروع کی، 1828 میں ایک مالی خاندان میں پیدا ہوئے تھے، نچلی ذات سے اُن کے تعلق نے اُن کی تعلیم میں بڑی رکاوٹیں ڈالیں۔ اُس کے بعد 15 سال کی عمر میں ایک عیسائی مشنری کی مہربانی اور مدد سے وہ تعلیم حاصل کر سکے۔ لیکن سماجی تقریبات میں برہمن اُن کی تذلیل کرتے تھے۔ اس توہین آمیز رویے نے جوتیبا کو برہمنوں کے دعوؤں کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے ہندو دھرم کے متعلق پروفیسر ولسن اور سر ولیم جونس کی تحریریں پڑھنے پر اکسایا یا اُن کے مطالعے، ذاتی تجربے اور عیسائی مشنریوں کے ساتھ روابط نے انھیں اُس دور کے ہندو دھرم اور رواجوں کے خلاف تنقید پر آمادہ کر دیا۔

عام مخالفت کے باوجود انھوں نے اکیس سال کی عمر میں لڑکیوں کے لئے ایک اسکول قائم

---

[1] ایضاً، صفحہ 213

کیا۔1854 میں انھوں نے اچھوتوں کے لئے ایک اسکول شروع کیا۔ ہندو بیواؤں کی بے بسی اور دکھوں نے انھیں متاثر کیا اور انھوں نے تکلیفوں میں مبتلا بیواؤں کی مدد کرنے کی غرض سے ایک نجی یتیم خانہ شروع کیا۔

لیکن ان کی زندگی کا مقصد تھا برہمنوں کے اقتدار کو ختم کرنا۔ اُس کے لیے انھوں نے عام لوگوں کی تعلیم کی وکالت کی۔ تنقیدی کتابیں سارو جنک ستیہ دھرم پشتک اور غلام گیر لکھیں۔ اور برہمنوں کے خلاف منظم انداز سے سرگرمیاں جاری رکھنے کے لئے ستیہ شودھک سماج قائم کیا۔

پھولے کی تحریریں تنقیدی نہیں ہیں۔ اور انھوں نے جن نظریات کی تشکیل کی اُن کی بنیاد واقعات پر قائم نہیں ہے۔ لیکن اُن کی آواز کچلے ہوئے طبقوں کی کراہ ہے۔ جو صدیوں کے بعد اپنی حیثیت دوبارہ حاصل کرنا چاہتے تھے اس کے لئے پھولے نے یہ مضحکہ خیز مشورہ دیا کہ ایسے انگریز اور اسکاچ مشنری جو مرہٹی زبان جانتے ہیں گاؤں میں سکونت اختیار کرنے پر آمادہ کئے جائیں تا کہ وہ گاؤں کے کلکرنی اور دوسرے برہمن حکام پر نظر رکھیں اور ہر سال حکومت کو رپورٹ بھیجیں۔ اُن کا اصلی کام تھا عام لوگوں کو بیدار کرنا اور پجاری طبقے کے غیر معمولی دعوؤں کو منظم مزاحمت پر انھیں آمادہ کرنا۔ آج سے ایک صدی پہلے سماجی بغاوت کا تصور مایوسی کا پیدا کردہ جرأت مندانہ عمل تھا۔ جس کے لئے بڑی ہمت کی ضرورت تھی۔ یہ ہے پھولے کی عظمت کا راز اُن کے مقصد کی وضاحت ستیہ شودھک سماج کی ایک رپورٹ کے اس اقتباس سے ہوجاتی ہے ''ہزاروں سال سے اپنی کتابوں کی مدد لے کر برہمن عام لوگوں کو کم تر قرار دے رہے ہیں۔ اور اُن کا استعمال کر رہے ہیں ستیہ شودھک سماج کا قیام 24 ستمبر 1873 کو عمل میں لایا گیا تا کہ عام لوگوں کو پروہتی اقتدار غلامی سے نجات دلائی جائے اور انھیں تعلیم دے کر اُن کے اندر اُن کے حقوق کا احساس پیدا کیا جائے۔''

ہوسکتا ہے کہ جیوتبا پھولے کے دل میں تحریک برہمن پجاریوں کے خلاف اُن کی شدید نفرت کا نتیجہ ہو۔ لیکن اُن کی کتابوں سے نفرت ظاہر نہیں ہوتی ہے۔ انھوں نے مرد کو وہ وقار بخشا جو ذات پات کے نظام نے اُس سے چھین لیا تھا۔ انھوں نے لکھا تھا ''تمام انسان ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں پھر کوئی ایک ذات اپنے کو دوسری ذاتوں سے برتر کیوں سمجھے۔ وہ پہلے شخص تھے جس

نے ہندوستانی تنظیم میں اتحاد پیدا کرنے کی کوشش کی جو ذاتوں کی بنا پر فرقوں میں بٹا ہوا تھا۔ وہ غیر برہمن اور اچھوت میں کوئی امتیاز نہیں کرتے تھے۔ وہ غریبوں کو اتنا عزیز رکھتے تھے کہ جب ڈیوک آف پارک سے ملے تو اُس وقت ایک لنگوٹی میں تھے تاکہ انھیں غربت و افلاس میں مبتلا کسانوں کا صحیح نمائندہ تصور کیا جائے۔''

پارسی فرقے میں اصلاح

برطانوی اثر کی بنا پر مغربی ہندوستان میں ہلچل پیدا ہوئی۔ وہ محض مرہٹوں تک محدود نہیں تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کو سب سے پہلے پارسیوں نے محسوس کیا جن کے انگریزوں کے ساتھ تجارتی روابط زیادہ پرانے تھے۔ چونکہ ذات اور کھانے پینے کے معاملے میں وہ چھوت چھات سے آزاد تھے۔ اس لئے وہ نئے نئے آنے والے بدیسیوں کی خدمت منڈیوں کے علاوہ اپنے گھروں میں کرتے تھے۔ انگریز کا ملازم ہی نہیں پارسی اُس کا بانیان بھی بن گیا۔ انگریز اور ہندوستانی کے درمیان بچولیے کے فرائض ادا کرنے لگا۔ اور بعد میں مغربی اور مشرقی تجارت میں کمیشن ایجنٹ بن گیا انگریزوں کے ساتھ اپنے روابطہ کی بنا پر پارسیوں نے ابتدا ہی سے انگریزی پڑھنا شروع کر دی تھی۔ ابتدائی دنوں میں الفنسٹن انسٹی ٹیوٹ کی مختلف جماعتیں پارسیوں سے بھری ہوئی تھیں۔ مشنریوں نے جو کالج اور اسکول شروع کئے تھے اُن میں بھی اُن کی تعداد بہت تھی۔

اس فرقے میں بڑھتی ہوئی انگریزی تعلیم کے انعکاسات سماجی اصلاح کی تحریک اور اُن کی سیاسی دلچسپیوں میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ بمبئی میں شائع ہونے والا پہلا اخبار بمبے سماچار ایک پارسی نے شروع کیا۔

1828 میں دادا بھائی نوروجی کی صدارت میں اسٹوڈینٹ لٹریری اینڈ سائنٹفک سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے ہفتہ وار جلسوں میں ادبی، سائنسی اور سماجی موضوعات پر مضامین پڑھے جاتے تھے۔ اس انجمن کی ہندوستانی زبانوں کی دو شاخیں تھیں۔ دادا بھائی گجراتی شاخ کے صدر تھے۔ اور انجمن کے مباحثوں کو دنیا پر اسلک میں شائع کرتے تھے۔ ان جلسوں میں سماجی سوالوں پر بڑی گرما گرمی کے ساتھ بحث کی جاتی تھی۔

دادا بھائی نے اپنے پارسی دوستوں کے ساتھ مل کر لڑکیوں کے کئی اسکول بھی شروع کئے جو اُس زمانے میں بڑی عجیب بات سمجھی جاتی تھی۔

ہندوستان میں مدتوں تک رہنے کی وجہ سے پارسیوں نے بہت سے ہندو رواج اختیار کر لیے مثلاً ہولی پر ناریل نذر دینا یا ہنومان پر تیل کے پیالے چڑھانا۔ نئے اثرات کے تحت وہ ہندو رواجوں سے پیچھا کٹانا چاہتے تھے اور انھوں نے حقیقی زرتشتی مذہب کی تلاش شروع کی۔ اس مذہبی اصلاح کی انجمن کا مقصد جس کا قیام 1851 میں عمل میں آیا۔ زرتشتی مذہب کی اصل شکل کو بحال کرنا تھا۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے زنداوستا کے مطالعے اور مذہبی تحریروں کی تحقیق کی ہمت افزائی کی گئی۔

گجراتیوں میں سماجی اصلاح

گجراتیوں کے بھاٹیا فرقے نے نئی تعلیم اور اُس کی بنا پر جنم لینے والے نئے تصورات میں زیادہ دلچسپی نہیں لی۔ لیکن اصلاح کے بڑھتے ہوئے سیلاب سے وہ بھی نہ بچ سکے۔ وہ وشنو اور رولجو آچاریہ کے پیروکار تھے۔ اور اپنے ''مہاراجوں'' یا مذہبی رہنماؤں کی بڑی عزت کرتے تھے۔ اُن مہاراجوں کو بڑے اختیارات حاصل تھے۔ اس لئے کہ وہ اپنے پیروؤں کو بُت کے حضور میں حاضر نہ ہو سکنے سے لے کر برادری سے خارج کرنے تک کی سزا دے سکتے تھے۔ اُن کا دعویٰ تھا کہ وہ بھگوان کرشن کے اوتار ہیں۔ اور اپنے پیروؤں کی نجی زندگیوں پر انھیں بڑا اختیار حاصل تھا۔ اُن کے مٹھ اوباشی اور عیاشی کے مرکز بن گئے تھے اور اُن کے تحت مطالبوں نے اُن کے پیروؤں کی ناک میں دم کر دیا تھا۔ جیسا کہ ولاباری نے کہا تھا۔

''وشنو مہاراجہ کھوٹا سکہ ہے۔ اُن دانش ور خواتین کے محلوں میں اُس کا حکم چلتا ہے جن کے شوہر بڑے روشن خیال ہوتے ہیں۔ مہاراجہ دوسروں سے فائدہ اٹھانے کے اعلیٰ ترین تخیلات رکھتا ہے۔'' اس کے بعد وہ مختلف قسم تپشیوں وغیرہ کا ذکر کرتا ہے۔ یعنی اُس کے کوڑے اور لاتیں کھانے اور اُس کے ساتھ نہ سُن کر لدا کرنے کی فیس۔[1]

الفنسٹن انسٹی ٹیوٹ کے طالب علم اور لٹریری اینڈ سائنٹفک سوسائٹی کے رکن کرشن داس

---

[1] ولاباری۔ بی۔ ایم۔ گجراتی (1889) صفحہ 122-121

نے بھی مہاراجوں کو بے نقاب کرنے کا بیڑا اُٹھایا۔ اُس نے پہلے تو سماجی اصلاح کے متعلق راست گفتار میں مضامین لکھے۔ اور اُس کے بعد خود اپنا اخبار ستیہ پرکاش شروع کیا۔ اُس نے اُن کی بے شرمی، چالاکی، بے حیائی، بدمعاشی اور دھوکے بازی کا بھانڈا پھوڑا۔ کرشن داس کے خلاف ازالہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کیا گیا۔ چیف جسٹس نے ہتک عزت کو تسلیم کیا۔ لیکن اُس کے جواز میں جو کہا گیا تھا اس کو صحیح قرار دیا۔ جج اور عام لوگ کرشن داس کی ہمت اور جذبے کے مداح تھے۔ اُس نے ایک مثال قائم کردی تھی جس سے متاثر ہو کر اور لوگوں نے بھی گجراتیوں کی اصلاح کا کام شروع کردیا۔

چنانچہ پیشواؤں کی حکومت کے ختم ہونے کے چالیس سال کے اندر ایک نئی تہذیب شکل اختیار کرنے لگی۔ پرانے نظام کی گرفت ختم ہوتی جارہی تھی۔ ایک نئی معیشت رفتہ رفتہ ملک میں تبدیلی لارہی تھی۔ ریل کی پٹریاں بچھائی جارہی تھیں۔ اور 1857 میں بمبئی میں پہلا سوتی کارخانہ شروع ہو چکا تھا۔ ان تبدیلیوں کے اثرات آئندہ برسوں میں رونما ہوئے۔

کسی بھی سماج میں اُبھرتا ہوا نیا طبقہ بدیسی تہذیب سے نئے تصورات آسانی کے ساتھ درآمد کرلیتا ہے۔ لیکن اس سے پہلے کہ تصورات پوری طرح قبول کئے جائیں اُس کو قدامت پرستوں کی مخالفت کا سامنا کرنے اور اُس پر قابو پانے کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ زیر مطالعہ دور میں (1818 لغایت 1857) مہاراشٹر میں قدامت پرستوں کے قدم اتنے جمے ہوئے تھے کہ ''مغربی تعلیم کے خطرے کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ 1857 کی شورش کے بعد ہی، جب قدیم سیاسی نظام جل کر خاک ہو چکا تھا، مرہٹہ سماج میں ترقی پسند عناصر کو قدیم دبستان فکر سے لپٹیا لینا پڑا۔''

ساتواں باب

ہندوستانی قوم پرستی کا معاشی پس منظر

I- ہندوستانی معیشت پر برطانوی اثر

7581 کی بغاوت کے بعد کے پچاس سال میں قومی شعور میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا۔ اس کی کئی وجوہ تھیں۔ اُن میں ایک اہم عنصر تھا۔ ہندوستانی معیشت میں ''جدید تصورات کی تفریق وتوسیع'' ایک طرف تو ہندوستان کی معیشت کے کچھ شعبوں مثلاً تجارت، باربرداری اور مواصلات میں تبدیلی ہورہی تھی۔ اور دوسری طرف اس کے اصل شعبے یعنی زراعت پر جمود طاری تھا۔ جوں جوں آبادی اور زمین پر بوجھ بڑھتا رہا ویسے ویسے ہندوستان کے عام لوگ دکھوں میں مبتلا ہوتے گئے جو قلت اور قحط کے زمانوں میں بڑی شدت اختیار کرلیتے تھے۔

دیہات کے لوگوں کو جن تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا اُن کا مضر اثر داخلی تجارت پر پڑتا تھا۔ اور تاجر، بنک کار اور وکیلوں کی طرح پیشے وارانہ طبقے بھی اس کی لپیٹ میں آجاتے تھے۔ دیہات کی بے چینی سیاسی شعور رکھنے والے شہریوں تک پہنچتی تھی۔ جو اس کے خلاف آواز اٹھاتے تھے اور معاشی پالیسیوں اور انتظامی طریقوں کو بدلنے کے لیے حکومت پر زور ڈالتے تھے۔

تجارت اور صنعت میں کچھ ترقی ضرور ہوئی جو معیشت میں مقابلتاً کم تر حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن ترقی کی رفتار سُست اور غیر متوازن تھی۔ انگریز زیادہ تر ریلوں اور باغات میں سرمایہ لگاتے تھے۔ ریلوں کی حد تک اُن کا اصل مقصد تھا فوجی ضرورت پوری کرنا اور استعماری معیشت کو تقویت پہنچانا۔ باغات کی صنعت پر بڑی حد تک یورپیوں کی اجارہ داری تھی۔ جو زیادہ تر منافع کماتے تھے۔ سوتی کپڑے کے علاوہ بڑی صنعتوں پر توجہ نہیں دی گئی اور اس لیے انھوں نے ترقی نہیں کی۔ اس کے ثبوت میں یہ واقعہ پیش کیا جا سکتا ہے کہ انیسویں صدی کے اختتام تک ایک لاکھ سے زیادہ آبادی والے شہروں میں رہنے والے لوگوں کی مجموعی تعداد کل آبادی کی 2.23 فی صدی تھی۔ شہری آبادی میں امریکہ سے ہندوستان تقریباً 57 سال پیچھے تھا۔ داخلی اور خارجی تجارت کا فروغ برطانوی اور ہندوستانی تاجروں کے تعاون اور ایسی کاروباری تنظیموں کی ترقی کا نتیجہ تھا جنھوں نے سرمایہ دارانہ پیداوار کو بڑھاوا دیا۔ مثلاً کپاس صاف کرنا بدیسی تجارت کے اضافے نے ہندوستانی معیشت کی استعماری شکل کو زیادہ واضح کر دیا۔ انگلستان سے مشین سے بنے ہوئے سامان کی درآمد میں خام مال کی برآمد میں بڑا اضافہ ہو گیا جس میں بڑی مقدار میں غذائی اجناس شامل ہوتی تھیں۔

اس تجارت میں حصہ لینے والے ہندوستانی منافع کماتے تھے۔ اُن کا تعلق سرمایہ دار طبقے سے تھا۔ جس کی دولت اور اثر بڑھتا گیا۔ اُس طبقے کی خواہش تھی کہ صنعتوں کو ترقی دے اور ملک کے وسائل کو ترقی دینے کے کام میں اپنا سرمایہ لگائے۔ برطانوی سامراجی مفادات اُس کے راستے میں رکاوٹ ڈال رہے تھے۔ جس کی بنا پر اُسے حکمرانوں کے خلوص نیت پر شبہ ہونے لگا۔ کچلے ہوئے عوام کے ساتھ اُس کو جو ہمدردی تھی اُس کی بنا پر وہ اُس نظام سے دل برداشتہ ہو گیا جس پر وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے دکھوں کی ذمہ داری تھی۔

انگریزوں نے جن تکنیکی تبدیلیوں کو رواج دیا اُن کی بنا پر قومی معیشت وجود میں آ گئی۔ یعنی ایک معاشی نظام کے تحت ہندوستان متحد ہو گیا۔ اس تبدیلی کی بنیاد تھی، مواصلات اور بار برداری میں نئے طریقوں کو رائج کرنا۔ ریلوں اور تار برقی نے نہ صرف شہری کاروباری مراکز کی سرگرمیوں میں انقلاب برپا کر دیا۔ بلکہ دیہی معیشت کی بھی شکل بدل دی۔ ہندوستانی گاؤں میں تبادلہ اشیا کی

جگہ زر کے ذریعے خرید وفروخت کی جانے لگی۔ اپنی گذر بسر کے لیے کاشت کرنے کے طریقے کو چھوڑ کر منڈی کے لیے پیداوار کی جانے لگی۔ اور صدیوں پُرانی خود کفالت کے بجائے پورے ملک میں پھیلی اور پوری دنیا میں پھیلی منڈیوں پر اشیائے صرف خریدنے اور گاؤں کی پیداوار بیچنے کے لیے انحصار کیا جانے لگا۔

عام حالات میں ان تبدیلیوں سے مُلک کو فائدہ پہنچنا چاہئے تھا۔ اور لوگوں کو خوش حال ہونا چاہیے تھا۔ لیکن دو وجوہ سے ایسا نہیں ہوسکا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ترقی پذیر ممالک کا یہ عام تجربہ ہے کہ جدید اور انجان تکنیکوں، طریقوں اور معاشی تنظیموں کو اگر یک بیک رائج کر دیا جائے تو ابتدائی مرحلے میں قدیم طرز زندگی نئے حالات سے سمجھوتا نہیں کر پاتی ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ استعماری معیشت کی نمایاں خصوصیت ہے محکموں کا استعمال۔

انگریزوں نے ہندوستان میں جس نئی معاشی تنظیم کو رواج دیا وہ بعض پیداواری نوعیت کی نہیں تھی۔ نئی تبدیلیوں سے فوائد بدیسیوں نے حاصل کئے یعنی حکمرانوں، صنعت کاروں، اصل کاروں نے یا پھر اُن ہندوستانیوں نے جن کا تعلق دولت مند طبقوں سے تھا۔ اور جو بدیسی اور گھریلو تجارت، لین دین کے کاروبار اور ملک کے انتظامی کاموں میں حصہ لیتے تھے۔ کسانوں، دست کاروں، کھیتیہر مزدوروں اور شہری مزدوروں پر بڑھتی ہوئی قیمتوں اور پھلتی پھولتی تجارت، صنعت کی لائی ہوئی خوش حالی کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ اُن تبدیلیوں کی بنا پر اُن کے دکھوں میں اضافہ ہوگیا۔ اُس کے ثبوت میں واقعات پیش کئے جاسکتے ہیں کہ 0681 کے بعد ملک میں زیادہ قحط پڑے، دیہات میں فاقوں اور بیماریوں سے بڑی تعداد میں لوگ مرے اور پورے ملک میں دیہی قرض بڑھ گیا۔ اُجرتوں کے مقابلے میں غذائی اجناس کی قیمتوں میں تیزی کے ساتھ اضافہ ہوا اور آبادی تو بڑھتی گئی لیکن روزگار کے مواقع نہیں بڑھے۔ صنعت اور تجارت کے جدید شعبوں کی توسیع ہوئی لیکن ان پر بدیسی سرمائے کا غلبہ بھی بڑھتا گیا۔ ملک کا نظم ونسق بہتر ہوگیا۔ لیکن وہ قریب قریب پورا کا پورا بدیسیوں کے ہاتھوں میں تھا جو حکومت کے تمام شعبوں میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ حالانکہ قومی آمدنی میں زیادہ اضافہ نہیں ہوا۔ لیکن محاصل کا بوجھ بڑھ گیا۔ ہندوستانی معیشت کے ان متضاد رجحانات نے آبادی کے غریب حصوں کو بڑے دکھوں

میں مبتلا کر دیا۔ اور متوسط طبقے اور خصوصیت سے تعلیم یافتہ لوگوں میں بے چینی اور سیاسی بے اطمینانی پیدا کر دی۔

II ہندوستانی معیشت کی ساخت

نئی معیشت کی عمارت اس بنیاد پر تعمیر کی گئی تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی نے ڈالی تھی۔ کمپنی کے دور حکومت میں ہندوستانی معیشت کے دیہی اور شہری دونوں شعبوں میں اس طرح کی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ 2981 سے پہلے ہندوستان کی قومی آمدنی کے اندازے محض بر بنائے قیاس لگائے جاسکتے ہیں۔ قابلِ اعتبار سالانہ حسابات کی عدم موجودگی میں یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ اُس دور میں فی کس آمدنی بڑھی، کم ہوئی یا جوں کی توں رہی۔ 2981 کے بعد کے زمانے کے تعلق سے بھی، جس کی قومی سالانہ آمدنی کے حسابات کا سلسلہ امریکہ کے بلین اور ہندوستان کے سبرامنیم نے تیار کیا ہے۔ عالموں میں اس پر اتفاق رائے نہیں ہے، کہ فی کس آمدنی جوں کی توں رہی، بڑھی یا کم ہوئی۔ دیکھئے کزنٹس۔ ایس وغیرہ India and ,Economic Growth Brazil Japan مضامین از ڈنیل تھرنر، ہندوستان کی پیداوار میں طویل المدتی رجحانات اور کنگلی ڈیوس، ہندوستان کی معاشی ترقی کے سماجی اور نسلی پہلو۔[1] دیکھئے 6681 کے قحط بنگال کے متعلق ہنٹر کی رپورٹ 0871 کے قحط کے حالات سے 6681 کے حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے ہنٹر نے لکھا ''بنگال کے موجودہ اور پچھلے قحطوں میں فرق یہ ہے کہ اس زمانے میں انھیں روٹی کھلانے میں زمین اور منافع بخش تجارتی فصلوں کی مانگ بڑھ گئی۔ ان حالات کے نتیجے میں دیہی سرمایہ داروں اور زمینداروں کا ایک نیا طبقہ وجود میں آ گیا جو زمین کے لگان اور کسانوں کو دیئے جانے والے قرض کے سود سے منافع کماتا تھا۔

کمپنی نے اپنی سلطنت کے مختلف حصوں میں تین قسم کی لگان داری کو رواج دیا تھا۔ لیکن وہاں لگان داری کا کوئی نظام سہی ملک کے مختلف حصوں کے دیہی رشتوں میں انقلابی تبدیلیاں ہوگئی تھیں اور کمپنی کے دور حکومت کے اختتام تک دیہات میں ایک ناکارہ اور خون چوسنے والا

---

[1] Sixteenturer on The Condition and Resources of India صفحہ 70

متوسط طبقہ وجود میں آ چکا تھا۔ جو درمیانی لوگوں پر مشتمل تھا۔ یہ نیا طبقہ دیہی قرضوں کے سود اور زراعتی زمین کے لگان پر گذر بسر کرتا تھا۔لیکن زراعت کو ترقی دینے اور پیداوار بڑھانے کے لیے کچھ نہیں کرتا تھا۔ کمپنی کی حکومت کے دوران کسان کو زمیندار اور مہاجنوں کے مظالم سے نجات دلانے کے لیے کچھ نہیں کیا گیا۔(1) اس کے لئے سرمایہ داری کا ایک طبقہ موجود تھا۔ کسانوں کو بھوکا مارنے اور اُس کی زمین کو بیچ نہ ہونے کی وجہ سے غیر مزادعہ بنانے کے بجائے قرض دینے والے کھانے پینے کے لیے قرض دینے کو آمادہ رہتے تھے۔ اور زمیندار اس شرط پر لگان معاف کرنے کو تیار رہتے تھے کہ اگلی فصل کے موقع پر اُس کا ایک حصہ اُنھیں دیا جائیگا۔

بمبئ پریسیڈنسی، پنجاب اور مدراس کے رعیت داری علاقوں میں جہاں حق ملکیت کسان کو حاصل تھا۔ زمین مہاجنوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ دکن رائنس کمیشن کی رپورٹ کے مطابق 0581 اور 8581 کی درمیانی مدت میں دکن کی دیہی معیشت کی ایک اہم نوعیت تھی۔ ایک چھوٹے سے سرمایہ دار طبقے کی نموجولیت کا کاروبار کرتا ہے۔ (رپورٹ پیراگراف 64) شمالی مغربی صوبجات کے متعلق 1681 میں کرنل پیرڈ اسمتھ نے لکھا ''رفتہ رفتہ دولت مند طبقے وجود میں آرہے ہیں۔ اور زمین میں روپیہ لگانے کا رجحان ان طبقوں میں بڑھتا جاتا ہے۔ (شمالی مغربی صوبجات کے قحط کی رپورٹ (1681) حصہ دوم پیراگراف (84)۔ مصنوعات کی برآمدی تجارت کو ختم کر کے مقامی دست کاروں اور شہری تجارتی فرقے کو برباد کر دیا گیا تھا۔ تجارت اور صنعت کے پھلتے پھولتے مرکز اپنی سابق خوش حالی اور اہمیت کھو چکے تھے اور لوگوں کے روزگار سے محروم ہو جانے کی بنا پر ترک وطن کرنے کے نتیجے میں وہ چھوٹے چھوٹے قصبوں اور گاوؤں میں تبدیل ہو گئے تھے۔[1] ان کی جگہ کلکتہ، بمبئ اور مدراس کی طرح کے نئے شہروں نے لے لی تھی جو حکومت کے صدر مقام ہونے کے علاوہ یورپین نو آبادیات اور تجارت کے بھی مرکز تھے۔ ان شہروں میں کمپنی کے یورپین ملازموں اور بدیسی تاجروں کی سرگرمیاں زندگی کے مرکز بن گئی تھیں۔ حالانکہ اُن کی تعداد کم تھی۔ پھر بھی ان شہروں کی آبادی معیشت کے غالب عنصر تھے یورپین۔ نو

---

[1] ٹکر ہینری سینٹ جارج، ہندوستانی حکومت کی یادداشتیں جو سینٹ جارج ٹکر کے پرچوں کے انتخاب پر مشتمل ہیں۔ صفحہ 494

آبادیات دنیا کے دوسرے حصوں کی طرح ہندوستان میں بھی استعماریت کے پہلے مرحلے کی خصوصیت تھی مادری ملک کے تجارتی سرمائے کے ہاتھوں ملک کا استحصال۔[1]

ایسٹ انڈیا کمپنی نے ملک کے وسائل کو ترقی دینے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ مفادِ عامہ کے کاموں اور خاص طور سے سڑکوں اور آبپاشی کی نہروں کو نظر انداز کیا گیا۔ ملک کی دست کاریاں تباہ ہو چکی تھیں۔ جیسا کہ ٹامسن نے کہا تھا۔ ہندوستان کی زمین کو معلوم ہوتا تھا کہ کسی کی بدعا لگ گئی ہے اور مال گزاری کی اونچی شرح قانون پر زمینداروں کا مظالم اور زراعت کو ترقی دینے کے کاموں کی طرف غفلت برتنے کی وجہ سے پیداوار روز بروز کم ہوتی تھی، جیکسن[2] کے الفاظ میں ”کمپنی اپنی سلطنت میں ایک مشرقی مطلق العنان بادشاہ کی طرح حکومت کرتی تھی۔ جو اپنی سلطنت کا استحصال کرنا چاہتا ہے، لیکن اُسے ترقی نہیں دینا چاہتا ہے۔ ایک اہم معاشی فرق یہ تھا کہ مانچسٹر کے مقابلے کی بنا پر سوتی کپڑے کی صنعت تباہ ہوگئی۔ صنعت سے زراعت کی طرف مزدور جانے لگے اور خود زراعت میں غذائی اجناس پیدا کرنے کے بجائے تجارتی اجناس پیدا کی جانے لگیں۔ زمین کا محصول نقد کی شکل میں ادا کرنے کی بنا پر کسان اس پر مجبور تھے کہ مال گزاری ادا کرنے کے لیے چاندی حاصل کرنے کی خاطر اپنی سالانہ پیداوار کا بڑا حصہ منڈی میں فروخت کرے۔“

8581 میں ہندوستانی معیشت ترقی کے بنیادی عناصر سے خالی تھے۔ زراعتی ترقی رکی ہوئی تھی۔ اس لیے کہ کسان کے پاس زمین کو ترقی دینے اور زراعت کا جدید سامان خریدنے کے لیے وسائل نہیں تھے۔ زمین کی مالگزاری ادا کرنے اور کبھی کبھی تو اپنی گذر بسر کے لیے بھی اسے

---

[1] نکٹ ستیہ Structured basis of India Economy، باب 4 مقابلہ کیجئے۔ پیوکے۔ جی۔ ایچ Economic Court policies of dualistic societies صفحہ 091 انڈونیشیا کی سر دوہری معیشت کے نمونہ پہ رائے زنی کرتے ہوئے پروفیسر پیوکے نے لکھا ہے کہ ابتدائی دور میں مادری ملک کا تجارتی سرمایا تھا، اس کی ابتدا میں اس کا منفی سرمایہ آیا۔ اور آخر میں خود آبادی میں حال میں لگایا جانے والا سرمایہ، ہندوستان کے حالات بھی اس سے مختلف نہیں تھے۔

[2] جیکسن ایل۔ ایچ Migration of British Capital to5781 صفحہ 902

مہاجن سے قرض لینا پڑتا تھا۔ تجارتی طبقوں کے پاس اتنی ہمت[1] تھی نہ وسائل کہ وہ بڑی بڑی صنعتیں شروع کرتے اُن کی سرگرمیاں مقامی تجارت، ایجنسی، دلالی، دوکانداری اور مقامی بنک کاری تک محدود تھیں۔ پہلے حکومت نے انگلستان کے مفاد میں بے دردی کے ساتھ ملک کا استحصال کیا۔ اس کے بعد اُس نے عدم مداخلت کی پالیسی اختیار کی جو تجارتیت کی ایک نئی شکل تھی اور جس نے ترقی میں رکاوٹ ڈالی اور استعماریت کو فروغ دیا۔ چنانچہ جب ''پھوٹ نکلنے کی منزل اور اُڑن کا مرحلہ'' آیا تو ہندوستان اپنی معیشت کی ساخت کی خرابیوں اور کمیوں کی بنا پر اور صنعتی ترقی کی راہ میں سیاسی طاقت کے ذریعے رکاوٹیں ڈالنے کی بنا پر بھی اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکا۔ بدیسی منڈیوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور بدیسی تجارت کے فروغ کی بنا پر کچھ مدت بعد اس قسم کا موقعہ ہندوستان کو ملا تھا۔

III۔ صدی کے نصف آخر میں ہونے والی معاشی تبدیلیاں

8581 کے ایکٹ کی رو سے جب حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے تاج کو منتقل ہوگئی تو اس کی بنا پر ہندوستانی نظم ونسق، حکمرانوں کے معاشی مقاصد اور پالیسیوں میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی۔ اس کے باوجود تاج کو حکومت منتقل ہونے کے بعد کی نصف صدی میں ملک کے معاشی میدان میں بڑی تبدیلیاں نمودار ہوئیں۔ اس تبدیلی کی بڑی نوعیت یہ تھی کہ ہندوستان معیشت کے کچھ شعبوں کو جدید بنا دیا گیا۔ اس کی وجہ سے سماجی تبدیلی کا سلسلہ شروع ہوا۔ جس کا بڑا اثر ہندوستانی نقطۂ نظر پر پڑا۔ اُس زمانے میں تیزی کے ساتھ بڑھتے ہوئے قومی جذبے کا سبب بڑی حد تک دو عنصر کہے جاسکتے ہیں۔ اُن میں سے ایک تھا۔ عام لوگوں کی بگڑتی ہوئی معاشی حالت اور دوسرا متوسط طبقات کی غیر اطمینانی۔ چنانچہ ہندوستان میں سیاسی شعور کی ابتدائی اور فروغ اور اُس کی خصوصی نوعیتوں کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اُس معاشی منظر کا جائزہ لیا جائے جو برطانوی تاج کی حکومت کی پہلے پچاس سال میں نمودار ہوا۔

---

[1] دوارکا ناتھ ٹیگور کی طرح کے کچھ مستثنیات بھی تھے جنھوں نے پچھلی صدی کی چوتھی دہائی میں ایک کوئلے کی کان شروع کی اور شکر صاف کرنے کا جدید کارخانہ قائم کرنے کا خیال ظاہر کیا۔

معاشی تبدیلی کی بڑی نوعیت یہ تھی کہ آہستہ آہستہ دولت کی پیداوار اگر بڑھی تو آبادی میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ اور دولت کی تقسیم اور زیادہ غیر مساوی ہوگئی۔ کچھ لوگ زیادہ دولت مند ہوگئے۔ لیکن اُن کی بہت بڑی اکثریت زیادہ افلاس اور دکھوں میں مبتلا ہوگئی۔ فی الجملہ حکومت کی پالیسیاں معاشی ترقی میں معاون نہیں تھی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ بڑھتی ہوئی پیداوار اور قومی آمدنی کے لیے زیادہ تر مضر تھیں۔ انھوں نے تجارت کو فروغ دیا۔ لیکن صنعت کاروں کی راہ میں رکاوٹیں ڈالیں۔ بچولیوں اور بدیسی اصل کاروں کو فائدہ پہنچایا۔ لیکن اصل پیداوار کرنے والوں کی حالت اور خراب کردی۔ برطانیہ کے صنعتی سامراج نے ہندوستان کے ساتھ نوآبادی کا سا برتاؤ کیا۔ اور اُس کی معیشت کی ساخت استعماری نوعیت کی سی بنادی اس نے ایک شیطانی چکر شروع کردیا۔ جو استعماری نظاموں کی ایک نمایاں خصوصیت ہوتی ہے۔ ایک طرف تو اُس نے دیہی نظام کو جو بڑی حد تک غیر سرمایہ دارانہ تھا اور جس کی پیداواری صنعت میں اصل کاری کرنے کے لیے ضروری فاضل سرمایہ مہیا نہیں کرسکتی تھی۔ غیر متحرک بنا دیا اور دوسری طرف اُس نے جدید بڑی بڑی صنعتوں کے فروغ میں رکاوٹ ڈالی۔ سرمایہ داری سے پہلے کی پس ماندہ صنعت اتنی فاضل دولت نہیں پیدا کرسکتی تھی کہ وہ زراعت کو جدید بنانے اور صنعت نو کے لیے سرمائے کی شکل اختیار کرسکے۔ جو ہندوستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کو روزگار فراہم کرسکے اور زمین پر بوجھ کم کرسکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ متوسط طبقے کی تعداد اور دولت میں تو اضافہ ہوا لیکن عام لوگ تکلیفوں اور دکھوں میں مبتلا رہے۔ اول الذکر کی سرگرمیاں مذہبی اور سماجی اصلاح، تعلیم، سیاست، فنون و ادب میں بڑھ گئی۔ لیکن عام لوگوں کی طرف توجہ نہیں دی گئی۔ وہ جہالت کے اندھیروں میں بھٹکتے اور بیماری اور قلت کے شکار تھے۔

اس تمام مدت میں (8581 لغایت 5091) ہندوستان کی 09٪ فی صدی سے زیادہ آبادی گاؤں میں رہتی تھی۔ اس زمانے میں آبادی میں تقریباً 05 فی صدی کا اضافہ ہوگیا۔[1] لیکن مصنوعات کی صنعت اور غیر زراعتی پیشوں میں بڑھتی ہوئی تعداد کی تناسب سے روزگار کے مواقع نہیں بڑھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس بڑھتی ہوئی تعداد کا سارا بوجھ زراعت پر پڑا جس میں

[1] 2781 میں آبادی 03 کروڑ 06 لاکھ تھی جو 1191 میں بڑھ کے تقریباً 13 کروڑ پچاس لاکھ ہوگئی۔

عہد وسطیٰ کی تکنیک استعمال کی جاتی تھی۔اس نے جس صورت حال کو جنم دیا اسے ویرانسٹے نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے" مغرب میں عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ محض زراعت سے فی مربع میل تقریباً 052اشخاص سے زیادہ کی گذر بسر نہیں ہوسکتی ہے۔لیکن ہندوستان کے بڑے بڑے دیہی علاقوں میں اوسطاًفی مربع میل 006 سے زیادہ اشخاص آباد ہیں۔[1]

آبادی کا تقریباً 3 / 5 حصہ ملک کے پانچویں حصے میں آیا تھا۔[2] دیہی صنعتوں کے زوال نے زمین پر بوجھ بڑھا دیا تھا۔اس کی وجہ سے پیشہ وارانہ ذاتوں سے تعلق رکھنے والوں کو اپنا آبائی پیشہ ترک کر کے کاشت شروع کرنی پڑتی۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زراعت غیر منافع بخش بن گئی۔ کسان کی زمین کے اوسط رقبہ میں تخفیف ہوگئی اور بہت سے ہندوستانیوں کو افلاس کی زندگی گزارنے پر مجبور ہونا پڑا۔اس نصف صدی میں بار بار پڑنے والے تباہ کن قحط اس امر کا ثبوت ہیں کہ ملک کو روگ کھائے جارہا تھا۔

IV زراعت اور کسانوں کی حالت

یہ بات بڑی عجیب ہے کہ جس وقت زراعت کے فروغ کے لیے سازگار حالات پائے جاتے تھے۔کسان کی حالت خراب تر ہوتی جارہی تھی۔مثال کے طور پر زیر زراعت مجموعی رقبہ جو 92-1891 میں اٹھارہ کروڑ ستر لاکھ پچھتر ہزار ایکڑ تھا۔وہ 2-1901 میں بڑھ کے اُنیس کروڑ نوے لاکھ اکتھر ہزار ایکڑ اور 11-1910 میں بائیس کروڑ تیس لاکھ ایکڑ ہوگیا۔اس قسم کی اور زیادہ قابل زراعت زمین میں زراعت نہیں کی جارہی تھی۔کاشت کی جانے لگی اور سینچائی کی سہولتوں یعنی کنوؤں اور نہروں کا اضافہ کیا گیا۔اس کو بڑھتی ہوئی خوشحالی سے تعبیر کیا جاسکتا تھا۔اور کچھ لوگوں نے کیا بھی۔لیکن بڑھتی ہوئی آبادی کے تناسب میں یہ اضافہ کافی نہیں تھا۔زیادہ بری بات یہ ہوئی کہ غذائی اجناس اور دوسری قسم کی فصلوں میں اس کی منصفانہ تقسیم نہیں کی گئی۔حالانکہ 2-1901 میں ختم ہونے والے دس سال میں اُس رقبہ میں جس میں فصلیں بوئی گئیں۔ایک کروڑ

---

[1] انسٹے،دی،The Economic Development of India صفحہ 04

[2] گیان چند Indian's Teeming Miltrons صفحات 09-19

بیس لاکھ ایکڑ کا اضافہ ہوگیا۔ لیکن غذائی فصلوں میں محض ستائیس لاکھ ایکڑ کا اضافہ ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ 1891 اور 1911 کے درمیانی بیس برسوں میں غذائی فصلوں میں 3 فیصدی کی کمی ہوگئی۔ مندرجہ ذیل نقشے[1] سے ظاہر ہوتا ہے کہ غذائی فصلوں کی جگہ کس طرح غیر غذائی فصلیں لے رہی تھیں۔

نقشہ

برطانوی ہند میں زیر کاشت مجموعی رقبے میں مختلف فصلوں کے رقبے کا فی صد تناسب (اس میں برما شامل نہیں ہے)

پانچ سالہ مدت

	1890-91	1895-96	1900-1	1905-6		
	تا	تا	تا	تا		
	1894-95	1899-99	1904-5	1909-10	1910-11	1911-12
غذائی	81.3	81	80.4	79.4	79.3	78.2
تلہن	6	5.5	5.7	5.4	5.6	6.5
پٹسن	1	1	1.1	1.4	1.2	1.4
کپاس	4.6	4.4	5.1	5.7	5.9	9

لیکن کل ہند اعداد و شمار سے پوری کہانی نہیں معلوم ہوتی ہے، کچھ صوبوں میں غذائی فصلوں کی جگہ تجارتی فصلیں اتنی زیادہ بوئی جانے لگیں کہ ایک مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ مثال کے طور پر شمالی اور مشرقی بنگال میں 91-1890 اور 95-1894 کی درمیانی پانچ سالہ مدت میں وہ رقبہ جس میں غذائی فصلیں بوئی جاتی تھیں 71.48 فیصدی تھا جو 12-1911 میں گھٹ کے 67.7 فیصدی ہوگیا۔ اور جس میں پٹ سن بویا جاتا ہے وہ اسی مدت میں 11.28 فیصدی سے بڑھ کے 14.1

[1] دت۔ کے۔ ایل Report on the Enquiry in to the rise of prices of India 4191() صفحہ 46

فیصدی ہوگیا۔جنوبی مدراس میں غذائی فصلوں کا رقبہ 82.78 سے گھٹ کر 76.8 فیصدی رہ گیا اور تلہن کی کاشت کا رقبہ 6.71 سے بڑھ کے 10.6 فیصدی اور کپاس کا 4.8 سے بڑھ کے 7 فیصدی ہوگیا۔اسی طرح سندھ میں 95-1894 میں ختم ہونے والی پانچ سالہ مدت میں کپاس کی کاشت کا علاقہ 3.06 فیصدی تھا۔جو 12-1911 میں بڑھ کے 10.3 فیصدی اور برابر میں 33.6 سے بڑھ کے 46.1 فیصدی ہوگیا تھا۔[1] اس میں شک نہیں کہ تجارتی فصلوں کی مانگ اور پیداوار کی بنا پر ان فصلوں کے علاقوں کے کسان زیادہ خوشحال ہوگئے تھے۔لیکن ملک کو اس کی قیمت غذائی قلت اور غذائی اجناس کی بڑھتی ہوئی قیمتوں کی شکل میں ادا کرنا پڑی۔کھیتی ہر مزدور طبقے کو جن کی تعداد بڑھ رہی تھی اس کی نتیجے میں بڑے دکھوں کا سامنا کرنا پڑا۔

زراعتی پیداوار اور اس سے آمدنی میں زیادہ اضافہ نہ ہونے کی ایک وجہ اور بھی تھی پنجاب کی بڑی آراضی اور ملک کی ایسے دوسرے حصوں کے علاوہ جہاں سینچائی کی سہولتیں موجود تھیں۔زیر کاشت لائی جانے والی زیادہ تر بنجر اور عام طور سے خراب قسم کی زمین تھی۔ان علاقوں میں اسی آراضی کی پیداوار اُن زمینوں سے کم تھی جن پر پہلے سے کاشت کی جارہی تھی۔اس کی وجہ سے اور پیداوار کی پچھڑی ہوئی تکنیک اور کھیتوں کے چھوٹے رقبوں کی وجہ سے فی ایکڑ پیداوار میں اضافہ نہیں ہوا۔

غذائی پیداوار کے اعداد وشمار سے ظاہر ہوتا ہے کہ 6-1905 میں ختم ہونے والی پوری مدت میں اوسطً پیداوار بدستور رہی۔یعنی تقریباً سات کروڑ بیس لاکھ ٹن سالانہ۔اس مجموعی پیداوار میں سے کچھ حصہ برآمد کیا جاتا تھا۔صارفین کی تعداد برابر بڑھ رہی تھی۔اس کے متعلق وثوق سے نہیں کہا جاسکتا ہے کہ اس کی وجہ سے فی کس غذا کے صرف میں کمی ہوئی یا نہیں۔ ڈبلیو۔ڈبلیو۔ہنٹر کے مطابق ''بڑے بڑے علاقوں میں جہد حیات اُس سے زیادہ بڑھ گئی ہے جتنی اُس وقت تھی جب وہ علاقے ہمارے ہاتھوں میں آئے۔''[2] اُس نے اضافہ کیا کہ اس کا

---

[1] کم پیداوار اور چھوٹے چھوٹے کھیتوں کے باہمی رشتے کے لئے دیکھئے ارون جے لانگ Theeconomic basis of land reform.

[2] ہنٹر۔ڈبلیو،ڈبلیو، The Indian of the Queen (1930) صفحہ 99

افسوسناک نتیجہ یہ ہے کہ ہم زمین چاہے مالکان آراضی کو دیں۔ جیسا کہ بنگال میں ہوا یا جنوبی ہند کی طرح اپنے ہاتھوں میں رکھیں۔ زیادہ تر لوگوں کے لیے جہد حیات مشکل تر ہو جاتی ہے۔[1]

اُس کا خیال تھا ''زمین سے اتنی غذائی اجناس پیدا کی جارہی ہیں جتنی پہلے نہیں کی جاتی تھیں۔لیکن غذا کی اجناس میں اضافے کی شرح سے زیادہ تیز ہے آبادی میں اضافے کی شرح،[2] یہ خرابی کس حد تک بڑھ گئی ہے۔اس کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔ برطانوی ہندوستان کے 2/5 لوگ جتنے خوشحال ہیں جتنے وہ پہلے مقامی حکمرانوں کی حکومت میں کبھی نہیں تھے۔دوسرے 2/5 کسی نہ کسی طرح اپنی گزر بسر کر لیتے ہیں۔لیکن آبادی کا بقیہ پانچواں حصہ یا چار کروڑ انسان پیٹ بھر کے روٹی نہیں کھا پاتے ہیں۔[3]

اس میں شک نہیں کہ حکومت نے زراعت کو ترقی دینے کی کوشش کی 1870 اور 1880 کی درمیانی مدت میں جدید طریقوں اور ذریعوں کا مظاہرہ کرنے کے لیے تجرباتی فارم شروع کئے گئے۔1880 کے قیمت کمیشن کی سفارش پر ایک محکمۂ زراعت قائم کیا گیا۔لیکن ابتدائی کچھ برسوں میں اُس نے محض زراعت کے متعلق اعداد وشمار جمع کئے۔ 1889 میں ایک زراعتی کیمسٹ ڈاکٹر ولکر ہندوستان آیا اور بہت تحقیق وتفتیش کے بعد اُس نے ایک بیش بہا رپورٹ پیش کی۔ 1901 میں صوبوں کے زراعتی محکموں میں تال میل پیدا کرنے کے لیے ایک زراعت کا انسپکٹر جنرل مقرر کیا گیا۔ایک معتبر امریکی مسٹر فلپس کی فیاضی کی بنا پر حکومت کو پوسا ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کرنے کا موقعہ ملا۔زراعت تعلیم کے لیے کچھ اسکول اور کالج قائم کئے گئے۔لیکن ان اقدامات نے پیداوار کی طریقوں پر زراعت کی پیداوار میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں کی۔ زیادہ تر تحقیق اتفاقی نوعیت کی تھی۔[4] اور اگر اس کے نتائج نکلیں بھی تو اُن سے کسانوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

ذرائع اور روقت اور مواصلات کی ترقی ایک اور ایسا عنصر تھا جسے کسان کی خوشحالی میں معاون

---

[1] ایضاً صفحہ 741

[2] ایضاً صفحہ 741

[3] ایضاً صفحہ 115

[4] Moral and Material Progress During1591-25 صفحہ 923

ثابت ہونا چاہیے تھا۔منڈیاں بڑھ گئیں تھیں۔ بدیس میں بہتر قیمتیں مل رہی تھیں اور ملک کے اندر بھی قیمتیں اُن کے برابر ہوتی جارہی تھیں۔

ریلوں نے ہندوستان کی معاشی ترقی میں کوئی اہم رول ادانہیں کیا اس بات کو ہیلن لیمپ نے ان الفاظ میں کہا ہے۔''ہندوستانی ریلوں کی ترقی کے خطروں کو اگر چہ ریاست نے برداشت کیا اور 1901 میں جب ریلوں سے منافع ہونے لگا تھا۔حکومت پر پانچ کروڑ پاؤنڈ کا بار پڑ چکا تھا۔ پھر بھی ہندوستانی ریلوں کے جال نے فی الجملہ اور مجموعی ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ ہندوستان نے کچھ نقصان تو اُٹھائے لیکن ریلوں کی ترقی کی ریاستی ذمہ داروں سے کئی بڑے فائدے حاصل نہیں ہوئے۔ ریلوں کا کوئی منصوبہ بنایا گیا تھا۔'' ہندوستانی ریلوں کے وکیل اور معمار آر۔ایم۔اسپٹوینس کے مطابق یہ مقصد دو تھے۔ پہلا مقصد فوجی یعنی کم سرمایہ لگا کر پورے علاقے کا بہتر دفاع کرنا اور دوسرا ہے تجارتی جس کی بڑی غرض ہے ملک کے طرح طرح کی پیداواروں کو اندرون ملک سے قریب ترین بندرگاہ تک پہنچانا اور اس کے بدلے میں انگلستان کا بنا ہوا سامان نمک وغیرہ وہاں پہنچانا۔[1] دوسرا سازگار عنصر جو ہندوستانی معیشت کے لیے معاون ثابت ہوسکتا تھا۔ وہ تھا دنیا میں عام طور سے قیمتوں کا بڑھنا جس کی ابتدائی 1861 میں ہوئی اور پوری کی پوری انیسویں صدی میں جاری رہی۔[2] 1891 سے قیمتیں تیزی کے ساتھ بڑھنے

---

[1] جوش۔جی۔دی۔تقریر اور تحریر، صفحہ 006

[2]

غذا(60مدات)	(خام مال29مدات)	کل قیمتیں	(100مدات)
0781-7681	001	001	001
0481	401	301	501
0881	801	801	601
0981	811	801	411
0091	201	021	931
5091	931	611	031

لگیں اور 1905 کے بعد تو وہ اُڑنے لگیں۔ کے۔ ایل۔ دت کے تخمینوں کے مطابق ایرمطالعہ یعنی 1890 سے 1912 تک قیمتوں میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ پانچ سالہ مدتوں کے اعتبار سے کچھ خاص خاص غذائی اجناس کی حد تک 1865 سے 1905 تک کے چالیس سال میں قیمتوں میں مندرجہ ذیل تبدیلیاں ہوئیں۔

سال	دھان	گیہوں	چنا	باجرا	راگی
1865	25.8	22.6	29.1	23.7	28.2
1885	13.2	14.3	16.6	18.5	22
1905	8.4	11.5	13.5	13	20

پورے ہندوستان کے اشاریہ اعداد ظاہر ہوتا ہے کہ 1900 سے 1904 تک کی پانچ سالہ مدت میں روپئے کی شکل میں قیمتوں میں 8 فیصدی اور 1905 سے 1909 تک کی پانچ سالہ مدت میں 31 فیصدی کا اضافہ ہوا [1] غذائی اجناس کی قیمتوں میں خصوصیت کے ساتھ زیادہ اضافہ ہوا۔ دت کے خیال میں اس اضافہ کی داخلی اور خارجی وجوہ تھیں۔ اس کی رائے میں اول الذکر میں مندرجہ ذیل شامل تھیں۔ غذائی اجناس کی پیداوار میں مقابلتاً کمی، آبادی میں اضافہ اور ہندوستان اور بدیسی ملکوں میں بھی غذائی اجناس، غیر غذائی اجناس اور خام مال کی بڑھتی ہوئی مانگ، آمدورفت کے سستے ذرائع، روپئے کا پھیلاؤ اور بنک کاری کی سہولتوں میں اضافہ، عالمی وجود میں مندرجہ ذیل اہم تھیں۔ سونے کی بڑھتی ہوئی سپلائی، قرض کا پھیلاؤ، جنگوں کی لائی ہوئی تباہی اور جنگی تیاریوں کی طرح کی غیر پیداواری سرگرمیوں کی طرف محنت اور سرمائے کی منتقلی۔ [2]

لیکن محض تھوڑی مدت کے لیے پچھلی صدی کے ساتویں دہائی میں کپاس کی اونچی قیمتوں نے بمبئی، دکن اور برابر کے کسانوں کو خوش حال بنادیا ورنہ قیمتوں میں اضافہ کی بنا پر ہندوستانی کسانوں کی حالت نہیں سنبھلی اس کی جزوی وجہ یہ تھی کہ کسان کے کھیتوں کا رقبہ کم تھا اور پیداوار کم ہوتی تھی۔ جس کی وجہ سے ایک اوسط کسان کی فاضل پیداوار جو منڈی میں لائی جاسکتی بہت کم ہوتی تھی اور جزوی وجہ تھی حکومت کی محاصل کی پالیسی اور تقسیم کار غیر منصفانہ نظام۔

---

[1] دت۔ کے۔ ایل، Report on enquiry into the rise of Prices صفحہ 64

[2] ایضاً صفحہ 6

مالگزاری

مالگزاری کے دو خاص نظام رائج تھے۔ ایک تو وہ تھا جس میں کسان اور حکومت کے درمیان مالک آراضی کے طور پر ایک درمیانی طبقہ تھا جس کو زمینداری نظام کہا جاتا تھا۔ اور دوسرا وہ جس میں حکومت براہ راست کسانوں سے معاملہ کرتی تھی اور جو رعیت داری نظام کہلاتا تھا۔ زمینداری نظام کی ایک قسم کی محال داری تھی جس میں پورا گاؤں یا زمینداروں کا ایک گروہ مجموعی اعتبار سے زمین کا مالک سمجھا جاتا تھا۔

زمینداری نظام 48 فی صدی علاقے میں رائج تھا۔ جس میں سے 29 فی صدی میں پچیس یا تیس سال کے لیے عارضی بندوبست تھا۔ اور 19 فی صدی میں بندوبست استمراری تھا۔ جس علاقے میں بندوبست استمراری تھا، اس کے علاوہ جو علاقہ تھا، وہاں مال گزاری کی شرح اتنی اونچی تھی کہ زمین کو ترقی دینے کے لیے اُن کے پاس کچھ نہیں بچتا تھا۔

بنگال کے جن اضلاع میں بندوبست استمراری تھا۔ وہاں مالگزاری کل پیداوار کی 11 فیصدی سے کچھ زیادہ تھی۔ لیکن گجرات میں جہاں عارضی بندوبست تھا۔ مالگزاری پیداوار کی 20 فیصدی یا بنگال کی شرح کی تقریباً دگنی تھی۔ شمالی ہندوستان میں لگان کا 50 فیصدی مالگزاری کے طور پر ادا کیا جاتا تھا۔ لیکن مالک آراضی کا حصہ دوسرے فاضل (لگان کے 8 فیصدی) اور گاؤں کے چوکیدار اور مُکھیا کو ادا کی جانے والی رقموں کی بنا پر اور کم ہو جاتا تھا۔[1] پنجاب میں محاصل لگان کے 121/2 فیصدی ہوتے تھے۔ صوبجات متوسط میں اگرچہ حکومت کا حصہ لگان کا 40 سے 50 فیصدی تک مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن حقیقت میں سرکاری مطالبہ 50 سے 79 فیصدی تک ہوتا تھا۔

جس علاقے میں رعیت داری نظام رائج تھا۔ وہ زیر کاشت زمین کے 52 فیصدی رقبے پر مشتمل تھا۔ بمبئی اور مدراس کے رعیت داری علاقے میں حالات بدتر تھے۔ بمبئی پریسیڈنسی میں 1866 کے بندوبست میں مالگزاری کے شرح میں اتنا اضافہ کر دیا گیا کہ اُسے ''بدترین معنی میں خون چوسنا کہا جا سکتا تھا۔'' واقعہ یہ تھا کہ کاشت کی لاگت اور سرکاروں کے مطالبے کے بعد اُن

[1] دت۔ رمیش۔ عہد وکٹوریہ میں ہندوستان کی معاشی تاریخ (1509 اڈیشن)، صفحہ 964

کے پاس کچھ بچتا ہی نہیں تھا۔[1]

مدراس میں مال گزاری کا نیا بندوبست کیا گیا۔ جس نے بقول دت محصول کا بوجھ بڑھا دیا۔ اس نے لکھا ہے۔ ''صوبے کی مجموعی پیداوار اور اس کی پیداوار کی قیمتوں کے تناسب میں اگر سرکاری مطالبے پر غور کیا جائے تو بلاشبہ کہا جاسکتا ہے کہ 1875 میں 1860 کے مقابلے میں لوگوں پر محصول کا زیادہ بوجھ ڈالا گیا'' اُس زمانے کی انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کی طرح کے اعلیٰ حاکم مسٹر جیمس ملیٹ نے خود اعتراف کیا ''اس میں شک نہیں کہ جو شرح لگائی گئی وہ اگر پورے لگان پر مشتمل ہوتی ہے اور میں سمجھتا ہوں اکثر اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ منافع بھی کم کردیتی ہے۔[2]

جن علاقوں میں مالکان آراضی کے لگان کی بنیاد پر تشخیص کی شرحیں مقرر کی جاتی تھیں وہاں تاج کو حکومت ہندوستان منتقل ہونے کے بعد کے پچاس برسوں میں یہ رجحان تھا کہ مالکان آراضی زمینوں کے لگان میں اضافہ کردیتے تھے اور جن علاقوں میں عارضی بندوبست تھا وہاں تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد بندوبست کے موقع پر حکومت مالگزاری کی شرحوں پر نظرثانی کرتی تھی اور اُنھیں بڑھا دیتی تھی۔

تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد ہونے والے بندوبستوں کے نتیجے میں کساد بازاری آتی تھی۔ اس لیے کہ کسان اضافہ سے بچنے کے لیے دوسرے بندوبست سے دو ایک سال پہلے اپنی زمینوں میں کاشت کردیتے تھے۔

اس کے باوجود 61-1850 سے 5-1904 تک مالگزاری کی وصول میں 50 فیصدی کا اضافہ ہوگیا۔[3] اس میں کچھ اضافے کئے ان اعداد میں وہ اضافہ شامل نہیں ہے جو 78-1877 کے بعد آبپاشی کی بنا پر ''مالگزاری'' کی حد میں ہوئی اور اس لیے صحیح صورت حال پیش کرتے ہیں۔ یہ اعداد statistical based abstracts of British India کے مختلف شماروں سے لی گئی ہیں۔

---

[1] ایضاً صفحہ 233

[2] ایضاً صفحہ 913

[3] ہندوستان کی حالت پر سرجان کیسرڈ کی رپورٹ، صفحہ 93

بنگال	کروڑ روپئے
1793	3.13
1885	16

1858 سے 1879 تک ہونے والا اضافہ	فی صدی
شمالی مغربی صوبجات	14.1
اودھ	17
متوسط صوبجات	13.8
پنجاب	3.9
اڑیسہ	4.3
مدراس	5.5
بمبئ	23.3
میسور	10
برار	22

لگان میں اضافہ کی وجہ تھی اس زمانے میں زیر کاشت آنے والے رقبے کی توسیع لیکن یہ واحد وجہ نہیں تھی۔ قیمتوں میں اضافے سے جو فائدہ ہوا وہ حکومت نے حاصل کیا اور کسان تک نہیں پہنچ سکا۔

کسان کی افلاس اور کاشت کی پس ماندگی کی بنیادی وجہ تھی۔ زمین کی لگان داری اور مالگزاری کا نظام ناناوتی اور انجاریا کے الفاظ میں ''بندوست استمراری میں لگان داری کے نظام کی بنا پر بہت سی خرابیاں وجود میں آ گئی تھیں۔ مثلاً غیر حاضر زمینداری، انتہائی لگان، کسانوں کی معاشی نیم غلامی وغیرہ۔ دوسرے قسم کی لگان داریوں والے علاقے بھی اُن خرابیوں سے محفوظ نہیں ہیں۔ اس کے علاوہ واضح مسلمہ اصولوں کے کسی واحد نظام کی عدم موجودگی نے مالگزاری کے نظام کو جنم دیا ہے۔ اُس نے انھیں اور کنگال بنا دیا ہے۔ اور اُس کے نتیجے میں زمین کو لا پرواہی کے

ساتھ استعمال کیا جا رہا ہے۔[1]

اوسط لگان داری کے چھوٹے رقبے کی ایک اور اہم وجہ تھی جس کی وجہ سے زراعتی پیداوار کی قیمتوں میں اضافے اور اُن کی بدیسی ملکوں میں مانگ سے کسان فائدہ نہیں اٹھا سکا۔ معقول اعداد وشمار کی عدم موجودگی میں یہ تو دشوار ہے کہ انیسویں صدی میں لگان داری کے مسلسل کم ہوتے ہوئے رقبے کے متعلق کوئی بات وثوق سے کہی جا سکے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بمبئی دکن کی صورت حال پورے ملک کے حالات کی طرح تھی۔ ہرلڈ مان کے مطابق دکن میں کسان کی اوسط لگان داری کا رقبہ 1771 میں 40 ایکڑ تھا۔ جو 1818 میں 17.5 ایکڑ، 1820 اور 1840 کے درمیان 17 ایکڑ اور 1910 میں 7 ایکڑ ہو گیا۔ ان میں سے 11 فی صدی 15 ایکڑ سے کم کے تھے۔ ان کا رقبہ غیر معاشی تھا۔

برج نرائن نے لکھا ''یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ پورے پنجاب میں (اور پنجاب کا معاملہ مُستثنیات میں شامل نہیں ہے) اُن اضلاع کے علاوہ جہاں سینچائی کی نہروں کی بنا پر بہت سی نئی زمین زیر کاشت آ گئی ہے لگان داری کا اوسط رقبہ، جو پہلے ہی کم تھا۔ تعداد بڑھنے کے ساتھ اور چھوٹا ہوتا جا رہا ہے۔[2]

ان لگان داریوں کے بٹوارے کی ایک اور تکلیف دہ نوعیت یہ تھی کہ اُن کے ٹکڑے دور دور بکھرے ہوئے تھے۔ اوسطاً ہر لگان داری 5 سے لے کر 8 تک ٹکڑوں میں بٹ گئی تھی۔ اس وجہ سے زراعت کی پیداوار کی نسبت سے لاگت بڑھ گئی۔ کسان کو زیادہ محنت اور زیادہ وقت صرف کرنا پڑتا تھا اور زراعت کی غیر معاشی نوعیت میں اضافہ ہو گیا تھا۔

---

[1] ناناوتی اور انجاریہ، محولہ بالا صفحہ 24

[2] برج نرائن، 9291 (Indian Economic life) صفحہ 53

برج نرائن کے مطابق 7291 میں پنجاب میں 7.92 ملین ایکڑ زمین زیر کاشت تھی۔ ان میں 5.61 ملین ایکڑ اُن کسانوں کے پاس تھی جو نقد یا جنس کی شکل میں لگان دیتے تھے۔ اتر پردیش میں 0291 میں 5.82 ملین ایکڑ میں سے 9.12 ملین ایکڑ اور اودھ میں 01 ملین میں سے 4.8 ملین ایکڑ نقد یا جنس کی شکل میں لگان پر اُٹھے ہوئے تھے۔

لگان داریوں کے بٹوارے کی خرابی کی جڑیں ہندو اور مسلم خواتین وراثت میں پیوست تھیں۔لیکن آبادی کے اضافے اور مقامی صنعتوں کے زوال نے اس خرابی میں شدت پیدا کردی تھی اور اُس کی رفتار بڑھادی تھی۔

کسان مالکان آراضی کے آہستہ آہستہ کم ہوتا رقبہ اور درمیانی لوگوں کو نقد یا جنس کی شکل میں لگان ادا کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ معمولاً ادا کئے جانے والے لگان کی جگہ تقابلی لگان اور زمینداروں کے من مانے انداز سے کسانوں کو بے دخل کرنا وہ مزید اُمور تھے۔جنھوں نے زراعتی آبادی کو دکھوں میں مبتلا کردیا تھا۔

تھورتر کے مطابق ''بیسویں صدی میں اور غالباً پچھلی صدی کے ربع آخر میں بھی ہندوستان کی زراعت میں فیصلہ کن عنصر یہ تھا کہ زیادہ تر کسانوں کے پاس سرمایہ نہیں تھا۔''

غذائی صورت حال

انیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان معیشت کا ایک اہم عنصر تھا غذا کی قلت۔اس کی جزوی وجہ تو یہ تھی کہ آبادی میں اضافے کی مناسبت سے مجموعی طور سے زیر کاشت رقبے میں اضافہ نہیں ہوا اور جزوی وجہ تھی کہ غذائی فصلوں کی جگہ تجارتی فصلوں کی کاشت۔

93-1892 سے 5-1904 تک مجموعی اعتبار سے زیر کاشت رقبے میں 17.4 ملین ایکڑ یا 8 فیصدی کا اضافہ ہوا۔لیکن غذائی فصلوں کے رقبے میں 5.39 ا ایکڑ یا 3 فی صدی کا اور غیر غذائی فصلوں کے رقبے میں 12 ملین ایکڑ یا 29 فی صدی کا اضافہ ہوا۔چونکہ اُسی مدت میں آبادی میں تقریباً 15 ملین کا اضافہ ہوگیا جس کے لیے 10.5 ملین ایکڑ اور چاہیے تھے۔اس لیے یہ ظاہر ہے کہ 5.39 ملین ایکڑ بڑھی ہوئی آبادی کے محض نصف حصے کی ضرورت پوری کرسکتی تھی۔[1]

زراعتی پیداوار میں تبدیلی اتفاقیہ نہیں ہوئی تھی۔اس کی جزوی وجہ تو یہ تھی کہ دنیا کی منڈیوں میں ہندوستان کے نام مال کی مانگ بڑھ گئی تھی اور جزوی طور سے یہ نتیجہ تھا حکومت کی پالیسی کا۔جہاں تک صنعتوں کا تعلق تھا۔حکومت ہندوستان 1919 تک عدم مداخلت کی اصول پر کاربند رہی لیکن زراعت کے معاملے میں اس نے ایسی فصلوں کو فروغ دینے کے عملی اقدامات کئے جو یا تو

---

[1] دیکھئے جوشے۔جی۔وی۔تقریریں اور تحریریں صفحات 7-6-8-6

انگلستان کے لیے خصوصی اہمیت رکھتی تھیں۔ (مثلاً کپاس اور پٹ سن) یا جن سے ہندوستان کے لیے زرمبادلہ حاصل کیا جاسکتا تھا۔ مثلاً چائے اور سنکونا۔

امریکہ میں خانہ جنگی شروع ہونے کے بعد صوبجات متوسط اور برار کے لیے ایک کاٹن کمشنر (کپاس کا کمشنر) مقرر کیا گیا۔ اور شمالی مغرب صوبجات (اتر پردیش) میں کپاس کی کاشت کو توسیع دینے کے اقدامات کئے گئے۔[1] 1862 میں اس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کیا گیا کہ بندوبست استمراری کو توسیع دی جائے۔ اور کپاس کی کاشت کو فروغ دینے کے لیے آبپاشی کے ذرائع کو ترقی دی جائے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور حکومت میں نیل کی کاشت کی ہمت افزائی کی گئی اور مالواس میں افیم کی کاشت کے لیے تعاون دی گئی۔ جس کی وجہ سے اس علاقے سے آنے والی غذائی اجناس میں کمی آگئی۔[2] 1893 سے 1906 تک غذائی فصلوں کی اوسط سالانہ پیداوار کا اشاریہ 100 سے گھٹ کے 96 ہوگیا۔ اور تجارتی فصلوں کا اشاریہ 100 سے بڑھ کے 105 ہوگیا۔ اسی زمانے میں غذا کی اوسط پیداوار 73.9 ملین ٹن سے گھٹ کر 71.5 ملین ٹن رہ گئی۔ چنانچہ فی کس سالانہ غذا 5871 پاؤنڈ سے گھٹ کر 560 پاؤنڈ رہ گئی قحطوں اور غذا کی قلت کے باوجود بدقسمتی سے حکومت نے غذا کی پیداوار بڑھانے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ حالانکہ وہ اُن فصلوں کو بڑھاوا دینے کے لیے عملی کوشش کرتی رہی جن کی مانگ بدیسی منڈیوں میں تھی۔

مقروضیت

برطانوی ہندوستان میں جس نظام آراضی کو رواج دیا گیا اس کی بنیاد تھی، جائداد اور مالکانہ حقوق کا مغربی تصور۔ اس کی وجہ سے زرعی معیشت میں منافعوں کی تقسیم کے جس طریقے نے رواج پایا وہ غیر منصفانہ اور ظالمانہ تھا۔ اس کے نتیجے میں عام لوگ غربت و افلاس کے شکار اور مقروض ہوگئے۔

---

[1] سانڈرز کی شمالی مغربی صوبجات میں تجارت لگان داریوں اور کپاس کی کاشت کے متعلق رپورٹ 1691-26 دیکھئے (داخلی و مال) روداد نمبر 01، اکتوبر 1681

[2] یونائٹڈ پریٹیرین چرچ کے ڈاکٹر مک گل کا خط بنام سیکریٹری آف ایسٹ مورخہ 71، 0781 دیکھئے مراسلات (قحط) (سیکریٹری آف ایسٹ انڈیا بنام حکومت ہندوستان 5091-9681 (غیر مطبوعہ مراسلات)

مالگزاری اور دوسرے کے بندوبستوں کے حقوق کی دستاویزوں، عدالتی نظام اور دیوانی عدالتوں نے زمین کو ایک بیش بہا اور آزادی کے ساتھ منتقل کی جانے والی جائداد بنا دیا تھا۔ جب بڑھتی آبادی اور دوسرے پیشوں میں گھٹتے ہوئے روزگار کے مواقع کی بنا پر زمین کے لیے مقابلہ بڑھا اور اس کے نتیجے میں زمین کی قیمتوں میں اضافہ ہوا۔[1] تو مالک آراضی کے پاس ایسی چیز آ گئی جس کی ضمانت پر آسانی سے قرض لیا جا سکتا تھا۔ اُس نے جو قرض لیا۔ اُسے بغیر سوچے سمجھے خرچ کیا۔ شہر کے سرمایہ دار طبقے نے جب یہ محسوس کیا کہ اصل کاری کے دوسرے تمام راستے بند ہو چکے ہیں تو اُس نے نقد قیمت ادا کر کے یا زمین اور اس کی پیداوار کی ضمانت پر قرض دے کر زمین حاصل کرنے پر توجہ دی۔ جب کسان قرض واپس نہ کر پاتا تھا تو وہ زمین پر قبضہ کر لیتے تھے۔

جب قرض کا بوجھ بڑھ گیا تو مجبوراً کسانوں کو اپنی زمینیں یا تو خوشحال زمینداری اور کسانوں کے یا شہری اور مقامی مہاجنوں کے ہاتھ فروخت کرنی پڑیں۔ اس کی وجہ سے ایک طرف تو ناکارہ درمیانی لوگوں اور سودخوروں کی تعداد بڑھ گئی۔ اور دوسری طرف مزارع، شکمی کسانوں اور کھیتی پر مزدوروں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ پورے ملک میں چاہے وہاں زمینداری نظام رائج ہو یا محال داری یا رعیت داری غریب اور امیر میں فرق بڑھ گیا اور وہ کسانوں جو زیر کاشت علاقے کے 75 فی صدی میں کاشت کرتے تھے۔ صرف اپنی گذر بسر کے لیے پیداوار کرتے تھے۔

موٹے طور سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ دیہی مقروضیت نتیجہ تھی فیوڈل اور دوسری سماج سے تجارتی سماج کی طرف مکمل عبور کا۔ اس کی وجہ سے تبادلہ اشیا اور جنس کی شکل میں ادائیگی کی جگہ زری معیشت نے لے لی۔ رواج کی جگہ مقابلہ شروع ہو گیا۔ اور انتشار و علیحدگی کے بجائے ارتکاز و اکثریت نے رواج پایا۔ یہ نتیجہ تھا دام دویت[2] کی طرح کے مفید رواجوں کے ختم ہو جانے کا اور

---

[1] پنجاب میں 9481 میں ایک ایکڑ زمین کی قیمت مالگزاری کی چھ گنا تھی 8391-93 میں یہ قیمت بڑھ کے 382 گنا ہو گئی تھی۔ دیکھیے ناناوتی اور انجاریا Indian rural problem صفحہ 302۔ ایک تفتیش میں یہ دلچسپ اطلاع سامنے آئی کہ زمین کی قیمت ہر طرح کی زمین کی اوسط قیمت چاہے وہ سینچائی کی زمین ہو یا بنجر 0481-05 میں 3.5 روپیہ فی ایکڑ تھی۔ 0581-16 میں 7.5 روپیہ فی ایکڑ اور 0681-07 میں

[2] یہ ہندوستان کا ایک قدیم رواج تھا۔ جس کی رو سے مقروض اپنے قرض خواہ کو جو رقم ادا کرتا تھا وہ کسی صورت میں اصل رقم کی دگنی سے زیادہ نہیں ہو سکتی تھی۔

گاؤں کی برادری کے زوال کا جو مقامی مہاجنوں کے چنگل سے کسان کو محفوظ رکھتی تھی۔ اور اپنے قدیم سماجی رشتوں اور ملکیت کے پرانے طریقوں کو برقرار رکھتی تھی۔ دیہی آبادی میں اضافے نے اس خرابی کو اور بڑھا دیا۔ [1] ان حالات کی بنا پر ذہن قدیم کاشتکاری خاندانوں سے نکل کر نئے نئے دولت مند طبقوں کے ہاتھوں میں آ گئی۔ [2]

بلاشبہ دیہی مقروضیت محض ہندوستان تک محدود نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ دنیا میں ہر جگہ پائی جاتی ہے۔ بات یہ ہے کہ کاشت بھی ایک صنعت ہے اور دوسری صنعتوں کی طرح اُسے بھی قرض کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن ہندوستان میں جس بات نے قرض کو خصوصی اہمیت دی وہ یہ تھی کہ قرض کا خاصا حصہ غیر پیداواری نوعیت کا تھا۔ دوسرے ترقی یافتہ ممالک کے کسانوں کی طرح ہندوستان کے کسان بیج، کھاد، جانور، اوزار، مشین، زمین یا کنویں وغیرہ کھود کر زمین کو مستقل طور سے ترقی دینے کے لیے قرض نہیں لیتا تھا۔ وہ عام طور سے زمین کا محصول ادا کرنے قلت کے برسوں میں اپنی اور اپنے خاندان کی گذر بسر کرنے یا شادی، بچے کی پیدائش اور موت وغیرہ کی طرح کی سماجی تقریبات کی لیے مہاجن سے قرض لیتا تھا۔ کسان کے سالانہ پیداوار اتنی کم ہوتی کہ وہ محض اس کی گذر بسر کے لیے کافی تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ جب وہ قرض لے لیتا تھا تو آئندہ

---

[1] نہ صرف مجموعی اعتبار سے آبادی میں اضافہ ہوگیا بلکہ اس سے بڑھ کہ یہ ہوا کہ زراعت پر انحصار کرنے والی آبادی کا تناسب تیزی کے ساتھ بڑھا۔ یہ مندرجہ ذیل اعداد سے ظاہر ہوتا ہے۔

9181۔16 فی صدی آبادی کسانوں کی

1091۔66 فی صدی آبادی کسانوں کی

1191۔17 فی صدی آبادی کسانوں کی

1291۔37 فی صدی آبادی کسانوں کی

[2] ڈارلنگ کے مطاق ''پنجاب میں جو مہاجن کسان بن گئے۔ وہ زرعی معیشت میں واحد ترقی پسند عنصر تھے۔ وہ چاروں طرف بکھری ویرانی میں تنہا نخلستان نظر آتا ہے۔ اور اگر کہیں تجربہ کیا جا رہا ہے تو ایک روپیے کے خلاف دس روپیے کا سرمایہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُس کے پس پشت کوئی کردار ہوگا۔ ڈارلنگ The Punjab peasanl صفحہ 101

برسوں کی فصلوں سے اُس کی ادائیگی ممکن نہیں ہوتی تھی۔ قرض کسان کی زندگی کا ایک مستقل عنصر بن جاتا تھا۔ بنکنگ انکوائری کمیٹی کو معلوم ہوا تھا کہ بمبئی میں زیادہ تر دیہی قرض غیر پیداواری مقاصد کے لیے لیا گیا تھا۔ اُتر پردیش میں محض 30 فیصدی غربت کی بنا پر 36 فیصدی سماجی، مذہبی اور قانونی رواجوں کے لیے لیا گیا تھا۔ صوبجات متوسط میں 26 فیصدی غیر پیداواری مقاصد کے لیے لیا گیا تھا۔ پنجاب میں زیادہ تر قرض اس لیے لیا گیا تھا کہ خراب فصلوں کے زمانے میں کسان زندہ رہ سکے۔ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی شادیاں کر سکے اور اپنے مُردوں کو جلا سکے یا دفن کر سکے۔[1]

ان حالات میں قرض کا مقصد اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ وہ کسان کو زندہ رکھ سکے۔ اس میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ ترقی کے لیے اصل کاری کی جا سکے۔

ڈارلنگ نے پنجاب کے متعلق لکھتے ہوئے کہا تھا۔ 1880 تک کسان مالک اور مہاجن کی نابرابر جنگ مہاجن کی مکمل فتح میں ختم ہو چکی تھی۔ اگلے تیس سال میں مہاجن اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ گیا تھا اور اُن کی تعداد اور خوشحالی میں بڑا اضافہ ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ بنک کاروں اور مہاجنوں کی تعداد (جن میں اُن کے لواحقین بھی شامل تھے) جو 1866 میں 53,263 تھی، 1911 میں بڑھ کے 1,93,890 ہو گئی۔[2]

1880 کے قیمبن کمیشن جب تحقیق و تفتیش کی، اُس وقت مقروضیت کتنی پھیل چکی اُس کے متعلق تمام صوبوں کی سرکاری رپورٹوں میں کہا گیا تھا کہ کسانوں کا بہت زیادہ بوجھ پایا جاتا ہے۔[3] مسٹر نکلسن نے لکھا تھا کہ صوبجات متوسط میں ''بالعموم کسان نہ صرف بیج کے لیے بلکہ غذا کے لیے بھی زمینداروں سے ملنے والی پیشگی رقموں پر انحصار کرتے تھے۔'' بنگال میں مسٹر[4] سکرائن کو معلوم ہوا کہ ضلع نادیا کے تمام کسانوں کی پچھتر فیصدی تعداد مہاجنوں کے چنگلوں میں پھنسی

---

[1] ڈارلنگ، ای۔ ایضاً، صفحات 91-02

[2] ایضاً، صفحہ 37

[3] نکلسن، چھتیس گڈھ، ومواہ اور بھندارا اضلاع کے حالات کے متعلق رپورٹ۔ ضمیمہ قیمبن کمیشن رپورٹ 0881

[4] اسکواُن کی رپورٹ، قیمبن کمیشن رپورٹ 0881

ہوئی تھی۔ ممبئ میں مسٹر پیلے[1] کے تخمینے 75 فیصدی کسان مقروض تھے۔ جن میں 50 فیصدی ایسے تھے جن کے سروں سے پانی گذر چکا تھا۔ مدراس پریسیڈنسی میں تفتیش[2] سے ظاہر ہوا کہ کرشنا ضلع کے 75 فیصدی اور ویلور کے 80 فیصدی کسان مقروض تھے۔ برار میں میجر سرنز پانسکی کو معلوم ہوا کہ جن کے پاس کچھ سرمایہ تھا۔ ان کی حالت تو اچھی تھی مگر بقیہ کسانوں کا مکمل انحصار ساہوکاروں پر تھا۔[3]

بہار میں شاہ آباد کے کلکٹر کی رپورٹ کے مطابق 50 فیصدی کسانوں پر اُس غلّے کی بنا پر زمیندار کا قرض ہوتا ہے جو زمیندار اُنھیں دیتا ہے اور 40 فیصدی پر غلہ یا روپیہ لینے کی وجہ سے مہاجن کا قرض ہوتا ہے۔[4]

آٹھ سال بعد لارڈ ڈمزن کے حکم سے ایک دفعہ پھر تفتیش کی گئی۔ جس میں ان نتائج کی حمایت کی گئی۔ جو شہادتیں لی گئی اُس سے ظاہر ہوا کہ ''ہندوستان کے تمام حصوں میں بہت سے ایسے لوگ ہیں جو روز کنواں کھود کر پانی پیتے ہیں۔ اور شادیوں اور دوسری تقریبوں میں اصراف بیجا کرنے کی وجہ سے ہمیشہ مقروض رہتے ہیں اور اس مقروضیت کی بنا پر اور اس واقعہ کی بنا پر کہ قرض خواہ کاشت کے منافع کا بڑا حصہ ہتھیا لیتے ہیں، اُن کے پاس برے موسم میں گذر بسر کرنے کے لیے بہت کم یا کچھ نہیں بچتا ہے۔[5]

انیسویں صدی میں مسلسل مقروضیت بڑھتی رہی۔ اچھے موسم اور اچھی فصلوں، خراب موسم اور قلت اور اونچی یا نیچی قیمتوں کا کوئی اثر اس پر نہیں پڑتا تھا۔ 1914 میں جب قیمتیں اونچی تھیں کے ایل۔ دت نے لکھا تھا ''اچھی فصلوں کے زمانے میں اگرچہ اُس کے پاس (کسان کے پاس) قرض کا ایک بڑا حصہ ادا کرنے کے ذرائع ہوتے ہیں لیکن وہ جہاں تک ممکن ہوتا ہے ادائیگی سے

---

[1] پیلے کی رپورٹ ایضاً
[2] قیمبن کمیشن رپورٹ (0881) صفحہ 3 صفحہ 903
[3] میجر سریز پانسکی کا نوٹ، ایضاً صفحہ 692
[4] ڈونل سی۔ جے۔ اوما بہار کی ضرورتیں۔ کلکتہ ریو جلد LXIX9781 صفحات 641-74
[5] تجویز نمبر 95-06 مورخہ 9 اکتوبر 8881 دیکھئے ضمبن بروسیڈنکس، دسمبر 8881

بچتا ہے اور اصراف بیجا کرتا ہے۔ بری فصلوں کے زمانے میں قرض ادا کرنا تو درکنار اُس کے پاس گزر بسر کے لیے کچھ نہیں ہوتا ہے اور اس طرح وہ قرض کے بوجھ کے نیچے ہمیشہ دبا رہتا ہے۔''[1]

ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ ''زیادہ تر ہندوستانی کسان مقروض پیدا ہوتے ہیں اور ترکے میں قرض چھوڑتے ہیں۔[2]

بڑھتی ہوئی مقروضیت کا اہم ترین سماجی اثر یہ ہوا کہ کسان بیدخل ہو گئے اور زمین ساہوکاروں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی۔ اگر ساہوکار خود ایک کسان ہوتا تھا تو اس کی لگان داری میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ لیکن وہ اگر کسان نہیں ہوتا تھا تو غیر حاضر زمیندار اور منافع خور بن جاتا تھا اور بیدخل ہونے والا کاشت کار کسانوں اور مزدوروں کی بڑھتی ہوئی تعداد میں اضافہ کرتا تھا۔ 1866 اور 1895 کی درمیانی مدت میں زمینوں کی منتقلی میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا۔ مندرجہ ذیل نقشہ پنجاب کی کہانی سناتا ہے۔[3]

1866....74	88,000 ایکڑ فی سال
1875....80	93,000 ایکڑ فی سال
1880....85	1,60,000 ایکڑ فی سال
1885....90	3,10,000 ایکڑ فی سال
1890....95	3,38,000 ایکڑ فی سال

تھوربرن نے پنجاب کے منتخبہ حلقوں میں تفصیلی تفتیش کی۔ اُسے معلوم ہوا کہ 742 خاندانوں میں سے 566 بہت زیادہ مقروض تھے یا قریب قریب برباد ہو چکے تھے اور زیر کاشت کل زمین کے 53 فیصدی حصے کا دو تہائی ساہوکاروں کو اور ایک تہائی بڑے زمینداروں کو منتقل

---

[1] دت۔ کے۔ ایل محولہ بالا، جلد 1 صفحہ 161

[2] مدراس کو لیجئے۔ 3581 میں کلکٹر جے۔ بورڈیلون نے لکھا ہے کہ کسان ہمیشہ غربت اور عام طور سے قرض میں پھنسے رہتے ہیں۔ پچھتر سال کے بعد ایک اور کلکٹر ٹی۔ اسٹن نے کہا ''ایک اوسط کسان کو اچھے سال میں فاضل پیداوار نہیں ملتی ہے۔''

[3] ناناوتی انجاریا محولہ بالا، صفحات 33-43

ہو چکا تھا۔ اُس نے 474 گاوؤں کی پڑتال کی۔ ان میں سے 126 بری طرح قرض میں ڈوبے ہوئے تھے، 210 میں قرض کافی تھا اور 138 میں قرض کا بوجھ زیادہ نہیں تھا۔[1]

1901-2 کی مورل اینڈ پراگرس رپورٹ کے مطابق 92-1891 کے بعد پنجاب میں مالکوں کے زیر کاشت علاقے میں صوبے کی مجموعی رقبے کے تناسب سے اور مطلقاً کمی ہوگئی تھی اور اس کمی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ زمین غیر کاشت کار طبقوں کو منتقل ہوگئی تھی۔ صوبجات متوسط میں مقروضیت کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ مدراس میں مقروضیت بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔ جی۔ وی۔ جوشی کے مطابق بمبئی میں موروثی کسانوں کی دو تہائی تعداد نے لگان داری کے حق کھو دئے تھے اور 1894 تک اُن کی حیثیت شکمی کسانوں کی ہوگئی۔[2]

قرض کس طرح بڑھ رہا تھا اُس کا اندازہ اُن لوگوں کی فیصدی تعداد سے لگایا جاسکتا ہے جو قرض سے بچے ہوئے تھے۔ 1907 میں بنگال کے فرید پور میں فیصدی تعداد تھی 55 اور 1919 میں میسور اور پنجاب میں فیصد تعداد تھی 37 اور 17-1930 میں گجرات میں یہ تعداد تھی 22 اور پنجاب میں 13۔[3]

ان حالات کے نہ صرف معاشی نتیجے سامنے آئے اور لوگوں کی بڑی تعداد دکھوں میں مبتلا ہوگئی بلکہ اس نے کچھ سیاسی سوال بھی اٹھا دیے جیسا کہ ای۔ ڈی۔ میک لاگن نے کہا ''بید خلی کے مسائل کسانوں کی مقروضیت کے عام سوال کے محض ایک پہلو کو ظاہر کرتے ہیں۔ یہ وہ پہلو تھا جس نے سیاسی حالات کو راست متاثر کیا اور جس کا فوری تدارک ضروری تھا۔''[4] چنانچہ حکومت کو اس پر توجہ دینی پڑی اور قانون بنانے پڑے۔

1599 میں گورنر جنرل کی کونسل میں پنجاب لینڈ الاینیشن بل (پنجاب میں انتقال اراضی کا بل پیش کرتے وقت چارلس ریواز نے کہا کہ اس کا مقصد ہے کہ اس سیاسی خطرے کا تدارک کرنا

---

[1] پنجاب میں دیہی مقروضیت کی نوعیت کے متعلق تھور برن کی تفتیش لفٹنٹ گورنر ڈینس فٹز پاترک کے حکم سے کی گئی تھی۔ دیکھئے ایشیاٹک کوائرلی ریویو، جولائی 1091، صفحات 56-66 اور 37

[2] بجوشی۔ جی۔ ای۔ محولہ بالا، صفحہ 153

[3] ڈارلنگ، ایو، ایل، بحوالہ بالا، صفحہ 5

[4] ای۔ میک لاگن کا پیش لفظ، ڈارلنگ کی پنجابی کسان، صفحہ VIII

جو پنجاب کے صحت مند مالکان اراضی کی بیدخلی کے نتیجے میں اُٹھ رہے ہیں۔''جو ہندوستان کی نیٹو فوج کے بہترین سپاہی ہیں اور جو نجی زندگی کی تکلیفوں اور کامرانیوں میں یہ سوچتے ہیں کہ اپنے بڑھاپے کے دن اپنی آبائی لگان داریوں میں گزاریں گے۔[1]

پنجاب میں اس کے تدارک کے بدقسمتی سے فرقہ وارانہ نتائج سامنے آئے اس لیے کہ زمین میں کاشت کرنے والے زیادہ تر مسلمان کسان تھے اور ساہوکار زیادہ تر ہندو تھے۔ بنگال کی صورت حال بھی ایسی ہی تھی خاص طور سے مشرقی اضلاع کی۔ وہ دونوں صوبے بعد میں ہندو مسلم تنازعے کی بنیاد اور پاکستان کے حصے بن گئے۔ ہندوستان کی تقسیم میں دوسری طاقتوں نے حصہ لیا ہو یا نہ لیا ہو لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہندو زمینداروں اور ساہوکاروں اور مسلم کسانوں اور مقروضوں میں جو علیحدگی پیدا ہوگئی تھی وہ ایک اہم عنصر ضرور تھا۔

بڑھتی ہوئی مقروضیت اور انتقال اراضی کا تدارک کرنے کے لیے جو اقدامات کئے گئے وہ تھے۔ (الف) لین دین کے کاروبار کو منضبط کیا گیا، (ب) زرعی جائیداد کے غیر کاشتکاروں کے ہاتھوں میں جانے میں رکاوٹ ڈالی گئی جس نے زرعی قرض کی تجدید کردی اور (ج) معاہدے اور قرض کے قوانین میں ترمیم کی گئی تاکہ قرض خواہ اور مقروض کا رشتہ زیادہ منصفانہ بنیاد پر قائم ہو سکے۔ چونکہ مالکان اور کسانوں کی بڑی تعداد کے مقروض ہونے کی ذمہ داری مالگزاری کے نظام پر تھی اس لیے حالات کو سدھارنے کے لیے اُس کی اصلاح ضروری تھی۔ لیکن ایسا نہیں کیا گیا۔

صرف اتنا کیا گیا کہ قرض خواہ سے مقروض کو محفوظ رکھنے کے لیے کچھ قانون بنائے گئے۔ کسانوں کو مقروضیت اور ساہوکاروں کے استحصال سے نجات دلانے کے لیے جو سب سے پہلے اقدام کیا گیا وہ دکن اگریکلچرسٹس ریلیف ایکٹ آف 1819 تھا۔ اس کی رو سے عدالتیں قرض کی تاریخ اور نوعیت کا جائزہ لے سکتی تھیں اور بڑی شرح سود کی اجازت دینے سے انکار کر سکتی تھیں، مقروض کو گرفتار اور زمین کی فروخت سے محفوظ رکھ سکتی تھی اگر وہ زمین مکفول نہ کی گئی ہو اور قرض وصول کرنے والے مقرر کر سکتی تھیں۔ بعد کے برسوں میں مزید تحفظ کی خاطر ایکٹ میں اور ترمیمیں کی گئیں۔ لیکن اس کے نتائج اتنے مایوس کن ثابت ہوئے کہ بنڈکینگ انکوائری کمیٹی نے

---

[1] بل پیش کرنے والے سر چارلس ریواز کی تقریر۔ گورنر جنرل کی کونسل کی روداد مورخہ 72 اکتوبر 9981

اس کی تنسیخ کی سفارش کی۔

1901 میں پنجاب لینڈ الیانیشن ایکٹ قانون بن گیا جس کی رو سے اس امر کی ممانعت کردی گئی کہ ساہوکار کی ڈگری کے اجرائی میں کاشت کاری زمین فروخت کی جائے یا 20 سال سے زیادہ مدت کے لیے اُس کا قبضہ منتقل کیا جائے۔ اس کے علاوہ اس نے بیدخلی زمین کی ترقی اور قرض کے لیے اُس کے وارثوں کی واجبات کے تعلق سے اُس کی قانونی حیثیت کو تقویت بھی پہنچائی۔ اُس کے بعد پنجاب کے ایکٹ کی طرح کا 1903 کا بندیل کھنڈ لینڈ الیا نیشن ایکٹ، 1903 کا نارتھ ویسٹرن پراونسز لینڈ الیانیشن ایکٹ اور 1916 کا سنٹرل پراونسز لینڈ الیا نیشن ایکٹ منظور کیا گیا۔

یہ اقدامات اپنا مقصد حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے اس لیے کہ ساہوکاروں نے ان قوانین میں خامیاں ڈھونڈ لیں اور اُن سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ پنجاب میں بڑے بڑے زمینداروں کو چھوٹے چھوٹے کسانوں کی قیمت پر اپنی جائیدادیں بڑھانے کا موقع مل گیا۔ اس کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ لینڈ الیانیشن ایکٹ کی منظوری کے بعد کاشتکاروں کے قبیلوں کی رہن کی ہوئی زمین کے مجموعی رقبے میں اور رہن کے روپے کی تعداد میں اضافہ ہوگیا۔ 1902 سے 1906 تک کے چار برسوں میں رہن کیا جانے والا زمین کا مجموعی رقبہ 1,89,810 ایکڑ پر مشتمل تھا اور رہن کی شرح تھی 62 روپیہ فی ایکڑ۔ 1906 سے 1911 تک کی مدت میں رقبہ 2,89,608 ایکڑ اور شرح ہوگئی 8.3 روپے فی ایکڑ۔ چھوٹے چھوٹے مالکان اراضی پر قرض کا کتنا بوجھ تھا اس کا اندازہ لگانے کے لیے یہ دیکھنا چاہیے کہ کسان جو مالگزاری ادا کرتا تھا اُس کا کتنا گنا قرض تھا۔ پنجاب میں ایکٹ کے بعد بھی قرض سے دوگنا تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسان پر قرض کا کتنا بوجھ تھا۔ جو کسان لگان ادا کرتے تھے اُن کی حالت بھی اتنی ہی خراب تھی۔ مسٹر تھور برن کو معلوم ہوا کہ سب سے چھوٹے مالکان زیادہ بری طرح سے پھنسے ہوئے تھے۔ جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے۔ بدقسمتی سے چھوٹی چھوٹی لگان داریوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔

زمینداری کے علاقوں میں مقروضیت سے زیادہ بڑی خرابی تھی انتہائی لگان تشخیص کیا جانا جس پر کسان کی غربت کی ذمہ داری تھی۔ مثال کے طور پر بنگال میں ذیلی ملکیت اور انتہائی شرح

لگان کا عام رواج تھا۔ ذیلی مالکان پر مشتمل حریص درمیانی لوگوں کا ایک نظام مراتب وجود میں آ گیا تھا اور قانون نے زمینداروں کو جو اختیارات دئے تھے اُن کے ذریعے مظالم توڑے جانے لگے۔ 1859 تک حکومت نے زمینداروں کے اختیارات محدود کرنے اور کسانوں کی حفاظت کرنی کے لیے کچھ نہیں کیا۔ اُس سال حکومت نے لگان کی تکلیف دہ اضافوں اور من مانی بے دخلیوں کو روکنے کی کوشش کے طور پر بنگال رینٹ ایکٹ منظور کیا۔ لیکن اس سے محض ایک چھوٹے سے حصے کا تحفظ ہوا جنھیں موروثی حقوق مل گئے۔ چنانچہ جہاں تک کاشتکاروں کی بڑی اکثریت کا تعلق تھا یہ ایکٹ بے کار ثابت ہوا۔ دیہات میں بے چینی بڑھتی رہی اور حکومت نے غیر موروثی کسانوں کی مدد کرنے کے لیے 1885 میں ایک اور ٹننیسی ایکٹ منظور کیا۔ لیکن یہ بھی لگان کے اضافوں کو نہ روک سکا اور کسانوں کے دکھ کم نہ کر سکا۔ شکمی لگان داری اور زمین کی منتقلی میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ موروثی حقوق رکھنے والے کسانوں کی تعداد گھٹتی رہی اور کھیتیہر مزدوروں کی تعداد بڑھتی رہی۔

1859 کے بنگال ٹننیسی ایکٹ کا نفاذ تمام صوبوں میں کیا گیا اور 1883 میں صوبجات متوسط میں 1887 میں پنجاب میں اور 1886 میں شمالی مغربی صوبجات اور اودھ میں ٹننیسی اور رینٹ ایکٹ منظور کئے گئے۔ ان اقدامات کے مقاصد تھے دیہی رشتوں کو منضبط کرنا، کسانوں کی جا و بیجا بیدخلیوں کو روکنا، لگان کو منضبط کرنا اور کسانوں کو زمین سدھارنے کا مناسب معاوضہ دلانا۔ بدقسمتی سے کسان ان سے زیادہ فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ ''اُن کے سامنے (حکومت کے سامنے) مسئلہ اتنا بڑا تھا کہ ضروری امور پر توجہ دینا اُن کے لیے مشکل تھا۔'' حکومت کی تدارکی کارروائیوں کے متعلق بنگال کمیشن برائے زراعت نے یہ فیصلہ دیا۔[1]

قانونی کارروائی کے علاوہ حکومت نے زرعی مسئلہ کو سلجھانے کے لیے مندرجہ ذیل اقدامات کئے۔ کسان کو بارش کے غیر یقینی حالات سے محفوظ رکھنے کے لیے سینچائی کی سہولتوں میں اضافہ کیا گیا، ساہوکار کے چنگل سے کسانوں کو نجات دلانے کے لیے اُن کو مالی امداد دی گئی اور اُن کی پیداوار کی فروخت کے لیے منڈیوں کے نظام کی اصلاح کی گئی۔ لیکن حکومت کی کوشش کی نوعیت اور وسعت ایسی نہیں تھی کہ آبادی کے بڑے حصے کی مالی حالت میں کوئی بڑی تبدیلی کر سکے جو قرض، قلت اور افلاس کے شکار رہے۔

---

[1] رپورٹ، صفحہ 7

قحط اور معاشی دکھ

اس کے ثبوت میں بار بار پڑنے والے قحطوں کی افسوسناک کہانی سنائی جاسکتی ہے جنھوں نے اُنیسویں صدی میں ملک کو تباہ کر دیا۔ صرف انچاس سال میں یعنی 1860 سے 1908 تک بیس قحط پڑے۔[1] اڑیسہ اور بنگال (1866)، شمالی مغربی صوبجات اور راجپوتانہ (69-1868)، بمبئی اور مدراس (77-1876)، شمالی مغربی صوبجات، پنجاب اور کشمیر (79-1878)، شمالی مغربی صوبجات مدراس، بمبئی اور صوبجات متوسط (97-1896) اور بمبئی صوبجات متوسط، برار،

---

[1] اُس زمانے کے بڑے بڑے قحط مندرجہ ذیل تھے۔

سال	قحط کا علاقہ
1860-61	شمالی مغربی صوبجات، پنجاب، راجپوتانہ اور کچھ
1866-67	اڑیسہ، بنگال، بہار
1868-69	شمال۔ مغربی صوبجات، راجپوتانہ، بہار
1873-74	بنگال، بہار، بندیل کھنڈ
1876-77	مدراس، بمبئی، میسور، حیدرآباد
1877-78	شمالی مغربی صوبجات، کشمیر، پنجاب
1888-89	گنجام (مدراس)، اڑیسہ
1890-92	پنجاب
1896-97	شمالی مغربی صوبجات اودھ، بنگال، مدراس، صوبجات متوسط، بمبئی، پنجاب اور کئی دیسی ریاستیں
1899-1900	صوبجات متوسط، برار، بمبئی، پنجاب، اجمیر
1905-06	بمبئی
1906-07	شمالی بہار
1907-08	اُتر پردیش، صوبجات متوسط، مدراس، بنگال، بمبئی ان کے علاوہ مقامی قلتیں تھیں دکن (2681)، بنگال (6781)، دکن (9781-08)، شمالی مغربی صوبجات (0881)، بنگال (4881-58)، صوبجات متوسط (6881-78)، گڑوال، اجمیر، مارواڑ صوبجات متوسط، بمبئی اور پنجاب (0981-29)، بمبئی (5091-60)، اور شمالی بہار (6091-70)۔

پنجاب اور اجمیر 1900-1899 کی طرح بڑے بڑے قحطوں میں بہت سے لوگ مرے۔ اڑیسہ اور بنگال میں 67-1866 میں تیرہ لاکھ انسان موت کے گھاٹ اتر گئے۔ 77-1876 کے قحط میں تقریباً پچاس لاکھ انسان مرے، 97-1896 میں پینتالیس لاکھ اور 1900-1899 میں ساڑھے بارہ لاکھ۔[1]

1860 کے بعد اتنی جلدی جلدی قحط پڑنے کے اسباب کیا تھے؟ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ صرف بارش کی کمی نہیں تھی۔ ہندوستان کی طرح کے بڑے ملک میں بارش کی مقامی کمی زیادتی تو معمول ہے۔ لیکن شاید ہی پورے ملک میں سوکھا پڑتا ہے۔ عام طور سے ایک علاقہ کی کمی کو دوسرے علاقوں کی پیداوار سے پورا کر دیا جاتا ہے اور ایسا شاذ ہی ہوتا ہے کہ پورے ملک میں قلت ہو جائے۔

چنانچہ ملک میں ایسے قحط جن میں لاکھوں انسان بھک مری کے شکار ہو جائیں غذا کی کمی یا اُس کی غیر مناسب تقسیم کی بنا پر نہیں پڑتے تھے۔ اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ غربت اور قیمتوں کی زیادتی کی وجہ سے غریب طبقات غذا حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ خصوصاً اُن دنوں میں جب فصلیں خراب ہو جاتی تھیں اور روزگار کے مواقع کم ہو جاتے تھے۔ واقعہ یہ تھا کہ معمولی حالات میں بھی 30 سے 40 فیصدی لوگ خریدنے کی استعداد نہ رکھنے کی وجہ پوری غذا حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ اس کی تصدیق سی۔ اے۔ ایلیٹ[2] اور ڈبلیو۔ ڈبلیو۔ ہنٹر[3] کی طرح کے تجربے کار سرکاری حاکموں نے کی تھی۔

ڈفرن نے ان حالات کی تفتیش کا حکم دیا۔ لیکن اس کی رپورٹ عام لوگوں سے پوشیدہ رکھی گئی یہاں تک کہ ولیم ڈگبی نے مسٹر بریڈلا۔ ایم۔ پی کے ذریعے اُن تک رسائی حاصل کی اور اپنی کتاب Prosperous British India میں دی جانے والی اطلاعات کے لیے انھیں

---

[1] یہ اموات کے سرکاری اعداد ہیں جن کے متعلق عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ وہ کم ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ولیم ڈگبی کا اندازہ تھا کہ 1900-1899 میں ساڑھے بتیس لاکھ افراد مرے تھے، مقابلہ کیجئے Prosperous British India صفحہ 31۔

[2] مدراس کا کرسچین کالج میگزین، اکتوبر 1887

[3] ہنٹر۔ ڈبلیو۔ ڈبلیو، محولہ بالا، غذا کی سپلائی کا انحطاط، صفحات 166-133

استعمال کیا۔ انڈین نیشنل کانگریس نے اُس رپورٹ کی اشاعت کا مطالبہ کیا۔ لیکن اس ڈر سے اُس کا مطالبہ رد کردیا گیا کہ ''اس رپورٹ سے بڑی احتیاط کے ساتھ اقتباسات نکالے جائیں گے اور انھیں ہمارے خلاف استعمال کیا جائے گا اور آئندہ برسوں تک وہ بحث کا موضوع بنے رہیں گے۔[1] اس تفتیش سے ظاہر ہوا کہ پورے ملک میں کسان مقروض ہیں اور بہت زیادہ لگان ادا کرتے ہیں اور یہ کہ کسانوں کے نچلے طبقوں کے بڑے حصوں میں انتہائی غربت اور افلاس پایا جاتا ہے۔

کاشت اور خاندان کی بجٹ کے متعلق صوبائی حکموں اور حاکموں کی تفصیلی تفتیشوں نے ان نتائج کی تصدیق کی۔ اُن میں سے کچھ ذیل میں درج ہیں۔[2]

''براعظم کے بڑے حصے میں چھوٹے کسانوں کو پانی پینے کے لیے روز کنواں کھودنا ہوتا ہے۔''

''پادریوں کی حالت، جو پریسیڈنسی میں آبادی کے 52 فیصدی ہیں، عام طور سے بہت خراب ہے۔'' (حکومت مدراس)

''بہار میں مزدوروں، دست کاروں اور چھوٹے چھوٹے زمینداروں کی مجموعی آبادی ایک کروڑ ترپن لاکھ ہے۔ ان میں 40 فیصدی موٹا جھوٹا کھا کر گزارہ کرتی ہے اور دن میں دو دفعہ کے بجائے محض ایک دفعہ کھانا کھاتی ہے۔'' (حکومت بنگال)

''لوگوں کے غریب طبقوں اور نیم بھک مری کے درمیان کچھ نہیں ہے۔'' (الہ آباد کمیشن)

''غریب طبقوں کے پاس روٹی ہے نہ کپڑا۔ وہ خراب قسم کے چاولوں اور پالک کی ترکاری سے پیٹ بھرتے ہیں جس میں تیل نہیں ہوتا۔ عام طور سے وہ دن میں ایک وقت کھانا کھاتے ہیں۔'' (اڑیسہ کا سول سرجن)

''اچھے اور برے سال میں فرق یہ ہے کہ اچھے سال میں لوگوں کی غذا کا نصف حصہ جڑیں اور بوٹیوں پر مشتمل ہے اور برے سال میں تین چوتھائی حصہ۔'' (پنجاب میں چمبا)

ایک ضلع افسر کلارک نے اوسط پیداوار کے پانچ ایکڑ کے کھیت کا آمدنی اور خرچ کا تخمینہ

---

[1] سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام تار، مورخہ 31 دسمبر 2091

[2] مالگزاری، زراعت اور تجارت (قحط) روداد، دسمبر 8881، صفحات 191

لگایا اور مندرجہ ذیل نتائج اخذ کئے:

	آمدی	اخراجات	
خریف	129/-	لگان	75/-
ربیع	84/8	کاشت کے اخراجات	93/-
		منافع	45/-
	213/8		213/-

450 روپیہ کے منافع میں سے کاشتکار کو غذا، کپڑے، گھر اور خاندان کی دوسری ضروریات پر خرچ کرنا پڑتا تھا۔ کھانے پر 43 روپیہ اور کپڑے پر 8 روپیہ خرچ ہوتے تھے۔ اس کی وجہ 6 روپیہ کا خسارہ ہوتا تھا جو وہ قرض سے پورا کرتا تھا۔ مسٹر کروک نے لکھا تھا "میں نے کئی دفعہ کوشش کی کہ اس طبقے کے ایک انسان کی بیلنس شیٹ تیار کروں جس کا نتیجہ یہ ہے۔"[1]

اگر اُس زمانے کی فی کس آمدنی پر غور کیا جائے تو یہ بات زیادہ واضح ہوجاتی ہے کہ قحطوں میں تکلیفوں اور بھک مری کی وجہ غربت تھی۔ سرکاری اور غیر سرکاری اشخاص نے 1868 سے 1900 کے برسوں کے کئی تخمینے لگائے ہیں۔ مسٹر وی۔ بی۔ بھٹ نے بڑی جدت سے کام لیتے ہوئے یہ کوشش کی ہے کہ کسی مخصوص سال یا منسلکہ برسوں کی ایک تعداد کے اوسطوں کی بنیادوں پر اُن اوسطوں کے مطابق دھان کی قیمت کا حساب لگایا جائے۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ پچھلی صدی کے نصف آخر میں ہندوستان میں فی کس آمدنی کم ہو رہی تھی اور یہ کہ اعداد و شمار سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ معاشی نمونا مکمل تھا۔[2] ڈینیل تھورنر بھی اسی نتیجے پر پہنچا تھا۔[3] اُس نے لکھا تھا "اگر غور کیا جائے تو برطانوی حکومت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی زراعت کی سماجی بناوٹ میں بڑی

---

[1] بھٹ وی۔ وی، Aspect of Economic change policy in India صفحہ 91

[2] ڈی۔ آر۔ گیڈگل The Industrial Evaluation of India in Recent Times صفحات 62، 82، 59، 69

[3] ڈینیل تھورنر، ہندوستان کی پیداوار کے طویل المدتی رجحانات Eco, Growth, Brazil, India, Japan تدوین از مائمن کزنٹس وغیرہ (ڈیوک یونیورسٹی، 1955)، صفحہ 721

تبدیلی آ گئی لیکن پیداوار کے بنیادی طریقوں اور تکنیک کی سطح پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ نئے دیہی سماج کے بالائی طبقوں نے خوب منافع کمائے۔ کسانوں کی حالت بڑی بدتر ہوگئی۔ زراعت کے ترقی دینے کے لیے جس سرمائے کی ضرورت تھی وہ نہ مل سکا اور مجموعی پیداوار کی سطح جمود کا شکار ہوگئی۔ [1]

قحطوں کے اہم نتائج ہوئے۔ اُن کا اثر آبادی کے بڑھنے کی شرح پر پڑا یعنی 1872 سے 1889 تک بمبئی پریسیڈنسی میں 2.05 فیصدی کا اضافہ ہوا، اسی مدت میں مدراس میں 1.25 فیصدی کا اضافہ ہوا، میسور میں دس سال میں آبادی میں 17.09 فیصدی کی کمی ہوئی اور کوچین میں 6 سال میں 14 فیصدی کی کمی ہوگئی۔ آبادی کی کمی کی بڑی وجہ بھک مری نہیں تھی بلکہ قحط کے ساتھ پھیلنے والی وبائیں اور وسیع پیمانے پر پائی جانے والی غذا کی کمی تھی جس نے لوگوں کی صحتیں خراب کردی تھیں۔ آبادی اور غذا کی سپلائی میں توازن برقرار رکھنے کا ایک ظالمانہ مگر قدرتی طریقہ تھا قحط۔ اگر بار بار قحط نہ پڑے ہوتے تو اُنیسویں صدی ہی میں آبادی اور غذا کے مسائل بڑی سنجیدہ شکل اختیار کر لیتے۔

قحطوں نے زراعت کی ترقی کو روک دیا۔ کاشت کے پرانے طریقے برقرار رہے، ترقی دینے کی خواہش پوری نہ ہوسکی اور جانوروں کی ہلاکت نے بحالی کی رفتار سست کردی۔

بعد کے اور خاص طور سے 1895 اور 1900 کے درمیان پڑنے والے قحطوں میں لوگوں کی صحتیں تو خراب ہوئیں اور اُن کی اخلاقی ہمت میں کمی آئی لیکن ان کے موذی اثرات یہ ہوئے کہ دو فصلوں کا علاقہ کم ہوگیا اور صنعتی اور برآمد کی جانے والی فصلوں کے بجائے غذائی اجناس کی کاشت کی جانے لگی۔ [2] جہاں تک غذائی مسئلے کا تعلق تھا اس کو ایک صحت مند رجحان سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

یہ بات اچھی طرح ظاہر ہے کہ غریب طبقوں کی حالت انتہائی غیر اطمینان بخش تھی جو

---

[1] ایضاً، صفحہ 721

[2] ڈی۔ آر۔ گیڈگل، The Industrial Evaluation of India in Recent Times صفحات 69،59،82،62

ہندوستان کی آبادی کی ایک بڑی اکثریت تھے، یہ کہنا مشکل ہے کہ اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں اُن کی حالت یکساں رہی یا خراب تر ہوگئی لیکن اس امر کا ناقابل انکار ثبوت موجود ہے کہ ان کروڑوں انسانوں کی تباہی اور بربادی کی کوئی انتہا نہایت نہیں تھی۔ لیکن اس دائمی دکھ میں بھی وہ اتنے فرماں بردار اور صابر تھے اور اُن میں اتنی زیادہ قوت برداشت تھی کہ جب تک پانی سر سے اونچا نہیں ہوجاتا تھا اُس وقت تک وہ اپنی غیر اطمینانی کا مظاہرہ کرنے کی خاطر احتجاج بھی نہیں کرتے تھے۔ انھیں وقتاً فوقتاً احتجاج کرنا پڑتا تھا جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حالات ناقابل برداشت تھے۔

1858-60 میں پہلی بغاوت بنگال میں ہوئی جب باغ داروں کے مظالم کے خلاف نیل کے کاشتکاروں میں شورش پھوٹ پڑی۔ اُس کے بعد 1873 میں پٹنہ میں فسادات ہوئے۔ 1872 میں دکن کے کچھ ضلعوں یعنی پونا اور احمد نگر میں کسانوں کے بلوے ہوئے۔ 1878-79 میں بارک پور اور پیک پارا کے کسانوں نے حکومت سے انتہائی اونچی شرح لگان کی شکایتیں کیں۔ اس مسئلے کی اہمیت اور دکھوں کی زیادتی کو دیکھتے ہوئے یہ حادثات چھوٹے چھوٹے تھے۔ انڈین نیشنل کانگریس کے وجود میں آنے کے بعد اس قسم کے حادثات بھی بہت کم ہوگئے۔ کسانوں کو کانگریس کی شکل میں ایسا فورم مل گیا جو اُس کی شکایتیں پیش کرسکتا ہے اور اُس کی حمایت کرنے والا ایک منظم ادارہ تھا۔

V تجارتی انقلاب (1858 لغایت 1905)

ریلوے اور تار برقی

ہندوستان کی معاشی ترقی کے لیے عوامل مواصلات و بار برداری کے ذرائع میں ہونے والے انقلاب نے مہیا کردئے جن کی وجہ سے اُس کی گھریلو اور بدیسی تجارت کو فروغ ہوا۔ ہندوستان میں ریل کی پٹری بچھانے کے لیے پہلا معاہدہ 1848 میں کیا گیا لیکن ابتدا میں اس کی رفتار افسوسناک حد تک سست تھی۔ 1853 میں پہلے 21 میل لمبی پٹری بچھائی گئی اور 1857 تک محض 288 میل لمبی ریلوے لائن پر لوگوں نے سفر کرنا شروع کیا۔ 1857 کی

بغاوت کے بعد سیاسی فوجی اور سامراجی ضرورتوں کے پیش نظر تیزی کے ساتھ ریلوں کی توسیع دی جانے لگی۔ [1] لنکا شائر دباؤ ڈال رہا تھا جس کی خواہش تھی کہ ہندوستان میں ریلوں کا جال بچھ جائے تاکہ انگلستان کو برآمد کرنے کے لیے کپاس بندرگاہ تک لائی جاسکے [2] اس کے علاوہ اس زمانے میں انگلستان بڑی مقدار میں سرمایہ دنیا کے دوسرے حصوں میں بھیج رہا تھا۔ [3] اور 1875

---

[1] میک فرسن۔ ڈبلیو۔ جے، ہندوستانی ریلوں میں اصل کاری، 5481 اکونامک ہسٹری ریویو، سکنڈ سیریز 5591-66 جلد VIII، صفحات 68-771

[2] میک فرسن کے مطابق جی۔آئی۔پی۔ ریلوے کی منظوری 9481 میں اُس کے بنانے والوں چیمبرس آف کامرس، پارلیمنٹ کے ممبروں اور سلیکٹ کمیٹی کے دباؤ کی بنا پر دی گئی اس لئے کہ ریلوے لائن بمبئی کے اُن اضلاع میں سے گزرتی تھی جہاں کپاس مہیا ہوتی تھی۔ 0581 میں بی بی سی۔آئی۔آر کی تعمیر کے لئے بھی اسی قسم کا دباؤ ڈالا گیا۔ ”گریٹ ساؤتھرن ریلوے میں بھی کپاس کی بنا پر پڑنے والا دباؤ دیکھا جاسکتا تھا۔ امریکی خانہ جنگی کے دوران انگریز تاجروں کو ہندوستانی کپاس کی بڑی فکر تھی۔ 1681 میں پندرہ میل لمبی کھلنے والی ہندوستانی ریلوے لائن کپاس کے علاقوں کی محض سرحدوں کو چھوتی تھی اور نئی کمپنیوں کو منظوری دینے کے لئے حکومت سے درخواستیں کی جانے لگیں۔ سکریٹری آف اسٹیٹ کے پاس بہت سی یادداشتیں مانچسٹر اور گلاسگو سے آئیں۔“

[3] مندرجہ ذیل نقشے میں ایک سال کے اندر (5 برسوں کے وقفے سے) انگلستان نے بدیس میں جو اصل کاری کی، وہ دکھائی جا رہی ہے

سال	خالص اصل کاری	سال	خالص اصل کاری
1852	218	1887	1,576
1857	270	1892	2,005
1862	394	1897	2,252
1867	523	1902	1,431
1872	764	1907	2,750
1877	1088	1912	3,568
1882	1255		

(ماخذ، Economic Elements in Pas Britanica از البرٹ اصلاح، صفحہ 180)

تک اصل کاری کی سب سے اہم مشکل تھی ریلیں۔[1] پھر بھی ریلوں کے لیے ہندوستان کو اصل تباہ کن شرائط پر مہیا کیا گیا۔ 1869 تک نجی برطانوی کمپنیوں نے ریلیں تعمیر کیں جن کا حکومت سے معاہدہ تھا اور اصل پر پانچ فیصدی منافع کی ضمانت کی گئی تھی۔ ریلوں پر اخراجات اور اُن میں ملازمتوں پر حکومت کا کوئی اختیار نہیں تھا اور کمپنیوں کو کم خرچ کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اس لیے کہ ان کے اصل پر 5 فیصدی منافع کی ضمانت تھی۔ ہندوستان میں ریلیں بنانے کے لیے ریلوں کی کمپنیوں نے جو مجموعی طور سے ضمانت شدہ اصل حاصل کیا وہ 49-1848 میں 42 لاکھ تھا اور 69-1868 میں بڑھ کے 83 کروڑ 42 لاکھ ہو گیا۔[2] اسی مدت میں جو ریلیں سواری کے لیے کھول دی گئیں وہ 49-1848 میں صفر سے لے کر 69-1868 میں 4016 میل ہو گئیں۔ 1862 میں بہتر لاکھ افراد نے ریلوں سے سفر کیا۔ یہ تعداد 1869 میں بڑھ کے ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہو گئی۔

اگرچہ اپنی جگہ پر یہ کارنامہ بڑا تھا پھر بھی حکومت اس سے مطمئن نہیں تھی۔ اس کے علاوہ ضمانت کا نظام ایک بڑا مالیاتی بوجھ بنتا جا رہا تھا۔ لیکن کمپنیاں ضمانت کے فوائد سے مستفید ہونے کے بعد ہندوستان میں بغیر ضمانت کے اصل کاری کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1869 کے بعد حکومت نے خود ریلیں بنانی شروع کر دیں۔ لیکن پالیسی کی یہ تبدیلی اس وقت ہوئی جب کہ حکومت پر مالیاتی دباؤ زیادہ بڑھ رہا تھا۔ 69-1868 کے پنجاب اور راجپوتانہ کے قحط نے 1873 کے بنگال کے قحط نے اور 1876 کے بمبئی اور مدراس کی پریسیڈنسیوں کے قحط نے حکومت کا مالیاتی بوجھ بہت بڑھا دیا تھا۔ 1872 میں چاندی کا بین الاقوامی بھاؤ گرنا شروع ہوا اور یہ سلسلہ 1893 تک جاری رہا جب روپے کی آزاد سکہ سازی کرنے والی ٹکسالیں بند کر دی گئیں۔ اس کی وجہ سے روپیہ کی قیمت مبادلہ گر گئی اور حکومت کی مالی دشواریاں بڑھ گئیں۔ لندن کی منڈی سے حکومت ہندوستان کے قرض لینے کی حد کو سکریٹری آف اسٹیٹ نے بار بار کم کیا اور

---

[1] پارمنیر، رچرڈ، سلطنت کی تاریخ میں معاشی اُمور، اکونامک، ہسٹری ریویو فسٹ سیریز، جلد VIII، (7391)

[2] 13 دسمبر 9681 کو ہندوستانی ریلوں کی ادا شدہ مجموعی اصل تھی 84.27 ملین پاؤنڈ اور اُس پر ادا ہونے والے سود کی مجموعی رقم تھی 92.8 ملین یا اصل کی 53 فیصدی۔

اُس کے ہاتھ باندھ دئے[1] ان دشواریوں اور بڑھتے ہوئے اخراجات کے باوجود حکومت اپنے ارادے پر قائم رہی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 70-1869 میں 4,265 میل لمبی چوڑی پٹری بچھی ہوئی تھی وہ دس سال میں 79-1878 میں 8,212 میل لمبی ہوگئی۔ لیکن ترقی کی یہ رفتار ہندوستان میں برطانوی تجارت کے نقطۂ نظر سے تو اطمینان بخش تھی لیکن حکومت کی قحط کی پالیسی کے نقطۂ نظر سے غیر اطمینان بخش تھی۔ 1880 کے قیمبن کمیشن نے سفارش کی تھی کہ اگر بڑے بڑے قحطوں سے بچنا ہے تو موجودہ ریلوں میں مزید 10,000 میل کا اضافہ فوری طور سے کیا جائے۔ چونکہ حکومت اپنے وسائل سے ریلوں کو اتنی توسیع نہیں دے سکتی تھی اس لیے نجی کمپنیوں کو ضمانت کا طریقہ تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ پھر شروع کر دیا گیا۔ اس طریقے میں جس منافع کی ضمانت کی گئی تھی وہ پچھلے طریقے کے 5 فی صد کے بجائے ساڑھے تین فی صدی تھا۔ پالیسی کی اس دوسری تبدیلی کا نتیجہ فوراً سامنے آیا۔ 1880 کے بعد ملک میں تیزی کے ساتھ ریلوں کی توسیع ہوئی۔ 79-1878 اور 90-1889 کے درمیانی گیارہ سالہ مدت میں ریلوں کی لمبائی 8,212 میل کی دگنی یعنی 16,44 میل ہوگئی۔ 1900-1899 میں اُس کی لمبائی بڑھ کے 23,763 میل اور 6-1905 میں 28,604 میل ہوگئی۔ 1869 میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ اشخاص نے ریلوں میں سفر کیا تھا جن کی تعداد 1906 میں بڑھ کے بیس کروڑ اکھتر لاکھ ہوگئی۔ اس طرح 1906 میں ریلوں میں نقصان کے بجائے 24,7.5 ملین پاؤنڈ کا منافع ہوا۔[2] اب ریلوں سے اصل پر تقریباً 6 فیصدی کا منافع ہونے لگا تھا۔[3]

---

[1] سلیکٹ کمیٹی رپورٹ مفاد عامہ کے کاموں کے متعلق، 6781

[2] ان میں سے 556751 ملین پاؤنڈ ریاست کے منافع ہوا اور بقیہ کمپنیوں کو ضمانت شدہ اور مالی امداد پانے والی کمپنیوں نے جو اصل لگایا تھا وہ 9981-0091 میں 48.48 ملین پاؤنڈ تھا۔ اُس کے بعد حکومت نے ضمانت شدہ ریلوں کو خریدنا شروع کر دیا اور اُس کے بعد کمپنیوں کا اصل 6091-7 میں گھٹ کر 94.75 ملین اور 1191-21 میں 24.04 ملین پاؤنڈ رہ گیا۔

[3] اصل پر خالص منافع 3091 میں 5.45 فی صدی، 4091 میں 6 فیصدی، 5091 میں 6.70 فی صدی، 6091 میں 5.69 فی صدی تھا۔

اس دوران ہندوستان میں تار برقی کی لائنیں بچھانے میں بڑی زبردست کامیابی حاصل ہوئی تھی جیسا کہ مندرجہ ذیل نقشے سے معلوم ہوتا ہے۔[1]

سال	کتنے میل	دفاتر کی مجموعی تعداد	تاروں کی مجموعی تعداد (ہزاروں میں)	مجموعی آمدنی (لاکھوں روپے)
1860-61	11,592	145	*	6
1870-71	12,538	197	577	13
1880-81	20,346	254	1,656	39
1890-91	37,070	949	3,407	52
1900-1	55,055	1,936	6,449	93
1910-11	74,828	2,856	12,090	93 کذا

1870-71 اور 1910-11 کے درمیان 40 سالہ مدت میں ملک میں تار گھروں کی تعداد میں 14 گنا زیادہ کا اضافہ ہوگیا اور تاروں کی مجموعی تعداد میں بائیس گنا زیادہ کا بھی۔ 1870-71 میں اُن کی مجموعی تعداد تھی 5,77,000 جو 1910-11 میں ہوگئی تھی 13,090,000۔ اس کے ساتھ ملک میں ڈاک کی سہولتیں بھی بہت بڑھ گئیں۔ مختلف ڈاک گھروں میں 1812 میں جو کل خط، اخبار اور پارسل آئے اُن کی تعداد تھی 47.14 ملین جو 1880-81 میں ہوگئی 158.6 ملین، 1889-90 میں 312 ملین اور 1905-6 میں 6645.13 ملین۔

داخلی مواصلات اور بار برداری کے ذرائع توسیع نے برصغیر میں معاشی اتحاد کو فروغ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملک کے مختلف حصوں میں اشیا کی قیمتوں کا فرق داستان پارینہ بن گیا۔[2]

---

[1] کے ایل۔ دت، Report on enquiry into rise of prices in India، کلکتہ، 4191 صفحہ 32

[2] برج نرائن، Present Past,India Economic life، صفحہ 901 اس کے علاوہ بیرڈ اسمتھ، شمالی مغربی صوبجات کے قحط (0681 کا اثر مانچسٹر کی تجارت پر کے متعلق رپورٹ) اسمتھ کے مطابق اُس زمانے میں بار برداری کے ذرائع اتنے خراب تھے کہ ''ایک منڈی میں اگر قحط کی قیمت 4/21 فی من تھی اور دوسرے بازار میں جو 03 میل کی دوری پر تھا، اُس چیز کی قیمت صرف 1/8 من تھی۔

بارش کی کمی کا اثر جو ملک کے ایک حصے پر پڑتا تھا وہ محض اُس حصے تک محدود نہیں رہتا تھا بلکہ پورے ملک میں محسوس کیا جاتا تھا۔ غربت و افلاس کی تقسیم زیادہ مساویانہ انداز سے ہوگئی۔ اس کے ساتھ مختلف علاقوں میں رہنے والے لوگوں کے باہمی روابط اور مواصلات میں زیادہ آسانی پیدا ہوگئی جس کی بنا پر خیالات و جذبات کی یکجہتی اور ہم آہنگی ممکن ہوگئی۔

ہندوستان میں ریلوں اور تار برقی کی توسیع کے ساتھ بحری سفر میں دو اہم واقعات رونما ہوئے۔ اُن میں سے پہلا تو تھا 1869 یعنی نہر سوئز کا کھلنا اور دوسرا تھا ہندوستان کی جہاز رانی میں انقلاب جو اس وقت پیدا ہوا جب ہندوستان کی سمندری تجارت میں بادبانی جہازوں کی جگہ بھاپ سے چلنے والے جہازوں نے لے لی۔ نہر سوئز کے کھل جانے کی بنا پر ہندوستان سے یورپ کے فاصلے میں 3000 میل سے زیادہ کی اور سفر کی مدت میں 35 دن کی کمی ہوگئی۔ اسی کے ساتھ بھاپ سے چلنے والے جہازوں میں زیادہ مال جانے لگا جس سے باربرداری کے کرائے میں بڑی کمی ہوگئی۔ 1873 میں کلکتہ سے لیورپول جانے والے ایک ٹن زراعتی مال کا کرایہ تھا 55 شلنگ۔ لیکن 1882 میں وہ گھٹ کر 27 شلنگ رہ گیا تھا۔[1] باربرداری کے اخراجات میں اس بڑی کمی کی وجہ سے ہندوستان کا زیادہ تر مال یورپ کی منڈیوں میں روس، کناڈا اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کے مال کے ساتھ موثر انداز سے مقابلہ کرنے لگا جو انگلستان اور یورپ کے دوسرے ملکوں کی منڈیوں کو گیہوں، کپاس اور کچھ دوسری زراعتی پیداوار سپلائی کرنے کے بڑے ذریعے تھے۔

بدقسمتی سے باربرداری کی سہولتوں میں توسیع کچھ اس طرح کی گئی کہ اُن سے برطانوی سامراجی مفادات کو فائدہ ہوا لیکن ہندوستان کی معاشی ترقی کو نظرانداز کیا گیا۔ ریلوے لائنوں کے بچھانے اور کرائے مقرر کرنے سے برطانوی تجارت کو فائدہ ہوا یعنی ہندوستان سے برآمدات اور ہندوستان میں درآمدات کو اور اُس سے داخلی تجارت اور ہندوستان کی صحت مند صنعت کاری کو نقصان ہوا۔

مثال کے طور پر ریل کی لائنیں اس طرح بچھائی گئی تھیں کہ صنعتی مرکزوں سے منڈیوں تک مال لے جانے میں وہ معاون نہیں تھیں۔ کچھ کھالوں کو جہاز کے ذریعے لے جانے کے لیے جب

---

[1] جوشی۔ جی۔ وی، محولہ بالا، صفحہ 826

بندرگاہ لانا ہوتا تھا تو اُس پر جو کرایہ دیا ہوتا تھا وہ اُس کرایے کے مقابلہ میں 50 فیصدی کم ہوتا تھا جو ملک کے اندر ایک مقام سے دوسرے مقام کو لیجانے میں دینا پڑتا تھا۔ ملک میں بار برداری کے ذرائع بنانے کی صنعت قائم کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی اور صنعت کاری کی ترقی کی مخالفت کی جاتی تھی۔[1]

بدیسی تجارت

ذرائع آمدورفت میں جو انقلاب ہوا تھا اُس کے انسلاکات ہندوستان کی ڈرامائی انداز سے بڑھتی ہوئی سمندری تجارت میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ 61-1860 میں ہندوستان کی مجموعی برآمدات کی مالیت، جن میں خزانے بھی شامل تھے، 23.97 کروڑ تھی لیکن 7-1906 تک یہ بڑھ کے 177 کروڑ ہوگئی تھی۔ امریکہ کی خانہ جنگی کے دوران وہاں سے مال نہ آنے کی بنا پر 1862 میں ہندوستان کی کپاس کی مانگ انگلستان میں یک لخت بڑھ گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 61-1860 میں ہندوستان سے ہونے والی برآمدات کی مالیت 32.97 کروڑ تھی جو 64-1863 میں 65.63 کروڑ اور 65-1864 میں 68 کروڑ ہوگئی۔ 66-1865 میں برآمدات کی مالیت تھی 65.49 کروڑ۔ امریکہ میں امن قائم ہوجانے کے بعد لنکاشائر میں ہندوستانی کپاس کی مانگ گرگئی اور ہندوستان کی برآمدات کی مالیت 67-1866 میں گھٹ کر 41.86 کڑور رہ گئی لیکن 69-1868 میں وہ بڑھ کے پھر 53 کروڑ ہوگئی۔ 1869 میں نہر سوئز کے کھلنے اور آٹھویں دہائی میں مال کے کرائے میں کمی ہونے کی بنا پر ملک کی برآمدات کو فروغ ہوا اور 1880 کے بعد تیزی کے ساتھ بڑھنے لگے۔ 79-1878 میں برآمدات کی مجموعی مالیت تھی 60.94 کروڑ، 89-1888 میں وہ بڑھ کے 97 کروڑ 99-1898 میں 115 کروڑ اور 7-1906 میں 177 کروڑ ہوگئی۔

درآمدات میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوا۔ 62-1861 میں درآمدات کی مالیت محض 22.23 کروڑ تھی جو 70-1869 میں بڑھ کے 32.93 کروڑ ہوگئی۔ نہر سوئز کے کھلنے کے بعد درآمدات

---

[1] ڈیوس۔ کے، Pakistan Population of India حصہ ششم، سیکشن 22

بڑھ کے 81-1880 میں 53.11 کروڑ، 91-1890، [1]میں 71.97 کروڑ اور 7-1906 میں 127 کروڑ ہو گئے۔

ہندوستان کی بدیسی تجارت میں اس عجیب وغریب اضافے کے نتائج کیا ہوئے؟ برطانوی حکمرانوں نے اس کو ملک کی بڑھتی ہوئی خوشحالی کا ناقابل تردید ثبوت سمجھا۔ اُن کا کہنا تھا کہ یورپ کی منڈیوں کو ہندوستانی زراعت کی پیداوار بھیجنے کے مواقع بڑھ گئے ہیں جس کے نتیجے میں زراعت کی آمدنی اور ملک میں زر کی آمد بڑھ گئی ہے۔ اُن کا یہ بھی خیال تھا کہ انگلستان میں ہونے والے ٹیکنالوجیکل ترقی سے ہندوستانی صارفین کو فائدہ ہوا ہے جس کی وجہ سے وہ برطانوی صنعتوں کی مصنوعات اُس سے کم قیمت پر حاصل کر لیتے ہیں جتنی قیمت انھیں اُس وقت ادا کرنی پڑتی اگر وہ اشیا ہندوستان میں بنائی جاتیں۔

تجارتی پالیسی

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی بدیسی تجارت کے مرکبات کو اُن عناصر نے شکل نہیں دی تھی جو اُن ملکوں کے معاشی رشتوں کا تعین کرتے ہیں جو کلاسیکی ماہرین معاشیات کے خیال کے مطابق قدرتی وسائل اور پیداوار کی بنیاد پر آزادی کے ساتھ بین الاقوامی تجارت میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کا تعین حکمراں سماجی طاقت کی ضرورتوں کے دباؤ کے تحت کیا گیا تھا۔

ایک طرف تو حکومت ہند نے ریلوں کی ترقی کے لیے خزانہ عام سے اعانت کی اور دوسری طرف ممالک غیر کے ساتھ ہندوستان کے تجارتی رشتوں پر آزاد تجارت کے اصولوں کا سختی کے ساتھ اطلاق کیا۔ 1864 میں سر چارلس ٹریویلین نے حکومت کی تجارتی پالیسی کی وضاحت مندرجہ ذیل الفاظ میں کی۔ ''ہمارا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ حتی الوسع ہم تجارت کی آزادی میں حائل ہر رکاوٹ کو دور کریں جیسا کہ انگلستان میں اس کے تعلق سے کیا گیا۔'' [2] لیکن انگلستان میں آزاد تجارت کو رواج دینے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کے لیے مفید تھی۔ صنعتی اعتبار سے انگلستان بقیہ دنیا سے آگے تھا اور اپنے لوگوں کے لیے غذا اور اپنے کارخانوں کے لیے خام مال چاہتا تھا۔ اس

---

[1] یہ قحط کا سال تھا اور اس لئے درآمدات اُس دہائی کے اوسط سے کم تھے۔

[2] 38-2891 کے لیے سرری۔ بارنگ کا مالیاتی بیان، پیراگراف 332

کے برعکس ہندوستان ایک زراعتی ملک تھا جو غذائی اجناس اور خام مال برآمد کرتا تھا اور مصنوعات درآمد کرتا تھا۔ آزاد تجارت کی پالیسی پر عمل کرنے میں ہندوستان کی حکومت کا مقصد ہندوستان کی پیداوار بڑھانے کے بجائے برطانوی برآمدات میں اضافہ کرنا تھا۔ سر چارلس ٹریویلین نے کہا تھا ''ہندوستان کی تجارت میں بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ وہ اتنی مقدار میں اشیائی درآمد نہیں کر پاتا ہے کہ وہ اُس کی قابل برآمد بڑی مقدار میں ہونے والی پیداوار کا بدل ہو سکے جو یہ ملک باہر بھیجنے کا استعداد رکھتا ہے۔ اگر ہم ہندوستان کی تجارت کو دشواریوں سے بچانا چاہتے ہیں اور اُس کو مزید توسیع کے آزاد مواقع فراہم کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں اُس کے درآمدات کی ہر امکانی ہمت افزائی کرنی چاہیے۔'' [1] ہندوستان کی آزاد تجارت کی حمایت میں یہ عجیب و غریب دلیل دی گئی تھی۔

واقعہ یہ ہے کہ حکومت ہندوستان کی معاشی پالیسی انگلستان کے کپڑے کی صنعت کے مفادات کے پیش نظر بنائی جاتی تھی جس کے لیے ہندوستان میں سوتی کپڑے کی صنعت کی نمو باعث تشویش تھی۔ مانچسٹر اور لنکا شائر نے برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعے حکومت ہندوستان پر دباؤ ڈالا کہ وہ اُس صنعت کی نشوونما کو روکنے کی ہر امکانی کوشش کرے۔ [2] چنانچہ برطانوی حکومت نے ایک تجویز کے ذریعے حکومت ہندوستان سے کہا ''کہ ایوان کی رائے میں ہندوستان جانے والے سوتی مصنوعات پر جو ڈیوٹی لگائی جاتی ہے وہ تامینی نوعیت کی اور صحت مند تجارتی

---

[1] ایضاً

[2] جیسا کہ لکانن نے کہا تھا ہندوستان کے محاصل کی تاریخ پر مانچسٹر کے سرمایہ داروں کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ جس طرح امریکی سرمایہ دار امریکی منڈی کو اپنے لئے محفوظ و مخصوص رکھنا چاہتے تھے اسی طرح وہ مانچسٹر کے سرمایہ دار ہندوستان کی منڈی کو برطانوی صنعت کاروں، تاجروں بنک کاروں اور جہاز رانوں کے لئے مخصوص رکھنا چاہتے ہیں۔ برطانوی سیاست کے ایک بااثر حلقے کے ساتھ تمام حکومتیں جھکی ہیں (Development of Capitalistic Enterprise in India) میک ملن، نیویارک 4391، صفیہ 5564۔) اسی طرح لارڈ کرزن نے ٹائمس، لندن، مورخہ 5 جون 8091 ایک خط میں کھل کر اعتراف کیا کہ'' 5781 میں جب ہندوستان کو درآمدات پر محاصل ختم کرنے کا حکم دیا گیا اُس وقت سے اسی پالیسی میں بار بار جو تبدیلیاں کی گئیں وہ زیادہ تر لنکا شائر کے دباؤ کی بنا پر کی گئی تھیں۔''

پالیسی کے منافی ہے اس لیے جب بھی ہندوستان کی مالی صورت حال اس امر کی اجازت دے اُسے بلاتاخیر منسوخ کر دیا جانا چاہیے۔[1]

اُس وقت ہندوستان کو اپنے تاریخ کے بدترین قحط کا مقابلہ کرنا پڑ رہا تھا اور اس کی مالی حالت نازک تھی۔ حکومت نے محض آمدنی بڑھانے کے لیے سوتی کپڑے پر 5 فیصدی کی درآمد ڈیوٹی لگانے کا فیصلہ کیا۔ لنکاشائر نے اس فیصلے کی شدت کے ساتھ مخالفت کی اس لیے کہ اُس کا خیال تھا کہ یہ ڈیوٹی ہندوستان کی سوتی کپڑے کی صنعت کے لیے تامینی ثابت ہوگی۔ حکومت ہندوستان کو مجبوراً ڈیوٹی کو منسوخ کرنا پڑا۔ اس کی وجہ یہ ظاہر ہے نہ آزاد تجارت کے اصولوں سے لگاؤ تھا اور نہ اُس ملک کی معیشت کے مفاد کا خیال بلکہ اس کو محض برطانوی سوتی کپڑے کے مفاد میں منسوخ کیا گیا تھا۔

ڈیوٹی کی منسوخی کے بعد بھی لنکاشائر مطمئن نہیں ہوا اور اُس نے ہر قسم کے سوتی کپڑے پر سے ہر قسم کی ڈیوٹی ہٹانے کا مطالبہ کیا۔ اس موضوع پر ایک مراسلے میں سکریٹری آف اسٹیٹ نے زور دے دیا۔ ''اس میں کسی مبالغے کی گنجائش نہیں ہے کہ ایک اتنی بڑی صنعت کو، جیسی کہ ہندوستان کپڑے کی صنعت بالفرض دور ہو جائے گی ایک ایسے نظام کے تحت غور کرنے کی اجازت دینا مناسب نہیں جسے ہمارا وسیع تجربہ غیر صحت مند ثابت کر چکا ہے اور جو انگلستان کی سوچی سمجھی پالیسی کے منافی ہے۔ مجھے یہ بات بھی خطرے سے خالی نہیں معلوم ہوتی ہے کہ قدرتی اسباب کے نتائج کے بغیر ہی اُس تجارت کو رفتہ رفتہ ختم کیا جائے جو ہندوستان اور انگلستان کے درمیان خوشحالی کے سب سے استوار رشتوں میں سے ایک ہے۔'' [2] چنانچہ 1879 میں سوتی مال پر ہر قسم کی ڈیوٹی کی تنسیخ کی وجہ سے سامراجی دباؤ تھا۔ حکام کو اس کا کھل کے اعتراف کرنا پڑا کہ ''ہندوستان کے علاقے کی وسعت اور سازگار حالات اس امر کے منافی ہیں کہ وہ انسان کی ضرورت کی قریب قریب ہر شے پیدا کر سکے۔'' [3] اس لیے اگر ہندوستان کی منڈیوں میں انگریزی مال کی فوقیت

---

[1] ہاؤس آف کامنز کی تجویز، مورخہ 11 جولائی 7781

[2] مالیاتی بیان، حکومت ہندوستان، 1887-97، (نمبر 9421 مورخہ 31 مارچ 9781) پیراگراف 991

[3] حکومت ہندوستان کی تجویز (مالیاتی) نمبر 1191 مورخہ 81 مارچ 9781، پیراگراف 55

برقرار رکھنی تھی تو یہ ضروری تھا کہ مقابلے کی صنعتوں کو ترقی دینے سے ہندوستان کو باز رکھا جائے۔

آزاد تجارت کی پالیسی کو 1896 میں اُس وقت مضحکہ انگیز شکل دی گئی جب درآمد ہونے والے سوتی مال پر لگائی جانے والی آمدنی کی ڈیوٹی کی شرح کے بقدر ہندوستان کے کارخانوں میں بنائے جانے والے تمام سوتی کپڑے پر ''متلافی ڈیوٹی'' لگائی گئی۔ یہ ڈیوٹی ہندوستان پر اس لیے لگائی گئی تھی کہ اپنے مفاد میں ہندوستان منڈیوں کا استحصال کرنے میں وہ انگلستان کے صنعت کاروں کی مدد کرے۔

مواصلات اور آمدورفت کے ذرائع کی توسیع اور آزاد تجارت کی پالیسی نے ملک کی بدیسی تجارت میں اضافہ کر دیا مگر ملک کی خوشحالی نہیں بڑھی۔ اس کی صراحت دشوار نہیں ہے۔ اُس وقت ہندوستان خام مال اور غذائی اجناس برآمد کرتا تھا جنھیں غیر ترقی یافتہ زراعت کے ذریعہ پیدا کیا جاتا تھا۔ لیکن وہ ایسی چھوٹی چھوٹی اشیا درآمد کرتا تھا جیسے سوتی کپڑا اور ریشمی کپڑا جو تھوڑے سے سرمائے اور مہارت کے ساتھ خود ملک کے اندر اُس خام سے پیدا کی جاسکتی تھیں جو دوسرے ملکوں کو بھیجا جاتا تھا۔ اگر اس قسم کی صنعتیں قائم کرنے کی اجازت دے دی جاتی تو اُس کے نتیجے میں بدیسی تجارت بڑھنے کے بجائے اُس میں عارضی طور سے کچھ کمی ہو جاتی۔ [1] لیکن انگلستان چاہتا

---

[1] جدید زمانے کے ایک سرکردہ برطانوی ماہر معاشیات الفریڈ مارشل کے بقول ''محض تجارت کے حجم سے کچھ ظاہر نہیں ہوتا ہے کسی ملک کی بدیسی تجارت کے بڑھنے کا امکان مال برآمد کرنے کی طاقت میں اضافہ کر دیتی ہے۔ لیکن ان صنعتوں کی ترقی سے اُس کی بدیسی تجارت میں کمی ہوسکتی ہے جن میں وہ مقابلتاً کمزور ہو۔ اس لیے کہ یہ ترقی اُس کی درآمدات کی فروخت کو کم کر دے گی۔'' اس بیان سے ہندوستان کی صورت حال کی اچھی طرح وضاحت ہو جاتی ہے۔ اس میں صرف اتنی ترمیم کرنی ہوگی کہ ہندوستان کی بدیسی تجارت ''دوسرے ملکوں میں صنعتوں کی تیزی کے ساتھ ہونے والی ترقی'' کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ آمدورفت کے ذرائع میں تیزی سے ہونے والی توسیع کا نتیجہ تھی۔ اس میں بھی شک ہے کہ بدیسی تجارت کی ترقی کے نتیجے اس بات کے لئے کہ ''معیشت کی ترقی کے ساتھ قومی معیشت میں بدیسی تجارت کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔'' جس کو جرمن عالم ورنر سوم برٹ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے اور سوم برٹ کے قانون کا نام دیا گیا، دیکھئے کے۔کے۔ ڈیوش اور اے۔ اکسٹین، the declining shere of International National Industrilisation 5981, Eco.Section-0981 ورلڈ پالیٹکس، 13(1169) صفحات 792-99

تھا کہ بدیسی تجارت کو معاشی سامراج کے مقاصد پورا کرنے کا ایک بڑا ذریعہ بنائے۔[1] اس لیے ملک کی بدیسی تجارت کے حجم میں اضافہ ملک کی بہتر معاشی صحت کے بجائے ہندوستانی معیشت پر سامراج کی بڑھتی ہوئی گرفت اور برطانوی صنعت کار اور اصل کار کے مفاد میں ملک کے وسائل اور اُس کی منڈیوں کے بڑھتے ہوئے استحصال کا نتیجہ تھی۔

برطانیہ کے ماہر اعداد و شمار اے۔ایل۔باڈلے نے 1893 میں کہا تھا ''ہندوستان اور ہماری نو آبادیات میں تجارتی اعتبار سے کچھ باتیں مشترک ہیں۔ دونوں ہمارے خصوصی مصنوعات یعنی سوتی کپڑا اور مشینوں کی باقاعدہ منڈیوں کی حیثیت سے ہمارے لیے مفید ہیں اور دونوں نے ہماری تجارت کو نقصان پہنچائے بغیر دوسرے ملکوں کے ساتھ تجارت کرنے کی اُس اجازت سے فائدہ اٹھایا ہے جو صدی کے وسط میں بڑی ہچکچاہٹ کے ساتھ دی گئی تھی۔[2]

چنانچہ دوسرے ملکوں کے ساتھ ہندوستان کی تجارت نے 1860 کے بعد برطانیہ کی سامراجی معیشت میں ایک روز افزوں اہم تر جگہ بنالی۔ 1870 یا 1875 تک برطانیہ دوسرے یورپین ممالک کو قرض دیکر اپنے سرمائے کی اصل کاری کرتا تھا۔ لیکن 1875 کے بعد ایک بڑی تبدیلی ہوگئی۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور سلطنت کے ملکوں کو زیادہ سے زیادہ سرمایہ جانے لگا۔ برطانوی اصل کاروں نے اپنے روسی اور دوسری حکومتوں کے بانڈ بیچ دئے اور ریلوں کے اسٹاک خرید لیے۔[3] ریلیں اُن ملکوں میں بنائی گئیں جو برطانیہ کو زیادہ تر غذائی اجناس، کپاس اور دوسرا خام مال مہیا کرتے تھے۔ اُنھوں نے قرض خواہ ممالک سے برطانیہ کو ان چیزوں کی سپلائی بڑھادی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُنیسویں صدی کے آخر تک ان ملکوں کے ساتھ توازن ادائیگی میں خسارہ پیدا ہوگیا تھا۔ لیکن صرف اتنا ہی نہیں ہوا۔ ''خطرے سے بچنے کے لیے جس طرح

---

[1] پروفیسر کوچیز کا کہنا ہے ''معاشی سامراج کو محض اُس وقت مفہوم ملتا ہے جب مفادات کا تعلق تجارت، صنعت اور اصل کاری کے میدانوں سے ہو۔ جب یہ مفادات سرمایہ داروں کے ایسے بین گروہوں کے ہاتھوں میں ہوں جو محکومی سے خود مستفید ہونا چاہیں۔ جب وہ معاشی مفادات کا ایسا لازمی جز ہوں جس پر ہوم گورنمنٹ کو توجہ دینی پڑے۔ معاشی سامراج کا تصور اکونامک ہسٹری ریویو، جلد 23 دوسرا سلسلہ 9491 صفحہ 01

[2] باڈلے۔اے۔ایل، England's foreign trade لندن 2981 صفحہ 07

[3] کیرن کراس، اے۔کے، Home Foreign Investments صفحہ 881

ہندوستان کو استحصال کیا گیا اُس سے اور بھی فائدے ہوئے۔ جزوی طور سے ہندوستان کے ساتھ روابط کی بنا پر انگلستان تارف کی روکوں کی ضربوں میں زندہ رہ سکا۔ برطانوی مال کے لیے ہندوستانی منڈی کھلی رہی اور اُس کے خلاف تارف پر ہندوستانی برآمدات نے قابو پالیا۔ [1] اس کی وضاحت پٹ سن کی خصوصی صورت حال سے ہوتی ہے۔"1887-91 سے 1909-12 برطانیہ کے پٹ سن کے مال کی مجموعی برآمدات 250 ملین گز کے اوسط سے کم ہوکر 170 ملین گز رہ گئے اس لیے کہ" ہندوستان کے مال نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ، اسٹریلیا اور اونچے تارف والی جنوبی امریکی منڈیوں کو بھی ختم کرلیا تھا۔" [2] لیکن برطانیہ کے بدیسی منڈیوں کی ہندوستانی پٹ سن کے مال کے لیے فتح سے انگلستان کو نقصان نہیں ہوا۔ اس لیے ہر سال ہندوستان پٹ سن اور پٹ سن کے مال کی برآمدات کے منافع میں سے دس ملین پاؤنڈ برطانیہ کے ڈالر کے حسابات کے سلسلہ میں ریاستہائے متحدہ امریکہ کو ادا کرتا تھا" جو خود ڈنڈی کے اعتراف کے مطابق وہ تارف کی رکاوٹوں کی بنا پر نہیں کرسکتا تھا۔" [3]

1858 سے پہلے ہندوستان کو ادائیگی کے بحرانی توازن کا سامنا کرنا پڑا۔ [4] اُس کی دست کاریاں تباہ ہوچکی تھیں اور وہ برطانوی مصنوعات کی بڑی مقدار درآمد کرنے لگا تھا۔ نیل کی طرح کی اشیا کی درآمدات برطانوی منڈیوں میں کم ہورہی تھیں اور افیم کی جنگوں نے اُس تجارت پر کاری ضرب لگائی تھی جو زرمبادلہ حاصل کرنے کا ہندوستان کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ چنانچہ ہندوستان میں برطانوی مال کی درآمد کے بڑھنے میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی ادائیگی کے توازن کی صورت، لیکن پٹ سن، کپاس اور چائے کی صنعتوں کی ترقی اور بھاپ کے ذرائع آمدورفت نے اس مسئلے کو حل کردیا۔

---

[1] ایضاً

[2] سول، محولہ بالا

[3] ایضاً، صفحہ 56

[4] سلیکٹ کمیٹی کی رپورٹ 3381، مالیات اور حسابات۔ تجارت، جلد دوم، حصہ دوم، صفحہ 775 مسٹر میکی لوپ کی شہادت

VI۔ معاشی نکاس

حالانکہ درآمدات میں بہت زیادہ اضافہ ہوگیا تھا جو پھر بھی 1862 کے بعد تجارت کا توازن مسلسل ہندوستان کے موافق رہا۔[1] اپریل 1862 سے مارچ 1905 تک کی 43 برسوں میں درآمدات کے مقابلے میں 1,288,23 کروڑ کے فاضل برآمدات ہوئے جس کا اوسط ہوا 29.3 کروڑ فی سال ہے۔ اس کے عوض ہندوستان نے 508.81 کروڑ کا سونا اور چاندی درآمد کی۔ بقیہ یعنی 780642 کروڑ کی رقم ملک کی اُن ذمہ داریوں کو پورا کرنے پر خرچ کی گئی جو انگلستان کے ساتھ سیاسی اور معاشی روابط کی بنا پر اُس پر عائد ہوئی تھیں اور اُس کو ''بعد عوض'' برآمدات سمجھنا چاہیے۔

دادا بھائی نوروجی اور رمیش چندر کی طرح کے ماہرین معاشیات اور ہندوستان کی رائے عامہ کے رہنماؤں نے اس ادائیگی کو ''خراج'' سے تعبیر کیا جو انگلستان کو ہندوستان ادا کرتا تھا اور ملک کی بڑھتی ہوئی غربت وافلاس کی ذمہ داری ''ہندوستان سے ہر سال ہونے والے دولت کے نکاس'' پر ڈالی۔[2]

اس نکاس کا ایک حصہ ''گھریلو اخراجات'' کی نمائندگی کرتا تھا جو اُن ادائیگیوں پر مشتمل تھے جو ہندوستان کی طرف سے مندرجہ ذیل کے لیے انگلستان کو جاتی تھیں۔ لوگوں کے قرض کا سود ادا کرنے کے لیے صحافت اور اعانت شدہ ریلوں کا سود اور سالیانے ادا کرنے کے لیے، اُن قرضوں کا سود ادا کرنے کے لیے جو مفاد عامہ کے دوسرے کاموں کی خاطر لیے گئے، اُن سول اور فوجی حکام کی چھٹیوں کے اخراجات اور پنشنوں کے لیے جو ہندوستان میں ملازمتوں سے چھٹی پر آتے تھے یا رٹائر ہوئے تھے، انگلستان میں سکریٹری آف اسٹیٹ کے دفتر کے اخراجات کے

---

[1] 5581-65 سے 1681-26 تک ہندوستان کی درآمدی فاضل کی رقم تھی 22.35 کروڑ۔ اس خسارے کا بڑا حصہ یعنی 02.59 کروڑ 6581-75 اور 9581-06 کے درمیانی چار برسوں میں ہوا تھا جس کو 7581 کی بغاوت کا راست نتیجہ سمجھا جاسکتا ہے۔

[2] دادا بھائی نوروجی Poverty and Un British Rule (لندن 1091)، صفحات 33-65

لیے اور اُس مال کے لیے جو حکومت ہندوستان کے مختلف شعبوں کو مہیا کیا جاتا تھا۔ اس کا دوسرا حصہ درآمدات کی ایسی ''غیر مرئی'' مدات پر ہونے والے اخراجات پر مشتمل ہوتا تھا جیسے بدیسی بنک کاری، بیمہ اور جہاز رانی کی کمپنیوں کی خدمات، بدیسیوں کے کاروبار کے منافع جیسی چائے کے باغات، پٹ سن کے مصنوعات اور کان کی اور برطانوی افسروں اور تاجروں کی ہندوستان سے بھیجی جانے والی نجی رقمیں۔

1835 اور 1871 کی درمیانی مدت میں سالانہ فاضل درآمدات کی خالص مالیت تھی 461 ملین پاؤنڈ۔[1] 72-1871 میں یہ رقم بڑھ کے 21.03 کروڑ ہوگئی[2] لیکن اُس کے بعد کم ہوگئی اور 91-1890 تک قریب قریب 16 سے 18 کروڑ رہی۔ اُس کے بعد دوگنا بڑھ گئی اور 92-1891 میں 27.3 کروڑ، 93-1892 میں 30.28 کروڑ اور 95-1894 میں 34 کروڑ روپے تھی۔ 4-1903 میں یہ رقم 29.9 ملین پاؤنڈ، (27 کروڑ روپے) تھی۔ اسی طرح اس زمانے میں ''گھریلو اخراجات'' بھی بڑھ گئے تھے۔ 85-1884 میں یہ اخراجات 11.4 ملین پاؤنڈ تھے۔ 89-1888 میں 14.8 ملین پاؤنڈ، 2-1901 17.4 ملین پاؤنڈ اور 5-1904 میں 19.4 ملین پاؤنڈ۔

استعماریت کے زمانے میں سالانہ ان رقموں کی ادائیگی ہندوستان اور برطانوی مصنفین کے درمیان ایک طویل اور نزاعتی بحث کا موضوع بنی رہی ہے۔ برطانیہ کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ یہ ادائیگیاں اُس اصل کے سود اور منافع کی نمائندگی کرتی ہیں۔ انگلستان نے جس کی اصل کاری

---

[1] اخلاقی اور مادی ترقی کی رپورٹ 2781-37، صفحہ 701۔ سر رچرڈ ٹیمپل کی ایک روداد مورخہ 41 ستمبر 2781 کی رو سے انگلستان کو برآمد کئے جانے والے تجارتی مال کی قیمت تھی 121 ملین پاؤنڈ اور درآمد ہونے والے مال کی قیمت تھی 385 ملین پاؤنڈ جس میں 924 ملین پاؤنڈ بقایا رہی 451 ملین پاؤنڈ جس کو اگر 73 سے تقسیم کیا جائے تو سالانہ اوسط آتا ہے 1.4 ملین پاؤنڈ۔

[2] دادا بھائی نوروجی کے حساب سے یہ رقم 53.5 ملین پاؤنڈ سالانہ ہوتی ہے۔ اگر اس میں تجارت کا منافع اور افیم کی خالص آمدنی بھی جوڑی جائے جس کا ذکر تجارت کے حسابات میں نہیں کیا گیا ہے۔ مقابلہ کیجیے Poverty Un-British Rule محولہ بالا، صفحات 33-43

اس ملک میں کی تھی۔ ہندوستان کے قومی رہنماؤں میں ایم۔جی۔رانا ڈے کی طرح کی بلند قامت شخصیت بھی پچھلی صدی کے آخر میں اس نقطۂ نظر کی حامی تھی۔ صنعتی کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا۔[1] ''کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ جب تک ہر انگلستانی وہ بڑا اخراج ادا کر رہے ہیں جس کی وجہ سے ہر سال 20 کروڑ روپے کے فاضل درآمدات ہمارے ہاتھوں سے نکل جاتے ہیں اُس وقت تک ہماری نجات ممکن نہیں ہے اور اپنی مدد کرنے کے لیے کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔لیکن یہ موقف نہ منصفانہ ہے اور نہ جرأت آمیز۔'' انھوں نے صنعت کاروں سے بزور الفاظ میں کہا'' آپ خراج کے سوال پر فضول بحث میں اپنی قوت عمل صرف نہ کیجئے جس کو سیاسی کانگریسیوں پر چھوڑ دیا جانا چاہئے۔'' اس کے برعکس بہت سے انگریزوں نے، جن میں سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کے لوگ شامل ہیں، اس موضوع پر مختلف موقف اختیار کیا۔[2] 1878-79 کے مالیاتی بیان میں اس سلسلے میں کہا گیا۔[3]

''ہندوستان کے معاشی حالات کی ایک خصوصی نوعیت ایسی ہے جس نے اس بات کو (ملک کی فاضل پیداوار کو صرف کرنے کا کوئی بڑا اور سازگار ذریعہ) زیادہ ضروری اور زیادہ اہم بنا دیا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ انگلستان کے ساتھ اُس کے روابط اور اُن روابط کے مالیاتی نتیجوں کی بنا پر وہ مجبور ہے کہ ہر سال اپنی پیداوار کا تقریباً 20 ملین پاؤنڈ کا حصہ یورپ بھیجے جس کے عوض اُسے اُتنی مالیت کا تجارتی مال نہیں ملتا ہے۔ درآمدات کے مقابلے میں فاضل برآمدات ایسے ہیں جنھیں ماہرین معاشیات کی زبان میں خراج سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان وجوہات کے بنا پر ہندوستان کی تجارت کی نوعیت غیر معمولی ہوگئی ہے جو اُسے اس سے باز رکھتی ہے کہ وہ اس کے بدلے میں باہر سے آنے والا تجارتی مال اور خزانہ پائے اور اُس سے پورا تجارتی فائدہ حاصل کرے جو عام حالات میں اُس کے وسیع مادی وسائل کی بنا پر اُسے حاصل ہونا چاہیے۔'' اسی طرح زمرے

---

[1] اس نقطہ کے بہترین نمائندے ہیں تھوڈرو ماریسن Eco-Transition in India باب 8، ویرانسٹے Eco-Development of India ضمیمہ جی۔

[2] اس موضوع پر کئی برطانوی حاکموں کی رایوں کے متعلق دیکھئے دادا بھائی نورجی، محولہ بالا، صفحات 83-95

[3] مالیاتی بیان کی تجویز نمبر 1191 مورخہ 81 مارچ 8781، پیراگراف 25

میکڈونالڈ نے لکھا تھا۔[1] ایک بدیسی حکومت کے تحت ان بلا معاوضہ اخراجات کی دہری خصوصیت ہے اس لیے کہ وہ نہ صرف ہندوستان کی پیداوار میں سے لیے جاتے ہیں بل کہ خود ہندوستان سے چھین لیے جاتے ہیں......اس کی وجہ سے پیداوار کے دھارے میں سے پانی کی بڑی مقدار نکال لی جاتی ہے جس کی معنی غربت وافلاس ہوتے ہیں۔'' اس نے مزید کہا۔[2] اگر باہر بھیجا جانے والا اخراج بھاری ہو تو وسیع پیمانے پر خوشحالی نہیں ہو سکتی ہے۔''

ایک مشہور امریکی مصنف نے لنڈ منکس نے اس موضوع پر یہ کہا۔[3] اخراجات کا وہ بوجھ جو ہندوستان پر ڈالا گیا بہت غیر معقول تھا۔ غدر کے اخراجات کمپنی کے حقوق تاج کو منتقل کرنے کے اخراجات، چین اور ابی سینیاں کے خلاف جنگوں کے اخراجات اور لندن میں ہر اُس سرکاری مدد پر ہونے والے اخراجات جن کا دور کا تعلق بھی ہندوستان سے نہیں تھا۔ یہاں تک کہ انڈیا آفس میں کام کاج کرنے والی عورت کی اجرت، اُن جہازوں پر ہونے والا خرچ جو گئے تو لیکن کسی کسی لڑائی میں حصہ نہیں لیا اور ہندوستان کو جانے سے پہلے چھ مہینے تک ہندوستان جانے والی فوج کو انگلستان میں تربیت دینے کے اخراجات۔ یہ کام اخراجات کا بوجھ اُن کسانوں پر ڈالا جاتا تھا جن کو نمائندگی حاصل نہیں تھی۔'' 1868 میں ترکی کا سلطان لندن گیا اور سرکاری ناچ کا انتظام انڈیا آفس میں کیا گیا اور اس کے اخراجات ہندوستان کو برداشت کرنے پڑے۔ ہندوستان کے خزانے سے اسی قسم کے اصراف بیجا کی اور بھی مثالیں دی جاسکتی ہیں۔

مہاتما گاندھی کے ایک قریبی ساتھی جے۔سی کمار پاسی تفصیلات سے بچتے ہوئے یہی بات انگلستان کے ہندوستان پر قرض اور اُس کے سود کی سالانہ ادائیگی کی ناانصافی کے متعلق کہی ہے۔[4]

''یہ غیر پیداواری قرض زیادہ تر انگلستان نے خود ہندوستان کو فتح کرنے اور ایشیا اور افریقہ میں

---

[1] رمزے میکڈانلڈ The Government of Iidia، صفحہ 841

[2] ایضاً، صفحہ 941

[3] منکس، ایل۔ایچ محولہ بالا صفحات 323-423۔ مزید دیکھئے دبی کمیشن کے سامنے بکانن کے بیان 5881 جلد 1۔صفحہ 941

[4] کمارا پا، جے۔سی، Public Finance and our Poverty، احمد آباد 1291، صفحات 92-03

سامراجی مفادات کی جنگیں لڑنے کی خاطر لیا تھا اور ہندوستان کو وہ ادا کرنا پڑا۔ چونکہ یہ بڑے بڑے قرض اُن لڑائیوں اور اُن مفادات کو حاصل کرنے کی خاطر کیے گئے تھے جن سے اُس کا کوئی تعلق نہیں تھا اس لیے یہ بوجھ ہندوستان پر ڈالنا کسی طرح بھی منصفانہ نہیں کہا جا سکتا تھا۔''

چنانچہ ''گھریلو اخراجات'' اور ''خراج'' کی یہ بجٹ زیادہ تر اخلاقی سطح پر کی گئی لیکن جو بات زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ یہ جاننا ہے کہ ان ادائیگوں کا کیا اثر ہندوستان کی معیشت پر پڑا۔ ان ''بلا معاوضہ برآمدات'' کے سوال پر ماہرین معاشیات نے پہلی عالمگیر جنگ کے بعد اُس وقت پہلی مرتبہ سنجیدگی سے بحث کی جب جرمنی سے تاوان جنگ وصول کرنے کا سوال اُٹھا۔[1]

جے۔ ایم۔ کینیز نے (جو بعد میں لارڈ کینیز ہو گیا) اس موضوع پر مندرجہ ذیل رائے ظاہر کی[2] اس بات کو سرسری طور سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے کہ جہاں تک ملک کی فاضل پیداوار پر اُس کے نتائج کا تعلق ہے معیار زندگی کا گرنا (جو خراج ادا کرنے کی وجہ سے ہوا) یکطرفہ عمل کرنا ہے۔ اُس کے علاوہ ہمارے پاس کسی ایسی سفید نسل کی نفسیات کا تجربہ نہیں ہے جو قریب قریب غلامی کی زندگی بسر کرتی ہو۔ لیکن عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر کسی انسان کی تمام فاضل پیداوار اُس سے چھین لی جائے تو اس کی کارکردگی اور محنت کم ہو جاتی ہے، صنعت کار اور اصل کار، تاجر اور دکاندار بچت نہیں کریں گے اور مزدور محنت نہیں کرے گا اگر اُن کی محنت کے پھل اُن کے بچوں کو نہ ملیں یا اُن کے بڑھاپے میں کام نہ آئیں یا اُن کی عزت اور حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے استعمال نہ کئے جا سکیں بلکہ اُن سے بدیسی فاتحین استفادہ کریں۔'' جو بات سفید نسل کے لوگوں پر صادق آتی ہے۔ لیکن چونکہ ہندوستان ایک آزاد ملک نہیں تھا اس لیے وہاں سے ''دولت کے مسلسل نکاس'' اور اُس کی معیشت پر اُس کے تباہ کن اثرات کو کسی یورپین ماہرین معاشیات نے درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ لیکن ادھر کچھ دن سے ماہرین معاشیات غیر ترقی یافتہ معیشتوں کو ترقی دینے کے

---

[1] دیکھئے جے۔ ایم۔ کینیز Eco-Consequences of Peaces صفحہ 291۔ حاشیہ مزید کینیز جرمن منتقلی کا مسئلہ، اکونامک جرنل، جلد XXXIX مارچ 9291، صفحات 1-7 اور برٹن، تاوان کا مسئلہ، ایک بحث، اکونامک جرنل XXXIX جون 9291، صفحات 271-371

[2] کینیز، محولہ بالا، صفحہ 391۔ حاشیہ

تعلق سے اس سوال پر بحث کرنے لگے ہیں۔ مثال کے طور پر ہیری جی۔ جانسن نے بین الاقوامی تجارت پر معاشی نمو کے ہیرو۔ڈومر طریقے کا اطلاق کرتے ہوئے معاشی ترقی پر ''بلا معاوضہ برآمدات'' کے اثرات کو ناپنے کے لیے ایک ریاضی کا فارمولہ پیش کیا ہے۔[1] اس فارمولے کے مطابق اگر مسلسل فاضل برآمد کی موجودگی کی بنا پر ملک کی بچت کی رائج الوقت شرح کم ہوتی ہے تو معاشی نمو کی شرح بھی اس حد تک کم ہو جاتی ہے، اُس کے الفاظ میں۔[2] اگر کسی زمانہ میں تناسبی فاضل پر برآمد کم ہوتی جاتی ہو اور اگر برآمدات کی نمو کی شرح طبعی شرح نمو سے زیادہ ہو تو آخر الذکر اُس مدت میں کم ہوئی۔'' گھریلو اخراجات'' کو منصفانہ سمجھا جائے یا غیر منصفانہ لیکن اس خیال سے اختلاف مشکل ہی سے کیا جا سکے گا کہ ان ادائیگیوں کا مضر اثر ہندوستانی معیشت کے نمو پر پڑا۔ فاضل برآمد بچانے اور اصل کاری کرنے کی ملک کی طاقت کم کر دی اور اس طرح ملک کی معاشی ترقی کو روک دیا۔

جیسا کہ دادا بھائی نوروجی اور آر۔سی۔دت نے کہا ہے اس معنی کہ خراج کی ادائیگی اور ملک کے بڑھتے ہوئے قحطوں میں ایک راست تعلق تھا۔ دادا بھائی نے اس پر زور دیا کہ تشکیل اصل کی نیچی شرح اور صنعتی ترقی کی سست رفتار نکاس کے راست نتیجے تھے۔ دت اس سے بھی آگے بڑھ گئے انھوں نے نکاس کو غذائی اجناس کی برآمدات اور اس کے نتیجے میں ملک میں غذا کی قلت اور اُس کی اونچی قیمتوں سے جوڑ دیا۔ انھوں نے لکھا ''کسی حد تک تکلیف دہ ہونے کے باوجود اس پر نظر ڈالنا بڑا اسبق آموز ہے۔ انگلستان کو جانے والے سالانہ معاشی نکاس کی قیمت ہندوستان کی آمدنی سے راست ادا کی جاتی ہے۔ ہندوستان کی آمدنی کا بڑا حصہ مالگزاری کی شکل میں زمین سے حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ مالگزاری عام طور سے جنوبی ہندوستان میں کسانوں سے اور شمالی ہندوستان میں مالکان اراضی سے وصول کی جاتی ہے جو خود کسانوں سے لگان وصول کرتے ہیں۔ کسان اپنے کھیتوں کی پیداوار کا بڑا حصہ فروخت کرکے مالگزاری یا لگان ادا کرتے ہیں اور اپنے

---

[1] ہیری۔جی۔جانسن، International Trade & Eco لندن 1959، صفحہ 122

[2] یہ فارمولہ سرائے ہیروڈ کے معاشی نمو کے طریقے سے راست اخذ کیا گیا ہے اور اُس کا جز ہے۔ دیکھو Towards a dynamic Eco. لندن 1948

لیے ناکافی ذخیرہ رکھتے ہیں۔ برآمد کرنے والے تاجروں کے گماشتے پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں جو وہ مال خرید لیتے ہیں جسے فروخت کرنے پر کسان مجبور ہوتا ہے۔ ریلیں بلا تاخیر یہ مال بندرگاہوں تک پہنچا دیتی ہیں جہاں سے وہ یورپ جاتا ہے۔ سردیوں میں آنے والے سیاحوں کی ہندوستان میں بڑی سرگرمیاں نظر آتی ہیں جب ہر بڑے شہر اور منڈی میں یہ خرید فروخت ہوتی ہے لیکن غلے کی تجارت کے خوشگوار منظر کے پیچھے یہ واقعہ چھپا ہوتا ہے کہ ایک زراعت پیشہ قوم کے گھر اور گاؤں مہلک حد تک غذا سے خالی ہو جاتے ہیں تا کہ ہر سال انگلستان کو وہ خراج ادا کیا جا سکے جو وہ ہندوستان سے وصول کرنا چاہتا ہے۔[1]

چنانچہ ہندوستان کو باہر سے آنے والے اصل اور بدیسی حکومت کی بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ ''نکاس'' نے اس کی بچت اور اصل کاری کی استعداد گھٹا دی اور اس طرح صنعتی ترقی روک دی۔[2] اس کے علاوہ ملک کو اس پر مجبور کر کے کہ وہ خراج کے جزوی ادائیگی کے طور پر غذائی اجناس برآمد کرے[3] اس نے ملک میں غذا اور آبادی کے پرخطر توازن کو اور خراب کر دیا۔ اس نے ہندوستان میں غذائی اجناس کی قیمتوں میں اضافہ کر دیا۔ اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں بار بار پڑنے والے قحطوں اور قلتوں میں اضافہ بھی اس کی وجہ سے ہوا۔

شرائط تجارت

ہندوستان یہ ادائیگیاں کرنے کے باوجود ہر سال کچھ سونا اور چاندی درآمد کر سکا جس کی وجہ یہ تھی کہ اُس کی پیداوار کی اچھی قیمتیں ملتی تھیں۔ 1861 سے 1914 تک ''شرائط تجارت'' ہندوستان کے حق میں رہیں۔ مجموعی اعتبار سے دنیا میں 1876 کے بعد شرائط تجارت زراعتی ملکوں

---

[1] دت۔ آر۔ سی، وکٹوریہ کے عہد میں معاشی تاریخ (دوسرا ایڈیشن 1906)، صفحات 49-348

[2] ''نکاس'' پردادا بھائی نوروجی کے حملے کی بڑی بنیاد یہ تھی۔ دیکھئے ویلبی کمیشن کے سامنے اُن کی شہادت، تقریریں اور تحریریں۔

[3] ہندوستان میں چاندی کی قیمت، جرمن آف رائل اسٹیٹیکل سوسائٹی (1892) نے اعتراف کیا کہ قحط کے دوران بھی ملک سے غذائی اجناس کے برآمدات کو ممنوع نہ کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کی وجہ سے گھریلو اخراجات کی ادائیگی میں دقتیں پیدا ہو جاتیں۔

کے خلاف اور صنعتی ملکوں کے حق میں ہونے لگی تھیں۔ اقوام متحدہ تنظیم کی مطبع کے مطابق[1] یہ رجحان اس کے بعد سے برابر بین الاقوامی معاشی سطح پر نظر آتا ہے۔ لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے شرائط تجارت اُس کے حق میں کم از کم پہلی عالمگیر جنگ کی ابتدا تک رہیں جیسا کہ مندرجہ ذیل نقشے سے ظاہر ہوتا ہے۔

نقشہ

ہندوستان کی خالص مبادلے کی شرائط تجارت۔[2]

سال	مبادلے کی شرائط (تجارت برآمدی قیمت کا اشاریہ)	سال	مبادلے کے شرائط تجارت (برآمدی قیمت کا اشاریہ)
1861	92.6	1866	87.8
1862	92.6	1867	87.8
1863	82.4	1868	111.3
1864	78.5	1869	110.5
1865	80	1870	108
1871	111	1891	122.5
1872	100	1892	121
1873	103	1893	126
1874	105.5	1894	131
1875	99	1895	127.6

[1] کے۔ ایل۔ دت Report on rise of prices, (1914) باب۔ 5

[2] Relative prices of Agricultural and Manufactural Commition (یو۔ این۔ او۔ 8491)

1876	125	1896	124.6
1877	135.7	1897	144.2
1878	125	1898	127.5
1879	125	1899	115
1880	115	1900	129.1
1881	111.8	1901	120.8
1882		1902	131.5
1883	112	1905	120.8
1884	123	1906	132.4
1885	121.3	1907	125
1886	116.2	1908	142.4
1887	113.2	1909	134.3
1888	106.5	1910	116.5
1889	114.3	1911	120
1890	114.3	1912	124
1903	117	1913	131
1904	111.8	1914	140

اس کی وجوہ کئی تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اُن 28 اشیا میں سے جن پر برآمدات کی قیمتوں کے اشاریہ کا انحصار تھا غذائی اجناس تھیں۔ چونکہ اس زمانے میں غذائی اجناس کی قیمتیں ہندوستان میں بڑھ رہی تھیں اس لیے درآمدات کے مقابلے میں برآمدات کی قیمتوں میں بہت اضافہ ہوگیا اور اس کے نتیجے میں شرائطِ تجارت ہندوستان کے موافق ہوگئیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہندوستان

مقروض ملک تھا اور اس کی بنا پر اُس کو ہر سال سود اور دوسری رقمیں ادا کرنی ہوتی تھیں جس کی وجہ سے بدیسی منڈیوں میں اُس کی پیداوار کی قیمتیں زیادہ تھیں۔ کولن کلارک کے مطابق ''جب صنعتی ممالک بین الاقوامی قرض دینے میں عملی طور سے مصروف ہوتے ہیں تو اُس زمانے میں شرائط تجارت اصل پیداوار کنندگان کے موافق ہوتی ہیں اور دیگر حالات میں اس کے برعکس صورت ہوتی ہے۔''[1] 1875 سے 1914 تک انگلستان بڑی بڑی رقموں کی اصل کاری ہندوستان اور دوسرے ملکوں میں کر رہا تھا اور اصل کی بڑی بڑی برآمدات[2] کے نتیجے میں اُس ملک کی شرائط تجارت میں کساد بازاری پیدا ہوگئی جو اُن زراعتی ملکوں کے موافق تھی جن کے ساتھ تجارت کرتا تھا۔

برآمدات کی نوعیت اور مشتملات، دولت کی سالانہ نکاس اور حکومت کی آزاد تجارت کی پالیسی نے بدیسی تجارت کو ہندوستان کی معاشی ترقی کا ذریعہ نہ بننے دیا۔ جیسا کہ کنڈل برگر نے کہا ہے۔ ''برآمدات کی بنا پر ترقی ہوتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔ اس ترقی کے لیے یہ شرط ہے کہ اصل کی تشکیل ہو، تکنیکی تبدیلی ہو اور وسائل کا از سرِ نو تعین ہو۔'' جہاں تک ہندوستان کا تعلق تھا ان میں سے کوئی شرط پوری نہیں ہوئی۔ ''نکاس'' نے تشکیل اصل کی شرح کو کم رکھا اور بدیسی تجارت میں زراعتی پیداواروں پر توجہ مرکوز کرنے کی وجہ زراعت اور صنعت میں محنت اور اصل کا تعین نہیں کیا جا سکا۔

جدید کارخانوں کی صنعتوں کے علاوہ زراعت اور صنعت میں تکنالوجی قدیم ہی رہی۔ اُنیسویں صدی میں جو خصوصی حالات ہندوستان میں پائے جاتے تھے اُن میں زیادہ کے مقابلے

---

[1] کلارک کولن Condition of Eco. Progress صفحہ 664

[2] اگر انگلستان نے اصل برآمد کر کے اس زمانے میں اپنی تمام بدیسی اصل کاری کی ہوتی تو شرائط تجارت اور زیادہ اس کے ناموافق ہو جاتے۔ لیکن حقیقت میں اُس کی بدیسی اصل کاری کا بڑا حصہ اُن رقموں پر مشتمل تھا جو ملک کے باہر کی تھیں اس کی وجہ سے بدیسی پیداوار کی اُس کی مانگ کم رہی اور شرائط تجارت کو بہت زیادہ ناموافق نہیں ہونے دیا۔ دیکھئے کیرن کراسدس۔ اے۔ کے۔ Home & Foriegn Investment Economic Elements in Par Britanica لندن اور اصلاح۔

میں کم تجارت ملک کی معاشی ترقی کے لیے مفید ہوتی۔[1]

ہندوستان کی بدیسی تجارت میں جو انقلابی اضافے ہوئے اُس کا بڑا تقسیمی اثر ملک کی معیشت پر پڑا۔ تجارت کرنے والے طبقات تجارت کی وجہ سے دولت مند ہو گئے۔ چونکہ جہاز رانی، بنک کاری بیمہ، اور برآمد درآمد تجارت قریب قریب پوری بدیسیوں کے ہاتھوں میں تھی اس لیے برآمد درآمد کرنے والے اداروں کے مال تقسیم کرنے والے ایجنٹوں کی حیثیت سے ہندوستانی کام کرتے تھے۔ غلہ جمع کرنے والے اور کمیشن ایجنٹ، دلال اور زراعتی پیداوار کے تاجر، بنک کار اور دیہی ساہوکار، زمیندار، دکاندار اور درآمد کئے جانے والے مال کے تقسیم کاران سب کو بڑھتی ہوئی بدیسی تجارت سے فائدہ ہوا اور وہ دولت مند ہو گئے۔ چنانچہ تجارتی طبقات اور انہی کی طرح دیہاتی سرمایہ دار اور زمیندار زیادہ دولت مند اور طاقتور ہو گئے لیکن زراعت اور صنعت دونوں کے پیدا کرنے والے اس تجارت سے فائدہ نہیں اٹھا سکے۔ تمام شواہد ظاہر کرتے ہیں کہ کاشتکار اور دست کار زیادہ تباہ حال ہو گئے جس کی وجہ سے انھیں دشواریوں اور قحطوں کا بار بار سامنا کرنا پڑا۔

VII صنعتی ترقی

ہندوستان اور انگلستان کے باہمی رشتے کا سب سے زیادہ افسوسناک باب یہ تھا کہ انیسویں صدی میں صنعتوں کو عموماً نظر انداز کیا گیا۔ ہندوستان کی وہ پرانی صنعت برباد ہو چکی تھی جس کی وجہ سے آبادی کے ایک قابل لحاظ حصے کو روزگار ملتا تھا اور صدیوں تک دنیا بھر سے سونا اور چاندی یہاں آتا رہا تھا۔ دست کاریوں کی جگہ لینے کے لیے نئی صنعتیں شروع نہیں کی گئیں نہ جاپان

[1] اس صورت میں بدیسی تجارت کا اثر وسیع حلقے میں غیر معین ہوتا ہے، تجارت صرف اُس صورت میں ترقی کا باعث ہو سکتی ہے جب باہر کے ملکوں میں مانگ صحیح ہو اور اپنے ملک میں سپلائی صحیح ہو۔ یہ تجارت اس کو نقصان پہنچا سکتی ہے اگر بدیسی میں مانگ غلط ہو یا اپنے ملک میں سپلائی غلط ہو۔ وہ درمیانی صورتوں میں کیا ہوگا۔ یہ ہمیں معلوم ہے۔ کندل برگر، محولہ بالا، صفحہ 112۔ ہندوستان کی حد تک مانگ ''بدیسی میں غلط تھی'' اور سپلائی اپنے ملک میں غلط تھی۔

کی طرح دست کاریوں کو نئے صنعتی نظام میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی۔

انگلستان کے حکمراں حلقے کے ذاتی مفادات کے نتیجے میں مغرب کی نئی مشینی صنعت کونشوونما پانے کی اجازت نہیں دی گئی۔ مختلف قسم کے پیشوں پر سختی سے پابندی لگائی گئی جو بڑھتی ہوئی آبادی کے مسئلے کو حل کر سکتے تھے، سرمایہ دارانہ صنعت کی نشوونما کو روکا گیا جو زیادہ اور جلدی منافع کما سکتی تھی اور عہد وسطیٰ کی تنگ دستی کی معیشت کے دور کو غیر ضروری توسیع دی گئی۔ تجارت نے جو معیشت کی نمو کا سب سے بڑا ذریعہ ہے، تیزی کے ساتھ ترقی کی لیکن صنعت کاری کی عدم موجودگی کی بنا پر اس نے استعماری نظام کی بدترین خصوصیتوں کو اور پروان چڑھایا۔

1880 کے قیمبن کمیشن نے اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان کی معاشی صورت حال کا لب لباب ایک جملہ میں پیش کیا تھا۔ ہندوستان کے لوگوں کے افلاس اور قلت کے زمانوں میں انھیں جن خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اُن بنیادوں کی وجہ یہ ہے کہ بدقسمتی سے وہاں کے لوگوں کا واحد ذریعہ معاش زراعت ہے۔ موجودہ خرابیوں کا علاج اس وقت تک نہیں کیا جا سکتا ہے جب تک مختلف پیشوں کو رواج نہ دیا جائے جن کی بنا پر آبادی کا فاضل حصہ زراعت کا پیشہ ترک کر کے مصنوعات یا اس قسم کے دوسرے کام کر کے اپنی گزر بسر کر سکے۔[1] ''یورپ کے برعکس ہندوستان میں تجارت کی ترقی صنعت کاری سبب نہ بن سکی۔ بدیسی اصل ریلوں، باغوں، کانوں، بنکوں بیموں اور سرکاری قرضوں میں لگایا گیا۔[2] لیکن چائے باغات، کان کنی اور پٹ سن کے کارخانوں کے علاوہ اس نے ہندوستان میں جدید صنعتوں کی ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ جاپان میں جرمنی میں صنعتوں نے تیزی کے ساتھ جو ترقی کی تھی اس کے برعکس ہندوستان میں صنعت کاری کی سست رفتاری کی وجوہ پر بحث کرتے ہوئے کنگس۔ کے۔ ڈیوبز نے کہا۔

''لیکن ہندوستان کئی طریقے سے ایک باج گزار ریاست تھا۔ حالانکہ دوسرے عوامل و مفادات بھی اُس میں شامل تھے پھر بھی اس کے تعلق سے انگلستان کی پالیسی ویسی تھی جیسی ایک صنعتی قوم کی زراعتی نوآبادی کے تعلق سے ہوتی ہے۔''

---

[1] قیمبن کمیشن کی رپورٹ، حصہ 2 باب 6 صفحہ 175

[2] منکس، محولہ بالا، صفحہ 25

اُس کے بعد اُس نے صنعت کاری کو فروغ دینے میں حکومت ہندوستان کی ناکامی کے اسباب کا ذکر کیا۔ قدرتی وسائل سے استفادہ کرنے کے لیے وہ قومی مفاد کے بجائے بدیسی کاروبار کو اور ہندوستانی خام مال کے استعمال کے لیے ہندوستانی پیداگاروں کے مقابلے میں بدیسی مہم جو لوگوں کو ترجیح دیتا تھا، فوج، سول کاموں اور ریلوں کے لیے ہندوستانی کمپنیوں کے بجائے برطانوی کمپنیوں سے مال خریدا جاتا تھا اور کرنسی کے ایسے ضوابط بنائے گئے اور بنک کاری کے ایسے طریقے اختیار کئے گئے جو ہندوستانی مفادات کے لیے مضر تھے۔[1]

1858 سے پہلے لوہے کے کام، نیل کی کاشت، کاغذ سازی اور ریشم کے کیڑے پالنے کی صنعتوں کی طرف انفرادی طریقے سے مہم جو افراد نے توجہ دی تھی لیکن عجیب بات یہ ہے کہ 1858 کے ملکہ کے اس اعلان کے بعد کہ ''ہماری بڑی خواہش ہے کہ ہندوستان میں پرامن صنعت کو فروغ دیا جائے'' بدیسی اصل کاروں اور حکومت دونوں نے ہندوستانی مصنوعات کو ترقی دینے میں افسوسناک حد تک لاپرواہی سے کام لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آبادی میں اضافے اور ہندوستانی دست کاریوں کی تباہی کی بنا پر زیادہ سے زیادہ لوگ اپنی گزر بسر کے لیے زراعت کی طرف رجوع کرنے لگے جس کی وجہ سے گاؤں میں بے روزگاری بڑھ گئی۔ ایک طرف یورپ، ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جاپان نے اپنی صنعتوں کو بڑھایا اور اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں بہت سے لوگوں کو زراعت سے ہٹا کر صنعتوں میں روزگار فراہم کیا لیکن ہندوستان میں ''صنعتوں کو ختم کیا گیا۔''[2] یہ بات مندرجہ ذیل نقشے سے ظاہر ہوتی ہے کہ 1911 تک آبادی کی پیشہ وارانہ تقسیم میں کیا تبدیلیاں ہوئیں۔[3]

---

[1] ڈیوبنر۔ کے Population of India & Pakistan، صفحہ 217

[2] ڈینیل تھورنر، De-Industrialization in India 1881-1931 معاشی تاریخ کی پہلی بین الاقوامی کانفرنس میں پڑھا گیا (اسٹاک ہوم 1960)

[3] ایضاً، صفحات 225-224

نقشہ

	1871	1881	1891	1901	1911
	کل ہند				
کام کرنے والے (مرد)	100	100	100	100	100
(1) زراعت، جنگلات، مچھلی کا شکار اور عام کام	74	74	74	75	76
(2) مصنوعات سازی، کان کنی، تعمیر اور تجارت	18	16	16	15	15
(3) بار برداری اور دوسرے کام	8	8	10	10	9

دوسرے قسم کا کام کرنے والوں کی تعداد 1881 میں 18 فی صدی تھی جو 1901 میں گھٹ کر 15 فی صدی رہ گئی۔ اُس زمانے میں ملک میں کئی ''صنعت کاری'' ہوئی اُس کا ثبوت یہ اعداد پیش کرتے ہیں۔ یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیے کہ اس مد میں مصنوعات سازی کے علاوہ کان کنی، تجارت اور تعمیر بھی شامل ہیں۔ جیسا کہ اوپر دکھایا جا چکا ہے۔ اس زمانے میں تجارتی سرگرمیاں بڑھ رہی تھیں اور شہر کاری کی بنا پر تعمیری سرگرمیاں بھی بڑھ گئی ہوں گی۔ اس کی وجہ سے معیشت کے تجارتی اور تعمیری شعبوں میں روزگار کے مواقع بھی بڑھ گئے ہوں گے۔ چنانچہ اگر ان دو شعبوں میں روزگار کے زیادہ مواقع پر نظر رکھی جائے تو مصنوعات سازی اور کان کنی میں روزگار کے مواقع کی کمی اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ اس زمانے میں کارخانوں کی صنعتیں شروع کی گئیں اور اُن میں دو یعنی سوتی کپڑے اور پٹ سن کی صنعتوں نے تیزی کے ساتھ ترقی کی۔ اس طرح کان کنی میں بھی ترقی ہوئی۔ 1905 تک روزانہ اوسطاً 1,96,369 اشخاص سوتی کپڑے کے کارخانوں میں اور 1,33,162 پٹ سن کے کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ مقابلتاً کم اہم صنعتوں میں اُونی کپڑے کے کارخانوں، کاغذ سازی کے کارخانوں اسلحہ اور گولی بارود بنانے کے کارخانوں،

شراب بنانے کے کارخانوں، کپاس صاف کرنے اور گانٹھیں باندھنے کے کارخانوں، نیل کے کارخانوں، پٹ سن کی گانٹھیں بنانے کے کارخانوں، دھان صاف کرنے کے کارخانوں، مشین آروں کے کارخانوں، شکر سازی کے کارخانوں، ریشم کے کیڑوں، لوہا اور پیتل ڈھالنے کے کارخانوں اور ٹائل کے کارخانوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ 1905 میں کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی مجموعی تعداد تھی اسّی لاکھ بانوے ہزار جو مجموعی آبادی یعنی تیس کروڑ کی ایک فی صدی سے بھی کم تھی۔ چنانچہ 1905 تک روزگار کی حد تک ہندوستان کی صنعت کاری کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔

ہندوستان کی صنعتی ترقی میں بدیسی اصل اور کاروبار پیش پیش تھا۔ باغ کاری یعنی نیل، چائے، کافی کی صنعت بدیسیوں نے شروع کی اور حالانکہ کچھ ہندوستانی نے اصل بھی اُن میں لگایا تھا پھر بھی وہ بڑی حد تک بدیسیوں کی ملکیت تھے اور وہی اُن کا انتظام کرتے تھے۔ یہی حال پٹ سن کی صنعت کا تھا۔ پٹ سن کا پہلا کارخانہ 1855 میں ایک اسکاٹ جارج اکلینڈ نے شروع کیا تھا۔ اُنیسویں صدی کے اختتام تک بہت کم ہندوستانی اصل اس صنعت میں داخل ہوسکا۔ کان کنی بھی محض بدیسیوں کے ہاتھوں میں تھی۔ ان صنعتوں پر بدیسیوں کی اجارہ داری کی بنا پر اس کے بعد ان میں ہندوستانی اصل کے لیے گنجائش بہت کم تھی۔ ہندوستانی سرمایہ داری کے ہاتھوں میں واحد بڑی صنعت تھی سوتی کپڑے کی صنعت۔

1905 میں 1494 مشترک سرمایہ کمپنیاں ہندوستان میں رجسٹرڈ تھیں جن کا ادا شدہ اصل تھا 26.78 ملین پاؤنڈ یا 48 کروڑ روپیہ۔ اگر یہ سمجھا جائے کہ وہ تمام کمپنیاں جو ہندوستان میں رجسٹر ہوئیں ہندوستان کی تھیں، جو بہت مشکوک ہے، تو پھر بھی کارخانوں اور کانوں میں لگنے والا کل ہندوستانی اصل ہوا محض 14.7 ملین پاؤنڈ اس کا مقابلہ 350 ملین پاؤنڈ برطانوی اصل سے کیا جانا چاہیے جو اُس زمانے میں ہندوستانی تجارت وصنعت میں لگا ہوا تھا۔ جس طرح مزدوروں کے لیے روزگار کے مواقع کم تھے اسی طرح جدید صنعت میں ہندوستانی اصل لگانے کے مواقع بھی محدود تھے۔

نیل، چائے اور کافی کی کاشت میں کوئلے، سونے اور میگنیز کی کانوں اور پٹ سن کے کارخانوں میں انصرام، انتظام بڑی حد تک یورپینوں کے ہاتھوں میں تھا۔ ان صنعتوں میں

ہندوستانی محض معمولی کلرکوں کی یا دوسری حیثیتوں سے کام کرتے تھے۔سوتی کپڑے کی صنعت میں بھی جس میں 99فی صدی اصل ہندوستانی تھا، اس صنعت کی ترقی کے ابتدائی دنوں میں قریب قریب سبھی مل منیجر اور افسران شعبہ لنکا شائر سے آئے ہوئے لوگ تھے۔[1] 1895 میں بمبئی کے کارخانوں میں 42.4فی صدی منیجر، تکنیکل انجینئر اور دھنائی، کتائی اور بنائی کے ماہر یوروپین تھے۔ یہ امر قدرتی ہے کہ جب بدیسی تکنیک حاصل کی جاتی ہے تو صنعتی ترقی کے ابتدائی دنوں میں بدیسی ٹیکنیشین بھی حاصل کئے جاتے ہیں۔جاپان اور جرمنی کی طرح کے آزاد ملکوں کو بھی صنعت کاری کے ابتدائی مرحلوں میں اس پر عمل کرنا پڑا۔لیکن اُن ملکوں میں وہاں کے باشندوں نے نئے فنون اور تکنیک جلدی سیکھ لیں اور تھوڑی ہی مدت بعد صنعتوں کا انتظام خود سنبھال لیا مگر ہندوستان میں اس میں بہت دیر لگی۔[2]

ملک میں جن صنعتوں کو ترقی دی گئی وہ یا تو برآمد مائل تھیں یا ہندوستان میں بدیسی کاروبار کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے انھیں ترقی دی گئی تھی۔ چنانچہ نیل، چائے کافی اور پٹ سن کی صنعتوں کی ترقی کی وجہ یہ تھی کہ انگلستان اور یورپ کی دوسری منڈیوں میں اُن کی مانگ تھی۔ کوئلے کی کانوں کو ترقی دینے کا راست تعلق ریلوں کے پھیلاؤ سے تھا۔ریلوں کی وجہ، انجن سازی اور دوسری چھوٹی چھوٹی انجینئرنگ کی صنعتیں بھی وجود میں آئیں۔لیکن مشین سازی کی صنعت کو ترقی نہیں دی گئی اور جنگ عظیم کے بعد تک چھوٹی چھوٹی مشینوں کے لیے ملک کو بدیسی صنعتوں پر انحصار کرنا پڑا تھا۔ لوہے اور فولاد کی صنعت کو بھی، جس کے لیے بڑے بڑے قدرتی وسائل ہندوستان میں موجود ہیں، اُس وقت تک ترقی نہیں کرنے دی، جب تک پچھلی صدی کے ختم ہوتے ہوتے بلجیم میں فولاد کی صنعت بڑھ گئی اور ہندوستان میں بلجیم کے فولاد کی مانگ میں اضافہ ہوگیا۔

---

[1] لکانن۔ڈی۔ایچ، Development of Capitalist Enterprise in India (نیویارک 1924) صفحہ 21

[2] 1921 میں بھی پورے ہندوستان میں یورپین مل منیجروں کی تعداد مجموعی اعتبار سے 34.6فی صدی تھی۔ جہاں تک اعلیٰ عہدوں کا تعلق تھا جن کی تنخواہیں 1000 روپیہ ماہوار یا اس سے زیادہ تھیں ہندوستانی کاروباری اور اداروں میں 1947 تک 97فیصدی عہدے یورپیوں کے پاس تھے۔ دیکھئے ''کامرس'' بمبئی، 6/جولائی 1963

اس کی بنا پر حکومت کی پالیسی میں یک لخت تبدیلی آگئی 1882 میں جمشید جی ٹاٹا نے اس امر کی پیش کش کی تھی کہ وہ بڑے پیمانے پر لوہے کی صنعت شروع کرنے کے پیش نظر وردرا کی سرکاری کوئلے کی کان لے لیں گے۔ اس تجویز کو رد کردیا گیا تھا۔[1] 1900 میں سکریٹری آف اسٹیٹ جارج ہملٹن اور وائسرائے لارڈ کرزن دونوں نے لوہا اور فولاد بنانے کی اسکیم کے تعلق سے مسٹر ٹاٹا کی ہمت افزائی کی لیکن ٹاٹا آئرن اینڈ اسٹیل کمپنی نے 1911 میں لوہا پیدا کرنا شروع کیا اور 1912 میں فولاد بنایا۔[2]

سوتی کپڑے کی صنعت۔ 1905 سے پہلے ملک کی وہ واحد صنعت تھی جو ہندوستان میں برطانوی مال سے راست مقابلہ کرتی تھی۔ اس صنعت میں ہندوستان کو مانچیسٹر کے مقابلے میں کئی فائدے تھے۔ پہلی بات یہ کہ ہندوستان سوتی کپڑے کی صنعت کے لیے خود ملک کے اندر بڑی منڈی موجود تھی جو بڑھتی جارہی تھی۔ تیسری بات یہ کہ ہندوستان قدیم زمانے سے سوتی کپڑا بنانے والوں کا ملک تھا اور سوتی کپڑا بنانا اُس کے لیے کوئی ایسا نیا کام نہیں تھا جس میں ہندوستانی سرمایہ داروں کو کوئی خطرہ نظر آئے۔ آخری بات یہ کہ ملک میں مزدور سستا تھا۔ ان فوائد کی بنا پر ہندوستان میں سوتی کپڑے کی صنعت شروع کرنے پر ہندوستانی سرمایہ دار آسانی سے تیار ہوگئے۔ لیکن جوں جوں صنعت نے ترقی کی ہندوستانی صنعت کار کے مقابلے میں انگلستان کے صنعت کار کو جن دشواریوں کا سامنا تھا انھیں سامان کے کرائے میں بہت زیادہ تخفیف اور لنکا شائر کے مفاد میں ہندوستان پر مسلط کی جانے والی آزاد تجارت کی پالیسی نے دور کردیا۔ اے۔ ایل۔ باولے کے تخمینے کے مطابق 1853 میں ہندوستانی منڈی میں انگریزی دھاگے اور ہندوستانی دھاگے کی قیمت فروخت میں صرف 3/4 پیس فی پاؤنڈ کا فرق تھا۔[3] اس کے باوجود سوتی

---

1. سکریٹری آف اسٹیٹ کا ہندوستان کو مراسلہ (سی۔ پی۔ ڈبلیو۔ ڈی) سول ورکس، نمبر 63 مورخہ 16 نومبر 1883

2. لوہا اور فولاد بنانے کا منصوبہ پورا ہونے سے پہلے جے۔ این۔ ٹاٹا کا انتقال ہوگیا لیکن اُن کے بیٹوں اور وارثوں نے اس اسکیم کو پورا کیا اور اس طرح اُس واحد بنیادی صنعت کی بنیاد ڈالی جو جنگ عظیم سے پہلے ہندوستان میں موجود تھی۔ دیکھئے لووٹ فریزر، Iron & Steel in India

3. باوے۔ اے۔ ایل، England's Foreign Trade لندن 1983، صفحہ 39۔ انگریزی دھاگے کی قیمت تھی 8.¼ پینس فی پاؤنڈ۔

کپڑے کی صنعت منافع بخش تھی اور ہندوستان کے بنائی اور کتائی کے کارخانے اس صنعت کی ترقی کے ابتدائی مرحلوں میں بھی بڑا منافع کمارہے تھے۔[1]

1905 سے پہلے ہندوستان کی ہر بڑی صنعت کے فروغ کی وضاحت معاشی اُمور کی روشنی میں کی جاسکتی ہے۔[2] لیکن جس بات کی وضاحت نہیں کی جاسکتی ہے ملک کی معاشی ترقی کی سست رفتاری۔[3] صنعتوں کی سست رفتار بلکہ اس زمانے میں جب تیزی کے ساتھ صنعت کی ترقی کے مواقع بہت تھے ملک کی ''غیر صنعت کاری'' کے اسباب دریافت کرنے کے لیے ہمیں سماجیاتی اور سیاسی امور پر نظر ڈالنی ہوگی۔[4]

اس کی ذمہ داری دو اُمور یعنی سماجی نظام اور سیاسی پالیسی پر ہے۔ ہندوستان میں یورپین تجارت کی نمو نے ایک طاقتور کاروباری طبقے کو جنم دیا جو یورپ کے تاجروں کی طرح اکتسابی اور اجتماعی معاشی رجحان رکھتا تھا۔ لیکن انگلستان اور دوسرے یورپین ملکوں کے شہری تاجر نے اختراع وایجاد کے بعد تجارت کے بجائے صنعتی پیداوار پر توجہ دی مگر ہندوستان کے تجارتی طبقات نے اپنی کاروباری سرگرمیاں تجارت، روپے کے لین دین اور جائداد و مکانات خریدنے تک محدود رکھیں۔ ملک کی صنعتی پس ماندگی کی بڑی وجہ اصل کی کمی کے بجائے مواقع اور کاروباری قیادت کی کمی تھی۔ جیسا کہ بکانن نے کہا ہے''ہندوستانی سماج میں حالات ایسے سازگار نہیں تھے کہ وہ صنعتی قائدوں کو جنم دیتے۔ اس کی جزوی وجہ یہ تھی کہ انگلستان میں صنعت کی ترقی اُن سے مختلف

---

[1] ایک ماخذ کے مطابق (پارلیمنٹری، پیپرز، 1888، کمانڈ 5322 صفحہ 116) آٹھویں دہائی میں کچھ کارخانوں نے اپنا پورا اصل پہلے چار برسوں میں کمالیا۔ اسی طرح بمبئی کے پہلے کارخانے نے پہلے دو برسوں میں کوئی منافع نہیں دیا لیکن اُس کے بعد ایک سال میں نصف اصل ادا کردیا۔

[2] روزن، جارج، ہندوستان کی سست رفتار معاشی نمو 18601900، اکونامک ویکلی، 11/اگست 1962۔

[3] سین، اے۔ کے، سماجیاتی اعتبار سے سست رفتار معاشی نمو 1890 1900، اکونامک ویکلی، 11/اگست 1962۔

[4] جیسا کہ شومپیٹر نے کہا ہے''معاشی نمو ایک آزاد مظہر نہیں ہے جس کا اطمینان بخش وضاحت محض معاشی اصولوں سے کی جاسکے۔'' دیکھئے سومپیٹر، نظریاتی مسائل، معاشی تاریخ کا منصب، جرنل آف اکونامک، ہسٹری سپلیمنٹ VIII، 1947 صفحہ 3

حالات میں ہوئی تھی جن میں صنعتی نظام ہندوستان پہنچا۔ مشرقی ممالک میں وہ بڑے بڑے گروہ کارخانے قائم کرنے کے لیے تیار تھے یعنی تاجر اور استاد قسم کے دست کار...... ہندوستان کے دست کاروں نے اس قسم کا حصہ اس میں نہیں لیا۔ ہندوستان کے تاجر تجارت کرنا جانتے تھے اور اُن کے پاس اصل تھا جس پر وہ ہمیشہ منافع کمانے کی خواہش مند رہتے تھے لیکن وہ مزدوروں کا انتظام کرنے کے کام سے ناواقف تھے۔''[1]

ہندوستان کی صنعت کی پس ماندگی اور سست رفتاری کی جزوی ذمہ داری مغربی مصنفین اُس کے سماجی نظام پر ڈالتے ہیں۔ ویرا انسٹے کے مطابق ظاہری مذہبی رجحان، شدید روایت پرستی اور قدامت پرستی، ذات پات کے نظام، بدیسی لوگوں سے علیحدگی اور سیاسی سلامتی کی عدم موجودگی نے معاشی تبدیلی کی رفتار کو سست بنا دیا اور اب بھی سست بنا رہی ہے۔ کنگس لے کا خیال ہے کہ ''ذات پات'' خاندانی روایات اور ہندو دھرم نے مل کر جدید زندگی کی راہ میں بڑی رکاوٹ ڈال دی۔[2]

یہ دلیل بہت معقول نہیں ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ جب ایک سماج ایک نظام سے دوسرے کی طرف عبور کرتا ہے تو روایت پرست عناصر کی طرف سے کسی نہ کسی حد تک مزاحمت ناگزیر ہوتی ہے۔ لیکن ہر دور کا سماجی اور سیاسی طاقتوں کی بنا پر سماج کو بہ رضا و رغبت یا مجبوراً تبدیل ہونا پڑتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ معاشی حالات سماجی نظام کا تعین کرتے ہیں نہ کہ سماجی نظام معاشی حالات کا۔

مثال کے طور پر طاقتور مذہبی عناصر کی مخالفت کے باوجود، قرون وسطیٰ کے راہبانہ اور دوسرے دنیاوی نقطۂ نظر کے باوجود، سود خوری کے معاشی قوانین اور قیمتیں مقرر کرنے کے ضوابط کے باوجود اور عہد وسطیٰ کے یورپ کے یکساں طریقوں کو دبانے میں کلیسا کی مدد کے باوجود یورپ کی قومیں عہد وسطیٰ سے نکل کر عہد جدید میں داخل ہو گئیں۔ یہ دونوں غیر معقول کام تھے جیسے یادگاروں کی پرستش، سنتوں کے مزاروں کی یاترائیں وغیرہ۔

---

[1] بکانن، ڈی۔ ایچ۔ محولہ بالا صفحات 146-145

[2] ڈیوس۔ کنگس۔ کے محولہ بالا، صفحہ 316

اٹھارہویں صدی میں ہندوستانی سماج کئی اعتبار سے ازمنہ وسطٰی کے یورپین سماج کی طرح تھا۔ دونوں سماجوں کے سماج تھے یعنی مختلف فرقوں پر مشتمل تھے۔ اگر سماجیاتی اور معاشی عناصر کے زیر اثر ایک نے جوہری افراد کے سماجوں کی شکل اختیار کی، جس کو کچھ جدید مفکر قابل افسوس صورت حال سے تعبیر کرتے ہیں، تو کوئی وجہ نہیں کہ اُسی قسم کے حالات دوسرا سماج بھی یہ مشکل اختیار نہ کرے، معاشی بہتری کے لیے قدرتی انسانی محرکات کو بروئے کار موقع نے بالآخر سماج کو تبدیل کرنے کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے والی مذہبی اور روایتی طاقتوں پر فتح حاصل کر لی۔

جہاں تک سماجی اتحاد اور جمہوری مساوات کا تعلق ہے ہندوستان کا ذات پات کا نظام یقینی ایک بڑی خرابی ہے لیکن اُس کو معاشی پس ماندگی کے لیے ذمہ دار ٹھہرانا مبالغہ آرائی کے مترادف ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ہندوستان کی آبادی کا ایک قابل لحاظ حصہ یعنی ایک چوتھائی ہندو نہیں تھے مگر وہ بھی اُتنے ہی پچھڑے ہوئے تھے جتنے ہندو پھر یہ کہ اُس میں لچک نہ ہونے کے باوجود وہ نظام اتنا سخت گیر نہیں تھا جتنا سمجھا جاتا ہے۔ پیشے اور حیثیت میں تبدیلی ہوتی رہتی تھی۔ مثال کے طور پر براہمنوں کو لیجیے۔ مقدس کتابوں کے مطابق انھیں پوجا پاٹ کے کاموں میں منہمک رہنا چاہیے لیکن اُن میں سے بہت سوں نے زراعت، تجارت اور گھریلو ملازمت کے پیشے اختیار کر لیے ہیں۔ یہی بات شتریوں، ویشوں اور شودروں کے متعلق کہی جاسکتی ہے۔

یہ بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ ایک گاؤں کا بنکر کپڑے کے میل میں بامہارت مزدور کیوں نہیں بن سکتا ہے یا گاؤں کا لوہار ایک لوہے کے کارخانے میں کام کیوں نہیں کر سکتا ہے۔ مذہب نے ویشیہ بنک کاروں اور تاجروں کو اس امر کی ممانعت نہیں کی ہے کہ وہ دولت جمع کریں یا اُسے منافع بخش تجارت یا صنعت میں لگائیں۔

ہندوستان کی صنعتی پس ماندگی کی ذمہ داری اصل میں صنعتی ترقی کی طرف ریاست کے رویّے پر ہے۔ حکومت کی تجارتی، مالیاتی اور زری پالیسیاں ہندوستان کے بجائے برطانوی سامراجی مفادات کے پیش نظر تشکیل کی جاتی تھیں۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد تک، جب ہندوستان کو مالیاتی خودمختاری عطا کی گئی، ہندوستان کی تجارتی اور مالیاتی پالیسی کا انحصار لنکاشائر کے کارخانوں کے مفاد پر ہوتا تھا۔ 1878 میں اُنیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں بار بار پڑنے

والے قحطوں کی بنا پر ہندوستان کے مالیات ایک بحرانی دور سے گزر رہے تھے پھر بھی سکریٹری آف اسٹیٹ کے دباؤ سے درآمد ہونے والے سوتی کپڑے پر مجبوراً ڈیوٹی ختم کرنی پڑی۔ اُس کے بعد جب آمدنی بڑھانے کے لیے ہندوستان آنے والے سوتی کپڑے پر درآمد ڈیوٹی لگائی گئی تو ہندوستانی ملوں کے بنائے ہوئے کپڑے پر بھی متلافی آبکاری ٹیکس لگایا گیا تاکہ برطانوی کپڑے پر لگائی جانے والی کسٹم ڈیوٹی سے ہندوستانی صنعت کار کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں۔[1]

1868 کے بعد جاپان میں تیزی کے ساتھ ہونے والے ترقی کا مقابلہ اکثر اسی زمانے میں ہندوستان میں صنعتی ترقی کی سست رفتار سے کیا جاتا ہے۔ جاپان میں صنعتی ترقی کی بڑی وجہ تھی ریاست کا فیض رساں رویہ اور ہندوستان کی پس ماندگی کی ذمہ داری تھی حکومت پر جس نے معاشی ترقی کو نظر انداز کیا اور اُس کی طرف غیر ہمدردانہ رویہ اختیار کیا۔ ہندوستان کے صنعتی میدان میں حکومت کا عمل محدود تھا نمائشیں کرنے، یورپ کے ملکوں میں ہونے والی مختلف نمایشوں میں ہندوستان کی پیداوار کے نمونے بھیجنے اور تجارتی اور صنعتی معلومات فراہم کرنے تک انتہا تو یہ ہے کہ مقامی فنون اور صنعتوں کی ہمت افزائی کے متعلق مدراس کے محکمہ صنعت کی تجاویز کو بھی سکریٹری آف اسٹیٹ نے اس بنا پر ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا کہ وہ عدم مداخلت کی روح کی منافی تھیں۔ جو صنعتی ترقی کے تعلق سے ریاست کی مسلم پالیسی تھی۔[2] چنانچہ پہلی جنگ عظیم سے پہلے ہندوستان کی صنعتی پس ماندگی کا جائزہ لیتے وقت ملک کی سیاسی حیثیت اور حکومت کی صنعتی پالیسیوں کی اہمیت کو نظر میں رکھنا چاہیے۔

---

[1] جیسا کہ صنعتی کمیشن نے کہا ہے پہلی جنگ عظیم تک حکومت کی کارروائی صرف اتنے تک محدود تھی کہ ''نہایت ناقص تکنیکی اور صنعتی تعلیم دی جائے اور تجارتی اور صنعتی معلومات حاصل کر کے لوگوں کو نوکری مہیا کی جائے۔'' رپوٹ صفحہ 68

[2] مراسلہ، آمدنی، نمبر 50، ازطرف سکریٹری آف اسٹیٹ مورخہ 29/جولائی 1909 سکریٹری آفس اسٹیٹ کے رویے کی اصل وجہ تھی۔ مدراس کے یورپین تجارتی مفادات کی مخالفت جو مدراس کے صنعتی اور تکنیکی معلومات کے ڈائرکٹر مسٹر چیٹرٹن کی کارروائیوں سے خائف تھے۔ ان کی نظر میں مسٹر چیٹرٹن کے تحت صنعتی محکمے کا قیام ''نجی کاروبار کے لئے ایک بڑا خطرہ اور اُن کاموں میں حکومت کی غیر ضروری مداخلت کے مترادف تھا جو حکومت کے حلقہ کار سے باہر تھے۔'' دیکھئے صنعتی کمیشن کی رپورٹ، پیراگراف 107۔

VIII۔ ہندوستانیوں کا ردعمل

معاشی معاملات کے متعلق کی جانے والی ان نزاعی بحثوں کے دو اہم نتیجے ہوئے۔ رائے عامہ دو مخالف کیمپوں میں بٹ گئی۔ تمام کے تمام ہندوستانی ایک طرف ہو گئے۔ چنانچہ یہ خیال پھیلنے لگا کہ ہندوستانی مفادات برطانوی حکمرانوں کے مفادات کے منافی ہیں۔ تمام صدیوں میں نشر و اشاعت کرنے والے ہندوستانی مل کر حکومت کی اُن پالیسیوں پر تنقید کرنے لگے جنھیں وہ مضر پالیسیاں تصور کرتے تھے۔

دوسرا نتیجہ یہ ہوا کہ چونکہ حکومت عوامی اداروں کی عرضداشتوں، دلیلوں اور تجویزوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتی تھی اور ہندوستان کی رائے عامہ کی پرواہ نہیں کرتی تھی اس لیے ہندوستان کی سیاسی تحریک کو بڑے دکھ کے ساتھ اس بات کو تسلیم کرنا پڑا کہ جب تک نظام حکومت میں بڑی تبدیلی نہ کی جائے معاشی تکلیفوں کا ازالہ نہیں ہو سکے گا۔ اس کے نتیجے میں سیاسی حقوق اور نمائندہ حکومت کا مطالبہ ملک میں فروغ پانے لگا۔ انیسویں صدی میں برطانوی حکمراں حلقوں کا خیال تھا ''ہندوستانی رائے عامہ'' ایک غلط تصور ہے وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانی رائے عامہ یا ہندوستانی قومیت کوئی وجود نہیں رکھتی ہے۔ ہندوستان محض ایک جغرافیائی تصور ہے، مذہبی فرقوں، نسلوں اور ذاتوں وغیرہ کا ایک مجموعہ، جس میں بنیادی سماجی وحدت یا سیاسی اتحاد مفقود ہے۔ 1906 میں فلسفی سکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ مورلے نے لکھا تھا۔

''آپ سے (لارڈ منٹوں سے) مجھے بالکل اتفاق ہے۔ میں بھی سمجھتا ہوں کہ یہ بات نہ پسندیدہ و ممکن ہے نہ اس کا تصور کیا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں رہنے والی قوموں کو برطانوی سیاسی اداروں سے نوازا جا سکے۔ کم سے کم یہ آپ کی یا میری زندگی میں نہیں ہو سکے گا''۔[1]

انیسویں صدی میں ہندوستانی رائے عامہ کا ارتقا تین خاص خاص مرحلوں سے گزرا۔ پہلا مرحلہ وہ تھا جب تعلیم یافتہ متوسط طبقہ برطانوی حکومت کو حکومت الٰہیہ سے تعبیر کرتا تھا۔ برطانیہ نے امن امان قائم کیا تھا اور قانون کی حکمرانی شروع کی تھی جسے وہ ایسی نعمت سمجھتے تھے جس سے

---

[1] مورلے یادداشتیں، دوسرا حصہ، صفحات 73-172

ہندوستان پچھلے سو برسوں سے محروم تھا اور چونکہ جان و مال کی حفاظت اور خوشحالی و ترقی کے لیے یہ چیزیں ضروری تھیں اس لیے برطانوی حکومت کا جواز سمجھی جاتی تھیں۔ تعلیم اور سماجی اور اخلاقی اصلاح کے نئے مواقع ہاتھ آئے اور قومی ترقی کے لیے نئے راستے کھل گئے تھے۔ اس قسم کے مواقع فراہم کرنے والوں کو وہ مشیت ایزدی کے آلہ کار سمجھتے تھے جنھیں ایک قدیم قدم کی نشاۃ ثانیہ کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

دوسرے مرحلے میں امن وامان کے فوائد کا تاثر ختم ہوگیا اور انھیں روزمرہ کی چیز سمجھا جانے لگا۔ اس کے علاوہ مجسٹریٹوں اور ججوں کی کارروائیوں اور ایک اجنبی نظام قانون نے پہلی توصیف و تعریف کے نقوش دھندلا دیئے۔ برطانوی حکومت کی تہذیب، سائنسی علم اور عملی پہلوؤں سے جب تعارف ہوا، جنھوں نے ابتدا میں ہندوستانیوں کی آنکھوں میں چکا چوند پیدا کردی تھی، تو تاثر کی تازگی کم ہوگئی اور وہ سنجیدگی کے ساتھ اُن پر غور کرسکے۔ دیہی بے اطمینانی جو اکثر مفادات کی شکل اختیار کرلیتی تھی اور البرٹ بل کو منسوخ کرنے کی طرح کے سیاسی مناقشات نے لوگوں کی آنکھوں سے پردے ہٹانے شروع کردیے۔ لیکن 1885 تک تنقید اور تحریک میں شدید وفاداری کا جذبہ شامل ہوتا تھا۔

انڈین نیشنل کانگریس کے قیام نے سیاسی تحریک کو ایک کل ہند بنیاد عطا کردی۔ ابتدائی دور میں یہ یقین بدستور قائم رہا کہ حکومت اُن تمام خرابیوں کو دور کردے گی جن کے شکار ہندوستان کے عوام تھے۔ جب اس میں مایوسی ہوگئی تو وہ ہندوستان کے ذیلی حکام کے بجائے انگلستان کے اصل حاکموں پر بھروسہ کرنے لگے۔ ہندوستانیوں کے وفود انگلستان گئے اور انگلستان کے اُن عوامی کارکنوں اور پارلیمنٹ کے ممبروں تک انھوں نے رسائی حاصل کی اور اُن سے امداد لینی چاہی جنھیں ہندوستان کا ہمدرد سمجھا جاتا تھا۔ اخبارات پر اثر ڈالا گیا اور ہندوستانی نقطۂ نظر کا پرچار کرنے کی خاطر انگلستان میں انجمنیں قائم کی گئیں۔ یہ مرحلہ 1905 میں ختم ہوا۔

انڈین نیشنل کانگریس اور معاشی بے اطمینانی

دیہات کے لوگوں کے دکھوں اور افلاس پر شروع ہی سے انڈین نیشنل کانگریس نے توجہ دی۔ کانگریس نے اپنے دوسری سالانہ اجلاس میں ''بڑی ہمدردی'' کے ساتھ ''ہندوستان کی آبادی

کی ایک بڑی تعداد کے بڑھتے ہوئے افلاس کے خطرے پر'' غور کیا۔ اُس کے بعد کانگریس کے سالانہ اجلاسوں میں غربت و افلاس کے متعلق تجاویز منظور کرنا ایک دستور بن گیا۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت پر حملہ کرنے کے لیے یہ ایک اہم معاملہ تھا۔ ملک پر سوا سو سال حکومت کرنے کے بعد برطانیہ نے ایسے حالات پیدا کر دیے تھے کہ معمول کے مطابق برسوں میں بھی 40 فی صدی سے زیادہ لوگوں کے پاس اتنا غلہ نہیں ہوتا تھا کہ وہ دو وقت روٹی کھا سکیں۔ اگر غربت اور بھوک مری کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت تھی تو 1857 کی بغاوت کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے پڑنے والے قحط اس کے ثبوت میں پیش کئے جا سکتے تھے۔ ہندوستان کے قومی رہنماؤں کے خیال میں ہندوستانی عوام کے افلاس کے کئی اسباب تھے جن میں اہم تھے حکومت کی مالگزاری کی پالیسی، ہندوستان سے دولت کا ''نکاس'' اور ہندوستانی وسائل اور صنعتوں کی ترقی میں حکومت کی مدد نہ ملنا۔

اُن علاقوں میں جہاں بندوبست استمراری نہیں تھا کسانوں کے افلاس کی اصل وجہ مالگزاری کا نظام تھا جس پر کانگریس تنقید کرتی تھی۔ اس مطالبے نے جہاں بندوبست استمراری نہیں ہے وہاں بھی استمراری بندوبست کیا جائے ایک قومی مطالبے کی شکل اختیار کر لی۔

آر۔سی۔دت نے 1901 میں لارڈ کرزن کے نام ایک کھلی چٹھی میں کہا تھا کہ افلاس اور قحطوں کی ذمہ داری رعیت داری نظام اور کسانوں پر تشخیص کی جانے والی بھاری مالگزاری پر ہے۔ حکومت پر حملہ کرنے کے لیے مالگزاری کے نظام کا انتخاب کر کے کانگریس کے رہنماؤں نے بڑی دور اندیشی سے کام لیا اس لیے کہ ایک ایسے ملک میں جہاں کے لوگ زیادہ تر زراعت پیشہ ہیں قومی جدوجہد میں عوامی حمایت حاصل کرنے کا بہترین طریقہ، مالگزاری کے اجنبی نظام اور زمین کے بھاری محاصل کو تنقید کا نشانہ بنانا ہے۔

لیکن عام لوگوں کے افلاس کے اسباب بہت پیچیدہ تھے حالانکہ اہمیت صرف دو کو دی جاتی تھی یعنی مالگزاری کے نظام اور انگلستان کے دولت کے نکاس کو مگر اس میں سامراج کی پوری پوری معاشی پالیسی شامل تھی۔ لارڈ کرزن نے ان ناگفتہ حالات کی ذمہ داری ہندوستانی رہنماؤں پر ڈالنے کی کوشش کی۔ اُس کی شکایت تھی کہ ''بدقسمتی سے حکومت کو اپنے ناقدین سے'' اُن لگان کی

حد مقرر کرنے میں مدد نہیں ملی جو کسان مالکان اراضی کو ادا کرتے ہیں لیکن وہ چاہتے ہیں کہ مالکان اراضی پر تشخیص ہونے والی مالگزاری کی صورت میں حکومت کو جو رقم ملتی ہے اُس کی استمراری تجدید کر دی جائے۔[1]

عوامی مالیات

لیکن مالگزاری کا مسئلہ نہیں تھا۔ اصل میں یہ مسئلہ تو پوری مالیاتی پالیسی اور عوامی مالیات کا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستانی رائے عامہ کے رہنماؤں کو عوامی مالیات کے تینوں پہلوؤں کی فکر تھی یعنی (1) عوامی اخراجات (2) محاصل اور خاص طور سے سماج کے کمزور حصوں پر اُن کی تشخیص (3) عوامی قرض کا بوجھ اور اُس کی ابتدا اور واجبات۔

عوامی اخراجات

عوامی اخراجات میں کمی پر بحث سب سے پہلے ٹریولین نے شروع کی تھی جس نے مدراس کے گورنر کی حیثیت سے 1860 میں اس موضوع پر تین رودادیں لکھیں۔ ان رودادوں نے ولسن اور ٹریویلین میں بحث چھیڑ دی جس کی بنا پر وہ مختلف دبستان فکر وجود میں آ گئے۔

ہندوستانی رائے عامہ ٹریویلین کے نقطہ نظر کی حامی تھی جب کہ حکومت کی مالیاتی پالیسی بدستور اس بنیاد پر قائم رہی جو ولسن نے ڈالی تھی جو وائسرائے کی ایگزیکیٹو کونسل کا پہلا رکن مالیات تھا۔

ولسن کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے حکومت نے اخراجات میں کمی کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی جو بغاوت کے بعد مسلسل بڑھتے رہے۔ یہ اخراجات 51-1850 میں 26.93 کروڑ تھے جو 61-1860 میں بڑھ کے 46.92 کروڑ، 91-1890 میں 82 کروڑ اور 5-1904 میں 101.47 کروڑ ہو گئے۔

عوامی اخراجات میں اضافہ ضروری نہیں کہ شکایت یا خطرے کا باعث بنے۔ لیکن سامراجی حکومت کے تحت ہندوستان کے عوامی اخراجات میں دو بڑی خرابیاں پائی جاتی تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ زیادہ تر خرچ فوج، سول، انتظامات اور اُن قرضوں کے سود کی ادائیگی پر کیا جاتا تھا جو

---

[1] حکومت ہندوستان، زمین کی مالگزاری کی تجویز، پیراگراف 9

غیر پیداواری مقاصد کی خاطر لیے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ عوامی اخراجات سے فائدہ اٹھانے والے بھی، فوجی لوگ، سول ملازمین، فوج کا اور دوسرا سرکاری سامان سپلائی کرنے والے اور سرکاری بانڈوں اور سیکورٹیوں پر سود وصول کرنے والے قریب قریب سبھی بدیسی تھے۔ چنانچہ عوامی اخراجات سے حکمراں قوم کے افراد کی آمدنی میں اضافہ ہوتا تھا نہ کہ اُس ملک کی جہاں سے محاصل کی شکل میں اخراجات کے لیے رقمیں حاصل کی جاتی تھیں۔

اس کے علاوہ ان آمدنی کی رقموں کی اصل کاری ریلوں اور آبپاشی کے کاموں میں کی جاتی تھی لیکن یہ بات ابتدا سے واضح تھی کہ ہندوستان میں ریلوں کی تعمیر پیداواری استعداد بڑھانے کے بجائے سامراجی مقاصد کے پیش نظر کی جارہی تھی۔ دوسری طرف آبپاشی کے کاموں پر اُس وقت تک مقابلتاً کم توجہ دی جاتی رہی جب تک ملک میں قریب قریب پوری طرح ریلیں نہیں تعمیر کر لی گئیں۔ چنانچہ ہندوستان کی رائے عامہ ہندوستانی حکومت کی غیر نمائندہ حیثیت کے بعد اگر کسی چیز کو ناپسندیدہ قرار دیتی تھی تو وہ تھے عوامی اخراجات اور ہندوستان میں برطانوی حکومت پر حملہ کرنے کے لیے اُن کو استعمال کیا جاتا تھا۔

دادا بھائی نوروجی نے 1897 میں ایسٹ انڈیا فائننس کی سلیکٹ کمیٹی پر پیش کئے گئے اپنے میمورنڈم میں دریافت کیا ''کیا ہندوستان کی پیداوار آج کی تاریخ میں اس درجہ کافی ہے کہ وہ من حیث القوم اپنی روزمرہ کی ضروریات اور اپنی مخصوص غیر معمولی ضروریات میں محرومی اور سختی اٹھائے بغیر ایک دور دراز کے غیر ملک کو اپنی پیداوار کا ایک حصہ بھیج سکے کہ جو دراصل اس غیر ملکی حکومت کا ایک قدرتی اقتصادی نتیجہ ہے؟ میں کہتا ہوں کہ ہندوستان اپنے بچوں کی روزمرہ کی معمولی ضروریات کے قابل بھی پیدا نہیں کر پاتا، اپنی تمام سماجی اور مخصوص سیاسی ضروریات کے لائق پیداوار کی تو بات ہی جانے دیجیے......'' انھوں نے خرچ کی رقم پر اعتراض نہیں کیا کیونکہ ان کو ڈیوک آف ڈیون شائر اور سر ولیم ہنٹر سے اتفاق تھا کہ ہندوستان کا انتظام ناکافی طور پر ہو رہا ہے اور ملک کے افلاس نے ملکی خرچ کی ایک اوسط درجہ کی رقم کو کمر توڑ بوجھ بنا دیا ہے۔ [2] انھوں

---

[1] دادا بھائی نوروجی، تقاریر اور تحریریں، صفحہ 164

[2] ویل بی کمیشن کو دادا بھائی نوروجی کا میمورنڈم۔ اکتوبر، 1895 دیکھئے تقاریر اور تحریریں صفحہ 85-284

نے کہا ''یہ کوئی موجودہ برطانوی انتظامیہ کے ہندوستانی خرچ کی کڑی تنقید نہیں ہے کہ ہندوستان کے لوگ دولت نہیں پیدا کر سکتے۔ اس سے بھی بدتر یہ ہے کہ وہ لاکھوں کی تعداد میں مریں اور کروڑوں کی تعداد وہ ہے جن کو پیٹ بھر کر کھانا نصیب نہ ہو، ان کی پیداوار نا قابل اعتنا ہو اور اس پر بھی کوئی ان کو اس حقیر پیداوار کے ایک حصہ سے محروم کرے۔

اونچے خرچ کی خاص وجوہات میں یہ حقیقت بھی شامل تھی کہ ہندوستان کی فوجی اور سول سروسوں میں بیشتر اونچے اور متوسط عہدوں پر یورپی لوگ متعین تھے جن کی تنخواہیں مساوی لیاقتیں اور اہلیت رکھنے والے دستیاب ہندوستانیوں سے کہیں زیادہ تھیں۔ دونوں کی تنخواہوں میں کوئی تناسب ہی نہیں تھا پھر بھی ترجیح یورپین کو تھی۔ جیسا کہ سر ولیم ہنٹر نے 1880 میں مشاہدہ کیا تھا: ''ہندوستان اس (انتظامیہ) محنت کے لیے انگریزی شرحوں پر ادائیگی برداشت نہیں کر سکتا کیونکہ سیاسی خدمت کی تنخواہ پوری دنیا کے مقابلے یہاں بلند ترین ہے البتہ وہ اپنی مقامی شرحوں پر بآسانی ادا کر سکتا ہے کیونکہ یہ پوری دنیا میں یہاں شاید کم ترین ہے۔''[1]

ہندوستان میں یورپینوں کو ملازم رکھنا ایک اور اعتبار سے بھی قابل اعتراض تھا۔ دوران ملازمت اُن کی تنخواہوں کا ایک حصہ اور رٹائر ہونے کے بعد اُن کی پوری پینشن ہر سال انگلستان جاتی تھی۔ دادا بھائی نوروجی اور کچھ اور لوگوں کا خیال تھا کہ اس طرح ہر سال ہندوستان سے انگلستان کو دولت کا نکاس ہوتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کے مالیات کے متعلق سلیکٹ کمیٹی کے سامنے دادا بھائی نے کہا ''پچھلے زمانے میں بدیسیوں کی فتوحات کا جہاں تک تعلق ہے حملہ آور یا تو لوٹ مار کر کے واپس چلے جاتے تھے یا ملک پر حکومت کرنے لگتے تھے...... جب حملہ آور ملک کے حاکم بن جاتے تھے تو وہاں آباد بھی ہو جاتے تھے اور اُس زمانے کے بادشاہ کے کردار کے مطابق اُس زمانے کی حکومت جیسی بھی ہوتی تھی لیکن ملک سے مادی اور اخلاقی نکاس نہیں ہوتا تھا...... لیکن انگریزوں کا معاملہ دوسرا ہے...... پچھلے حکمراں قصائی کی طرح جگہ جگہ کاٹتے تھے لیکن انگریز اپنے سائنسی نشتر سیدھے دل میں اتارتے ہیں اور عجیب بات یہ ہے کہ زخم نظر نہیں آتا ہے۔ وہ تہذیب، ترقی وغیرہ وغیرہ کے ایسے مرہم لگاتے ہیں کہ جلد ہی زخم بھر جاتا ہے۔ انگریز ہندوستان کے صدر

---

[1] ہندوستان میں برطانیہ کا کام، صفحات 119-118

دروازے پر پہریدار کھڑے ہیں اور دنیا سے کہتے ہیں کہ وہ تمام دشمنوں سے ہندوستان کی حفاظت کریں گے اور پچھلے دروازے سے وہ خزانہ لے جاتے ہیں جس کی حفاظت کے وہ دعویدار ہیں...... مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ انگلستان یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان سے مسلسل دولت نکالنے کے بہترین طریقے ایجاد کرے۔ دنیا میں اپنی بدنامی کرائے بغیر دولت نکالنے کا اس سے بہتر طریقہ وہ ایجاد نہیں کرسکتا جیسا کہ موجودہ پالیسی کا مؤثر طریقہ ہے۔''[1]

اسی یادداشت میں وہ پہلے کہہ چکے تھے ''انگریز حکمراں اس بات پر بجا طور سے فخر کرتے ہیں کہ انھوں نے ہندوستان میں تعلیم اور مغربی تہذیب کو رواج دیا۔ لیکن دوسری طرف اُن کا عمل ظاہر کرتا ہے کہ اس قسم کا کوئی اقدام نہیں کیا گیا ہے اور اُن کا فخر محض ایک سراب سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتا ہے۔ یا تو انھوں نے تعلیم دی ہے یا نہیں دی ہے۔ اگر اُن کا فخر کوئی حقیقت رکھتا تو عجیب بات یہ ہے پچاس سال یا اس سے زیادہ مدت کی کوششوں کے باوجود وہ ایسے لوگوں کی ایک معقول تعداد تیار نہیں کرسکتے جو خود اپنے ملک کی خدمت کی اہلیت رکھتے ہوں۔ محکمہ تعلیم کو لیجیے۔ ہم بی۔ اے، ایم اے اور ایم۔ ڈی وغیرہ ہوجاتے ہیں لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہمیں اس قابل نہیں سمجھا جاتا ہے کہ ہم اپنے ہم وطنوں کو تعلیم دے سکیں۔ دوسرے محکموں کی طرح اُس محکمے میں بھی ہم پر اُن یورپینوں کو تھوپا جاتا ہے جو کسی نہ کسی طرح اُس میں داخل ہوجاتے ہیں۔''[2]

حکومت پر ایک اور بڑا اعتراض یہ کیا جاتا تھا کہ ہندوستان کی سرحدوں پر لڑی جانے والی سامراجی جنگوں پر تو بڑی بڑی رقمیں خرچ کی جاتی تھیں لیکن تعلیم، زراعت اور صنعت کی طرح کے مفید کاموں پر خرچ کرنے کے لیے بہت کم رقمیں مہیا کی جاتی تھیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوامی اخراجات اور رقموں کو خرچ کرنے کے طریقوں نے ''لوگوں (ہندوستانیوں) کو دولت'' کام اور عقل سے محروم کردیا ''ذلت آمیز حد تک ابتر، حقیر بنا دیا اور اُن سے انسانی خوبیاں چھین لیں۔''

---

[1] تقریر اور تحریریں، محولہ بالا ضمیمہ I صفحات 87-286

[2] ایضاً، صفحات 198-197

محاصل

ان بے جا اخراجات کے لیے رقمیں حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ حکومت محاصل کا ایک بھاری اور ظالمانہ نظام بنائے جس کی تشکیل اس طرح کی گئی تھی کہ اُس کا زیادہ بوجھ ہندوستان کی غریب آبادی پر پڑتا تھا۔ کچھ انتظامی حکام نے بھی اس کا اقبال کیا ہے۔ چنانچہ سکریٹری آف اسٹیٹ کی حیثیت سے لارڈ سلسبری نے لکھا تھا ''اس کو خوشحالی کی پالیسی سے نہیں تعبیر کیا جاسکتا ہے کہ زیادہ تر محاصل دیہی علاقوں سے وصول کئے جائیں جہاں سرمائے کی قلت ہے اور شہروں کو چھوڑ دیا جائے جہاں اُس کی بہتات ہے اور وہ برباد ہوتا ہے۔ ہندوستان کا خون تو نچوڑنا ہی ہے۔ نشتر وہاں لگانا چاہئے جہاں خون زیادہ یا کم سے کم کافی ہے نہ کہ اُن حصوں میں جو کمزور ہیں اور خون کم رکھتے ہیں۔'' [1] اسی طرح سر اکلینڈ کولون نے، جو وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کا رکن مالیات تھا، لیجسلیٹیو کونسل میں کہا ''ہمارے انتظامیہ کے دامن پر ایک دھبہ یہ ہے، جو دھلنے کے بجائے حالیہ واقعات کی بنا پر اور زیادہ گہرا ہوگیا ہے۔ کہ اس ملک میں ریاست سب سے زیادہ حفاظت اُن طبقات کی کرتی ہے جو ریاستی اخراجات کے لیے سب سے کم رقم دیتے ہیں۔'' [2] اس میں امیر اور متوسط طبقوں کا کوئی قصور نہیں تھا کہ ہندوستان میں محاصل کا نظام رجعت پسندانہ نوعیت کا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ لنکا شائر کے دباؤ اور سیاسی ضرورتوں کی بنا پر حکومت نے 1878 کے بعد ہر قسم کی کسٹم ڈیوٹی ختم کردی تھی اور آزاد تجارت کی پالیسی پر عمل کررہی تھی۔ چنانچہ بالائی حکام کے احکامات کی تعمیل میں حکومت کو دولت مند طبقوں پر بالواسطہ محاصل لگانے کا سلسلہ ختم کرنا پڑا تھا۔

چنانچہ امیروں کی جیبوں تک پہنچنے کے واحد ذریعے تھے بلاواسطہ محاصل۔ لیکن انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں ایک کم مدتی تجربے کے بعد انکم ٹیکس ختم کردیا گیا تھا اور 1886 تک دوبارہ نہیں لگایا گیا۔ ریلوں سے آمدنی نہیں ہورہی تھی اور آب پاشی کے ذرائع کو ترقی نہیں دی گئی تھی۔ ان حالات میں آمدنی کے بڑے بڑے ذرائع تھے مالگزاری، نمک کا محصول، اکسائز ڈیوٹی (شراب، بھنگ، افیم، وغیرہ پر) اور اسٹامپ۔ ان تمام محاصل کا بار دیہات کی آبادی اور

---

[1] روداد مورخہ 26/اپریل 1875

[2] لیجسلیٹیو کونسل میں انکم ٹیکس بل پر تقریر، 4/جنوری 1886

خاص طور سے غریبوں پر پڑتا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کا نظام محاصل غریب طبقوں کے لیے بڑا غیر منصفانہ تھا۔اس نے بڑی بے چینی پیدا کردی تھی اور ہندوستان کی سیاسی تحریک کا وہ اصل محرک بن گیا تھا۔ مالگزاری کے نظام کا سدھار، کسانوں پر مسلسل بڑھتے ہوئے بوجھ کو کم کرنے کی خاطر اُن علاقوں میں بندوبست استمراری کرنا جہاں رعیت داری نظام رائج تھا، نمک پر محصول کم کرنا اور انکم ٹیکس کے لیے مستثنیٰ آمدنی کی رقم کو بڑھانا انڈین نیشنل کانگریس کی تجاویز کے بار بار موضوع بنتے رہے۔ چنانچہ 1888 میں کانگریس نے حکومت سے مطالبہ کیا کہ انکم ٹیکس کے مقاصد کے لیے کم سے کم نا قابل ٹیکس رقم ایک ہزار روپیہ کردی جائے۔ [1] اس اجلاس میں کانگریس نے نمک کے محصول کے حالیہ اضافے پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا جس کی وجہ سے غریب طبقوں پر بوجھ بڑھ گیا ہے اور امن وافراط کے زمانے میں سلطنت کے واحد مالیاتی ریزرو کا جزوی انضمام ہو رہا ہے۔[2] اسی طرح مالگزاری کے تعلق سے کانگریس نے اپنے پانچویں سالانہ اجلاس (1889) میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ بندوبست استمراری کیا جائے۔[3] 1902 میں کانگریس نے کہا کہ ''بہت سی بیماریوں کے پھیلنے کی ذمہ داری نئی تحقیق کے مطابق اس بات پر ہے کہ ہندوستان کے عام لوگ نمک کم کھاتے ہیں'' اور یہ مطالبہ کیا کہ محصول'' کم سے کم اس حد تک کم کر دیا جائے جتنا اضافہ 1888 میں کیا گیا تھا۔ [4] اسی سال اُس نے کپاس پر لگائی جانے والی اُس اکسائز ڈیوٹی کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا جو 1895 میں عائد کی گئی تھی اس لیے کہ'' بننے کی صنعت کی آزاد نمو کو روکنے کے علاوہ یہ صنعت کاروں کے حق میں نہایت غیر منصفانہ ہے اور اُن لوگوں کے لیے اس نے بڑی دشواریاں پیدا کردی ہیں جو مقامی بنا ہوا موٹا جھوٹا کپڑا استعمال کرتے ہیں۔''[5] ایک جامع تجویز میں جسے جی۔ کے۔ گوکھلے نے پیش کیا تھا۔ کانگریس نے اپنے بیسویں اجلاس منعقدہ

---

[1] تجویز نمبر 6 جو چوتھی کانگریس میں منظور کی گئی۔ دیکھیے اینی بیسنٹ، How India wrought for Freedom صفحہ 72

[2] تجویز نمبر 15 محولہ بالا، صفحہ 74

[3] تجویز نمبر 7 محولہ بالا، صفحہ 93

[4] تجویز نمبر 13 محولہ بالا، صفحہ 389

[5] تجویز نمبر 16 محولہ بالا، صفحہ 337

دسمبر 1904 میں مطالبہ کیا کہ کرنسی اور زر مبادلہ کے سلسلے میں کئے جانے والے اقدامات کے نتیجے میں جو فاضل آمدنی ہو اس کو مندرجہ ذیل کے لیے استعمال کیا جائے۔ (الف) محاصل کا بوجھ کم کرنے کے لیے خصوصیت کے ساتھ (1) نمک کے محصول میں مزید کمی کرکے، (2) ان صوبوں میں جہاں کسانوں کو کئی سال تک خراب حالات کا سامنا کرنا پڑا وہاں مالگزاری کا سرکاری مطالبہ کم کرکے اور (3) سوتی کپڑے پر اکسائز ڈیوٹی میں تخفیف کرکے'' اور (ب) '' جب تک اس قسم کی تخفیف نہ کی جائے کانگریس مطالبہ کرتی ہے کہ اس فاضل آمدنی کا ایک حصہ اُن کاموں پر خرچ کیا جائے جس سے عام لوگوں کو راست فائدہ پہنچے جیسے سائنسی بنیادوں پر زراعتی اور صنعتی تعلیم اور طبی امداد کے لیے بہتر سہولتیں اور یہ کہ بقیہ رقم لوکل اور میونسپل بورڈوں کی مدد کرنے پر صرف کی جائے۔''[1]

جہاں تک مجموعی اعتبار سے محاصل کا تعلق تھا انڈین نیشنل کانگریس کے رہنما ہندوستان میں محاصل کے بوجھ کو ناقابل برداشت تصور کرتے تھے۔ دادا بھائی نوروجی نے قومی آمدنی کا جو تخمینہ لگایا تھا اس کے مطابق 1871 میں مجموعی قومی آمدنی 340 ملین پونڈ تھی جس میں سے 50 ملین پونڈ محاصل کی شکل میں حکومت نے وصول کئے تھے یعنی قومی آمدنی کا 15 فیصدی۔ اس حساب سے فی کس ٹیکس کی رقم 6 شلنگ پڑی جب کہ فی کس سالانہ آمدنی 40 شلنگ تھی۔ یہ حقیقت ہے کہ کچھ دوسرے ممالک کے مقابلے میں یہ محصول اُس سے بہت کم تھا جو اُن ملکوں کے لوگ ادا کر رہے تھے۔ مثال کے طور پر لارڈ میو کے مطابق ترکی میں فی کس سالانہ محصول 7 شلنگ 9 پینس تھا، روس میں 12 شلنگ 2 پینس، اسپین میں 18 شلنگ 50 پینس، آسٹریلیا میں 19 شلنگ 7 پینس اور اٹلی میں 17 شلنگ[2] لیکن یہ مقابلہ غلط بھی تھا اور گمراہ کن بھی جیسا کہ دادا بھائی نوروجی نے کہا[3] یہ دیکھنے کے لیے کہ محصول کا بوجھ واقعی ''کمر توڑنے والا'' ہے یا نہیں ہمیں محصول ادا کرنے والے کی آمدنی پر غور کرنا چاہیے۔ چنانچہ جب کہ ایک ہندوستانی اپنی چھوٹی سی

---

[1] تجویز نمبر 8 محولہ بالا، صفحات 10-409

[2] لیجسلیٹو کونسل میں تقریر، 3/ مارچ 1871

[3] ایضاً، صفحات 53-52

آمدنی کا 15 فیصدی حکومت کو دیدیتا تھا۔ ایک انگریز اپنی اُس سے کہیں زیادہ آمدنی یعنی 30 پونڈ سالانہ کا محض 8 فیصدی ادا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ 30 پونڈ سالانہ کی آمدنی میں سے 2 پونڈ 10 شلنگ ادا کرنا بھی اتنا بڑا بوجھ نہیں تھا جتنا اُن 40 شلنگ سالانہ میں سے 6 شلنگ سالانہ ادا کرنا جو زندگی کی ضروریات کے لیے بھی کافی نہیں تھے۔

ہندوستان میں اس واقعہ نے ناانصافی میں اضافہ کردیا تھا کہ حکومت کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ ملک کی پیداوار بڑھا کر اُس کو ''دولت منداور خوشحال'' بنانے کے بجائے گھریلو اخراجات اور ہندوستان میں برطانوی اصل کاری کے منافعوں کی شکل میں انگلستان جارہا تھا۔ اگر دولت کا نکاس نہ ہوتا تو وقت گزرنے کے ساتھ ہندوستان کی پیداواری طاقت میں اضافہ ہوجاتا اور محصول کا بوجھ مطابق رقم کی شکل میں چاہے اتنا ہی رہتا تب بھی اسے آمدنی کی تناسب سے کم ہوجاتا۔ لیکن آمدنی جوں کی توں رہی لیکن محاصل برابر بڑھتے گئے اس لیے ان کے بوجھ نے واقعی لوگوں کی کمر توڑ دی۔

بڑے بڑے سرکاری اخراجات اور اُن کے نتیجے میں محصول اور دولت کے نکاس کے بڑے بوجھ کا ہندوستان پر کیا اثر پڑا اس کا خلاصہ پنڈت مدن موہن مالویہ کے الفاظ میں بیان کیا جاسکتا ہے جو انھوں نے پونے میں کانگریس کے گیارہویں اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہے تھے ''تعلیم یافتہ ہندوستانی، جو ملک کے مہذب دانش وروں کی نمائندگی کرتے ہیں، پچھلے 40 سال سے ملک میں کئے جانے والے انتظامات کی تحقیق و تفتیش، مکمل تفتیش، کا مطالبہ کرتے رہے ہیں، ہم نے قریب قریب ہر معاملے میں اُن انتظامات پر اعتراضات کئے ہیں۔ ہم حکومت انگلستان کو اس کا ملزم ٹھہراتے ہیں کہ اُس نے ہندوستان کی سول سروس پر کئے جانے والے غیرضروری اور بھاری اخراجات کا بوجھ ہم پر ڈالا ہے، ہم اُس کو ملزم گردانتے ہیں کہ اُس نے ہمارے کاندھوں پر فوجی اخراجات کا بوجھ لاد دیا ہے، ہم اُس کو ملزم سمجھتے ہیں کہ اُس نے ہندوستان کی سرحدوں کے باہر ہندوستان کا روپیہ برباد کیا ہے۔ اور ہم اُسے ملزم تصور کرتے ہیں کہ گھریلو اخراجات کے سلسلے میں اُس نے ہندوستان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ غیر منصفانہ ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں ہم اُس پر یہ الزام بھی عائد کرتے ہیں کہ ہندوستان کے تعلق سے اُس نے اپنے فرائض کو نظر انداز کیا۔ اُن

لاکھوں انسانوں کی موت کی ذمہ داری اُس پر ہے جو ہر دہائی میں بھوک مری کے شکار ہو جاتے ہیں یہ بھوک مری ضرورت سے زیادہ بھاری محاصل اور ناقص انتظام کا نتیجہ ہوتی ہے۔''[1]

عوامی قرضہ

ایک اور چیز جس سے ہندوستان کے قوم پرست ناخوش تھے وہ تھا عوامی قرضہ 61-1860 میں ملک پر 94.56 کروڑ روپیہ قرض تھا جو 2-1901 میں بڑھ کے 312 کروڑ روپیہ ہو گیا تھا۔ ہندوستان کے محصول دہندگان پر اس کا بوجھ پڑ رہا تھا اور فوج اور سول سروس پر کئے جانے والے بڑے بڑے اخراجات اور قرضے کی وجہ سے عام لوگوں پر بھاری محاصل لگائے جا رہے تھے۔ لیکن مخالفت کی وجہ اس کے مالیاتی پہلو سے زیادہ اُس کا اخلاقی پہلو تھا۔ ہندوستان کا زیادہ تر قرض نتیجہ تھا مشرق میں فتوحات کے لیے برطانیہ کی جنگوں کا۔ [2] ایسٹ انڈیا کمپنی نے ہندوستان میں جو جنگیں لڑیں اُن کے اخراجات، 1857 کی بغاوت کے اخراجات، جب حکومت ہندوستان کو منتقل ہوئی اُس وقت حصہ داروں کو ادا کیا جانے والا اصل کا حصہ، افغانستان اور برما کی جنگوں کے اخراجات [3] اور اس قسم کے دوسرے تمام اخراجات ہندوستان کے حساب میں ڈالے گئے اور اُن کے لیے قرض لیا گیا جو زیادہ تر انگلستان کے لوگوں سے ملا تھا۔

بہت سے انصاف پسند انگریز بھی ان اخراجات کو غیر منصفانہ سمجھتے تھے اور اُن کے خلاف احتجاج کرتے تھے۔ مثال کے طور پر مسٹر فاسٹ نے 1880 میں ہاؤس آف کامنز میں تجویز پیش کی ''اس سرکاری اعلان کے پیشِ نظر کہ افغانستان کی جنگ انگلستان اور ہندوستان کے مفاد میں لڑی گئی تھی اس ایوان کی یہ رائے ہے کہ افغانستان کے ساتھ دوبارہ جنگ کے پورے اخراجات ہندوستان پر ڈالنا انصاف سے بعید ہے۔'' ابی سینا کی مہم کے تمام معمولی اخراجات ہندوستان نے برداشت کئے۔ حکومت انگلستان نے محض غیر معمولی اخراجات برداشت کئے اس کے لیے یہ دلیل

---

[1] بپن بیسینٹ محولہ بالا، صفحہ 213

[2] دیکھئے کمارپا، جے۔سی۔ Public finance & our poverty احمد آباد، 1941، صفحات 30-29

[3] پارلیمنٹ اور اُس کے باہر بہت بحث ومباحثے کے بعد انگلستان اس پر آمادہ ہو گیا کہ جنگ افغانستان کے اخراجات کے لیے 5 ملین پونڈ ادا کرے۔ دیکھئے دادا بھائی نوروجی، تقریریں، صفحہ 348

دی گئی کہ ہندوستان کو اپنی فوجوں کے اخراجات برداشت کرنے ہوں گے اور اسے اس سلسلے میں منافع حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ لیکن حکومت انگلستان نے اُس وقت حکومت ہندوستان کے ساتھ کیا کیا تھا جب غدر کے زمانے میں فوجیں وہاں بھیجی گئی تھیں؟ کیا انھوں نے کہا تھا ''ہم اس سے منافع حاصل کرنا نہیں چاہتے ہیں۔'' جی نہیں۔ وہاں بھیجے جانے والے ہر شخص کے اخراجات پوری مدت تک ہندوستان کو برداشت کرنے پڑے حالانکہ انھیں صرف عارضی طور سے استعمال کیا گیا تھا۔ بھیجے جانے سے پہلے رنگروٹوں کی حیثیت سے اُن کی تربیت اور قواعد پریڈ پر جو اخراجات ہوئے وہ بھی ہندوستان کو ادا کرنے پڑے۔''[1]

اس قسم کے انفرادی احتجاج کے باوجود انگلستان کی بڑی بڑی سیاسی پارٹیوں کی پالیسی ہندوستان کے تعلق سے یکساں تھی۔ جیسا کہ گلیڈسٹن نے وضاحت سے اعتراف کیا تھا۔ ''مجھے حزب مخالفت کے عزت مآب اراکین کی اس یقین دہانی سے اطمینان ہوا کہ وہ اس بات کے حق میں ہیں کہ ہمیں رقوم اس بات کے لیے ادا کی جانی چاہئیں کہ ہم، جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، اپنی مرضی کے مطابق انھیں قومی اور سامراجی پالیسی کو برقرار رکھنے پر صرف کر سکیں۔ اس ملک کی کسی پارٹی نے ابھی تک یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ ہندوستانی سلطنت کے تعلق سے ہماری ذمہ داری محض اُس کا حصہ ہے۔ میرے خیال میں ہر وہ شخص ایک اخلاقی جرم اور سیاسی غلطی کا مرتکب ہوگا جو یہ دعویٰ کرے کہ اس معاملے میں اُس کی جماعت کو اُن لوگوں پر فوقیت حاصل ہے جن کی وہ ہمیشہ مخالفت کرتی ہے۔ یہ ایک سامراجی پالیسی ہے جس میں ہم سب معروف ہیں۔''[2]

ان حالات میں اس امر کی امید کرنا فضول تھی کہ انگلستان اور ہندوستان کے درمیان مالیات سوالوں پر کوئی منصفانہ سمجھوتا ہو سکے گا۔ ہندوستانی قیادت اس کو غیر منصفانہ قرار دیتی تھی کہ ہندوستان پر اُن تمام اخراجات اور قرضوں کا بوجھ ڈالا جائے جو از روئے انصاف سامراجی حکومت کو ادا کرنے چاہئیے اور حکمرانوں کو اس پالیسی کے خطرناک نتائج سے آگاہ کرتی رہتی تھی۔ دادا بھائی نوروجی نے 1867 ہی میں برطانیہ کو بتا دیا تھا ''دو کروڑ غیر مطمئن لوگوں کے ایک لاکھ بدیسی سنگینوں کے ساتھ ٹکراؤ کا نتیجہ کیا ہوگا اس کو بتانے کے لیے کسی نبی کا ہونا ضروری نہیں ہے۔

---

[1] تقریر، ہاؤس آف لارڈز، 15 مئی 1895، دیکھیے مباحث (لارڈز)، جلد 12 صفحہ 874

[2] ہنسرڈ، جلد 297 صفحہ 809

پانی کا ایک قطرہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہو لیکن سیلاب ہر چیز کو بہا لے جاتا ہے۔ جیت ہمیشہ تیز دوڑنے والے کی نہیں ہوتی ہے۔ ایک غیر مطمئن قوم سو دفعہ گر سکتی ہے اور سو دفعہ گر کے اُٹھ سکتی ہے۔ لیکن بدیسی کی ہار مُہلک ثابت ہو سکتی ہے۔ مقامی لوگوں کی ہر نا کامی اُن کا بوجھ اور بڑھا دیگی اور بدیسی جوا اتار پھینکنے کے لیے انھیں اور زیادہ بے چین کر دے گی۔''[1]

تقریباً تیس سال بعد وہی کمیشن کے سامنے پیش کرنے والی یادداشت میں انھوں نے غصہ کے ساتھ کہا تھا ''حکمراں طبقے کی اقلیت کی بالا دستی کے لیے پیسہ پیسہ ہندوستان کے لوگوں کو دینا چاہیے اور اُن پیسوں کو خرچ کرنے کے طریقوں کے متعلق انھیں آواز نہیں اٹھانی چاہیے اور انھیں اس کے لیے تیار رہنا چاہیئے کہ برطانوی شہریت کی برابری کے وعدے پوری طرح توڑے جائیں گے۔ اور ایسا کیوں ہوگا؟ کیا بقول لارڈ سلسبری اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کے ہاتھوں میں حکومت ہے اور رائفلیں ہیں یا جیسا کہ مسٹر گلیڈسٹن نے خود ہندوستان کے بارے میں کہا کہ قانون یا طاقت کی دلیل جو ہمارے پاس ہے اور جس کا اطلاق ہم کرتے ہیں اس کمیشن کا فرض ہے، کم از کم اخراجات کا منصفانہ بٹوارہ کرنے کی حد تک اسے اس شکایت کا ازالہ کرنا چاہیئے۔[2] انھوں نے مزید دریافت کیا ''کیا ہندوستان کے انگریز حکام واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ ہندوستانی افریقہ کے وحشیوں کی طرح ہیں یا بچے ہیں اور دو ہزار سال کی تہذیب کے باوجود جو اُس وقت یہاں پائی جاتی تھی جب انگریز وحشی تھے اور جو اب انگریزوں سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد بقول لارڈ ڈفرن ''بڑی اہلیت اور ذہانت رکھنے والے مقامی اشراف پیدا کر رہے ہیں'' کیا وہ اتنا بھی نہیں دیکھ اور سمجھ سکتے ہیں کہ وہ کتنے ذلیل وخوار اور معاشی اعتبار سے برباد ہو گئے ہیں، یا بات یہ ہے کہ ہندوستانی اسے سمجھیں یا نہ سمجھیں لیکن یہ حکام اُس وقت تک اس کی پرواہ نہیں کریں گے جب تک وہ برطانوی عوام کو گمراہ کرتے رہیں اور انھیں یقین دلاتے رہیں کہ برطانوی ہند میں حالات اچھے ہیں جب کہ حقیقت میں وہ اچھے نہیں ہیں۔[3]

---

[1] لندن کی ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے اجلاس میں پڑھا جانے والا پرچہ جو 2/مئی 1867 کو ہوا تھا۔ دیکھئے Poverty & un British Rule صفحہ 303

[2] دیکھئے تقریریں اور تحریریں، محولہ بالا، صفحات 357-256

[3] ایضاً، صفحہ 357

کرنسی کا مسئلہ

محاصل کی بھاری شرح اور گھریلو اخراجات سے جڑا ہوا تھا کرنسی کا مسئلہ۔ یہ بھی ہندوستانی ذہن کے لیے بڑی پریشانی کا باعث تھا۔ زر کے میدان میں ایسے بین الاقوامی حالات رونما ہوئے کہ 1873 کے بعد چاندی سونے کی قیمت گرنے لگی۔ چونکہ اُس زمانے میں چاندی کی آزادسکہ سازی کا دستور تھااور روپیہ ہندوستان کا معیاری زر تھااس لیے چاندی کی قیمت جب گری تو اسٹرلنگ کے تناسب سے روپیہ کی قیمت بھی گرنے لگی۔ روپیہ اور اسٹرلنگ کی شرح مبادلہ 1874 میں ایک شلنگ اور 10.25 پینس تھی جو 1891 میں گھٹ کر ایک شلنگ اور 5 پینس رہ گئی۔اس نے حکومت کے لیے بہت سے مسئلے کھڑے کر دیے۔ ہندوستان میں بدیسی سول ملازمین اور فوجوں نے، جنھیں انگلستان اپنی تنخواہیں بھیجنے میں نئی شرح مبادلہ کی بنا پر گھاٹا ہو رہا تھا، متلافی بھتوں کا مطالبہ کیا۔ جوں جوں شرح مبادلہ کم ہوتی گئی ویسے ویسے روپے کی شکل میں گھریلو اخراجات بڑھتے گئے۔اس کی وجہ سے نہ صرف حکومت ہندوستان کی مالی مشکلات میں اضافہ ہو گیا بلکہ مسلسل گرتی ہوئی شرح مبادلہ نے بدیسی زر کے تعلق سے سٹہ بازی کو بھی فروغ دیا۔[1] اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے چار بین الاقوامی کانفرنس کی گئیں۔لیکن چونکہ انگلستان نے سونے کے معیار کو بدستور جاری رکھنے پر اصرار کیا اس لیے ان کانفرنسوں میں کوئی سمجھوتا نہیں ہو پایا۔ 1892 میں بروسل کانفرنس کی ناکامی کے بعد حکومت ہندوستان نے لارڈ ہرشیل کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کیا تاکہ وہ روپے کی گرتی ہوئی شرح مبادلہ پر غور کرے اور اُس کے تدارک کی سفارش کرے۔ ہرشیل کمیشن نے سفارش کی کہ عام لوگوں کو چاندی کا روپیہ ڈھالنے کی ممانعت کر دی جائے، یہ کہ روپیہ کی قیمت بڑھا کر ایک شلنگ اور 4 پینس کرنے کے لیے روپیہ کی مصنوعی قلت پیدا کی جائے، یہ کہ حکومت اس شرح پر روپیہ بیچے لیکن خریدے نہیں اور یہ کہ ایک نئی کمپنی یا کمیشن مقرر کیا جائے جو یہ فیصلہ کرے کہ روپیہ اور اسٹرلنگ کی شرح مبادلہ ایک شلنگ اور چار پینس ہو جانے کے بعد ہندوستان زر کا ایک مستقل معیار اختیار کرے۔ان سفارشوں کو قبول کر لیا گیا اور 1893 میں ٹکسالیں بند کر دی گئیں۔ 1898 تک یہ مقصد حاصل کر لیا گیا اور

---

[1] رکن مالیات سر ڈیوڈ باربور نے کہا کہ ہندوستان کی بجٹ ''زر کا جوا'' بن گیا ہے۔ دیکھیے ہرشیل کمیٹی رپورٹ (1892)

ہندوستانی روپے کی قیمت بڑھ کے ایک شلنگ اور چار پینس ہوگئی۔حکومت نے ہرشیل کمیٹی کی سفارش کے مطابق سر ہنری فاؤلر کی قیادت میں ایک اور کرنسی کمیشن مقرر کیا اس کمیشن نے سونا معیار اختیار کرنے کی سفارش کی۔لیکن اُن وجوہ کی بنا پر جن کا ذکر یہاں ضروری نہیں ہے ہندوستان نے سونا کرنسی معیار کے بجائے ،جس کی سفارش فاؤلر کمیشن نے کی تھی ،سونا مبادلہ معیار اختیار کیا۔

زر کے میدان میں ہونے والی تبدیلیوں کے تعلق سے کانگریس نے دہرا موقف اختیار کیا۔ (1)اس نے مبادلے کی فرسودگی کا متلافی بھتہ یورپین حکام کو دینے کی مخالفت کی اور (2) ہندوستانی روپے کو اسٹرلنگ سے جوڑنے کی بنا پر، جو ایک بدیسی کرنسی تھا، اس کی آزاد حیثیت کے کھو جانے کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا اس نے اپنے نویں اجلاس منعقدہ دسمبر 1893 میں اس موضوع پر دو تجویزیں منظور کیں۔ [1] تجویز نمبر 14 میں کہا گیا تھا کانگریس کو اس کا افسوس ہے کہ حال ہی میں حکومت ہند نے جلدی میں ایک قانون بنایا ہے جس کی رو سے چاندی کی نجی سکہ سازی کرنے والی ٹکسالیں بند ہوگئی ہیں۔اس نے لوگوں پر مستقل اور تکلیف دہ نوعیت کے بالواسطہ محاصل کا بوجھ بڑھا دیا ہے۔خصوصیت کے ساتھ کارخانوں کی صنعت پر اس کا بڑا مضر اثر پڑا ہے۔'' تجویز نمبر 15 کے ذریعہ کانگریس نے مبادلہ متلافی بھتے جو حکومت کے یورپین اور اپوزیشن ملازمین کو دیا گیا تھا اور جس کی وجہ سے ایک کروڑ روپیہ سے زیادہ خرچ ہو رہا تھا اور بنکوں کو ایک لاکھ اکتیس ہزار پونڈ کا معاوضہ دینے کے خلاف سخت احتجاج کیا۔خصوصاً ایسے وقت یہ اخراجات کئے گئے تھے جب ملک کی مالی حالت خراب تھی اور مزید محاصل لگائے جانے کا خطرہ تھا۔

1899 میں ایک تجویز منظور کی گئی جس کے ذریعے چاندی معیار کے بجائے سونا معیار کو رواج دینے کی مخالفت کی گئی تھی۔ [2] اور 1901 میں ٹکسالیں بند کرنے کی ایک دفعہ پھر مذمت کی گئی۔

لیکن کرنسی کی اصلاحات نے حکومت کی مالی حالت سدھار دی اس لیے کہ ہندوستان سے سالانہ انگلستان بھیجی جانے والی سود اور اخراجات کی رقم میں کمی ہوگئی۔لیکن کانگریس 1898 کی اصلاحات کی مخالفت کرتی رہی۔اُس کا کہنا تھا کہ روپے کی قیمت میں 30 فیصدی کا مصنوعی اضافہ

---

[1] اینی بیسینٹ محولہ بالا،صفحہ 180

[2] تجویز نمبر 4۔ایضاً صفحہ 304

کر کے اس حد تک بالواسطہ طریقہ سے تمام محاصل میں اضافہ کر دیا گیا ہے جس کی وجہ سے حکومت کو تو سال بہ سال بڑی بڑی فاضل رقمیں مل جاتی ہیں لیکن ملک کے کسانوں اور دوسرے پیداوار کرنے والوں کے مفادات کو نقصان پہنچتا ہے۔'' [1] اس مسئلے پر بحث جاری رہی اور جنگ عظیم کے بعد وہ ماہرین معاشیات اور مبصروں کے درمیان نزاع کا باعث بنا رہا۔

X اختتامیہ

1858 اور 1905 کے درمیانی پچاس سال میں جب برطانوی تاج براہ راست ہندوستان پر حکومت کر رہا تھا، مواصلات اور آمد و رفت کے ذرائع کی توسیع ہوئی، ہندوستان کی بدیسی تجارت میں بڑا اضافہ ہوا اور ہندوستانی معیشت نے جو جدید شکل اختیار کی ہندوستان بین الاقوامی تجارت میں پوری طرح شامل ہو گیا اور ایک اہم تجارتی اکائی سمجھا جانے لگا جدید صنعت اور کان کنی کی بنیاد بھی ہندوستان میں پڑ گئی۔ پٹ سن اور سوتی کپڑے کی صنعتوں نے اور کوئلہ، میگنیز اور ابرق نکالنے کی صنعتوں نے خاصی ترقی کی۔ جس وقت کانگریس نے سودیشی کی تحریک شروع کی اُس وقت ٹاٹا کے جدید فولاد کے کارخانے کی تجویز بھی زیر غور تھی۔ ان معاشی تبدیلیوں کے نتیجے میں تاجر طبقوں، زمینداروں اور ساہوکاروں کی حالت میں بڑا سدھار ہو چکا تھا۔ قیمتیں بڑھی تو منافعوں میں بھی اضافہ ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستانی اصل نے یورپ کی طرح کی تجارتی تنظیموں کو ترقی دینا شروع کر دی۔ مشترک سرمایہ کمپنیوں کی تعداد اور اصل میں بڑا اضافہ ہو گیا۔

ایک طرف تو یہ ترقی ہو رہی تھی دوسری طرف اسی دور میں ملک کو تباہیوں کا سامنا کرنا پڑا جن میں لاکھوں بھک مری کا شکار ہو گئے۔ اس زمانے میں حکومت کی مالی حالت زیادہ خراب رہی جس کی وجہ سے اسے اور زیادہ بھاری محاصل لگانے پڑے اور زیادہ قرض لینا پڑا۔ بھاری بھاری محاصل کی بنا پر پڑنے والے معاشی بوجھ، ہندوستان کی دست کاریوں کی تباہی اور سول اور فوجی ملازمتوں میں یورپینوں کی زیادہ تعداد ہونے کی وجہ سے روزگار کی کمی نے لوگوں میں بڑی بے چینی پھیلا دی تھی۔

---

[1] تجویز نمبر 11۔ آٹھویں کانگریس، دیکھئے اینی بیسینٹ محولہ بالا، صفحہ 366

برطانوی حکومت کی مخالفت کے اسباب اور بھی تھے لیکن اس کی سب سے بڑی وجہ تھی معاشی بے چینی اور دکھ۔ ہندوستان میں برطانیہ کی نو آبادیاتی معیشت برطانوی مفادات کو تو بڑھاتی تھی لیکن اُس نے ہندوستان کی صنعتوں کی نمو کو روک دیا تھا۔اس کے ساتھ مغربی تعلیم کے رواج، جدید سیاسی تصورات کے اثرات، جدید سائنس اور ٹکنالوجی اور متوسط طبقہ کے نشوونما نے زمین تیار کردی اور سیاسی انقلاب کا راستہ کھول دیا۔آزادی اور مساوات کے تصورات اور انگریز شدت پسندوں سے سیکھا ہوا ''نمائندگی کے بغیر محاصل نہیں لگائے جا سکتے'' کا سبق ایک نو آبادیاتی معیشت کے قیام میں معاون نہیں ہو سکتے تھے۔ ہندوستان کی قوم پرستی کو، جو ہندوستانی سماج پر برطانوی اثرات کا نتیجہ تھی، عام غربت وافلاس نے وہ عوامل ومحرکات مہیا کر دئے جنھوں نے اسے حرکی عمل بنا دیا۔

اس افلاس، محاصل کے اس بڑے بوجھ، اس اخراجات بیجا اور دولت کے نکاس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ ہندوستان ایک آزاد اور بااقتدار ملک نہیں تھا۔ ڈی۔این۔ واچا نے سترہویں کانگریس کا خطبہ صدارت پڑھتے ہوئے کہا تھا ''واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کو اپنے انتظامی معاملات میں انتخاب کی آزادی حاصل نہیں ہے۔اگر وہ آزاد ہوتا تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اس کا انتظامی ڈھانچہ ملک کے باشندوں پر مشتمل ہوتا جو اس ملک میں رہتے اور یہیں اپنا روپیہ خرچ کرتے ہیں۔[1]

ہندوستان کی افلاس کا تجزیہ بلاشبہ ظاہر کرتا ہے کہ بنیادی طور سے اس کا افلاس ایک بدیسی حکومت کا نتیجہ تھا یعنی اس انتظامی طریقے کا جس کو برطانیہ نے ہندوستان میں رواج دیا۔اس سے یہ ظاہر تھا کہ ہندوستان کے لوگوں کی معاشی حالت میں اس وقت تک کوئی سدھار نہیں ہو سکتا تھا جب تک حکومت کی نوعیت میں کوئی بڑی تبدیلی نہ ہو۔ چنانچہ حکومت تبدیل کرنے کے لیے تحریک چلانا ایک قدرتی امر تھا یعنی ایک نمائندہ اور جمہوری نظام کو رواج دینے اور برطانوی حکمرانوں کے ہاتھوں سے ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں سیاسی طاقت منتقل کرنے کے لیے معاشی مسائل اہم اور ضروری تو تھے لیکن ان کے حل کا انحصار تھا ہندوستان کو خودمختاری حاصل ہونے پر۔

---

[1] ایضاً صفحہ 336

آٹھواں باب

مسلم سیاسی فکر کے رجحانات

(1905-1857)

1857 کی بغاوت کے تعلق سے مسلم ردعمل

ہندوستان کے بالائی طبقوں کی امیدوں پر 1857 کی بغاوت نے کاری ضرب لگائی۔ اس نے کھوئے ہوئے علاقے اور طاقت کو دوبارہ حاصل کرنے کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ چونکہ بغاوت کے بعد انگریزوں کی نفرت کا اصل نشانہ مسلمان بن گئے تھے اس لیے قدرتی طور سے بغاوت کے نتائج انھیں زیادہ برداشت کرنے پڑے۔ جن علاقوں میں بغاوت کا زیادہ زور تھا وہاں کے سرکردہ خاندان برباد ہو گئے اور بہت لوگوں کی زمینیں اور دوسری املاک چھن گئیں اور وہ غربت وافلاس کے شکار ہو گئے۔ نوجوانوں کا مستقبل تاریک ہو گیا اس لیے کہ سرکاری سرپرستی کے دروازے اُن پر بند ہو گئے تھے۔ پورا پورا مسلم فرقہ اندھیروں میں بھٹکنے لگا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی قسمت میں تباہی اور بربادی کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ سرالفریڈ لائل کے مطابق 1857 کی بغاوت کے بعد، انگریزوں نے مسلمانوں کے ساتھ حقیقی دشمنوں اور انتہائی خطرناک رقیبوں کا سلوک کیا جس کی وجہ سے بغاوت کی ناکامی ہندوؤں کے مقابلے میں اُن کے لیے

(مسلمانوں کے لیے) زیادہ تباہ کن ثابت ہوئی۔ ہندوؤں پر روایتی برتری کا آخری شائبہ بھی مسلمانوں نے گم کر دیا، وقتی طور سے وہ بدیسی حکمرانوں کا اعتماد کھو بیٹھے اور اس وقت سے سول اور فوجی ملازمتوں میں اونچے ماتحت عہدوں پر اُن کی تعداد کم ہونا شروع ہوگئی۔[1]

علما

ان حالات میں اُن کے سامنے صرف دو راستے تھے۔ یا تو وہ اپنے دکھوں کا بہادری کے ساتھ مقابلہ کرتے، اُن اخلاقی کمزوریوں کو دور کرتے جن کی وجہ سے اُن کی قوت ارادی مفلوج ہوگئی تھی، قرآن پاک کی تعلیمات کی بنیاد پر ایک صاف ستھرا، خدا پر ایمان رکھنے والا اور راست باز سماج قائم کرنے اور دوسرے مذاہب کو ماننے والے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ مل کر ایک ایسا سیاسی نظام بناتے جس میں ہر کسی مذہب پر چلنے کی ممانعت نہ ہوتی، ترقی اور خوشحالی کے مساوی مواقع ہوتے اور ہر مذہب، ہر نسل اور ہر رنگ کے انسان کے لیے ایک باعزت اور باوقار زندگی گزارنے کا موقع ہوتا۔ یا ہمیشہ کے لیے آزادی کے خواب کو بھول جاتے، بدیسی حکمرانوں کی حکومت کو تسلیم کر لیتے اور سرکاری سرپرستی کے لیے اُن کی خوشنودی حاصل کرتے۔ یعنی ملازمتوں میں اور میونسپل کونسلوں، قانون ساز اداروں اور دوسرے اداروں کی ممبری کی طرح کی با اثر حیثیتوں میں حصہ بٹانے کی کوشش کرتے۔

پہلا راستہ زیادہ تر علما نے اختیار کیا یعنی اُن بزرگوں نے جو روایتی درس و تدریس کے کاموں میں مصروف رہتے تھے اور ایک نصب العین رکھتے تھے۔ دوسرا راستہ اُن مسلم قائدین نے اختیار کیا جنھوں نے اُن اسکولوں اور کالجوں میں جدید تعلیم پائی تھی جو مغربی فنون اور سائنس کی نشر و اشاعت کے لیے قائم کئے گئے تھے۔

جو علما مذہبی اصلاح اور سیاسی آزادی کے حامی تھے وہ اپنا رشتہ شاہ ولی اللہ سے جوڑتے تھے جنھوں نے نام نہاد وہابی تحریک کے قائدوں اور اُن عالموں کو متاثر کیا تھا جنھوں نے 1857 کی بغاوت میں حصہ لیا۔ علما عام مسلمانوں کے مفادات کی نمائندگی کرتے تھے جن کے متعلق لائل

---

[1] لائل سر۔ اے۔ سی۔ ایشاٹک اسٹڈیز، **ریلیجس اینڈ سوشل** (دوسرا ایڈیشن لندن، جان مرے، 1884) 339-340

کا خیال تھا ''میرے خیال میں یہ بات زیادہ قرین حقیقت ہے کہ اُن کی ناسمجھ اور غیر تعلیم یافتہ اکثریت ہمارے خلاف ہے''[1] اُن میں سے زیادہ تر معمولی محنت کش طبقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کا اصل مقصد تھا کہ لوگوں میں پائے جانے والے مذہبی طریقوں کی اصلاح کی جائے، انھیں توہمات اور غیر اسلامی عناصر سے پاک کیا جائے اور انھیں اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ قرآن اور حدیث کے بتائے ہوئے راستے پر چلیں۔ اس کے علاوہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ جب تک ہندوستان میں بدیسی حکومت رہے گی اس وقت تک یہ اصلاحات نہیں کی جاسکیں گی۔ اُن کا خیال تھا کہ مذہبی اور سیاسی مسائل صرف اس وقت حل کئے جاسکتے ہیں جب انگریزوں کی حکومت ختم ہوجائے جو اسلام کے لیے ایک سیاسی اور ثقافتی خطرہ ہے۔ چنانچہ وہ اس کے لیے تیار تھے کہ ملک کے غیر مسلم باشندوں کے ساتھ مل کر قومی آزادی کی جدوجہد میں پوری طرح شامل ہوجائیں۔ انھیں یقین تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد اُن کی پوری پوری مذہبی اور تہذیبی آزادی حاصل ہوجائے گی۔

چنانچہ وہ بڑی ثابت قدمی کے ساتھ حکومت کی مخالفت کرتے رہے۔ اُس بدیسی حکومت کے خلاف جس نے ریاست میں اُن کا اثر چھین لیا تھا، اُن کے دلوں میں جو جذبہ نفرت تھا اُس نے بدیسی علم اور تہذیب سے ہی اُنھیں متنفر کر دیا۔ اُن کا خیال تھا کہ انگریزی تعلیم بہت سے مسلمانوں کو اسلام سے منحرف کر دے گی اور بہت سے الحاد کا شکار ہوجائیں گے۔ اس کے برعکس وہ گروہ جو مسلمانوں میں اثر حاصل کرنے کے لیے ان کا مقابلہ کر رہا تھا اُن لوگوں پر مشتمل تھا جو سیاسی اداروں، فوجی طاقت اور مغرب کی تہذیب وتمدن سے بہت متاثر تھے۔ وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کو ناقابل تسخیر کہتے تھے اور انھوں نے تاریخ میں پڑھا تھا کہ آزاد مسلم حکمراں برطانیہ کے خلاف جدوجہد میں کس بری طرح ناکام ہوئے تھے۔ انھیں یقین تھا کہ مسلم بالائی طبقے کی بربادی اُن غلطیوں کا نتیجہ تھی جو انھوں نے 1857 میں کی تھیں۔

انھوں نے دیکھا کہ بالعموم ہندوؤں نے اور بالخصوص بنگالیوں نے ترقی کے موجودہ مواقع سے کس طرح پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ انھوں نے بڑی ترقی کی تھی۔ زمینداری اور تجارت سے بڑی

---

[1] لائل۔ اے۔ سی۔ محولہ بالا 246

دولت کمائی تھی اور سب ملازمتوں پر قابض ہو گئے تھے۔ مغربی تعلیم سے غیر مشروط لگاؤ کی بنا پر انھوں نے حاکموں کی خوشنودی حاصل کر لی تھی۔ اس کے برعکس مسلمان اُس سے اپنا دامن بچائے رہے اپنی شکایتوں کو زندہ رکھا اور اس کے نتیجے میں بچھڑ گئے۔ اس نابرابری کے متعلق ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے لکھا تھا ''تعلیم عامہ کا ہمارا نظام، جس نے ہندوؤں کو صدیوں کی نیند سے چونکا دیا اور اُن کے سست عام لوگوں میں قوم کی اعلیٰ خصوصیات پیدا کر دیں، مسلمانوں کی روایات کے خلاف، اُن کی ضرورتوں کے لیے ناکافی اور اُن کے مذہب کے لیے نفرت انگریز ہے۔''[1]

مسلمانوں نے ابتدا سے انگریزی تعلیم کی مخالفت کی۔ انھوں نے اس وقت باضابطہ طور سے اس کی مخالفت کی تھی جس وقت لارڈ ولیم بینٹک نے 7/مارچ 1835 کے حکم پر دستخط کئے تھے۔ آٹھ ہزار مسلمانوں کے دستخطوں سے ایک عرضداشت اُس کو پیش کی گئی تھی جس میں اس امر کے خلاف احتجاج کیا گیا تھا کہ سرکاری مالی امداد محض انگریزی تعلیم پر خرچ کی جائے۔ انگریزی تعلیم پر اُن کا سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ اس سے نوجوان ہندوستانی طالب علموں کے مذہبی عقائد کمزور ہو جاتے ہیں اور عیسائیت کی تبلیغ کے لیے راستے کھل جاتے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مغرب کی مخالفت کے رجحان کے خلاف بھی کچھ آوازیں اٹھیں۔ شاہ عبدالعزیز (1746۔1824) نے مغربی تعلیم حاصل کرنے کی حمایت کی تھی۔ کچھ مسلم نوجوانوں نے کلکتہ کے انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں داخل ہو کر مسلمانوں کے رجعت پرست عناصر کی مخالفت مول لی۔ کلکتہ مدرسہ میں بھی انگریزی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ دہلی میں جو کالج 1828 میں کھلا تھا اس میں مغربی علوم کی تعلیم دی جانے لگی اور سائنس کی کتابوں کے اردو میں ترجمہ کرنے کی تحریک شروع ہوئی۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں انیسویں صدی کے نصف اول میں کلکتہ سے دہلی تک کچھ مسلم نوجوانوں نے مغربی تعلیم حاصل کی۔ لیکن من حیثیت الفرقہ مسلمان انگریزی تعلیم سے دور رہے۔

سیاسی میدان میں بھی اُس شک اور دوری کو کم کرنے کی کوشش کی گئی جو حکمراں طبقوں کے خلاف پائی جاتی تھی۔ کلکتہ کی محمڈن لٹریری سوسائٹی نے، جو 1823 میں قائم کی گئی تھی اور جس کے

---

[1] ہنٹر ڈبلیو۔ ڈبلیو، انڈین مسلمان، (لندن، 1876)، صفحہ 177

سکریٹری خان بہادر نواب عبدالطیف خان تھے، شاہ ولی اللہ کے گروہ یعنی وہابیوں کے جہاد کے خلاف فتویٰ دیا۔ ملکہ انگلستان کے خلاف جہاد کی ضرورت کے لیے مکہ کے مفتیوں سے بھی فتوے حاصل کئے گئے۔

I سرسید احمد خاں۔ حالات زندگی

لیکن انگریزی تعلیم اور برطانوی حکومت کے ساتھ تعاون کے حق میں سب سے زیادہ موثر اقدامات سرسید احمد خاں نے کئے جو ہندوستانی مسلمانوں کی سیاسی نشاۃ ثانیہ کا ایک اہم رول ادا کرنے والے تھے۔

سرسید احمد خاں 1817 میں پیدا ہوئے اُن کا دعویٰ تھا کہ باپ اور ماں دونوں کی طرف سے اُن کا تعلق طبقہ اشرافیہ اور مذہبی مسلم خاندانوں سے تھا۔ اُن کے ددھیالی بزرگ اورنگ زیب کے زمانے سے مغل سلطنت کی ملازمت میں تھے، مغل دربار سے قریبی تعلق رکھتے تھے اور مغل تہذیب کے علمبردار تھے، اُن کے ننہیالی بزرگ خواجہ فرید احمد ایرانی تاجروں کے ایک دولت مند خاندان کے رکن تھے۔ انھوں نے لکھنؤ میں تعلیم پائی تھی اور ریاضی اور فلکیات میں خصوصی مہارت حاصل کی تھی۔ وہ پہلے تو کلکتہ مدرسہ کے سپرنٹنڈنٹ کے فرائض ادا کرتے رہے اُس کے بعد ایران اور برما کے درباروں میں برطانوی سفیر مقرر ہوئے۔ دو دفعہ وہ شہنشاہ اکبر شاہ دوم (1837-1806) کے وزیر اعظم بھی رہے۔

چنانچہ سید احمد خاں کی ابتدائی زندگی ایسے ماحول میں گزری جہاں وہ زمانہ وسطیٰ اور زمانہ جدید دونوں کی تہذیبوں سے فیض یاب ہو سکے۔ لیکن وہ باضابطہ طریقے سے اور مسلسل تعلیم نہیں حاصل کر سکے۔ اس کی وجہ سے اسلامی امور کے متعلق اُن کی معلومات نامکمل تھیں۔ بعد میں انھوں نے اپنی کوششوں سے مغربی فکر تک رسائی حاصل کی اور مغرب نے قدرتی سائنسوں میں جو ترقی کی تھی اس سے بہت زیادہ متاثر ہوئے۔

جس وقت اُن کی عمر 22 سال تھی ان کے والد کا انتقال ہو گیا اور انھیں روزگار کے مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ مغل دربار میں اس قسم کی ملازمت کی گنجائش نہیں تھی جس میں انھیں مرضی کے

مطابق تنخواہ مل سکتی۔ چنانچہ انھوں نے عدالتی کام سیکھنا شروع کیا اور 1839 میں آگرہ کے کمشنر کے دفتر میں کلرک مقرر ہو گئے۔ 1857 میں وہ ترقی کر کے صدر امین بن گئے۔ جس وقت 1857 کی بغاوت شروع ہوئی وہ اس وقت بجنور میں تھے۔ بارہ سال بعد وہ انگلستان گئے جہاں تقریباً ڈیڑھ سال اُن کا قیام رہا۔ 1876 میں وہ سرکاری ملازمت سے ریٹائر ہوئے اور علی گڑھ میں سکونت اختیار کی۔ 1898 میں 81 سال کی عمر میں اُن کا انتقال ہوا۔

سید احمد خاں نے طویل عمر پائی اور پوری زندگی بڑی جانفشانی میں گزاری۔ انھوں نے مسلمانوں کی بہت خدمت کی۔ زندگی کے ابتدائی برس انھوں ایک ایسے سماج میں گزارے تھے جو ذلت اور خواری کے آخری مرحلوں سے گزر رہا تھا۔ اُس کا سیاسی اختیار و اثر ختم ہو چکا تھا، اس کا طبقہ اشرافیہ بے ایمان اور زوال پذیر تھا اور اس کے عام لوگ تیزی سے غربت اور افلاس کے شکار ہوتے جا رہے تھے۔ کٹرپن، جہالت اور توہم پرستی بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی تھی۔ مذہب محض ظاہری رسوم تک محدود ہو کر رہ گیا تھا اور اُس سے یقین و ایمان کی روشنی چھن گئی تھی۔ اخلاق خراب ہو چکے تھے اور زندگی سے خلوص و اصول پرستی ختم ہو چکی تھی۔ مکر و ریا کا دور دورا تھا۔ عیاشی اور جسمانی لذت کا رواج عام تھا۔ تمام اعلیٰ اقدار اپنی توقیر کھو چکی تھیں۔

جب سید احمد خاں جوان ہوئے تو مسلمانوں پر ایک ایسی آفت آئی جو بظاہر اُن کی مکمل تباہی کا حکم رکھتی تھی۔ 1857 اور اس کے بعد رونما ہونے والے واقعات نے ہر طرف تباہی و بربادی پھیلا دی۔ دولت مند بالائی طبقے کے بہت سے رکن ختم ہو گئے اور پورے فرقے کو حکمراں نفرت اور شک کی نظر سے دیکھنے لگے۔ ایک باعزت اور حساس مسلمان کے لیے یہ واقعات روح فرسا تھے۔ پہلے ملک سے ہجرت کرنے کا خیال انھیں آیا لیکن جلد ہی یہ بات اُن کی سمجھ میں آ گئی کہ اس ملک میں مسلمانوں کو دکھوں اور تکلیفوں میں مبتلا چھوڑ کر خود کسی دوسرے ملک میں آرام کی زندگی بسر کرنا بزدلی ہے۔ انھوں نے فیصلہ کیا کہ وہ یہیں رہ کر جد و جہد کریں گے۔ تقریباً پچاس برسوں پر محیط طوفان اور تباہی کے زمانے میں وہ بے مثال صبر، ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ کے ساتھ اپنے فیصلے پر قائم رہے۔ اپنی موت سے پہلے اُنھیں اطمینان ہو گیا تھا کہ ملت کے افق پر منڈلاتے ہوئے گہرے بادل چھٹ گئے ہیں اور اس کے حالات میں ایک ایسا انقلاب آ گیا ہے جو ایک روشن مستقبل کا ضامن ہے۔

II سید احمد خاں کے سماجی اور مذہبی اصلاحات کا تصور

سید احمد خاں کے سامنے ایک دشوار کام تھا۔ یہ کام تھا مسلمانوں کا سماجی، معاشی اور سیاسی سدھار۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ سید احمد خاں کا تعلق بالائی طبقے سے تھا۔ اس طبقہ کو بڑی تباہی کا سامنا کرنا پڑا تھا جس کا راست اثر خود اُن پر بھی پڑا تھا۔ وہ اُسے اپنا ذاتی نقصان سمجھتے تھے لیکن نچلے طبقوں کی آہستہ آہستہ اور تقریباً غیر محسوس طور پر بگڑتی ہوئی حالت نے اُنھیں متاثر نہیں کیا۔ اُن کے رویے سے کبھی یہ ظاہر نہیں ہوا کہ وہ اس تباہی سے واقف ہیں جس کے شکار رفتہ رفتہ عام مسلمان ہو رہے تھے۔ چنانچہ اُن کی تمام کوششیں اُس طبقے کے حالات سدھارنے پر مرکوز تھیں جو پچھلے زمانے میں با اثر اور طاقتور تھا اور جس کے شاندار کاموں سے تاریخ کے اوراق بھرے ہوئے ہیں جس کو مسلمانوں کے باوقار ورثے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے چنانچہ مسئلہ کا جو حل انھوں نے دریافت کیا وہ علما کے حل سے مختلف تھا۔

سید احمد خاں اور اُن کے ساتھی یہ دیکھ چکے تھے کہ ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کی کوشش بے سود ہے۔ اُن کے نزدیک ''آزادی'' عملی سیاست نہیں تھی۔ دوسرا راستہ صرف یہ تھا کہ برطانوی حکومت کے تحت مسلمانوں کی حالت سدھاری جائے۔ اس کے لیے ضروری تھا کہ انگریزوں اور مسلمانوں کے درمیان جو نفرت اور شک کی کھائی حائل تھی اس کو پاٹا جائے، یہ کہ انگریزوں کو یقین دلایا جائے کہ مسلمان اُن کی حکومت کے دشمن نہیں ہیں بشرطیکہ وہ اُن کے مذہبی عقائد و رسوم میں مداخلت نہ کریں اور یہ کہ اُن کے مذہب نے اس کا حکم نہیں دیا ہے کہ اُن عیسائیوں کی طرف مخاصمانہ رویہ اختیار کیا جائے جو اُن پر حکومت کرتے ہیں۔

اس کے لیے مذہب کی تشریح نو ضروری تھی۔ اس کی ضرورت تین اور وجوہ سے تھی۔ پہلی وجہ تو یہ تھی کہ عیسائی مشنری اسلام پر سخت تنقید کرتے تھے اور اسے طعن وطنز کا نشانہ بناتے تھے۔ کتابوں، رسالوں، تبلیغ عام اور مناظروں کے ذریعے وہ جو پرچار کرتے تھے اسے اسکولوں اور دوسرے تعلیمی اداروں سے تقویت ملتی تھی اور وہ بہت کارگر ثابت ہو رہا تھا۔ اس خطرہ میں اضافہ اس سے ہو گیا کہ وہ حکمراں طبقے سے تعلق رکھتے تھے اور بہت سے حکام اُن کے ہمدرد اور حامی

تھے۔حالات انتہائی پریشان کن تھے اوراس لیے مذہب کا دفاع ضروری تھا۔

دوسری بات یہ تھی کہ اخلاقی اور سماجی گراوٹ اور مذہب کی طرف سے مسلمانوں کی لاپرواہی رقیبوں کو حملے کرنے کے مواقع فراہم کرتی تھی لیکن اُس کی وجہ سے اسلام کے حامیوں کے لیے اُس کی دفاع دشوارتر ہوگئی تھی۔اسلام کی سچائی کو ثابت کرنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ جدید خطوط پر اس کی تشریح نو کر کے اُس کا وقار بحال کیا جائے۔اس سے بھی زیادہ ضروری یہ تھا کہ توہمات اور غیر معقول تصورات سے اسلام کا دامن پاک کیا جائے۔

تیسری بات یہ تھی کہ مغربی تصورات کی اشاعت اور مغربی تعلیم کی توسیع اسلام کے بنیادی عقائد کے لیے خطرہ بنتی جارہی تھی۔جدید سائنس کے چیلنج کا بہرحال مقابلہ کرنا تھا۔

اس جدوجہد کے لیے جس فلسفیانہ اور مذہبی علم وفضل کی ضرورت تھی وہ سید احمد خاں کے پاس نہیں تھا لیکن وہ بڑی ہمت اور انتہائی جوش رکھتے تھے۔انھوں نے تین کاموں کا بیڑا اٹھایا یعنی مذہب کی تشریح نو، سماجی اصلاح اور تعلیم۔لیکن انھوں نے اس پر بھی نظر رکھی کہ یہ چیز مسلمانوں کی معاشی اور سیاسی بحالی کے لیے بھی شرط اول ہیں۔

اُنھیں یقین تھا کہ عیسائی مشنریوں اور مصنفوں کے ساتھ مناظروں میں اطمینان بخش نتائج صرف اس وقت حاصل کئے جاسکتے ہیں جب اُن کے خلاف مغربی طریقہ استدلال استعمال کیا جائے۔اگر وہ عقل اور سائنس کی بنیاد پر اسلام پر حملہ کریں تو انھیں بھی جواب میں اُسی قسم کی دلیلیں استعمال کرنی چاہئیے۔چنانچہ انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ قرآن کی تعلیمات عقل وفطرت کے مطابق ہیں۔انھوں نے جو طریقہ استدلال استعمال کیا وہ علما کے طریقوں سے بالکل مختلف تھا۔انھوں نے جن اصولوں پر بنیاد قائم کی وہ تھے۔

(1) قرآن کی تعلیمات من جانب اللہ اور ابدی ہیں۔اس لیے اُن میں کوئی غلطی نہیں ہوسکتی ہے اور لفظاً اور معناً دونوں اعتبار سے اُن کی پابندی لازمی ہے۔

(2) حدیث رسولؐ کے اقوال پر مشتمل ہے جنھیں ایسے زاویوں نے یکجا کیا ہے جن کے کردار و استناد کی جانچ کی جانی چاہئیے۔اس لیے اُن پر تنقید کی جاسکتی ہے اور جانچ پڑتال کے بعد ہی اُنھیں تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

(3) حدیث کی پابندی محض مذہبی امور میں لازمی ہے۔ دنیاوی امور میں اُن کی پابندی نہ کرنے کی اجازت ہے۔

(4) انسان کی مرضی آزاد ہے۔

ان اصولوں کی بنا پر وہ اسلامی عقائد کے باجرأت اور انقلابی شارح بن گئے۔ انھوں نے اس قسم کے تصورات پر اُن اصولوں کا اطلاق کیا جیسے خدا کی وحدانیت، روح، آزادی مرضی، تقدیر، پیش گوئی، الہام، معجزات، معراج، فرشتے، شیطان، عالم غیب، عالم مثال، حیات بعد از ممات، خلود، قرآن وغیرہ۔ ان تمام سوالوں کے تعلق سے اُن کا رویہ بہت معقول تھا۔ مثال کے طور پر وجود باری تعالیٰ کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ اس کا ثبوت کائنات کے مظاہر میں موجود ہے۔ حالانکہ انسان کی محدود عقل رب العالمین کی حقیقت اور نوعیت کا احاطہ نہیں کر سکتی ہے۔ اُن کے مطابق ہم صرف جانتے ہیں کہ روح ہے لیکن اُس کی حقیقی نوعیت کو نہیں سمجھ سکتے ہیں۔ اُن کی رائے میں نبوت انسانی تکمیل کا نام ہے اور یہ کہ نبی ایک انسان ہوتا ہے جسے خدا نبوت کی صفات سے نوازتا ہے۔ ہر انسان خدا کا پیغام حاصل کرنے کا اہل ہوتا ہے لیکن اُن کی اہلیت میں فرق ہوتا ہے۔ الہام کی سچائی کو معلوم کرنے کا پیمانہ فطرت ہے۔

سید احمد خاں نے ایسے معجزوں کے امکان سے انکار کیا جو قانون قدرت کے منافی ہوں۔ اُن کا خیال تھا کہ ''فرشتے'' اور ''شیطان'' انسانوں اور جانوروں کی طرح کوئی آزاد وجود نہیں رکھتے ہیں بلکہ انسان کے اندر پائی جانے والی اچھی اور بری طاقت، رویہ یا رجحان ہیں۔ انھوں نے اس سے بھی انکار کیا کہ مکان وزمان کا اطلاق خدا، فرشتوں، خوابوں وغیرہ پر کیا جائے۔ اُن کے مطابق جنت اور دوزخ ایسے تصور ہیں جو انسان کی عقل سے بالاتر ہیں۔ قرآن کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ وہ کلام اللہ ہے اور اس لیے معنی اور لفظ دونوں اعتبار سے ابدی ہے۔ انھوں نے اسلام کی معقولیت سے ایک دلچسپ نتیجہ اخذ کیا اور وہ یہ تھا کہ جو شخص خدا میں یقین رکھتا ہے اُس کو کافر یا ملحد نہیں قرار دیا جا سکتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ایک دہریے کو بھی کافر مشکل ہی سے سمجھا جا سکتا ہے اس لیے کہ وہ اسلام کے ارکان سے لاکھ انکار کرے لیکن عملاً وہ اُن کا اسی طرح پابند ہے جس طرح کوئی حقیقی مسلمان اس لیے کہ خدا کے احکام قانون فطرت ہیں جن کی خلاف ورزی

نہیں کی جاسکتی ہے۔

سماجی، تہذیبی اور سیاسی مسائل کے تعلق سے بھی سید احمد خاں اتنے ہی آزاد خیال تھے۔ اُن میں سب سے دلچسپ سوال تھے غلامی، کثرت ازواج، جہاد، سود اور جنگی قیدیوں کے سوال۔ اُن کا کہنا تھا کہ اُن مسائل کے تعلق سے اسلامی تصورات معقول اور قوانین فطرت کے مطابق ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ اسلام نے غلاموں کے ساتھ برتاؤ کرنے کے تعلق سے ایسی شرائط مقرر کی ہیں کہ اُن کی وجہ سے غلامی کی نوعیت ہی بدل گئی ہے، کثرت ازواج کی اجازت محض خصوصی حالات میں ہے، غیر مسلموں کے خلاف جہاد صرف اُس صورت میں جائز ہے جب اسلام پر حملہ کیا جائے، ہر قسم کے سود کی ممانعت نہیں ہے بلکہ اسلام سے پہلے جس طرح خون چوسا جاتا تھا اُس کی ممانعت ہے، جنگ میں گرفتار ہونے والے مردوں کو قتل کرنا اور عورتوں کو باندیاں بنانا مناسب نہیں ہے۔ جہاں تک خلفائے راشدین کا تعلق ہے اُن کا خیال تھا کہ آنحضرتؐ کے انتقال کے تیس سال بعد اُن کا سلسلہ امام حسین کے ساتھ ختم ہوگیا۔ اس کے معنی تھے ترکی کا سلطان جائز خلیفہ نہیں تھا اور یہ کہ انگریز حکمرانوں کے ساتھ وفاداری لازمی تھی۔[1]

سید احمد خاں کی بڑی خواہش تھی کہ مسلمانوں اور عیسائی حکمرانوں کے درمیان جو کھائی تھی اس کو پاٹ دیا جائے۔ دوسری طرف وہ مشترکہ باتوں پر زور دیتے تھے اور اسلام نے عیسائیت کی جو خدمت کی ہے اس کو یاد دلایا کرتے تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ سماجی تعلقات میں وہ عیسائیوں کے خلاف تعصب اپنے دل سے نکال دیں خاص طور سے کھانے پینے کی حد تک۔

مصلح کی حیثیت سے وہ اتنے آگے بڑھ گئے تھے کہ مسلمانوں کے رجعت پرست عناصر اُن سے بہت خفا رہنے لگے تھے۔ اُن سے خاص طور سے قدیم خیال رکھنے والے ناراض تھے اور اُن کے خلاف کفر کا فتویٰ دیتے رہتے تھے۔ اخباروں، کتابوں اور تقریروں میں اُن کو گالیاں دی جاتی تھیں اور اُن کی زندگی خطرے میں تھی۔ لیکن انھوں نے کسی خطرے کی پرواہ نہیں کی۔ انھیں

---

[1] سید احمد خاں۔ آخری مضامین (15-1314 ہجری مطابق 98-1897) طابع ایم۔ فضل الدین بازار کشمیری، لاہور 1898 صفحات 150 اور بعد کے صفحے۔

کوئی اپنے راستے سے نہیں ہٹا سکا۔ بالآخر اُن کے زیادہ تر معترضین خاموش ہو گئے۔ حالانکہ قرآن کی جو جرأت آمیز تشریح انھوں نے کی تھی اُس پر عمل خود اُن کے ادارے میں بھی نہیں کیا گیا پھر بھی اسلام کے تعلق سے اُن کے معقول اور فطرت سے مطابقت رکھنے والے رویے کو مغربی تعلیم پائے ہوئے نیا ذہن رکھنے والے مسلمان در پردہ قبول کیے۔

جہاں تک ہندوستانی سماج کا تعلق ہے اُن کے مذہبی خیالات کا اہم ترین نتیجہ یہ ہوا کہ اُن تنگ نظر عالموں کے خیالات کی نفی کی گئی جو ہندوؤں کو کافر سمجھتے تھے۔ اس اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد کہ اسلام کے قوانین فطرت کے قوانین کے مطابق ہیں اور یہ کہ ہر انسان پر اُن کی پابندی لازمی ہے۔ منطقی طور سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ قرآن پر ایمان رکھنے والوں اور دوسرے مذاہب کو ماننے والوں میں جو بھی فرق ہے وہ محض لفظوں کا ہے حقیقی نہیں۔ اس کے علاوہ جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ خیر وشر کے انتخاب میں انسان آزاد ہے اور یہ کہ ایک مسلمان بھی ویسے ہی گناہ کا مرتکب ہو سکتا ہے جیسے کہ ایک غیر مسلم، اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کو کسی کی شفاعت کے بغیر خدا کے سامنے اپنے گناہوں کی جوابدہی کرنی ہوگی۔ اس طرح سید احمد خاں کے لبرل رویے نے مسلمانوں، ہندوؤں اور عسائیوں کے درمیان سماجی سمجھوتے اور تال میل کے دروازے کھول دئے۔

اس میں کوئی تعجب نہیں ہے کہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں سید احمد خان نے ہندو مسلم اتحاد پر زور دیا۔ انھوں نے 27/جنوری 1883 کو پٹنہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا ''ہم دونوں ہندوستان کی ہوا میں سانس لیتے ہیں اور گنگا اور جمنا کا متبرک پانی پیتے ہیں۔ ہم دونوں ہندوستان کی مٹی سے پیدا ہونے والی چیزیں کھاتے ہیں۔ ہم ساتھ جیتے ہیں ساتھ مرتے ہیں۔ ہندوستان میں رہ کر ہمارا خون بدل گیا ہے ہمارا رنگ بدل گیا ہے اور یکساں ہو گیا ہے، ہمارے خدوخال میں مشابہت پیدا ہو گئی ہے۔ مسلمانوں نے بہت سی ہندوؤں کی رسمیں اختیار کر لی ہیں۔ ہندوؤں نے بہت سے مسلم طریقے اپنا لیے ہیں۔ ہم اتنے ایک دوسرے میں گھل مل گئے کہ ہم نے ایک نئی زبان اردو کو جنم دیا جو ہماری زبان ہے نہ ہندوؤں کی زبان۔ چنانچہ اگر ہم اپنی زندگی کے، جو خدا کی امانت ہے اس حصہ کو اپنا سمجھیں تو اس میں شک نہیں کہ ایک ہی ملک میں رہنے کی بنا پر ہم ایک

قوم تصور کئے جاسکتے ہیں اور ملک اور خود ہماری خوشحالی کا دارومدار اتحاد، باہمی ہمدردی اور محبت پر ہے۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اختلافات، ضد، مخالفت اور مخاصمانہ جذبات ہمیں برباد کریں گے۔'' آگے چل کر انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک خوبصورت دلہن کی دو آنکھوں سے تشبیہہ دی اور کہا کہ اگر ان میں سے کوئی بھی آنکھ خراب ہوگئی تو دلہن کا حسن ختم ہو جائے گا۔[1]

پنجاب کے ہندوؤں سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے شکایت کی کہ انھیں ہندو کیوں نہیں سمجھا جاتا ہے اور کہا آپ نے ہندو کی اصطلاحات اپنے لیے استعمال کی۔ یہ صحیح بات نہیں ہے۔ اس لیے کہ میری رائے میں لفظ ہندو کے معنی کوئی خاص مذہب نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ہر وہ شخص جو ہندوستان میں رہتا ہے اپنے کو ہندو کہنے کا حق رکھتا ہے۔ مجھے افسوس کہ میں حالانکہ ہندوستان میں رہتا ہوں پھر بھی آپ ہندو مجھے نہیں سمجھتے۔''

اپنے آخری مضامین میں سے ایک میں انھوں نے لکھا ''ہماری رائے میں جس طرح مذہبی اختلافات کی بنا پر مسلمانوں اور ہندوؤں کے آپسی لین دین باہمی محبت اور ہمدردی پر کوئی مضر اثر نہیں پڑنا چاہئے، اسی طرح سیاسی مسائل کو بھی آپسی لین دین، باہمی محبت، پیار، اور ہمدردی میں مائل نہیں ہونا چاہئے۔'' انھوں نے مزید لکھا ''اس میں شک نہیں کہ جس طرح ہم مذہبی اختلافات کو نظر انداز کر کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوستی، پیار، اتحاد اور باہمی ہمدردی کا رشتہ قائم کرنا چاہتے ہیں اس طرح سیاسی اختلافات سے بھی قطع نظر کر کے ہم چاہتے ہیں کہ اُن میں سماجی سطح پر باہمی دوستی، پیار، ہمدردی اور بھائی چارہ ہو۔''[2]

سید احمد خاں کا خیال تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں سیاسی تعاون ہونا چاہئے۔ یہ بات حقیقت کے منافی ہے کہ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو قومیں سمجھتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ اس اتحاد میں مذہب کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا ہے اور اُن کا ضمیر اس پر مطمئن تھا۔ کانگریس سے اُن کے اختلافات کی وجہ تھی محض سیاسی مصالح۔ اس قسم کے اختلافات خود ہندوؤں میں بھی پائے جاتے تھے یعنی زمینداروں اور تعلیم یافتہ متوسط طبقے میں۔

---

[1] مجموعہ لیکچر ہائے سرسید (اردو)، منشی سراج الدین اڈیشن، ہلالی پریس، 1892 صفحات 121-117

[2] مارچ 1897، تا اپریل 1898 دیکھئے آخری مضامین، محولہ بالا، صفحات 57-56

سید احمد خاں ایک ماہر تعلیم کی حیثیت سے

سید احمد خاں نے مسلمانوں کے خیالات میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا۔ انفرادی اور اجتماعی طور سے مسلمانوں کی اصلاح کی کوشش اس سے کم اہم نہیں تھی۔ وہ اپنے مذہبی خیالات کو ایک اداریاتی اساس دینا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کی ایک ایسی اسکیم بنائی جو اُن کی مذہبی، تہذیبی اور مادی ضرورتوں کو پورا کر سکے۔ مسلمانوں میں پائے جانے والے رجعت پسند عناصر کی طرح وہ خود بھی سرکار کی طرف سے چلائے جانے والے تعلیمی اداروں کی سیکولر تعلیم سے مطمئن نہیں تھے جس کی بنا پر طالب علم اسلام سے منحرف ہو رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس نئی تعلیم نے ان روایتوں کو پس پشت ڈال دیا جن میں کردار کی خوبی پر زور دیا جاتا تھا اور دوسری طرف اُس نے زندگی کے کوئی نئے اخلاقی اصول نہیں پیش کئے لیکن جہاں تک ذہنی نشوونما کا تعلق تھا سید احمد خاں نہ مسلم مدرسوں کے قدیم نظام سے مطمئن تھے اور نہ جدید تعلیم سے جو حکومت کے قائم کیے ہوئے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جاتی تھی۔ مدرسوں کے متعلق انھوں نے لکھا تھا، ان دنوں مسلمانوں نے پرانے قسم کے کئی تعلیمی ادارے جون پور، علی گڑھ، کان پور، سہارن پور، دیوبند، دہلی اور لاہور میں شروع کئے لیکن میں صدق دل سے کہتا ہوں وہ سب محض فضول اور بے مصرف ہیں۔"[1]

مدرسوں کا نصاب تعلیم دینیات، زبان، منطق، طبعی سائنسوں، ریاضی، فقہ اور طب پر مشتمل ہوتا تھا۔ سید احمد خاں کی رائے تھی "اب یہ بات اچھی طرح ظاہر ہو چکی ہے کہ اسلامی سائنس محض بے مصرف ہے اور یہ بات اچھی طرح واضح ہو گئی ہے کہ اُن کو پڑھنے سے اب کوئی فائدہ نہیں اس لیے وہ لوگوں کی نظروں میں حقیر و خوار ہو گئی ہیں۔[2]

اسی کے ساتھ سید احمد خاں کا خیال تھا کہ ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں دی جانے والی اعلیٰ تعلیم بھی ناکافی تھی۔ اُن کی رائے میں یونیورسٹیاں تھوڑی بہت تعلیم دے کر بہت سے بی۔ اے اور ایم۔ اے پیدا کر رہی تھیں لیکن ایسے لوگ بہت کم نکل رہے تھے جنھیں واقعی عالم کہا جا سکے۔

---

[1] تہذیب الاخلاق (لاہور، فضل الدین اڈیشن)، جلد 22 صفحہ 457

[2] ایضاً جلد اول، صفحات 439-429

انھوں نے تعلیم کے مقاصد اس طرح بیان کئے۔ (1) ایمان کو تقویت پہنچانا جس کے لیے مذہبی حقائق کا علم اور معقولیت و روایت میں مفاہمت ضروری ہے۔ (2) اقامتی تعلیم گاہیں قائم کر کے اور صحت مند عملی کاموں کو فروغ دے کر کردار کی تہذیب کرنا اور (3) جدید سائنسوں کی اعلیٰ ترین مدارج تک تعلیم دینا اور طالب علموں میں معقول پسندی کا رجحان پیدا کرنا۔

ان مقاصد کو پورا کرنے کے لیے سید احمد خاں نے مندرجہ ذیل اقدامات کئے۔ اسکول کھولے، سائنسی سوسائٹیاں قائم کیں اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی تنظیم کی۔ انھوں نے مسلمانوں کے لیے تعلیم کی جو اسکیم بنائی تھی اس میں تین قسم کے ادارے شامل تھے یعنی اعلیٰ تعلیم جس کی نمائندگی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کرتا تھا جس میں 18 سال سے زیادہ کے طالب علم تھے۔ اس کے تین شعبے تھے یعنی انگریزی، اُردو اور فارسی اور عربی۔ مڈل سیکشن جس میں گیارہ سے اٹھارہ سال تک کے بچوں کے لیے مکتب۔ ان تینوں قسم کے اسکولوں میں مذہبی تعلیم لازمی تھی۔

اس اسکیم کے تحت محمڈن اینگلو اورینٹل اسکول 1874 میں قائم کیا گیا جسے ترقی دے کر 1878 میں کالج بنا دیا گیا۔ اس نے ہندوؤں اور برطانوی حکمرانوں دونوں پر ظاہر کر دیا کہ ہندوستانی مسلمان نئی تعلیم اور اُس کے فوائد کی طرف سے بے خبر نہیں ہیں۔ سید احمد خاں کی خواہش تھی کہ اس کالج کو ترقی دے کر آکسفورڈ یونیورسٹیوں کی طرح کی یونیورسٹی بنا دیں۔ جس طرح یہ یونیورسٹیاں انگلستان کی حکومت کے لیے حکام اور انتظامی کارکن پیدا کرتی تھیں اسی طرح وہ چاہتے تھے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج ہندوستان کے لیے حکام پیدا کرے۔ اُن کی دوسری خواہش یہ تھی کہ کالج ہندوستانی زبانوں کے ذریعے ہندوستان کے لوگوں میں مغرب کے اعلیٰ ترین علوم کی نشر و اشاعت کرے۔ کالج کے اردو شعبے سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ ایسے عالم پیدا کرے جو اسلام کی مذہبی اور تہذیبی میراث کو آئندہ نسلوں تک پہنچا سکیں۔

لیکن سید احمد خاں کی توقعات کالج پوری نہ کر سکا۔ انگریزی شعبہ اپنا رول پوری طرح ادا نہ کر سکا یعنی اردو کے ذریعے وہ مغربی علوم کو مسلمانوں میں نہ پھیلا سکا۔ اس کے باوجود کالج اس کا مرکز بن گیا جو ''علی گڑھ تحریک'' کہلاتی ہے اور مسلمانوں کی زندگی اور فکر پر اس کا گہرا اثر پڑا۔

محمڈن، اینگلو اورینٹل کالج کا قیام سید احمد خاں کی زندگی میں ایک اہم موڑ کا حکم رکھتا ہے۔ وہ

اس کی ترقی اور داشت و پرداشت میں اتنے منہمک ہو گئے کہ تمام دوسری دلچسپیاں ماند پڑ گئیں۔ اُن کی نظر میں اعلیٰ انگریزی تعلیم ہندوستان کی تمام سماجی اور سیاسی بیماریوں کا علاج تھی۔ جب انھیں معلوم ہوا کہ پنجاب اور الہ آباد کی یونیورسٹیوں میں مشرقی علوم کی درس گاہیں بنائی جارہی ہیں تو انھوں نے اس پر سخت اعتراضات کئے۔ ابتدائی اسکول قائم کرنے کے لیے مسلمان جو چندے کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ انھوں نے اُس کی سخت مذمت کی۔ سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لیے سیاسی تحریک کی انھوں نے مخالفت کی۔ اُن کا خیال تھا کہ اُنھیں حاصل کرنے کا بہتر ذریعہ اعلیٰ تعلیم ہے۔ چونکہ کالج کی کامیابی کا انحصار ایک طرف تو مسلمانوں کی خوشنودی اور تعاون حاصل کرنے پر تھا اور دوسری طرف حکومت کی حمایت اور امداد پر۔ اس لیے وہ سمجھتے تھے کہ ان دونوں چیزوں کو حاصل کرنے کے لیے انھیں ان باتوں سے بچنا چاہیے جو مسلمانوں یا حکومت کے لیے ناگواری کا باعث ہوں۔

کام بہت دشوار تھا۔ اُس زمانے میں مسلمان مذہبی اور سیاسی بنیادوں پر بٹے ہوئے تھے۔ رجعت پرست علما جن میں دیوبند کے اسکول کے رکن اور کلکتہ کے نواب عبدالطیف خاں، بھوپال کے نواب صدیق حسن خاں، حیدرآباد کے نواب رسول یار خاں اور صوبجات شمال مغربی و اودھ (اتر پردیش کے نواب) امداد علی خاں کی طرح کے عالم شامل تھے اُن کے جدید تصورات اور معقول تشریحات کے خلاف تھے اور انھیں اگر کافر نہیں تو دہریا ضرور سمجھتے تھے۔ اُن کے حامی جن میں سید امیر علی جو اپنے کو معتزلی کہتے تھے، نہایت با تدبیر سید مہدی علی (محسن الملک)، جنھوں نے بعد میں سبھی اسکیموں میں اُن کا ہاتھ بٹایا اور مولوی چراغ علی، جنھوں نے اپنی سلیم الطبع تحریروں سے اُن کی مدد کی اپنے لبرل خیالات کی وجہ سے عام مسلمانوں میں اتنے پسند نہیں کئے جاتے تھے جتنے علما اور اُن کے حلیف۔

مسلمانوں کو مطمئن کرنے کی خاطر سید احمد خاں نے 1878 میں اپنے تہذیب الاخلاق کی اشاعت روک دی اور اس طرح اُن کی ناراضگی کی ایک بڑی وجہ دور کر دی۔ انھوں نے جوش کے بجائے عقل سے کام لیا۔

سید احمد خاں اور سیاست

مذہب کے طور پر اسلام کی اصلاح ایک خطرناک کام تھا لیکن مسلمانوں کے اثر کی بحالی اور ہندوستان کے نئے حالات میں اُن کی نو آبادکاری ضروری تھی اور اس کے لیے کوشش کرنا اور مستحسن تھا۔ ماضی میں طاقت دولت حاصل کرنے کا ذریعہ تھی۔ موجودہ حالات میں تعلیم صلاحیت اور اہلیت پیدا کرنے کا ذریعہ تھی اور اہلیت سے عہدہ اور طاقت حاصل کی جاسکتی تھی۔

چنانچہ سید احمد خاں کے لیے معاشیات اور سیاسیات ایک دوسرے سے جڑی ہوئی اور ایک دوسرے کے تابع تھیں۔ انھیں معلوم تھا کہ من حیثیت الفرقہ مسلمان معاشی طور سے بہت گر گئے ہیں۔ اُن کے لیے ضروری تھا کہ وہ حکومت سے تعاون کریں اور اُس کی مدد سے اپنی معاشی حالت سنبھالیں۔ جو بات معاشی میدان میں صحیح تھی وہ سیاسی میدان میں بھی صحیح تھی۔ معاشی ترقی اور سیاسی حیثیت دونوں کا انحصار حکومت کی مہربانی پر تھا۔ یہ وجہ تھی کہ سید احمد خاں برطانوی حکمرانوں سے تعاون کرنا چاہتے تھے۔

انڈین نیشنل کانگریس کے وجود میں آنے سے پہلے سید احمد خاں اس بات کی بڑی وکالت کرتے تھے کہ تمام ہندوستانی اپنے منتخب نمائندوں کے ذریعے حکومت کی کونسلوں میں ڈسٹرکٹ اور لوکل بورڈوں کے انتظامات میں حصہ لیں۔ انھوں نے مسلمانوں کے لیے خصوصی مراعات کی مخالفت کی اور اُنھیں مشورہ دیا کہ وہ اپنے دست و بازو پر بھروسہ کریں۔ اپنے رسالے ''اسباب بغاوت ہند'' (1863) میں انھوں نے لکھا تھا ''بغاوت کی اصل وجہ تھی ہندوستانی لیجسلیٹیو کونسل میں شامل نہ کرنا۔ مجھے یقین ہے کہ اس بغاوت کی محض ایک بڑی وجہ تھی۔ بقیہ وجوہ ذیلی تھیں جیسے درخت میں نکلی ہوئی شاخیں۔ میری اس رائے کی بنیاد کوئی قیاس ہے نہ کوئی نظریہ۔ صدیوں سے بہت سے قابل اور ہوش مند لوگ اس خیال کی تصدیق کرتے رہے ہیں جو سب میں ظاہر کرنے والا ہوں۔

''میں سمجھتا ہوں کہ زیادہ تر لوگ اس خیال کے ہیں کہ خوشحالی کے لیے یہ ضروری ہے بلکہ اس کے استحکام کے لیے لازمی ہے کہ اس کی کونسلوں میں عام لوگوں کو شامل کیا جائے۔ صرف عام لوگ ہی حکومت کو یہ بتا سکتے ہیں کہ اس کے کاموں کا خیر مقدم کیا جائیگا یا نہیں۔ صرف عام لوگ ہی

غلطیوں کا ابتدا ہی میں ازالہ کر سکتے ہیں اور اس سے پہلے کہ ہم خطرات میں گھر جائیں اور تباہ ہو جائیں وہ ہمیں ان خطرات سے آگاہ کر سکتے ہیں۔"

انھوں نے مزید کہا "اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ مقامی لوگوں کو لیجسلیٹیو کونسلوں سے علیحدہ رکھا جائے اور یہ ہے تمام خرابیوں کی جڑ، یہ ہے اُن تمام دکھوں کی اصل وجہ جن کا سامنا ہندوستان کو کرنا پڑا...... میں یہاں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کی جاہل اور غیر تعلیم یافتہ قوموں کو لیجسلیٹیو کونسل کے مباحث میں حصہ لینے کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے یا یہ کہ انگریزی پارلیمنٹ کی طرح کی اسمبلی بنانے کے لیے اُن کا انتخاب کیسے کیا جائے۔ یہاں میں صرف اتنا ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ یہ طریقۂ عمل نہ صرف قرین مصلحت بلکہ انتہائی ضروری بھی ہے اور یہ کہ شورش کی وجہ اس طریقہ کار کو نظر انداز کرنا ہے۔"[1]

1866 میں جب انھوں نے برٹش انڈیا ایسوسی ایشن قائم کی تو انھوں نے ہندوستانیوں پر زور دیا کہ وہ لیجسلیٹیو کونسل میں اپنے مفادات کی مناسب نمائندگی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ انھوں نے ہندوستانیوں سے کہا کہ یہ بے وقوفی اور بزدلی ہوگی اگر وہ حکومت یا ضلع کے حکام کے ڈر سے مناسب نمائندگی کا مطالبہ نہ کریں۔ حالات کو بہتر بنانے کے لیے وہ ہندوؤں کے ساتھ تعاون کرنے کے حق میں تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ "اگر گاؤ کشی ختم کرنے سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دوستانہ تعلقات قائم کئے جاسکتے ہیں تو بہتر یہ ہے کہ آپ گائے کی قربانی نہ کیجیے"۔[2]

مشترکہ ہندوستانی قومیت کے سوال پر انھوں نے اپنے خیالات صاف صاف ظاہر کئے۔ پٹنہ میں 27 رجنوری 1883 کو جو تقریر کی تھی اُس میں انھوں نے کہا تھا "براہ کرم ایک بات کو یاد رکھئے کہ ہندو اور مسلم مذہبی اصطلاحیں ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے تمام باشندے چاہے وہ ہندو ہوں، مسلمان ہوں یا عیسائی ہوں اس ملک میں رہنے کی بنا پر ایک قوم ہیں...... وہ وقت لد گیا

---

[1] اہم مسلمان، جی۔ اے۔ ناتیسن، اینڈ کو، مدراس صفحات 98

[2] آخری مضامین، محولہ بالا، صفحہ 70

جب کسی ملک کے باشندے محض مذہب کی بنا پر دو قوموں کے افراد سمجھے جاتے تھے۔''[1]

گورداس پور میں 27 رجنوری 1884 کو تقریر کرتے ہوئے انھوں نے دونوں فرقوں کے اتحاد کے متعلق اپنے یقین کی تصدیق کی۔ انھوں نے لوگوں سے یوں خطاب کیا ''ہمیں (ہندوؤں اور مسلمانوں کو) اس امر کی کوشش کرنا چاہیے کہ ہم ایک جان دو قالب بن جائیں۔ اگر ہم میں اتحاد ہوگا تو ہم ایک دوسرے کی حمایت کر سکیں گے۔ اگر اتحاد نہیں ہوگا تو ہم ایک دوسرے کی مخالفت کریں گے جس کا نتیجہ ہوگا کہ دونوں کی بربادی اور زوال۔''

انھوں نے مزید کہا ''ہندو اور مسلمان بھائیوں'' کیا آپ ہندوستان کے علاوہ کسی اور ملک میں رہتے ہیں؟ کیا آپ ایک ہی ملک میں نہیں رہتے ہیں؟ کیا آپ اس زمین میں دفن نہیں ہوتے ہیں اور یہیں جلائے نہیں جاتے ہیں؟ کیا آپ ایک ہی سرزمین پر نہیں چلتے ہیں اور ایک ہی ملک میں نہیں رہتے ہیں؟ یہ بات یاد رکھئے کہ ہندو اور مسلمان کی اصطلاحات کا مقصد محض مذہبی امتیاز نہ کرنا ہے ورنہ تمام لوگ چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان بلکہ عیسائی تک جو اس ملک میں رہتے ہیں وہ سب اس اعتبار سے ایک ہی قوم سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس طرح یہ تمام مختلف فرقے ایک ہی قوم سے تعبیر کئے جاسکتے ہیں۔ ان سب کو ملک کی بھلائی کے لیے متحد ہونا چاہیے جو ہم سب کا ملک ہے۔[2]

III۔ سید احمد خاں اور علی گڑھ تحریک

لیکن 1885 کے بعد سید احمد خاں کا لبرلزم واضح طور سے کم ہونے لگا۔ بدقسمتی سے انھوں نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ سیاسی معاملات میں مذہب سے زیادہ احتیاط برتنی ضروری ہے۔ مذہبی معاملات میں اُنھیں مسلمانوں کے احساسات کا خیال کرنا تھا اور مذبذب عناصر کو اپنے ساتھ لانا تھا۔ سیاسی معاملات میں ضروری تھا کہ حکمرانوں کے غیر ہمدردانہ رویے کو ہمدردی اور حمایت میں تبدیل کیا جائے۔

---

[1] مجموعہ لیکچر ہائے سرسید (اردو) محولہ بالا، صفحات 121-117

[2] اہم مسلمان، محولہ بالا، صفحات 32-31

بڑی دشواری یہ تھی کہ سیاسی مقاصد کے اعتبار سے مسلمان بٹے ہوئے تھے۔ علما جن کے ساتھ مسلمانوں کی اکثریت تھی، برطانوی تہذیب اور حکومت سے متنفر تھے۔ اس کے علاوہ اسلامی دنیا میں جو حالات رونما ہو رہے تھے انھوں نے انھیں بہت پریشان کر رکھا تھا۔ 1878 میں عثمانی سلطنت کو روسیوں نے زک دی اور خلافت کو بہت سے علاقے اپنے وقار سے محروم ہونا پڑا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے لیے، جو ترکی کے سلطان کو اپنا خلیفہ تصور کرتے تھے، یہ نہایت توہین آمیز ضرب تھی۔ اُسی زمانے میں ایک اور مسلم ریاست یعنی مصر تیزی کے ساتھ اپنی آزادی کھو رہی تھی اور انگریزوں کے تابع ہوتی جا رہی تھی۔ خدیو کے تخت و تاج سے محرومی اور 1881 میں عربی پاشا کی شکست ایسے واقعات تھے جن کے دوررس اثرات پوری اسلامی دنیا پر پڑے۔

اس کے علاوہ برطانیہ عظمیٰ اور روس کی آپسی رقابت کے نتیجے میں جنگ افغانستان ہوئی، جنرل رابرٹس نے کابل پر قبضہ کر لیا اور افغانستان کو برطانیہ کے حلقہ اثر میں شامل کر لیا گیا۔ ایران میں خلیج فارس کے ساتھ ساتھ واقع جنوبی علاقے پر قریب قریب انگریز قابض ہو گئے تھے اور شمال میں روسیوں نے غلبہ حاصل کر لیا تھا۔

ان حالات کی بنا پر مشرق اور مغرب کی سامراجی طاقتوں اور خاص طور سے انگلستان کے خلاف غصے کے جذبات مسلم ممالک میں بھڑک اٹھے۔ اُن کو جمال الدین افغانی کی شخصیت میں ایک مبصر اور رہنما مل گیا جنھوں نے اپنے علم و فضل، زور خطابت، انتھک جوش اور بے لوث لگاؤ سے مسلمانوں کی تہذیبی اور سیاسی مدت کے خطرے سے لوگوں کو آگاہ کر دیا۔ وہ عین اسلامی تحریک کے پیش رو بن گئے۔

ہندوستان کے تمام مسلم حلقوں میں اُن کی تحریریں اور تقریریں بڑے شوق سے پڑھی جاتی تھیں اور جب وہ 80-1879 میں تیسری بار یہاں آئے تو ایک ہیرو کی طرح اُن کا خیر مقدم کیا گیا اور مسلم نوجوان مسیح کی طرح اُن کی پرستش کرنے لگے۔ ہندوستان میں اُن کے ایک سال کے قیام کے دوران سید احمد خاں کی مخالفت اور بڑھ گئی اس لیے کہ افغانی نے اُن کے مذہبی اور سیاسی تصورات پر سخت حملے کیے۔ انھوں نے سید احمد خاں کی تفسیر قرآن کو ایسی جاہلانہ اور عامیانہ تفسیر سے تعبیر کیا ''جس کا مقصد ہے مسلمانوں کے عقائد کو برباد کرنا، دوسروں کا مقصد پورا کرنا اور اُن کو

(مسلمانوں کو) اُن کا مذہب اختیار کرنے کی ترغیب دلانے کی سازش کرنا۔''[1]

جمال الدین افغانی سیاسی آزادی اور مساوات کے دلدادہ اور مغربی سامراج کے کٹر دشمن تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ایشیا کی قوموں کو آزاد کرائیں اور اُن کی گذشتہ شان وشوکت بحال کریں۔ اُن کی تقریروں سے اُس ہمدردی نے ایک واضح شکل اختیار کر لی جو مسلم ممالک کی بدحالی کی بنا پر ہندوستانی مسلمانوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ اُن میں اتحاد کا شعور پیدا ہونے لگا اور اُسی کے ساتھ عالم اسلام کے وسیع تر اتحاد کا جذبہ بھی شکل اختیار کرنے لگا۔ لیکن جمال الدین کے مقاصد سید احمد خاں کے سیاسی تصورات کے برعکس تھے جن کا اب یہ خیال تھا کہ ہندوستان کے لیے حکومت خود اختیاری بالکل ناممکن العمل ہے اور جو انگریزوں اور مسلمانوں کے اتحاد کی بات کرنے لگے تھے جس پر علی گڑھ تحریک کی بنیاد قائم تھی۔ اب وہ اس کو مسلمانوں کے تحفظ اور اتحاد کا واحد ذریعہ سمجھنے لگے تھے۔

چنانچہ سید احمد خاں کو بڑے مسائل کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ لیکن 1885 تک حالات پلٹا کھا کر اُن کے حق میں ہو گئے تھے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ انگریزوں کے ساتھ تعلقات بڑھانے کا موقع مسلمانوں کو مل گیا تھا۔ یورپ میں روس کے ہاتھوں ترکی کے ٹکڑے ہونے کا سلسلہ انگریزوں نے روک دیا تھا اور افغانستان کے متعلق اُن کی پالیسی سدھرنے لگی تھی۔ وسطی ایشیا کی طرف روس کی پیش قدمی کے خطرے نے برطانیہ عظمیٰ کو مجبور کر دیا تھا کہ مسلم ممالک کے ساتھ اپنے تعلقات میں زیادہ اختیارات سے کام لے۔ امیر عبدالرحمن خاں کا خیر مقدم کرنے کے لیے راولپنڈی کا دربار اس پالیسی کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

خود ہندوستان میں مسلمانوں کی طرف برطانیہ کا رویہ بدل گیا تھا۔ قدیم مخالفت مسلمانوں کے ساتھ دوستی بڑھانے کی پالیسی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ اس کے لیے کسی مخصوص تاریخ کا تعین کرنا مشکل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس پالیسی کی ابتدا ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر کی کتاب ہندوستانی مسلمان کی 1871 میں طباعت کے ساتھ ہوئی۔ اس نے حکومت کی توجہ مسلمانوں کی شکایتوں کی طرف مبذول کرائی یعنی ''غیر ہمدردانہ رویہ، کم ظرفی کا مظاہرہ، خیانت مجرمانہ اور ملک بھر میں

---

[1] مرتضیٰ درس چہاردہ، سید جمال الدین الافغانی، تہران، 1284 ہجری۔ 1964، صفحہ 121

پھیلی ہوئی عام خرابیاں'' [1] وہ مسلمانوں کا پہلا'' قابل اور کسی قدر جذبات کو برانگیختہ کرنے والا وکیل تھا۔'' تبدیلی کے دوسرے انگریز وکیل تھے کلکتہ مدرسہ کا سابق پرنسپل نسولیس، علی گڑھ کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے بیک اور مارلسن اور ڈبلیو۔ ایس۔ بلنٹ نے انھیں آواز اٹھانے پر اکسایا۔ اُس نے کہا'' میں نے اُن سے کہا کہ مسلمان اگر اپنی طاقت سے واقف ہوتے تو حکومت انھیں نظر انداز نہیں کرسکتی اور نہ اُن کے ساتھ براسلوک کرسکتی۔ انگلستان میں ہم مسلمانوں کی بغاوت کے تصور سے ہمیشہ ڈرتے رہتے تھے اور بیس ہندوؤں کے مقابلے میں ایک مسلمان کی بات پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔ لیکن اگر وہ ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھے رہے اور انگریزوں کی زیادتیوں کے لیے اپنی قسمت پر شاکر رہے تو انگلستان کے لوگ اُن کو اُن کی حالت پر چھوڑنے میں بڑی خوشی محسوس کریں گے۔'' [2]

انڈ ولف چرچل جو اس زمانے میں سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہندوستان تھا 1885 میں ہندوستان آیا اور یہ سمجھا گیا کہ مسلمانوں کی طرف حکومت کے جھکاؤ کے رجحان کی تصدیق کی۔ بہر حال 1888 تک یہ رجحان واضح ہو چکا تھا۔ سر آکلینڈ کولون نے ہیوم کو کانگریس کی سیاست کے خطرناک امکانات سے باخبر کر دیا تھا۔ [3]

ڈفرن خائف ہو گیا۔ مسلمانوں نے اُسے جو الوداعی اڈریس دیا تھا اُس کے جواب میں اُس نے مندرجہ ذیل الفاظ میں اُن کی تعریف کی'' آپ ان لوگوں کی اولاد ہیں جو پہلے ہندوستان میں ایک مناسب حیثیت کے مالک تھے۔ آپ خاص طور سے اُن ذمہ داریوں کو سمجھتے ہیں جو حکمرانوں پر ہوتی ہیں۔'' [4]

اس پالیسی کو فروغ دینے کے لیے لارڈ نارتھ بروک نے علی گڑھ میں وظیفوں کے لیے مبلغ 10000 روپے عطا کئے۔ جان اسٹریچی نے اپنے ہموطنوں سے سفارش کی کہ وہ فیاضی کے ساتھ

---

[1] اقتباس، لائل۔ اے۔ سی۔ محولہ بالا، صفحہ 233

[2] بلنٹ ڈبلیو۔ ایس۔، ہندوستان رپن کے دور حکومت میں، محولہ، صفحہ 233

[3] وڈ برن، ڈبلیو

[4] ڈفرن، Speaches, Delivered in India (1888-1884) صفحہ 204

کالج کی مدد کریں۔ 1882 کے ایجوکیشن کمیشن کے صدر ڈبلیو۔ڈبلیو۔ہنٹر نے کمیشن کا پہلا اجلاس علی گڑھ میں کر کے اس کی اہمیت کا اعتراف کیا اور تعلیم میں مسلمانوں کے خصوصی دعووں کو تسلیم کیا۔ الفریڈ لائل نے علی گڑھ کالج کے بانیوں کی تعریف کی اور اُن کے کام کو حکومت کی بڑی خدمت سے تعبیر کیا۔ آکلینڈ کولون نے یہ خیال ظاہر کیا کہ حکومت کے لیے جذبہ وفاداری پیدا کرنے میں کالج نے خصوصی رول ادا کیا۔

1883 میں البرٹ بل کے حق میں جو تحریک چلائی گئی اُس نے ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کو ہندوؤں کی طرف سے بدگمان کر دیا اور مسلمانوں کی طرف اُن کے رویے کو بدلنے میں مدد دی۔

ایک اور بات یہ ہوئی کہ اُس زمانے میں بدقسمتی سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی پیدا ہوگئی۔ اس کشیدگی کی وجوہ کئی تھیں۔ یعنی سماجی، سیاسی اور معاشی۔ اُن میں کچھ نے محض بالائی طبقوں کو متاثر کیا، کچھ نے عام لوگوں کو متاثر کیا اور کچھ نے دونوں کو۔ تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مفادات کا ٹکراؤ سرکاری ملازمتوں کی بنا پر ہوا۔ انیسویں صدی کے پہلے پچھتر برسوں میں ہندوؤں نے ملازمتیں حاصل کرنے کی دوڑ میں زیادہ مستعدی دکھائی اور برطانوی نظم ونسق میں زیادہ عملی حصہ لیا۔ اُن میں انگریزی تعلیم زیادہ پھیل گئی جب کہ مسلمان اُس سے دور رہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرکاری ملازمتیں اور آزاد پیشوں میں کامیابی بڑی حد تک ہندوؤں کا پیشہ بن گئی۔ اس کے علاوہ اخبارات زیادہ تر ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھے اور سیاسی تحریکات پر قریب قریب اُن کا اجارہ تھا۔ جیسا کہ حکومت ہند نے 1893 میں کہا تھا ''مسلمانوں پر سرکاری اور نجی روزگار کے دروازے قریب قریب بند تھے جس کی وجہ سے قدرتی طور سے ہندوؤں کے خلاف اُن میں تلخی پیدا ہوگئی جس کو یہ خیال زندہ رکھتا ہے کہ ماضی میں وہ صاحب اقتدار رہ چکے تھے۔''[1]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس منعقدہ، دسمبر 1885 نے سید احمد

---

[1] لارڈ لینس ڈاؤن کا مراسلہ سکریٹری آف اسٹیٹ برائے ہندوستان ارل آف کم نیری کے نام، مورخہ 27/دسمبر 1893 پیراگراف 7 محکمہ داخلہ۔ پبلک، نمبر 84-1893

خاں کو پریشان کردیا۔ اُن کے ذہن میں یہ خیال پرورش پانے لگا کہ اگر کانگریس اپنے مطالبات کی منظوری پر حکومت کو آمادہ کرسکی، جن میں سب سے اہم مطالبہ تھا کونسلوں میں ہندوستان کو نمائندگی دینا، تو مسلمانوں کا مستقبل تاریک ہوجائے گا۔ کانگریس کی مخالفت کرنے اور مسلمانوں کو اُس سے علیحدہ رہنے کا مشورہ دینے کی معقول وجوہ تھیں۔ اُن کا خیال تھا کہ ایک ایسے نظام میں جس میں راست انتخابات کئے جائیں مسلمانوں کے لیے جو اقلیت میں تھے، کونسلوں میں جگہ پانے کے امکانات کم تھے۔ انیسویں صدی میں یہ خوف بے بنیاد نہیں تھا۔ یوروپ میں نسلی، مذہبی اور لسانی اقلیتیں ہر جگہ اکثریتوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ اس کی وجہ وہ تحریکات وجود میں آئیں جن کا مقصد تھا اقلیتوں کو اُن کے بڑے گروپوں سے جوڑنا جو آس پاس کے ریاستوں میں پائے جاتے تھے اور اُن کا اکثریتوں سے علیحدہ کرنا تھا جن کے درمیان وہ رہتی تھیں۔ مثال کے طور پر اطالوی زبان بولنے والی اسٹرین ٹائی رول اور ترستے میں رہنے والی اقلیتیں اٹلی میں شامل ہونا چاہتی تھیں اور جرمنی بولنے والی سلوممالک کی اقلیتیں جرمنی میں۔ اس طرح نسلی اقلیتیں بھی تحریکات چلا رہی تھیں۔ اسٹرین اور ترکی سلطنتوں میں رہنے والے سلاو اس امر کی شدید خواہش رکھتے تھے کہ وہ روس کی عظیم سلولوگوں سے متحد ہوجائیں۔

لیکن موزوں ترین مثال تھی عثمانی سلطنت کی اس لیے کہ وہاں ایک مسلم سلطنت میں غیر مسلم خصوصاً آرمینی اور یونانی اقلیتیں آباد تھیں جن کو کچھ حقیقی اور کچھ فرضی شکایتیں تھیں اُن شکایتوں کو بہانہ بنا کر یورپ کی عیسائی طاقتیں اُن کے محافظ کے طور پر مداخلت کرتی تھیں۔

ہندوستان میں کچھ قدیم اشرافیہ خاندانوں کے مسلمان اس کے لیے تیار نہیں تھے کہ ایک ایسے ملک میں جس پر اُن کے ہم مذہب چھ سو سال تک حکومت کر چکے ہوں ہندوؤں کے ساتھ برابری کی حیثیت میں زندگی گزاریں۔ حکومت سے وہ خصوصی برتاؤ کا مطالبہ کرتے تھے اُس کی جزوی حکمرانی کی روایات کے وارثوں کے طور پر اُن کی سیاسی اہمیت تھی۔

عام لوگ زیادہ تر معاشی حالات سے متاثر ہوتے تھے۔ مثال کے طور پر ہندو اور مسلمان زمینداروں کے مفادات اُن کے کاشتکاروں سے ٹکراتے تھے۔ ہندو ساہوکار اور مسلمان قرض لینے والا ایک دوسرے کے مخالف تھے۔ اس معاشی مناقشے کو فنون اور دست کاریوں کے زوال نے زیادہ شدت دیدی جو اکثر مسلمانوں کے ہاتھوں میں تھے۔

IV فرقہ وارانہ سیاست

احیا پرستی کی تحریکات جو اُنیسویں صدی میں پھیلی انھوں نے باہمی شکوک و خطرات میں اضافہ کر دیا۔ دہلی کے شاہ ولی اللہ کے دبستان اور دیو بند میں اُن کے شاگردوں کے قائم کردہ اسکول نے اور سید احمد خاں کی اصلاحی تحریک نے مسلمانوں میں مذہبی جوش اور قدیم پاکیزگی کے خیالات کو بحال کر دیا۔ احیا پرستی کی تحریک نے اس بات پر زور دیا کہ مسلمانوں کے طریق عمل سے وہ عناصر نکال دیئے جائیں جو ہندوستانیوں کے ساتھ روابط کی بنا پر اُس میں داخل ہو گئے تھے۔ ہندوؤں میں کلکتہ کے رادھا کانت ایب کی ہندو سبھا برسرِ عمل تھی جو ہندو دھرم کو لبرل مصلحین اور عیسائی مشنریوں کے حملوں سے بچانے کے لیے قائم کی گئی تھی۔ اس کی کارروائیاں تیز تر ہو گئیں۔ بنکم چندر چٹرجی کی طرح کے ادیبوں نے اس کو پھیلانے اور تقویت پہنچانے کے لیے اپنے زوردار قلم استعمال کیے۔ سوامی دیانند سرسوتی نے 1875 میں بمبئی میں آریہ سماج کی بنیاد ڈالی لیکن جلد اُس کا شمار شمالی ہندوستان میں پھیل گیا۔ انھوں نے ہندوؤں کو ویدوں کی طرف آنے کی دعوت دی اور جو لوگ اپنا مذہب بدل چکے تھے انھیں دوبارہ ہندو مذہب میں داخل کرنے کی کوشش کی۔

انگریزی تعلیم کی وجہ سے مذہب کی طرف سے جو لاپرواہی برتی جانے لگی تھی اس کے ردِعمل کے طور پر ہندو دھرم کے عقائد اور رواجوں کے لیے احترام کا جذبہ پیدا کرنے کی بڑی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ یہ تحریک محض بالائی طبقوں تک محدود نہیں تھی۔ اس کا اثر بہت سی ایسی ذاتوں پر بھی پڑا جنھیں دوسروں سے کم تر سمجھا جاتا تھا۔ جوں جوں وہ ہندو فرقے میں ایک حیثیت حاصل کرتے گئے اتنے ہی ہندو دھرم کے کاموں میں وہ سخت تر ہوتے گئے۔ ہندو دھرم کے احیا نے ان کے دلوں میں ماضی اور ہندو روایات کے لیے جذبہ احترام پیدا کر دیا۔

چنانچہ دونوں فرقوں میں متوازی تحریکات چل رہی تھیں جن کے مقاصد مشترک تھے اور طریق عمل یکساں تھا۔ بدقسمتی سے لبرلزم اور رواداری کو تقویت پہنچانے کے لیے وہ آپس میں تعاون نہ کر سکے۔ اس کے بجائے وہ ایک دوسرے کو شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ان

تحریکات کی نوعیت ہی ایسی تھی کہ وہ منافرت واحتجاج پر زور دینے لگے اور انھوں نے جارحانہ شکل اختیار کرلی۔ دونوں اپنی بے گناہی پر مُصر تھے، دونوں اپنے کو دوسروں سے بالاتر سمجھتے تھے اور دونوں اپنے کو دوسرے سے بہتر تصور کرتے تھے۔ دونوں فرقے مادی خوشحالی کے تعلق سے اپنے مطلب کی بات کرتے تھے جس کو حکومت کے امتیازی رویے نے اور شہ دی، مطلب پرستی کے احساس نے پریشان کن صورت اختیار کرلی۔ چنانچہ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ مذہب کے احیا نے فرقہ وارانہ جذبات کو بڑھا دیا۔ خاص طور سے ایسی صورت میں جب کہ بے روزگاری کے شدید مسئلے کے حل کرنے کی کوئی امید ملک کے معاشی حالات سے نہیں تھی۔

ان حالات میں دور بینی اور اعتدال سے کام لینے کی ضرورت تھی۔ دونوں فرقوں کے مستقل مفادات یکساں تھے اور فوری ضرورتیں اور حاجتیں اُن دونوں کی سیاسی غلامی کے نتیجے تھے۔ لیکن دونوں نے اپنا اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے ایسی پالیسیاں اختیار کیں جنھوں نے اختلافات اور بڑھا دئے۔ ایک دوسرے کے خلاف اُن کی الزام تراشیوں نے اُن کا مقدر ایک تیسرے فریق کے ہاتھوں میں دے دیا جس نے اُن کے آپسی جھگڑوں سے دوہرا فائدہ اٹھایا۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت زیادہ مستحکم ہوگئی اور انگریزوں کو ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے ایک جواز مل گیا جس کی اُنھیں بڑی ضرورت تھی۔

ہندوؤں میں پیدا ہونے والی نئی بیداری نے پرانے عقائد و رسوم پر ایک دفعہ پھر زور دیا اور ہندوستانی تہذیب کو بدیسی عناصر سے پاک کرنے کے لیے ایک نیا جوش پیدا کردیا۔ اُن کارروائیوں میں جنھوں نے ہندو مسلم اختلافات بڑھائے مندرجہ ذیل تھیں (1) گئو رکشا (2) ہندی۔اردو کا جھگڑا (3) تیوہاروں اور متبرک دنوں پر مذہبی حقوق پر زور دینا خصوصاً اس صورت میں جب ہندو اور مسلم کیلنڈروں کی نوعیتوں کی بنا پر وہ ایک دن پڑتے تھے۔

آپسی تعلقات میں زیادہ تلخی پیدا کرنے کی ایک وجہ یہ تھی کہ انگریزوں سے پہلے ہندوستان میں کچھ مقامات پر ایک فرقے کو غلبہ حاصل تھا اور دوسرے مقامات پر دوسرا فرقہ طاقت رکھتا تھا جس کی وجہ سے کچھ توازن پیدا ہو گیا تھا۔ انگریزوں کی فتح کے بعد دونوں فرقے انگریزوں کے محکوم ہوگئے اور حالانکہ انگریزوں کے مقابلہ میں وہ دونوں کمتر حیثیتیں رکھتے تھے لیکن آپس میں

دونوں اپنے ماضی پر فخر کرتے تھے اور ایک دوسرے پر سبقت لے جانا چاہتے تھے، انگریزوں سے پہلے اگر حکمراں رواداری سے کام لیتا تھا تو وہ دونوں پر امن حالات میں رہتے تھے لیکن اگر حکمراں متعصب اور ظالم ہوتا تھا تو شاکی فریق کو اس کا موقع نہیں ہوتا تھا کہ وہ شکایت ظاہر کر سکے۔

گئو رکشا کا مسئلہ پہلی دفعہ پنجاب میں اٹھا جہاں سکھوں کی حکومت میں گاؤکشی سخت ممنوع تھی۔ اور اس جرم کی سزا موت تھی۔ الحاق کے بعد گاؤکشی کی ممانعت ختم کردی گئی۔ ہندو اور سکھ اس سے ناراض تھے لیکن مسلمان خوش تھے کہ اُن کا ایک حق تسلیم کرلیا گیا۔ جب آریہ سماج کا قیام عمل میں آیا تو گئو رکشا سوسائٹیاں تقریباً ہر صوبے میں کئی جگہ قائم ہوگئیں۔ سفری مبلغ ملک میں دورہ کرنے لگے، کانجی ہاؤس کھولے گئے اور گاؤکشی کے خلاف ایک تحریک شروع کی گئی۔ بہت سے ہندو راجوں اور زمینداروں نے اس تحریک کی مدد کی۔ سکھوں میں بھینی (لدھیانہ) کے نام دھاری اس میں پیش پیش تھے۔ مسلمانوں میں بھی کچھ اس تحریک سے ہمدردی رکھتے تھے۔ اتر پردیش میں انھوں نے گاؤکشی کی ممانعت کی تحریک کی حمایت کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ گئو رکشا کا مسئلہ محض ایک مذہبی مسئلہ نہیں تھا بلکہ زراعت کرنے والوں کے لیے اس کا معاشی جواز بھی تھا۔

لکھنؤ کے فرنگی محل کے مولانا عبدالحئیٔ نے، جو ہندوستان کے علما میں بڑی حیثیت رکھتے تھے، تین دوسرے عالموں کے ساتھ مل کر مندرجہ ذیل فتویٰ دیا جس سے یہ واضح ہوگیا کہ گائے کی قربانی ترک کرنا کوئی گناہ نہیں ہے اور اس سے قربانی میں کوئی خلل نہیں پڑتا ہے ''ہم مسلمانوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم دوسروں کو تکلیف دینے سے بچیں۔ اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ بداعمالی اور انسانوں کے ساتھ تشدد نامناسب ہے (مسلمانوں کو) اس کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ لوگ اس جرم کے مرتکب نہ ہوں۔ گاؤکشی اسلام کے احکام ہی میں شامل نہیں ہے چنانچہ اس مذموم عمل سے بچنا بہت مستحسن ہے۔''

اس فتویٰ پر دستخط کرنے والوں میں تھے (1) ابوالحسنات محمد عبدالحئیٔ، (2) محمد عبدالوہاب (3) ابوالحیا محمد عبدالحمید اور (4) قاضی سید محمد حسن۔ [1]

---

[1] نظامی، خواجہ حسن، تاریخ قربانی گاؤ، اگست 1925 صفحہ 27-26

بدقسمتی سے ایک طرف ضرورت سے زیادہ جوش تھا اور دوسری طرف احساس ناگواری جس کے نتیجے میں بدنما مظاہرے اور ٹکراؤ ہوئے۔ 1881 میں ملتان میں ایک فساد ہوا اور اُس کے بعد کئی برسوں تک ملک کے مختلف حصوں میں دنگے فساد ہوتے رہے۔ 1893 میں اتر پردیش، مدھیہ پردیش، بہار اور بمبئی میں فسادات ہوئے۔ حکومت اور مسلمانوں دونوں نے جان و مال کی بربادی کا ذمہ دار ہندوؤں کو ٹھہرایا۔ فسادات کی ذمہ داری سے قطع نظر دیکھنا یہ چاہیے کہ اُنھیں روکا جاسکتا تھا یا نہیں۔ یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے لیکن دفتر کے ایک نوٹ مورخہ 21/جولائی 1871 میں کہا گیا تھا۔

''مجھے لفٹننٹ گورنر اور دوسرے اعلیٰ حکام کی اس رائے سے بالکل اتفاق نہیں ہے کہ احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے تعلق سے پولیس اور مجسٹریٹ بری الذمہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مقصد یہ ظاہر کرتا ہے کہ کسی بات کی ذمہ داری کسی پر نہیں ہے۔ روہیل کھنڈ میں اس قسم کے فسادات کا مجھے بہت تجربہ ہے اس لیے میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ بات مہمل ہے کہ حکام کے پاس ایسے کوئی ذرائع نہیں تھے جن سے وہ خطرے کے متعلق باخبر ہوجاتے۔''[1]

لیکن فرقہ وارانہ اتحاد کے متعلق سید احمد خاں کی خواہش پر کاری ضرب ہندی اردو کے جھگڑے نے لگائی۔ سرکاری حلقوں میں بہت سے مسلمانوں کی طرف سے بدگمان تھے اور مسلم تہذیب کے مختلف پہلوؤں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انیسویں صدی کے اوائل میں فورٹ ولیم کالج میں ہندوستان کی جدید زبانوں مثلاً بنگالی، مراٹھی اور اردو کی نثر کو ترقی دینے کی کوششیں کی گئیں۔ چونکہ ان زبانوں میں شعری ادب بہت تھا اس لیے یہ کام آسان تھا۔ لیکن کالج کے ذمہ دار حضرات کو یہ محسوس ہوا کہ اردو، جو فارسی رسم الخط میں لکھی جاتی ہے لفظیات اور شعریات کی حد تک فارسی سے بہت متاثر ہے اور چونکہ وہ زیادہ تر قصبوں اور شہروں میں بولی جاتی ہے اس لیے اسے عام لوگوں کی زبان میں کہا جاسکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے نثر کے ایک ایسے اسلوب کو ترقی دینے کی کوشش کی جس میں فارسی کے عناصر شامل نہ ہوں۔ اس طرح، ہندی نثر

---

[1] اس پر دستخط ہیں۔'' جے۔ ایس (سرجان اسٹریچی) مورخہ 21/جولائی 1871 (ہوم ڈپارٹمنٹ پبلک A نمبر 47-145 مورخہ 5/اگست 1871)

معروض وجود میں آئی۔ اس ہندی میں کوئی شعری ادب نہیں تھا اور اس کی نثر اردو کا اسلوب تھی جس میں فارسی کے الفاظ کی جگہ سنسکرت کے الفاظ نے لے لی تھی۔ پہلے تو وہ کچھا کھڑی اکھڑی زبان تھی لیکن جلد ہی نثر اور نظم دونوں میں اظہار کا ذریعہ بن گئی اور اُس نے ادبی زبان کی شکل اختیار کر لی۔

1897 کے بعد ہندی کو ایک نیا محرک مل گیا۔ بہت سے برطانوی حکام اُس کی ترقی میں دلچسپی لینے لگے۔ انھوں نے اُس کی صرف نحو تیار کی اور ہندی کے ادیبوں کی ہمت افزائی کی۔ ایس۔ سی۔ بیلی نے حکومت کو مشورہ دیا کہ ''ہندی کو رفتہ رفتہ عدالتوں اور دفتروں میں استعمال کیا جانا چاہیے۔''

اس لیے کہ ''ناگری کے مقابلے میں فارسی حروف زیادہ آسانی کے ساتھ تبدیل کئے جا سکتے ہیں۔ اور اس لیے اس کی وجہ سے دستاویزات میں تحریف کے مواقع زیادہ ہوتے ہیں۔''[1]

بہار میں لفٹننٹ گورنر سر جارج کمپ بل (1874-1871) نے صوبے کی عدالتوں اور اسکولوں سے فارسی رسم الخط کو خارج کرنے کی کوشش کی۔ اُس کا کہنا تھا کہ بہاری ''مفلس، بے زباں اور کچلے ہوئے ہیں اور جب تک اُن کی زبان (یعنی ناگری یا کیتھی رسم الخط میں لکھی ہوئی ہندی) عدالتوں میں رائج نہیں کی جائے گی وہ عملے، پولیس، زمینداروں اور نیل باغوں کے مظالم کے شکار بنے رہیں گے۔''[2]

اس کو مسلمانوں نے ایک خطرناک کارروائی سمجھا اس لیے کہ عدالتوں کے عملے، پولیس اور زمینداروں اور نیل کے باغداروں کے کارکنوں میں زیادہ تر مسلمان تھے جو صرف اردو جانتے تھے۔ اُن کی روزی کا سوال تھا۔ 1867 میں حکومت کو ایک عرضداشت پیش کی گئی جس میں کہا گیا تھا کہ عدالتوں میں فارسی رسم الخط میں لکھی جانے والی اردو کی جگہ دیوناگری میں لکھی جانے والی ہندی رائج کی جائے۔ سید احمد خاں، جو اُس وقت ایک عدالتی حاکم کی حیثیت سے کام کر رہے تھے، اس سے بہت پریشان ہو گئے۔ اُن کے نزدیک یہ مطالبہ نہ صرف ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب کے منافی تھا جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ تھی بلکہ اُن عناصر کے وجود

---

[1] موسوم ڈپارٹمنٹ، تعلیمی روداد، نومبر 1875 نمبر 13-11

[2] بنگالی، 10/ مارچ 1877

سے انکار کے مترادف بھی تھا جو ہزاروں سال سے زیادہ کی مدت سے ہندوستان میں رہ رہے تھے اور اسے اپنا گھر سمجھتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی تنخواہیں پانے والے مسلمانوں پر مضر معاشی اثرات کے علاوہ اس نے خطرہ پیدا کردیا تھا کہ سماج اور تہذیب دو ناقابل مصالحت حصوں میں بٹ جائے۔

1872 میں صوبجات متوسط (مدھیہ پردیش) کے 9 اضلاع میں اردو کے بجائے ہندی عدالتوں کی زبان بنادی گئی جس سے فرقہ وارانہ کشیدگی میں اضافہ ہوگیا۔

چنانچہ 1885 سے پہلے ہی فرقہ وارانہ صورت حال خراب ہوگئی تھی۔ اس کے علاوہ مسلمانوں میں کچھ ایسے شدت پسند عناصر بھی تھے جو ہندوؤں سے مکمل علیحدگی اور برطانوی حکمرانوں سے قریبی تعلقات کی سفارش کرتے تھے۔ اُن میں اہم ترین شخصیت تھی سید امیر علی کی جنھوں نے 1877 میں نیشنل محمڈن ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی۔ اس ایسوسی ایشن کا مقصد تھا مسلم نوجوانوں کو سیاسی تربیت دینا جس سے انھیں اس وقت بھی دلچسپی تھی جب وہ انگلستان میں طالب علم تھے۔ اس وقت انھوں نے اس بات پر زور دیا تھا کہ مسلم نوجوانوں کو اگر ہندوؤں کے متوازی خطوط پر سیاسی تربیت نہ دی گئی تو وہ نئی قوم پرستی کے سیلاب میں ڈوب جائیں گے اُس وقت سید احمد خاں نے سید امیر علی کی رائے سے اتفاق نہیں کیا تھا۔

لیکن 1885 میں جب انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا تو سید احمد خاں کے تمام شکوک وخطرات سامنے آگئے۔ یہ ممکن ہے کہ اس خیال کو تقویت علی گڑھ کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے انگریز استادوں اور خاص طور سے تھیوڈ ہڑ بیک نے دی ہو جو 1886 کالج کا پرنسپل مقرر کیا گیا تھا۔ بیک نے سید احمد خاں کے خطرات کو ہوا دی اور کالج کے نوجوانوں میں ہندوؤں کے خلاف جذبہ نفرت اور برطانوی حکومت کے لیے جذبہ وفاداری پیدا کرنے کے لیے اپنی پوری قوت صرف کردی۔ علی گڑھ کالج کو خراج عقیدت ادا کرتے ہوئے اُس نے کہا تھا ''مادر درس گاہ کی آغوش میں پرورش اور کرکٹ اور فٹ بال کے میدانوں میں تربیت پانے والے طالب علم حکومت اور ہمارے ہر دلعزیز بادشاہ کی ایسی روداد کرنے کو تیار رہیں گے جس سے ثابت ہوجائے کہ ہندوستانی مسلمان سلطنت کی حفاظت کے لیے گولیوں اور سنگینوں کا مقابلہ کرنے کو آمادہ ہیں۔'' اُس نے سید احمد خاں سے درخواست کی کہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کی ادارت اُس کے

سپرد کردی جائے اور قومی تحریک اور اُس کے بنگالی حامیوں کی مخالفت کے لیے اُس کے کالم استعمال کیئے۔ آفیشلی سید احمد خاں اُس کے مدیر تھے، چنانچہ اُن مضامین کے لیے انھیں ذمہ دار قرار دیا جاتا تھا اور وہ بنگالی اخبارات کے حملوں کا نشانہ بن گئے تھے۔

1886 میں سید احمد خاں نے محمڈن (بعد میں مسلم) ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی جو حقیقت میں ایک سیاسی جماعت تھی اس کا مقصد تھا تمام شہروں اور قصبوں میں شاخیں قائم کرکے مسلمانوں کی تعظیم کرنا، مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتوں کا جائزہ لینا اور اُن کی زراعتی، تجارتی اور صنعتی ضرورتوں کے متعلق تحقیقات کرنا۔ اس کانفرنس نے مسلمانوں میں اتحاد کا جذبہ پیدا کرنے اور مسلم سماج میں ایک نیا شعور بیدار کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

1887 میں انھوں نے کانگریس کے خلاف سخت جدوجہد شروع کردی۔ انھوں نے تمام ہندوستانیوں اور خاص طور سے مسلمانوں کو اُس کی خطرناک کارروائیوں سے آگاہ کیا۔ لیکن اُن کی مخالفت محض سیاسی سطح پر تھی۔ ہندوؤں کے ساتھ اُن کے سماجی تعلقات پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ اُن کے رویے کو سمجھنے کے لیے یہ بتادینا ضروری ہے کہ سید احمد خاں ایک رکن اشرافیہ تھے اور وسطی فیوڈل طبقے کی روایات سے جڑے ہوئے تھے اور یہ کہ سیاسی معاملات میں اُن کا ذہن وسطی عہد کا ذہن تھا۔ مثال کے طور پر عہد وسطیٰ کے تمام لوگوں کی طرح وہ سمجھتے تھے کہ بنیادی چیز طاقت ہے نہ کہ دولت اور یہ کہ جنگ جو اور منتظم لوگ تاجروں اور دلالوں سے اہم تر ہیں۔ چنانچہ بالائی طبقے کے مسلمانوں کی حالت سدھارنے اور اُن کی نوآبادکاری پر پورا زور صرف کرتے تھے لیکن عام لوگوں کی خوشحالی کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ اُس کے خیال میں اصل مسئلہ تھا حکمرانوں کی خوشنودی اور ہمدردی حاصل کرنا جن کے ہاتھ میں سب کچھ تھا اور جن کی مخالفت کی بنا پر وہ سب کچھ برداشت کرنا پڑتا تھا جو 1857 میں سامنے آیا۔ اس حادثے کی یاد وہ کبھی فراموش نہیں کرسکے۔ چنانچہ اُن کے خیال میں حکمرانوں کی طرف وفاداری کی پالیسی مسلمانوں کے لیے بہترین پالیسی تھی۔ اُنھیں کبھی اس کا خیال نہیں آیا کہ ہندوستان کا اصل مسئلہ تھا یہاں کی بڑی اور بڑھتی ہوئی آبادی کی غربت وافلاس کا مسئلہ۔ یہ سمجھنا اُن کے لیے ممکن نہیں تھا کہ اس سماجی معاشی

بیداری کا علاج ایک بدیسی حکومت کے پاس نہیں تھا وہ چاہے کتنی ہی اہل، طاقت ور اور نیک نیت کیوں نہ ہو۔

لیکن ان تکلیف دہ حالات کا شکار وہ تنہا نہیں تھے۔ زیادہ تر زمیندار بھی اس خیال کے تھے۔ سید احمد خاں کی دلیل تھی کہ آزادی ایک خواب سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اس لیے برطانوی حکام بہت طاقت ور ہیں اور انھیں ملک سے ہٹانا ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ حکومت کی غلطیاں ظاہر کر کے اور اُس کے خلاف بے اطمینانی پھیلا کے اسے ناراض کرنا مناسب نہیں ہے۔ چنانچہ میک نے، جو سید احمد خاں کا رازدار اور مشیر تھا، بدرالدین طیب جی کے نام اپنے خط مورخہ 7 مئی 1888 میں اس کی وضاحت کر دی تھی۔

''نیشنل کانگریس کے متعلق ہمارا سب سے بڑا اعتراض دوسری خاص خاص تجاویز کے مقابلے میں زیادہ اساسی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس کا طریقہ کار یعنی عام جلسے کرنا، لوگوں کی تکلیفوں کو بیان کرنا اور اُس قسم کے پمفلٹ جاری کرنا جیسا کہ کانگریس کی رپورٹ کے آخر میں دیا ہوا ہے وغیرہ جلد یا بدیر ان صوبجات اور پنجاب کے لوگوں کو بغاوت پر آمادہ کر دیگا۔ اگر اس کے ساتھ سرحدی جنگ بھی شروع ہوگئی تو حالات تباہ کن صورت اختیار کریں گے۔'' اُس نے مزید لکھا۔

''پہلی بات تو یہ ہے کہ بالائی ہندوستان کے تمام مسلمان بہت غریب ہیں۔ اگر انھیں یقین دلا دیا گیا، جیسا کہ وہ کر رہے ہیں، کہ اس کی وجہ برطانوی حکومت ہے تو وہ بغاوت پر آمادہ ہو جائیں گے۔ وہ اپنی سابقہ شان وشوکت کی کمی کو بہت محسوس کرتے ہیں۔ دہلی اور آگرہ کی شاہی عمارتیں اُن کی بدحالی کی زندہ نشانیاں ہیں۔ دہلی کے بوڑھے لوگ اب بھی خاندان تیمور کے آخری شہنشاہ کو یاد کرتے ہیں۔ اس میں اُن کا مذہبی کٹر پن اور اضافہ کر دیتا ہے جو ابھی تک باقی ہے۔ اب بھی کبھی جہاد کا نعرہ سننے میں آتا ہے۔ پھر یہ بھی ہے کہ یہ لوگ واقعی بھڑک اٹھتے ہیں، اور جنگ کو پسند کرتے ہیں جیسا کہ ہم دہلی اور اٹاوہ میں دیکھ چکے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر اس قسم کی بے چینی پھیل گئی تو پورے شمالی ہندوستان میں ایک دن آگ لگ جائے گی۔ ذاتی طور سے مجھے یہ دو وجوہ کی بنا پر ناپسند ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں قتل ہونا نہیں چاہتا ہوں اور دوسری بات یہ ہے کہ وہ کام جس کے لیے میں نے اپنی زندگی وقف کر دی ہے تباہ ہو جائے گا اور مسلمان ایسے گریں

گے کہ پھر دوبارہ اُٹھ نہ سکیں گے چنانچہ ہمیں کسی قسم کی شورش پسند نہیں ہے۔[1]

ایک اور خط میں اُس نے ہندوستان کے مستقبل کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے جو سید احمد خاں کے خیالات بھی تھے ''ہندوستان میں ایک بات اہمیت رکھتی ہے اور وہ ہے حکومت کا استحکام۔ اس لیے کہ صرف اُس صورت میں ہر شخص رفتہ رفتہ تعلیم اور خوشحالی میں ترقی کی توقع کر سکتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ لوگ ملک کی حکومت میں حصہ لیں وہ حصہ نمائندگی کی بنیاد پر نہ لیا جائے جو میری رائے میں ہندوستان کے لیے موزوں نہیں ہے بلکہ دفتر شاہی میں بڑے بڑے عہدے حاصل کر کے لیا جائے۔''[2]

سید احمد خاں کو جو حمایت ملی اُس نے اُن کے خیالات میں بڑی استقامت پیدا کر دی۔ کانگریس کے تعلق سے سر آکلینڈ اکلون اور لارڈ دفرن بھی اُسی نتیجے پر پہنچے تھے جس پر سید احمد خاں پہنچے تھے۔ راجہ رام بال سنگھ کو چھوڑ کر اودھ کے زیادہ تر تعلقدار اُن کے ساتھ تھے۔ شمالی ہندوستان یعنی اتر پردیش، پنجاب اور سندھ کے اُس طبقے کے ہندو اور مسلم رہنماؤں میں بہت کم کانگریس میں شامل ہوئے تھے۔ حکومت نے شروع میں کچھ دلچسپی دکھائی تھی لیکن جلد ہی وہ غفلت برتنے لگی اور ہندوستان میں رہنے والے انگریز مجموعی اعتبار سے اس کے خلاف تھے۔

سید احمد خاں نے کانگریس کے مخالفین کو یونائیٹڈ انڈیا پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میں یکجا کرنے کی کوشش کی جس کا قیام 1888 میں عمل میں آیا تھا۔ لیکن یہ ایسوسی ایشن زیادہ دن تک باقی نہ رہ سکی۔ 1893 میں کئی مقامات پر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے جن میں بمبئی کا فساد بھی شامل تھا اور اُسی سال تلک نے پونا میں گن پتی کا تیوہار منانا شروع کیا۔ ان حالات سے فائدہ اٹھا کر بیک نے محمڈن ڈفینس ایسوسی ایشن قائم کی جس کے سکریٹری خود وہ اور سید احمد خاں مقرر کیے گئے۔ اپنے افتتاحی خطبے میں اُس نے پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی خامیوں کا ذکر کیا اور ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کی ضرورت پر زور دیا جو محض مسلمانوں پر مشتمل ہو۔ اُس نے کہا کہ کانگریس سے لڑنے

---

[1] دیکھیے نئی دہلی میں نیشنل آرکائیوز آف انڈیا میں طیب جی کے خطوط۔ اس کے علاوہ طیب جی حسین۔ بی بدرالدین طیب جی، سوانح عمری، تھیکر اینڈ کو، بمبئی، 1853 صفحہ 208

[2] ایضاً، صفحہ 209

کے لیے ایک سیاسی ادارہ ہونا چاہیے جس کا مقصد اس کی رائے میں ہندو جماعتوں اور ہندو احیا پسندوں کے ہاتھوں میں طاقت منتقل کرنا ہے جو اسلام کے وجود کے لیے ایک خطرہ ہیں۔ اس نے وضاحت کرتے ہوئے کہا ''اخبارات سیاسی مضامین سے بھرے ہوتے ہیں جس کی بنا پر ہمارے تعلیم یافتہ مسلم نوجوان مجوزہ کارروائیوں کی یا تو حمایت کریں گے یا مخالفت۔ میری رائے میں یہ غلط ہوگا کہ اُن کی رہنمائی نہ کی جائے اور انھیں اُن کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔[1]

1895 میں لندن کی مسلم ایسوسی ایشن سے خطاب کرتے ہوئے بیک نے کہا کہ ہندو۔مسلم اتحاد کا کوئی امکان نہیں ہے اور اس لیے حکومت کے کسی جمہوری نظام کا بھی کوئی امکان نہیں ہے اس لیے کہ اس قسم کے نظام میں مسلمان ہمیشہ کے لیے ہندو اکثریت کے غلام ہو جائیں گے۔ اُس نے انھیں مشورہ دیا کہ 1857 کی غلطی دوبارہ نہ کریں اور باغیانہ انڈین نیشنل کانگریس میں شامل نہ ہوں جس کی رہنمائی دادا بھائی نوروجی اور بنگالی سیاست داں کر رہے ہیں۔ اس لیے کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو وہ اپنے عہدوں، اپنی آزادی اور اپنی حیثیت سے محروم ہو جائیں گے۔

یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ سید احمد خاں نے بیک کے خیالات کو قبول کرلیا اور آخری دم تک کانگریس کی ہر تجویز کی مخالفت کرتے رہے۔عمر کے آخری پندرہ سال میں بیک کے زیر اثر اُن کی سرگرمیوں نے اتنی غیر متوقع شکل اختیار کرلی کہ اُن کے قریبی دوست بھی تعجب کرنے لگے۔ اُن میں سے کچھ نے اُن سے تعاون کرنا چھوڑ دیا۔ سمیع اللہ خاں اور اُن کے دوستوں نے کالج کی ٹرسٹی شپ سے استعفیٰ دے دیا جس کی جزوی وجہ یہ تھی کہ کالج کے معاملات میں بیک کا بڑھتا ہوا اثر۔ شبلی نعمانی کالج سے رٹائر ہو گئے اس لیے کہ سید احمد خاں کے سیاسی خیالات کے وہ سخت مخالف تھے۔ دوسرے ٹرسٹی اتنے پریشان ہو گئے تھے کہ وہ اخبارات میں مضامین لکھ کر ملت سے اپیل کرنا چاہتے تھے کہ وہ مداخلت کریں اور کالج کو بچائیں لیکن سید احمد خاں کی موت نے انھیں خاموش کر دیا۔ اُن کی زندگی کے آخری دن بہت بُرے گزرے۔ اُن کے گھر میں ایک حادثہ یہ ہوا کہ اُن کے بیٹے کا ذہنی توازن خراب ہو گیا، رقوم کے غبن کی بنا پر کالج میں دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اور عام حالات بھی بگڑ گئے مثلاً سر انتھنی میک ڈونل نے حکم دیا کہ عدالتوں میں ہندی استعمال

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 30/جنوری 1894

کی جاسکتی ہے۔ ان سب باتوں کا اُن پر بہت مضر اثر پڑا اور اُن کی صحت خراب ہوگئی۔

سید احمد خاں۔ کردار کا جائزہ

1898 میں یہ پروقار بزرگ انتقال فرماگئے۔ کسی بھی پیمانے سے ناپئے وہ ایک بڑے انسان تھے۔ اُن کے ایک عزیز دوست نے انھیں جو خراج عقیدت پیش کیا تھا اُس کا ذکر سی۔ ایف۔ انڈوز نے کیا ہے۔ وہ اُن کی عظمت کو پوری طرح وضاحت کرتا ہے۔ اُس نے کہا تھا ''سر سید احمد میں ایک شان، شیر کی سی طاقت، اعلیٰ تصورات اور ایک اعلیٰ ذہن کا شدید جوش مجھے نظر آیا۔ میرے ملاقاتیوں میں کسی مسلمان نے اپنے کردار کے وقار اور مضبوطی اور اپنی غالب ذہنی صلاحیت سے اتنا متاثر نہیں کیا جتنا سر سید احمد نے کیا۔ جہاں بھی جاتے تھے وہ قدرتی طور سے پیش پیش ہوجاتے تھے۔ اُن کی شخصیت اس کا مطالبہ کرتی تھی اور لوگ قدرتی طور سے اس پر عمل کرتے تھے۔ اُن کی شکل وصورت ہی ایسی تھی کہ وہ لوگوں کو متاثر کرلیتے تھے۔ وہ ایک پیدائشی رہنما تھے۔''[1] انھوں نے اپنی بہترین رہنمائی کی بنا پر مسلمانوں کو مایوسی کی دلدل سے نکالا۔ انھوں نے انھیں ناکارہ اور ظلمت پرست وتعلیم سے غیر معقول لگاؤ سے چھٹکارا دلایا اور جدید تعلیم کی طرف اُن کے ذہنوں کو موڑا جس کی بنا پر وہ اپنے ملک کے معاملات میں اپنا جائز حصہ لے سکے۔ انھوں نے حکمرانوں کے شکوک اور مخالفت کو اعتماد اور دوستی میں بدل دیا۔

اس کو بدقسمتی کے علاوہ کیا کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے مسلمان فرقے کو ملک پر فوقیت دی۔ اُن کے رویے کی صراحت شاید اس بات سے ہوسکے کہ اُن کے زمانے میں ایک چھوٹے سے دانش ور طبقے کو چھوڑ کر پورا ملک بحیثیت مجموعی عہد وسطیٰ کے انداز فکر کا شکار تھا۔ عام لوگوں پر چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان سب سے زیادہ اثر مذہب کا تھا۔ دونوں میں اس قسم کے لوگ موجود تھے جو ایک ایسے شاندار ماضی کا خواب دیکھا کرتے تھے جسے بدیسیوں نے ناپاک نہیں کیا تھا وہ دونوں اس ماضی کو دوبارہ لانا چاہتے تھے اور یہ نہیں سمجھتے تھے کہ تاریخ کے دھارے کو پلٹنا ممکن نہیں ہے۔ دونوں اس کو تسلیم کرتے تھے کہ سیزر (یعنی بادشاہ وقت) خدا کے مماثل ہے اور اُن

---

[1] انڈروز، سی۔ ایف۔ دہلی کے ذکاءاللہ، کیمبرج 1929 صفحہ 50-149

دونوں کی طرف سے انسان پر جو فرائض عائد ہوتے ہیں اُن میں امتیاز نہیں کیا جانا چاہیے۔ سماج کی ساخت ایک ہمیشہ رہنے والی غیر سرمایہ دارانہ زرعی معیشت پر قائم تھی۔ بہت سے لوگوں کے لیے زندگی دشوار، افلاس میں گھری ہوئی اور تکلیف دہ تھی اور بالائی طبقے کے افراد کے لیے روزگار حاصل کرنا مشکل تھا۔ دونوں فرقوں کے درمیان ایک دوسرے پر معاشی انحصار اور ساجھے داری کی عادتیں راسخ نہیں ہو پائی تھیں اور عام طور سے پیشہ ورانہ علیحدگی پائی جاتی تھی۔

سیاست کے میدان میں ہندوستانیوں کا علم اور تجربہ برطانوی فکر و عمل تک محدود تھا۔ برطانیہ ایک جمہوری اور ہم نوعی ملک تھا جہاں کوئی مستقل مذہبی، نسلی اور لسانی اقلیت نہیں تھی۔ اسکاٹلینڈ، آئرلینڈ، اور ویلس کے مسائل زیادہ اثر نہیں رکھتے تھے۔ برطانوی اکثریتیں اور اقلیتیں محض سیاسی تھیں اور ان میں ردوبدل ہوتی رہتی تھی۔ لیکن ہندوستان میں صورت حال مختلف تھی۔ بدقسمتی سے ہندو اکثریت نے اس بات کو پوری طرح نہیں سمجھا کہ قومی اتحاد اور جمہوری حکومت صرف اس صورت میں ممکن ہو سکتی ہے جب اقلیتوں میں یہ احساس پیدا ہو جائے کہ ان کا مذہب اور تہذیب محفوظ ہیں اور ان میں مداخلت نہیں کی جائے گی۔ اقلیتوں نے محسوس کیا کہ مستقبل میں مذہبی اکثریت ایک مستقل سیاسی اکثریت بن جائے گی اور جدید حکومتوں کے تجربے کے باوجود وہ یقین نہیں کر سکیں گے کہ ایک ایسے سماج میں ان کا مذہب اور تہذیب آزادی کی فضا میں سانس لے سکیں گی جہاں اکثریت کا تعلق کسی دوسرے مذہب سے ہو پچھلے زمانے کے اثرات مابعد ابھی زائل نہیں ہوئے تھے۔

اکثریت کے تصور کی بنیاد تھی لوگوں کی تعداد۔ وہ واحد اہم تعداد جس سے واقف تھے مردم شماری کے اندراجات کی تعداد تھی جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والوں کی تعداد علیحدہ علیحدہ دی جاتی تھی۔ یہ تعداد ایسا لگتا تھا کہ ہمیشہ کے لیے معین ہو گئی ہے۔

اس بات کا انھیں کوئی تجربہ نہیں تھا کہ سیاسی جماعتوں یا اُن گروہوں کے اعتبار سے تعداد کو دیکھیں جو مختلف سیاسی اور معاشی پروگراموں کی بنیادوں پر بنتے تھے اور موسموں کی طرح بدلتے رہتے تھے۔ اس بات کو سمجھنے کی اہلیت اُن میں کم ہی تھی کہ جدید حکومت کی اصل بنیاد مذہب کے بجائے مادی مفادات ہوتے ہیں۔

مذہبی اور سیاسی تعدادوں کے متعلق جو الجھن پیدا ہوگئی تھی باہمی سمجھوتا نہ ہوسکنے کی ذمہ داری اُس پر تھی اور ایک فرقہ دوسرے فرقہ کو موردالزمام ٹھہراتا تھا۔

سید احمد خاں نے بالائی طبقے کے مسلمانوں کے دلوں میں ایک نئی امید اور اعتماد پیدا کردیا اور اُن کی سیاسی رہنمائی کے لیے ایک مرکز قائم کردیا جہاں سے انھیں ہدایت مل سکے۔ حالانکہ انھوں نے جو تحریک شروع کی اس کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں نے علی گڑھ کی رہنمائی قبول کرلی اور اُن کے رقیب پس پا ہوگئے پھر بھی انھوں نے مسلمانوں کے سامنے جو منزل رکھی تھی وہ تنگ دلی اور کوتاہ بینی پر مبنی تھی جس کی وجہ سے فرقہ وارانہ سمجھوتے اور ہم آہنگی کا ضروری کام اور زیادہ مشکل ہوگیا۔

سید احمد خاں نے......اپنی زندگی کی ابتدا ایک سماجی اور مذہبی مصلح کی حیثیت سے کی تھی۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے تنزل کی وجہ مسلمان شرفا کا اخلاقی اور روحانی زوال ہے چنانچہ انھوں نے اسلام کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ چونکہ مسلمان توہم پرستی اور رسم پرستی کا شکار ہوگئے تھے۔ اس لیے انھوں نے اپنی اصلاح کی بنیاد عقل پر قائم کی انھیں خواب سے جگانے کے لیے یہ ضروری تھا کہ غیر معقول عقائد اور رواجوں کی مذمت کی جائے اور اندھی رسم پرستی ترک کردی جائے۔ پرانے اور ناکارہ تصورات کی گرفت سے ذہن کو آزاد کرنا ضروری تھا۔

اُن کا یہ خیال ٹھیک ہی تھا کہ مسلمانوں کے ذہنوں کو آزاد کرانے کا ذریعہ تھی جدید تعلیم اُس کی معقولیت پسندی اور سائنسی طریقہ۔ چنانچہ اس مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر انھوں نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور سائنٹیفک سوسائٹی قائم کی۔ لیکن جدید قسم کی تعلیم کی ضرورت صرف مسلمانوں کی ذہنیت بدلنے کے لیے نہیں تھی بلکہ اس کا ایک فوری اور عملی مقصد بھی تھا اور وہ تھا سرکاری ملازمتوں کے لیے مسلم نوجوانوں کو تربیت دینا۔

بدقسمتی سے پہلے مقصد کی شدت کے ساتھ مخالفت مسلمانوں کے رجعت پرست عناصر کی طرف سے ہوئی اور سید احمد خاں کو مجبوراً اپنا اعلیٰ مقصد یعنی اسلام کی عقلی تفسیر کی نشر و اشاعت ترک کردینی پڑی اور اپنے عملی مقاصد حاصل کرنے پر پورا زور صرف کرنا پڑا۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی طرف سے حکومت کی بدگمانی دور ہوجائے تا کہ بالائی طبقوں کے مسلمانوں کی معاشی

حالت سدھر سکے۔

علی گڑھ نئی شکل اختیار کرنے والے اسلام کا مرکز نہ بن سکا۔ اس نے کوئی غزالی، ولی اللہ جمال الدین یا رشید رضا پیدا نہیں کئے۔ کالج میں دی جانے والی مذہبی تعلیمات میں روایتی اسلام چھایا رہا۔ لیکن روایت اور مغربی سائنس، فلسفے اور ادبیات ایک دوسرے سے لگا نہیں کھاتے تھے۔ چنانچہ طالب علموں کا شعور دو حصوں میں بٹ گیا مذہبی عقائد اور عقل میں مفاہمت نہیں ہوسکی۔

مسلمانوں کے بنیادی امور کے متعلق تشویش نے علی گڑھ کو مجبور کر دیا کہ وہ حکومت کا سہارا لے اور کالج کو انگلستان کے تعلیمی اداروں کی شکل دے۔ لیکن انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے اپنے ماضی کو نظر انداز کر دیا۔ نہ صرف وہ اپنی تہذیبوں کے لیے اجنبی بن گئے بلکہ انھوں نے ایک دوسرے کی تہذیبوں کو بھی بھلا دیا جس کا اثر تباہ کن ہوا۔ حالانکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مغربی تعلیم کا عجیب وغریب اثر ہوا تھا۔ اس نے اُن میں شعوری یکسانیت اور جذباتی اختلاف پیدا کر دیا تھا۔

علیحدگی پسندی کے جذبے نے اُن کے درمیان ایسی خلیج پیدا کر دی جو پہلے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی تھی اور جس کو مغربی فکر کا مشترکہ علم بھی پاٹ نہ سکا۔

ہندوستان کے تعلیمی نظام نے دونوں فرقوں کے درمیان مفاہمت کو دشوار بنا دیا۔ ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے انگریزی پر زور دیا جاتا تھا اور ثانوی اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں علم کے مغربی شعبوں کو مضامین کی حیثیت سے پڑھا جاتا تھا جس کی وجہ سے دونوں کلاسیکی زبانوں یعنی سنسکرت اور عربی کی تعلیم حاصل کرنا مشکل ہوگیا تھا۔ اس کی وجہ سے اُن کے درمیان وہ رواداری نہیں پیدا ہوسکی جو ایک دوسرے کے بنیادی نظریات کو سمجھنے کے بعد پیدا ہوسکتی تھی۔ وہ ہندو اور مسلمان جنھوں نے مغربی نظام کے تحت تعلیم حاصل کی تھی وہ اپنے یا اپنے پڑوسیوں کے فلسفے، سائنسی اور ادبیات کے مقابلے مغربی فلسفے، سائنس یا ادبیات سے زیادہ واقفیت رکھتے تھے۔

V۔ سید احمد خاں کے بعد علی گڑھ تحریک

سید احمد خاں کے انتقال کے بعد اقتدار محسن الملک کے ہاتھ میں آ گیا۔ لیکن ہندی اور اردو کے سوال پر شمال مغربی صوبجات کا لفٹنٹ گورنر انٹنی میکڈانلڈ، اُن سے ناراض ہو گیا جس کے نتیجے میں علی گڑھ کی سیاسی سرگرمیاں معرض التوا میں پڑ گئیں۔ یہ صورت حال تقسیم بنگال تک جاری رہی جس نے ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔

اپنی مدت کار میں بیک کے جانشین تھیوڈور ماریسن نے علی گڑھ تحریک کی رہنمائی کی۔ اُس نے مسلمانوں کو ہر قسم کی سیاسی تحریکات سے علیحدہ رکھنے پر اپنا پورا زور صرف کر دیا۔ اس نے مسلمانوں سے کہا ''وقت آ گیا ہے کہ بالائی طبقوں کو جن کے ساتھ خاص طور سے اچھا برتاؤ کیا گیا ہے، یہ دکھانا چاہیے کہ وہ احسان فراموش نہیں ہیں۔'' اس نے دھمکی بھی دی ''اگر مسلمانوں کے رہنماؤں کے رویے نے (غیر وفاداری کی) تہمت کو صحیح ثابت کر دیا تو اس میں کسی کو تعجب نہیں ہوگا اگر حکومت اُن کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ ختم کر دے اور انگریزوں کی طرف اُن کے حالیہ دوستانہ رویے، ہندوؤں کے ساتھ اُن کی مخالفت اور اپنے مفادات کو پورا کرنے کے رجحان پر یقین نہ کرے۔''[1]

اُس کے رہنماؤں کے مطابق علی گڑھ تحریک کے دو مقصد تھے ایک مذہبی اور دوسرا سیاسی۔ مذہبی معاملات میں سید احمد خاں ایک لبرل قوم پرست تھے۔ سیاست میں وہ وسیع النظری کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ وہ آزاد ہند میں مسلمانوں کی منزل کا تصور نہ کر سکے اور اس لیے مستقبل کے تعلق سے وہ صرف حکام کی مہربانیوں اور حکمرانوں کے ساتھ وفاداری کی حد تک سوچ سکے۔ اُن کے پیروؤں میں کچھ جید عالم اور کچھ تعلیم یافتہ سیاست داں شامل تھے۔ اول الذکر میں اہم تھے چراغ علی، نذیر احمد، ذکا اللہ اور الطاف حسین حالی اور آخر الذکر میں محسن الملک اور وقار الملک جو دونوں حیدر آباد سے رٹائر ہونے والے حاکم تھے۔

---

[1] علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، 9/اکتوبر 1897

سید امیر علی

سید احمد خاں کے حلقے کے باہر لیکن مسلمانوں کے حالات سے اُتنی ہی دلچسپی رکھنے والے تھے کلکتہ کے سید امیر علی۔ وہ اپنے کو معتزلہ سمجھتے تھے اور ہندوستان اور ہندوستان کے باہر کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے ذہنوں کو بنانے میں اُن کا جو حصہ ہے وہ سید احمد خاں کے تمام پیروؤں کی مجموعی کوششوں سے زیادہ ہے۔ لیکن سیاست میں وہ علی گڑھ تحریک کے کسی دوسرے رہنما سے زیادہ فرقہ پرست اور علیحدگی پسند تھے۔ وہ سیاسی اتحاد اور ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ شہریت کے تصور کے شدید مخالف تھے۔ انھوں نے لکھا تھا ''صرف وہ لوگ مشترکہ شہریت کی بات کرتے ہیں جو حالات سے ناواقف ہیں اور صورت حال کو سمجھنے کی اہلیت نہیں رکھتے ہیں۔ کم تعداد والوں کو زیادہ تعداد والوں کے کیمپ میں داخل کرنے کی کوشش کا نتیجہ فتنہ وفساد کی شکل میں سامنے آئے گا......کیا آپ سمجھتے ہیں کہ انھیں مشترک انتخابات میں حصہ لینے پر مجبور کر کے وہ مقصد حاصل کیا جاسکتا ہے۔'' [1] انھوں نے محض مسلمانوں کے مفاد میں ایک فرقہ وارانہ تحریک شروع کرنے کی اپنی اسکیم کے لیے سید احمد خاں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن انھوں نے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اُس کے بعد مسلمانوں میں احساس ذمہ داری پیدا کرنے کی خاطر انھوں نے 1877 میں سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن قائم کی۔ 1902 میں انھوں نے اسپرٹ آف اسلام شائع کی جس میں اسلام کو ایک ترقی پسند، معقول اور جمہوری مذہب ثابت کیا گیا ہے انھوں نے اے کریٹکل اگزامنیشن آف دی لائف اینڈ ٹیچنگس آف محمد، اے ہینڈ بک آف محمڈن لا، اے شارٹ ہسٹری آف سیراسنس، دی اتھیکس آف اسلام پرسنل لا آف محمڈنز وغیرہ کے علاوہ کئی مضامین بھی لکھے جن میں مسلمان نوجوانوں کی توجہ اُن کی شاندار میراث کی طرف مبذول کرائی گئی ہے اور مغرب میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

وہ اسلام کے مافوق اور معجزاتی عناصر کے اظہار سے بچتے تھے اور یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ مقدس قوانین بیسویں صدی کے تصورات سے مطابقت رکھتے ہیں۔ چاروں اماموں نے قدیم قانون کے متعلق جو فیصلے دیے تھے انھوں نے اُن فیصلوں کو ناقابل ترمیم ماننے سے انکار کر دیا۔

---

[1] سید امیر علی کی یادداشتیں، اسلامک کلچر، جلد VI صفحہ 339، 1932

اُن کا خیال تھا شریعت کی قراردادوں میں جدید ضروریات کی روشنی میں ترمیم کی جاسکتی ہے اور ذاتی فیصلے کے حق کی وہ تصدیق کرتے تھے۔

رٹائر ہونے کے بعد امیر علی نے انگلستان میں بود و باش اختیار کی تا کہ اخبارات اور ذاتی بیانات کے ذریعے وہ اپنے خیالات کی نشر و اشاعت برطانوی کنزرویٹو لوگوں میں کرسکیں۔ 1910 میں انھوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کی ایک شاخ لندن میں کھولی۔

VI علما اور دیو بند تحریک

سید احمد خاں کے خیالات سے اختلاف مسلمانوں کے دو فرقوں نے کیا یعنی علما نے، جو قدیم علوم کے نام لیوا تھے، اور قوم پرست مسلمانوں نے مسلمانوں کی سیاست میں سید احمد خاں کو دلچسپی 1857 کی بغاوت کے بعد پیدا ہوئی مگر علما اُس میں دلچسپی بہت پہلے سے لے رہے تھے۔ مغل سلطنت کا زوال اور اس کی جگہ برطانوی سلطنت کا قیام اُن کے لیے ایک کاری ضرب کا حکم رکھتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اسلام کی عمارت دو ستونوں پر قائم ہے یعنی ایمان اور طاقت۔ آخر الذکر ستون گر چکا تھا۔ اب سوال یہ تھا کہ ریاست کی حمایت کے بغیر کیا ایمان کی عمارت سلامت رہ سکے گی۔

علما کا جواب یہ تھا کہ وہ ایک دفعہ پھر مسلمانوں کی سیاسی طاقت بحال کرسکیں گے۔ چنانچہ دہلی کے شاہ ولی اللہ نے دو کاموں کا بیڑا اٹھایا۔ پہلا تو تھا زندگی کے اخلاقی چشموں کو پاک کرنا، قانون ادعایت سے پیچھا چھڑانا اور مسلمانوں کو قرآن کی اصل تعلیمات اور رسول کی روشن مثال کی طرف لانا۔ دوسرے مرحلے میں انھوں نے اُس عملی مسئلے کا حل دریافت کرنے کی کوشش کی جو برطانوی فتح نے پیدا کر دیا تھا۔ لیکن اُن کے بیٹے شاہ عبدالعزیز نے دہلی کو فتح کرنے کے بعد 1803 میں فتویٰ دیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے۔ اس فتوے کے بعد ہر مسلمان کا فرض ہوگیا کہ یا تو وہ عیسائی فاتحین کے خلاف جہاد کرے یا ہندوستان سے کسی اسلامی ملک کو ہجرت کر جائے۔

بریلی کے سید احمد نے تحریک کی قیادت سنبھالی اور عبدالعزیز کے رشتہ داروں اور طالب علموں نے ان کا ساتھ دیا۔ یہ بہادر مجاہدین، جنھیں انگریزوں نے وہابیوں کے غلط نام سے

منسوب کیا تھا، شمال مغربی سرحد کی دشوار گزار پہاڑیوں میں لڑتے اور 1814 تک حکومت سے ٹکر لیتے رہے۔

1857 میں اُن میں سے کچھ نے انگریزوں کے خلاف بغاوت میں حصہ لیا لیکن بغاوت کی ناکامی کے بعد اُنھیں ایک دفعہ پھر اُس سوال کا سامنا کرنا پڑا جس سے پہلے شاہ ولی اللہ دوچار ہو چکے تھے۔ لیکن 1857 کی بغاوت کی ناکامی کے بعد انیسویں صدی کے وسط میں جہاد کے ذریعے اس مسئلے کو حل کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

علما کا ایک گروہ، جس نے بغاوت میں عملی حصہ لیا تھا اور انگریزوں کے خلاف ایک تحریک شروع کر دی تھی جس کا مرکز اتر پردیش کے مظفر نگر ضلع میں واقع شاملی میں تھا۔ حکومت کے جبر و ظلم سے کسی طرح محفوظ رہا اور سہارن پور کے ضلع میں دیوبند کے مقام پر انھوں نے ایک اسکول قائم کیا جس کا مقصد تھا مسلمانوں کے لیے مذہبی رہنما تیار کرنا۔ اُن میں اہم تھے محمد قاسم نانوتوی (1837۔1880) اور رشید احمد گنگوہی (1828۔1905) یہ دونوں عماد اللہ کے پیرو تھے جو 1857 میں مکہ کو ہجرت کر گئے تھے۔

دیوبند کا اسکول 1867 میں قائم ہوا جس کے مقاصد مندرجہ ذیل تھے

1۔ بغیر کسی لالچ، سرپرستی، دباؤ یا مہربانی کے کلام اللہ کی اشاعت کرنا۔
2۔ مسلمانوں کے ساتھ روابط بڑھانا تاکہ صحیح اسلامی اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے اُن کی تنظیم کی جائے۔
3۔ حکومت یا طبقہ اشرافیہ کے ساتھ کسی قسم کے تعاون کو اسکول کے مفاد کے لیے مضر تصور کرنا۔
4۔ شاہ ولی اللہ کی تعلیمات پر سختی اور ثابت قدمی کے ساتھ عمل کرنا۔
5۔ امیرانہ شان اور مطلق العنانیت سے دامن بچائے رکھنا اور ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور آپسی صلاح مشورے سے کام کرنا تاکہ انتظام کے جمہوری طریقوں کی مثال پیش کی جاسکے۔

اس اسکول میں تعلیم کے لیے درس نظامی کا انتخاب کیا گیا جس میں قدیم سائنسوں پر زور دیا گیا ہے۔ نصاب تعلیم، مالیات اور انتظامی امور کی حد تک اسکول بالکل آزاد تھا اور وہاں کے

فارغ التحصیل طلبا کے لیے حکومت کے محکموں میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ یہ غریبوں کا اسکول تھا اور اس کے اساتذہ اور طلبا بہت جز رسی کے ساتھ سخت محنت کی زندگی گزارتے تھے۔ وہ اپنے ایمان کو روشن رکھنا چاہتے تھے اور دنیاوی کامیابی کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ انگریزی تعلیم، مغربی تہذیب اور مشرق کے ملکوں پر مغرب کا غلبہ اُن کے لیے نفرت انگیز تھا اور وہ مسلمانوں کی اخلاقی اور مذہبی حیاتِ نو کے لیے ایشیا کے ملکوں کو آزاد کرانا چاہتے تھے۔

حالانکہ اسکول کی فوری ضرورت تو تھی تعلیم اور کردار کے مسائل لیکن ''سماج اور ریاست'' کے سوال بھی ان کے لیے اتنی ہی اہمیت رکھتے تھے جتنے فرد کے ''ایمان و عمل'' کے سوال۔ ہندوستان اور دنیائے اسلام میں رونما ہونے والے واقعات قدرتی طور سے اُن کی توجہ کا مرکز بن جاتے تھے۔ 60-1859 کے نیل کے فسادات، 1876 کے دکن فسادات، قحط اور کسانوں اور دیہات کے دست کاروں کی بگڑتی ہوئی حالت نے انھیں راست متاثر کیا۔ بنگال میں شروع ہونے والی اُس سیاسی تحریک نے جو پورے ہندوستان میں پھیل گئی تھی اور خاص طور سے 1883 میں البرٹ بل کی وجہ سے شروع ہونے والی تحریک نے بڑے پیمانے پر انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ ہندوستان میں بے چینی بڑھ رہی تھی۔

اسی کے ساتھ دوسرے ملکوں میں جو حالات رونما ہو رہے تھے اُن کی وجہ سے پوری دنیا کے مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہو گئی تھی۔ مصر، ترکی، مغربی ایشیا، شمالی افریقہ اور ایران میں مغربی سامراج کی توسیع کے اثرات ہندوستان پر پڑے۔ سید جمال الدین افغانی کے آمد نے مسلم مذہبی تعلیمی اداروں کے نوجوان طالب علموں میں جوش پیدا کر دیا تھا۔ ایشیا کو مغربی تہذیب کے غلبے اور سیاسی اقتدار سے آزاد کرانے کے لیے انھوں نے جو آواز اٹھائی تھی اس کی گونج بہت سے دلوں میں سنی جا سکتی تھی۔

دیوبند اسکول جلال الدین افغانی کے خیالات سے متفق تھا۔ چنانچہ 1885 میں جب سیاسی مقاصد کے لیے ہندوستانیوں کو متحد کرنے کی خاطر انڈین نیشنل کانگریس قائم کی گئی تو اسی اسکول نے اس کی حمایت کی۔ رشید احمد گنگوہی نے، جو محمد قاسم کے بعد اس ادارے کے سربراہ مقرر ہوئے تھے، اسکول کے رویے کی وضاحت کی۔ انھوں نے کہا کہ شاہ عبدالعزیز کے فتویٰ کے مطابق

ہندوستان دارالحرب ہے اور اس لیے ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ انگریزوں کو ملک سے نکال دے۔

ہندوؤں کے ساتھ تعاون کرنے کے سوال پر رشید احمد گنگوہی نے کہا کہ دنیاوی اُمور میں قومی مقصد حاصل کرنے کی غرض سے شریعت نے اجازت دی ہے کہ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ معاہدہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ کانگریس کی سرگرمیوں میں تعاون کریں حالانکہ وہ خود کانگریس میں شامل نہیں ہوئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس زمانے کی کانگریس کے برعکس وہ مکمل آزادی میں یقین رکھتے تھے۔ دیوبند اسکول کے عالم سربراہ نے صاف لفظوں میں کہا کہ تمام مذہبی گروہوں کے اتحاد کی بنیاد پر قائم قومیت کا تصور کسی اسلامی اصول کے منافی نہیں ہے۔

اس فیصلے نے دیوبند اور علی گڑھ کے درمیان خلیج پیدا کردی۔ 1881 میں عربی پاشا کی بغاوت کے تعلق سے سید احمد خاں نے انگریزوں کی موافقت کا رویہ اختیار کیا، جمال الدین افغانی نے سید احمد خاں کے مذہبی اور سیاسی تصورات کی مذمت کی اور آخر میں یہ ہوا کہ 1897 کی ترکی۔ یونان جنگ میں سید احمد خاں نے ترکوں کے خلاف مغربی طاقتوں کی حمایت کی۔ ان سب باتوں سے ہندوستان میں مسلم فکر کے دو بڑے مرکزوں کے درمیان خلیج بڑھ گئی۔ محسن الملک کی کوشش کے باوجود اُن دونوں کو قریب لانا ممکن نہ ہوسکا۔ چنانچہ شدید فرقہ وارانہ منافرت کے زمانے میں بھی دیوبندی علما قومی اتحاد اور ہندوستان کی آزادی کی برابر حمایت کرتے رہے۔

شبلی نعمانی

دیوبند کے اسکول کے حامیوں میں شبلی نعمانی (1857۔1714) شامل تھے جو فارسی اور عربی کے جید عالم تھے۔ اردو میں جنھوں نے بہت سا شعری اور نثری ادب تخلیق کیا۔ سید احمد خاں کی دعوت پر 1883 میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے اساتذہ میں شامل ہو گئے اور حالانکہ وہ 1898 تک جس سال سید احمد خاں کا انتقال ہوا، وہاں کام کرتے رہے لیکن بہت پہلے سید احمد خاں سے اُن کے اختلافات ہو گئے تھے۔ وہ سید احمد خاں کے مذہبی نظریات اور اُن کی سیاست سے متفق نہیں تھے۔ وہ امام ابوحنیفہ کے کٹر پیرو تھے اور چاروں دبستان فقہ کی طرف سید کے غیر مقلد رویے کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے ابتدا تو کی ماتوریدی کے پیرو کی حیثیت سے، اس کے

بعد وہ غزالی اور رازی کے زیر اثر آگئے اور آخر میں ابن تیمیہ کی پیروی اختیار کی۔ اس لیے انھوں نے سید احمد خاں کی معقولیت پسندی کو رد کر دیا۔

تعلیم کے سوال پر شبلی کا موقف دیوبند کے اسکول اور سید احمد خاں کے اسکول کے بین بین نہیں تھا۔ وہ اس بات کے حق میں تھے کہ قدیم اسلامی نظام تعلیم میں سے زبانی اور رسمی درس و تدریس کا سلسلہ ختم کر کے وہ انگریزی زبان اور یورپین سائنس شامل کر کے اس کی اصلاح کی جائے۔ انھوں نے لکھنؤ میں 1894 اور 1896 میں ندوۃ العلما اور دار العلوم کی بنیاد ڈالی جہاں انھوں نے اپنے تعلیمی تصورات کو عملی شکل دینے کی کوشش کی۔ پہلے روایت پرست علما نے ان کی بڑی مخالفت کی لیکن بالآخر وہ انھیں اس امر کا یقین دلانے میں کامیاب ہو گئے کہ پرانے نصاب کو تبدیل کرنا اور انگریزی کو رواج دینا مفید ہے۔

سیاسی امور کے تعلق سے اُن کا خیال تھا کہ اسلام ایک لبرل مذہب ہے جو ترقی اور تہذیب کو فروغ دیتا ہے۔ وہ انسان کی عظمت کا قائل ہے۔ انسانی مساوات پر زور دیتا ہے، عورتوں کے حقوق کا محافظ ہے اور حکومت کے جمہوری طریقوں کو پسند کرتا ہے۔ وہ رواداری کی تعلیم دیتا ہے اور مذہب کے تحفظ کے علاوہ کسی اور صورت میں جنگ کو جائز نہیں قرار دیتا ہے۔ اس میں بالجبر تبلیغ مذہب کی ممانعت کی گئی ہے۔ اسلام زندگی کو دنیاوی اور دائمی شعبوں میں تقسیم نہیں کرتا ہے اور تیاگ اور رہبانیت کے خلاف ہے۔

شبلی جمہوریت پسند تھے۔ سامراج کے مخالف تھے اور بین اسلامیت کے قائل تھے۔ یہ قدرتی امر تھا کہ وہ سید احمد خاں سے متفق نہیں تھے۔ ہندوستان کے مسائل پر اُن کے خیالات مختلف تھے جس کی بنا پر باہمی اختلافات اور بڑھ گئے۔ انگریزوں کے لیے سید احمد خاں کی وفاداری اور کانگریس کی مخالفت کو ناپسند کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ کالج کے انگریز اساتذہ کے وہ بہت زیر اثر ہیں۔ شبلی کے شاگرد اور سوانح نگار سید سلیمان ندوی نے کہا ہے۔

''انگریز پروفیسروں نے سرسید کو یقین دلا دیا تھا کہ کانگریس کی مخالفت اور انگریزوں سے دوستی کالج اور مسلمانوں کے مفاد میں ہے۔ اُن کے جادو نے سرسید کو اتنا مسحور کر دیا تھا کہ وہ اپنی رائے سے دست بردار ہو گئے اور ہر چیز کو مسٹر بیک اور دوسرے انگریز استادوں کی آنکھوں سے

دیکھنے لگے اور ہر بات اُن کے کانوں سے سننے لگے۔"[1]

اُس کے اعلیٰ نصب العین اور ہندوستانیوں کی بھلائی اور ترقی کے لیے اُس کی کوششوں کی بنا پر شبلی کانگریس کے مداح تھے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا شبلی کا خیال تھا کہ ایک اقلیت کے طور پر اُن کی دو حیثیتیں ہیں۔ اُن کے پاس ایک ممتاز نمایاں مذہب اور تہذیب ہے، ہندوستان کی تاریخ میں اُن کا حصہ شاندار ہے اور مذہب کے اعتبار سے وہ عالمی سماج سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ مسلمان ہندوستان کے شہری ہیں اور اپنے وطن کے وفادار ہیں۔ دوسرے تمام فرقوں کے ساتھ وہ بھی اُن تکلیفوں کے شکار ہیں جو برطانوی حکومت کی پیدا کردہ ہیں اور ہندوستان کے مستقبل کے متعلق وہ بھی وہی توقعات رکھتے ہیں جو دوسرے لوگ رکھتے ہیں۔ وہ جانتے تھے کہ عہد وسطیٰ کی مسلم حکمرانی کو بحال کرنا ممکن نہیں ہے لیکن انھیں یقین تھا کہ ہندوؤں کے ساتھ مل کر مسلمان ایک ایسی ریاست قائم کر سکتے ہیں جس میں دونوں عزت و آرام کی زندگی گزار سکیں اور نہ اُن کے ضمیر اُن پر لعنت بھیجیں اور نہ مقدس قوانین کی خلاف ورزی ہو۔

XII قوم پرست مسلمان

ایک اور مسلم مکتب خیال، جو کانگریس کے تصورات کی حمایت کرتا تھا، تعلیم یافتہ مسلمانوں پر مشتمل تھا جن میں زیادہ تر بمبئی اور مدراس پریسیڈنسیوں کے رہنے والے تھے۔ اس اصطلاح کے جدید معنوں میں اُن کا نقطۂ نظر قوم پرستانہ تھا۔ جمہوری خطوط پر ہندوستان کی سیاسی ترقی کے وہ حامی تھے اور ہندو۔مسلم اتحاد سے اُنہیں گہری دلچسپی تھی۔ اُن کے نزدیک اسلام پر اُن کے ایمان اور ہندوستان کے لیے اُن کی محبت میں کوئی تضاد نہیں تھا۔

بدرالدین طیب جی

کانگریس کے ابتدائی دنوں میں بدرالدین طیب جی (1844۔1906) کا شمار بڑے قومی رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ اُن کا تعلق ایک عرب خاندان سے تھا جو ہندوستان آیا اور بمبئی میں آباد

---

[1] ندوی، سلیمان، حیات شبلی دارالمصنفین۔ اعظم گڑھ، 1943 صفحہ 296

ہوگیا۔ ابتدائی زندگی میں انھوں نے ایک مسلم مدرسے میں تعلیم پائی اور اُس کے بعد بمبئ کے الفسٹن انسٹی ٹیوٹ میں۔ وہ اُس وقت سیاست میں گہری دلچسپی لینے لگے جب 1878 میں لارڈ لٹن نے ورنا کلر پریس ایکٹ کا نفاذ کیا اور سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا (لارڈ سیلسبری) کو مشورہ دیا کہ اقرارنامہ کو پابند ملازمتوں سے ہندوستانیوں کو علیحدہ رکھا جائے۔ اُن کارروائیوں کے خلاف اُن میں شدید ردعمل ہوا۔ 1883 کے البرٹ بل کی نزاع نے اُنھیں ہندوستان کے مفاد میں لڑنے پر آمادہ کر دیا۔ وہ اُس زمانے میں ایک بریسٹر کی حیثیت سے اپنے پیشے میں تیزی کے ساتھ ترقی کر رہے تھے۔ وہ بمبئ کی لیجسلیٹیو کونسل کے زائد رکن پہلے ہی مقرر ہو چکے جہاں وہ اپنے زور خطابت اور وکالت کی بنا پر لوگوں میں بڑے مقبول ہو گئے تھے۔ بمبئ پریسیڈنسی ایسوسی ایشن کا قیام 31/جنوری 1885 کو عمل میں آیا اور انھوں نے اپنے سیاسی خیالات کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا۔

''میرا خیال ہے کہ قومیں ہوں یا افراد اُن کی سیاسی زندگی جب نشوونما پاتی ہے تو نئی توقعات بھی پیدا ہوتی ہیں اور اُن توقعات کے لیے ایک تنظیم کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ان کو اظہار مل سکے۔ اور وہ تنظیم قومی توقعات پر نظر رکھتی ہے، منضبط کرتی ہے، ترقی دیتی ہے اور رہنمائی کرتی ہے۔'' انھوں نے مزید کہا ''سیاسی حقوق کے تعلق سے ہم میں ایک احساس پیدا ہو گیا ہے اور نسل، رنگ اور مذہب کے اختلافات، جو ابھی تک ہمیں ایک دوسرے سے دور رکھتے تھے، تعلیم کے روشنی بخش اثر کے تحت بالآخر ختم ہو گئے ہیں۔''[1]

کاشی ناتھ ترمبک تلنگ اور فیروز شاہ مہتہ کے ساتھ طیب جی بھی بمبئ میں تمام عوامی تحریکات کے رہنما تسلیم کر لیے گئے۔ جیسا کہ سر ایچ۔ پی موڈی نے کہا ہے ''یہ تینوں ذہین حضرات نظم ونسق کے ہر شعبے میں اصلاحات کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہے تھے۔ مختلف پلیٹ فارموں سے اور طرح طرح کی تنظیموں سے وہ عام زندگی کے شعبے میں لوگوں کی بھلائی کے لیے مصروف عمل تھے۔''[2]

---

[1] طیب جی، حسین، محولہ بالا، صفحہ 160

[2] ایضاً۔ صفحہ 213

جب دسمبر 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس بمبئی میں ہوا تو طیب جی نے نہ صرف کانگریس کی حمایت کی بلکہ لنڈن ٹائمس کے اس الزام کی تردید بھی کی کہ بمبئی کے مسلمان کانگریس کے اجلاس سے علیحدہ رہے۔ بمبئی پریسیڈنسی ایسوسی ایشن میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا ''میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری ہمدردی اور میرے عام ہم مذہبوں کی ہمدردیاں اس تحریک کے ساتھ ہیں۔ اس تحریک کے متعلق لکھتے ہوئے انگلش ٹائمس نے غلط بیانی سے کام لیا اور کہا کہ مسلمانوں نے کانگریس میں حصہ لینے سے اپنا دامن بچایا۔ میں اس کی تردید کرتا ہوں۔''[1] حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ کسی وجہ سے طیب جی اس اجلاس میں شرکت نہیں کر سکے تھے لیکن رحمت اللہ سیانی اور عبداللہ دھرمسی وہاں موجود تھے جو بمبئی کے اتنے ہی بااثر مسلم رہنما تھے۔ طیب جی نے اپنے خیالات کی تصدیق تو اس طرح کی ''مسلمانوں کے پاس انجمن اسلام ہے جس کے ذریعے وہ اپنی ضروریات حکومت تک پہنچا سکتے ہیں اور مسلمانوں کی عام ترقی کے اقدامات کرنے کے لیے اُس پر زور ڈال سکتے ہیں لیکن میں اس امر کی تردید کرتا ہوں کہ ملک کی سیاسی ترقی کی تحریک میں وہ دوسرے مذاہب اور پیشے رکھنے والے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ نہیں ہیں۔''[2]

بمبئی کے گورنر لارڈ رے نے مسلمانوں کو کانگریس کی حمایت کرنے سے باز رکھنے کی خفیہ کوششیں کیں۔ لارڈ ڈفرن نے، جو سید احمد خاں سے اطمینان بخش گفتگو کر چکا تھا، بدرالدین طیب جی کو بھی متاثر کرنے کی کوشش کی۔ وائسرائے نے طیب جی سے ملاقات کی، انھیں اپنی اور اپنے خاندان کے دوسرے اراکین کی ایک تصویر پیش کی اور مسلمانوں کی بڑی تعریف کی اور اُن کے لیے دوستی کے جذبے کا اظہار کیا جن سے اُسے اس زمانے میں محبت تھی جب وہ ترکی میں برطانوی سفیر تھا۔ لیکن وائسرائے کی کوششوں کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ بدرالدین طیب جی نے اعتراف کیا ''تحفے لینے والے نے جب تحفہ پیش کیا تو میں ڈر گیا۔''[3] سید امیر علی نے بھی اُن کو اپنے ساتھ لانے کی کوشش کی۔ کلکتہ کی محمڈن ایسوسی ایشن کے سکریٹری کی حیثیت سے انھوں نے طیب جی کو

---

[1] ایضاً۔ صفحہ 167

[2] ایضاً، صفحہ 168

[3] مکتوب، مورخہ 3/دسمبر 1887 صفحہ 178

دعوت دی کہ وہ مجوزہ محمڈن پولیٹکل کانفرنس میں شامل ہو جائیں۔ طیب جی نے یہ کہہ کر دعوت رد کردی غالباً آپ جانتے ہیں کہ ہمیشہ سے میرا خیال یہ رہا ہے کہ فی الجملہ سیاسی مسائل کے تعلق سے مسلمانوں کو دوسرے مذاہب اور خیالات رکھنے والے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے اور اُن سوالوں کے تعلق سے ہمارے اور ہندوؤں اور پارسیوں کے درمیان پیدا ہونے والے اختلافات کو میں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنے پر مجبور ہوں۔ اس کی وجہ سے مجھے اس بات کا بڑا افسوس ہوا کہ کلکتہ کے مسلمان نیشنل کانگریس کے اُن اجلاس میں شریک نہیں ہوئے جو بمبئی اور کلکتہ میں منعقد ہوئے تھے۔ چنانچہ اگر مجوزہ محمڈن کانفرنس کا قیام نیشنل کانگریس کی رقابت کے خیال سے عمل میں لایا جا رہا ہے تو مجھے اُس کی پوری مخالفت کرنی ہوگی اس لیے کہ میری رائے میں صحیح راستہ یہ ہے کہ ہم کانگریس میں شامل ہوں اور اپنے خصوصی حالات کے پیش نظر اُس کے مباحث میں حصہ لیں۔[1]

اُس کے بعد کے ایک اور خط میں بھی بدرالدین طیب جی نے ان الفاظ میں اپنے سیاسی خیالات ظاہر کئے ''میری ذاتی رائے یہ ہے کہ مجموعی اعتبار سے ہندوستان پر اثر انداز ہونے والے عام سیاسی سوالات کی حد تک سب تعلیم یافتہ اور عام لوگوں کی بھلائی چاہنے والے شہریوں کا فرض ہے کہ وہ بلا امتیاز ذات، رنگ اور مذہب مل کر کام کریں۔''[2]

انڈین نیشنل کانگریس کا اجلاس 1887 میں مدراس میں منعقد ہوا اور طیب جی اس کے صدر منتخب کئے گئے۔ انھوں نے حکومت کی ناراضگی یا سید احمد خاں اور سید امیر علی کی مخالفت کی پرواہ نہیں کی۔ اپنے صدارتی خطبے میں انھوں نے اس پر زور دیا کہ ہندوستان کے تمام فرقے متحد ہو جائیں ''تاکہ وہ مل کر اُن عام اصلاحات کے لیے کوشش کرسکیں جن سے ہم سب کی بھلائی ہوگی، اور جن کے متعلق میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ بالاتفاق رائے اور سنجیدگی کے ساتھ کام کر کے اُن کو حاصل کرنے پر زور دیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اس الزام کی تردید کی کہ کانگریس محض

---

[1] مکتوب مورخہ 3/دسمبر 1887، ایضاً صفحہ 180-179

[2] مکتوب مورخہ 13/جنوری 1888، ایضاً صفحہ 191

لوگوں کے اژدہام کا نام ہے۔ انھوں نے اُن لوگوں کو چیلنج کیا جنھوں نے الزام لگایا تھا اور کہا ''میرے ساتھ اس ہال میں آئیے اور اپنے اردگرد نظر ڈالیے اور مجھے بتائیے اس سے بہتر اشرافیہ کی نمائندگی کہاں دیکھی ہے۔ اشرافیہ سے میرا مطلب بربنائے ولادت اور دولت نہیں بلکہ بربنائے شعور، تعلیم اور حیثیت۔''[1]

1887 کے بعد کئی سال تک طیب جی کی آواز کانگریس کے مباحث میں فیصلہ کن عنصر کا حکم رکھتی تھی۔ ایک طرف تو انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو یقین دلانے کی کوشش کی کہ اپنے مذہبی معاملات میں انھیں پوری آزادی حاصل ہے اور کانگریس اس میں مداخلت نہیں کرے گی۔ لیکن جہاں تک قومی سرگرمیوں کا تعلق ہے ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے کو ہندوستانی تصور کرنا چاہیئے۔ اور انھیں قومی ترقی یعنی بہتر حکومت، ہندوستانیوں کے ساتھ بہتر برتاؤ، محاصل میں کمی اور تمام فرقوں کے لیے بہتر تعلیمی انتظام کے لیے دوسروں کے ساتھ مل کر کام کرنا چاہیے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے نمائندہ اداروں کے تعلق سے مسلمانوں کے شکوک رفع کرنے کی بھی کوشش کی جن کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ عید محرم اور دوسرے مسلم مذہبی مواقع پر کی جانے والی قربانی کے تعلق سے قوانین وضوابط نافذ کر کے مسلم مفادات کو خطرے میں ڈال دیں گے۔ انھوں نے شمال کے مسلم رہنماؤں کو لکھا کہ تمام تعلیم یافتہ اور عام لوگوں کی بھلائی چاہنے والے شہریوں کا یہ فرض ہے کہ وہ بلا اختیار ذات، رنگ یا مذہب مل کر کام کریں۔ انھوں نے روشن خیال مسلمانوں سے کہا کہ وہ عام لوگوں کی حالت سدھارنے کے لیے انفرادی اور اجتماعی طور سے جو کچھ کر سکتے ہیں اُس میں دریغ نہ رکھیں۔ جب تک وہ زندہ رہے وہ ایک پکے مسلمان رہے لیکن اسی کے ساتھ انڈین نیشنل کانگریس کے ایک مخلص وفادار اور نڈر رہنما بھی رہے۔

1905 میں تقسیم بنگال نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے آپسی تعلقات میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔ اس وقت تک مسلم سیاسی فکر دو دبستانوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک طرف شمالی ہندوستان کے بالائی طبقے کے مسلمان زیادہ تر علی گڑھ تحریک اور سید احمد خاں کے تصورات کے حامی تھے۔

---

[1] خطبۂ صدارت، مدراس اجلاس، 1887

دوسری طرف دیوبند کا اسکول اور عام علما اُن لوگوں کی قیادت کر رہے تھے جو مغربی تعلیم سے بے بہرہ تھے۔ قوم پرست مسلمان مغرب کی طرف سید احمد خاں کے لبرل رویے کے حامی تھے لیکن سیاسی اصلاحات، نمائندہ حکومت کے تصور اور جمہوری تحریک کے طریقوں کے مسائل کے تعلق سے اُن سے اختلافات رکھتے تھے۔ لیکن تقسیم بنگال سے پہلے یہ بتانا مشکل تھا کہ ان میں سے کون سا دبستان خیال بالآخر مسلمانوں کی رہنمائی کے مقابلے میں کامیاب ہوگا۔

نواں باب

مذہبی اور سماجی اصلاح کی تحریکات

I۔ مغرب کا چیلنج

اُن واقعات نے جن کی ابتدا پلاسی سے ہوئی اور اختتام 1857 کی بغاوت پر ہوا۔ ہندوستان کو ہلا کے رکھ دیا تھا۔ ہندوستان کے نظام حکومت کی تباہی، ان کی معیشت کی قلب ماہیت اور اُس کے سماجی نظام اور تہذیب پر ہونے والے حملوں کی بنا پر یہ خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ نہ صرف یہاں کے قدیم لوگ ہمیشہ کے لیے سیاسی غلامی کے شکار ہو جائیں گے بلکہ یہ کہ ہندوستان مغرب کی ایک معاشی نو آبادی اور ثقافتی صوبے میں تبدیل ہو جائے گا۔ اس سیاسی محکومی اور ذہنی غلامی کے خلاف ایک احتجاج شروع ہوا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ طاقت پکڑتا گیا۔

مشرق کے بنیادی تصورات اور اداروں کے سامنے جو مغرب کا چیلنج آیا اس کی کوئی مثال موجود نہیں تھی۔ جس وقت یہ محسوس کیا جانے لگا کہ سیاسی میدان میں انگلستان کے غلبے سے نجات حاصل کرنے کی کوششیں بے سود ہیں تو قدرتی طور سے لوگوں کی توجہ مغربی تسلط کے تہذیبی اور سماجی پہلوؤں پر مبذول ہونے لگی۔

اُنیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں میں مغرب کے اثرات کی بنا پر خود تنقید اور مذہب کی اصلاح کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ صدی کے نصف آخر میں یہ عمل زیادہ تیز ہو گیا۔ مغرب کے عیسائی مذہب کی چنوتی نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو بیدار کر دیا تھا اور وہ خود اپنا جائزہ لینے پر مجبور ہو گئے تھے۔ دونوں نے محسوس کیا کہ مرورِ زمانہ سے اُن کے ابتدائی مقصد کی چمک دمک ماند پڑ گئی تھی، اُن کے ذہن کی دیرینہ پاکی باقی نہیں رہی تھی اور مذہب اندھی رسموں، خراب رواجوں، غیر معقول طریقوں اور بے درد توہمات کا مجموعہ بن گیا تھا۔ ہندو دھرم اور اسلام دونوں ان خرابیوں سے اپنا پیچھا چھڑانا چاہتے تھے تاکہ روحانی زندگی کا صاف وشفاف چشمہ پھر بہہ نکلے اور فرد اور سماج کو آزادی اور مسرت کی منزل کی طرف بہالے جائے۔

روحانی بیداری اور پاک وصاف زندگی کی خواہش نے قدرتی طور سے انسان کے ذہن کو قدیم دین کی طرف موڑ دیا جو نیا نیا شروع ہوا تھا اور برائیوں سے پاک تھا۔ ان حالات میں اصلاح کے معنی تھے ابتدائی دین کی طرف بازگشت اور بہت سے مصلحین کی کوششوں نے احیا پرستی کی شکل اختیار کر لی۔ لیکن چونکہ ماضی کا احیا ایک ناممکن عمل ہے اور ماضی نام ہے ایک ایسے ذہن کی تشکیل کا جو اُس کا تصور کرے۔ اس لیے مصلحین نے اپنے اپنے میلانِ طبع کے مطابق ابتدائی مذہب کی مختلف تصویریں پیش کیں اور اُسے دوبارہ زندہ کرنے کے لیے مختلف طریقے بتائے۔

اصلاح یا احیا کے لیے ضروری تھا کہ ان عناصر کو روکا جائے جو اصل دین سے مطابقت نہیں رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں کچھ مصلحین نے دوسروں کے مقابلے میں زیادہ آزادی کے ساتھ کانٹ چھانٹ کی۔ آج کے حالات میں پرانے عقائد کی تشریحات کے سلسلے میں بھی اُن میں اختلافات پائے جاتے تھے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھی کئی دبستانِ فکر پیدا ہو گئے۔ اُن کے ظاہری اختلافات کے باوجود اُن میں یکساں رجحان پایا جاتا تھا یعنی مذہب کی تشکیلِ نو، اخلاقی اصلاح اور ایک مذہب کو ماننے والوں کو متحد کرنے کی زبردست خواہش کا شعور۔ وہ اس بات پر متفق تھے کہ اُن کی سیاسی ناکامی اور اُس کے نتیجے میں اُن کی بدحالی کا سبب تھا اخلاقی زوال اور سماجی کوتاہی جو نتیجہ تھی حقیقی مذہب کو نظر انداز کرنے کا۔

لیکن ان مذہبی تحریکات کا سب سے دلچسپ نتیجہ یہ ہوا کہ انھوں نے قومی نقطۂ نظر کو فروغ دیا۔ یہ بات ناگزیر تھی کہ مذہبی فرقوں کے درمیان مناظروں نے ذہنوں میں انتشار پیدا کر دیا جو لوگ روایتوں سے سختی کے ساتھ چمٹے ہوئے تھے اُن کے رویے میں تبدیلی ہوئی اور وہ غیر مشروط طور پر انھیں قبول کرنے کے بجائے اُن کا جواز پیش کرنے لگے۔ مذہبی مباحث نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو لیکن یہ ضرور ہے کہ اُن کی بنا پر انفرادیت نے فروغ پایا جو جدید سیکولر فکر کی بنیاد ہے۔ انفرادیت میں جب سیاسی اور معاشی عناصر شامل ہو گئے تو وہ قوم پرستی کی نشوونما کے لیے طاقتور عوامل کا کام کرنے لگے۔ اس نقطۂ نظر سے مذہبی تحریکات پر بحث جدوجہد آزادی کی تاریخ کے لیے ضروری ہو جاتی ہے۔

ہندو اور مسلم مصلحین میں بہت سے گروہ تھے جن کا سلسلہ اُن لوگوں سے لے کر جو قدامت پرست تھے اور کم سے کم تبدیلی کی وکالت کرتے تھے اُن تک پھیلا ہوا تھا جو قریب قریب سبھی روایتوں کو رد کرنے پر مائل تھے۔ یہ سب بالواسطہ یا بلاواسطہ مغربی فکر سے متاثر ہوئے تھے۔ اُن میں وہ لوگ بھی شامل تھے جن کی پرورش قدیم اثرات کے تحت ہوئی تھی مگر اقتضائے زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکے تھے۔ ہندوؤں کے ترقی یافتہ اور لبرل گروپ میں مندرجہ ذیل شامل تھے۔ رام موہن رائے، رویندر ناتھ ٹیگور، کیشپ چندر سین، ایم۔ جی۔ رانا ڈے، ایشور چندر ودیا ساگر اور راج نرائن بوس اور مسلمانوں میں سید احمد خاں، امیر علی اور محمد اقبال۔ وہ گروپ جو سختی کے ساتھ قدیم روایت سے جڑا ہوا تھا وہ ہندوؤں میں مندرجہ ذیل پر مشتمل تھا۔ دیانند سرسوتی، رام کرشنا پرم ہنس، ویویکانند اور بنکم چندر چڑ جی اور مسلمانوں میں اسی قسم کے فرقوں کے بانیوں پر جیسے اہل حدیث، اہل قرآن اور قادیانی۔

اس باب میں ہم ہندو مذہبی تحریکات کی وہ کہانی جاری رکھیں گے جو پچھلے باب میں شروع کی گئی تھی۔ اُس باب میں بتایا گیا تھا کہ یہ تحریک تین دھاروں میں بٹ گئی تھی۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں یہ تینوں دھاریں بہتی رہیں لیکن اُن کے بہاؤ کا زور کم زیادہ ہوتا رہا۔ کئی سال تک برہمو سماج کی مقبولیت بڑھتی رہی۔ اُس کے بعد داخلی اختلافات مناقشات نے اُسے کمزور کر دیا اور اُس کی مقبولیت کم ہو گئی۔ بالآخر اُس کے ماننے والے ایک چھوٹا سا گروہ بن کے رہ گئے۔

لیکن رام موہن رائے کا لبرل بنگال کی سرحدیں پار کرکے دوسرے علاقوں میں پہنچا اور اصلاح کی تحریکات کے لیے وہاں اُس نے میدان ہموار کر دیا۔

شدت پسندی نے ایک منظم نظام کی شکل اختیار نہیں کی لیکن مغرب سے متاثر لوگوں میں اُس پر یقین کرنے والے بہت سے تھے۔ اس کا اثر ادب کی ٹہنیوں کے علاوہ سماجی اور سیاسی سرگرمیوں میں محسوس کیا گیا۔

دوسری طرف وقت گزارنے کے ساتھ اور خاص طور سے 1870 کے بعد رجعت پرستی نے متوسط طبقہ کے ذہن پر غلبہ حاصل کرلیا اور ملک میں بہت سی احیا پرستانہ مذہبی تحریکات نمودار ہوگئیں۔ حالانکہ یہ تحریکیں اس معنی میں کہ رجعت پرست تھیں کہ وہ قدیم ہندو مذہب کا پرچار کرتی تھیں لیکن قدیم مذہب کی نوعیت کے متعلق اُن میں اختلافات تھے۔ پھر قدیم عقائد، رسوم اور مذہبی فتنوں کو کس حد تک رد یا قبول کیا جانا چاہیے، اس کے بارے میں بھی اختلافات تھے۔ لیکن قریب قریب سبھی فضول اوہام پرستی اور غیر معقول طریقوں کے خلاف تھے جو قرونِ وسطیٰ میں معرض وجود میں آ گئے تھے۔

II۔ برہموسماج

ہندوستان کی سرزمین کے مغربی تہذیب سے سیراب ہونے کے نتیجے میں جو نیا پودا اگا تھا اس کا پہلا پھل رام موہن رائے تھے۔ مذہبی معاملات میں ان کا طریق کار بڑی حد تک دانش مندانہ تھا۔ جس سماج (برہموسماج) کو انھوں نے قائم کیا اس کی بنیاد معقول رویے پر قائم تھی۔ اس کے علاوہ انھوں نے وحدانیت کے جس اصول کو دریافت کیا اور فروغ دیا وہ ان کے انفرادی ذہن کی پیداوار تھا۔ جو اتنی ہمت رکھتا تھا کہ ہندوؤں کے عصری عقائد کی ممانعت کر سکے۔ چنانچہ ان کی برہموسماج طبقہ دانش وران کے ذہنوں کو متاثر کر سکی۔ ان کا خدا کے وجود کا اقرار اور وحی سے انکار، معقولیت پر مبنی اخلاقیات، سماجی، سیاسی اور معاشی معاملات میں مبدل رویہ، فکر و عمل کے میدان میں قرون وسطیٰ کے طریقوں سے قطعی انکار اور سیکولر اور مذہبی معاملات میں امتیاز کرنے کا انداز۔ یہ وہ باتیں تھی جنھیں آسانی سے ہضم نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جہاں تک عمل کا تعلق تھا برہمو عبادت اجتماعی مطالعے، غور وفکر اور مراقبے پر مشتمل تھا جس میں وہ رنگارنگ لوازمات استعمال نہیں کئے جاتے تھے جو عبادت کرنے والوں کی توجہ مرکوز کرانے کے لیے گرجا میں عام طور سے استعمال ہوتے ہیں۔ اس کی عبادت گاہوں کے خشک ماحول میں پیروئے مذاہب کا نمو پانا آسان نہیں تھا۔

رام موہن رائے کے انتقال کے بعد دس سال تک جمود و کساد بازاری کا زمانہ رہا، اس کے بعد 1843 میں رویندر ناتھ ٹیگور (رام موہن رائے کے شریک کار دوارکا ناتھ ٹیگور کے بیٹے) سماج میں شریک ہوگئے۔ انھوں نے سماج کی تنظیم نو کی۔ انھوں نے برہمو مبلغین کو تربیت دینے کے لیے ایک اسکول قائم کیا جس کا نام تھا تتو بودھینی پاٹھ شالا، فلسفیانہ اور مذہبی مباحث کے لیے تتو بودھنی پتریکا شروع کی۔ انھوں نے رکنیت کے ضابطے بنائے اور مذہبی کارکنوں کی تقرری کو منضبط کیا۔ برہمو اقرار نامہ تیار کیا گیا جس کے ذریعے اراکین خدائے واحد کی عبادت کرنے، اس سے محبت کرنے اور اس کے پسندیدہ کام کرنے کا عہد کرتے تھے اور خدا سے دعا مانگنے اور اس کی حمد وثنا کرنے کے طریقوں کو رواج دیا گیا۔ ہندو منتروں (برہمو دھرم) کی بنیاد پر ایک مذہبی صحیفہ اور ایک دُعاؤں کی کتاب تیار کی گئی۔ اس طرح سماج نے حیات نو پائی اور بہت ترقی کی۔ اُس کے مبلغین نے ہندوستان کے مختلف حصوں کا سفر کیا اور پنجاب سے مشرقی بنگال تک اس کی شاخیں قائم ہوگئیں۔

چنانچہ 1843 سے 1857 تک اس مذہبی تحریک نے بڑی ترقی کی جسے رام موہن رائے نے شروع کیا تھا۔ 1857 میں کیشپ چندر سین سماج میں شامل ہوگئے اور اپنی سرشت کے مطابق بڑے انہماک کے ساتھ کام کرنے لگے اس وقت تک برہمو سماج اپنے ابتدائی موقف سے بہت دور جا چکی تھی۔ رام موہن رائے کی عقلیت پسندی اور انفرادیت کو ترک نہیں کیا گیا مگر ذہن کے دوسرے شعبوں اور انسانی تجربوں کو جنھیں انھوں نے نظر انداز کر دیا تھا، فروغ دیا گیا اور ان کے مذہب کو انسانی صفات سے متصف کر دیا گیا۔ دعا اور خدا سے ہم کلام ہونے کے تصورات، زندگی کو وقف کر دینے کا تصور، خدا کے ساتھ محبت کرنے اور اس کی مرضی کے مطابق انسان کی خدمت کرنے کا تصور اور اس سے روشنی، روحانی تاثیر اور رحمت و برکت حاصل کرنے کا تصور

مذہب کے جز بن گئے اور اُسے وہ جذباتی رنگ عطا کردیا جس کی اس میں پہلے کمی تھی۔

لیکن تحقیق، اصلاح اور تبدیلی کا جذبہ جو بیدار ہو چکا تھا وہ ربندرناتھ کے اقرارنامے اور نظریوں سے مطمئن نہیں ہوسکتا تھا۔ انھوں نے شروع تو اس سے کیا تھا کہ وید غلطی سے پاک ہیں۔ لیکن جلد ہی انھیں اس نظریے کی عدم صحت کا علم ہوگیا اور انھوں نے ایک دفعہ پھر رام موہن رائے کی معقولیت پسندی کو قبول کرلیا۔ مذہبی علم حاصل کرنے کے ذریعے تھے فطرت اور وجدان، ربندرناتھ نے نہ صرف ویدوں کے صحیفہ آسمانی ہونے سے بلکہ کرم اور آواگون کے ہندو نظریات سے بھی انکار کردیا۔ آئندہ برہموسماج کی بنیاد ہونی تھی۔ ''انسانی دل جسے وہ روحانی علم روشنی دے گا جو اپنی حقیقت کو سمجھنے سے وجود میں آتا ہے۔'' [1] لیکن ان کے دل میں قومی عزت کا اتنا شدید جذبہ تھا کہ زندگی بھر دوارکا ناتھ برطانوی حکومت سے فائدہ اٹھانے یا اس ملک کی بدیسی حکومت کے نمائندوں سے کسی قسم کا تعاون کرنے سے بھی مسلسل انکار کرتے رہے۔ راج نارائن بوس کے الفاظ میں ''ربندر بابو عام طور سے یورپینوں سے ملنے سے بچتے ہیں اس لیے کہ ہندوستان کے معاملات میں وہ اُن سے اتفاق رائے نہیں رکھتے، انگلستان اور ہندوستان میں ان کے خیالات کی حمایت کرکے ان سے متعارف ہونا آسان ہے۔ لیکن ربندر بابو انگریزوں سے متعارف ہونے کے خواہش مند نہیں ہیں۔ کرشنا نگر کالج کے پرنسپل شرلوب نے ایک دفعہ لکھا تھا'' وہ خوددار بزرگ یورپینوں کی تعریف کو بھی اپنے لیے کسرِ شان سمجھتے ہیں۔'' [2]

دوسری طرف کیشپ چندر سین کا پرجوش ذہن نئے تصورات کی تلاش اور نئے تجربے کرنے میں مصروف تھا۔ چنانچہ جلد ہی ان کے لیے یہ ناممکن ہوگیا کہ وہ ہندو دھرم تک خود کو محدود رکھ سکیں۔ 1860 میں انھوں نے سنگت سبھا قائم کی جس میں '' دُرگا پوجا '' کی طرح کی ہندو رسموں اور ذات پات کی طرح کے اداروں کی ضرورت پر بحثیں ہوتی تھیں۔ یہ فیصلہ کیا گیا کہ انھیں ترک کردیا جانا چاہیے۔ 1861 میں انگریزی تعلیم دینے کے لیے کلکتہ کالج قائم کیا گیا اور مشن کی سرگرمیوں کی نشر واشاعت کے لیے انڈین میرو جاری ہوا۔

---

[1] Studies in the Bengal Renaisance تدوین اے۔سی۔گپتا، کلکتہ 1958 صفحہ 37

[2] پال۔بی۔سی۔ کے نو یوگر بنگلہ میں درج، کلکتہ، 1914، صفحہ 129

1864 میں کیشپ چندر نے ہندوستان کا دورہ کیا۔ جدید ہندوستان میں ایک نظریاتی مذہبی انجمن قائم کرنے کی یہ پہلی اہم کوشش تھی۔ اُن کی کوششوں کے نتیجے میں مدراس میں وید سماج اور مہاراشٹر میں پراتھنا سماج قائم کی گئی۔ اس دوران کیشپ چندر کی شدت پسندی نے سماج میں تبدیلی کی رفتار کو اتنا تیز کر دیا تھا کہ جلد ہی اُن کے اور ربندر ناتھ کے درمیان ہندو رواجوں اور ہندو مذہبی رویوں کے تعلق سے تصادم ہو گیا اس کی بنا پر 1860 میں کیشپ چندر برہمو سماج سے علیحدہ ہو گئے۔ اور ایک نئی انجمن قائم کر لی اس انجمن کے مقاصد تھے۔ ہندوستان کے سبھی برہمو کو چاہے وہ مرد ہوں یا عورتیں ایک ادارے میں مجتمع کرنا اور سبھی مذاہب کی تعلیمات سے استفادہ کر کے برہمو مذہب کے اصولوں کی تشکیل اس طرح کرنا کہ وہ سب کے لیے قابل قبول ہوں۔ یہ اہم بات ہے کہ اُس نے اپنے لیے ''بھارت ورشیہ برہموسماج'' کا نام منتخب کیا۔ ربندر ناتھ کی انجمن ''آدی برہموسماج'' یا ''اصل برہموسماج'' کے نام سے مشہور ہو گئی۔

سماج کے پہلے بٹوارے کے کچھ برسوں بعد دوسرا بٹوارا ہوا۔ ابتدا سے نئے سماج کو کیشپ چندر نے مسحور کر رکھا تھا۔ جن کا جوش اور ذہنی صلاحیتیں بنگال کے نوجوانوں کے لیے بڑی کشش رکھتی تھیں۔ لیکن اُن کی روح بے چینی سے عبارت تھی۔ 1870 میں وہ انگلستان گئے اور سماج اصلاح اور سماجی بھلائی کے کاموں کے لیے اور زیادہ جوش لے کر واپس آئے۔ 1872 میں اُنہوں نے حکومت کو اس پر آمادہ کر لیا کہ برہمو میرج ایکٹ کو قانونی شکل دی جائے جس کی رو سے برہمو طریقے سے کی جانے والی شادیاں جائز قرار دے دی گئیں۔ اس کی بنا پر ہندوؤں سے اُن کا رشتہ بالکل ٹوٹ گیا۔

اس دوران کیشپ چندر کے ذہن میں نئے تصورات جنم لیتے رہے۔ ایک طرف تو عیسائیت اُن کے لیے بڑی کشش رکھتی تھی دوسری طرف ویشنو مذہب کے ماننے والوں کی بھگتی سے وہ بہت متاثر تھے۔ اوتار کے تصور نے، جو ان دونوں مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ اُنھیں اس پر آمادہ کر دیا کہ وہ مذہب کے سرچشمہ میں فطرت اور وجدان کے علاوہ الہام کا اضافہ بھی کر دیں۔ وہ اب مناجاتوں یعنی خدا کی حمد و ثنا اور کیرتن میں زیادہ وقت صرف کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ یہ بات ان کے ذہن میں جگہ پکڑتی گئی کہ وہ خدا کے پیغامبر ہیں جن پر وحی نازل ہوتی ہے۔ کیشپ چندر

جو ابھی تک با اختیار سربراہ کی حیثیت سے سماج پر حکمرانی کرتے تھے۔ اب اپنے اعمال کو من جانب اللہ قرار دینے لگے۔ اس کی وجہ سے اُن کے پیروؤں کا ایک گروہ اُن کی مخالفت کرنے لگا۔ 1878 میں اُن کی بیٹی کی شادی کوچ بہار کے کم عمر مہاراجہ کے ساتھ ہوئی۔ اُس وقت دولہا اور دلہن دونوں کی عمر کم تھی۔ یہ شادی 1872 کے برہمو میرج ایکٹ کے دفعات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ہندو رسوم کے مطابق کی گئی۔ اس نے اُن کے مخالفین کو بہت ناراض کر دیا۔ اور وہ سب کے سب سماج سے علیحدہ ہو گئے۔

علیحدگی اختیار کرنے والوں نے ایک نئی تنظیم کی بنیاد ڈالی جس کا نام تھا ''سادھارن برہمو سماج''۔ اُس کے رکن صرف وہی لوگ بن سکتے تھے جو ہر قسم کی بت پرستی سے بچیں، ذات پات کے نظام کو رد کریں عورتوں کی آزادی کی حمایت کریں، تمام گھریلو رسموں میں برہمو طریقوں پر عمل کریں اور سماج نے جو نیا مسلک بنایا تھا اُس پر عمل پیرا ہوں۔ برہمو سماج کے وہ نوجوان ہیرو سیاسی تحریکات میں بڑھ کے حصہ لیتے ہیں جنھوں نے ''سادھارن برہمو سماج'' قائم کیا تھا۔

سب ناتھ شاستری کی قیادت میں اُنھوں نے ''اعلان کیا کہ وہ آزادی میں یقین رکھتے ہیں۔ بدیسی حکومت کے تحت ملازمت نہ کرنے کا عہد کرتے ہیں لیکن اس کا وعدہ کرتے ہیں کہ ملک کے خصوصی حالات کے پیش نظر وہ پرامن طریقوں سے کام کریں گے۔'' انھوں نے عوامی جمہوریت کے جھنڈے کے نیچے [1] دنیا کے سب لوگوں کی آزادی کے لیے بھی کام کیا۔ اُن میں اہم ترین شخصیت تھی سر بندر ناتھ بنرجی کی جو بعد میں بنگال کے بے تاج بادشاہ بن گئے تھے۔

کیشپ چندر کے لیے یہ بٹوارہ بڑی آزمائش کا حکم رکھتا تھا لیکن اس کے بعد انھوں نے ایک دفعہ پھر عہد کیا کہ سماج میں زیادہ روحانیت اور اصلاح کا زیادہ جوش پیدا کر کے اُس کو نئی توانائی عطا کریں گے۔ انھوں نے اپنے نئے مشن کی اشاعت کی جسے انھوں نے نو ودھان یا نئے دستور کا نام دیا تھا اس کی خاص خاص باتیں تھیں۔ (1) مذہب کے باطنی پہلو پر زور دیا جائے (2) عیسائی اور ہندو نصب العین اور طریق امتزاج کی کوشش کی جائے۔ انھوں نے بارہ

[1] شفیق، رحمن Notes on the Bengal Renaissance، بمبئی 1946 صفحہ 39

چیلوں پر مشتمل ایک گروپ بنایا جنھیں وہ خدا کی طرف سے مقرر کئے جانے والے ''حواری'' کہتے تھے۔ اور مردوں اور عورتوں کا ایک حلقہ بنایا جن سے بڑے سخت عہد لیے جاتے تھے۔

ایک طرف تو وہ کہتے تھے کہ ''مسیح ایک مثالی انسان تھا اور اس کے معنی ایک مثالی خدا پرست تھا کہ اُس نے قُربِ الٰہی کا وہ اعلیٰ منصب حاصل کرلیا تھا جب روح فنا فی اللہ ہو جاتی ہے'' وہ اُسے ہنسی تصور کرتے تھے۔ دوسری طرف وہ رام کرشنا پرم ہنس کے اثر میں تھے، جن سے انھوں نے سیکھا تھا کہ خدا کو ماں سمجھا جائے جو انسان اور پوری کائنات کی لطیف و جمیل فیض رساں ہے۔

کیشپ چندر کی خواہش تھی کہ اُن کا ''نیا مذہبی دستور'' ایسا ہو کہ وہ ''تمام مقدس کتابوں، نبیوں اور مذہبی نظاموں میں ہم آہنگی'' کی مثال ہو۔ یہ بھی کوشش کی گئی تھی کہ باطنی مظاہر اور کرداروں کو شعوری حقائق میں تبدیل کر دیا جائے تا کہ انسان معروضی الوہیت کو نہ صرف ذات بلکہ کردار کے طور پر بھی اپنے دل میں محسوس کر سکے۔ اُن کی زندگی کے آخری ایام اپنی مذہبی انجمن کے عقائد، رسوم اور تنظیم کو سدھارنے میں گزرے۔ مذہب کے میدان میں اُن کی یہ کوشش بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ عیسائی مغرب اور ہندو ہندوستان کے تصورات میں وہ ایک شعوری امتزاج پیدا کرنا چاہتے تھے۔

1884 میں اُن کے انتقال کے بعد تینوں سماجوں میں سے کسی ایک میں بھی اُن کی قد آور شخصیت کا کوئی رہنما باقی نہیں رہا۔ لیکن تمام مذاہب کے اچھے عناصر پر مشتمل کیشپ چندر کا مذہب اُن کے تعلیم یافتہ ہم وطنوں کو متاثر کرنے میں ناکام رہا۔ اور برہمو سماج کی توسیع کا عمل رُک گیا۔ 1911 میں ہندوستان میں 183 برہمو سماج تھے۔ جن کے اراکین کی مجموعی تعداد تھی 5504۔

حالانکہ اُن کی تعداد کم تھی مگر برہمو سماج پورے ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ پہلی دفعہ ایک جدید مذہبی تحریک نے، جس کو متوسط طبقے کے دانش وروں نے شروع کیا تھا۔ پورے ہندوستان میں بکھرے ہوئے پیرووٗں کو متحد کرنے کی کوشش کی جہاں تک تعداد کا تعلق ہے، ہم کہہ سکتے ہیں سماج نے بڑی کامیابی حاصل نہیں کی لیکن سماجی اصلاح کی تحریکات پر اُس کا بڑا اثر پڑا اور حبِ وطن کے جذبات کو بیدار کرنے میں سماج نے اہم رول ادا کیا۔

قوم پرستی کی نشوونما میں برہموسماج کی کاوشوں کا جائزہ بپن چندر نے ان الفاظ میں لیا ہے۔

''کیشپ چندر کی قیادت میں برہموسماج نے ذاتی آزادی اور سماجی مساوات کے لیے مقدس اصولوں کا اعلان کیا۔ جس کا شدید ردعمل نئے بنگال کی تشکیل، قومی شعور اور نئی سیاسی زندگی اور توقعات پر ہوا۔ اپنے سیاسی مالکوں کی برتری کے مفلوج کن احساس کی جگہ بین طور سے ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں میں ایک نیا اعتماد پیدا ہونے لگا۔''[1]

سماجی اصلاح کی تحریک کے اہم رہنماؤں میں راج نرائن بوس (1826۔1899) شامل تھے جو ایک وسیع النظر عالم تھے اور فارسی زبان وادب سے اچھی واقفیت رکھتے تھے۔ انھوں نے سائنس ان ریلیجن لکھی جو برہموسماجیوں کے لیے بڑی دلچسپی کا باعث تھی۔ برہمو پبلک اُپینین لکھا ''مختصراً یہ ان کی دینیات ہے۔''[2] وہ کیشپ چندر اور ان کے ان چیلوں کے سخت مخالف تھے جو کیشپ چندر کو خدا کا اوتار ثابت کرنا چاہتے تھے۔ انھوں نے برہموسماج اور ہندو دھرم کی یکسانیت پر زور دیا۔ وہ صرف یہ کہتے تھے کہ برہموسماج کی شکل میں ہندو دھرم اپنی ترقی کے نقطۂ عروج تک پہنچ گیا ہے۔

انھوں نے قومی احساس کو فروغ دینے کے لیے ایک انجمن قائم کی جس کے مقاصد تھے ہندوستانی ورزشوں کے ذریعہ نوجوانوں کی صحتوں کو بہتر بنانا، اسکولوں کے ذریعے ہندو موسیقی طب، سنسکرت زبان اور قدیم علوم کو ترقی دینا اور بدیسی رواجوں، طریقوں اور زبان کی جگہ ان کی ہندوستانی شکلوں کو رواج دینا، زندگی کو ہندوستانی بنانے کی تحریک کو مقبول بنانے کے لیے انھوں نے 1867 میں ''ہندو میلے'' کی بنیاد ڈالی اور نیشنل سوسائٹی قائم کی۔

ایشور چندر ودیا ساگر (1820۔1891) مذہبی مصلح سے زیادہ تعلیمی ماہر تھے۔ وہ سنسکرت کے بڑے عالم تھے اور 1850 میں کلکتہ کے سنسکرت کالج میں پروفیسر اور ایک سال بعد پرنسپل کے عہدے پر فائز ہوگئے۔ انھوں نے اسپیشل انسپکٹر آف اسکولز کے فرائض بھی سرانجام دئے۔ 1858 میں انھوں نے سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا لیکن تعلیمی معاملات میں غیر رسمی طور

---

[1] پال، بی۔سی Memoirs of my Life and Times جلد صفحہ 229

[2] بوس، راج نرائن، اتم چرن، کلکتہ، 1925 صفحہ 134

سے وہ حکومت کو مشورے دیتے رہے۔

جدید تصورات کو فروغ دینے کے لیے سنسکرت کالج میں انگریزی تعلیم کو رواج دے کر انھوں نے سیکولر نقطہ نظر پیدا کرنے کی رام موہن رائے کی کوشش کو تقویت پہنچائی۔ انھوں نے تعلیمی کونسل کو لکھا تھا ''کچھ وجوہ کی بنا پر......ہم سنسکرت کالج میں ویدانت اور سنکھیہ کی تعلیم دینے پر مجبور ہیں۔ اب اس میں کوئی شک وشبہہ باقی نہیں رہا ہے کہ ویدانت اور سنکھیہ فلسفے کے غلط نظام ہیں۔ یہ نظام غلط ہونے کے باوجود ہندوؤں میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ سنسکرت نصاب میں ہم انھیں پڑھاتے رہیں لیکن انگریزی نصاب میں صحیح فلسفے کی تعلیم دیکر ہمیں ان کا اثر کم کرنا چاہیے۔''[1]

بنگال کے سماج کو جدید شکل دینے کے لیے انھوں نے کئی سماجی اصلاحوں کی وکالت کی۔ جن برائیوں پر انھوں نے حملے کئے وہ تھیں کثرت ازواج، بچوں کی شادیاں اور بیواؤں کی شادیوں کی ممانعت، یہ ان کی کوششوں اور کچھ دوسرے بااثر لوگوں کی حمایت کا نتیجہ تھا کہ انجمن قانون ساز نے 1856 کا ایکٹ منظور کیا جس کی رو سے ہندو بیواؤں کی شادیاں جائز قرار دی گئیں۔ انھوں نے اصلاحات کی وکالت کے جوش میں مذہبی احکام کو رد نہیں کیا بلکہ ان پر زور دیا جو جدید حالات کے لیے موزوں ترین تھے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے پرسہار سنگھتا کا انتخاب کیا۔[2]

بیوہ، وِواہ اور بالیہ وواہ دوش کی طرح کی کتابچوں کے ذریعہ ان کی پُرزور حمایت کے باوجود بدقسمتی سے وہ دوسری سماجی اصلاحات نہ کی جا سکیں جن میں انھیں دل چسپی تھی یعنی کثرت ازواج اور بچوں کی شادیاں۔

عورتوں کی آزادی کے کام میں ان کی پیش قدمی کی بنا پر ان کا تعاون ڈانک وائرہ بیتھون سے ہوا اور عورتوں کے لیے بیتھون کالج اور دوسرے اسکولوں کا قیام عمل میں آیا۔

---

[1] بندوپادھیائے، بی۔ این، ایشور چندر ودیا ساگر، کلکتہ، 1943، صفحات 136-131

[2] ایشور چندر ودیا ساگر، ودھوا ویواہ، کلکتہ، 1872، ودیا ساگر گرنتھ بالی، تدوین، سنیت کمار چٹوپادھائے، بی۔ این۔ بندوپادھیا اور ایس۔ کے۔ داس، کلکتہ، 1838 صفحات 29-23

III۔ پرارتھنا سبھا

جدید ہندوستان کی پہلی تبلیغی تحریک تھی برہمو سماج اور ملک میں نئے مذہب کی تبلیغ کرنے والا پہلا مبلغ تھا کیشپ چندر۔ جب 1864 میں وہ بمبئی گئے تو ان کا پیغام قبول کرنے کے لیے میدان پہلے ہی تیار کیا جا چکا تھا۔ اُس قسم کا ایک تعلیم یافتہ متوسط طبقہ اس پریسیڈنسی میں بھی جنم لے چکا تھا جیسا بنگال میں پایا جاتا تھا۔ وہ مغربی تصورات کو قبول اور انگریزی تعلیم کو حاصل کر رہا تھا اور اس نے مذہبی اور سماجی اصلاح کی ضرورت محسوس کر لی تھی اور عیسائی مشنریوں کی تبلیغی سرگرمیوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ ''پرم ہنس سبھا'' کی طرح کی انجمنیں عیسائیت کا مقابلہ کرنے کے لیے قائم کی جا چکی تھیں۔

1867 میں کشیپ چندر کے دورے کے نتیجہ میں ''پرارتھنا سبھا'' کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے خاص خاص عقائد خدا پرستی پر مبنی تھے اور اس کا مقصد تھا سماجی اصلاح۔ جب ایم. جی. رانا ڈے اور آر۔ جی بھنڈارکر کی طرح کی اہم شخصیتیں اس میں شامل ہوگئیں تو اس کی حیثیت اور طاقت بڑھ گئی اور سرگرمیوں میں اضافہ ہوگیا۔ اس انجمن کی تعلیمات کو پھیلانے کے لیے ایک اخبار سبودھ پتریکا شروع کیا گیا اور محنت کش طبقے کو تعلیم دینے کے لیے ایک شبینہ مدرسہ قائم کیا گیا۔ 1882 میں سماج نے تبلیغی سرگرمیاں شروع کر دیں۔ ایک باصلاحیت مرہٹہ خاتون پنڈتا رام بائی نے ''آریا مہیلا سماج'' قائم کرنے میں بڑی مدد کی۔ جلد ہی کچھ روشن خیال اور تعلیم یافتہ اشخاص اس انجمن میں شامل ہو گئے اور سماجی اصلاح اور سماجی بہبود کے کاموں کو تقویت پہنچائی۔

اس سماج کے اصلی معمار تھے مہادیو گوند رانا ڈے (1882۔1901) جو اُنیسویں صدی کے ہندوستان کے سب سے زیادہ قدآور دانش ور تھے۔ وہ ایک اچھے طالب علم، سچے استاد اور باصلاحیت اور ایماندار جڈیشیل افسر تھے جو ہندوستان کے اعلیٰ ترین عدالتی عہدے تک پہنچے۔ ان کی دلچسپیاں وسیع تھی اور قومی زندگی کے ہر اہم پہلو پر ان کی نظر رہتی تھیں۔ لیکن سب سے زیادہ انھیں مذہبی اور سماجی اصلاح سے دلچسپی تھی۔ چالیس سال تک وہ اُن خرابیوں اور اوہام پرستوں کے خلاف بڑی ثابت قدمی کے ساتھ جنگ کرتے رہے جن پر ہندوستانی سماج کی ناگفتہ بہہ حالت کی ذمہ داری تھی۔

مذہب اور سماج کے مسائل کے تعلق سے راناڈے کا نقطۂ نظر معقول تھا لیکن وہ آنکھیں بند کر کے مغرب کی تقلید کرنے کے قائل نہیں تھے۔ اور مغربی فکر کو بغیر سوچے سمجھے قبول کرنے کے خلاف تھے۔ اُنہیں اس پر ناز تھا کہ وہ ہندو ہیں اور خود کو بھگوت گیتا کے پجاریوں میں تصور کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے ذہن کو ایسے تمام عقائد سے پاک کر لیا تھا جو عقل سے ثابت نہیں کئے جاسکتے تھے۔ وہ ہندوؤں کی علیحدگی پسندی کی مذمت کرتے تھے۔ اور انھیں تلقین کرتے تھے کہ وہ پوری انسانیت کو اپنے گلے سے لگائیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہندوؤں کو تیاگ اور دنیا کی طرف حقارت آمیز رویے کو ترک کر دینا چاہیے، سماج میں اپنے فرائض پورے کرنے چاہیے، املاک کی پیدا کردہ آسودہ خاطری سے گریز کرنا چاہیے اور آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ راناڈے نے اپنے ہندو دھرم کا انتخاب کیا تھا۔ لیکن یہ ہندو دھرم حشو و زوائد سے پاک تھا۔ اور خدا پرستی کے جدید فلسفے کی روشنی میں اس کی تشریح کی گئی تھی۔ راناڈے نے ہندو ویدانتک فلسفے کی شنکر کی تشریح کو رد کر دیا جس کی بنیاد اصنام پرستی پر قائم تھی اور وشنو رامنج اور دور وسطیٰ کے مرہٹہ سنتوں کی خدا پرستی پر مبنی تشریح کو قبول کیا۔ اُنھوں نے کہا ''دوسرے تمام نظاموں کے مقابلے میں اُن کے یہاں خدا پرستی کا برتر اور زیادہ حقیقی تصور پایا جاتا ہے۔[1] اُن کی نظر میں ''بھگتی تحریک'' بت پرستی کے بجائے حقیقی خدا پرستی کی تحریک تھی۔

وہ اس بات کو تسلیم کرتے تھے۔ مذہب کی سچائی کا انحصار منطقی مقدمات کے بجائے عرفانی سچائی پر ہوتا ہے۔ جس طرح سائنس کا انحصار منطقی نتائج کے بجائے فطری قوانین کے تسلسل اور یکسانیت پر ہے۔ خدا پرستی کی موافقت میں جس قسم کی دلیلیں انھوں نے پیش کی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس سوال پر مغربی فلسفیوں کے افکار کا مطالعہ کیا تھا لیکن اس میں شک ہے کہ انھوں نے اُن کی علم کائنات، علم غایات اور علم الوجود کے متعلق دلیلوں، ثبوتوں اور تردید کی باریکیوں کو پوری طرح ذہن نشین کر لیا تھا۔ خدا پرستی کے متعلق اُن کے تصورات اُن اُنتالیس دفعات میں پیش کئے گئے ہیں جو انھوں نے ''مذہب کے متعلق ایک خدا پرست کا اعتراف'' کے

---

[1] ذہب اور سماجی اصلاح: ۔ مہادیو گووند راناڈے کے مضامین اور تقریر کا وہ مجموعہ جسے ایم جی کولاسکر نے ترتیب دیا، بمبئی، 1902 صفحہ 12

عنوان سے ترتیب دیے تھے۔ خاص خاص اصولوں کی شکل میں اُن کی تلخیص ذیل میں درج کی جارہی ہیں۔

(1) قابل پرستش محض خدا ہے۔ وہ مالک، باصفت اور اخلاقی حاکم ہے۔ خدا واحد ہے۔ اُس کا ثانی کوئی نہیں ہے۔ وہ کئی ذاتوں پر مشتمل نہیں ہے تثلیث نہیں ہے یا دو ذاتوں کا مجموعہ نہیں ہے وہ خالی اور روحانی دنیا میں رہنے والا خود میں جذب رہا نہیں ہے۔[1] اس کے علاوہ اور کوئی دیوتا نہیں ہے اور بت پرستی حماقت ہے اُسکا کوئی اوتار نہیں ہے۔ لیکن وہ فطرت انسانی اور تاریخ میں خود کو ظاہر کرتا ہے۔

(2) کائنات خدا کی تخلیق ہے اور حقیقی ہے وہ محض قرین نظر ہے۔ مادے کا وجود، حرکت اور زندگی خدا کی دین ہے۔[2] لیکن دنیا کی ابتدا انسان اور خدا، انسان اور کائنات کے رشتے کے مسائل پر اسرار اور ناقابل حل ہیں۔

(3) انسان کا مزاج روحانی ہے۔ اُس کی روح مادی نہیں ہے روح ابدی ہے وہ خدا کے مشابہ ہے نہ اس کا ظہور روحیں بہت سی ہیں اور اُن میں سے ہر ایک میں استدلال کرنے، خوش کرنے اور صحیح اور غلط میں امتیاز کرنے کی صلاحیت ہے۔ وہ آزاد ہیں اور اپنے مال کی ذمہ دار۔ اس دنیا میں انسان کی زندگی نظم وضبط اور دکھوں کی زندگی ہے جسے آئندہ زندگی کی تیاری کی زندگی سمجھنا چاہیے۔ لیکن آئندہ کیا ہوگا یہ کسی کو نہیں معلوم ہے صرف اتنا کہا جاسکتا ہے کہ ایک محدود زندگی کے گناہوں کی ابدی سزا نہیں ہوسکتی ہے۔ کوئی ابتدا گناہ نہیں ہے اور کسی شخص کی قسمت میں یہ نہیں لکھا ہے کہ دوزخ میں جائے گا یا جنت میں۔

خدا کے ساتھ انسان کا رشتہ انسان کے آمیزہ تصور اور اُس کو حاصل کرنے میں بتدریج ترقی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں دعائیں، قرب خداوندی، اچھے اور پاکباز لوگوں کی صحبت استغفار اور پاکیزگی ضروری ہے۔ عبادت گاہوں میں مل کر عبادت کرنا اور زندگی کے اہم سنگ میلوں کا جشن منانا معاون ہوتا ہے لیکن تیاگ وترک، گروؤں کی حمد وثنا اور نجات و بندوں اور

---

[1] ایضاً صفحہ 263

[2] ایضاً صفحہ 264

معجزوں میں یقین بالکل ضروری نہیں۔ تمام دوسری باتوں کے مقابلے میں ضمیر کی فرماں برداری سب سے زیادہ اہم ہے۔ اس فرماں برداری کی تحریر صرف اخلاقی اُمور اور دوسرے لوگوں کے مساوی حقوق کی بنا پر کی جاسکتی ہے۔ اخلاقی قانون کے تحت سب مرد اور سب عورتیں برابر ہیں۔ اور انسان کا سب سے بڑا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام تر خلوص دل اور ایمان کے ساتھ انسان سے اور خدا سے محبت کرے۔ اخلاقی عمل جس منزل کی طرف انسان کو لے جاتا ہے وہ ہے جسم کی قیود اور خواہشات نفسانی سے نجات حاصل کرنا۔

ان مذہبی عقائد نے سماجی اصلاح کے راناڈے کے تصورات کو جنم دیا چونکہ انسان ایزدی خصوصیات کا حامل ہے اور سب انسان برابر ہیں اس سے قدرتی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ انسانی سماج جو خدا کی بخشی ہوئی سماجی جبلت کا نتیجہ ہے۔ اُس میں ایزدی قدر حیات ہونی چاہیے۔ چنانچہ انسان اور سماج کی ظرفی اخلاقی ترقی ہے جس کے معنی ہیں کہ اُن تمام رواجوں، اداروں اور کام کے طریقوں کو دور کیا جانا چاہیے جو اس عمل میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اور انسان کے ایزدی مزاج کی نفی کرتے ہیں۔

اگر راناڈے قدیم ویدک مذہب پر فخر کرتے تھے یعنی اُنھوں نے جس طرح اُسے سمجھا اور اپنی تحریروں اور تقریروں میں پیش کیا تھا تو اسی کے ساتھ اُن کا یہ خیال بھی تھا کہ موجودہ زمانے میں ہندو سماج جن اوہام پرستانہ رسموں اور غیر معقول اور غیر انسانی رواجوں کا شکار ہو گیا تھا وہ ''قدیم معیاروں سے دوری کا حکم رکھتی ہیں جن کے لیے آپ قدیم قانون سازوں کو ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتے وہ انسان کے کارنامے میں، انسانی کمزوریوں کے شاخسانے میں یعنی قدیم صحت مند ضوابط کی جگہ غلط طریقوں نے لے لی ہے''۔[1]

لیکن وہ جانتے تھے کہ تاریخی دلیل کو اُن کے مخالف غلط طریقے سے استعمال کر سکتے ہیں۔ اس لیے انھوں نے اصلاح کے تصور کو زیادہ مضبوط بنیادوں پر قائم کیا۔ اور عقل سے اس کا جواز پیش کیا۔ انھوں نے کہا کہ اصلاح اصل میں نجات دلانے کا عمل ہے ایک برتر مذہب، قانون، نظام سیاست کے اداروں اور رواجوں پر خود غرضانہ عوامل کی غیر انسانی طاقت کے دباؤ کے سامنے

---

[1] ایضاً، صفحات xiv

ہم جس طرح جھک گئے ہیں اُس کی پیدا کردہ بندشوں سے نجات۔[1] اپنے خطبے احیا اور اصلاح میں انھوں نے کہا ''اگر حقیقی اصلاح کی خواہش ہے تو نہ صرف ظاہری شکل بلکہ اندرونی شکل یعنی اُس خیال وتصور کو بھی تبدیل کرنا ہوگا جو ظاہری شکل کا تعین کرتے ہیں۔[2] بنیادی تصورات جن میں تبدیلی کی ضرورت تھی وہ تھے علیحدگی پسندی، ضمیر کی آواز کے بجائے بیرونی طاقت کی فرماں برداری، وراثت کی بنیاد پر انسان اور انسان میں تفریق کرنا، غلط طریقوں اور غلط اعمال کے سامنے سر جھکا دینا اور سیکولر ہستیوں کی طرف سے ایسی غفلت برتنا کہ اسے تن بہ تقریر سے کیا جاسکے۔اس کے بعد انھوں نے ان لفظوں میں کہا کہ اپنے ضمیر کی طرف مرد کی ذمہ داری کیا ہے۔

''ماضی اور حال کے بڑے اور صاحب فہم لوگ ہمارے احترام کے حقدار ہیں لیکن اُنھیں ہمارے اور خدا کے بیچ حائل نہیں ہونا چاہیے یعنی اُن ایزدی اصولوں کے جو ہم میں سے ہر چھوٹے بڑے انسان کے اندر پائے جاتے ہیں عزت نفس بلکہ یوں کہیے خدا کی عزت کے احساس کو پروان چڑھایا جانا چاہیے۔لیکن اس نازک پودے کی نشوونما مدتوں میں ہو پاتی ہے۔ہم اس کام کو کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں اور خود اپنی ذات کے تعلق سے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس کام کو سرانجام دیں۔''[3]

ماضی کی طرف دیکھنے کی تلقین انھوں نے ایک زمانے میں کی تھی۔لیکن اُس کی کمزوری اُن پر عیاں ہوگئی۔اور انھوں نے احیا پرستوں کے خلاف، جو قدیم اداروں اور رواجوں کی وکالت کرتے تھے۔شدید طعن وطنز کا حربہ استعمال کیا۔ہم کس چیز کا احیا کریں؟ کیا ہمیں اُن قدیم لوگوں کی عادتوں کا احیا کرنا چاہیے جب ہماری ذاتوں میں سے سب سے زیادہ مقدس ذاتوں کے لوگ اُن کے مرتکب ہوتے تھے۔جنھیں ہم اب بدتر اعمال سے تعبیر کرتے ہیں یعنی جانوروں کا گوشت کھانا اور شراب پینا۔کیا ہمیں بارہ قسم کے بیٹوں اور آٹھ قسم کی شادیوں کا احیا کرنا چاہیے جن میں بالجبر پکڑ لینا بھی شامل تھا اور ملے جلے اور ناجائز جنسی تعلقات کو تسلیم کیا جاتا تھا۔کیا ہمیں

---

[1] ایضاً، صفحات xiv-xiii

[2] ایضاً، صفحہ 172

[3] ایضاً

جانوروں کی اُس مذہبی قربانی کا احیا کرنا چاہیے جو سال کے ایک سرے سے دوسرے تک جاری رہتی تھی اور جس میں دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے انسانوں کو بھی قربان کر دیا جاتا تھا۔ کیا ہمیں بائیں ہاتھ کی شکتی پوجا کا احیا کرنا چاہیے جس میں ناشائستہ حرکتیں کی جاتی تھیں اور عمل عیاش کا مظاہرہ کیا جاتا تھا؟ کیا ہمیں ستی، بچوں کو مار دینے کے رواج، زندہ لوگوں کو دریا میں پھینک دینے، چٹانوں پر گرانے، کانٹوں میں لٹانے یا جگن ناتھ کے رتھ کے نیچے داب دینے کا احیا کرنا چاہیے۔[1]

اس سلسلے میں اہم ترین سوال یہ تھا کہ ماضی کے کس دور کا احیا کیا جائے سماج ایک جسم نامی ہے جس میاں لگاتار تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ دستور بدلتے رہتے ہیں اور اداروں، قانونوں، رواجوں مذہبی تصوروں اور عقیدوں میں ترمیم وتحریف ہوتی رہتی ہے۔ جو مرنے کے بعد دفن کر دئے جاتے ہیں یا جلا دئے جاتے ہیں وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جاتے ہیں اور اس لیے اُن کو دوبارہ زندہ نہیں کیا جا سکتا۔[2] ماضی کو صرف ایک نئے جسم نامی کی شکل دی جا سکتی ہے اور اُس کو سماجی اصلاح کہتے ہیں۔

جن اصلاحات کی انھوں نے متواتر و مسلسل وکالت کی اُن میں مندرجہ ذیل اہم ترین تھیں انسانوں میں برابری اور مساوات قائم کرنا جس میں ذات پات کی تقسیم اور مختلف ذاتوں کے درمیان شادی بیاہ کرنا شامل تھا، بچوں کی شادی کی مخالفت، بیواؤں کی شادیوں کے تعلق سے قانون بنانا، عورتوں کو پردے میں رکھنے کی مخالفت اور تعلیم نسواں کی ترقی۔ اس کے علاوہ ایسے تمام غیر معقول اور ظالمانہ رواجوں اور طریقوں کو منسوخ کرنا جو انسان کی تذلیل کا باعث ہیں۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ سماجی اصلاح کا مقصد تھا فرد کی طہارت اور خاندان، گاؤں قبیلے اور قوم کو نئے سانچوں میں ڈھالنے کا عمل۔

رانا ڈے نے مذہب اور سماج کے تعلق سے جس فلسفے کی بنیاد ڈالی وہ مغربی نظریے سے مملو تھا۔ اس کے علاوہ کہ انھوں نے خدا پرستی، انسانی مساوات، سماجی آزادی، تیاگ وسنیاس کی

---

1 ایضاً، صفحات 71-170

2 ایضاً، صفحہ 171

مخالفت اور عمل پذیری کے تصورات مغرب سے حاصل کئے تھے۔ ایک اور قابل قدر چیز مغرب سے انھوں نے مستعار لی تھی اور وہ تھی فرد اور سماج کے مسائل کے تعلق سے دانش ورانہ طریق عمل۔ ان کا رویہ معروضی اور ناقدانہ تھا اور اُن کا طریق کار بڑی حد تک تاریخی اور حسب ضرورت استخراجی تھا، اصلاحات کی کوشش کی بنیاد ترقی کے تصور میں اُن کے یقین پر قائم تھی۔ لیکن اُن کے نزدیک ترقی کے معنی محض مادی ترقی بلکہ علم کی ترقی ہی نہیں تھے۔ وہ ترقی کے معنی اخلاقی اور روحانی ترقی سمجھتے تھے۔ اُن کا خیال یہ بھی نہیں تھا کہ ترقی انسانی فلاح کی طرف ایک راہ مستقیم نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان کے ماضی میں ایسے کئی دور گزرے جو آج کے مقابلے میں مادی اور اخلاقی اعتبار سے زیادہ شاندار تھے۔ جو زمانہ بعد میں آتا ہے۔ وہ لازمی طور سے گزشتہ زمانے سے بہتر نہیں ہوتا ہے۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ کسی ملک کی تاریخ کا کوئی زوال پذیر دور ایک مستقل زوال اور ناقابل اصلاح تنزل کا پیش خیمہ ہو۔ اُن کا خیال تھا کہ ترقی نام ہے سماجی زندگی کی پیش رفت کا جس میں فرد ایک آزاد آلۂ کار کا رول ادا کرتا ہے۔

ہندوستان کی تاریخ پر ان اصولوں کا اطلاق کر کے راناڈے اِس نتیجے پر پہنچے کہ تاریخ نشیب وفراز اور امن واستحکام کے بعد انتشار و بدنظمی کی داستان ہے۔ جس کا سبب ہے اخلاقی گراوٹ اور جارحانہ بیرونی مداخلت۔ ہر حال میں خدا اپنے کرم اور فضل کے لیے انسانی ضمیر کو استعمال کرتا ہے۔ اور ہر بُرا واقعہ خدا کی مرضی سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے تعلق سے اُن کا کہنا ہے۔

''اس بات کو آسانی سے تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ خدا کی یہ مرضی تھی کہ اس ملک میں رہنے والی اس بڑی آبادی کو ایک غیر ملکی حکومت کے اثر اور قید میں صدیوں تک رکھا جائے جب تک یہ تسلیم نہ کیا جائے کہ اس اثر وقید کا مقصد تھا لوگوں کے کردار میں وہ پختگی پیدا کر کے اُن کی بڑی خدمت سرانجام دینا جس کا ہندوستان کی نسلوں میں بہت فقدان تھا۔''[1]

''اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت مسلمانوں کی حکومت کی بنا پر زوال اور بددیانتی کا شکار

---

[1] مرحوم آنریبل مسٹر جسٹس۔ ایم۔ جی۔ راناڈے کی متفرق تحریریں، ناشر مسز رام بائی راناڈے، بمبئی، 1910 صفحات 220-219

ہونے کے بجائے جب اس کی عنان اُن مسلمان اور ہندو سیاست دانوں کے ہاتھوں میں تھی جو رواداریوں اور مساوات کی پالیسی پر عمل کرکے ملک کو خوش حال بنا رہے تھے، مقامی نسلوں نے طاقت حاصل کی۔ اشوک کے بعد قدیم ہندو خاندانوں میں وہ طاقت باقی نہیں رہی تھی جو اتحاد کی دین ہوتی ہے اور ان پر آسانی سے مسلمان حملہ آوروں نے غلبہ حاصل کرلیا۔''[1]

اس کا ذکر کرنے کے بعد کہ ''دوسرے سینکڑوں طریقوں سے مسلم حکومت نے ہندوؤں کے طور طریق اور مذاق میں نفاست پیدا کرنے میں مدد دی۔''[2] انھوں نے کہا کہ ''اس میل ملاپ کے زیادہ دوررس نتائج یہ ہیں کہ اُس نے لوگوں کے مذہب اور تصورات کو بہتر لہجہ عطا کردیا۔''[3]

آخر میں انھوں نے کہا ''اگر ماضی کے درس کی کچھ قدر و قیمت ہے تو ایک بات واضح ہونی چاہیے یعنی اس وسیع ملک میں کسی ترقی کا امکان اُس وقت تک نہیں ہے جب تک ہندو اور مسلمان مل کر کام نہ کریں اور ان لوگوں کی تقلید کرنے کا ہم ارادہ نہ کرلیں جو اکبر کے زمانے میں اس کے صلاح کار اور مشیر تھے اور ان غلطیوں سے بچنے کی امکانی کوشش نہ کریں جو اس کے پر پوتے اورنگ زیب نے کی تھیں۔''[4]

رانا ڈے کی نظر میں ہندوستان کے مستقبل کی تصویر تھی ایک ایسی بڑی قوم کی تصویر جو اپنے ماضی پر فخر کرنے کے ساتھ خدا کی مرضی کے مطابق ایک روشن مستقبل کی طرف گامزن ہو، جس میں مساوات اور آزادی کے تصورات پر متحد ہو کر ثابت قدمی کے ساتھ عمل کیا جائے، جو سماجی خرابیوں سے پاک ہو اور ضمیر و اخلاق کی آواز جس میں حرکت پیدا کرتی رہے۔

IV۔ وید سماج

بنگال میں جو اصلاح کی تحریک شروع ہوئی تھی اُسے کیشپ چندر سین نے مہاراشٹر اور تامل ناڈو تک پہنچا دیا۔ 1864 میں وہ مدراس گئے اور اپنی پُر اثر تقریروں کے ذریعہ انھوں نے لوگوں

---

[1] ایضاً، صفحہ 223

[2] ایضاً

[3] ایضاً، صفحہ 224

[4] ایضاً، صفحہ 226

کو ویدسماج قائم کرنے پر آمادہ کرلیا۔ اس سماج کی سرپرستی میں ہر ہفتے پراتھنا سبھائیں ہوتی تھیں۔ اور اس کے نظریات کا پرچار کرنے کے لیے ایک اخبار جاری کیا گیا۔ اس کے اوّلین رہنماؤں میں اہم ترین وی راج گوپال، چارلو اور پی۔ سبرا بالا چٹی اور ایک رٹائرڈ جج اور تیلگو کے مصنف وشوناتھ مدالیر شامل تھے۔لیکن اس تنظیم کے حقیقی بانی تھے نوجوان کے۔سریدھرالونائڈو جو ایک پُرجوش، وسیع النظر اور ہونہار مگر غریب شخص تھے۔انھوں نے کلکتہ کا سفر کیا، برہمو تحریک کا مطالعہ کیا اور مدراس واپس آنے کے بعد 1871 میں ویدسماج کو جنوبی ہندوستان کے برہمو سماج میں تبدیل کر دیا۔ پرانے طریقوں کی جگہ انھوں نے نئے روحانی مذہب کو رواج دیا اور برہمو دھرم کی کتابوں کا ترجمہ تامل اور تیلگو میں کیا۔ اور مذہب کی تبلیغ کی خاطر تبلیغی دورے کئے۔ بدقسمتی سے وہ 1874 میں ایک حادثے کے شکار ہو گئے۔

ان کی افسوسناک موت کے بعد سماج میں جھگڑے شروع ہو گئے۔ کچھ اراکین سریدھر الونائڈو کے مذہب پر قائم رہے جو کیشپ چندر کے چیلے تھے۔لیکن اکثریت نے سادھارن برہمو سماج کی طرح کی ایک انجمن قائم کر لی لیکن اس جھگڑے کی بنا پر تحریک کمزور اور اس کی مقبولیت کم ہوگئی۔

رام موہن رائے اور مہادیو گوند رانا ڈے انیسویں صدی کی دو قدآور شخصیتیں تھیں جنھوں نے ہندوستان کی آزادی کے لیے اپنے خوف اور کمزوریوں کو بھلا کر آگے بڑھے اور اپنے فرائض پورے کر لیے۔ وہ دونوں اپنے وقت سے آگے تھے اور حالانکہ ان کے ہم وطنوں نے ان کے پیغام پر فوری توجہ نہیں دی پھر بھی ان کے نقشِ پا چراغِ راہ بن کر اُس منزل کی نشان دہی کر رہے ہیں جس کی طرف ہندوستان کے لڑکھڑاتے قدم بڑھ رہے ہیں۔

کیشپ چندر سین کی خدا پرستی نے ایک کارنامہ اور جذباتی انتخابیت کا روپ اختیار کر لیا یعنی انھوں نے مختلف مذاہب کے عقائد میں سے کچھ کو چُن لیا۔ اُن کا مذہب ہندو دھرم سے کوئی تعلق نہیں رکھتا تھا۔ برہمو سماج کی تین شاخوں میں سے ''آدی سماج'' کا زوال ہو گیا اس لیے کہ وہ اور ہندو دھرم قریب قریب یکساں تھے۔ کیشپ چندر کے ''نوودھان'' کو اس کے بانی کی ضرورت سے زیادہ انفرادیت نے نقصان پہنچایا۔ صرف ''سادھرن سماج'' بحال اور متواتر ترقی کرتا رہا۔

اس کے مبلغین، خدمت خلق کی تنظیموں اور اخباروں نے اس کو بہت فائدہ پہنچایا۔

راناڈے نے ایک ایسے مذہب کی تعلیم دی جس میں غالب عنصر عقلیت پسندی تھی حالانکہ دل کے تقاضوں کو بھی نظرانداز نہیں کیا گیا تھا۔لیکن ان کی پکی دینداری اور اُن ہندو رسموں کی خدمت کی بنا پر، جو اپنی فرسودگی کے باوجود لوگوں کو بہت عزیز تھیں، قدامت پرست مذہبی رہنماؤں کو موقع مل گیا کہ مغرب کے غلبے کے خلاف بے اطمینانی سے فائدہ اٹھا کر احیا پرستی کی تحریکوں کو مقبول بنائیں جو آزادی کے زمانے میں بزرگوں کے کارناموں کو لوگوں میں فخر و مباحات کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتی تھیں۔ بنگال اور مہاراشٹر دونوں جگہ لبرل اور ریڈیکل تحریکوں کو نقصان پہنچا۔

V۔ بنگال میں احیاپرستی کی تحریک

1870 کے لگ بھگ بنگال میں اور 1880 کے قریب مہاراشٹر میں احیاپرستی نے برہمو سماج اور پرارتھنا سماج کی مقبولیت اور کم کرنا شروع کر دیا اور عقلیت پسندی کی جگہ ہندو دھرم کی وہ آواز سنائی دینے لگی جس کی بازگشت تقریباً 40 سال سے ملک میں گونج رہی تھی۔کئی واقعات نے مل کر اس رجحان کو جنم دیا تھا۔ بنگال میں متوسط طبقے کے ہندوؤں کے ایک کٹر گروہ نے بہت پڑھے لکھے صوبھا بازار کے رادھا کانت دیب کی قیادت میں 1830 میں رام موہن رائے کی لبرل برہمو سبھا کے مقابلے میں دھرم سبھا قائم کرلی تھی لیکن نوجوان بنگال ریڈیکل اور خدارسیدہ دوارکاناتھ ٹیگور اور اُن کے بیٹے ربندرناتھ کی طرح کے مصلحین کی کوششوں کی وجہ سے اُن کی تحریک زیادہ ترقی نہ کرسکی۔ یہ دونوں تقریباً نصف صدی تک ملک پر چھائے رہے۔اصلاح کی تحریک کی حمایت اکشے کماردت (1820۔1886) ، ایشور چندرودیاساگر (1830۔1891)، رام تنولاہری (1813۔1898)، راج نرائن بوس (1899 1826) اور دوسرے حضرات نے کی جس کی وجہ سے برہموسماج کی شہرت میں بہت اضافہ ہوگیا۔

لیکن 1857 کی بغاوت کے بعد برسوں میں ملک کے سیاسی ماحول میں ایک تبدیلی رونما ہوئی۔ نئے حالات نے سماجی رجحانات کو تبدیل کرنا شروع کیا۔ مذہبی فکر میں ریڈیکل تصورات کا

اثر اور سماجی اصلاح کی ضرورت کا احساس کم ہونے لگا اور رجعت پسندانہ رجحانات ابھرنے لگے۔انیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں یہ تبدیلی زیادہ واضح ہوگئی۔

1858 کے بعد جن دو تحریکوں نے بنگالیوں کے ذہنوں کو زیادہ سے زیادہ متاثر کیا وہ تھیں قوم پرستی اور روحانیت کی تحریکیں۔ یہ دونوں عام انسانی لگن کی پیداوار تھیں یعنی انفرادی خود اظہاری اور قوم کے ماضی پر فخر، حکمراں طبقے کی نخوت اور زور زبردستی کے خلاف نفرت، دیہات کی آبادی کی بڑھتی ہوئی غربت اور دکھوں سے ہمدردی کے احساس اور آزادی اور مساوات کی خواہش نے انھیں جنم دیا تھا۔ان خواہشات نے سیاسی آزادی کی خواہش میں اضافہ کردیا۔جس کے بغیر بڑے پیمانے پر سماجی اصلاح بھی نہیں کی جاسکتی۔

ماضی پر فخر کے جذبات کو سب سے پہلے مذہبی تحریکات نے اُبھارا۔تاریخی مطالعوں اور کھدائی کرنے والوں اور ہندوستان کی تاریخ کے ماہروں کی دریافتوں نے اُسے تقویت پہنچائی۔ قدیم ادبیات، فلسفہ، سائنس، قانون، فنون اور یادگاریں جو تاریخ کے اندھیروں میں گم ہوگئی تھیں، ایک دفعہ پھر منظر حیات پر آئیں اور ان کی وجہ سے دنیا میں ہندوستان کی شہرت میں بہت اضافہ ہوگیا اور یہاں کے لوگوں میں خودداری کا جذبہ پیدا ہوگیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی تہذیب کے خلاف ایک نفرت کا جذبہ پیدا ہوگیا اور مغرب کے غلبے کو رد کرنے کی خواہش نے جنم لیا۔اس تحریک کے بہت سے حامی پیدا ہوگئے جس کو نو ہندو دھرم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔لیکن یہ دو واضح دبستانوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ان میں ایک ہر طرح کی اصلاح کے خلاف تھی اور دوسری شروعات میں تبدیلی کی ضرورت کو تسلیم کرتی تھی لیکن بنیادی اصولوں میں نہیں۔پہلی تحریک میں پیش پیش تھے سسادھر چرڈامنی اور دوسری میں بنکم چندر چٹرجی۔

سسادھر قدیم ہراتک رسوم وروایات کے حامی تھے وہ ہندوؤں کی مقبول عام رسموں اور سماجی رواجوں کی حمایت کرتے تھے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ ان کی بنیاد سائنس کے قوانین پر قائم ہے۔اُن کے متعلق ٹیگور نے اپنی یادداشتوں میں لکھا تھا، پنڈت سادھر کے دبستان فکر میں...... احمقانہ حد تک کوشش کی گئی ہے کہ موجودہ توہمات کی نام ونہاد سائنسی جواز پر توجہ کی جائے۔[1]

---

[1] ٹیگور، رابندر ناتھ، ایجنسی سینسر، لندن، 1961 صفحہ 251

نو ہندو بندو دھرم کے رہنماؤں میں جو لوگ سسا دھر چرامنی کے تصورات سے قریب تر تھے وہ تھے کرشن پرستا سین، نیسین چندر سین اور ہیم چندر بندرو پادھیہ۔ کرشن پرستا سین ذہنی سطح پر کام نہیں کرتے تھے۔ اور مذہب کے متعلق اُن کی بحث بھونڈی ہوتی تھی۔ نیسین چندر سین، جو بنیادی طور پر شاعر تھے، اُس زمانے کے سماجی اداروں کے متعلق مخصوص رائے رکھتے تھے، وہ وحدانیت میں یقین رکھتے تھے۔ لیکن بت پرستی میں بھی اُنھیں کوئی برائی نظر نہیں آتی تھی اُن کا کہنا تھا کہ ذات پات کا نظام، کم عمری کی شادی اور اپنی ذات میں شادی کرنے کے قدیم سماجی رواجوں میں بھی کچھ اچھائیاں ہوں گی۔ مغرب کے سیکولر تعلیمی نظام کے کٹّر مخالف تھے جو رفتہ رفتہ بنگال میں رواج پا رہا تھا اور وہ شد و مد کے ساتھ اس امر کی وکالت کرتے تھے کہ تعلیم کا مقصد مذہب کو بحال رکھنا اور ترقی دینا ہونا چاہیے۔

نیسین چندر کی طرح ہیم چندر بندو پادھیہ بھی پرانے خیال کے ہندو تھے۔ 1857 میں انھوں نے سری کرشن کی زندگی کے حالات کے متعلق ایک طویل مضمون لکھا تھا۔ جو بعد میں کتاب کی شکل میں شائع ہوا۔ اُنھوں نے اپنی کتاب برہموتھی ازم ان انڈیا (ہندوستان میں برہمو خدا پرستی) میں اس امر کی وضاحت کی تھی کہ تعلیم یافتہ ہندوؤں کو برہمو سماج میں شامل نہیں ہونا چاہیے۔

بنکم چندر چٹرجی (1838۔1894)

بنگال میں تحریک کے سب سے زیادہ با اثر پیش رو تھے بنکم چندر چٹرجی وہ اُس بیداری کی نمائندگی کرتے تھے جو اُنیسویں صدی کے قدیم ملکوں میں نظر آ رہی تھی۔ اُن سے پہلے قدامت پسند ہندو دھرم کی حفاظت کی ذمہ داری رادھا کانت دیب (1784۔1867) کی قیادت میں دھرم سبھا پر تھی لیکن اس قسم کے حالات ہندوستان کے دوسرے حصوں یعنی جنوب میں مادھوؤں، سری ویشنوؤں، شوسدھانتوں، لنکا تیوں سحرتوں میں اور وسطی ہندوستان کے ویشنوؤں کے علاوہ بنگال کے چیتنیہ کے ماننے والوں میں پائے جاتے تھے۔ وہ کانفرنسیں کرتے تھے، مذہبی مطالعوں کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ اپنے عقائد کی حمایت تحریروں میں شائع کرتے تھے تعلیمی ادارے قائم کرتے تھے اور مذہبی سرگرمیوں کا انتظام کرتے تھے۔

بنکم چندر میں قوم پرستی کے احساس کے ساتھ دین داری بھی پائی جاتی تھی۔ انگریزی تعلیم اور کانٹ، فشٹے، بینتھم، مل اور اسپینسر کے فلسفے کے نظاموں کے مطالعے نے اُن میں تنقیدی صلاحیت کو ابھار دیا تھا۔ آگست کومتے کے ثبوتیت نے اُن کے ذہن پر گہرا اثر ڈالا تھا۔ وہ مغربی سائنسوں کے مطالعے کی شدومد کے ساتھ وکالت کرنے لگے لیکن چاہے وہ بینتھم کا افادیت اجتماعی ہو یا اسپینسر کا انقلابی فلسفۂ لذتیت یا کومتے کا منکر خدا ثبوتیت اُنھیں کوئی بھی مطمئن نہ کرسکا۔ ہندو فلسفے اور مذہب کے مطالعے سے اُنھیں ذہنی اطمینان نصیب ہوا لیکن مغربی فلسفے کے منہاجیات نے مذہب کی طرف ان کے رویے کو ایک خصوصی شکل دیدی تھی اور اُنھوں نے زندگی اور سماج کو درپیش مسائل کے تعلق سے ایک سائنسی، تنقیدی اور معقول طریقہ اختیار کرنے کی کوشش کی۔ ان کا مقصد تھا ایک آزاد نقطۂ نظر کی تشکیل، مغربی فکر کے غلبے کی تنسیخ اور لوگوں سے ایسی زبان میں گفتگو کرنا جسے وہ سمجھ سکیں۔

فلسفے سے اُن کی دلچسپی نے اُنھیں ہندو دھرم کا محافظ بنا دیا۔ عیسائی مشنریوں کے حملوں نے اُنھیں مناظرات پر آمادہ کردیا۔ اُنھوں نے محسوس کیا کہ جدیدیت کے چیلنج کا جواب نہ سسادھر کی طرح کے توہم پرست دے سکتے ہیں اور نہ برہموں کی طرح کے ریڈیکل۔ اس بحث نے اُن سے لیٹرز آن ہندوازم (ہندو دھرم کے متعلق خطوط) لکھوائے جن میں یوگیش چندر گھوش کو مخاطب کیا گیا ہے۔ ہندو سماج کو جن مسائل کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا اُن کا حل تھا اصل ہندو دھرم کا احیا سسادھر کا نام نہاد سائنسی جواز اُتنا ہی بے عمل تھا جتنی کیشپ کی انتخابیت، جوں جوں بنکم چندر معمر ہوتے گئے، ان کے اعلیٰ مشن کا احساس بڑھتا گیا۔ اُن کو روز افزوں یقین ہوتا گیا کہ ہندوستان کے مسئلے کا حل ہے۔ ہندو دھرم کا احیا یعنی گیتا کے اُس عارفانہ اور وجدانی مذہب کا احیا جس کی تشریح جدید ہندوستان سے لی گئی تھی اُنھوں نے اپنے تصورات دو جلدوں میں قلم بند کئے یعنی دھرم سدھانت (مذہب کے اصول) اور کرشن چرتر (کرشن کی زندگی اور کردار)۔

وہ مغرب کو سماج کی اخلاقی اور سیاسی حیات نو کا ذریعہ سمجھتے تھے اُنھوں نے کہا تھا ''مذہب کو اجتماعی افادیت کے تصور سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔[1] جہاں تک ہندوستان میں سماجی اصلاح

---

[1] چٹرجی، بنکم چندر، کرشن چرتر، تدوین بی۔ این۔ بندوپادھیہ اور ایس۔ کے۔ داس کلکتہ، 1940، صفحہ 283

کے مسائل کا تعلق تھا۔ اُن کا طریقہ کار دوسرے ترقی پسند مصلحین سے مختلف تھا۔ وہ جزوی اصلاحات کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور اُن کا خیال تھا کہ مذہبی اور اخلاقی حیات نو سماج کو ڈھالنے کا موثر طریقہ ہے۔ اُن سماجی رسموں اور رواجوں پر حملے کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا جو صحیفوں سے زیادہ سماج کی شیرازہ بندی کرتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ فرد کی شخصیت پوری طرح نشوونما پائے۔ یہ ہم آہنگ ترقی انوسیلان دھرم (نظم وضبط کا مذہب) ہے جس کی بنیاد ہے بتدریج ترقی ہوئی چار قسم کی انسانی محبتیں یعنی اپنے آپ سے محبت (آتم پرستی)، خاندان کے لیے محبت (سواجن پرستی)، ملک کی محبت (سودیش پرستی) اور بنی نوع انسان سے محبت (جگت پرستی)۔

محبت کا سب سے اعلیٰ درجہ یعنی بنی نوع انسان سے محبت ہی خدا سے محبت ہے۔ ملک سے محبت کرنا ہمارا سب سے بڑا انسانی فرض ہے جو اپنے آپ یا اپنے خاندان سے محبت کرنے سے زیادہ اعلیٰ وارفع ہے۔ بنکم کا قول تھا ''جب وطن مذہب ہے اور مذہب ہندوستان سے محبت کا نام ہے اس مذہب کی مقدس کتاب بھگود گیتا تھی جو بے لوث خدمت اور نتائج سے بے نیاز ہو کر عمل کرنے کا درس دیتی ہے۔''

اُنھوں نے کرشن چرتر میں نہ صرف کرشن کی مذہبی تعلیمات سے بحث کی ہے بلکہ ہندو سماج کی ترقی کے لیے اُن کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ اُنھوں نے لکھا ''انھوں نے (کرشن نے) کبھی سماجی مصلح بننے کی کوشش نہیں کی۔ اُن کا مقصد تھا سماج کی اخلاقی اور سیاسی حیات نو، مذہب کو پھیلانا اور مذہب کی بنیادوں پر حکومت قائم کرنا۔ اگر یہ ہوسکے تو سماج میں ازخود اصلاح ہوجائے گی اُس کے بغیر سماجی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ ہم سماجی مسائل کی طرف آزادانہ رویہ اختیار کر کے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ مذہبی ترقی ہی سیاسی ترقی کی بنیاد ہے۔ چنانچہ ہر شخص کو مذہب کو ترقی دینے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر ایسا ہوسکے تو سماج کی اصلاح کے لیے کسی کوشش کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ [1] بنکم کے مطابق کرشن ایک مثالی انسان تھے، انسانی شخصیت کی تکمیل اور ''سب سے زیادہ سوجھ بوجھ رکھنے والے اور عظیم ترین ہندو''۔ خدا ویدانتوں کے خدا کی طرح ذات محض، صفات سے عاری اور قایم بالذات نہیں ہے۔ جیسا کہ کرشن نے کہا ہے خدا ایک

[1] ایضاً

شخصیت ہے صفات رکھتا ہے۔ انسانوں سے محبت کرتا ہے اور کریم ہے۔ کرشن سب سے بڑے علم اور اس مذہب کے بہترین نمونہ ہیں۔

دھرم تتو میں کرشن کی وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ وہ جنھوں نے اپنے زور بازو سے شر پسندوں کو شکست دی، اپنی سمجھداری سے ہندوستان کو متحد کیا اپنے علم کی طاقت سے ایک عجیب و غریب بے لوث مذہب کا اعلان کیا۔ میں اُنھیں سلام کرتا ہوں وہ جنھوں نے اس ملک میں جس کی قوت تھے۔ ویدا ُس وقت جب ویدوں میں طاقت تھی کہا ''دھرم ویدوں میں نہیں ہیں دھرم وہ ہے جو انسان کی فلاح و بہبود کا باعث ہو'' وہ خدا ہو یا انسان میں اسے سلام کرتا ہوں۔ وہ جن کی ذات واحد میں بودھ، یسوع، محمد اور رام چندر شامل ہیں، وہی ہر طاقت ہر خوبی، ہر مذہبی حقیقت اور ہر قسم کی محبت کا سرچشمہ ہیں چاہے وہ خدا ہوں یا نہ ہوں میں اُنھیں سلام کرتا ہوں۔[1]

جس ہندو دھرم کی بنکم نے تعلیم دی وہ انسانی زندگی کے ہر شعبے پر حاوی تھا یہ زندگی سے لذت یاب ہونے اور تیاگ کا آمیزہ تھا اور بغیر کسی مسئلے کی تمنا کے عمل کرنے کا اصول۔ اُس نے وہ اخلاقی بنیاد فراہم کردی جس پر ہندو سماج اور ریاست کی تعمیر کی جاتی تھی۔ لیکن ہندو دھرم پر اُن کی توجہ اس طرح مرکوز ہو کر رہ گئی تھی کہ ہندوستانی سماج کی گوناگوں نوعیت اُن کی نظروں سے اُجھل ہوگئی اور محض ہندو فرقے کی اخلاقی اور سیاسی حیات نو پر توجہ دے سکے۔

بنکم چندر کی طرح بھودیو چندر مکھو پادھیہ بھی نو ہندو دھرم کے حامی تھے اس تحریک کے حامیوں میں بھودیو کا موقف بنکم اور سسادھر کے بہت قریب تھا۔ بنکم کی طرح اُنھوں نے بھی مغربی فلسفے کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ بھودیو نے کامتے کے بہت سے حوالے دیے ہیں۔ اپنی کتاب سماجک پربندھ میں اُنھوں نے ثبوتیت کے اصول کا ذکر اور حمایت کی ہے کہ ''دوسروں کے لیے زندہ رہو اس کے علاوہ بنکم کی طرح مغربی فلسفے کے مطالعے کی بنا پر اُن کے دل میں ہندو دھرم کے لیے زیادہ احترام کا جذبہ پیدا ہوگیا۔ بھودیو کا خیال تھا کہ خود اُن کا مذہب زندگی کے ہر شعبے اور ہر فرد پر حاوی ہے۔ ان کا بھی یہ خیال تھا کہ ہندو دھرم کی عمومی نوعیت اُس کی اصل طاقت ہے۔ ایک جگہ اُنہ ن ھ نے کہا ہے۔

---

[1] چٹرجی۔ بنکم چندر، دھرم تتو، تدوین بی۔ این۔ بندو پادھیہ اور ایس کے داس، کلکتہ، 1940 صفحہ 21-20

''ہندوستانیوں کا سناتن ہندودھرم لازوال، ابدی اور ہر قسم کے حالات میں مکمل کیوں ہے؟''

اس لیے کہ یہ مذہب سب کے لیے ہے اور دردمندی اور رحم دلی کا مظہر ہے جس کا دروازہ ہر قسم کے سادھنوں اور ہر طرح کی تلاش وجستجو کرنے والوں کے لیے کھلا ہوا ہے۔'' چونکہ ہندودھرم کی عمومی نوعیت پر بھودیو زور دیتے تھے اس لیے دوسرے مذہب کی طرف اُن کا رویہ رواداری پر مبنی تھا۔ اُنھوں نے اپنی خودنوشت سوانح عمری میں لکھا ہے۔''چونکہ ہندودھرم کا مقصد دوسروں کو اپنے اندر شامل کرنا ہے اس لیے وہ کسی مذہب سے نفرت نہیں کرتا ہے۔ ایجوکیشن گزٹ کے کسی مضمون میں برہمو، مسلمانوں اور عیسائیوں کے خلاف کچھ نہیں لکھا جانا چاہیے۔[1] جہاں تک مذہب کے وسیع تر مقصد اور صراحت کا تعلق تھا بھودیو کو بنکم سے پورا پورا اتفاق تھا ان کے نزدیک اس کا اصل مقصد تھا انسانیت کی بقا اور انسان کی فلاح۔ ''سماجک پربندھ'' میں اُنھوں نے لکھا ہے۔

''انسان کو مذہبی ہونا چاہیے جو کہ مذہب بحال و برقرار رکھتا ہے۔ مذہب برقرار رکھتا ہے۔ محافظت کرتا ہے۔ اس لیے ممکن ہے کہ اُس سے وقتی لذت حاصل نہ کی جاسکے۔''[2]

اس قسم کی اتفاق رائے سے ممکن ہوسکا اس لیے کہ بنکم کی طرح بھودیو بھی تعلیم کو توسیع دیکر، غربت وافلاس کو دور کرکے اور دولت میں اضافہ کرکے سماج کو مادی اور اخلاقی حیات نو دینا چاہتے تھے۔ سماجک پربندھ میں اُنھوں نے ان باتوں پر روشنی ڈالی ہے۔[3]

رام کرشن پرم ہنس (1836۔1886)

بنکم کے برعکس کی کشنیشور کے خدا رسیدہ رام کرشن پرم ہنس کی حیاتِ کار ایک عجوبہ کا حکم رکھتی تھی، رام کرشن 1836 میں پیدا ہوئے اور پچاس سال کی عمر میں 1886 میں اُن کا انتقال ہوگیا۔ اس مفلس، ناخواندہ، دبلے پتلے، نفاست سے مبرا، بیمار، نیم بت پرست اور بے

---

[1] بھودیو لکھو پادھیہ، بھودیو چرت، کلکتہ حصہ سوم، صفحہ 310

[2] بھودیو لکھو پادھیہ، سماجک پربندھ، صفحہ 291

[3] ایضاً، صفحات، 307 تا 231

یارومددگار ہندو بھکت'' نے بنگال کو ہلا دیا۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ دکشنیشور کے مندر میں، جہاں وہ رہتے اور پوجا کرتے تھے، جوق درجوق آنے والوں کے لیے وہ چراغِ ہدایت کا کام کرتے تھے بلکہ اُنھیں صبر وسکون کے ساتھ تکلیفوں اور دکھوں کو برداشت کرنے اور روحانی اطمینان ومسرت حاصل کرنے میں بھی مدد دیتے تھے۔ اسی کے ساتھ اُن کے اندر مغرب سے متاثر متوسط طبقے کے لیے بھی کشش تھی۔ جوان کی انکساری، انسان دوستی اور روحانی دیانت داری سے بڑے متاثر تھے۔ چنانچہ کلکتہ یونیورسٹی کے گریجویٹ نریندر ناتھ دت (بعد میں جو ویویکانند کے نام سے مشہور ہوئے) کشیپ چندرا اور دوسرے لوگ یا تو ان کے ساتھ رہنے کو آئے تاکہ اُن کی تعلیمات کو پھیلانے کے لیے اپنی زندگیاں وقف کردیں یا اُن کا اتنا اثر قبول کیا کہ خود اُن کا نقطۂ نظر بدل گیا۔

رام کرشن خدا کی محبت سے سرشار عارف تھے۔ جنھیں ہر قسم کی عبادت میں ایک خالق مطلق کی محبت کا عکس نظر آتا تھا اور جن کی نظر میں ہر مذہبی تلاش وجستجو ''ایک ہی خدا کی تلاش تھی جس کی طرف ہر شخص کے قدم بڑھتے ہیں حالانکہ راستے مختلف ہیں۔'' اپنی نسل کی روحانی میراث سے پوری طرح واقف اور ویدانت اور اپنشدوں سے ہدایت حاصل کرنے والے رام کرشن ہر مذہب کو ایک ہی منزل کی طرف جانے کے مختلف راستے تصور کرتے تھے اور اپنے عارفانہ تجربات میں وہ ہر فرقے کے لوگوں کو شامل کرنا چاہتے تھے۔ اسلام کی تعلیم انھوں نے ایک مسلم صوفی سے حاصل کی اور انجیل پڑھوا کر سنا کرتے تھے سکھ گروؤں کا وہ بڑا احترام کرتے تھے اور مصر رہتے کہ عالم میں اُنھیں مقدس ماں کالی اور کرشن کے علاوہ یسوع مسیح اور بدھ کے بھی درشن ہوئے جیسا کہ ویویکانند نے اُن کے متعلق لکھا ہے ''بظاہر وہ ایک بھکت تھے لیکن باطنی طور سے وہ روح مقدس تھے۔[1] ان کے وجد آفریں تجربات نے اُنھیں خدا سے قریب کردیا۔ اور انسان میں ایزدی خصوصیت پیدا کردی۔ مذہب سے اُن کی محبت نے اُنھیں ہر اُس چیز کو ترک کرنا سکھادیا جو عرفانِ ذات اور بنی نوع انسان کے لیے محبت اور شفقت کی راہ میں حائل تھی۔ خدمت خلق نے اُنھیں

[1] رولنڈ روحالی، The life of Vevekananda and The Universal Gospel (جے۔ فرانسیسی لے ڈاکٹر مالکم اسمتھ نے ترجمہ کیا، مایاوتی، الموڑا، ہمالیہ، 1953) صفحہ 84

زندہ پیار کرنے اور دکھ جھیلنے والی انسانیت سے واقف کرا دیا۔ ان کی دُعا تھی ''اے ماں مجھے حقیر انسانوں کی خدمت کا موقع دے[1] اور وہ اپنے لمبے لمبے بالوں سے گھر میں جھاڑو دیتے تھے۔ اُن کی تعلیم تھی ''مہربانی نہیں خدمت۔ انسان کی خدمت کو خدا سمجھنا چاہیے۔'' جس وقت وہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ اُس وقت بھی لوگوں کا انبوہ اُنھیں دیکھنے اور اُن کی باتیں سننے کے لیے آتا تھا۔ اور کوئی بھی اُنھیں گفتگو کرنے سے باز نہیں رکھ سکتا تھا۔ لوگوں کے ہمدردانہ گلے کے جواب میں وہ کہتے تھے ''مجھے فکر نہیں ایک انسان کی مدد کرنے کی خاطر میں ایسے بیس ہزار جسم چھوڑ سکتا ہوں۔ ایک انسان کی مدد کرنا بھی بڑا شاندار کام ہے۔''[2]

ویویکانند

رام کرشن کی انسان دوستی کے ایک پرجوش وکیل تھے اُن کے عزیز شاگرد ویویکانند۔ ویویکانند 1863 میں پیدا ہوئے اور کلکتہ میں تعلیم پائی۔ اُن کے خدوخال جاذب نظر، کسرتی بدن اور چہرہ خوبصورت تھا۔ وہ بڑے ذہین تھے۔ اُن کی ذہانت پر مغربی فلسفے نے اور جلا کردی تھی۔ انھوں نے بڑی دقت نظر کے ساتھ ڈسکارٹز، کانٹ، اسپینورا، ہیگل، شوپنہارو، کامتے، ڈارون اور مل کی تصنیفات کا مطالعہ کیا تھا۔ جس نے اُس کی تنقیدی اور تجزیاتی صلاحیت کو ابھار دیا تھا۔ پہلے وہ ''برہموسماج'' کی تعلیمات سے متاثر ہوئے لیکن اُن کے سائنسی مطالعے نے خدا پرستی میں اُن کا اعتقاد ختم کر دیا۔ اُس کے بعد وہ رام کرشن کے زیر اثر آ گئے۔ اُس وقت اُن کی عمر پوری بیس سال کی بھی نہیں تھی۔ اب تو اُن کی زندگی میں ایک انقلاب آ گیا۔ وہ سنت رام کرشن کے پکّے پیرو بن گئے۔

اپنے اُستاد کے انتقال کے وقت ویویکانند کی عمر صرف پچیس سال کی تھی۔ اُنھوں نے عہد کیا کہ رام کرشن کی تعلیمات کو پھیلانے کے لیے وہ اپنی زندگی وقف کر دیں گے۔ اُنھوں نے دنیا ترک کر دی، سیر و سیاحت کی زندگی گزارنے لگے۔ اور ہمالیہ کے جنگلوں میں سکونت اختیار کر لی۔

---

[1] ایضاً، 92

[2] The Complete Works of Swami Vivekananda مایاوتی میموریل اڈیشن (مایاوتی، الموڑا 1945، جلد چہارم، صفحہ 181

چھ سال تک جس نظم و ضبط کے ساتھ اُنھوں نے زندگی گزاری تھی اُس نے اُن میں بڑا توازن، ذہنی سکون اور یقین کامل پیدا کر دیا تھا جو عمر بھر اُن کی مشق کی امتیازی خصوصیتیں بنی رہیں۔ ایک جہاں گشت فقیر کی طرح جب اُنھوں نے ہندوستان کا دورہ کیا تو اُنھیں عام لوگوں کے دکھوں اور تکلیفوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ جس نے اُنھیں یہ کہنے پر مجبور کیا۔ ''میں صرف ایک خدا میں یقین رکھتا ہوں۔ جو تمام روحوں کا مجموعہ ہے اور سب سے بڑھ کے یہ کہ میرا خدا شر پسند ہے میرا خدا بیمار ہے میرا خدا ہر نسل سے تعلق رکھنے والا، مفلس و نادار ہے۔[1] یہ بڑی عجیب و غریب بات تھی عقلیت پسند ویویکانند میں رام کرشن کی ان تعلیمات نے جن کی بنیاد ویدانت کا قدیم ہندوستانی مذہب تھا اس سے ایمان وایقان پیدا کر دیا۔ جس سے ان کے ذہن اور روح دونوں نے تسکین پائی۔ اُن تعلیمات نے ہندوستانی روایت کی عظمت پر فخر کا جذبہ ایک روز پھر پیدا کر دیا جس کی جڑوں کو مغربی فکر نے روند ڈالا تھا۔ لیکن اُس کے سفر نے اُن پر روشن کر دیا کہ ان کے زمانے کا ہندوستان اخلاق اور مادی اعتبار سے کس حد تک گر چکا ہے۔

اُن کے دل میں طوفان برپا تھا اور روح سرد فشاں تھی اُنھوں نے تہیہ کیا کہ دنیا کی نظروں میں ہندوستان کی عظمت ثابت کریں گے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ ہندوستان کے دکھوں کا حق ادا کریں گے۔ 1893 میں وہ امریکہ گئے اور شکاگو میں منعقد ہونے والی مذاہب کی عالمی پارلیمنٹ میں حصہ لیا۔ اُن کی تقریر ہندوستان کی وسیع النظری کی عکاس تھی جس نے سامعین کے دلوں کو موہ لیا۔ اُنھوں نے کہا ''جس طرح مختلف دریاؤں کا پانی سمندر میں مل جاتا ہے اسی طرح مختلف مذاہب کی منزل خدا ہے''۔ نیویارک ہیرلڈ نے لکھا تھا ''مذاہب کی پارلیمنٹ میں بلاشبہ ویویکانند کی شخصیت سب سے قدآور ہے۔ اُن کی تقریر سننے کے بعد ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ان پڑھے لکھے لوگوں کی قوم کے لیے مشنری بھیجنا کتنی بڑی حماقت ہے۔''[2] ایک اور اخبار نے اپنے

---

[1] رولنڈ روحالی، The life of Vivekananda and The Universal Gospel (جسے فرانسیسی سی ڈاکٹر مالکم اسمتھ نے ترجمہ کیا، مایاوتی، الموڑا، ہمالیہ 1953، صفحہ 26)

[2] اقتباس از اے۔ این۔ فارکوہار، Modern Religious Movements in India (لندن، مک ملن، 9191) صفحہ 202

تاثرات ان الفاظ میں ظاہر کئے تھے۔''وہ فن خطابت میں خداداد مہارت رکھتے ہیں اور پیلے اور گلابی کپڑوں میں اُن کا ذہین چہرہ اُن کے پرخلوص الفاظ اور ان کے خوبصورت پیرایہ اظہار سے کم دلچسپ نہیں۔[1]

اُنھوں نے امریکہ میں قیام کیا اور تقریریں کرنے، ویدانت سوسائٹیوں کے قائم کرنے اور شاگرد بنانے میں وقت گزارا۔ اُن کی تقریروں کا لب لباب یہ تھا کہ''دنیا کے کسی مذہب نے انسان کی عظمت کا ایسا درس نہیں دیا ہے جیسا ہندو دھرم نے۔''[2]

ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے وہ انگلستان گئے۔ حالانکہ ایک قوم پرست ہندوستان کی حیثیت سے وہ بدیسیوں کی حکومت کو سخت ناپسند کرتے تھے۔ لیکن انسانوں سے پیار کرنے والوں کی حیثیت سے اُنھیں انگلستان کے لوگوں سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ اُنھوں نے کہا تھا''تم میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جو مجھ سے زیادہ انگلستان کے لوگوں کو پیار کرتا ہو۔''[3] اُنھیں''انگلستان میں بڑی آزادی اور بڑی قانون نوازی ملی'' اور اُنھوں نے انگلستان کے لوگوں کو''بہادروں کی قوم اور حقیقی مشنری'' پایا[4] انگلستان سے وہ براعظم کے سفر پر روانہ ہوئے اور فرانس، سوئزرلینڈ اور جرمنی کا دورہ کیا۔

چار سال تک باہر رہنے کے بعد ویویکانند ہندوستان واپس آئے اور 10 رجنوری 1879 کو کولمبو میں اُترے۔ کنیا کماری سے کلکتہ تک اُن کا سفر ایک یادگار سفر تھا اس لیے کہ وہ پہلے ہندوستانی تھے جنھوں نے مغرب کی برتری کو تسلیم نہیں کیا اور اپنے مذہب کے متعلق معذرت کرنے اور ناقدین کے حملوں کے خلاف اُس کا دفاع کرنے کے بجائے بڑی جرأت کے ساتھ اُس کی روحانی فضیلت اور بے مثال عظمت کا اظہار کیا۔ وہ ایسے ہیرو تھے جنھوں نے معترضین کا مقابلہ خود اُن کے وطن میں کیا اور اُنھیں تحسین وتوصیف بلکہ خراج عقیدت ادا کرنے پر مجبور کردیا۔ اُن کے اس

---

[1] ایضاً، صفحہ 201

[2] رولائی رومن، ویویکانند، محولہ بالا صفحہ 70

[3] ایضاً

[4] ایضاً، 89

شاندار کارنامے کی بنا پر ہندوستان کا سر اُونچا ہوگیا اور وہ اپنی نظروں میں حقیر ہونے کے بجائے معتبر و مستند قرار پایا۔

ویویکانند نے اپنی زندگی کے آخری کچھ برس مشن کی تنظیم کے کام میں صرف کئے تاکہ وہ اُن کے ملک کے پرچار اور ملک کے مفاد کی سرگرمیوں کو جاری رکھ سکے۔ اُنھوں نے دو مرکز قائم کئے ایک مرکز کلکتہ کے قریب بلور میں اور دوسرا الموڑا کے نزدیک مایاوتی میں، جہاں ان نوجوانوں کو سنیاس کی تربیت دی جاتی تھی جو رام کرشن مشن میں شامل ہوتے تھے۔ تاکہ وہ مذہبی اور سماجی فلاح کے کام کر سکیں۔ چنانچہ اس طرح ایک قدیم اور قابلِ احترام ادارے کو قومی خدمت کے کاموں کے لیے استعمال کیا گیا۔ پرانے زمانے کے سادھوؤں کی طرح اس مشن کے راہب بڑی لگن اور بڑے ریاض و زہد کی زندگی گزارتے ہیں لیکن سادھوؤں کے برعکس وہ عمل سماجی خدمت میں مصروف رہتے ہیں اور لوگوں کے دکھ دور کرتے ہیں، قحط کے زمانے میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں، بیماروں اور طاعون، ہیضے اور کوڑھ کے مریضوں کا علاج معالجہ کرتے ہیں اور یتیموں کی دیکھ بھال کرتے ہیں اسکول، فلاحی کاموں کے مرکز کے علاوہ خانقاہیں بھی قائم کی گئیں۔

حالانکہ ویویکانند سیاسی تحریک کے حق میں نہیں تھے لیکن اُن کی دلی خواہش تھی کہ ایک جری اور فعال قوم کی تعمیر کی جائے۔ وہ مذہب کو قومی زندگی کا اہم ترین جز سمجھتے تھے۔[1] وہ چاہتے تھے کہ ''زندگی کے ہر شعبے میں اُس سادگی پسند دینداری کو بیدار کیا جائے جو دلاوری کو جنم دیتی ہے۔'' چنانچہ اُنھوں نے اس طرح ''قادرِ مطلق'' کے لیے گہرے پیار کے ساتھ دکھ جھیلنے والے انسانوں کے لیے اپیل کو جوڑ دیا۔

پھر بھی سماجی تنظیم اور سماجی اُمور کے تعلق سے ریاکارانہ مذہبیت کے جذبے کی وہ مخالفت کرتے تھے۔ اور اس کی بنا پر ذات پات، فرقہ واریت، چھوت چھات اور نابرابری کے خلاف تھے۔ اُن کی نظر میں ہر انسان اس ایک خدا کا بیٹا ہے اور سب میں یکساں ایزدی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اُن کا کہنا تھا ''غریبوں، بے نواؤں، بے سہاروں اور کچلے ہوئے انسانوں آؤ ہم سب

---

[1] ایضاً، صفحہ 106

رام کرشن کے نام لیوا ہیں۔''[1] مفلس و نادار لوگوں سے ہمدردی کرنے کی غرض سے وہ سب کچھ کرنے کو تیار رہتے تھے۔ انھوں نے کہا تھا۔

''ہمیں پوجا پاٹ کا یہ سب سامان پھینک دینا چاہیے، سنکھ بجانا، گھنٹے بجانا اور بتوں کی آرتی اُتارنا ترک کر دینا چاہیے.................ہمیں تعلیم پر فخر نہیں کرنا چاہیے اور اپنی مکمل (نجات) کے لیے شاستروں اور سادھوؤں کا مطالعہ ترک کر دینا چاہیے اور گاؤں گاؤں گھوم کر اپنی زندگی خدمت خلق کے لیے وقف کر دینا چاہیے۔ اور غریبوں اور دکھوں میں مبتلا لوگوں کی خدمت کرنی چاہیے۔''[2]

اُنھوں نے تعلیم یافتہ لوگوں کو اُن لفظوں میں چنوتی دی ''جب تک لاکھوں انسان بھوک اور جہالت کا شکار ہیں۔ میں ہر انسان کو غدار تصور کرتا ہوں جس نے اُن کے وسائل سے تعلیم حاصل کی اور اُن کی طرف بالکل توجہ نہیں دی۔''[3] اُنھوں نے مزید لکھا تھا ''ہندوستان کی توقعات محض عام لوگوں سے وابستہ ہیں بالائی طبقے جسمانی اور اخلاقی اعتبار سے مر چکے ہیں۔''

اُنھوں نے کہا کہ ''اگر برہمن کو ترکے میں اچھوتوں کے مقابلے میں تعلیم حاصل کرنے کی زیادہ اہلیت ملی ہے تو برہمنوں کی تعلیم پر زیادہ روپیہ نہیں خرچ کرنا چاہیے بلکہ اچھوتوں کو تعلیم دی جانی چاہیے کمزور کو تحائف کی ضرورت ہے۔ اس لیے اُنھیں دیجئے۔[4]

ہندوستانیوں کی کمزوری، بزدلی اور سستی پر اُنھیں بڑا غصہ آتا تھا۔ وہ اپنی تقریروں میں عام طور پر کہا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ طاقت ور بنو۔ اُنھوں نے کہا تھا ''ہر اُس جز کو زہر سمجھو جو تمھیں جسمانی، ذہنی اور روحانی طور سے کمزور بنائے۔ اس میں کوئی زندگی نہیں، اسکو سچائی نہیں کہا جاسکتا۔ سچائی طاقت ہے۔ سچائی پاکیزگی ہے سچائی ہر قسم کا علم ہے''[5] اُن

---

[1] ایضاً، صفحہ 166

[2] ایضاً، صفحات 66-165

[3] ایضاً، صفحہ 172

[4] ایضاً، صفحہ 113

[5] ایضاً، صفحہ 112

کا یقین ''ایسے مذہب میں تھا جو ہمارے اندر خود اعتمادی، قومی فخر اور مفلس و نادار لوگوں کی تعلیم دینے اور اُن کے دکھوں کو دور کرنے کی طاقت پیدا کر سکے۔''[1] وہ چاہتے تھے کہ مذہب کے نام پر گیان دھیان کی کاہلی اور جمود کو ترک کر دینا چاہیے اور اس پر زور دیتے تھے۔ ''تمھارے رام کرشن کی کون پرواہ کرتا ہے؟ تمھاری بھکتی اور مکتی سے کسے دلچسپی ہے؟ تمھاری مقدس کتابوں میں کیا لکھا ہے اس سے کس کو کیا لینا؟ میں ہزار جہنموں میں جانے کے لیے خوشی سے تیار ہو جاؤں گا۔ اگر اپنے ہموطنوں کو جو کاہلی اور بے عملی کے شکار ہیں اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل بنا سکوں اور اُن میں کرم یوگ (عمل کے ذریعے عبادت) کا جذبہ پیدا کر سکوں۔''[2] اُن کی خواہش تھی کہ ''زندگی کے ہر شعبے میں وہ سادگی پسند عروج ہو جو دلاوری کو جنم دیتا ہے۔''[3]

آزادی ویویکانند کو کتنی عزیز تھی اُس کی جھلک اُن کے قول و فعل میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اُنھوں نے کہا ''زندگی، نشوونما اور فلاح و بہبود کی واحد شرط ہے فکر و عمل کی آزادی۔ جہاں یہ نہیں ہوتی ہے وہاں فرد، نسل اور قوم تینوں کا زوال ہو جاتا ہے۔''[4]

وطن پرستی کے جذبات سے بھری ہوئی ایک پُرتاثیر تقریر میں اُنھوں نے اپنے ملک سے ان لفظوں میں خطاب کیا تھا۔

''اُو بھارت! کیا تو دوسروں کے اداروں پر، اس نقل پر دوسروں سے ستائش حاصل کرنے کے اس جذبے پر اس ناکارہ فلاحی پر، اس قابل نفرت اور قابل خدمت سنگ دلی پر، آزادی حاصل کرنے کے لیے انحصار کرتا رہے گا؟ کیا تو اُس شرمناک بزدلی کی مدد سے وہ آزادی حاصل کرے گا جو بہادروں کا حصہ ہے؟ یہ نہ بھول کہ تیرا سماج ایک عظیم مذہب کا عکس ہے۔ یہ نہ بھول کہ اچھوت، غریب، جاہل، پانی بھرنے والے اور جھاڑو دینے والے تیرا خون ہیں۔ تیرے بھائی ہیں۔ اے دلاور ہمت سے کام لے اور اس پر فخر کر کہ تو ہندوستانی ہے اور فخر کے ساتھ اس کا

---

[1] ایضاً، صفحہ 110

[2] ایضاً، صفحہ 126

[3] ایضاً صفحہ 129

[4] کنگوئی من موہن، سوامی دیوکھانند ایک مطالعہ، کلکتہ، صفحہ 40

اعلان کر کہ میں ہندوستانی ہوں۔ ہر ہندوستانی میرا بھائی ہے۔ ہندوستان کی سرزمین میری بہشت بریں ہے ہندوستان کی بھلائی خود میری بھلائی ہے۔"[1]

اپنے سیاسی عقائد کا اعلان اُنھوں نے ان الفاظ میں کیا۔ "یقین کرو احکام نازل ہو چکے ہیں، فرمان الٰہی جاری ہو چکا ہے۔ ہندوستان کو سربلند ہونا ہے۔ عام لوگوں اور مفلس وفاداروں کو مسرت سے ہمکنار ہونا ہے تمھیں خوش ہونا چاہیے کہ تم خدا کے آلہ کار کی حیثیت سے منتخب کیے گئے ہو۔"

مہاراشٹر میں احیا پرستی کی تحریک

مہاراشٹر میں سماجی مصلحین کی عقلیت پسندی کے خلاف ردعمل کے طور پر احیا پرستی کی تحریک کا آغاز ہوا۔ اُس وقت تک مرہٹہ سماج پرانے رسم ورواج میں ڈوبا ہوا تھا جب کہ بنگال کے دانش ور جدید طرز زندگی کو اپنا رہے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بمبئی دکن کا مرہٹہ علاقہ 8181 میں انگریزوں کے زیر نگیں آیا تھا یعنی فتح بنگال کے ساٹھ سال بعد۔ بنگال کے برعکس مرہٹوں کو تجارت اور کاروبار میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی اور رعیت داری زرعی نظام کی وجہ سے مالکان آراضی کا طبقہ وجود میں نہیں آسکا تھا۔ لیکن چونکہ اُلجھے ہوئے مالگزاری کے نظام کو چلانے اور دوسرے کاموں کے لیے مقامی لوگوں کی ضرورت تھی۔ اس لیے مرہٹہ اضلاع میں برہمن ذات کے لوگوں کو ماتحت عہدوں پر مقرر کیا گیا۔ انگریزوں سے اُن کے روابط بڑھے اور اُنھیں مغربی طور طریقوں کا تجربہ ہو گیا۔ اُنھیں انگریزی زبان سے واقفیت مفید معلوم ہوئی اور اُن میں سے کچھ لوگوں نے مغربی نظام کے مطابق تعلیم حاصل کی۔ ان لوگوں میں بال شاستری جام بھیکر، لوک ہت وادی، دیش مکھ اور جوتیبا پھولے جیسے اشخاص تھے۔ جنھوں نے سب سے پہلے ہندو سماجی نظام پر اعتراضات کیے۔

ان مصلحین کی آواز بہت کم لوگوں تک پہنچ سکی اس لیے کہ تعلیم کے فروغ کی رفتار سست تھی اور متوسط طبقہ کمزور تھا۔ 1857 میں بمبئی یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ لیکن بیس سال کے بعد بھی میٹرک پاس لوگوں کی تعداد 100 گریجویٹوں کی 179 اور وکالت پاس کرنے والوں کی 53

---

[1] سوامی دیویکانند سوانح حیات، جلد چہارم، صفحہ 185

تھی۔ 1880 میں صرف آٹھ کالج تھے۔جن میں سے 6 بمبئی کے شہر میں تھے۔ہائی اسکولوں کی تعداد 48اور مڈل اسکولوں کی تعداد 177 تھی۔

ان اداروں میں تعلیم حاصل کرنے والے وہ غریب بچے ہوتے تھے جو چھوٹی موٹی ملازمت کرنا چاہتے تھے۔ وہ اپنے قدیم سماجی تعصّبات اور فرسودہ تصورات سے پیچھا نہیں چھڑا پاتے تھے۔ چنانچہ رانا ڈے، بھنڈارکر، اگرکر اور چندور کر کی طرح کے سماجی مصلحین کو صدیوں پرانے اندازِ فکر کے خلاف لوگوں میں جذبہ پیدا کرنا پڑا۔ 1870 کے بعد نئے حالات رونما ہوئے جنھوں نے مصلحین کے کام کو نامقبول بنا دیا۔ بار بار پڑنے والے قحطوں کی بنا پر یہ خیال پختہ تر ہوتا جارہا تھا کہ ملک میں غربت وافلاس بڑھ رہا ہے۔جس نے بدیسی حکومت اور اُس کی تہذیب کے خلاف تعصب اور عدم اعتماد کا جذبہ پیدا کردیا اور ہندوستان کے ماضی کی دریافت نے ملک کے مستقبل کے متعلق ایک نئے اعتماد وفخر کو جنم دیا اور مغربی تہذیب کی اقدار کو اُن کی نظروں میں حقیر بنا دیا۔ بدیسی حکومت کے خلاف نفرت کے جذبے نے مذہبی اور سماجی اصلاح کے جذبے کو کمزور بنا دیا اور اُن کے ذہنوں میں سیاست ایک غالب عنصر بنتی گئی۔

وشنو ساستری چپ لنکر (متوفی 1883) نے اپنے رسالے نبندھ مالا[1] کے ایک مضمون میں لکھا تھا ''برطانیہ کی فتح نے ہماری آزادی کو ختم کردیا۔آزادی کھودینے کے معنی ہیں کہ ہم نے ہر وہ چیز کھودی جو ہمارے لیے بیش قیمت تھی، ہماری قدیم سلطنتیں، ہماری دولت، ہمارا علم سب کچھ خاک میں مل گیا۔'' اُنھوں نے زراعت، صنعت، تجارت اور فنون کی پس ماندگی پر اظہار افسوس کیا اور کہا:

''لیکن بدیسی حکومت کی سب سے بڑی لعنت ہماری اخلاقی گراوٹ ہے۔ جو نتیجہ ہے آزادی کھودینے کا، ہمارے ہم وطن غلامی کی اُس منزل تک پہنچ چکے ہیں جب غلام خود کو غلام تسلیم کرتا ہے اور عزتِ نفس سے بیگانہ ہوجاتا ہے...... ہمارے کردار میں پوری طرح گراوٹ آچکی ہے۔''

---

[1] ملک کی صورتِ حال کے عنوان سے نبندھ مالا کی اشاعت نمبر 83-77 میں یہ مضمون شائع ہوا تھا۔اُس کے سخت لہجے اور برطانوی حکومت پر سخت تنقید کی بنا پر 1910 میں اُس کو ضبط کرلیا۔ 1937 میں جب طاقت کانگریس کے ہاتھ میں آئی تو اسے شائع کیا گیا اور 1945 میں ایک طلبا کا اڈیشن شائع ہوا۔

اُن کا خیال تھا کہ سماجی مصلحین کچھ بھی کہیں لیکن ہندوستان کے زوال کا کوئی تعلق کم عمری کی شادی یا ذات پات کی طرح کے سماجی رواجوں سے تھا اور نہ مذہب سے۔ تمام برائیوں کی جڑ تھی محض بیرونی حکومت۔ اس سخت حملے کے خلاف راناڈے کی عقلیت پرستی کامیاب نہیں ہوسکتی تھی اس لیے جب بال گنگادھر تلک کی طرح کے قابل، جری اور پرعزم قدامت پرستی کے چیمپین مخالفوں کی صفوں میں شامل ہوگئے تو سماجی اصلاح کی زیادہ گنجائش باقی نہیں رہی۔

تلک ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے تھے جو پیشواؤں کی ملازمت میں رہ چکے تھے اور اُن کے ذہن کی ساخت ایک ایسے ماحول میں ہوئی تھی جو مرہٹوں کے پچھلے شاندار کارناموں کی یادوں سے بھرا ہوا تھا۔ خاندان کے کٹرپن، سنسکرت کی تعلیم اور قدیم تاریخ میں گہری دلچسپی کی بنا پر اُن میں ماضی کے احترام کا جذبہ پیدا کر دیا۔ ہندو تصورات اور اداروں سے پیار اور ہندو مذہب اور فلسفے کے احترام نے انھیں مغربی تہذیب کا ناقد اور ہندوستان کی برتری کا حامی بنا دیا۔ چنانچہ جب راناڈے نے سماجی اصلاح کی تحریک کو منظم کرنا شروع کیا تو تلک نے کھل کر اُسکی مخالفت کی۔ اصلاح کی مخالفت کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ اصلاح کے خلاف تھے۔ اُنھوں نے لکھا ''سماجی اصلاح اور ترقی کون نہیں چاہتا ہے؟ حالانکہ دونوں فریقوں میں منزل کے تعلق سے اتفاق ہے۔ لیکن اصلاحات کیا ہوں اور کیسے ہوں اس کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے۔''

ہندوستان میں اُس وقت جو حالات پائے جاتے تھے اُن میں سماجی اصلاح اُن کی نظر میں محض ایک تخریبی کارروائی تھی جو سماجی رشتوں کو کمزور تو کرسکتی تھی ان کی جگہ کچھ اور نہیں دے سکتی تھی۔ اُن کا خیال تھا کہ سماجی مسائل پر بدیسی حکومت سے قوانین بنوانے کے بجائے رائے عامہ کو ہموار کیا جانا چاہیے۔ اُن کی نظر میں بدیسی حکومت ہندوستان کی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ چنانچہ وہ سمجھتے تھے وقت کی ضرورت مذہبی اور سماجی تعمیر نو کے بجائے بدیسی حکومت کی مزاحمت کی تنظیم کرنا ہے۔ وہ اس بات کی تردید کرتے تھے کہ حکومت خود اختیاری حاصل کرنے سے پہلے ذات پات کو ختم کرنا یا عورتوں اور مردوں کو مساوی حقوق دینا ضروری ہے۔ وہ اس کی بھی تردید کرتے تھے کہ سیاسی طاقت حاصل کرنے سے پہلے سماجی اصلاح ضروری ہے۔ حالانکہ وہ

سماجی تبدیلی کے خلاف نہیں تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ سمجھتے تھے کہ سماجی اصلاح کی تحریک لوگوں میں پھوٹ ڈال دے گی۔ جو آزادی کی راہ میں رکاوٹ بن سکتی ہے۔

تلک نے سیاسی مقاصد کے لیے عوامی کارروائی کی اہمیت کو سمجھ لیا تھا اس لیے وہ ہندو عوام کو ایک سیاسی جھنڈے کے نیچے جمع کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ اُنھوں نے ماضی کے شاندار کارناموں کی یاد تازہ کرنے کے لیے گنیش کے تہوار کی بنیاد ڈالی اور شیواجی کی سالگرہ منانے کا سلسلہ ایک دفعہ پھر شروع کیا۔ اُنھوں نے تعلیم یافتہ ہندوؤں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی کوشش کی کہ ہندو دھرم محض گیان دھیان اور عارفانہ اور آخرت کے تصورات کا مذہب نہیں بلکہ وہ اپنے ماننے والوں کو باعمل زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے چونکہ زیادہ تر ہندو روحانی افادہ حاصل کرنے کے لیے بھگوت گیتا پڑھتے ہیں اس لیے اپنے خیالات کے ثبوت میں اُنھوں نے اُس کی وسیع شرح لکھی۔

اس مذہبی اپیل نے مہاراشٹر کے لوگوں میں ہلچل پیدا کر دی اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں احیا پرستی کی تحریکات کو تقویت پہنچائی۔ لیکن بدقسمتی سے ایک فرقے کو اس سے جو کچھ حاصل ہوا اس نے دوسرے فرقے میں خوف اور خطرے کا احساس پیدا کر دیا۔

VII۔ آریہ سماج

وہ مذہبی رجحان جس نے بنگال اور مہاراشٹر کے ہندوؤں میں شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں، مغربی ہندوستان کے پارسیوں میں اور دوسرے لوگوں میں مذہبی اور سماجی اصلاح کی تحریکات کو جنم دیا۔ حقیقت میں پورے ہندوستان پر حاوی تھا ملک کے ہر حصے اور لوگوں کے ہر فرقے میں ذہنی ہلچل پائی جاتی تھی جو کہ بنگال اور مہاراشٹر میں ہو چکا تھا۔ اس کی تجدید گجرات میں ہوئی 1844 میں کاٹھیاوار میں واقع موردلی کی چھوٹی سی ریاست میں ایک بچہ پیدا ہوا جو بڑا ہو کر عجیب و غریب قسم کا مصلح بنا جو دوسروں سے مختلف تھا۔ ایک سام ویدی برہمن کا بیٹا کل شنکر جو بعد میں دیانند کے نام سے مشہور ہوا۔ بہت سخت اور باغیانہ مزاج کا بچہ تھا۔ ابھی وہ پورے چودہ سال کے بھی نہیں ہوئے تھے کہ بت پرستی کی تنسیخ کے سلسلے میں باپ سے جھگڑ پڑے۔ شادی کے

بندھنوں سے بچنے اور اپنی روح کی پیاس بجھانے کے لیے اُنھوں نے گھر چھوڑ دیا۔ پندرہ سال تک وہ جہاں گشت عالم کی طرح تلاش علم میں گھومتے پھرے جس نے اُن کے سبھی شکوک وشبہات دور کر دئے۔ تلاش وجستجو کی لگن اُنھیں ہمالیہ، وندھیا اور اراول کے پہاڑوں میں، وادیوں میں اور گنگا، جمنا اور نربدا کے کناروں پر لے گئی۔ اُنھوں نے سنسکرت زبان، اُس کی صرف ونحو فلسفے اور مذہبی ادب پر عبور حاصل کیا۔ اُس کے بعد اُنھوں نے مقبرا میں نابینا ورج نند کی شاگردی میں دوسال گزارے جو قدیم علوم کے ماہر، بہت اچھے اُستاد اور عقلیت پسند مفکر تھے وہ بت پرستی، اوہام پرستی اور بہت سے دیوتاؤں کی پرستش کے تصورات سے نفرت کرتے تھے اُنھوں نے دیانند کو ویدوں کی فلسفیانہ تشریح کا درس دیا۔ اور اُس کے بعد اُن پر ہندو دھرم کو برائیوں سے پاک کرنے کی ذمہ داری ڈالی۔

1863 میں اُن کی ہادیانہ زندگی کا آغاز ہوا جو 1883 میں اُن کے انتقال کے ساتھ ختم ہوئی۔ اس بیس سال کی مدت میں اُنھوں نے بڑی جانفشانی سے کام کیا۔ پورے ہندوستان کا دورہ کیا۔

دیانند کوئی معمولی انسان نہیں تھے۔ وہ بڑی ذہنی صلاحیتوں کے مالک تھے کم ہی لوگ اُن سے زیادہ سنسکرت کے علوم سے واقف تھے۔ اُن کی گفتگو لوگوں کو متاثر کرتی تھی اور وہ بڑے تیز فہم مناظر تھے جو اپنے مخالفین کو دلیلوں سے لاجواب کر دیتے تھے۔ اسکے ساتھ وہ مضبوط، غیر متزلزل اور قریب قریب ضدی کردار کے مالک تھے۔ وہ ایک پیدائشی لیڈر تھے۔ جن میں مفکرانہ حد تک عزم اور خود اعتمادی پائی جاتی تھی۔

وہ ایک واضح اور نکتہ رس ذہن رکھتے تھے جس میں التباس، الہام اسرار ورموز کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ کالون کی طرح وہ بھی اپنے اعتقادات کی پوری پوری وضاحت کرتے تھے اور کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔ مارٹن لوتھر کی طرح کی انفرادیت ان میں پائی جاتی تھی اور تمام مذہبی مسائل کو حل کرنے کے لیے وہ انفرادی عقل پر بھروسہ کرتے تھے۔ ہندوؤں کی بہت سی مقدس کتابوں میں سے کچھ کو صحیفہ آسمانی کے طور پر منتخب کرنے کی بنیاد اُن کے نجی عقائد

تھے۔اس کے علاوہ خدا کی وحدانیت، دیوی دیوتاؤں کی کثرت کے رد، آواگون اور کرم کے عقائد اور انسان، فطرت اور خدا کے باہمی رشتوں کے متعلق عقائد ونظریات کا انتخاب بھی ان کے تجزیے اور ردعمل کا نتیجہ تھا جس میں نہ روایت نے ان کی رہنمائی کی نہ ہی تاریخ نے۔

ان کا عقیدہ تھا کہ ہندودھرم اور وید، جن پر اس کی بنیاد قائم ہے۔ابدی نا قابل ترمیم، ہر قسم کی غلطی سے پاک اور منجاب اللہ ہیں۔صرف ویدک مذہب صحیح اور سب کے لیے ہے۔ان کا خیال تھا کہ آریہ برگزیدہ قوم ہے، وید برگزیدہ مقدس کتاب ہے اور ہندوستان برگزیدہ سرزمین ہے۔تمام دوسرے مذاہب نامکمل ہیں اور ''آریہ سماج'' کا فرض ہے کہ ان کے ماننے والوں کو ہندودھرم قبول کرنے پر آمادہ کرے۔

انھوں نے ''آریہ سماج'' کے لیے سماجی عمل اور اخلاقی اقدار کا ضابطہ بنایا۔اس ضابطے میں پیدائش کی بنیاد پر ذات پات مردوں میں نابرابری اور مرد اور عورت کی نابرابری کے لیے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ان کا نعرہ تھا کہ جہاں تک روحانی اور اخلاقی زندگی کا تعلق ہے ''ویدوں کی طرف مراجعت کرو''۔لیکن وہ مغربی تعلیم، سائنس کا علم حاصل کرنے اور سماج کے مادی حالات کو سدھارنے کے حامی تھے۔

1875 میں انھوں نے بمبئی میں ''آریہ سماج'' قائم کیا جس نے تیزی کے ساتھ ترقی کی۔ شمالی ہندوستان کے زیادہ تر حصوں اور خصوصیت کے ساتھ پنجاب، اترپردیش اور راجستھان میں اس کی شاخیں قائم ہوگئیں۔اس میں متوسط اور نچلے طبقوں کے ہندوؤں کے لیے بڑی کشش تھی۔ حالانکہ اس نے سماج میں اصلاح کے تصور کو پھیلنے میں مدد دی۔لیکن ذات پات کے خلاف وہ زیادہ کامیابی حاصل نہ کرسکا۔اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ ہندوستان کے ماضی کے متعلق فخر کے جذبات کو اس نے جنم دیا اور آریہ مذہب کی تبلیغ میں ایک جارحانہ شدت پیدا کردی۔اس کو فروغ دینے کے لیے آریہ سماج نے اوقاف بنائے اور تعلیمی ادارے قائم کئے یعنی اعلیٰ تعلیم کے لیے کالج، ثانوی تعلیم کے لیے اسکول، عورتوں کی تعلیم کے لیے ادارے اور ایسے ادارے جن میں ہندوستان کے قدیم طریقوں کے مطابق تعلیم دی جاتی تھی۔''آریہ سماج'' کی کچھ کارروائیاں نزاعی نوعیت کی تھیں۔ دیانند پہلے ہندو معلم تھے جنھوں نے دفاع کے بجائے حملہ کیا۔یعنی

عیسائیوں اور مسلمانوں کے اعتراضات کے خلاف ہندو دھرم کا دفاع کرنے کے بجائے خود ان پر حملے کئے اور انھیں اپنا دفاع کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان کی کتاب ستھیارتھ پرکاش میں دوسرے مذاہب پر اعتراضات کئے گئے ہیں اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھ گئی اور باہمی منافرت میں اضافہ ہو گیا۔

''آریہ سماج'' کے پروگرام میں شامل ایک اور چیز جس نے جھگڑے بڑھائے وہ تھی گورکھشا۔ 1882 میں گورکھشا سبھا قائم کی گئی اس کے پرچار کے لیے پرچارک مقرر کئے گئے اور گایوں کو ذبح ہونے سے بچانے کے لیے فنڈ جمع کیا گیا۔ گورکھشا بہت اچھا کام ہے معاشی اعتبار سے گائے بڑی اہمیت رکھتی ہے اور اس کے تحفظ سے ہندوؤں کو بڑا جذباتی لگاؤ ہے۔ لیکن بدقسمتی سے کچھ ضرورت سے زیادہ پرجوش آریہ سماجیوں نے جارحانہ طریقہ کار اختیار کیا اور اگرچہ بہت سے غیر ہندو جن میں کئی مسلمان بھی شامل تھے ان کی تحریک سے ہمدردی رکھتے تھے پھر بھی کچھ حساس مسلم علما اور غریب طبقوں سے تعلق رکھنے والے ان کے کچھ ہیرو ناراض ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں بڑے بُرے بلوے ہوئے جن کی وجہ سے دونوں فرقوں کے درمیان منافرت بڑھ گئی۔

اس کے علاوہ دیانند کی شروع کی ہوئی تحریک نے ہندوستان کے لوگوں میں خود کفالت کا احساس پیدا کرنے اور خود اعتمادی کے جذبے کو تقویت پہنچانے کی کوشش کی۔ ایک انگریز مشنری نے دیانند کے تصورات کو جو خراج عقیدت پیش کیا وہ اس لیے بیش قیمت ہے کہ ایک ایسے غیر متوقع ماخذ سے آیا ہے جو ''آریہ سماج'' کو اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ ڈاکٹر گرس ولڈ نے کہا کہ:

''ان باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پنڈت دیانند سرسوتی بڑے فراخ دل انسان تھے وہ خوبصورت خواب دیکھنے کے عادی تھے۔ ان کی نظر میں ایک ایسے ہندوستان کی تصویر تھی جو توہمات سے پاک ہو۔ سائنس کے فوائد سے بہرہ یاب ہو، خدائے واحد کی عبادت کرے، حکومت خود اختیاری کا اہل ہو، دنیا کی قوموں میں اپنی جگہ بنائے اور قدیم شان وشوکت دوبارہ حاصل کرے۔''[1]

---

[1] Indian Evangelican Review جنوری 1882، اقتباس از: جے۔ این فارکوہار، محولہ بالا، صفحہ 112

VIII۔ تھیوسوفیکل تحریک

اس زمانے میں ایک اور مذہبی تحریک شروع ہوئی جو آریہ سماج کے مقابلے میں زیادہ قدامت پرست اور زیادہ عارفانہ تھی۔ یہ تحریک تعلیم یافتہ لوگوں میں مقبول ہوگئی۔ یہ تھی تھیوسوفیکل سوسائٹی جسے مادام بلاوٹسکی اور کرنل اُل کوٹ نے نیو یارک میں اس سال قائم کیا جس سال سوامی دیانند نے بمبئی میں ''آریہ سماج'' قائم کیا یعنی 1875 میں۔ جنوری 1879 میں اس سوسائٹی کے بانی ہندوستان آئے اور دسمبر 1882 میں اُنھوں نے مدراس میں واقع ادیار کے مقام پر اس سوسائٹی کا صدر دفتر کھولا۔ جلد ہی اس کی شاخیں پورے ہندستان میں پھیل گئیں۔ 1888 میں انگلستان میں مسز اینی بیسنٹ اس سوسائٹی میں شامل ہوگئیں۔ سوسائٹی میں ان کی شمولیت سے اُسے بڑا فائدہ پہنچا۔ وہ برناڈ شاہ، ڈبلو۔ ٹی۔ اسٹیڈ، اے۔ پی۔ سنٹ، بریڈ لا اور ٹریڈ یونینس ٹ کی طرح کے جدید فکر رکھنے والوں میں پہلے سے جانی پہچانی تھی۔ اگلے پانچ سال اُنھوں نے مطالعہ اور درس دینے میں صرف کیے۔ 1893 میں ریاستہائے متحدہ امریکہ گئیں اور شکاگو میں منعقد ہونے والی مذاہب کی پارلیمنٹ میں شرکت کی۔ اس کے بعد انھوں نے ہندوستان میں سکونت اختیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خود ان کے ہم وطنوں کے مقابلے میں ہندوستان اور ہندوستانی ان کے قریب تر تھے۔ انھوں نے اعلان کیا ''میرا دل تمھارے ساتھ ہے اور پچھلے جنم میں تم میں سے تھی۔'' نومبر 1893 میں ٹوٹی کورن میں جہاز سے اتریں اور اس کے بعد انھوں نے ہندوستان میں ہلچل ڈال دی۔ جہاں وہ گئیں ان کا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ اتنی پرکشش شخصیت اور غیر معمولی خطابت کی بنا پر انھوں نے بہت سے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو سوسائٹی میں شامل کرلیا جو انھیں اپنا گرو اور رہنما سمجھنے لگے۔ کچھ لوگ انھیں اوتار سمجھتے تھے۔ انھوں نے سوسائٹی کے کاموں کو بڑی تقویت پہنچائی۔ انھوں نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا جس میں قدیم ہندو دھرم کے دفاع میں تقریریں کیں، تعلیمی مراکز قائم کیے، بہت سی کتابوں اور رسالوں کے ذریعہ تھیوسوفی کا پرچار کیا اور سوسائٹی کے عقائد کی تشکیل کی۔

تھیوسوفیکل سوسائٹی کے عقائد مذاہب، فلسفے اور سحر پرستی کا ایک عجیب وغریب آمیزہ

تھے۔اس کی مذہبی تعلیمات چار بنیادی باتوں پر مشتمل تھیں (1) خدا کی وحدانیت (2) تثلیث ایزدی (3) مخلوق کی درجہ بندی جو فہم روحانی یا دیوتاؤں، فرشتوں، انسانوں اور تحت الانسانی مخلوق پر مشتمل ہے (4) عالمگیر بھائی چارہ جس کے لیے شرط یہ ہے کہ انسانی ترقی کے مختلف مدارج ومنازل کو نظر میں رکھا جائے۔

فلسفے کی رو سے سوسائٹی غیبت پرستی کے مکتب کی حمایت کرتی ہے۔شعور کی افضلیت کی مدعی ہے اور اُس کا عقیدہ ہے کہ انسانی فکر کی وہی نوعیت ہے جو ایزدی فکر کی۔فکر انسانی سفلی سرشت اور اُس کے ماحول پر قابو پا سکتی ہے۔روح دائمی اور لافانی ہے اور ایک جسم سے دوسرے میں منتقل ہوتی رہتی ہے جس کے دوران وہ تجربے حاصل کر کے ترقی کے منازل طے کرتی رہتی ہے یہاں تک کہ دنیا میں سیکھنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہتا ہے۔اُس کے بعد وہ حیات وممات سے ماورا اور ''حیات جاوید کے قابل'' ہو جاتی ہے۔

تھیوسوفی کی سائنس ''علم سینہ کی سائنس'' ہے جو مسلمہ ماہرین کے دریافت کردہ حقائق پر مشتمل ہے ان حقائق میں کائنات، انسان، قوانین عمل ورد عمل، ارتقا اور انسانی تکمیل کی ترکیب و ترتیب شامل ہے۔

معمولی سائنس کے برعکس اس ''سینہ کی سائنس'' کی بنیاد مفروضہ، تجربہ اور استخراج کی بنیاد پر قائم نہیں ہے بلکہ اس کی بنیاد اُن روشن ضمیر حضرات کے وجدان پر قائم ہیں جو روحانی اسرار سے واقفیت حاصل کرنے کے طریقے جانتے ہیں۔اس روحانی اسرار کی واقفیت پر مقبوسوں کا دارومدار ہے۔متوسط طبقے کے بہت سے تعلیم یافتہ ہندو اس سوسائٹی میں دلچسپی لینے لگے۔بہت سے لوگوں کو اس منظر نے متاثر کیا کہ ایک سفید فام خاتون ہندو دھرم کے متعلق بڑی روانی کے ساتھ اظہار خیال کرتی تھیں اور اُن باتوں کا جواز پیش کرتی تھیں جنھیں عیسائی مشنری اور یورپی مصنفین اوہام پرستی اور گمراہی سے تعبیر کرتے تھے۔اس نے اُن کے شعور کو تسکین بخشی اور خود اپنے مصلحین کے تیروں کا تدارک کیا۔سوسائٹی کے ''باطنی علم'' نے جوگیوں کی پراسرار کہانیوں کی حقیقت کا ثبوت فراہم کیا اور سر ولیم کرک کی طرح کے سائنس دانوں کی حمایت نے اُس کے دعووں کی ساکھ بڑھادی۔

بہت سے دانش وروں کو اُس عقیدہ نجات کل سے ذہنی تسکین ملی جس کا پرچار سوسائٹی کرتی تھی۔ اس لیے کہ اُس کا عقیدہ تھا کہ سب مذاہب حقیقت پر مبنی ہیں اور تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔ ایک ایسے ماحول میں جو سفید فام لوگوں کی نسلی برتری کے تکبرانہ دعووں اور ہندودھرم کی نا قابل برداشت تحقیر سے مملو تھا۔ اینی بیسنٹ کی طرح کی ایک مشہور یورپی خاتون اور اُن کے ہمنواؤں کی تعریف وتوصیف کا اچھا نتیجہ نکلنا ضروری تھا۔ اُن کے اس بیان نے کہ ''وہ ہندوستان جس سے میں عقیدے اور دل کا رشتہ رکھتی ہوں...... وہ تہذیب جس میں روحانی علم کو سب سے ارفع واعلیٰ درجہ دیا جاتا تھا اور جس میں لوگ روحانی حقیقت کی تلاش وجستجو میں لگے رہتے تھے اور اُس کا احترام کرتے تھے...... وہ ہندوستان جس کی تعمیر کے لیے میں اپنی جان دے سکتی ہوں قدیم فلسفے اور قدیم مذہب سے پوری طرح واقفیت رکھنے والا ہندوستان ہے۔ ایسا ہندوستان جس کی طرف تمام دوسرے ملکوں کو روحانی زندگی کے لیے دیکھنا چاہیے۔''[1] تعلیم یافتہ لوگوں کے دل جیت لیے لیکن سوسائٹی کے جس کام کو ہندوؤں کی مکمل حمایت حاصل ہوئی وہ تھا ہندوستان کے نوجوانوں کی تعلیم کا کام۔ اس کا سب سے بڑا کارنامہ تھا 1898 میں بنارس میں سنٹرل ہندو کالج کا قیام جہاں ہندودھرم کی تعلیم عام تعلیم کا جز وتھی۔ اس کالج میں کوشش کی گئی کہ انگلش پبلک اسکول کی تمام تر خوبیوں کے ساتھ قدیم ہندوستان کے اساتذہ اور طلبا کے رشتے کی روایات کو زندہ رکھا جائے۔

سوسائٹی نے لڑکوں، عورتوں اور کچلے ہوئے طبقوں کے لیے اسکول کھولے اور بوائے اسکاؤٹ کی تنظیم میں بھی حصہ لیا۔ سوسائٹی نے بچوں کی شادیوں کی مخالفت کی، ذات پات کو ختم کرنے کی حمایت کی اور اچھوتوں کے سدھار اور بیواؤں کی حالت بہتر بنانے کی کوشش کی۔ رنگ اور نسل کے تعصّبات کی مذمت کی۔ 1903 ہی میں اینی بیسنٹ نے اپنے سیاسی عقائد کا اظہار مندرجہ ذیل الفاظ میں کیا تھا۔

''ہندوستان پر حکومت ہندوستانی احساسات، ہندوستانی روایات، ہندوستانی خیالات اور

[1] مسز اینی بیسنٹ کا اعلان جو اُنھوں نے امرت بازار پتریکا میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں کیا تھا، ویسٹ جیونرے، Life of Annie Basant (لندن 1829 صفحہ 256)

ہندوستانی تصورات کی بنیاد پر کی جانی چاہیے۔[1]

ہندوستانیوں میں خودداری اور اپنے ماضی پر فخر کے جذبات پیدا کرنے میں تھیوسوفیکل سوسائٹی نے اہم رول ادا کیا۔

IX۔سماج کی اثر پذیری

راما کرشنا، ویویکا نند اور دیا نند کی تعلیمات نے ہندو دھرم کی بہترین روایات میں انسان پرستی کے اُس جذبے کی آمیزش کر دی جو اُنیسویں صدی کے ہندوستان کا امتیاز تھا ایک نیا جذبہ صورت پذیر ہو رہا تھا جس کے زیر اثر پرانے سانچے کمزور پڑنے لگے، اور اُن کی شکست وریخت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔فرد کے اندر اپنی اہمیت اور سماج کے تعلق سے ایک نئی ذمہ داری کا احساس پیدا ہونے لگا۔اُس کے معاشرے کا دائرہ اب پھیلنے لگا جو پہلے محض خاندان، ذات اور قبیلے تک محدود تھا۔تمام قدیم قیدو بند ٹوٹنے لگے اور فرد کا رشتہ سماج سے قائم ہونے لگا۔ان مصلحین کے منظر عام پر آنے سے پہلے ہی تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہنوں میں ایک ایسی علاقائی برادری کا تصور جنم لینے لگا تھا جس میں ملک کے تمام رہنے والے بلا لحاظ نسل و مذہب شریک ہوں۔لیکن مذہب اور سیاست میں تمیز کرنے کی صلاحیت جو ہر سیکولر سماج کی بنیاد ہوتی ہے ابھی کچھ ہی لوگوں میں پیدا ہو پائی تھی۔

سماجی تبدیلی بیک وقت تصورات کی تبدیلی اور عملی زندگی کی تبدیلی کا نام ہے۔ہندوستان پر فی الجملہ پڑنے والے برطانوی اثرات کی ایک خصوصی نوعیت یہ تھی کہ اس نے جدید ذہنی ماحول پیدا کر کے متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ لوگوں کے ذہنوں کو تبدیل کر دیا تھا۔جس کا اثر عملی زندگی کے کچھ پہلوؤں پر پڑا۔لیکن تمام لوگوں اور خصوصیت کے ساتھ گاؤں میں رہنے والوں لاکھوں کروڑوں انسانوں کی معاشی زندگی کو جوں کا توں رہنے دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُن کی عادتوں اور رواجوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔راجہ رام موہن رائے کے وقت سے شروع ہونے والی اصلاحی تحریکوں کا اثر محض تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے قبول کیا لیکن تمام لوگوں پر اُن کا کوئی اثر نہ پڑا اور وہ

---

[1] ویسٹ کا پیش کردہ اقتباس، محولہ بالا، صفحہ 221

روایتی زندگی گزارتے رہے۔ انتظامی تبدیلیوں نے گاوؤں کی حالت تو بدل دی لیکن کسی نئے معاشی نظام کو جنم نہیں دے سکیں۔ کاشت اور صنعتوں کی تکنیک اور طریقۂ پیداوار پر عہد وسطی کی چھاپ رہی اور اس لیے عہد وسطی کی روایات برقرار رہیں اور سرمایہ داری اور صنعت کاری فروغ نہ پاسکی۔ ان حالات میں سماجی تنظیم میں جمود لازمی تھا۔

شہری آبادی کا سلسلہ جو معاشی ارتقا کی علامت ہے بہت سست تھا اور زیادہ تر لوگ گاوؤں میں رہتے تھے۔ 1881 سے 1911 کے تیس سال میں شہری آبادی میں دس فی صدی سے زیادہ کا اضافہ نہیں ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دیہات میں پرانی روایات میں کوئی بڑی تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ تھوڑے سے لوگوں کو چھوڑ کر شہری آبادی بھی جس میں متوسط طبقہ بھی شامل تھا۔ پرانے طریقوں سے جڑی رہی۔

ایک ادارے کی حیثیت سے ذات پات پیشے اور معاشی سرگرمی جڑی ہوئی تھی۔ جب تک معاشی سرگرمی قدیم راستوں پر چلتی رہی ذات پات کی ساخت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ واقعہ یہ ہے کہ ذات پات اور رواجوں کا اثر اتنا گہرا تھا کہ اصلاح شدہ ملکوں کے ماننے والے بھی اُن سے پیچھا نہ چھڑا سکے۔ مثال کے طور پر برہمو سماج نے بت پرستی کو ترک کر دیا تھا۔ لیکن ٹیگور خاندان کے لوگ، جن کا شمار برہمو سماج کے پیشواؤں میں تھا، ہر سال بڑے جوش وخروش کے ساتھ دُرگاہ پوجا کا تہوار منایا کرتے تھے۔ آریہ سماج نے پیدائش کی بنیاد پر انسانوں کی درجہ بندی کی مذمت کی لیکن ایسے آریہ سماجیوں کی تعداد بہت کم تھی۔ جو اپنی ذات کے باہر شادی کرنے کی ہمت کر سکے۔ یہ صورتِ حال اخلاقی اعتبار سے غیر صحت مند تھی اسے اخلاقی معیاروں میں رخنہ پڑتا تھا۔ یعنی ایک معیار اپنے اور اپنے خاندان کے لیے اور دوسرا عام لوگوں کے لیے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کی اصلاحی تحریکات نے دونوں فرقوں کو کل ہند گروپوں کی شکل دیدی اور اس طرح اُن علاقائی اور تہذیبی فرقوں کو متحد کر دیا جو عہد وسطیٰ میں ایک دوسرے سے جداگانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ فرقوں کی اس داخلی یک جہتی نے انیسویں صدی میں بڑی ترقی کی۔ لیکن اُس کے ساتھ سب فرقوں کی سیاسی یک جہتی اور قومی اتحاد کا عمل بھی جاری رہا۔ حالانکہ ملک کی سیاسی پس ماندگی، لوگوں کی قدامت پرستی اور اُن کی تعلیم کی طرف سے حکومت کی بے اعتنائی کی

بنا پر قوم پرستی کا جذبہ اُس رفتار سے ترقی نہ کر سکا پھر بھی بہت سے تعلیم یافتہ فرقوں کا سوچنے، محسوس کرنے اور عمل پیرا ہونے کا طریقہ یکساں تھا۔

وہ جانتے تھے کہ ایک ایسے ملک کے سیاسی نظام کی تعمیر محض سیکولرزم کی بنیاد پر کی جاسکتی ہے جس میں بہت سی نسلیں، زبانیں، تہذیبیں اور مذہب پائے جاتے ہوں۔لیکن اُنیسویں صدی کے نصف آخر کے نہایت جذباتی اور رومانی ماحول میں مذہب کی نشاۃ ثانیہ ہوئی جس نے لوگوں کے ذہنوں کو متاثر کیا اور سیکولر قومی تحریک کی شدت کو کم کر دیا۔

مذہبی اصلاح کی تحریک کی شدت ہندو دھرم اور اسلام دونوں میں یکساں تھی۔ دونوں فرقوں میں احتجاج و اعتراض اور اُن کی کاٹ یا یوں سمجھئے کہ لبرلزم اور قدامت پرستی کے تصورات پھیل رہے تھے۔ یہ متوازی تحریکات یکساں وجوہ کی بنا پر وجود میں آئی تھیں ان کا اولین مقصد تھا متعلقہ فرقے کی شاندار ماضی کی بازیافت۔ تاریخ نے اُنھیں بتایا تھا کہ اُن کے بزرگوں نے بڑی بڑی سلطنتیں بنائی تھیں تہذیبی ترقی میں کارہائے نمایاں سرانجام دئے تھے۔ اور دنیا کے معاملات میں ایسا رول ادا کیا تھا جس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ دوسری بات یہ تھی کہ اُن کے ماضی کے مقابلے میں اُن کا حال ذلت آمیز اور شرمناک تھا وہ اپنی آزادی کھو چکے تھے۔ اُن کی سلطنتوں کی شان و شوکت کو بدیسیوں نے خاک میں ملا دیا تھا، اُن کی صنعتیں تباہ ہو چکی تھیں۔ اُن کے لوگ تباہ حال تھے، اُن کے بالائی طبقے اپنے مالکوں سے چھوٹی چھوٹی مراعات کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ اُن کے اخلاق میں گراوٹ آچکی تھی اور اُن کے حوصلے پست ہو چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ اپنے قابلِ نفرت حال کو بھول کر ایک نئی اور وسیع تر زندگی میں داخل ہونا چاہتے تھے۔

ان حالات میں فرقہ پرستی کو پھلنے پھولنے کا پورا پورا موقع ملا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ حکمراں اُس کو ہوا دے رہے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو قوم پرستی کی بات کرنے لگے اور مسلمان اسلامی قوم پرستی کا راگ گانے لگے اور اس طرح دو قوموں کے نظریے کی بنیاد پڑی۔ اس طرح اس نظریے کے حامیوں کو یہ خیال نہیں آیا کہ ہندو یا مسلم قوم کی اصطلاح خود اپنی نفی کرتی ہے۔ قوم ایک علاقائی، سیکولر اور سیاسی تصور ہے۔ اور مذہب، نسل اور زبان اس کے لازمی جزو نہیں ہیں لیکن اُنیسویں صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کے پیش نظر ایسے ملکوں کی مثالیں تھیں جن

پر عہد وسطیٰ کا ذہن رکھنے والے مسلمان حکومت کرتے تھے۔ عرب ممالک عثمانی ترکوں کے زیرِنگیں تھے۔ ایران پر مطلق العنان قاچار حکمران تھے۔ ملایا اور انڈونیشیا انگریزوں اور ڈچوں کے زیرِ حکومت تھے۔ نئے خیالات اور تصورات نے اُنھیں متاثر کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر بھی بین الاقوامی اسلامزم کا اثر غالب تھا۔ اس لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تہذیبی اور مذہبی اختلافات کو سامراجی سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنا دشوار نہیں تھا۔ عہدوں اور سرپرستی کا لالچ قوم پرستی کے نئے نئے جذبے پر فوقیت لے گیا جس سے مستقبل قریب میں کسی مادی منفعت کی امید نہیں تھی۔ پھر بھی فرقہ پرستی کی تمام ترکشش کے باوجود اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں قوم پرستی نشوونما پاتی رہی۔

دسواں باب

تعلیم اور ہندوستانی اخبارات

I۔ تعلیم (1858۔1905)

ہندوستانی سماج کی تبدیلی اور جذبہ قوم پرستی کے نشوونما کے باعث جو حالات وواقعات تھے اُن میں معاشی اور سیاسی حقائق کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ اُن کے ساتھ تہذیبی اور نظریاتی حقائق جڑ گئے اور ان دونوں نے مل کر قوم پرستی کی تحریک کو ایک نئ توانائی عطا کردی۔ مذہبی اور سماجی اصلاحات اُنیسویں صدی کے ابتدا میں شروع ہو چکی تھی اور اُس صدی کے نصف آخر میں پورے جوش وخروش کے ساتھ جاری رہیں۔ اُن کی وجہ سے ذہنی رویے میں بڑی تبدیلی آئی۔ وسطی عہد کے تصورات کی کایا پلٹ ہوگئی اور فرد اور سماج کے ایک جز کی حیثیت سے انسان، فطرت اور خدا کے تعلق سے مسائل میں بڑی ترمیم ہوگئی۔

ہندوستان کے ماضی کے مطالعہ نے، جس میں قدیم اور عہد وسطیٰ دونوں دور شامل تھے، اور سنسکرت کی تعلیم کے احیا نے ذلت وخواری کے احساس کو دور کرنے میں مدد دی جو آزادی کھودینے کی بنا پر پیدا ہوگئے تھے۔ لیکن اتحاد اور قوم پرستی کے جذبات کو فروغ دینے میں سب سے بڑی معاون انگریزی تعلیم ثابت ہوئی۔

ہندوستانی سماج میں دو بڑی تبدیلیاں انگریزی حکومت کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ اس نے متوسط طبقے کو جنم دیا اور دوسری یہ کہ اُس نے اُس طبقے کے لوگوں میں پائی جانے والے عہد وسطیٰ کے تصورات کو تبدیل کر دیا۔ یہ ظاہر ہے کہ لوگوں کی بڑی اکثریت اور خصوصاً دیہاتی آبادی تہذیبی اور ذہنی اعتبار سے پس ماندہ اور روایات کے حصار میں بند رہی۔ اُس کی وجہ یہ تھی کہ عہد وسطیٰ کا گاؤں کا نامی نظام اگرچہ شکستہ ہو چکا تھا لیکن اُس کی جگہ جدید صنعتی معیشت ابھی وجود میں نہیں آئی تھی۔ مذہبی اور سماجی اصلاحات میں بڑے احکامات مضمر تھے۔ پھر بھی مکمل سماجی تبدیلی اُس وقت تک ممکن نہیں تھی جب تک فی الجملہ لوگوں کی عملی زندگی میں انقلاب نہ آجائے۔ عہد وسطیٰ سے جڑے ہوئے یہ لاکھوں کروڑوں انسان متوسط طبقے کی زندگی کے لیے ایک بھاری پتھر بنے ہوئے تھے۔ جو ذہنی اعتبار سے انیسویں صدی میں رہتا تھا لیکن جذباتی اور تہذیبی اعتبار سے قدیم رسم ورواج کا پابند تھا۔

تعلیم کا مسئلہ متوسط طبقے کی توجہ کا مرکز پہلے بن چکا تھا۔ ہر مکتب خیال کے ہندوستانی جدید تعلیم کی قدر و قیمت سے واقف ہو چکے تھے اور اس لیے اسکول اور کالج قائم کرنے میں مدد دے چکے تھے۔ جہاں مغربی نصاب کی تعلیم دی جاتی تھی اور انگریزی پڑھائی جاتی تھی لیکن اُن کے پاس اساتذہ اور تعلیمی اداروں کو چلانے کے لیے وسائل کی کمی تھی۔ اس لیے انھوں نے تعلیم پھیلانے میں عیسائی مشنریوں اور یورپی کارکنوں کی اعانت کا خیر مقدم کیا۔

حکومت کا رویہ مذبذب تھا۔ 1813 تک اُس نے تعلیم پھیلانے کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا۔ اُس کے بعد بھی اخراجات کے لیے بہت چھوٹی سی رقم منظور کی۔ چونکہ حکومت مستقل مزاجی سے کام نہیں لے رہی تھی اس لیے وہ چھوٹی سی رقم بھی خرچ نہ ہو پائی۔ حکومت یہ طے نہیں کر پائی تھی کہ وہ تعلیم پھیلانے میں حصہ لے یا نہ لے۔ دوسری بات جس کے متعلق وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکی تھی یہ تھی کہ وہ ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم کے لیے اصلاح شدہ مقامی نظام تعلیم کی حمایت کرے یا انگریزی کے ذریعے جدید تعلیم کو فروغ دے۔ جب بینٹک کے فیصلے نے اس بحث کو ختم کر دیا اُس کے بعد بھی شکوک وشبہات باقی رہے۔ سب سے زیادہ غور طلب بات یہ تھی کہ تعلیم کا کیا اثر برطانوی حکومت پر پڑ گیا۔ اُن دونوں گروہوں کے درمیان اُنیسویں صدی میں بحث ومباحثہ

جاری رہا۔ جن میں سے ایک کہتا تھا کہ تعلیم برطانوی راج کے شکست و ریخت کا باعث ہوگی جب کہ دوسرے کا خیال تھا کہ اس کے سبب برطانوی راج کو تقویت ملے گی۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 1853 تک تعلیم نے کوئی ترقی نہیں کی اور حکومت کی کوشش بہت ناکافی ثابت ہوئی۔ 1855 میں بیس کروڑ کی آبادی والے ہندوستان کے لیے تعلیمی اداروں کی مجموعی تعداد، جس میں حکومت کے زیر انتظام اداروں اور تسلیم شدہ سبھی شامل تھے، 1,474 تھی جن میں صرف 67,569 طالب علم پڑھتے تھے۔ اور جن کا مجموعی بجٹ کل آمدنی کے ایک فیصدی سے بھی کم تھا۔

لیکن عیسائی مشنریوں نے صورت حال کو کسی قدر بہتر بنا دیا تھا۔ جو 1628 اسکول چلا رہے تھے، جن میں 64,005 طالب علم پڑھتے تھے۔ جہاں تک ہندوستانیوں کا تعلق تھا اُن کے مساعی نہ ہونے کے برابر تھے۔ پرانے دیسی تعلیمی اداروں کے علاوہ وہ کچھ اعلیٰ تعلیم کے ادارے اور چند اسکول چلا رہے تھے۔

1854 کے وڈ کے مراسلے سے تعلیم کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اس دستاویز میں اُن شکوک کے انعکاسات نظر آتے ہیں جو پچاس سال سے زیادہ کی مدت تک حکمرانوں کے ذہنوں میں پائے جاتے تھے۔ اگرچہ اس کا آغاز پرشکوہ انداز میں ہوا تھا۔ جس میں کہا گیا تھا کہ حکومت تسلیم کرتی ہے کہ تعلیم ''ہمارے مقدس ترین فرائض میں شامل ہے تاکہ جہاں تک ہم سے بن پڑے اُس کے ذریعے ہندوستان کی مقامی آبادی کو اُن اخلاقی اور مادی فوائد سے روشناس کرا دیا جائے جو سود حسنہ معلومات کے عام لوگوں تک پہنچنے کا نتیجہ ہوتے ہیں۔''[1] اس کے بعد اُس میں اس بات کو کہ حکومت تعلیم اور اُس کے مقاصد کی راست ذمہ داری قبول کرنے سے دامن بچائے ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ''ہم اُس وقت کا انتظار کر رہے ہیں جب ایسا نظام تعلیم باقی نہیں رہے گا جس کو پوری طرح حکومت چلا رہی ہو۔''[2] اس مراسلے کے لکھنے والوں نے ایک اور جگہ

---

[1] 1854 کا مراسلہ، پیراگراف 2۔ اس کے علاوہ دیکھیے جے۔ جے۔ اے Selection from Educational Records کلکتہ، 1922، جلد 2 (1840۔1859)، صفحہ 364

[2] ایضاً، پیراگراف 62۔

مفید اور عملی علم کی تعلیم کے لیے اپنی بڑی خواہش کا اظہار کیا ہے ''ان لوگوں کی بڑی اکثریت کے لیے جو دوسروں کی مدد کے بغیر ہم چاہتے ہیں کہ حکومت اس مقصد اور مستقبل کے لیے خصوصی اقدامات کرے جن کو بروئے کار لانے کے لیے ہم خاصی بڑی رقم منظور کرنے کے لیے تیار ہیں۔''[1]

مقامی ابتدائی تعلیم کو امدادی نظام کے تحت لاکر اس فیصلے کو عملی شکل دی گئی۔ لیکن ابتدائی تعلیم کے لیے زیادہ رقم منظور کرنے کے وعدہ کو ایفا کرنے میں اتنی جزرسی سے کام لیا گیا کہ ترقی کی رفتار تکلیف دہ حد تک سست ہوگئی۔

اس تمام زمانے میں قول وعمل کا فرق بہت واضح تھا۔ بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عام لوگوں کی تعلیم دینے کی خواہش اُن کے عام حالات کو سدھارنے کی سرکاری خواہش کا جزو تھی۔ لیکن بدقسمتی سے اس خواہش کا کوئی محسوس اثر ظاہر نہیں ہوا اس کے برخلاف خصوصیت کے ساتھ متوسط درجے کی تعلیم پر بڑی توجہ دی گئی اور اس زمانے میں اُس نے تیزی کے ساتھ ترقی کی۔

جہاں تک تعلیم کے مقاصد کا تعلق تھا وڈ نے اِن لوگوں کے خیالات کو رد کردیا جو سمجھتے تھے کہ ہندوستان میں مغربی تعلیم کا رواج انگریزی حکومت کے لیے خطرے کا باعث ہوگا۔ ''بہرحال میرا یہ خیال نہیں ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کو تعلیم دینے کی بنا پر انگریزی حکومت کے لیے خطرہ پیدا ہوسکتا ہے۔ اس کے برعکس میرا خیال ہے کہ اگر ہندوستان کی آبادی کا بڑا حصہ تعلیم حاصل کرے اور روشن خیال ہوجائے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ وہ اور ہم ایک مشترک مذہب کو ماننے لگیں تو ہندوستان میں انگریزی حکومت کمزور ہونے کے بجائے اور زیادہ مضبوط ہوجائے گی۔''[2]

اُنیسویں صدی کی حد تک وڈ کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی اس لیے ہندوستانی دانشور حکومت کی پالیسیوں پر سخت اعتراضات کرنے کے باوجود انگریزی حکومت کو ہندوستان کے لیے ضروری اور مفید سمجھتے رہے۔ اس رویے میں تبدیلی تعلیم کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ بدیسی حکومت کی ناقابل

---

[1] ایضاً، پیراگراف 114

[2] ہنسرڈ کے پارلیمانی مباحث، تیسرا سلسلہ 1853 جلد CXXVII صفحات 69-1168

تلافی خرابیوں کے تجربے نے اُن کے رویے میں تبدیلی پیدا کی اور ہندوستانیوں میں عزتِ نفس اور قومی وفاداری کا جذبہ پیدا ہوگیا۔

وڈ کا دوسرا مقصد تھا سرکاری ملازمتوں اور مختلف پیشوں کے لیے ضروری کارکنوں کی فراہمی۔ اُس نے لکھا تھا ''ہمارا ہمیشہ یہ خیال رہا ہے کہ ہندوستان میں اگر تعلیم پھیل گئی تو آپ کو حکومت کے ہر محکمے کے لیے ذہین اور قابل اعتماد لوگوں کی خدمات کرنے کا موقع ملے گا جس سے حکومت کے ہر شعبے میں کارکردگی کا معیار بڑھ جائے گا''۔[1]

تعلیم کی ہمت افزائی کرنے کے لیے اُن لوگوں کو ترجیح دی جاتی تھی جن کی تربیت انگریزی اسکولوں میں ہوئی تھی۔ چنانچہ سرکاری ملازمتیں اور زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا ذریعہ انگریزی تعلیم تھی اور تعلیم کے افادی مقصد نے اُن کے لبرل اور علمی پہلو کو داب دیا تھا۔

تعلیمی مقاصد حاصل کرنے کے لیے حکومت نے دو طریقے اختیار کیے تھے۔ پہلا طریقہ تھا محکمہ تعلیم جس میں ڈائریکٹر اور انسپکٹر ہوتے تھے۔ جن کا کام تھا تعلیم کو کنٹرول کرنا اور صحیح راستے پر چلانا۔ حالانکہ ان کے فرائض میں تعلیم کی توسیع کا کام شامل نہیں تھا پھر بھی وہ حکومت کے قائم کیے ہوئے اداروں کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ دوسرا طریقہ ان محکموں کا شروع کردہ امدادی طریقہ تھا جس کے ذریعہ تعلیمی اداروں پر پورا کنٹرول رکھا جاتا تھا۔ ان محکمات کی مدد سے حکومت اُن پالیسیوں پر عمل کرنا چاہتی تھی جنھیں مراسلے میں درج کیا گیا تھا۔

1857 کے بعد تعلیم

اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں تعلیم کی توسیع کی تاریخ کا راست اثر ملک میں قومی تحریک کی نشو و نما پر پڑا۔ اس کے پہلے مرحلے میں بڑی ترقی ہوئی جو 1854 سے 1882 تک کی مدت پر محیط تھا۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے میدان میں بڑی ترقی ہوئی۔ ابتدائی تعلیم کی ترقی کی رفتار بہت سست رہی، صدیوں میں تعلیم بٹ گئی، توسیع میں ہندوستانیوں نے زیادہ حصہ لیا اور مشنریوں کی تعلیمی سرگرمیوں کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔

---

[1] 1854 کا مراسلہ، پیراگراف 72

چونکہ تعلیم کی ترقی میں روپیہ بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس لیے مالیاتی نظام میں ہونے والی تبدیلیوں کا اثر اس ترقی کی رفتار اور نوعیت پر پڑنا لازمی تھا۔ 1854 سے 1870 تک حکومت ہند کا بجٹ قطعی مرکزی نوعیت کا تھا۔ اُس کے بعد میو نے لامرکزیت کا سلسلہ شروع کیا اور تعلیمی اخراجات صوبوں کو منتقل کر دیے۔ 1882 میں مرکزی حکومت نے صوبائی حکومتوں کے ساتھ پانچ سالہ گرانٹ کے معاہدے کرنے کا طریقہ شروع کیا۔ اُس کے بعد تعلیم کے لیے روپئے کی کمی کو پورا کرنے کے لیے دو مفید طریقے شروع کئے گئے۔ ایک طریقہ تھا صوبوں کو اس امر کی اجازت دینا کہ وہ گاؤں پر لوکل فنڈ محصول لگائیں (بنگال نے اس پر عمل نہیں کیا) دوسرا طریقہ یہ تھا کہ تعلیمی امداد کے لیے ضروری کر دیا گیا کہ لوگ اسکولوں کی دیکھ بھال کے لیے ضرور رقم جمع کریں اور طالب علم فیس ادا کریں۔ لیکن لوگوں کی عام غربت و افلاس کی وجہ سے یہ طریقے بھی اقدام حاصل کرنے میں ناکام رہے۔

بدقسمتی سے روپے کی کمی کا سب سے زیادہ اثر ابتدائی کی تعلیم کے شعبے پر پڑا۔ ابتدا کے اسکول دو قسم کے تھے یعنی پرانے قسم کے مقامی مدرسے اور جدید قسم کے اسکول جن کے اخراجات کی کفیل حکومت یا کوئی دیگر ایجنسیاں ہوتی تھیں۔ آخرالذکر سب سے اہم تھے مشنریوں کے اسکول۔ مشنریوں نے 1857 کے مراسلے کا خیر مقدم کیا تھا اور اُس نے اپنی تعلیمی سرگرمیوں کی توسیع کا اجازت نامہ سمجھا تھا۔ لیکن 1857 کی بغاوت نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔ حکومت محسوس کرنے لگی کہ شورش کی بڑی وجہ عیسائیوں کا پرچار تھا۔ جسے ہندو اور مسلمان دونوں ناپسند کرتے تھے۔ ایلن برو نے بورڈ آف کنٹرول کے صدر کی حیثیت سے حکومت ہند کو آگاہ کیا تھا کہ مشنری اسکولوں میں دی جانے والی تعلیم نہ صرف ہمارے تعلیمی نظام بلکہ انگریزی حکومت کے امن و امان کے لیے بھی خطرہ ہے۔'' اس نے مزید کہا تھا ''مجھے یقین ہے اس وقت مقامی باشندوں کے اشتعال کو دور کرنے اور حکومت کے لیے ان کا اعتماد حاصل کرنے کا سب سے اچھا طریقہ یہ ہے کہ ان اسکولوں کو دی جانے والی سرکاری امداد بند کر دی جائے جن کا تعلق مشنریوں سے ہے۔''[1]

---

[1] ڈائرکٹر محکمہ تعلیمات کی رپورٹ میں اس کا ذکر کیا گیا ہے، بمبئی، 58-1857 صفحہ 11

مشنریوں کے متعلق جو شکوک وشبہات پیدا ہو گئے تھے ان کی وجہ سے ابتدائی تعلیم کے کام میں رکاوٹ پڑی لیکن اس سلسلے میں خود حکومت نے جو کچھ کیا وہ بھی بہت ناکافی تھا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا اول اف ڈربی نے 1859 میں 1854 کے مراسلے کے نتائج کا جائزہ لیتے ہوئے حکومت ہند کی توجہ اس امر کی طرف دلائی تھی کہ عام لوگوں کو خود ان کی مادری زبان میں تعلیم دینے کی کوشش کو مسلسل نظرانداز کیا جارہا ہے۔ یہ بات تسلیم کرتے ہوئے کہ امدادی طریقہ اس قسم کی تعلیم کی ترویج میں ناکام ہو چکا ہے۔ اس نے حکم دیا کہ گاؤں کے مدرسوں کے لیے زمین پر محصول لگایا جائے۔ [1] لیکن 1859 کے اسٹینلے کے مراسلے [2] نے امداد کے ذریعہ ابتدائی تعلیم کو فروغ دینے کی پالیسی کو یکسر رد کر دیا۔ تعلیمی امداد عام لوگوں کی اسکولوں کے بجائے ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے اداروں کو دی جاتی تھی۔ چنانچہ عام لوگوں کی تعلیم کو نظرانداز کیا گیا اور ان مقامی اسکولوں کی ہمت افزائی نہیں کی گئی جو تعلیمی نظام کے لیے اساس مہیا کرتے اور عام لوگوں کی تعلیمی ضرورتیں پوری کرتے بعض صوبوں میں بالکل ختم کر دیا گیا۔ دوسرے صوبوں میں کوشش کی گئی کہ انھیں سرکاری نظام تعلیم میں شامل کر لیا جائے۔

پھر اس میں کوئی تعجب نہیں کہ حکومت ہند کے محکمہ داخلے کے انڈر سیکریٹری ہول ویل نے 1866 میں شکایت کی کہ ''اعداد وشمار کے نقشوں سے معلوم ہوتا ہے کہ 1854 سے سالانہ تعلیمی اخراجات میں جو بہت زیادہ اضافہ کر دیا گیا ہے اس کا متناسب حصہ نچلے درجوں پر خرچ نہیں کیا جاتا ہے۔ مراسلے میں ان کے لیے زیادہ رقم کا تعین کیا گیا تھا اور جو اصل مقصد تھا اس کا ذکر ہی کیا ہے۔ [3]

واقعہ یہ ہے کہ بار بار اعلان کے باوجود ثانوی تعلیم حکومت کی توجہ سے محروم رہی اس کے باوجود کہ عام تعلیم کے فوائد ظاہر تھے اور سب کو معلوم تھا کہ زراعت کے طریقوں کو سدھارنے، دیہات میں امداد باہمی کو فروغ دینے، کسان کی قانونی حیثیت کو تقویت پہنچانے یا اس کے

---

[1] حکومت ہند کی تاریخ 69-1868، تدوین ڈاکٹر جارج اسمتھ، جلد 14 (سر میور، 1870)، صفحہ 368

[2] پارلیمنٹری پیپرز 1859، سیکشن دو، جلد 24 حصہ اول 1867، صفحہ 11

[3] حکومت ہند کی تاریخ، 67-1866 تدوین ڈاکٹر جارج اسمتھ، جلد 12 حصہ 1 صفحہ 362

معیار زندگی کو اونچا کرنے کے لیے دیہات میں عام خواندگی کو فروغ دینا ضروری ہے۔ پھر بھی مقامی مدرسے قریب قریب نیست و نابود کردیے گئے۔ قدیم نظام زراعت اور اس کی عہد وسطیٰ کی تعلیم و تکنیک جاری رہی۔ 1868 میں لارڈ لارنس نے کہا تھا ''ہماری حکومت کی دشواریوں اور اس کے استحکام کے لیے امکانی خطروں میں سب سے اہم ہے عام لوگوں کی جہالت۔''[1]

جدید ابتدائی مدرسوں کی کفالت محصول، مونسپلٹیوں اور عام لوگوں کے چندوں اور طالب علموں کی فیس سے حاصل ہونے والی رقمیں یا حکومت سے ملنے والی چھوٹی موٹی امداد کرتی تھی۔ 82-1881 میں ابتدائی تعلیم پر خرچ ہونے والی مجموعی 70 لاکھ کی رقم میں حکومت کا حصہ محض 16.77 لاکھ تھا 83-1882 کے ہنٹر کمیشن نے ابتدائی تعلیم کی اہمیت اور اس کی توسیع کے لیے حکومت کی مالی ذمہ داری کو تسلیم کیا اور اعلان کیا کہ ''ثانوی تعلیم کے ساتھ ریاست کا رشتہ اس سے مختلف ہے جو ابتدائی تعلیم کے ساتھ ہے یعنی مقامی لوگوں کے تعاون کے بغیر بھی ابتدائی تعلیم کا انتظام کیا جانا چاہئے جب کہ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ثانوی تعلیم کا انتظام صرف اس صورت میں کیا جائے جب ضرورت کے مطابق مقامی تعاون حاصل ہو۔''[2]

اس کا نتیجہ یہ تھا کہ برطانوی ہند کے نو صوبوں میں جن کی آبادی تقریباً بیس کروڑ تھی، صرف 21 لاکھ طالب علم ابتدائی اسکولوں میں تھے یعنی تقریباً ایک فی صدی اور حکومت کو مجبوراً اس امر کا اعتراف کرنا پڑا تھا کہ '' ابتدائی تعلیم اور خصوصاً مقامی زبانوں میں عام لوگوں کی تعلیم ابھی تک اطمینان بخش بنیادوں پر قائم نہیں ہوسکی ہے، حکومت نے اس پر حسب ضرورت توجہ نہیں دی ہے۔''[3]

ابتدائی تعلیم کے پچھڑے پن کی جزوی وجہ تو یہ تھی کہ حکومت خود اپنے فیصلوں پر پوری طرح عمل کرنے سے قاصر رہی، جزوی وجہ تھی عام لوگوں کی انتہائی غربت اور افلاس جو تعلیم کی توسیع پر ہونے والے اخراجات میں حصہ نہیں لے سکتے تھے اور جزوی وجہ یہ تھی کہ گاؤں کے لوگوں کو اس

---

1. محکمۂ داخلہ (تعلیم)، روداد نومبر 1903 نمبر 47-42
2. ہندوستانی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ، کلکتہ، 1883 پیراگراف 283 صفحہ 254
3. حکومتِ ہند (داخلہ تعلیم) سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے نام مراسلہ، نمبر 1 مورخہ 6 فروری 1882

پر آمادہ کرنے کے لیے کوئی محرک نہیں تھا کہ وہ اپنے بچوں کو آبائی پیشے یعنی کھیتی باڑی سے علیحدہ کر کے تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے اسکول بھیجیں۔

اس کے برعکس تعلیم کی توسیع کے پہلے مرحلے میں ثانوی تعلیم کی ترقی زیادہ اطمینان بخش تھی۔ زیادہ تر ثانوی اسکولوں میں انگریزی تعلیم دی جاتی تھی اس لیے کہ انگریزی تعلیم پانے کے بعد روزگار کے بہتر اور زیادہ تر راستے کھل جاتے تھے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ لوگ انگریزی تعلیم حاصل کرنے کی خواہش ظاہر کرتے تھے۔ 1873 میں شمالی مغربی صوبجات کے لفٹنٹ گورنر سر ولیم میور نے اپنے صوبے میں انگریزی پڑھنے کی لوگوں کی خواہش کی ان الفاظ میں شہادت دی تھی۔

''پہلے کبھی اس قسم کی خواہش دیکھنے میں نہیں آئی جیسی کہ اب مقامی لوگ انگریزی کے تعلق سے ظاہر کرتے ہیں۔''[1] بنگال کے لفٹنٹ گورنر سر جرڈ نے ''بنگال کے ہندوستانیوں میں تعلیم کے ذریعے اپنی حالت بہتر بنانے کے صحت مند رجحان کا'' ذکر کیا تھا اُس نے مزید کہا ''ہر بنگالی نوجوان جو انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے ذرائع رکھتا ہے اُس کو اپنی زندگی کا اصل مقصد تصور کرتا ہے اور غریب طبقوں میں انگریزی پڑھنے کی خواہش پائی جاتی ہے''۔[2]

حکومت ثانوی تعلیم کی توسیع میں دلچسپی لیتی تھی اس لیے کہ خود اُس کی ضرورتیں بڑھ رہی تھیں اور ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے انگریزی جاننے والے ہندوستانیوں کی تعداد بڑھانی تھی۔ بنگال کے ڈائرکٹر تعلیمات نے 1865 میں کہا تھا'' اُن طبقوں اور فرقوں کی لبرل تعلیم جو سماج میں اپنی حیثیت کی بنا پر غریب طبقوں کی تعلیم کو کنٹرول کرتے ہیں اس وقت بھی سب سے اہم مقصد ہے جس پر حکومت کو توجہ دینی چاہیے''۔[3]

تعلیم کی ترقی کے لیے حکومت نے وہ نظریہ اپنایا جسے ""Downard Filtration" اوپر سے نیچے کی طرف تغیر کہا جاتا تھا۔ یہ محسوس کیا گیا کہ ''کسی طبقے میں تعلیم حاصل کرنے کی

[1] 1871-72 میں ہندوستان کی اخلاقی اور مادی ترقی اور حالات کو ظاہر کرنے والا بیان، صفحہ 118

[2] 1872-75 میں ہندوستان کی اخلاقی اور مادی ترقی اور حالات کو ظاہر کرنے والا بیان، صفحہ 72

[3] برطانوی ہند کا تعلیمی نظام، دیکھیے، محکمۂ داخلہ (تعلیم) روداد، فروری 1882، نمبر 31-71

خواہش پیدا کرنے کے لیے شرط یہ ہے اُس سے اونچے طبقے میں تعلیم پائی جائے تاکہ وہ اس سے ایک حقیقت کی طرح روشناس ہو جائیں اور اس کے فوائد کو محسوس کریں''۔[1]

انگریزی تعلیم کا فروغ

چنانچہ کئی وجوہ اور خصوصاً مغربی تعلیم حاصل کرنے کی متوسط درجے کی خواہش اور زیادہ تعداد میں انگریزی جاننے والے ہندوستانیوں کی سرکاری کاموں کے لیے ضرورت کی بنا پر اس زمانے میں ثانوی اور کالج کی تعلیم نے بڑا فروغ پایا۔ 1885 میں ملک میں 169 ثانوی اسکول تھے جن میں 18,335 طالب علم پڑھتے تھے لیکن 1882 میں محض گورنمنٹ اسکولوں کی تعداد بڑھ کے 1363 ہو گئی جن میں 44,605 طالب علم تھے۔

تعلیم کے فروغ میں خود ہندوستانیوں کا حصہ بھی کچھ کم نہیں تھا۔ 1854 میں ایسے اسکولوں کی تعداد بہت کم تھی جنھیں ہندوستانی چلاتے تھے لیکن 82-1881 میں ان کی تعداد بڑھ کے 1,341 ہو گئی یعنی گورنمنٹ اسکولوں کی تعداد کے قریب قریب برابر اور مشنری اسکولوں کی تعداد سے تقریباً دوگنا ان کی تعداد تھی 757۔

تعلیمی سرگرمیوں میں ہندوستانیوں کا حصہ حکومت کی اس پالیسی کا نتیجہ تھا جس کی ابتدا 1854 کے مراسلے سے ہوئی جس کی رو سے ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی ترقی میں حکومت نے راست حصہ لینا ترک کر دیا۔

تعلیم کو فروغ دینے کے لیے ہندو قربانی کرنے کو تیار تھے جو مغربی تعلیم کے فوائد سے واقف تھے۔ صرف مسلمان ابھی تک پس ماندہ اور مشکوک تھے۔ حالانکہ سید احمد خاں نے اُن کی مخالفت کو ختم کرنے اور مغربی تعلیم کے حق میں اُن کے خیالات تبدیل کرنے کے لیے جدوجہد شروع کر دی تھی۔

اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں کالج کی تعلیم میں بھی کم ترقی نہیں ہوئی۔ 1857 میں تین امتحان لینے والی اور الحاق کرنے والی یونیورسٹیوں کا قیام عمل میں آیا۔ اُن کا کام بھی کچھ ویسا

---

[1] ایڈورنڈ بے۔ جانسن کے نام بنگال کے ڈائریکٹر تعلیمات اے۔ کرافٹ کا خط، مورخہ 26/جون 1881، محکمۂ داخلہ (تعلیم)، روداد، فروری 1882، نمبر 31-71۔

ہی تھا جیسے محکمہ تعلیم کا جو 1854 کے مراسلے کی سفارشات کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا یعنی تعلیم کو صحیح خطوط پر چلانا اور اُس کی نگرانی کرنا۔ حکومت ثانوی اسکولوں اور کالجوں کو چلانے کی راست ذمہ داری سے بچنا چاہتی تھی لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ اُسے اُن میں سے کچھ کی ذمہ داری قبول کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ 1857 میں حکومت عام تعلیم کے 13 کالج، میڈیکل (طبی) تعلیم کے 3 کالج اور سول انجینئرنگ کالج چلا رہی تھی۔ 9 کالج مشنریوں کے تھے اور ایک کالج یعنی کلکتہ کا ہندو ودیالیہ تھا جس کو 1854 تک ایسی مشترک کمیٹی چلا رہی تھی جس کے ممبروں میں ہندوستانی اور انگریز دونوں تھے۔ تینوں یونیورسٹیوں کے پہلے میٹریکولیشن امتحان میں کامیاب ہونے والے طالب علموں کی مجموعی تعداد 219 تھی۔

1882 تک برطانوی ہندوستان میں انگریزی اور مشرقی علوم کے کالجوں کی تعداد 72 ہوگئی اور اُن کے علاوہ کئی ریاستوں میں بھی تھے۔ اُن میں سے 59 آرٹس کالج تھے جن میں 3,399 طالب علم پڑھتے تھے۔ 82-1881 میں میٹریکولیشن کے امتحان میں شریک ہونے والے طالب علموں کی تعداد 7,479 ہوگئی جن میں سے 2,778 کامیاب ہوئے۔ نئے کالجوں میں علی گڑھ کا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا ذکر خاص طور سے کیا جانا چاہئے۔ یہ کالج مسلمانوں میں ایک نئے شعور کی علامت اور احیا پرستی کی ایک ایسی تحریک کی پیداوار تھی جس نے اُنیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں بڑا جوش پیدا کر دیا تھا۔ علی گڑھ کے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے علاوہ چار اور کالج تھے جنھیں نجی کوششوں سے چلایا جا رہا تھا۔ یعنی لکھنؤ کا کیتنگ کالج جسے اودھ کے مالکان آراضی چلا رہے تھے...... کالج جس کے لیے رقم ایک خداترس ہندو کے ترکے سے ملی تھی وزیانگرم کالج جسے وزیانگرم کے مہاراجہ نے قائم کیا تھا اور تینی ویل کالج جو 1861 میں قائم ہوا تھا۔

1857 سے 1871 تک اور 1872 سے 1882 تک ایف۔اے، بی۔اے اور ایم۔اے پاس کرنے والوں طالب علموں کی تعداد ظاہر کرتی ہے کہ اس زمانے میں انگریزی تعلیم کو کتنا فروغ ہوا۔ پہلے دور میں انگریزی کے آرٹس کالجوں کی تعداد 46 تھی اور دوسرے دور میں 77۔ پہلے دور میں ایف۔اے میں 2,666۔ بی۔اے میں 859 اور ایم۔اے میں 151 طالب علم کامیاب ہوئے۔ دوسرے دور میں ایف۔اے میں 5,969۔ بی۔اے میں 2443

اور ایم۔اے میں 385 کامیاب ہوئے۔

ثانوی اور کالج کی تعلیم میں جو ترقی ہوئی اُس کا راست تعلق اُس نشاۃ ثانیہ سے تھا جو اُن دہائیوں میں وقوع پذیر ہو رہا تھا۔ یہ باہمی رشتہ دوطرفہ تھا اور متواتر جاری رہا اور اُس سیاسی بیداری کا اہم ترین عنصر بن گیا جس نے 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کی شکل اختیار کی۔ 1885-86 میں ثانوی اسکولوں میں تقریباً 4 لاکھ طالب علم تھے جن میں سے تقریبا 2,65000 محض انگریزی کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔[1] اس میں کوئی شک نہیں کہ 1881 میں انگریزی جاننے والے ہندوستانیوں کی تعداد ملک کی مجموعی آبادی میں دریا میں قطرے کی حیثیت رکھتی تھی۔ لیکن اُن کا اثر اُن سے بہت زیادہ تھا جتنا اُن کی تعداد سے معلوم ہوتا تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ وہ تمام عہدوں پر قابض تھے جو حکومت کی بنیاد سمجھے جاتے تھے اور جن کے ذریعے پالیسیوں کو عملی شکل دی جاتی تھی۔ اور حکومت کے احکام کی تعمیل کی جاتی تھی بلکہ وہ وکیلوں، ڈاکٹروں انجینئروں اور اُستادوں کی حیثیت سے بہت سے لوگوں کو متاثر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ صحافی اور ادیب تھے۔ جن کے خیالات کا پرچار بڑے پیمانے پر ہوتا تھا لیکن اُن کی اہمیت کو تسلیم کرنا حکومت کے مقاصد کے منافی تھا۔

1880 میں رپن کے آنے کے بعد تعلیم کے فروغ کی رفتار بڑھ گئی۔ گلنڈسن لبرل حکومت میں لارڈ پریسیڈنٹ ان کونسل کی حیثیت سے رپن نے 1888 اور 1870 کے تعلیمی ایکٹ منظور کروائے تھے۔ ہندوستان کے گورنر جنرل کی حیثیت سے جس مسئلے نے اُس کی توجہ کو کھینچا وہ تعلیم کا مسئلہ تھا۔ تعلیم کی توسیع میں اُس کی دلچسپی کی اصل وجہ سیاست میں اُس کے لبرل نقطۂ نظر کے بجائے یہ واقعہ تھا کہ وہ لوکل سیلف گورنمنٹ کی اسکیم کو اچھی طرح چلانے کی ضمانت کرنا چاہتا تھا۔ جس کی کامیابی کا انحصار عام تعلیم کی وسیع تر توسیع پر تھا۔

وڈ نے تقریباً پچیس سال پہلے خواہش ظاہر کی تھی کہ ''ایسی مفید اور عملی تعلیم دینے کے اقدامات کئے جانے چاہئے جو ہندوستان کے اُن لاکھوں انسانوں کی زندگی میں ہر حیثیت کے مطابق ہو۔ بغیر امداد کے معقول تعلیم حاصل کرنے کی استعداد نہیں رکھتے ہیں'' اُس نے یہ بھی کہا

---

[1] کرونٹ، سر۔اے، ڈائریکٹر تعلیمات 1886 میں ہندوستان میں تعلیم کا جائزہ، صفحہ 4

تھا کہ ''مقامی اسکولوں کی سمجھ داری کے ساتھ ہمت افزائی کی جائے اور اُنھیں اس قابل بنا دیا جائے کہ وہ لاکھوں کروڑوں انسانوں کو صحیح ابتدائی تعلیم دے سکیں'' لیکن اس کے باوجود تعلیم کے اس شعبے کو بری طرح نظر انداز کیا جا رہا تھا اور مقامی اسکول تیزی کے ساتھ ختم ہو رہے تھے۔

عام تعلیم کی توسیع کے متعلق جو توقعات تھیں اُن کے پورے نہ ہونے کے علاوہ کچھ اسباب اور بھی تھے جن کی بنا پر تعلیمی نظام کے متعلق ایک کل ہند تفتیش ضروری تھی۔ مشنریوں کی تعلیمی سرگرمیوں کے تعلق سے حکومت نے جو پالیسی اختیار کی تھی اُس سے انگلستان کے عیسائی مشنری مطمئن نہیں تھے۔ وڈ نے اس بات پر زور دیا تھا کہ مذہبی تعلیم کو نظر انداز کیا جانا چاہئے اور اچھی سیکولر تعلیم دی جانی چاہئے اور 1858 کے بعد اس پالیسی پر سختی سے عمل کیا جا رہا تھا۔

ایک اور وجہ جس نے رپن کو تفتیش کرنے پر آمادہ کیا یہ سیاسی خطرہ تھا کہ ''ہندوستانیوں کا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ جاہل اور غیر تعلیم یافتہ عام لوگوں پر اپنا اثر ڈالے گا''۔ [1]

چنانچہ بہت سی وجوہ کی بنا پر حکومت ہند نے 1882 میں انڈین ایجوکیشن کمیشن مقرر کیا جس کا صدر تھا سر ڈبلو ہنٹر اور 20 ممبر تھے جن میں سے آٹھ ہندوستانی تھے۔ کمیشن کو ہدایت دی گئی تھی کہ وہ اس بات کا جائزہ لے کہ 1854 کے مراسلے میں جن اصولوں کا ذکر کیا گیا تھا اُن پر کہاں تک عمل کیا گیا ہے اور اس میں جس پالیسی کا ذکر کیا گیا ہے اُس پر مزید عمل کرنے کے لیے ضروری اقدامات کی سفارش کرے۔ تعلیم کے مختلف پہلوؤں کے متعلق تفصیلی تحقیق و تفتیش کے بعد کمیشن نے اپنی رپورٹ 1883 میں پیش کی۔

کمیشن اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ 1854 کے مراسلے میں جو تعلیمی نظام پیش کیا گیا تھا وہ بنیادی طور پر صحیح ہے اور کسی بڑی تبدیلی کا محتاج نہیں۔ چنانچہ اُس کی سفارشات کا مقصد تھا اُس مراسلے میں بیان کئے جانے والے اصولوں کو تقویت پہنچانا اور اُن کی حمایت کرنا۔ رپورٹ میں اس بات پر زور دیا گیا تھا کہ تعلیم کو اگر ضرورت کے مطابق بنانا ہے تو اس کو سرکاری انتظام کے مضمرات سے

[1] ہیرنگٹن کے نام رپن کا خط، مورخہ 3/جون 1881، جس کو لوشین ولف نے پہلے مارکوئیس آف رپن کی سوانح جلد 3 صفحہ 114 پر دیا ہے۔

وسیع ترقی میں قومی بنانا ہوگا اور بڑی حد تک اُس کا انتظام لوگوں کو خود کرنا ہوگا۔[1] چنانچہ کمیشن نے سفارش کی کہ حکومت کا دست کش ہونا مناسب ہوگا اور کہا کہ ''حکومت کو نہ صرف اپنے اداروں کے اخراجات میں کمی کرنی چاہئے بلکہ جوں ہی کام کو جاری رکھنے کے لیے کوئی عوامی یا نجی ایجنسی مل جائے اُسے تعلیمی سرگرمیوں سے دست کش ہونا چاہئے۔''[2]

اس پالیسی کا اطلاق خصوصیت کے ساتھ کالج اور ثانوی تعلیم کے اداروں پر ہونا تھا۔ لیکن جہاں تک ابتدائی تعلیم کا تعلق تھا اس نے کہا کہ ابھی تک جو کچھ کہا گیا ہے اس سے زیادہ حکومت کو اب اس کے لیے کوشش کرنی چاہئے۔''[3] اور یہ کہ ابتدائی تعلیم پچھڑی ہوئی آدی واسی نسلوں میں پھیلانی چاہئے کمیشن نے یہ سفارش بھی کی کہ انگلستان کی طرح ابتدائی تعلیم کا کام ڈسٹرک اور میونسپل بورڈوں کے سپرد کیا جانا چاہئے لیکن اس نے اس بات کی سفارش نہیں کی کہ انگلستان کی طرح ابتدائی تعلیم اس ملک میں بھی لازمی قرار دی جائے۔ جہاں تک دیسی اسکولوں کا تعلق تھا اُس نے حکومت کو مشورہ دیا کہ اُن کی ہمت افزائی کی جائے اور سدھارا جائے تاکہ وہ جدید ضرورتیں پوری کرسکیں۔

جہاں تک ابتدائی تعلیم کے لیے سرمائے کا سوال تھا۔ اُس میں سفارش کی گئی تھی کہ لوکل فنڈ اُس کے کفیل ہوں اور صوبائی حکومتیں محض لوکل بجٹ کی کمی کو امدادی قوم سے پورا کریں۔ اچھے ارادے بے سُود ثابت ہوئے۔

اس رپورٹ کے بعد بیس سال میں ایک دفعہ پھر پچھلی دہائیوں کے مقابلے میں کالج کی اور ثانوی تعلیم میں تیزی سے توسیع ہوئی۔ جہاں تک کالجوں کا تعلق تھا اُن کی تعداد (جن میں آرٹس اور پیشہ ورانہ تعلیم کے اول اور دوم درجے کے ادارے شامل تھے) 72 سے بڑھ کے 191 ہوگئی جن میں سے 145 آرٹس کالج اور 46 پیشہ ورانہ کالج تھے یعنی اس کے معنی یہ ہوئے کہ 1882 کے بعد اُن کی تعداد تگنی ہوگئی برطانوی ہند کے چھ صوبوں میں 82-1881 میں طالب

---

[1] انڈین ایجوکیشن کی رپورٹ، کلکتہ، 1883 صفحہ 452

[2] تفصیلی بحث کے لئے دیکھئے، ایضا صفحات 254-65

[3] ایضاً صفحہ 112

علموں کی مجموعی تعداد 5432[1] تھی اور 2-1901 میں یہ تعداد 23009[2] ہوگئی تھی۔ یعنی چوگنی سے زیادہ 82-1881 میں 18 مشنری کالجوں کے مقابلے میں 5 ہندوستانی کالج تھے۔

2-1901 میں 168 آرٹس کالج تھے جن میں سے 136 برطانوی ہند میں تھے اور 32 ہندوستانی ریاستوں میں تھے۔ ان میں سے 42 کا انتظام ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں تھا اور 37 کا مشنریوں کے۔ ظاہر ہے کہ 1903 تک اعلیٰ تعلیم کی توسیع کے میدان میں ہندوستانی مشنریوں سے آگے نکل گئے تھے۔

ثانوی تعلیم کے میدان میں بھی ایسی ہی ترقی ہوئی۔ اسکولوں کی تعداد 3916 سے بڑھ کے 5,124 ہوگئی اور طالب علموں کی تعداد 2,11,477 سے بڑھ کے 5,90,129 ہوگئی ان میں سے زیادہ تر اسکولوں کے اخراجات ہندوستانی ایجنسیاں نجی طور سے پورا کرتی تھی اور اُس میں اُستاد بھی ہندوستانی تھے۔

لیکن صدی کے اختتام تک ابتدائی اسکولوں کی حالت قابل افسوس تھی۔ 2-1901 میں واقعی اسکول جانے والے بچوں کی تعداد تیس لاکھ تھی جب کہ اسکول جانے کی عمر کے بچوں کی مجموعی تعداد ایک کروڑ اور اسی لاکھ تھی۔ حکومت 82-1881 میں ابتدائی تعلیم پر جو خرچ کرتی تھی۔ 2-1901 میں بھی قریب قریب اُتنا ہی خرچ کرتی تھی اول الذکر سال میں 77 میں 16 لاکھ خرچ کئے گئے اور آخر الذکر میں 16.92 لاکھ۔ اس کے برعکس تعلیم کی توسیع پر جو بھی خرچ ہوا اُس کا بوجھ مقامی اداروں کے مزید محاصل پر پڑا۔ 82-1881 میں لوکل بورڈوں نے 24.9 لاکھ دئے تھے جو 2-1901 میں بڑھ کے 46.1 لاکھ ہوگئے اس کے باوجود 2-1901 میں مردوں میں خواندگی دس فیصدی تھی اور عورتوں میں 7 فیصدی۔ ہر چار گاؤں میں سے تین میں اسکول نہیں بنے تھے۔

---

[1] کرافٹ، سرولفریڈ، 1886 میں ہندوستان میں تعلیم پر ریویو جس میں ایجوکیشن کمیشن کی رپورٹ کا خصوصی حوالہ دیا گیا (کلکتہ (1888 صفحہ 31 سید محمود ہندوستان میں انگریزی تعلیم کی تاریخ 1781 لغایت 1892 علی گڑھ 1895، صفحہ 120

[2] ہندوستان میں تعلیم کی ترقی کا تاریخی رسالہ، ریویو، 1857 لغایت 1902 جلد دوم عام نقشہ

انگریزوں کی ڈیڑھ سو سال کی حکومت کے بعد بھی معاش اور تعلیمی اعتبار سے ہندوستان کے عام لوگ بچھڑے ہوئے تھے۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ حکومت نے لازمی ابتدائی تعلیم میں کوئی دلچسپی نہیں لی بلکہ اس مہنگی تعلیم کو قلانچ مقامی اداروں یعنی دسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں کے سپرد کر دیا اور تعلیمی اداروں میں کوئی اضافہ نہیں کیا۔ اسی کے ساتھ اُس نے مقامی اسکولوں کو بھی نظرانداز کیا۔ جہالت اور انتہائی افلاس ایسی دو خرابیاں تھیں جو پورے زمانے میں لوگوں کو پریشان کرتی رہیں۔ ان حالات میں یہ لازمی تھا کہ وہ توہم پرستی میں مبتلا رہیں، رسم و رواج کے بندھنوں میں جکڑے رہیں۔ بڑے بڑے کام کرنے کے حوصلے سے محروم ہوں۔ زراعت کی جدید تکنیک کے خلاف ہوں، دکھوں اور بیماریوں کے شکار ہوں اور ترقی کی طرف سے غفلت برتیں۔

مقابلتاً متوسط طبقے کو زیادہ تعلیم میسر ہوئی۔ حالانکہ اُن کی تعداد کا اندازہ لگانا مشکل ہے لیکن اس زمانے میں ثانوی اور اعلیٰ تعلیم میں بہ لحاظ مقدار زیادہ ترقی ہوئی اور وقت گزرنے کے ساتھ قومی زندگی کے تمام شعبوں میں متوسط طبقے کی سرگرمیاں بڑھتی رہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُن میں تعلیم تیزی کے ساتھ پھیل رہی تھی۔

اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں ہندوستان کے تمام فرقوں میں تعلیم نے یکساں ترقی نہیں پائی۔ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق تھا تعلیم بڑی حد تک متوسط طبقے تک محدود تھی اُس کے بالائی حصوں نے بھی دوسروں کے مقابلے میں تعلیم حاصل کرنے کے مواقع سے فائدہ کم اُٹھایا۔ اُن کے مفاد میں حکومت نے خصوصی انتظامات کئے جن کی بنا پر ایک طرف تو وہ تعلیم یافتہ متوسط طبقے کے اصل دھارے سے کٹ گئے اور دوسری طرف اپنے بدیسی مالکوں کی طرف اُن کی وفاداریاں بڑھ گئیں۔

اس پالیسی کے مطابق ایسے ادارے قائم کئے گئے جہاں صرف راجوں، مہاراجوں، امیروں اور زمینداروں کے بچوں کو داخل کیا جاتا تھا۔ اُن میں مندرجہ ذیل شامل تھے۔

(1) اجمیر کا میو کالج

(2) راجکوٹ کا راجکمار کالج

(3) اندور کا ڈال کالج

واقعہ یہ ہے کہ محض متوسط طبقے اور خاص طور سے متوسط طبقے کے غریب لوگوں کے بچے انگریزی اسکولوں کی طرف جاتے تھے اس کی وجہ ظاہر تھی۔ متوسط طبقے کا بالائی حصہ مالکان اراضی پر مشتمل تھا جو کسی آزاد پیشے یا سرکاری ملازمت میں داخل ہونے کے بہت خواہش مند نہیں تھے اور اس لیے کالج کی تعلیم میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتے تھے اس کے برعکس وہ لوگ جو کھاتے پیتے گھرانوں سے تعلق نہیں رکھتے تھے اپنے حالات کو سدھارنے کے زیادہ خواہش مند تھے اور اسکول اور کالج ان سے بھر جاتے تھے۔ کسی نوجوان کو رات میں سڑکوں کو لیمپوں کی روشنی میں پڑھتے ہوئے دیکھنا کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ انگلستان کی یونیورسٹیوں کے برعکس، جو ایسے تعلیمی ادارے تھے جہاں طبقۂ امرا کے نوجوانوں کو تہذیبی اور اخلاقی اُمور کی تربیت دی جاتی تھی، ہندوستان کے تعلیمی اداروں کو عہدوں کی تلاش کرنے والے حاجت مند نوجوانوں کی تربیت گاہ سمجھا جاتا تھا۔ اُنھیں اعلیٰ تعلیم یا علم و تحقیق کو فروغ دینے کے ارادے بھی نہیں سمجھا جاتا تھا۔

ہندوستان میں پڑھے لکھے لوگوں کی مجموعی تعداد کا 60 فیصدی حصہ آبادی کے 20 فیصدی سے بھی کم حصے سے تعلق رکھتا تھا۔ اُن میں سے زیادہ تر 20 ذاتوں سے تعلق رکھتے تھے جن میں زیادہ نمایاں تھے برہمنی ویش اور کائستھ۔ یہ تینوں ذاتیں مل کر ہندوستان کی مجموعی ہندو آبادی کی دس فیصدی سے بھی کم تھیں۔ لیکن 36 فیصدی تعلیم یافتہ لوگ اُن سے متعلق تھے اگر مردوں اور عورتوں دونوں کو شامل کرلیا جائے تو صرف 11 ذاتوں سے جو آبادی کی 14 فیصدی تھیں، 50 فیصدی تعلیم یافتہ لوگوں کا تعلق تھا۔ [1] ان اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں میں تعلیم ایک چھوٹے سے حلقے تک محدود تھی۔ لیکن اس بات کا اعتراف کیا جانا چاہئے کہ انگریزوں سے پہلے کے زمانے کے برعکس اُس وقت کوئی ایسا فرقہ نہیں تھا جو اپنے لوگوں میں تعلیم یافتہ افراد کی تعداد پر فخر نہ کرتا ہو۔ تعلیم نے ذات پر ہلا بول دیا تھا لیکن ابھی تک وہ بہت معمولی اور سطحی دراڑ ڈال سکی تھی ذاتوں کی سختیوں میں محض ایک ذرا سی کمی ہوئی تھی۔

---

[1] ڈیوس، کنگلس لے، ہندوستان اور پاکستان کی آبادی، صفحہ 106۔ ڈیوس نے اپنے نتیجوں کی بنیاد ہندوستان کی مردم شماری کی عام رپورٹ 1891، کو بنایا ہے۔

حکومت کی طرف سے مسلمانوں کی تعلیم کی ہمت افزائی

جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا اُن کی ترقی مایوس کن تھی۔ تعلیم میں اُن کے پچھڑے پن کی ذمہ داری بڑی حد تک حکومت کی ناراضگی اور حکمرانوں اور اُن کے مذہب اور تہذیب کے تعلق سے خود اُن کی نفرت پر تھی۔ اس کا خصوصی اطلاق ثانوی اور اعلیٰ تعلیم پر ہوتا تھا۔ 72-1871 میں ہندوستان کے بڑے چھ صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی 22.8 فیصدی تھی جب کہ اسکولوں میں پڑھنے والے کل طالب علموں میں مسلمان صرف 14.5 فیصد تھے۔ شمال مغربی صوبجات اور اودھ میں اُن کی تعداد تناسب سے زیادہ تھی اور بقیہ چار صوبوں میں تناسب سب سے کم۔ اس واقعے اور مسلمانوں کی طرف حکومت کے بدلے ہوئے رویے کی بنا پر، جس کی علامت ہنٹر کی کتاب ہندوستانی مسلمان تھی جو 1872 میں شائع ہوئی، حکومت نے 7/اگست 1871 کو ایک تجویز منظور کی جس میں اعلان کیا گیا تھا کہ حکومت مسلمانوں کی تعلیم کی زیادہ ہمت افزائی کرے گی۔ ایک سال کے اندر یعنی 13/جون 1872 کو ایک تجویز منظور کی گئی جس میں 1871 کے بعد صوبے کی ترقی کا جائزہ لیا گیا اور فیصلہ کیا گیا کہ مسلمانوں کو اعلیٰ ذہنی تربیت اور زندگی کے لیے مفید صحت مند علم میں اُن کا پورا حصہ دیا جائے۔ یہ تعلیم اس طرح دی جائے کہ مشرقی روایت سے، جو اُن کی نسلی اور ملک کی مملکت ہے، ٹکراؤ کے بجائے دونوں شیر و شکر ہو جائیں۔''[1]

دس سال کی مدت ختم ہونے کے بعد (1882-1872) کالجوں (انگریزی) میں مسلمانوں کی تعداد طالب علموں کی مجموعی تعداد کی 3.65 فیصدی اور انگریزی ہائی اور مڈل اسکولوں میں 9.2 فیصدی تھی۔ یہ دیکھتے ہوئے کہ مسلمانوں کی آبادی مجموعی آبادی کی 22.8 فیصدی تھی۔ ان اعداد سے ظاہر ہوتا ہے کہ صورت حال اطمینان بخش نہ تھی۔ ہنٹر کمیشن نے تسلیم کیا کہ '' کسی طبقے کے لیے خصوصی انتظام بذات خود ایک برائی ہے[2] اور مسلمانوں سے کہا کہ اپنی مدد خود کریں اور اس کے لیے قربانی دیں۔ پھر بھی اُس نے سفارش کی '' کہ مسلمانوں کی تعلیم

---

[1] سید محمد، محولہ بالا، صفحات 54-153

[2] ہندوستان کی تعلیمی کمیشن کی رپورٹ، محولہ بالا، صفحہ 506

کے تعلق سے خصوصی انتظامات کو لوکل، میونسپل یا صوبائی فنڈ[1] کا جائز استعمال تسلیم کیا جائے' اس کے علاوہ اس نے اس بات پر زور دیا کہ مقامی مسلم اسکولوں کی ہمت افزائی کی جائے، مسلمانوں کے اسکولوں کے لیے خصوصی معیار قائم کیا جائے، ابتدائی اور ثانوی اسکولوں میں مسلمانوں کے لیے حالیہ تعلیم ہندوستانی ہو اور اُس کو سکھانے کے خصوصی انتظامات کئے جائیں، انگریزی اسکول کھولنے کے لیے مسلم اوقاف کو استعمال میں لایا جائے اور اُن اسکولوں میں مسلم اساتذہ مقرر کئے جائیں، مسلم انسپکٹروں کا تقرر کیا جائے وغیرہ وغیرہ تاکہ مسلمانوں میں تعلیم فروغ پائے۔[2] ڈنزن کی حکومت مسلمانوں کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینے پر رضامند ہوگئی اور اُس نے کمیشن کی زیادہ تر سفارشات کو منظور کر لیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ 92-1891 تک آرٹس کالجوں (انگریزی) میں مسلم طالب علموں کی تعداد بڑھ کے 5.9 فیصدی، پیشہ ورانہ کالجوں میں 7.5 فیصدی اور ثانوی اسکولوں میں 14 فیصدی ہوگئی[3] جب کہ اُن کی آبادی 21.8 کے لگ بھگ رہی۔ مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ جہاں تک مسلمانوں میں عام حرف شناسی کا تعلق تھا 87-1886 میں وہ مجموعی آبادی میں اُن کے فیصدی تناسب کے مطابق تھی یعنی 22.6 فیصدی۔[4] صرف اعلیٰ تعلیم کے میدان میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بڑا فرق تھا۔

1903 تک فی الجملہ صورت حال کچھ خراب ہوگئی۔ اُن کی مجموعی آبادی 22.6 فیصدی تھی اور مسلمان طالب علموں کی تعداد تھی 18.21 فیصدی۔ یہ کوئی بہت بڑا فرق نہیں تھا۔ لیکن اعلیٰ تعلیم کے میدان میں مسلمانوں کا پچھڑاپن زیادہ نمایاں تھا۔ مسلمان طالب علموں کی تعداد سرکاری ابتدائی اسکولوں میں تھی 19.7 فیصدی ثانوی اسکولوں میں 14.4 فیصدی، آرٹس کالجوں میں 7.3 فیصدی اور پیشہ ورانہ کالجوں میں 6.4 فیصدی۔ صرف خصوصی تعلیم کے میدان میں از روئے

---

[1] ایضاً، صفحات 06-505

[2] ایضاً

[3] سید محمد، ایضاً، صفحہ 177

[4] تعلیم کی ترقی کی پانچ سالہ رپورٹ (1902-1897)، پیراگراف 113

تناسب اُن کی تعداد ہندوؤں سے زیادہ تھی، یعنی کل کی 7 سو فیصدی۔

یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ مسلمانوں کی جو خصوصی ہمت افزائی کی گئی تھی اُس کا کوئی اثر اُن میں تعلیم پھیلنے پر پڑا۔ تعلیم کا سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ اُس کی بنا پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے کھل جاتے تھے۔ لیکن حکومت کے اچھے رویے کی بنا پر صرف ماتحت ملازمتیں مل سکتی تھیں۔ جن میں بھرتی کرنے کا اختیار افسروں کو حاصل تھا۔ اُن کے لیے یونیورسٹی کی تعلیم کی چنداں ضرورت نہیں تھی چنانچہ مسلمان نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل نہیں کرتے تھے۔

اس کے برعکس جب کالجوں میں تعلیم پائے ہوئے لوگوں اور گریجویٹوں کی تعداد بڑھنے لگی اور ضرورت سے زیادہ تعلیم یافتہ لوگ پیدا ہونے لگے تو عہدوں کے لیے زیادہ سخت مقابلہ ہونے لگا۔ قابلیت اور لیاقت کا لحاظ کم ہونے لگا اور یہ مطالبہ زور پکڑنے لگا کہ مسلمانوں کو اہمیت کی بنیاد پر سرکاری عہدوں میں اُن کا حصہ مقرر کیا جائے۔ اس مطالبے کی بنا پر جو مراعات دی گئیں اُن کا دہرا اثر ہوا۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کے ساتھ کھلا مقابلہ کرنا یا یوں کہیے اُونچے معیار کے لیے کوشش کرنا ترک کر دیا اور دوسری طرف مسلمانوں کے ساتھ بہتر برتاؤ کی بنا پر ہندوؤں میں تلخی پیدا ہو گئی۔

II۔ انگریزی تعلیم اور قومی تحریک

اُنیسویں صدی میں مغربی تعلیم کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی ذہن کو تبدیل کرنے میں اس کے دوررس اثرات نے کیا رول ادا کیا۔ یورپ میں عہد جدید کی تشکیل میں یونانی علوم نے جو رول ادا کیا تھا وہی رول مغربی فکر نے ہندوستان میں ادا کیا۔ یورپی اور خصوصیت سے انگریزی ادب، فلسفے اور سائنس کی تعلیم کی بنا پر مذہبی اور سماجی اصلاحات، رومانیت، روشن خیالی یا عقل پرستی، تاریخی نقطۂ نظر اور سماجی عمل کے ایک اصول کے طور پر حب الوطنی کے جذبات کو جنم ملا۔ لیکن اس تبدیلی کا ہندوستان پر اگر ویسا اثر نہ پڑا جیسا یورپ پر پڑا تھا تو اُس کی وجہ یہ تھی کہ زندگی کے مادی حالات اور خاص طور سے عام لوگوں کی زندگی کے مادی حالات پر قریب قریب ایک جمودی کیفیت طاری تھی۔ اور اس قسم کی آزاد سیاسی سرگرمی مفقود تھی جو اُن سماجوں میں

دیکھنے میں آتی ہیں، جہاں حاکم ومحکوم میں ایک زندہ رشتہ پایا جاتا ہے۔

جب کہ یہ بات تاریخی اعتبار سے درست ہے کہ مغربی تعلیم نے جدید سماج کی تشکیل اور ہندوستان کے مختلف لوگوں کے اتحاد میں اہم رول ادا کیا۔ اس کو بھی تسلیم کیا جانا چاہئے کہ اس تعلیم کی ترویج میں کچھ بڑی خرابیاں بھی تھیں جن کے انعکاسات افرادی بعد اجتماعی کردار میں نظر آتے ہیں۔

اول اور نظری علم پر زور دیا گیا جس کی وجہ سے کتاب پڑھنے اور غیر حقیقت پسندی کے خلاف جھکاؤ اور بڑھ گیا تھا جسے کلاسیکی مشرقی علم نے فروغ دیا تھا۔ ہندوستانی زبانوں کی طرف عدم توجہ، جنھیں حقارت سے دانا مکر کا نام دیا گیا تھا اور اس کے نتیجے میں جدید فکر کے ذرائع کی حیثیت سے اُن کی پس ماندگی کی بنا پر وہ لوگ جو انگریزی نہیں جانتے تھے اور جن کی تعداد بہت زیادہ تھی اُس عہد وسطیٰ کی دنیا سے نکلنے کے مواقع سے محروم ہو گئے جہاں وہ رہتے تھے۔ اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ لوگوں کے درمیان فاصلہ اور بڑھ گیا۔

ثانوی اور اعلیٰ جماعتوں میں ذریعہ تعلیم کی حیثیت سے انگریزی کو رائج کرنے کا ایک اور بڑا نتیجہ ہوا۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم ہونے سے پہلے بہت سے ہندو فارسی پڑھتے تھے اور کچھ عربی بھی سیکھتے تھے اسی طرح بہت سے مسلمان ہندوستانی زبانیں پڑھتے تھے اور اُن میں لکھتے بھی تھے کچھ سنسکرت بھی پڑھتے تھے۔ لیکن جب ذریعہ تعلیم انگریزی ہو گئی تو ہندوؤں کے لیے انگریزی کے ساتھ عربی اور فارسی پڑھنا اور مسلمانوں کے لیے سنسکرت سیکھنا مشکل ہو گیا۔ ایک دوسرے کے کلاسیکی ادب سے عدم واقفیت بھی ایک وجہ تھی اس دوری کی، جو دونوں کے درمیان بڑھتی گئی۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ مغربی فکر اور انگریزی زبان کے مشترک علم نے اس کھائی کو کسی قدر پاٹنے اور خرابی کو دور کرنے میں مدد دی۔

اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ ایک بدیسی زبان کے ذریعہ تعلیم حاصل کرنے کا مجموعی نفسیاتی اثر کیا ہوا ہوگا لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ یاد کرنے کی قوت پر بہت بوجھ پڑا اور فکر میں تازگی باقی نہ رہی۔

جب کرزن نے ہندوستان میں تعلیم اور پچھلے پچاس سال میں اُس کے عواقب کا جائزہ لیا تو

وہ جس نتیجہ پر پہنچا اُس میں تعلیم کے فوائد مشکوک تھے۔ اُس نے کہا:

''ایک اہم مکتبِ خیال ایسا بھی ہے جو اس بات کو نہیں چھپاتا کہ یہ تجربہ (ہندوستان میں انگریزی تعلیم کا) ایک غلطی تھا۔ اور اس کا نتیجہ تباہ کن...... اُن کا خیال ہے کہ اس نے ایک ایسے ذہن اور کردار کو جنم دیا ہے جو تنظیم سے عاری ہے، انضباط سے متنفر ہے، غیر مطمئن ہے اور کچھ صورتوں میں تو واقعی بغاوت کی طرف مائل ہے۔''[1]

حالانکہ اُس نے اس رائے سے پورا اتفاق نہیں کیا لیکن اُس کا خیال تھا کہ ہندوستانی تعلیم بڑی حد تک ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں پہنچ گئی ہے جس پر حکومت کو کنٹرول نہیں حاصل ہے اور یہ کہ ہندوستانی حکومت پر دن بہ دن زیادہ تنقید کرتے جارہے ہیں۔ یا سرکاری لفظیات میں یوں سمجھئے کہ زیادہ ''سرکش'' ہوتے جارہے ہیں۔ اُس کا خیال تھا اِن دونوں کے درمیان ایک رشتہ ہے۔ چنانچہ اُس نے اِس رویے کو بدلنے کے ذریعے تلاش کرنے کی کوشش کی چنانچہ تعلیم کے کمتر معیار کو بہانہ بنا کر جو بظاہر جائز سبب معلوم ہوتا تھا، اُس میں اُس نے ابتدائی ثانوی اور یونی ورسٹی کی تعلیم کی خرابیوں پر روشنی ڈالی۔ ان خرابیوں کے متعلق اُس نے کہا:

''ہم نے نصاباتِ تعلیم اور امتحانوں کا ایک ایسا نظام بنادیا ہے جو تعلیم کا بوجھ بڑھانے کے ساتھ انسانی عمل ثمر میں نوعی خرابی کا باعث ہے۔ بھیڑوں کی طرح طالب علموں کو ایک لیکچر روم سے دوسرے لیکچر روم کی طرف اور ایک امتحان سے دوسرے امتحان کی طرف ہانکا جاتا ہے، لغات کی کتابوں کا انتخاب صحیح نہیں ہوتا ہے۔ ڈگریاں حاصل کرنے میں اُن کی تجارتی قدر و قیمت پر نظر رکھی جاتی ہے۔ سینٹوں میں اراکین کی تعداد ضرورت سے زیادہ ہے۔ جن کا انتخاب تعلیمی قابلیت کے علاوہ ہر اصول کی بنا پر کیا جاتا ہے، سنڈیکیٹوں کے پاس کوئی اختیارات نہیں ہیں۔ فعال مگر اکثر اوقات بے سمتی کی شکار کوششوں کا ایک عظیم نظام جس پر ایک بھوت کی طرح کسی خاص غرض سے بڑھنے کی مضرت رساں روح سایہ فگن ہے۔''[2]

---

[1] ریلے، سرٹامس، لارڈ کرزن ہندوستان میں اُس کی تقریروں کا انتخاب 1898ء۔ 1905 جلد 2 لندن میکملن 1909 صفحہ 30

[2] ایضاً، صفحہ 70

اس نے پورے نظام کی تلخیص ان الفاظ میں پیش کی ''لیکن میرا خیال ہے کہ حقیقی زندگی یعنی دینی، اخلاقی اور روحانی زندگی کے انعکاسات بہت کم اور دھندلے ہیں۔''[1]

مبالغے کے باوجود یہ الزام غلط نہیں تھا، لیکن کرزن نے تعلیم کی ماہیت کو سدھارنے کے لیے جو طریقہ تجویز کیا اس نے اس کی ماہیت اور خراب کردی خود اس کے الفاظ تھے، ''ہمیں تعلیم کی مقداری نوعیت کے بجائے اس کی ماہیتی نوعیت پر نظر رکھنی چاہیے۔'' اس کی وجہ سے کرزن اور ہندوستان کی رائے عامہ میں کھلا ہوا ٹکراؤ شروع ہو گیا جو پڑھے لکھے لوگوں کی بہت کم تعداد یعنی دس فیصدی سے غیر مطمئن تھی اور سمجھتی تھی کہ تعلیم کی توسیع ملک کے مفاد کے لیے ضروری ہے۔ لوگ وائسرائے کے ارادوں کے متعلق مشکوک ہو گئے۔

ریلے ایجوکیشن کمیشن نے جسے کرزن نے یونیورسٹی کی تعلیم کے نظام کے متعلق رپورٹ پیش کرنے کے لیے مقرر کیا تھا۔ سفارش کی کہ یونیورسٹی کے نظم کی تشکیل نو کی جائے، صرف امتحان لینے کے بجائے یونیورسٹی کے سپرد درس وتدریس کا کام بھی کیا جائے، ملحق کالجوں پر زیادہ کنٹرول رکھا جائے اور الحاق کے لیے زیادہ سخت شرائط رکھی جائیں۔

1904 کے انڈین یونیورسٹیز ایکٹ میں ان سفارات کو شامل کیا گیا جس کی ان حکومت کو اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ یونیورسٹی کے ضوابط میں ترمیم یا تنسیخ کرسکتی تھی۔

گوکھلے نے، جو ایک انتہائی ذمہ دار اور اعتدال پسند عوامی کارکن اور اہم ماہر تعلیم تھے ہندوستانیوں کی بے چینی اور مایوسی کا ذکر ان تقریروں میں کیا۔ اپریل لیجسلیٹیو کونسل میں کہیں۔ انھوں نے اسمبلی کو ''اس اقدام کے خلاف ملک کے تعلیم یافتہ لوگوں کے جذبۂ مخالفت پر توجہ دلائی ''جس کے متعلق کسی شک وشبہے کی گنجائش نہیں تھی۔''[2] اور یونیورسٹیوں سے نکلنے والی بیچلرس آف آرٹس کی بےچینی کی وضاحت کرتے ہوئے انھوں نے صاف صاف کہا کہ یونیورسٹی کے بااختیار اداروں کی تشکیل نو کی جو رعایت ایکٹ میں رکھی گئی ہے وہ ''اعلیٰ تعلیم کے میدان میں مقامی لوگوں کی کوششوں پر برا اثر ڈالے گی'' اور مزید کہا ''اسے کوئی فائدہ ہوگا یا نہیں ہوگا یہ بات مشکوک ہے

---

[1] ایضاً، صفحہ 71

[2] گھوکھلے کی تقریریں، دوسرا اڈیشن، 1916، صفحہ 265

لیکن جو نقصان اس سے ہوگا اس میں کسی شک وشبہے کی گنجائش نہیں۔''[1]

انھوں نے ان توقعات کی طرف اشارہ کیا جو کرزن کی تقریروں نے یونیورسٹی کے اصلاحات کے متعلق پیدا کردی تھیں اور شکایت آمیز لہجے میں کہا ''لیکن ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ وہ نئی نئی امیدیں، جنھوں نے ہمارے دل خوش کردئے۔ ٹھٹھر کے مر گئیں اور ہمیں معلوم ہوا کہ اس اقدام کے بجائے جس کی ہم امید لگائے بیٹھے تھے ہمیں ہمیشہ کے لیے ماہرین کی تنگ نظر اور مہنگی حکومت سے سابقہ پڑ گیا۔''[2]

کرزن اور تعلیم یافتہ ہندوستان کے درمیان ٹکراؤ تعلیم کے اس عمل کا نتیجہ تھا جو ہندو کالج کے قیام سے شروع ہوکر انیسویں صدی میں جاری رہا۔ اس کی ماہیاتی اور مقداری خرابیاں جو بھی ہوں جن کی وجہ سے تعلیم کی افادیت متاثر ہوگی لیکن اس کے نتائج نے اس کا جواز پیش کردیا۔ تعلیم کا اصل مقصد ہے ذہن کی آزادی اور ایک آزاد ذہن کو ہمیشہ کے لیے بدیسی مطلق العنانیت کا غلام بنا کر نہیں رکھا جاسکتا ہے۔ کرزن نے جو برطانوی سامراج کا سب سے بڑا وکیل تھا اس نوعیت کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کی جسے اس کے پیش روؤں نے جنم دیا تھا۔ اس نے یہ قدم بڑے تذبذب اور مختلف عواقب کی امید کے ساتھ اٹھایا تھا۔ کچھ انگریزوں نے اس کے نتائج کو پہلے ہی سمجھ لیا تھا لیکن انھوں نے سمجھداری معقولیت کا ثبوت دیتے ہوئے ان کا خیر مقدم کیا تھا۔ کچھ اور نے جو اتنے ہی دور اندیش تھے، تعلیم کی توسیع کو تباہی کا پیش خیمہ تصور کیا لیکن تعلیم کو ان مقاصد کے تابع لانے کی تمام کوششوں کا جواز اس کی فطرت کے خلاف تھے، ناکام تھا۔ کرزن نے جن پالیسیوں کی داغ بیل ڈالی تھی ان کے تلخ نتائج اس کے جانشینوں کے سامنے آئے۔

III۔ ہندوستانی اخبارات (1860 1900)

1857 تک ہندوستانی اخبارات کا ذکر ایک پچھلے باب میں کیا جاچکا ہے۔ بغاوت کے بعد کا زمانہ اخبارات کی نشو ونما میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ انیسویں صدی کے نصف اوّل کے

---

[1] ایضاً، صفحات 83-282

[2] ایضاً، صفحہ 304

زمانے کو اخبارات کے بچپن کا زمانہ کہا جا سکتا ہے۔ بہت سے اخبارات نکلے لیکن ان میں سے زیادہ تر کی زندگی محض چند روزہ تھی۔ ان کے پڑھنے والوں کا حلقہ چھوٹا سا تھا اور ان میں اکثر چار صفحے کے ہفتہ وار تھے۔

اس دوران انگریزی تعلیم پھیلتی رہی جو بڑھتے ہوئے متوسط طبقے کی علامت تھی۔ اسکولوں اور کالجوں کی تعداد بڑھ رہی تھی اور تین یونیورسٹیاں کام کر رہی تھیں۔ جن کی تعداد 1887 میں بڑھ کے پانچ ہوگئی تھی۔ مذہبی اور سماجی اصلاح کی تحریکیوں نے سماج میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اور مصلحین پرانے خیال کے لوگوں میں جو بحث ومباحثے ہوتے تھے اُنھوں نے گہرا اثر لوگوں کے ذہنوں پر ڈالا تھا۔ جہاں تک سیاست کا تعلق تھا بنگال بغاوت کی زیادتیوں اور اُن کے نتائج سے محفوظ رہا تھا۔ لیکن سرکاری افسروں کے بدلے ہوئے رویے، دیہات میں بڑھتی ہوئی معاشی دشواریاں، جن کا اظہار بار بار پڑنے والے قحطوں سے ہوتا تھا اور حکومت کے ہر کاروبار سے ہندوستانیوں کی علیحدگی ایسی وجوہ تھیں جنھوں نے ہندوستانیوں کی بڑھتی ہوئی بے چینی میں اور اضافہ کر دیا۔ ہندوستانی اُن واقعات میں زیادہ دل چسپی لینے لگے تھے جو دوسرے ملکوں میں رونما ہو رہے تھے یعنی جرمن اور اٹلی کے اتحاد اور آزادی کی تحریک، آئرلینڈ میں ہوم رول کی تحریک اور افریقہ میں مغرب کا بڑھتا ہوا غلبہ، انگلستان کا مصر اور سوڈان پر قبضہ اور یورپی طاقتوں میں افریقہ کی تقسیم۔ ایشیائی براعظم میں مغربی سامراج کی پیش قدمی چین کے ساتھ جنوبی، مشرقی اور وسطی ایشیائی ممالک کے لیے خطرہ بن گئے تھے۔

چنانچہ اس قسم کے حالات پیدا ہو رہے تھے جن میں اطلاعات حاصل کرنے کی خواہش کا پیدا ہونا لازمی تھا اور اس خواہش کو صرف اخبار اور رسالے پورے کر سکتے تھے۔ چونکہ ایسا کوئی آئینی طریقہ موجود نہیں تھا جس کے ذریعے حکومت کی پالیسیوں اور اقدامات کے تعلق سے ہندوستانیوں کی رائے عامہ کو ظاہر کیا جا سکے اور سیاسی تنظیمیں بھی نہیں تھیں جو عام لوگوں کے احساسات کا مظاہرہ کر سکیں۔ اس لیے صرف اخبارات کے ذریعے ہی مانگیں اور شکایتیں متعلقہ افسران تک پہنچا سکتے تھے۔ چنانچہ پرچار کا ایک آلہ کار مہیا کرنے میں اخباروں نے اہم رول ادا کیا۔

لیکن ابتدا ہی سے اُنھیں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ حکمراں حلقے تنقید کو سخت ناپسند کرتے تھے اور لبرل ذہن رکھنے والے گورنر جنرلوں کو چھوڑ کر جیسے 1857 سے پہلے مٹکاف اور 1857 کے بعد رپن اُن میں سے زیادہ تر ہندوستانی اخباروں کو اگر تشویش کے باعث نہیں تو کم از کم تکلیف دہ ضرور سمجھتے تھے۔ سر جان کیمبیلی کی اس بات سے اُنھیں اتفاق تھا کہ آزاد اخبارات ایک مطلق العنان حکومت سے مطابقت نہیں رکھتے ہیں۔ چاہے وہ پدری مطلق العنانیت ہی کیوں نہ ہوں۔ [1] جیفرسن کا یہ خیال اُن کے لیے کفر والحاد سے کم نہیں تھا کہ اگر اخباروں کے بغیر حکومت اور حکومت کے بغیر اخباروں میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا ہو تو وہ آخر الذکر کی حمایت کرے گا۔

انگریزی اخبارات

انگریزی اخباروں کی اشاعت نے مثال قائم کردی۔ 1861 میں ٹائمس آف انڈیا کا قیام عمل میں آیا، اسٹینڈرڈ، ٹیلی گراف، کوریر کو بمبئی ٹائمس میں ضم کرکے اس کو شروع کیا گیا تھا۔ اس نے اپنے پہلے شمارے میں ایک بندرگاہ اور ہندوستان کے بڑے شہر کی حیثیت سے بمبئی کی اہمیت کا ذکر کرکے اپنے وجود کا جواز پیش کیا۔ ''تجارت ہو یا جنگ اُس کے وسائل سامراجی ہیں اور وہ ایشیا کی قدرتی منڈی اور راجدھانی ہے۔ بمبئی کا مستقبل کتنا شاندار ہوگا اس کی پیشین گوئی کوئی مشکل ہی سے کرسکتا ہے۔ چاہے وہ کتنا ہی پرامید کیوں نہ ہو۔ جب کہ شہر سامراجی حیثیت رکھتا ہے۔ اُس کے اخبارات ابھی تک صوبائی حیثیت کے تھے۔ ہم یہ اعلان کرکے کہ ہمارے اخبار کا نام ہے ٹائمس آف انڈیا وقت کی رفتار کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کررہے ہیں۔''

1865 میں الہ آباد میں پائنیر شروع ہوا۔ اس کو حکومت کا ہمنوا اور اینگلو انڈین فرقے کا آرگن سمجھا جاتا تھا۔ 1872 میں سول اینڈ ملٹری گزٹ شملہ میں شروع ہوا اور 1876 میں لاہور منتقل ہوگیا۔ یہ اخبار سول اور فوجی ملازمین کے مفاد کی وکالت کرتا تھا۔ اڈیارڈ کپلنگ نے جس نے بعد میں بڑی شہرت حاصل کی۔ اپنی زندگی کے ابتدائی دنوں میں کچھ مدت تک سول اینڈ ملٹری گزٹ اور پائنیر کے نائب مدیر کے فرائض ادا کیے۔ 1875 میں رابرٹ تائٹ نے فرینڈ آف

---

[1] کلکتہ ریویو، 1911، صفحہ 444

انڈیا خرید لیا اور کلکتہ کے چوبیس تاجروں کی مدد سے اسٹیٹس مین قائم کیا۔ مدراس میل اور مدراس اسٹینڈرڈ اُس پریسیڈنسی میں اینگلو انڈین فرقے کی وکالت کرتے تھے۔ اسٹینڈرڈ جو 1877 میں قائم کیا گیا تھا 1892 میں ہندوستانیوں کے ہاتھوں میں آ گیا اور ہندوستانی نقطۂ نظر کی بڑی آزادی اور شدت کے ساتھ وکالت کرنے لگا۔

لیکن یہ سب اینگلو انڈین اخبارات تھے۔ اُس سے کہیں زیادہ اہم تھے وہ انگریزی اخبارات جو ہندستانیوں کی ملکیت تھے اور جن کی ادارت بھی ہندوستانیوں کے سپرد تھی۔ شاید سب سے اہم تھا ہندو پیٹریاٹ جس کی ابتدائی دو سال تک ادارت گریش چندر گھوش نے کی 1855 میں ہریش چندر مکرجی نے اُس کی ادارت سنبھال لی۔ پلانٹری کے مظالم کو بے نقاب کرنے اور مظلوم کسانوں کو راحت پہنچانے میں وہ بڑی نڈری سے کام لیتے تھے۔ 1861 میں اُن کے انتقال کے بعد کرستو داس پال اُس کے اڈیٹر ہو گئے۔ وہ انگریزی تعلیم کی مثالی پیداوار تھے۔ جو انگریزی حکومت کو اچھا سمجھتے تھے اور برطانوی لبرلزم کے فلسفے کے حامی تھے۔ اُن کے زیر اثر ہندو پیٹریاٹ بنگال کے مالکان اراضی کے بالائی متوسط طبقے کے مفادات کی نمائندگی کرنے لگا۔

پیٹریاٹ کے مقابلے میں گریش چندر گھوش نے 1868 میں بنگالی شروع کیا جو کسانوں کی ضرورتوں کی وکالت اور اُن کے خیالات کی ترجمانی کرتا تھا۔ سریندر ناتھ بنرجی نے جوان اخبار میں لکھتے رہتے تھے 1879 میں اُسے لے لیا اور ہندوستان کا ایک سرکردہ اخبار بنا دیا جو حکومت پر بلا خوف و خطر تنقید کرتا تھا اور ہندوستان کے مطالبات کی وکالت۔

1861 میں انڈین مرد کے نام سے ایک اور ترقی پسند اخبار وجود میں آیا جس کی ادارت موہن گھوش کے سپرد تھی اور مالی امداد رابندر ناتھ ٹیگور نے کی تھی۔ اُن کے ساتھ کیشب چندر سین بھی کام کرتے تھے۔ اُنھوں نے کچھ مدت تک اُس اخبار کی اڈیٹری کی۔ سریندر ناتھ سین کے زمانے میں یہ اخبار بہت ہر دلعزیز ہو گیا۔ گھوش برادران یعنی سیر کمار، بسنت کمار اور ہیمنت کمار نے 1868 میں بنگال میں امرت بازار پتریکا شروع کیا۔ 1872 میں اُسے کلکتہ منتقل کر دیا گیا اور 1878 میں انگریزی میں شائع ہونے لگا تا کہ ورنا کولر پریس ایکٹ کی دفعات سے اُس کا پیچھا چھوٹ جائے۔ شمبھو چندر مکھر جی نے 1882 میں انیس اینڈ رعیت شروع کیا۔ یہ سماجی معاملات

میں قدامت پسند تھا۔

ابتدا میں مدراس کے اخبارات کامیاب نہ ہو سکے نیوایسوسی ایشن کا آرگن کریسنٹ، سرٹی مادھوراؤ، دیوان بہادر رگھوناتھا راؤ اور کچھ دوسرے حضرات کا شروع کیا ہوا نیٹو پبلک اسپینین اور مدراس کچھ ہی دن زندہ رہے۔ لیکن رائے عامہ کے آرگن کی ضرورت بہت محسوس کی جارہی تھی۔ چنانچہ 1878 میں ہندو شروع کیا گیا اس کی ادارت جی۔ سبرامنیا ائر کے سپرد تھی۔ اُن کی قابلیت نے اسے جلد ہردلعزیز بنادیا۔ 1877 میں مدراس اسٹنڈرڈ ایک اینگلو انڈین اخبار کی حیثیت سے شروع ہوا لیکن 1892 میں وہ جی پلے کے ہاتھ میں آگیا جنھوں نے اُسے ترقی پسند بنادیا۔ کے نٹ راجن نے انڈین سوشل رفارمر شروع کیا جو سماجی اصلاح کا بڑا حامی تھا۔

بمبئی میں کاروباری اور تجارتی سرگرمیوں کی بنا پر یورپی اور ہندوستانی تاجر یعنی پارسی، بوہرے اور گجراتی ایک دوسرے کے قریب آگئے اور ٹائمس آف انڈیا کی مشترکہ سرگرمیوں کی نمائندگی اور اُن کے خیالات کا اظہار کرنے لگا۔ اُس کا نقطۂ نظر قدامت پرستانہ تھا اور وہ حکومت کی پالیسیوں کی شدت سے حمایت کرتا تھا۔ بمبئی میں ایک قوم پرست انگریزی اخبار نکالنے کی بھی کوشش کی گئی۔ 1882 میں دادا بھائی نوروجی نے وائس آف انڈیا کے نام سے ایک ماہوار رسالہ نکالنا شروع کیا جو بالآخر بہرام جی۔ ایم مالاباری کے انڈین اسپیکٹیٹر میں ضم ہوگیا۔ کہا جاتا ہے کہ 1886 میں فیروزشاہ مہتا نے ایڈووکیٹ آف انڈیا نکالنے کی کوشش کی۔ لیکن اُس کے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔ انگریزی تعلیم بمبئی اور کچھ اور ضلعوں کے شہروں تک محدود رہی جن کی ضرورتیں دو زبانوں میں شائع ہونے والے اخبار مثلاً اندو پرکاش، دینا پرکاش، سدھارک، نیٹو اُوپینین وغیرہ پوری کردیتے تھے۔ پچھلی صدی کے اختتام کے وقت 11 مراٹھی، انگریزی اور 13 گجراتی انگریزی اخبار موجود تھے۔ مرہٹھا، جسے تلک نے 1881 میں انگریزی اخبار کی حیثیت سے شروع کیا تھا بااثر تو تھا لیکن اُسے وہ ہردلعزیزی نصیب نہ ہوئی جو کیسری کو ہوئی۔

صوبجات متحدہ (اُترپردیش) میں انگریزی زبان میں پہلا قوم پرست اخبار انڈین ہرلڈ 1879 میں پنڈت اجودھیاناتھ نے شروع کیا تھا۔ تین سال تک وہ کامیابی کے ساتھ اہم اینگلو انڈین آرگن پائنیر کا مقابلہ کرتا رہا۔ 1890 میں پنڈت نے ایک اور اخبار انڈین یونین

اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ پنجاب میں تریبیون 1881 میں شروع ہوا جس کو وجود میں لانے کا سہرا سردار دیال سنگھ مجیٹھیا کے سر ہے۔

ہندوستانی زبانوں کے اخبارات کی نشوونما

ہندوستانی زبانوں کے اخبارات 1857 سے پہلے بھی بہت اثر رکھتے تھے اور خصوصیت کے ساتھ اُردو کے اخباروں نے بغاوت میں اہم رول ادا کیا تھا۔ 1857 کے بعد سرکاری حلقوں کی مخالفت کے باوجود اُنھوں نے تیزی کے ساتھ ترقی کی۔ حکومت خاص طور سے ان اخبارات کے اثر سے خائف تھی اُن کے خریداروں کا حلقہ بڑا نہیں تھا لیکن اُس کو اُن کے اثر کو ناپنے کا صحیح پیمانہ نہیں سمجھنا چاہئے۔ اُن کو پڑھنے والوں کی تعداد بہت تھی۔ پھر ایک بات یہ تھی کہ اُن اخباروں کا راست اثر پڑھنے والوں کا وہ طبقہ قبول کرتا تھا جنھوں نے اسکولوں میں انگریزی تعلیم نہیں پائی تھی اور اُن کی ہر بات کا یقین کر لیتے تھے۔ اس میں بھی شک نہیں کہ وہ بہت صاف گوئی سے کام لیتے تھے اور ہم عصر انگریزی اخباروں کے مقابلے زیادہ تلخ لہجہ اختیار کرتے تھے۔

ہندوستانی زبانوں کے اخباروں کی نشوونما کے دو مرحلے تھے۔ پہلا مرحلہ تھا بغاوت سے لے کر ٹین کے وائسرائے مقرر کئے جانے تک یعنی 1857 سے 1880 تک اور دوسرا لٹن سے کرزن تک یعنی 1880 سے 1905 تک پہلے مرحلے میں ہندوستانی زبانوں کے اخبارات جتنی دل چسپی سیاست میں لیتے تھے اتنی ہی سماجی اور مذہبی اصلاحات میں لیتے تھے۔ سیاست کی حد تک انگریزی حکومت کے تعلق سے اُن کا رویہ احترام و وفاداری کا تھا۔ حالانکہ کبھی کبھی وہ سخت تنقید بھی کرتے تھے۔ پھر بھی فی الجملہ انگریزوں کے ساتھ رشتے کو مفید بلکہ واقعہ یہ ہے کہ مبارک سمجھا جاتا تھا۔ انگریزوں کے نیک ارادوں پر اُنھیں اعتماد تھا اُن جمہوری اور لبرل اصولوں کی وہ قدر کرتے تھے جو برطانوی تہذیب اور برطانوی پارلیمانی نظام کی بنیاد تھے۔

دوسرے مرحلے میں سیاست نے زیادہ اہمیت حاصل کر لی اور سماجی اصلاح کی اہمیت کم ہوگئی۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں اور خاص طور سے ہندوؤں کے تعلقات حاکموں اور دوسرے انگریزیوں سے خراب ہونے لگے۔ حکومت کی پالیسیوں پر زیادہ گہری تنقیدی نگاہ ڈالی جانے لگی اور ہندوستان کی سیاسی ترقی کے تعلق سے برطانیہ کے ارادوں کو شک وشبہے کی نظر سے دیکھا جانے

لگا۔ حالانکہ اُس وقت تک برطانیہ سے رشتے توڑنے اور آزاد ہو جانے کا خیال واضح شکل میں سامنے نہیں آیا تھا لیکن تلافی کی ذلت نے لوگوں کو سوچنے اور چھپے چوری اُس کا اظہار کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

1857 میں کیننگ نے پریس ایکٹ کے ذریعے اخبارات کی سرگرمیوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ اُس کے بعد لارنس نے ہندوستانی زبانوں کے اخبارات کی تنقید کا جواب دینے کے لیے ایک سرکاری خبر رساں ایجنسی قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس اسکیم کو عملی شکل نہیں دی جا سکی اور وہ ترک کر دی گئی پھر بھی مطبعوں اور اخباروں پر پابندی عائد کرنے اور کتابوں کو رجسٹرڈ کرانے کی غرض سے 1867 میں ایک ایکٹ منظور کیا گیا۔ نام نہاد وہابیوں کی سرگرمیاں بڑی تشویش کا باعث تھیں اس لیے اُن کا مقابلہ کرنے کی غرض سے 1870 کی تعزیرات ہند میں 124 الف کے بدنام زمانہ دفعہ کا اضافہ کیا گیا۔ اُس کا مقصد تھا اُن مصنفین اور مقررین کو سزا دینا جن پر بغاوت کا الزام لگایا گیا ہو۔ نارتھ بروک کے زمانے میں حکومت اور اخبارات کے تعلقات اور زیادہ خراب ہو گئے۔

اس وقت تک ہندوستانی اخبارات بڑی طاقت پکڑ چکے تھے۔ 1875 میں بنگال میں 56 ہندوستانی زبانوں کے اخبار تھے اُن میں سے بیس پوری طرح جم چکے تھے اور اُن کے خریداروں کی مشترک تعداد 30,000[1] تھی۔ ان اخباروں میں مندرجہ ذیل اہم تھے۔

دوارکا ناتھ ودیا بھوشن نے 1858 میں سوم پرکاش شروع کیا۔ اُس کو عظیم دانشور اور سماجی مصلح ایشور چندر ودیا ساگر کی سرپرستی حاصل تھی۔ ودیا بھوشن کے بعد اُس کی ادارت سب ناتھ شاستری نے سنبھالی جو برہمو سماج کے لیڈر تھے۔ سماجی، اخلاقی اور سیاسی لبرلزم کے آرگن کی حیثیت سے اس پرچے کی بڑی قدر کی جاتی تھی۔ ششی کمار گھوش نے 1878 میں امرت بازار پتریکا شروع کیا جو 1878 کے ورناکلر پریس ایکٹ کے پاس ہونے تک بنگالی میں نکلتا رہا۔ اسکی جگہ آنند بازار پتریکا نے لے لی۔ یہ ایک آزاد اخبار تھا جو بڑی دیانت داری اور نڈری کے ساتھ اپنے خیالات ظاہر کرتا تھا۔ سلبھ سماچار پہلا سستا اخبار تھا جس کی قیمت تھی ایک پیسہ۔ اسے انڈین

---

[1] بنگال، 29 جنوری 1876

ریفارم ایسوسی ایشن نے 1876 میں کیشپ چندر سین کی زیر ادارت نکالنا شروع کیا تھا۔ سدھارانی کو بنکم چندر چٹر جی کی نیک خواہشات کے ساتھ شروع کیا گیا تھا۔

ان ہفتہ وار اخباروں کے علاوہ کئی ماہواری اور دو ہفتہ بعد شائع ہونے والے اہم رسالے بھی روشن خیال پھیلا رہے تھے۔ اُن میں زیادہ تر ادبی، سائنسی اور مذہبی موضوعات کی اشاعت کرتے تھے۔ اُن میں مندرجہ ذیل شامل تھے، رہاسیہ سندر (1863) جو کلکتہ بک سوسائٹی اور ورنا کلر لٹریچر سوسائٹی کا آرگن تھا۔ شک درپن (1863) جس کی جگہ 1868 میں ایجوکیشن گزٹ نے لے لی، بنگال درشن (1872) جس کی ادارت بنکم چندر چٹر جی کرتے تھے، بھارتی (1877) جسے دئی چندر ناتھ ٹیگور نے نکالا تھا اور رابندر ناتھ ٹیگور اور دوسرے اہم مصنفین کے مضامین شائع ہوتے تھے۔

اخبارات کے بڑھتے ہوئے اثر کو حکومت ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی تھی۔ 1875 کی بنگال کے انتظامیہ رپورٹ میں کہا گیا تھا:

''برطانوی حکومت اور انتظامیہ کو مسلسل الزام دیا جاتا ہے۔ نا قابل عمل تجویز بھی اکثر پیش کی جاتی ہیں کبھی کبھی تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ کیا جاتا ہے اُس میں کیڑے ڈالنا اور کسی بھی بات سے خوش نہ ہونا اُن کی عادت بن گئی ہے۔ ہندوستان کے باشندوں سے انگریزوں کے بیوپار کے تعلق سے روز افزوں حسد کا اظہار ہوتا ہے۔ اس قسم کا رجحان پایا جاتا ہے کہ علم اور عمل خیالات کے ہوش مندانہ اثرات کا لحاظ کئے بغیر خیالی تصورات کو مبالغہ آمیز توقعات سمجھ لیا جاتا ہے۔'' اُس میں مزید کہا گیا تھا ''ہندوستان کے باشندوں میں یہ عام خواہش جڑ پکڑتی جارہی ہے کہ وہ برطانوی حکومت کے مسلمہ اصولوں کے مطابق اپنے حقوق کا مطالبہ کریں اور سرکاری ملازمتیں اور حکومت کا نظام جو بہتر سے بہتر اشیا فراہم کرسکتی ہیں اُن میں اپنے پورے حصے کے جائز دعووں پر زور دیں...... ہندو ذہن کے کارہائے نمایاں کے تعلق سے اُن میں دن بدن بڑھتا ہوا فخر کا جذبہ پیدا ہورہا ہے جو ترقی کے لیے لازمی ہے۔ مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ ایک قسم کی شعوری بے چینی اور ذہنی ہلچل موجود ہے۔''[1]

---

[1] بنگال میں اقتباس کیا گیا 29/ جنوری 1876

مغربی ہندوستان میں بھی اسی قسم کے حالات رونما ہو رہے تھے۔ 1871 میں پریسیڈنسی میں 29 مرہٹی، 26 گجراتی، 3 اُردو اور ایک فارسی کا اخبار تھا۔ مرہٹی کے اخباروں میں اندو پرکاش (1862)، نیٹو اُپینین (1864) اور دین بندھو (1877) بااثر تھے۔ اندو پرکاش، جو دو زبانوں میں چھپتا تھا، ترقی پسند لکھنے والوں مصلحین کا آرگن تھا۔ جس کے لکھنے والوں اور حامیوں میں راناڈے، بھنڈارکر، تلنگ، چندارکر اور وشنو شاستری پنڈت شامل تھے دین بندھو ستیہ شودھک سماج کا آرگن تھا جیسے پھولے نے قائم کیا تھا۔ جو ایک سماجی مصلح تھے۔ اس کے اڈیٹر تھے کرشن راؤ بھالیکر۔ یہ پرچہ پچھڑے ہوئے طبقوں کی وکالت کرتا تھا۔ جن کی جہالت، غربت اور بیماری پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔ یہ پرچہ سیاسی اصلاح کا حامی نہیں تھا اُس کا خیال تھا کہ سیاسی اصلاح سے نچلے طبقوں کی قیمت پر بالائی طبقے فائدہ اُٹھائیں گے۔ نیٹو اُپینین دو ہفتہ بعد شائع ہوتا تھا۔ اُس کے اڈیٹر وشوا ناتھ نارائن مندلک پرانے خیال کے تھے اور اندو پرکاش کی اصلاح کی پالیسی کے خلاف تھے۔ بنگال کی طرح بمبئی میں بھی ایک مرہٹی کا سستا ہفتہ وار اخبار دیناچکشو پونا سے شائع ہوتا تھا۔ جس کی سالانہ قیمت تھی ایک روپیہ اور دو آنے۔

بمبئی کے دوسرے بااثر اخبار تھے۔ راست گفتار اور گزیرت مترا جس میں ''بڑے زوردار اداریے'' لکھے جاتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود اُس کی تحریر میں بڑی سوجھ بوجھ ہوتی تھی۔ بمبئی کے اخباروں کے متعلق ڈگبل نے لکھا تھا:

''بمبئی کی پرجوش پارسی آبادی نے، جس نے انگریزی طور طریقے سیکھ لیے ہیں اور اُن ریاستوں کے باشندوں کے فوجی کردار نے جن پر بمبئی کا گورنر راست حکومت کرتا ہے یا جو اُس کی حفاظت میں ہیں۔ ہمیں ورناکلر اخباروں سے متعارف کروایا۔ جن کی نمایاں خصوصیت بنگال کے اخباروں سے بالکل مختلف ہے۔ پھر بھی اگر اُن کے ساتھ مناسب برتاؤ کیا جائے تو وہ مشرقی ہندوستان کے پتریکا اور پرکاش کے اڈیٹروں کی مدھم لے سے زیادہ ذرا بھی خطرناک نہیں ثابت ہوں گے۔''[1]

بمبئی کے انتظامیہ کی 76-1875 کی رپورٹ میں مرہٹی اخباروں کا ذکر کرتے ہوئے

---

[1] ڈگبی، ڈبلیو، ہندوستان اور شری لنکا کے مقامی اخبارات کلکتہ ریویو 787، (1877)، صفحہ 373

ہندوستانیوں کے دستوری حقوق کی وکالت کے متعلق شکایتی لہجے میں کہا گیا تھا۔ ''دوسرے اقدامات کی آزادی کے ساتھ خدمت کی گئی مثلاً سکریٹری آف اسٹیٹ اور ہندوستان کی عاملہ کے اختیارات میں توسیع، اخباروں کی آزادی پر مبینہ پابندی اور مانچسٹر کی سوتی کپڑے پر درآمدی محصول کو منسوخ کرانے کی کوشش۔''[1] 1877-78 کی رپورٹ میں کہا گیا کہ اگرچہ بمبئی کے اخبارات کا لہجہ معتدل ہے اور سوجھ بوجھ کا پتا دیتا ہے۔ پونا برابر حکومت کی مخالفت کر رہا ہے۔ اُس میں کہا گیا ''اُن کی تحریروں کا منشا ہے کہ انگریز مظالم اور قریب سے خوش حالی کی منزل تک پہنچتے ہیں اور مظلوم لوگوں کا فرض ہے کہ وہ بغاوت کریں اور اُنھیں ہندوؤں کے آبائی وطن سے نکال دیں۔''[2]

مدراس پریسیڈنسی میں اگرچہ انگریزی زبان کے اخباروں کی رفتار سست تھی لیکن ہندوستانی اخباروں کی حالت تو مایوس کن تھی۔ عیسائی مشنری اخباروں پر چھائے ہوئے تھے لیکن اُن کے اخبار محض مذہبی پرچار کرتے تھے۔ اُن کے بعد مسلمانوں کے اخباروں کا نمبر تھا جن کی تعداد کل اخباروں کی ایک تہائی تھی۔ لارڈ ہوبرٹ نے جو 1872 سے 1875 تک وہاں کا گورنر رہا، مسلمانوں کے اخباروں کی ہمت افزائی کی۔ اُن کے متعلق اُس کا خیال تھا کہ ''وہ سپاٹ ہیں جن ایک سطر بھی طبع زاد نہیں ہوتی ہے۔''

شمالی ہندوستان میں جو موجودہ اُتر پردیش، پنجاب، راجستھان، مدھیہ پردیش اور برار پر مشتمل تھا بنگال اور بمبئی کی طرح صحافت تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ ہندوستانی زبانوں کے اخباروں میں اُردو پیش پیش تھی۔ اُن اخبارات سے بظاہر وفاداری کے تمام لوازمات ظاہر ہوتے تھے۔ جس کی بڑی وجہ برطانوی راج کا خوف یا انگریز افسروں کی سرپرستی حاصل کرنے کی خواہش تھی۔ ان میں کوہ نور جو 1850 میں شروع ہوا اور اخبار عام شامل تھا جو 1870 میں نکلا تھا۔

ڈگبی کے بقول اس مرحلے میں ہندوستانی اخبارات کی حیثیت مندرجہ ذیل تھی۔ 1875 میں 147 انگریزی کے اخباروں کے مقابلے میں 374 ہندوستانی زبانوں کے اینگلو ورناکلر

[1] بمبئی میں انتظامیہ کی رپورٹ، 1875-76 صفحات 315-16

[2] بمبئی میں انتظامیہ کی رپورٹ 1877-78 صفحات 425-26

اخبارات شائع ہو رہے تھے۔ جن میں سے 102 بنگال سے شائع ہوتے تھے، 86 بمبئی سے، 65 شمالی مغربی صوبجات (اتر پردیش) سے، 58 مدراس سے اور 63 پنجاب، سندھ صوبجات متوسط (مدھیہ پردیش) اور راجستھان سے۔[1]

ہندوستانی زبانوں کے اخباروں کے خریداروں کا حلقہ مجموعی طور سے کہیں زیادہ بڑا تھا اور اُن کے پڑھنے والوں کی تعداد بڑھ رہی تھی۔ اگر ایک شمارہ کسی گاؤں یا گاؤں کے ایک بڑے حلقے میں پہنچتا ہے تو اس کے مندراجات سے جلد ہی آس پاس کا ہر شخص واقف ہو جاتا ہے۔''[2]

IV۔ 1878 کا ورناکلر پریس ایکٹ

تمام دوسری مطلق العنان حکومتوں کی طرح ہندوستان کی حکومت بھی ہندوستانی اخبارات کے بڑھتے ہوئے اثر سے خائف اور مشکوک تھی اور برطانوی نوکرشاہی اور ہندوستان میں رہنے والے غیر سرکاری انگریز سخت تنقید پر فوراً خفگی کا اظہار کرتے تھے اور اخبارات پر پابندی لگانے کے لیے سخت قانون بنانے کی سفارش کرتے تھے۔ حالانکہ اخبارات چیخ چیخ کر اپنی وفاداری کا اعلان کرتے رہتے تھے۔ 1873 میں سر جارج کیمبیل نے جو بنگال کا لیفٹیننٹ گورنر تھا، حکومت ہند سے سفارش کی کہ ایک ایسا قانون بنایا جائے جس کی رو سے موت تک مقدمہ چلائے بغیر اُن لوگوں کو فوراً سخت سزا دی جاسکے جو حکومت کے خلاف شرارت آمیز اور باغیانہ الزام عائد کرتے ہیں۔ 1875 میں برودا کے مہاراجہ ملہار راؤ گیکواڈ کے خلاف مقدمہ چلا اور اُسے تخت سے اُتار دیا گیا۔ ہندوستانی اخباروں میں بے چینی پھیل گئی اور اندو پرکاش نے ہندوستانی ریاستوں پر برطانوی حکومت کی حکم فرمائی پر شک ظاہر کیا۔ اس سے حکمراں حلقے میں غصے کی لہر دوڑ گئی اور ہندوستانی زبان کے اخباروں کی باغیانہ تحریروں کو کچلنے کا مطالبہ کیا گیا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ سیلس بری نے پال مال گزٹ کی اس رائے سے اتفاق کیا۔ ''ہندوستانی زبانوں کے اخباروں کے بہت سے مضمون نہ صرف حکومت کی توہین کرتے ہیں بلکہ چاہے وہ اُس کو جائز قرار نہ دیتے ہوں پھر بھی

---

[1] ڈگبی، ڈبلیو، کلکتہ ریویو، 787 (1877) صفحہ 362

[2] ملک کل، ٹی۔ بی، انگریزی تعلیم اور ہندوستانی قوم پرستی کی ابتدا، صفحہ 325

برطانوی حکام کے قتل کے جرم کو قابل درگزر ضرور سمجھتے ہیں۔''[1] اور ان نے مشورہ دیا کہ ''ان اخباروں کے خلاف تغیرات ہند کے تحت مقدمہ چلایا جائے۔'' حکومت کے قانونی مشیر کا خیال تھا کہ اُس وقت جو قانون موجود تھے اُن کے تحت مقدمہ میں سزایابی مشکوک ہے۔

اُس کے بعد لارڈ لٹن نے اُس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اُس نتیجے پر پہنچا ''کہ ہندوستانی زبانوں کے اخباروں کے مالکوں سے ضمانت کی رقم حاصل کرنے کا قانونی طریقہ شروع کیا جانا چاہیئے۔'' ظاہر ہے کہ ہندوستانی اخباروں نے اس تجویز کی مذمت کی، لندن کے ٹائمس نے بھی اس کو پسند نہیں کیا۔''[2]

بنگال کے لیفٹینینٹ گورنر نے مندرجہ ذیل بنیاد پر قانون بنانے پر زور دیا۔ ''حکومت کے کاموں اور سرکاری افسروں کے اداروں اور نیت پر تنقید کرنے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔ جو نہ صرف وفاداری کے منافی بلکہ کبھی کبھی تو باغیانہ ہوتی ہے'' اس پر حکومت ہند نے عمل کرنے کا فیصلہ کیا اور 14رمارچ 1878 کو[3] لارڈ لٹن نے کونسل سے ورناکلر پریس ایکٹ منظور کرالیا۔ اس کی رو سے مجسٹریٹوں کو اختیار حاصل تھا کہ وہ ہندوستانی اخباروں کے اڈیٹروں سے اس امر کی ضمانت لے سکیں کہ قابل اعتراض تحریریں شائع نہیں کریں گے یا اُنھیں حکم دیں کہ وہ طباعت سے پہلے پروف دکھائیں۔

ہندوستانی اخباروں نے اُن کے خلاف چیخ پکار کی اس اقدام کو غیر ضروری قرار دیا۔ اور ایک دفعہ پھر اپنی وفاداری کا اظہار کیا۔ احتجاجی جلسے ہوئے جن میں ایکٹ کی مذمت کی گئی۔ ایک عرضداشت کے ذریعہ پارلیمنٹ سے مداخلت کی درخواست کی گئی۔ گلیڈسٹن کی قیادت میں لبرل پارٹی نے اس ایکٹ کی مذمت کی۔ بالآخر جب انگلستان میں کنزرویٹو حکومت کی لبرل پارٹی کی حکومت بنی اور لارڈ رپن ہندوستان کا گورنر بنایا گیا تو اس ایکٹ پر نظر ثانی کی گئی۔ لارڈ رپن معاملے پر پوری طرح غور کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ ایکٹ کا کوئی جواز نہیں ہے۔ اُس نے

---

[1] پرنس نے اقتباس دیا، محولہ بالا، صفحہ 279

[2] بنگال، 10راپریل 1872 ٹائمس کا اقتباس

[3] ایضاً، 18راگست 1877

سکریٹری آف اسٹیٹ کو لکھا۔

''مجھے اس سے بڑا اطمینان ہوا ہے اور مجھے اُمید ہے کہ جلد ہی ہندوستان کے قوانین کی کتاب اس ناہنجار ایکٹ سے پاک ہوجائے گی...... مجھے یہ اُمید نہیں تھی کہ یہ معاملہ اتنی آسانی سے طے ہوجائے گا۔ جن مقامی اداروں سے مشورہ کیا گیا تھا اُن میں سے بڑی تعداد تعزیرات ہند میں کسی قسم کی ترمیم کے حق میں نہ تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کے افسر ہندوستانی اخباروں کو ایک قسم کا شر سمجھتے ہیں جو غالباً ضروری ہے لیکن اُس کو حتی الامکان زیادہ سے زیادہ محدود رکھا جانا چاہئے۔ اُنھیں آزاد تبادلہ خیال کے فوائد کا کوئی احساس نہیں ہے۔''[1] اس کے مشورے پر 19/جنوری 1882 کو ایکٹ منسوخ کردیا گیا اور ہندوستانی اخباروں کی تاریخ میں ایک نئے باب کا آغاز ہوا۔

اخبارات اور قومی تحریک

لٹن نے جو غلط اقدامات کیے اُن کی رُو سے مخالفت اور ناپسندیدگی کا ایک طوفان ٹوٹ پڑا، انگریزوں کے ارادوں کے تعلق سے شکوک وشبہات پیدا ہوگئے اور سیاسی تحریک کی افادیت میں یقین بڑھ گیا۔ دوسرے مرحلے کے ابتدائی دنوں میں کچھ مدت تک حکومت کے مصالحت پسندانہ رویے کے لیے احسان مندی کے جذبے نے اخبارات کو ''سخت لہجہ اختیار کرنے سے باز رکھا'' لیکن جلد ہی نئی نئی اشتعال انگریزیاں کی گئیں اور نئے مسائل سامنے آنے لگے جن کی وجہ سے پرانے تلخی اور مخالفت کی تجدید ہوگئی۔ 1883 کا البرٹ بل، 1891 کا رضامندی دینے کی عمر کا بل اور 1892 کا کونسل ریفارم ایکٹ ایسے اقدامات تھے جنھوں نے ایک دفعہ پھر تلخی اور بے اطمینانی پیدا کردی۔ 1893 میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے جن کی وجہ سے حکومت اور عام لوگوں کے درمیان اور زیادہ دوری پیدا ہوگئی۔ ایک فرقے کا خیال تھا فساد کی وجہ تھی حکام کی طرف سے کی جانے والی مسلمانوں کی حمایت اور دوسرا فرقہ سمجھتا تھا کہ اُس کا سبب تھا کہ اُن کے حقوق کے استعمال میں غیرضروری مداخلت۔ اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں شدید قحط پڑے

[1] رپن کا خط سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا فارنگٹن کے نام، 29/اکتوبر 1881 یوشین ولف نے پہلے مارکوئس آف رپن کی سوانح میں اس کا اقتباس دیا ہے (جان برنی، 1921) جلد دوم، صفحات 14-113۔

جن میں بہت سی جانیں ضائع ہوئیں اور 1896 میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی۔ اُن حادثات نے صورت حال کو اور خراب کر دیا۔ کرزن کی نادری حکومت نے آگ پر تیل کا کام کیا۔

اخبارات کی تحریروں میں ایک نیا رجحان یا یوں سمجھئے کہ پرانے رجحان کی ایک شدید شکل ظاہر ہونے لگی۔ مذہبی اور سماجی اصلاحات میں دلچسپی مرکزی توجہ نہ رہی جو ابھی تک اُن کی تحریروں کا غالب عنصر تھی۔

اب اخبارات زیادہ سے زیادہ سیاست پر توجہ دینے لگے۔ اس تبدیلی کی کئی وجوہ تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مذہبی اصلاح کی تحریکات زیادہ سے زیادہ اہمیت اپنے اپنے فرقوں کی قدیم شان وشوکت اور طاقت کی احیا پر دینے لگیں اور اُس کے نتیجے میں سماجی اصلاح کی بحث پس پشت ڈال دی گئی۔ دوسری بات یہ تھی کہ عالمی حالات کا اثر محسوس کیا جا رہا تھا اس لیے کہ یورپ میں قومی حیات نو کی تحریکات نے طوفان برپا کر دیا تھا۔ تیسری بات یہ تھی کہ قومی زندگی کے مختلف شعبوں میں داخل تناؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ نمائندہ اداروں کی عدم موجودگی میں اخبارات ''پارلیمنٹ کا دائمی اجلاس'' بن گئے۔ اُن کے کالم حکومت کی سیاست اور اقدامات کے متعلق بحث کے لیے کھلے ہوئے تھے۔ وہ حکومت کے انتظامی اور قانون سازانہ اقدامات کے متعلق ہندوستان کے لوگوں کے خیالات حکومت تک پہنچاتے تھے۔ اس قسم کے اقدامات کی تعریف بھی کرتے تھے جن کے پیچھے اچھے مقاصد کارفرما ہوتے تھے یا جن سے ہندوستانی مفادات کو فائدہ ہوتا تھا۔

اسی کے ساتھ اخبارات رائے عامہ کو ہموار کرنے صوبائی یا قومی کانفرنسیں منعقد کرنے، سیاسی تحریکات کی تنظیم کرنے، عوامی اداروں کو تعمیر کرنے اور عوامی مباحث میں حصہ لینے میں بھی بڑی مدد کرتے تھے۔ خارجہ پالیسی یا داخلہ، انتظام کا کوئی مسئلہ اُن کی نظر سے اُوجھل نہیں رہ سکتا تھا۔ ہندوستان کی عزت کا سوال ہو یا معاشی خوشحالی اور حکومت میں حصہ لینے کے مقصد کے حصول کا سوال ہو، وہ اُس پر بحث ضرور کرتے تھے۔ حکومت وقت کی ناراضگی کے خطرے سے بے نیاز وہ ہر سیاسی مانگ کو بار بار اور سختی کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ چنانچہ اپنی تاریخ کے دوسرے مرحلے میں اخبارات ایک اہم سیاسی ادارہ بن گئے تھے۔ اُن کا اثر اُن لوگوں پر بھی پڑنے لگا تھا جو

دور دراز کے گاوؤں میں رہتے تھے۔ اُن کے لیے وہ سیاسی تعلیم کا سب سے بڑا ذریعہ تھے۔

حکومت کے لیے وہ ایک ایسی ایجنسی تھے جو اُسے مطالبوں اور شکایتوں سے باخبر رکھتی تھی اور اُس تک لوگوں کے خیالات اور توقعات پہنچاتی تھی۔ اخبارات سرکاری پالیسیوں اور عمل کے تعلق سے عام لوگوں کے احساسات ظاہر کرتے تھے اور لوگوں کے اُن خطرات سے حکومت کو آگاہ کرتے تھے کہ انگلستان کے مفاد میں کہیں ملک کے مفادات کو قربان نہ کر دیا جائے۔ وہ صاف صاف ظاہر کرتے تھے کہ سیاسی غلامی کی حالت قومی خودداری کے منافی ہے۔

قدرتی طور سے ہندوستانی اخبارات تعلیم یافتہ متوسط طبقے کی سرگرمی سے تعبیر کئے جا سکتے تھے۔ اس طبقے کے رکن اُن کے مالک تھے اور اُن کا انتظام اور ادارت بھی اُن ہی کے ہاتھوں میں تھی۔ اُن کے ذریعے سے متوسط طبقے نے پورے ملک میں اثر ورسوخ حاصل کر لیا اور واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی نمائندگی کا وہ جائز طور سے مطالبہ کرنے لگا۔ لیکن حکمران اس مطالبے کو سخت ناپسند کرتے تھے اور اس کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ بدقسمتی سے حالات اُن کے خلاف تھے اور اس مرحلے کے ختم ہونے سے پہلے ہی اُن کے انکار کی بنا پر اخبارات کے رویے اور طریق عمل میں ایک بڑی تبدیلی آ گئی اور وہ انگریزی راج سے آزاد ہونے کا مطالبہ بلند آواز کے ساتھ کرنے لگے۔ یہ وہ مطالبہ تھا جو اُنیسویں صدی کے دوران زیر لب کیا جاتا رہا تھا۔

اخبارات اُنیسویں صدی کے اختتام پر

اُنیسویں صدی کے آخری ربع میں اخبارات کے جائزے سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اُس وقت برطانیہ کے ساتھ اپنا رشتہ توڑنے کا خیال ہندوستان میں نہیں پیدا ہوا تھا اور ہندوستان پر انگریزی راج کو واقعی مفید سمجھا جاتا تھا اس لیے کہ اُس کی وجہ سے ہندوستان کی سالمیت تقویت پا رہی تھی اور اُس کے مادی اور تہذیبی مفادات فروغ پا رہے تھے۔ لیکن اسی کے ساتھ بہت سے اخبارات حکومت ہند کے انتظام سے مطمئن نہیں تھے۔ وہ حکومت کی خارجہ پالیسی پر تنقید کرتے تھے جس کی وجہ سے مہنگی جنگیں لڑنی پڑتی تھیں، اخراجات میں تخفیف ہوتا تھا، محاصل بڑھتے تھے اور تعلیم، صحت عامہ اور آب پاشی وغیرہ کی طرح کے سماجی اور مادی بھلائی کے کام نہیں ہو پاتے تھے۔ ہندوستانیوں کو اعلیٰ ملازمتوں سے دور رکھنا اور برطانوی عملے کا تقرر کرنا جن پر زیادہ خرچ

ہوتا تھا، ہندوستانیوں اور یورپینوں کے درمیان تکلیف دہ نسل اختیار کرنا، پالیسی سازی اور قانون سازی کے کاموں میں اُنھیں شریک کرنے سے انکار کرنا، ایسی باتیں تھیں جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُن کی ذہنی صلاحیت اور اخلاقی دیانت داری پر انگریزوں کو بالکل اعتماد نہیں ہے۔ اُس کی بنا پر ہندوستانیوں میں ناراضگی کے جذبات مسلسل پیدا ہوتے رہتے تھے۔

ایک مسئلہ جس کی بنا پر دن بدن حکومت پر اعتماد کم ہوتا گیا اور ہندوستان کے مختلف فرقوں میں تلخی بڑھتی رہی وہ تھا ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کشیدگی۔ اس مسئلے کے تعلق سے اخبارات کے رویے مختلف تھے جن اخباروں کے مالک اور مدیر ہندو تھے وہ یا تو مسلمانوں کو شدت پسندی اور ہندوؤں کے جذبات کا لحاظ نہ کرنے کا الزام دیتے تھے یا برطانوی افسران پر الزام لگاتے تھے کہ پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی سرکاری پالیسی پر عمل کرتے ہوئے وہ مسلمانوں کی فرقہ وارانہ مانگوں کی حمایت کرتے ہیں۔ مسلمان ادعائیت کا الزام ہندوؤں پر لگاتے تھے جس کی جزوی وجہ تھی اُن حقوق کی حفاظت جنھیں وہ جائز سمجھتے تھے، جزوی وجہ تھی اپنے فرقے کی اہمیت کا اظہار اور جزوی وجہ تھی مالی نقصان کا خوف۔ بہرحال وقت گزرنے کے ساتھ اُس کشیدگی نے زیادہ تکلیف دہ اور افسوسناک شکل اختیار کرلی۔ حالانکہ اُس کی ابتدا رسم و رواج کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوئی لیکن وہ ایک خطرناک قسم کی سیاسی نزاع میں تبدیل ہوگئی۔ بدقسمتی سے دونوں فرقوں کے سمجھ دار عناصر کی کوششوں پر خود اُن کے فرقوں کی تنگ نظری، حکومت کی مدد نہ کرنے اور کچھ حکام کی خلل اندازی نے پانی پھیر دیا۔

چنانچہ اُنیسویں صدی کے آخری ربع میں ہندوستانی اخبارات زیادہ کارآمد ثابت ہوئے اور ہندوستان کے لوگوں میں اُن کا اثر بڑھتا گیا۔ ہر صوبے میں وہ انگریزی اخبار جن کے مالک ہندوستانی تھے۔ صوبے کے انگریزی تعلیم یافتہ طبقے کو خبریں اور افکار مہیا کرتے رہے اور اس طرح ہر صوبے کے انگریزی داں طبقوں کو ایک واحد فرقے میں تبدیل کردیا جو مشترک خیالات وجذبات رکھتے تھے۔ ہندوستانی زبانوں کے اخبار اُن خیالات وجذبات کی اشاعت لوگوں کے بڑے حصوں میں کرتے تھے۔ ان دونوں نے مل کر ملک میں قومی اتحاد کی طرح ڈالی۔

ہندوستان کے صوبوں میں بنگال ترقی کے میدان میں سب سے آگے تھا۔ 1881 میں

اخبارات کی تعداد تھی 78 (28 بنگالی کے) لیکن 1905 میں بڑھ کے 111 ہوگئی (65 بنگالی کے)۔ اُس زمانے کے انگریزی کے اخباروں میں سب سے زیادہ اہم اور بااثر تھا بنگالی جس کی ادارت سریندرناتھ بنرجی کے ہاتھ میں تھی۔ اُس کے بعد امرت بازار پتریکا، ہندو پٹریاٹ اور انڈین کامریڈ نمبر تھا۔ 1903 میں ایک اور انگریزی اخبار اُن کی صف میں شامل ہوگیا یعنی چندر پال کا نیوانڈیا۔

1857 سے 1880 تک کے زمانے کے اہم بنگال ہفتہ وار اخباروں کی فہرست میں سن جیونی (1883) بنگ پالیسی (1890) ہت بادی (1891) اور بسوتی (1896) کا اضافہ ہوگیا۔ ایک روزنامہ بنگال اخبار دینک 1885 میں شروع ہوا، بمبئی میں 79-1878 کے خاتمے پر 77 اخبار تھے۔ صدی کے اختتام تک اُن کے تعداد بڑھ کے 178 ہوگئی تھی۔ اُن میں انگریزی کے اینگلو مرہٹی، اینگلو گجراتی اور مرہٹی۔ گجراتی اخبارات شامل تھے۔ خاص خاص اخبار تھے انگریزی کے انڈین اسپکٹیٹر، پونا ہیرلڈ اور مرہٹا، مرہٹی کا کیسری اور گجراتی کے قیصر ہند اور بمبئی سماچار۔ کیسری نے پہلے شمارے میں لکھا تھا ''یہ اخبار چوکیدار کے فرائض ادا کرے گا۔ جس کی بنا پر ہر انتظامی افسر رائے عامہ سے خائف رہے گا اور یہ کہ ہر غیر منصفانہ عمل کو بے نقاب کیا جائے گا'' اُس نے اپنا وعدہ پورا کیا اور مرہٹی صحافت میں ایک انقلاب برپا کردیا۔

شمالی مغربی صوبجات اودھ (اُتر پردیش) میں 1884 میں شائع ہونے والے اخباروں کی تعداد تھی 90۔ اُن میں سے 76 اُردو کے تھے۔ 12 ہندی کے اور 5 اردو- ہندی کے۔ 1900 میں اُن کی تعداد بڑھ کے 109 ہوگئی جن میں 70 اردو کے تھے۔ 32 ہندی اور دو اردو۔ ہندی کے۔ قابل غور بات یہ ہے کہ ہندی صحافت تیزی سے ترقی کر رہی تھی جب کہ اردو صحافت ایک جگہ رکی ہوئی تھی۔

مدراس کے متعلق جو رپورٹیں ملیں ہیں اُن سے بڑھتی ہوئی صحافتی سرگرمیوں کا اندازہ نہیں ہوتا ہے لیکن اس بات کو تسلیم نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ دوسرے صوبوں کی طرح وہاں بھی ترقی ہوئی ہوگی۔ 1882 میں جی سبرامینا آئر نے سودیش مترم شروع کیا جس نے جلد ہی ایک سرکردہ تامل اخبار کی شکل اختیار کرلی جو ہر ترقی پسند اقدام کی حمایت کرتا تھا۔ تلگو کے اخباروں میں

دیو یک وردھنی سماجی اصلاح کی وکالت کرتا تھا اور آندھرا پرکاشیکا حالات حاضرہ میں دلچسپی لیتا تھا جن میں سیاست بھی شامل تھی۔ 1900 میں جنوب کے اخباروں اور رسالوں کی تعداد تھی 161 جن میں سے 52 تھے تامل کے، 32 تلگو کے 12 کنڑ کے، 27 ملایالم کے اور 31 ہندوستانی کے۔ جن تین کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے اُن کے علاوہ اہم اخبار تھے بھیما، لوک پکاری، وکت دوت، پرا پنچ مترم، کویلا پتریکا اور منوراما۔

حکومت صحافتی سرگرمیوں کو شک وشبہہ اور ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتی رہی۔ پہلے پہلے حکومت نے اُس کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ 1885 میں اخبارات کے متعلق جو رپورٹ تیار کی گئی تھی اُس میں اخباروں کے لہجے اور انداز تحریر کو قابل اعتراض ٹھہرایا گیا تھا۔ پھر بھی اُس کو اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ اہمیت نہ دینے کی وجہ یہ تھی کہ اُن کا خیال تھا کہ بنگال کی عصری ادبی سرگرمی کی نمایاں خصوصیت ہے اعتدال پسندی پر مبالغہ آرائی کو ترجیح دینا۔ اظہار کا جو بھی انداز اختیار کیا جائے حکومت کی نیت پر اُنھیں شک نہیں ہے نہ آزادی کی خواہش پائی جاتی ہے۔ رپورٹ لکھنے والوں کے مطابق اصل خرابی تھی حکومت کے ارادوں کے تعلق سے اطلاعات کی کمی اور اس کا علاج تھا ضروری واقعات سے اُنھیں مطلع کرنا اور اُن کی وضاحت پیش کرنا۔ اس سلسلے میں نارتھ بروک نے ایک اسکیم بنانے کی تجویز پیش کی تھی لیکن اُس کو عملی شکل نہیں دی جا سکی۔

لیکن جلد ہی رواداری کا یہ رویہ بدل گیا۔ 1887 میں حکومت بنگال کے چیف سکریٹری نے اخباروں کے معاندانہ لہجے کی شکایت کی۔ اُس نے کہا ''واقعہ یہ ہے۔ ہندوستانی اخباروں کے اصل خیالات کے تجزیے سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ حکومت کے ارادوں اور عمل پر خدمت آمیز اور مخاصمانہ تنقید کی آئینہ داری کرتے ہیں۔''[1] پھر 1920 میں شکایت اس طرح کی گئی ''حرف گیری اور نکتہ چینی سے بھری ہوئی تخریبی تنقید کی بنیاد زیادہ تر صورتوں میں تلخی اور مخالفت پر ہوتی ہے۔ بدقسمتی سے اب بھی قابل تعریف مصنفین کا پسندیدہ طریقہ ہے۔''[2]

---

[1] ویراڈگر، جے، حکومت بنگال کے چیف سکریٹری کی طرف سے حکومت ہند کے محکمۂ داخلہ کے سکریٹری کو 25/نومبر 1887 محکمہ داخلہ امور عامہ، مارچ 1888، نمبر 451-408

[2] ایچ۔ ایل۔ اسٹیفن، حکومت بنگال کے چیف سکریٹری کی طرف سے حکومت ہند، محکمۂ داخلہ کے سکریٹری کو 29/اپریل 1903، محکمۂ داخلہ اُمور عامہ، حسب روداد نمبر 282، مئی 1903

بمبئی پریسیڈنسی کے اخبارات کا میلان بھی ویسا ہی تھا جیسا بنگال کے اخباروں کا اور حکومت کا ردعمل بھی اُسی قسم کا ہوا۔ 1880 میں انتظامیہ کی رپورٹ میں ہندوستانی اخباروں کے بارے میں کہا گیا ''حکومت کی طرف ہندوستانی اخباروں کا عام رویہ حسب معمول پورے سال وفادارانہ رہا'' اُس کے بعد ایک نیا انداز اختیار کیا گیا کیسری، مرہٹا اور کل کی طرح اخبار وجود میں آئے اور اُنھوں نے ایک نئے عہد کی آمد کا اعلان کیا۔ کیسری اور مرہٹا کو ایسے وطن پرست اور نامی گرامی مصنفین کی سرپرستی حاصل ہوگئی جیسے چپ ٹنکر گرکر، تلک، اُپٹے، کھادلکر، کیلکر وغیرہ۔ وہ صحافت کو ایک پیشے کے بجائے قوم پرستی کے صرف حق کے پرچار کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ تلک، جو برطانوی حکومت کے شدید دشمن تھے، 1889 سے 1920 تک اُن دونوں اخباروں کے روح رواں تھے۔

کل، جس کے اڈیٹر شیورام مہادیو تھے، قوم پرستی کے خیالات کا پرچار کرنے والے تین اخباروں میں سے ایک تھا۔ وہ اتنے زیادہ ہردلعزیز ہوگئے کہ اندو پرکاش اور دینا پرکاش اُن کے آگے ماند پڑ گئے۔ اُنھوں نے سماج کا رویہ بدل دیا۔ سماجی اصلاح کے کام کو دھکا پہنچا اور قدامت پرستی اور سیاست کے بڑھتے ہوئے طوفان سے مصلحین کو نبرد آزمائی کرنی پڑی جس میں اُن کی ہار یقینی تھی۔

سیاسی مطالبات میں شدت پسند اور آزادہ روی کی بنا پر کیسری اور کل دونوں کو بڑا نقصان اُٹھانا پڑا۔ ہندوستانی اخباروں کے متعلق 1893 کی رپورٹ بھیجتے ہوئے حکومت بمبئی کے سکریٹری نے لکھا تھا'' مذہبی احیا پرستی اور اُس کے لازمی نتیجے کے طور پر سماجی اختیارات کی لہر ہندو سماج پر سے گزر چکی ہے۔ ہندو رائے عامہ کے بدترین آرگنوں کی نمایاں خصوصیت ہے اُس قسم کے سخت اعتراضات کرنا جن کا شمار برابر ثبوت نہیں کیا جاسکتا اور زبان کی بے لگامی۔ دوسرے مذہبی اداروں پر جو حملے کئے جاتے تھے اب اُن کا رخ برطانوی حکومت کی طرف موڑ دیا گیا ہے جو بڑی ناطرفداری کے ساتھ قانون کی حمایت کرنے کی کوشش کرتی ہے۔''[1]

1897 میں بمبئی پریسیڈنسی ایک بحران میں مبتلا تھی۔ بڑے پیمانے پر پھیلے ہوئے قحطوں اور وباؤں نے پریسیڈنسی کی چولیں ہلا دی تھیں۔ شک وشبہ کے اس ماحول میں پونا میں وہ افسر قتل

---

[1] محکوسیات (بمبئی) 16/ جولائی، 1894 کا نمبر 4314۔

کر دیا گیا جو طاعون کے تعلق سے اپنے فرائض ادا کر رہا تھا۔ اینگلو انڈین اخبار آگ بگولہ ہو گئے اور برطانوی حکومت کے لیے خطرے کا اعلان کر دیا، حکومت گھبرا گئی۔ پونا کے شہر کا انتظام پولیس کے سپرد کر دیا گیا اور اُس لمحہ کے لیے خانہ تلاشیاں لی گئیں۔ حکومت کے خلاف بے اطمینانی پھیلانے اور تشدد کی ترغیب دینے کے جرم میں تلک پر مقدمہ چلا دیا گیا اور اُنھیں اٹھارہ مہینے کی سزا دی گئی۔

تعزیراتِ ہند کی دفعہ 124 الف کی ترمیم کی گئی اور اُسے زیادہ سخت بنا دیا گیا۔ حکومت بمبئی نے حکومت ہند کے نام اپنے خط میں لکھا تھا ''اُس وقت جو صورت حال پائی جاتی اُس کی بدترین نوعیت ہے اُن اخباروں کے خریداروں میں اضافہ جن کا لہجہ سب سے زیادہ تشدد آمیز ہے۔ چنانچہ گورکھی کی، جو دو مرتبہ سزایاب ہو چکا ہے، 5000 کاپیاں چھپتی ہیں۔ اس طرح کیسری کے خریداروں کی تعداد 12000 سے بڑھ کے 13000 اور کل کے 2500 پرچے فروخت ہوتے ہیں۔ جو پریسیڈنسی میں شائع ہونے والے اخباروں میں سب سے زیادہ کنبہ پرور اور نڈر رہے۔''[1] اُس نے مزید کہا کہ اخبارات میں تجربہ کی کمی ہے۔ اور اُن پر الزام لگایا کہ وہ کانگریس سے متاثر ہو رہے ہیں۔ 1903 میں اخباروں کے متعلق جو رپورٹ بمبئی[2] میں تیار کی گئی تھی اُس میں ہندوستانی اخباروں کی مندرجہ ذیل زمروں میں تقسیم کی گئی تھی۔

(1) دلی مرہٹی کے اخباروں جو زیادہ تر چت پادن برہمنوں کے ہاتھوں میں ہیں اور برطانوی راج کے خلاف مخالفت کا جذبہ رکھتے ہیں۔

(2) وہ اخبار جو کانگریس کے پرچار کی حمایت کرتے ہیں اور زیادہ سیاسی حقوق کے تعلق سے ''نئے ہندوستان'' کے توقعات کی وکالت کرتے ہیں۔

(3) (الف) وہ اخبارات جو اعتدال پسند ہیں، خاصے وفادار ہیں اور جن مسائل پر بحث کرتے ہیں اُن پر سنجیدگی سے اور آزادانہ نظر ڈالتے ہیں۔

(ب) وہ اخبار جو ہمیشہ برطانوی پالیسی کی حمایت کرتے ہیں اور انتہائی وفادارانہ لہجہ اختیار

---

[1] جنکنش، جے۔ ایل، حکومت بمبئی کے قائم مقام سکریٹری کا حکومت ہند کے محکمہ داخلہ کے سکریٹری کو محکمہ سیاست، 23/اگست 1901 نمبر 5963

[2] محکمۂ داخلہ، اُمور عامہ، جون، 1904 نمبر 139-138۔

کرتے ہیں۔

(4) وہ مطبوعات جو مندرجہ بالا کسی بھی زمرے میں نہیں آتیں اور عام طور سے بے ضرر ہوتی ہیں۔

رپورٹ میں اس بات کو تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ جو اخبار برہمنوں کے ہاتھوں میں تھے مثلاً کیسری کل وغیرہ وہ مقابلتاً زیادہ بااثر تھے اور اُن کے خریداروں کا حلقہ بھی زیادہ بڑا تھا۔

شمالی مغربی صوبجات (اُترپردیش) کے اخباروں کے سامنے بنگال اور بمبئی کے اخباروں کی مثال تھی۔ لیکن اُن کا لہجہ مقابلتاً زیادہ اعتدال پسندانہ تھا۔ ''ہندوستانی زبانوں کے اخباروں میں اودھ اخبار راجہ رام پال سنگھ کا، ہندی کا ہندوستان اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور انگریزی کے اخباروں میں ہندوستان ریویو، کائستھ سماچار اور ایڈووکیٹ بڑی سمجھ داری کے ساتھ چلائے جارہے تھے۔ ہندوستان ریویو اور کائستھ سماچار کا شمار صوری اعتبار سے بہترین اخباروں میں ہوتا تھا۔ سٹی زن کا لہجہ ویسا ہی رہا یعنی وہ عام طور سے حکومت کی غلطیاں نکالتا تھا۔''[1]

''تاجپوشی کے دربار کا تفصیلی حال بیان کیا گیا۔ لیکن کسی اخبار نے اس سلسلے میں جوش کا مظاہرہ نہیں کیا اور سٹیزن نے اُسے سامراج کے فضول مظاہرے سے تعبیر کیا۔

''ایڈووکیٹ نے کانگریس کے کام کی تعریف کی اور کہا کہ وہ ملک کے تمام لبرل تصورات کی حامی ہے۔ ہندوستان کو ایک مفتوح ملک تصور کرنے کی اینگلو انڈین پالیسی کی خدمت صاف صاف لفظوں میں کی گئی۔ وائسرائے کی حیثیت سے کرزن کی موقف کار کی توسیع کو اخباروں نے پسند نہیں کیا۔ اعلیٰ فوجی عہدوں سے ہندوستان کے لوگوں کو علیحدہ رکھنے کو ''سامراج کی شدت پسندی'' سے تعبیر کیا گیا۔''[2]

مدراس کے اخباروں کا لہجہ اعتدال پر مبنی تھا۔ اس میں ہندو اور مدراسی اسٹنڈرڈ پیش پیش تھے جو اپنے خیالات اعتدال کے ساتھ کے ظاہر کرتے تھے۔ اسی طرح ہندوستانی زبانوں کے اخبار بھی عام طور سے شائستہ، لہجے میں تنقید کرتے تھے۔

---

[1] 1920 میں صوبجات متحدہ کے اخباروں کے متعلق ایک یادداشت، محکمۂ داخلہ اُمور عامہ (کانفرنس) روداد، حصہ ب جون 1904

[2] ایضاً

گیارھواں باب

سامراج اور اس کے ریکارڈ

سامراج اور اُس کا اعمال نامہ

ہندوستان میں متوسط طبقے کی نشوونما کے ساتھ سیاسی شعور بھی پیدا ہوا۔ اُنیسویں صدی کی ابتدائی دہائیوں ہی میں اس نئے طبقے نے سیاسی امور میں دلچسپی لینی شروع کردی تھی۔ انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کے اخباروں نے اُس تحریک کو ہوا دینی شروع کردی۔ اخباروں اور اُس کے پڑھنے والوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ سیاست میں لوگوں کی دلچسپی بڑھتی جا رہی ہے۔

تعلیم کی ترقی کے ساتھ یہ دلچسپی بھی بڑھی اور وسیع تر حلقوں میں پھیل گئی۔ 1858 سے 1885 تک یہ تحریک مقامی اور صوبوں تک محدود تھی لیکن یکساں مسائل لوگوں کی توجہ کے مرکز بنے ہوئے تھے جب مواصلات میں ترقی ہوئی تو صوبوں کے باہمی روابط بھی بڑھے، سیاسی تحریک نے صوبائی سرحدوں کو پار کیا اور قومی نوعیت اختیار کر لی۔

عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ سیاست میں دلچسپی بڑھنے، رائے عامہ کا ایک شکل اختیار

کرنے اور اُس کو ظاہر کرنے کے ذرائع کی تنظیم کے مقاصد کا انتشار اور خیالات، اختلاف کو بڑھاوا دیتا ہے۔ آزاد جمہوری ممالک کے سماجوں میں یہ اختلاف اُن سیاسی جماعتوں اور پارٹیوں میں ہوتا ہے جو مختلف مفادات کی نمائندگی کرتی ہیں اور اُمورِ عامہ کے تعلق سے مختلف خیالات رکھتی ہیں۔ محکوم ممالک میں جہاں حاکم اور رعایا مختلف قوموں سے تعلق رکھتے ہیں سیاسی شعور اور سیاسی سرگرمیوں کی نشوونما محکموں کو انتظامیہ کو لبرل بنانے اور حکومت میں حصہ دینے کے مطالبوں پر اُکساتی ہے۔ یہ مطالبہ بدیسی حکومت کو شکوک وشبہات میں مبتلا کر دیتا ہے اور اس کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے باہمی تصادم جو بڑھ کے طاقت حاصل کرنے کے لیے حاکم ومحکوم کے درمیان جدوجہد کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

ہندوستان میں طاقت حاصل کرنے کے لیے کی جانے والی جدوجہد دو مرحلوں سے گزری۔ پہلے مرحلے میں مفتوح دورِ وسطیٰ کے ہندوستان نے فاتح کا جُوا اُتار پھینکنے کے لیے جنگ کی یہ مرحلہ 1858 میں ختم ہوگیا۔ اُس کے بعد بہت بدلے ہوئے حالات میں دوسرا مرحلہ شروع ہوا۔ فاتحوں نے ایک منظم حکومت کا نظام قائم کر لیا تھا اور امن وامان کے مسئلے سے آگے بڑھ کے لوگوں کی بھلائی کے کاموں میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی مثلاً تعلیم، سماجی اصلاح، مواصلات کی ترقی، زراعت، صحت عامہ وغیرہ بدیسی حکومت نے اپنے مکروہ چہرے پر ایک فیض رساں حکومت کی نقاب ڈال لی تھی۔ اور اصلاح اور ترقی کی ایک ایجنسی کی شکل اختیار کر لی تھی۔ چنانچہ اُسے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی اطاعت حاصل ہوگئی جو انگریزوں کے قائم کردہ امن وآمان کو اٹھارہویں صدی کی طوائف الملوکی سے آزادی تصور کرتے تھے۔ اطاعت نے بڑھ کے قبول عام کی شکل اختیار کر لی جو بلا جبر واکراہ اور غیر مشروط نہ ہونے اور مفادات پر مبنی ہونے کے باوجود حقیقی تھی۔

لیکن برطانوی حکومت اپنے سامراجی کردار سے چھٹکارا نہ پا سکی۔ سامراجی ضرورتوں نے اُسے جنم دیا تھا اور اُس کی پالیسیوں کی رہنمائی کرتی تھی۔ ابتدا میں اُن مفادات کے تعلق سے تنگ نظری سے کام لیا گیا اور فوری فوائد کی خاطر مفتوح ملک کا استحصال کیا گیا۔ خاص طور سے بنگال کی دیوانی کی منتقلی کے بعد کی دہائیوں میں جلد ہی یہ محسوس کیا گیا کہ اس قسم کی تنگ نظری خود حکمرانوں

کے لیے غیر مفید ہے۔ سامراج کے دائمی مفادات اس کے متقاضی تھے کہ انتظامیہ کا ایک منظم اور کارگزار نظام قائم کیا جائے، امن کو برقرار رکھا جائے ملک کے مسائل کو اس طرح ترقی دی جائے کہ وہ انگلستان کی معاشی ضرورتوں کو پورا کر سکے اور ایسی تعلیمی سہولتیں مہیا کی جائیں کہ کم سے کم لوگوں کا ایک حصہ بدیسی حکمرانوں کے طریقوں کو سمجھ سکے اور حکومت کے کاموں میں ان کا ہاتھ بٹا سکے۔ راج کا اخلاقی جواز اور محکوموں کی رضامندی حاصل کرنے کا واحد ذریعہ تھا ایک روشن خیال حکومت کا قیام۔

ان طویل المدت تصورات کو عملی شکل دینے کے لیے ایک کارگزار حکومت کے قیام کی کوشش کی گئی۔ پالیسن نے، جو سامراج پر بلارُو رعایت تنقید کرتا تھا ان کی مندرجہ ذیل فہرست تیار کی ہے۔

''ہم نے ہندوستان میں وسیع تر پیمانے پر اور ہمیشہ کے لیے امن قائم کیا ہے جو سکندر اعظم کے وقت سے کچھ نصیب نہیں ہوا تھا۔ ہم نے قانون پر منصفانہ طور سے عمل کر کے انصاف کا معیار بلند کر دیا۔ ہم نے محاصل کو منضبط کیا اور غالباً ان کا بوجھ کم کر دیا اور اسی کے ساتھ دیسی حکمرانوں اور ان کے ٹیکس وصول کرنے والوں کی بددیانتیوں اور مظالم کا بھی سدباب کیا۔ لوگوں کو تعلیم دینے کے لیے ہم نے سرکاری اسکولوں کا ایک نظام بنا دیا اور اس کے ساتھ نیم سرکاری مشنری ادارے بھی قائم کئے جو نہ صرف عیسائی مذہب کی تعلیم دیتے ہیں بلکہ بہت سے صنعتی فنون کی بھی۔ سڑکوں اور ریلوں کے جال نے مواصلات اور آمدورفت کی سہولتیں پیدا کر دی ہیں اور آب پاشی کے سائنسی نظام نے زمین کی پیداواری صلاحیت بڑھا دی ہے۔ کوئلے، سونے اور دوسرے معدنیات کی کان کنی میں بڑی ترقی ہو چکی ہے۔ بمبئی اور دوسرے شہروں میں سوتی کپڑے کے مل قائم ہو گئے ہیں جن میں جدید مشینیں لگی ہوئی ہیں اور دوسری مشینیں صنعتوں کی تنظیم بڑے بڑے شہروں کے لوگوں کے لیے روزگار فراہم کرنے میں مدد کر رہی ہیں۔ چائے، کافی، نیل، پٹ سن، تمباکو اور دوسری باہر سے لائی ہوئی فصلوں سے ہندوستانی زراعت کو متعارف کر دیا گیا ہے۔ ہم ایسے بہت سے مذہبی اور سماجی توہمات کو رفتہ رفتہ ختم کر رہے ہیں جو انسانیت کے خلاف گناہ کا حکم رکھتے ہیں اور ترقی کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے ہیں اور جہاں کہیں برطانوی اثر پڑ رہا ہے وہاں

ذات پات کے نظام کی بھی ترمیم ہو رہی ہے جس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔''[1]

ہندوستان میں برطانوی سامراج کے فیض رساں اقدامات کی جو تعریف پالیسن نے کی ہے اس کو مبالغہ پر مبنی سمجھنا ضروری نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سول ملازمتوں سے تعلق رکھنے والے ''ذہین'' تعلیم یافتہ اور باعزت لوگوں کے کاموں، سرکاری افسروں کی ''بے لوث اور سوچی سمجھی کاوشوں'' اور ہندوستان کے معاملات کی رہنمائی میں گورنر جنرلوں اور وائسرایوں کے تدبر کے مظاہروں کا مجموعی نتیجہ کیا ہوا۔

برطانوی سامراج سے جو بھی فائدے حاصل ہوئے جن میں سے کچھ نے ہندوستان کے اتحاد، قومی شعور اور بالآخر آزادی کے لیے ضروری حالات پیدا کر دیے پھر بھی اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس نوعیت کی بنا پر سامراج جمہوریت اور حکومت خود اختیاری سے مناسبت نہیں رکھتی ہے اور خود کو ختم کرنے کی طرف مائل نہیں ہوتی ہے۔ سامراج کی بنیاد طاقت پر قائم ہوتی ہے اور اُس کا آلہ کار رہوتا ہے فوجی طاقت۔ سامراج اور عسکریت ایک دوسرے کے حامی ہوتے ہیں، وہ اپنی ماتحت نسلوں کی قیمت پر عروج پاتے ہیں خصوصاً جب نسلیں مختلف ہوتی ہیں۔

II۔ سامراج کی غارت گرانہ نوعیت

اُنیسویں صدی میں ایشیا اور افریقہ میں سامراج کی نوعیت ظالمانہ اور مضر تھی۔ جو قوم سامراجی سرگرمیوں میں شامل تھی اُس کے لیے بھی سامراج نعمت کا حکم نہیں رکھتا تھا۔ اس نے انگریزوں کو دولت مند اور طاقت ور ضرور بنا دیا تھا لیکن اُس کی وجہ سے یورپ کی دوسری مقابلہ کرنے والی قوموں میں حسد اور رقابت کے جذبات پیدا ہو گئے تھے اور بین الاقوامی جنگیں چھڑ گئی تھیں۔ اس نے یورپ کی سامراجی ریاستوں کی داخلہ پالیسیوں کو بھی متاثر کیا تھا۔ جوں جوں رقابت بڑھی جنگ کے خطرے بھی بڑھے جن کی وجہ سے روز افزوں پیمانے پر فوجی تیاریاں ضروری ہو گئیں۔ جنگ کی تیاری کی بنا پر جو رقم سماجی بہبود یعنی تعلیم، صحت عامہ اور لوگوں کی بھلائی

---

[1] پالیسن، جے اے، سامراج۔ ایک مطالعہ، تیسرا ایڈیشن۔ جارج ایلن اینڈ انون، لندن، 1938 صفحہ 287۔ یہ اہم کتاب سب سے پہلے 1902 میں شائع ہوئی تھی

کے کاموں پر خرچ ہونا چاہئے تھی، وہ فوجی سہولتوں پر صرف ہوئی اور ترقی رک گئی۔عسکری ٹولیوں نے سیاست پر قابو پانے اور جنگ کی نفسیات پیدا کرنے کی کوشش کی جس نے ملک کے اندر اور ملک کے باہر لبرلزم اور جمہوریت کی ترقی میں رکاوٹ ڈالی۔ایک طرف اگر برک نے اٹھارہویں صدی کے اختتام پر انگلستان کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی سامراجیت کے مضر اثرات سے آگاہ کیا، تو دوسری طرف بہت سے لوگوں نے اُنیسویں صدی میں صنعتی سامراج کے خطرے پر انگلستان کو توجہ دلائی۔اُن میں اس قسم کے لوگ شامل تھے جیسے رچرڈ کائڈن جارج کانوال لوٹی، جان برائٹ، اینتھنی ٹرولوپ، جان اسٹورٹ مل ولفریڈ اسکاون بلنٹ اور جان۔اے۔ بابس۔

سامراج کے خلاف دلیلوں کو ظاہر کرنے کے لیے بہت سی تحریروں میں سے دو کے اقتباسات پیش کئے جاتے ہیں۔ ہندوستان کے متعلق ایک خط میں جو 16رمئی 1858 کو لکھا گیا تھا۔کائڈن نے مندرجہ ذیل رائے ظاہر کی تھی۔

''میں ڈرتا ہوں کہ ہندوستان میں جو کچھ ہورہا ہے اُس کی بنا پر ہمارا قومی کردار گرنہ جائے اور آزادی سے ہمارا پیار ختم نہ ہوجائے۔کیا یہ ممکن ہے کہ یہاں اپنے اپنے کردار کو گرائے بغیر ہم ہندوستان میں ایک مطلق العنان حکمراں اور قصائی کا رول ادا کرسکیں۔کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ ایشیائی فتوحات کی بنا پر قدیم یونانیوں اور رومنوں کے اخلاق خراب ہوگئے اور وہ بد دیانتی کے شکار ہوگئے اور کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہمارا حشر بھی وہی ہو، حالانکہ اُس کا انداز مختلف ہوسکتا ہے۔''[1]

جے۔اے۔ پالیسن نے لکھا تھا:

''سامراج اور فوجی، ڈپلومیٹک اور مالیاتی وسائل جو اُسے پروان چڑھاتے ہیں حالیہ حکومتوں کے لیے اتنے اہم ہوگئے ہیں کہ وہ پالیسی کی سمت مقرر کرتے ہیں، اُمور عامہ کے انصرام کو ایک خاص نقطۂ نظر رنگ اور کردار عطا کرتے ہیں اور انجانے اور بے حساب فائدوں اور خطروں کی مسلسل تجاویز سے داخلہ پالیسی کے قریب تر اور زیادہ سنجیدہ عمل کو مرعوب کردیتے ہیں۔ پارلیمانی طرز حکومت پر اس کا اثر جلد پڑتا ہے اور بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔یعنی نمائندہ اداروں کی طاقت کم ہوجاتی ہے۔انتخابات کے موقع پر رائے دہندگان سے یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ

---

[1] مدد جے جے کائڈن کی سوانح، (ایورسلے اڈیشن، میکملن اینڈ کمپنی، لندن، 1908) جلد دوم، صفحہ 192

وہ مختلف قابل فہم پالیسیوں کے نمائندوں میں سے آزادی، سمجھ داری اور معقول طریقے کسی کا انتخاب کریں...... ہاؤس آف کامنز کے مباحث میں حزب مخالف کی اختلاف رائے کی طاقت میں مسلسل کمی ہو رہی ہے...........خود حکومت کے اندر اُس قسم کی جو مرکزی قوتیں کام کرتی رہی ہیں۔[1] پالیسن نے مزید کہا،''سامراج اور جمہوری حکومت میں کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ اُن کی روح، پالیسی اور طریقہ کار مختلف ہیں۔''[2]

ان اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ انگلستان کے لبرل حلقوں میں شدید سامراج مخالف جذبہ پایا جاتا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اُنیسویں صدی میں تصورات کی دو متوازی دھارائیں موجود تھیں۔ ایک طرف جمہوریت اور آزادی کے تصورات نے داخلی، سماجی اور سیاسی اصلاحات کو بڑھاوا دیا اور پارلیمانی اصلاح، فوجداری قوانین سدھار، مزدوروں کے حالات کو بہتر بنانے، عورتوں کی آزادی مقامی حکومت کی تنظیم نو، تعلیم کی توسیع وغیرہ کی شکل اختیار کی اور خارجہ اور سامراجی سیاست کے میدان میں لبرل تصورات نے ایسے گروپوں کی تشکیل کی جیسے''کلونیل ریفارمرس''(استعماری مصلحین)''سیپرٹیسٹ''(علیحدگی پسند) اور لٹل انگلینڈرس''(چھوٹے انگلستانی)۔

لیکن دوسری طرف اُنیسویں صدی میں سامراجی غلبے کی سب سے زیادہ توسیع ہوئی۔ ایشیا اور افریقہ کے بڑے بڑے حصوں پر انگریزی حکومت قائم ہوگئی۔ 1870 اور 1900 کی درمیانی مدت میں جن علاقوں پر قبضہ کیا گیا اُن کا رقبہ 4754000 مربع میل تھا۔ اور 1902 کے تخمینے کے مطابق اُن کی آبادی آٹھ کروڑ اسی لاکھ تھی 34-1933 میں سلطنت کا مجموعی رقبہ (برطانوی جزائر کو چھوڑ کے) 13,271 ملین مربع میل اور اُس کی آبادی 449 ملین افراد پر مشتمل تھی۔ اس وسیع سلطنت میں سفید فام لوگوں کی تعداد تھی 256 ملین اور غیر سفید فام کی 424 ملین حالانکہ جس رقبے پر سفید فاموں کا قبضہ تھا وہ اُس رقبے سے بڑا تھا جس پر غیر سفید فاموں کا قبضہ تھا۔[3]

---

[1] پالیسن جے۔ اے محولہ بالہ، صفحات 48-147

[2] ایضاً صفحہ 15

[3] ایضاً، تتمہ، صفحہ 329

دو سلطنتیں

لیکن برطانوی سلطنت دو حصوں میں بٹی ہوئی تھی۔ یعنی سفید فام نو آباد کاروں کی نو آبادیاں اور استحصال نو آبادیات[1] اور برطانیہ عظمیٰ کی سیاست میں وہ مختلف رول ادا کرتی تھیں۔ سفید حصہ اس قسم کی نو آبادیات پر مشتمل تھا جیسے کناڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ اور جنوبی افریقہ۔ یہ حصہ برطانوی اخبارات، عام لوگ اور پارلیمنٹ کی خصوصی توجہ کا مرکز تھا۔ بہت سے انگریزوں کا خیال تھا کہ اُن نو آبادیات کو رکھنا مناسب نہیں ہے۔ ایڈورڈ گبن ویک فیلڈ کی طرح کے کچھ لوگوں نے حکومت کو اس بات پر آمادہ کرنے کے لیے ایک تحریک چلائی کہ وہ ان نو آبادیات کے اس حق کو تسلیم کرے کہ انگلستان سے رشتہ توڑے بغیر وہ اپنی حکومت خود سنبھال لیں۔ کچھ دوسرے لوگوں کی رائے تھی کہ ایسی نو آبادیات کی قانونی آزادی کو تسلیم کر لیا جائے جو اُس کے قابل ہیں۔ اُن میں کائڈن اور جارج کارنوال لوئس جیسے سیپریٹسٹ شامل تھے۔ ایک زمانے میں ڈزرائل بھی نو آبادیاتی سلطنت کی افادیت کو مشکوک سمجھتے تھے اور اُن کا خیال تھا کہ اس کے اراکین بالآخر ایک دوسرے سے دور ہو جائیں گے پھر بھی ریفارمرس نے تہیہ کیا تھا کہ وہ جارج سوم اور اس کے مشیر بوٹ اور ناتھ کی غلطیوں سے بچیں گے اور اُنھوں نے نو آبادیات کو حکومت خود اختیاری دے کر اُن سے سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی۔

جہاں تک سفید فام نو آبادیات کا تعلق تھا 1868 کے بعد سامراج کا ایک نیا مرحلہ شروع ہوا۔ نئی سلطنت کا تصور سب سے پہلے سر چارلس رلکے نے اپنی کتاب عظیم تر برطانیہ (1868) میں پیش کیا۔ ڈزرائل نے اپنے روایتی جوش کے ساتھ اس کی حمایت کی۔[2]

سر جان سیلی نے 1883 میں اپنی بااثر کتاب انگلستان کی توسیع لکھی جس میں ''ڈھل انگلینڈ'' کا مذاق اُڑایا اور اُسے ایک وہم سے تعبیر کیا۔ جے۔ اے۔ فراوڈے نے اپنی کتاب اُشیانا میں اُن نئے انگلستانوں کی طرف توجہ دلائی جو سمندروں کے پار نشوونما پا رہے تھے اور پھل

---

[1] ڈینش۔ اے برطانوی سلطنت نو آبادیاتی جغرافیے کا مطالعہ (جارج تہذیب، لندن، 1925 ترجمہ ایف۔ ایف۔ رو، کتاب اول، باب 3 اور 4

[2] پینتھن ڈزرائل کی سوانح از الف۔ جی۔ مغربی چینی اور سی۔ آئی۔ یگل، جلد دوم صفحات 545-534

پھول رہے تھے۔ لیکن سب سے بڑا سامراجی تھا، جوزف چیمبرلین[1] جو برطانوی سلطنت اور برطانوی نسل میں بڑا یقین رکھتا تھا جو اُس کے مطابق ''جو دنیا کے پردے پر پائی جانے والی حکمراں نسلوں میں سے ایک تھی''۔

اس نئے سامراج کا مقصد تھا خودمختار اکائیوں کی عظیم دولت مشترکہ میں ساجھی داروں کی حیثیت سے نوآبادیات کو یکجا رکھنا جسے ''آزاد ریاستوں کی کہکشاں'' سے تعبیر کیا گیا۔

اُنیسویں صدی کے بعد اور بیسویں صدی کی پہلی دہائی کے ختم ہونے سے پہلے ریفارمرس کا جواب حقیقت میں بدل گیا۔ 1867 میں برٹش نارتھ امریکن ایکٹ نے کناڈا کو ڈومی نیشن کی حیثیت دے دی۔ پانچ سال بعد کیپ کالونی کو ذمہ دار حکومت مل گئی۔ 1890 میں مغربی آسٹریلیا میں اور 1893 میں نٹال میں ذمہ دار حکومت کے نظام کا قیام عمل میں آ گیا۔ 1900 میں آسٹریلین کامن ویلتھ ایکٹ کی رو سے آسٹریلیا ایک وفاقی یونین بن گیا اور 1904 میں ایک افسوسناک جنگ کے بعد جنوبی افریقہ، ٹرانس وال اور آرنیم فری اسٹیٹ برطانوی سلطنت کے اندر خودمختار ریاستوں کے حلقے میں داخل کر لی گئیں۔ اس کے مقابلے میں وہ اُصول بالکل مختلف تھے جن کا اطلاق غیر سفید فام سلطنت یعنی استحصالی نوآبادیات پر ہوتا تھا۔ اُنیسویں صدی کے نصف اول میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذریعہ انگلستان نے ہندوستان پر حکومت کی۔ کبھی کبھی پارلیمنٹ اپنی ذمہ داری کا بھلے ہی اظہار کرے ورنہ کمپنی جو چاہتی تھی وہ کرتی تھی۔ پہلا موقعہ وہ تھا جب برک نے وارن ہسٹنگز پر الزام لگایا۔ لیکن سرکاری وکیل نے جتنا زبانی جمع خرچ کیا اُس کے مقابلے میں مقدمے کا اثر بہت کم ہوا۔ ہر بیس سال بعد چارٹر کی تجدید سے پہلے پارلیمنٹ جو تفتیش کرتی تھی وہ حقیقت میں انگلستان کے تاجروں اور صنعت کاروں کے مختلف گروہوں میں پائے جانے والی کمپنی کے حامیوں اور مخالفوں میں رسہ کشی کے مترادف تھی جو ایک دوسرے سے حسد کرتے تھے اور اپنے مفاد میں ہندوستان کا استحصال کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بورڈ آف کنٹرول

---

[1] جوزف چیمبرین کے خیالات جاننے کے لیے دیکھیے اُس کی تصویریں جن کے اقتباسات جارج بینٹ نے سلطنت کے تصور میں دیے ہیں۔ 1774۔1947 (لندن، اڈس انڈ چارلس بینک، 2691) صفحات 312-320

نے، جس کا قیام پٹ کے انڈیا ایکٹ کی رو سے عمل میں آیا تھا اور صدر جس کا سربراہ ہوتا تھا۔ اعلیٰ سیاسی اُمور کے علاوہ تقریباً نو سال کی حکومت کی۔ اُس کے بعد 1858 میں جان اسٹورٹ مل کی مخالفت کے باوجود حکومت ہند کی ذمہ داری کمپنی سے تاج کو منتقل کر دی گئی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کا کام ختم ہونے کے بعد صنعتی سامراج کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ برطانوی سرمایہ ہندوستان کو برآمد کیا جانے لگا اور باغ کاروں اور ریلوں میں لگایا جانے لگا۔ سرمایے کی اصل کاری کو باہسن نے ''سامراج کی اصل جڑ'' سے تعبیر کیا ہے چنانچہ شوم پیٹر کے اس نظریے کے برعکس کہ سامراج کی وجہ غیر معقول عناصر ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں برطانوی سامراج کی بنیاد معاشی فوائد کی معقول تجارتی سوچ بچار اور حساب کتاب پر قائم تھی۔ نولس کا کہنا ہے کہ ''انگریز دوسروں کو اپنے اندر جذب کرنے والی نسل نہیں ہے۔ توسیع کے اسباب عام طور سے معاشی ہوتے ہیں۔''[1] سامراج کی بالادستی سرمایہ داروں کی برآمدی اور درآمدی تجارت اور محکوم ملکوں میں اُن کی اصل کاروں کی حفاظت کرتی ہے۔

لیکن بنیادی معاشی اسباب میں کچھ اور اسباب کا اضافہ ہوگیا۔ یعنی طاقت، فخر اور وقار مثال کے طور پر ایسٹ انڈیا کمپنی اپنی حکومت کے جواز میں ہندوستان کے وحشیوں کو مہذب بنانے کا اپنی مشن پیش کرتی تھی۔

زیادہ تر انگریز اپنی حکومت کے نتائج سے بالکل مطمئن تھے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اُس کے کارناموں پر فخر کرتے تھے۔ اُن کے اطمینان کی وجہ یہ تھی ہندوستان کو حاصل ہونے والے اُن مسلمہ فوائد پر جن کا ذکر پالیسن نے کیا ہے، یک طرفہ غور وفکر۔ لیکن اس کا ایک اور پہلو بھی تھا۔ جس کو نظر انداز کیا گیا۔ مگر جسے کائڈن کی طرح کے عوامی کارکن باخبر تھے۔ بابسن کی طرح کے مصنفوں نے اُسے بے نقاب کر دیا۔

سامراج کا یہ پہلو اُن تمام فوائد کی نفی کرتا تھا جن کا ذکر اُس کے حامیان ومعترضین کرتے تھے۔ سامراج کا یہ پہلو کئی مکروہ خصوصیتوں کی نمائندگی کرتا تھا۔ مثلاً، معاشی استحصال، عام لوگوں کی بدحالی اور محکموں کی اخلاقی معیاروں اور وقار میں گراوٹ۔ سامراجی برطانیہ محکوم ہندوستان کو

---

[1] نولس، کوئی، سی۔ اے، انیسویں صدی میں معاشی ترقی (1924)، صفحہ 307

اپنی ذیلی سیارہ سمجھتا تھا۔ جس کا اصلی کام تھا اپنے مالکوں کے لیے خون پسینہ ایک کرنا، اُن کی معیشت کی معاونت کرنا اور اُن کے راج کی شان وشوکت اور وقار میں اضافہ کرنا۔

سامراج نے اچھائی اور برائی، ترقی اور جمود کی آمیزش کی شکل اختیار کی۔ 1858 تک تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کا خیال تھا کہ اچھے اور ترقی پسند عناصر کی تعداد برے عناصر سے بہت زیادہ ہے۔ بددیانتی اور عدلیہ کی کام چوری، کسانوں پر مطالبوں کے تباہ کن بوجھ ضابطوں فائدوں پر عمل کرنے میں حکام کی سختی اور سب سے زیادہ انگریزوں کی علیحدگی پسندی اور گھمنڈ کے باوجود حکومت ملازمت کے مساوی مواقع مہیا کرنے کا جو لبرل وعدہ کیا تھا وہ پورا نہیں کیا گیا۔ پھر بھی متوسط طبقے کے دانش وروں نے فی الجملہ برطانوی حکومت کو عام لوگوں کی بھلائی کا خواہاں اور اس لیے وفاداری کے قابل سمجھا۔

III سامراجی حکومت کی نااہلی

ایک طرف سامراج عروج پا رہا تھا دوسری طرف محکوموں کی وسیع تعداد پر حکومت کرنے کی اہلیت کم ہوتی جارہی تھی۔ ہندوستان میں 1857 کی بغاوت نے برطانیہ کو بہت زیادہ خائف کر دیا تھا۔ اس کے ردعمل کے طور پر انھوں نے انگلستان اور ہندوستان دونوں کی حکومتوں میں سختی کرنے کی کوشش کی لیکن بالآخر اس کے جو نتائج برآمد ہوئے وہ توقع کے خلاف تھے۔ ماتحت حصے یعنی حکومت ہند میں اختیارات کی مرکزیت پر زور دیا گیا۔ فوج میں برطانوی عناصر کو تقویت دی گئی۔ ہندوستان کی حکومت پر گورنر جنرل کے اختیارات میں اضافہ کیا گیا اور اُس کے دائرہ اختیار کو بڑھا دیا گیا۔ مرکزی عاملہ کے اختیارات کو تقویت پہنچانے اور اُس کے رقیبوں کی دخل اندازی سے محفوظ رکھنے کی غرض سے اعلان کیا گیا کہ 1861 کے ایکٹ کی رو سے جو لیجسلیٹیو کونسلیں قائم کی گئی ہیں وہ حکومت کی قانون ساز کمیٹیاں ہیں اور ذمہ دار اداروں کی نوعیت سے مبرا ہیں جن کو درج فہرست اضلاع کا نام دیا گیا۔ اُن کے لیے سرسری انداز سے قانون بنانے کے اختیارات گورنر جنرل کو سونپے گئے۔ پیل کمیشن کی مفادات پر عمل کر کے فوج کی برطانوی شعبے کی ضرورت سے زیادہ برتری ضمانت کی گئی۔ 1878 کے اسلحہ ایکٹ کی رو سے ہندوستانیوں کو اسلحہ رکھنے کی مخالفت کر دی گئی جس کو حکومت کی بقا کا ضامن تصور کیا گیا۔

جہاں تک انگلستان کی حکومت کا تعلق تھا فی الجملہ اختیارات کو مجتمع کیا گیا۔ ہندوستانی امور کے تعلق سے سیکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا کے نگراں اور کنٹرول کے رول میں اضافہ کردیا گیا اور انگلستان کے حکومت کے تعلق سے گورنر جنرل کو اختیارات میں تناسب کی کمی کردی گئی۔ 1858 کے ایکٹ کی رو سے بورڈ آف کنٹرول کے صدر اور کمپنی کے ڈائریکٹروں کے دوہرے کنٹرول کا طریقہ ختم کردیا گیا اور کل اختیارات سکریٹری آف اسٹیٹ کے سپرد کردیے گئے۔ چنانچہ انگلستان کی حکومت کی داخلی دیکھ بھال ختم ہوگئی اور سکریٹری آف اسٹیٹ زیادہ کارگر انداز سے کام کرنے لگا۔ اُس کے بعد انڈیا کونسل کی تشکیل کی گئی۔ جو ایسے رٹائرڈ حکام پر مشتمل تھی۔ جو ہندوستان کے متعلق علم اور تجربہ رکھتے تھے۔ اُس نے ہندوستانی امور سے نپٹنے کے لیے مقامی علم مہیا کردیا۔ چونکہ مالیاتی اختیارات سکریٹری آف اسٹیٹ کو حاصل ہوگئے تھے۔ وہ اُن کی بنا پر حکومت ہند کے اخراجات پر نظر رکھنے لگا۔ اُن انتظامات کی آخری کڑی تھا 1877 کا رائل ٹائیل ایکٹ جس میں صاف صاف کہا گیا تھا کہ گورنر جنرل اور اُس کی کونسل سکریٹری آفس اسٹیٹ کے ماتحت ہے جس کو اختیار اعلیٰ حاصل ہے۔

انگلستان اور ہندوستان کے درمیان 1870 میں راست کیبل ڈالا گیا، نہر سوئز جہازوں کے لیے کھل گئی۔ جس کی وجہ دونوں ملکوں کے درمیان فاصلہ کم ہوگیا اور بھاپ سے جہاز چلنے لگے۔ مندرجہ بالا امور کی وجہ سے انگلستان کی حکومت اور ہندوستان کی حکومت کے درمیان خط و کتابت اور خبر رسانی تیزی کے ساتھ ہونے لگی اور یہ تبدیلیاں ممکن ہوسکیں۔

ہندوستان کی حکومت پر اُس کے اختیارات میں اضافے کے ساتھ سکریٹری آف اسٹیٹ کے اختیارات پر کنٹرول کم ہوگیا۔ برطانوی پارلیمنٹ کو ہندوستان کے امور میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی اور سکریٹری آف اسٹیٹ کے فیصلوں میں وہ شاذ ہی مداخلت کرتی تھی۔ انڈیا کونسل کا کام صرف مشورہ دینا رہ گیا تھا۔ چنانچہ اس بات کو محض مذاق نہیں سمجھنا چاہئے کہ سکریٹری آف اسٹیٹ کو مغل شہنشاہ سمجھا جانے لگا تھا۔

تاج کی منتقلی کے بعد اگرچہ ہندوستان پر برطانوی حکومت بظاہر مضبوط و مستحکم معلوم ہوتی تھی اور ایسا لگتا تھا کہ وہ غیر معینہ مدت تک قائم رہے گی لیکن اُس کے طرزِ عمل کے جائزے نے یہ

عیاں کر دیا کہ ظاہری صورت ایک فریب تھی اور یہ کہ عمارت کی بنیادیں کمزور تھیں۔ ایک سیاسی آلۂ کار کی حیثیت سے اُس میں بڑی تباہ کن خرابیاں تھیں۔

سب سے بڑی خرابی یہ تھی اگرچہ حکومت ہند کو بڑی بڑی ذمہ داریاں قبول کرنی پڑی تھیں۔ اُس کے اختیارات محدود تھے اس لیے کہ حکومت ہند نے تمام اختیارات سکریٹری آف اسٹیٹ کو سونپ دیے تھے۔ جس کا کوئی راست رابطہ ہندوستان کے لوگوں سے نہیں تھا اور جیسے اُن کی رایوں، خواہشوں اور جذبات کے متعلق کچھ نہیں معلوم تھا۔

سکریٹری آف اسٹیٹ ایک مطلق العنان حکمراں بن گیا تھا اس میں کوئی شک نہیں کہ عمل یا نظریے کی حدتک وہ ہندوستانیوں کے سامنے جوابدہ نہیں تھا لیکن بڑی عجیب بات یہ تھی کہ برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے بھی وہ ذمہ داری سے قریب قریب بری تھا۔

حالانکہ اقتدارِ اعلیٰ پارلیمنٹ کو حاصل تھا پھر بھی انگلستان اور ہندوستان دونوں ملکوں کی حکومتوں پر اُس کی گرفت ڈھیلی ڈھالی اور غیر مسلسل تھی۔ ہندوستان میں جو قانون سازی ہوتی تھی اُس پر وہ بہت کم توجہ دیتی تھی۔ سکریٹری آف اسٹیٹ اُس کو کنٹرول کرتا تھا جو ہندوستان کی آمدنی اور خرچ میں کوئی دلچسپی نہیں لیتی تھی اور چونکہ سکریٹری آف اسٹیٹ اور اُس کے عملے کی تنخواہوں کا بوجھ انگلستان کے بجٹ پر نہیں پڑتا تھا۔ اس لیے وہ اُن کی ضرورتوں کا جائزہ نہیں لیتی تھی کبھی کبھی وہ ہندوستانی امور کے متعلق تجاویز منظور کرتی تھی جن پر حکومت کوئی توجہ نہیں دیتی تھی۔ مثال کے طور پر 1889 اور 1891 میں افیم کی تجارت کے متعلق اور 1893 میں بیک وقت ہندوستان اور انگلستان میں سول سروس کے امتحان لینے کے سوال پر تجاویز منظور کی گئیں۔ مانٹیگو اور چیمسفورڈ نے اس صورت حال کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا'' لیکن ہم بلا جھجک یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کے معاملات میں جو دلچسپی پارلیمنٹ نے دکھائی وہ قطعی اور عدم معلومات پر مبنی تھی۔[1]

پارلیمنٹ کی گرفت ڈھیلی ہونے کی وجہ سے سکریٹری آف اسٹیٹ کو کل اختیارات حاصل ہو گئے جس نے ہندوستان کی حکومت کو اپنا ماتحت بنالیا جب میو نے قانون سازی کے معاملات

---

[1] ہندوستان کی دستوری اصلاحات کے متعلق رپورٹ (1918) صفحہ 20

میں اپنی کونسل کے اختیارات کو بروئے کار لانے کی کوشش کی۔ اس سے کہا گیا ''اُصول یہ ہے کہ ہندوستان کے معاملات کو کنٹرول کرنے اور ایک سمت دینے کا قطعی اختیار حکومت انگلستان کو حاصل ہے اور اُن حکام کو حاصل نہیں ہے جن کا پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق ہندوستان میں تاج نے تقرر کیا ہے''۔[1]

اُس نے مزید کہا ''ہندوستان میں جو حکومت قائم کی گئی ہے وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے انگلستان کی شاہی حکومت کے تابع ہے اور کوئی حکومت اس وقت تک تابع نہیں کہی جاسکتی جب تک حکومت بالا کو یہ اختیار نہ حاصل ہو کہ وہ کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے کا حکم دے سکے اور معمولی دستوری طریقوں سے حکام سے اپنے اُن احکام کی تعمیل کرا سکے کہ وہ اپنی سرکاری حیثیت اور اختیار کا استعمال اُس پالیسی کو تقویت پہنچانے کے لیے کریں گے جس کا فیصلہ تاج کے مشیروں نے کیا ہے۔

میں یہ تسلیم کرنے کو بھی تیار نہیں ہوں کہ موجودہ صورت میں شاہی حکومت نے جو ہدایتیں دی ہیں اُن کا اطلاق قانون سازی کے امور پر ہوتا ہے۔ جو انتظامی امور سے مختلف ہیں''۔[2]

نارتھ بروک سے، جو ہندوستان کے معاشی مفادات کو کچھ اہمیت دینا چاہتا تھا، کہا گیا ''ملکہ معظّمہ کی حکومت جس انداز سے کنٹرول کرتی ہے۔ اُس کا اطلاق مالیاتی پالیسی پر بھی ہونا چاہیے''۔[3] اُس کے جواز میں دستور کی دفعات پیش کی گئی جو عملاً ایک اختراع قانون کی حیثیت رکھتی ہیں یعنی سکریٹری آف اسٹیٹ پارلیمنٹ کے سامنے جوابدہ ہے اور یہ ذمہ داری ''ہندوستان کی دور دراز کی حکومت'' پر نہیں ڈال سکتا۔

1894 میں سکریٹری آف اسٹیٹ سر ہنری ماڈلر نے بڑے وثوق کے ساتھ کہا کہ برطانوی کابینہ متحدہ اور ناقابل تقسیم ذمہ داری کے اصول کا اعلان دونوں انتظامی اور قانون سازانہ امور میں ہندوستان کی اگزیکیوٹیو کونسل پر بھی ہوتا ہے۔ اُس نے گورنر جنرل کو اطلاع دی ''اگر

---

[1] سکریٹری آف اسٹیٹ بنام حکومت ہند 24 /نومبر 1870

[2] ایضاً

[3] سکریٹری آف اسٹیٹ کی طرف سے حکومت ہند کے نام، 30 /نومبر 1894

دونوں میں سے کسی بھی صورت میں اختلافات پیدا ہو گئے ہیں تو حکومت ہند کے اراکین کے لیے ضروری ہے کہ اپنی رائے قلم بند کرنے کے بعد اگر وہ مناسب سمجھتے ہیں......تو یا تو وہ حکومت کا ساتھ دیں یا وائسرائے کو اپنا استعفیٰ پیش کر دیں''۔[1]

اس طرح حکومت ہند سے قانون سازانہ، مالیاتی اور انتظامی اُمور میں فیصلہ کرنے کے اختیارات چھین لیے گئے اور ایک قریب قریب غیر ذمہ دار سکریٹری آف اسٹیٹ کو اختیارات اعلیٰ سونپ دئے گئے جو معمولاً ہندوستان کے معاملات کا تجربہ نہیں رکھتا تھا۔ ہندوستان میں حکومت کے چاروں طرف جو لوگ تھے وہ زیادتر صورتوں میں قدامت پرست اور پابندیاں عائد کرنے کے حامی تھے۔ مثلاً سرکاری ملازمتیں اور یورپینوں کا غیر سرکاری طبقہ یعنی تاجر، مالدار، صنعت کار وغیرہ جیسا کہ البرٹ بل کے متعلق پیدا ہونے والی نزاع سے ظاہر ہوتا ہے۔

اُن حالات میں حکومت ہند کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ بدلتے ہوئے ہندوستان کے نئے اور اُلجھے ہوئے مسائل کے تعلق سے کوئی طویل المدت پالیسی اختیار کر سکے۔ وہ روزانہ کے مسائل میں الجھی ہوئی تھی جہاں تک انگلستان کی حکومت کا تعلق تھا وہ اپنی دستوری مجبوریوں کی بنا پر اس قسم کی پالیسی کا خاکہ بنانے کے قابل نہیں تھی۔ دستوری اصلاحات (1918) کے متعلق رپورٹ تیار کرنے والوں کو مجبوراً کہنا پڑا تھا'' ہندوستان میں بڑھتے ہوئے احساس کے مقابلے میں مسلسل ترقی کی پالیسی پر غور کرنے اور اُسے ایک شکل دینے میں ہماری ناکامی کی ایک وجہ یہ ہے کہ ہندوستانی انتظامیہ کے کاموں پر نظر رکھنے کا کوئی باضابطہ طریقہ پارلیمنٹ نے نہیں بنایا۔ یہ وجہ اتنی اہم ہے جتنی دوسری وجوہ''۔[2]

IV منافرت

1857 کی بغاوت تک حکمرانوں اور محکوموں کے درمیان ویسے تعلقات تھے جیسے گلہ بان اور گلّے کے مالک اور ملازمین کے ہوتے ہیں۔ حکمراں خود کو برتر نسل کے اراکین تصور کرتے تھے

---

[1] سر تھیدی فاڈلم کی طرف سے لارڈ ایکن کے نام، 30 نومبر 1994

[2] رپورٹ صفحہ 30

اور محکوم اپنی کمتری کا احساس رکھتے تھے۔ کائن کے الفاظ میں ''حالانکہ فخر، تعصب اور گھمنڈ تو پایا جاتا تھا پھر بھی یہ رشتہ تلخی اور نفرت سے پاک تھا۔''[1]

بغاوت کے بعد ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں اور یورپینوں میں ایک بڑی تبدیلی رونما ہوئی۔ مظالم کی کہانیاں جن میں اشتعال اور خطرے کے احساس کی بنا پر بڑی مبالغہ آمیزی سے کام لیا گیا تھا، پورے ملک میں رہنے والے انگریزوں میں پھیل گئی۔ وہ انگلستان بھی پہنچا جہاں انھوں نے غصے اور انتقام کے جذبات کو مشتعل کر دیا۔ لارڈ ایلگن نے اپنے جرنل میں لکھا تھا ''کم تر نسلوں کے درمیان رہنا بڑے خطرے کا کام ہے جب سے میں مشرق آیا ہوں میں نے کسی مرد یا عورت کی زبان سے ایک جملہ ایسا نہیں سنا جو اس مفرد جصے سے مطابقت رکھتا ہو کہ عیسائی مذہب کبھی اس دنیا میں آیا تھا۔ ذکر چاہے چینیوں کا ہو یا ہندوستانیوں کا، نفرت حقارت، غصے اور انتقام کے جذبات کا اظہار کیا جاتا ہے۔''[2]

جی۔ ٹریویلین نے 1866 میں لکھا تھا ''پھر ہمارے کردار کی انتہائی گراوٹ نے ان تاریک بد قماش قبیلوں کو جنم دیا جن کے وجود سے ہم بے خبر تھے۔ انتہائی دردمندی اور شدید غصہ یعنی ایک عظیم قوم کی مجروح خودداری کے احساس نے پوری قوم کو ہلا ڈالا۔ یہ وہ مخاصمانہ خیالات ہیں جن کے خلاف کئی مرتبہ مسٹر برائٹ نے دلائل پیش کئے لیکن ان کی کوشش بے سود ثابت ہوئی۔ خاموشی کے ساتھ اس بات کو تسلیم کر لیا گیا کہ رحم، انسانی ہمدردی اور انسانی جان کا وقار اور تقدس یعنی تمام وہ اصول جو عام حالات میں دائمی حقیقت تسلیم کئے جاتے ہیں اس وقت تک کے لیے بھلا دیے جائیں جب تک ہماری حکومت بحال نہ ہو جائے اور انتقام نہ لے لیا جائے۔''[3]

ٹریویلین نے 1866 میں جو کہا تھا اس کا ثبوت بغاوت کے دوران اینگلو انڈین اخبارات کی تحریروں سے ملتا ہے۔ فرینڈ آف انڈیا نے 8/ستمبر 1888 کو لکھا ''اب اس بات میں کسی شک وشبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ ہماری (برطانوی) حکومت لوگوں کے لیے ضرورت سے زیادہ

---

[1] کاشن ایش، جے۔ ایس، نیا ہندوستان یا بدلتا ہوا ہندوستان (لندن، کیگن پال، دوسرا ایڈیشن 1904)، صفحہ 37

[2] مورے جے، کابڈن کی سوانح، جلد 2 صفحہ 190 حاشیہ ایلگن کے جرنل کا اقتباس، 21/اگست 1817

[3] ٹریویلین، جی او، مقابلے والا، (میکملن، لندن 1866) صفحہ 242

اچھی ثابت ہوئی جو جنگلی جانوروں سے شاید کچھ ہی بہتر ہیں اور یہ کہ ان پر حکومت کرنے کے لیے کمپنی کا پرانہ طریقہ ترک کر دینا چاہئے تھا اور ڈنڈے کے زور پر حکمرانی کی جانی چاہئے تھی۔''

اخبار نے کرنل دیوان بیل کی کتاب غدر کے دوران لکھے گئے خطوط پر تبصرہ کرتے ہوئے سوال کیا ''عیسائی اور بت پرست، مسکن اور ایشیائی، روشنی اور تاریکی یکجا کیسے رہ سکتے ہیں''[1] ہندوستان پر کیسے حکومت کرنی چاہئے اس کے متعلق اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے اس نے لکھا ''وہ طریق عمل جس کی بنیاد غلط نظریات پر قائم ہوتی ہے خود بھی غلط ہوتا ہے۔ فوجی کنٹرول میں کئی قسم کی ڈھیل اور فولاد کے ہاتھوں پر مخمل کے دستانے چڑھانے کی کوشش فی الوقت ختم کر دی جانی چاہئے۔ تین ہزار سال کی تربیت نے ایشیا کے لوگوں کو طاقت ور کا لوہا ماننا سکھا دیا ہے اور ان کے حکمرانوں کو ثابت کرنا چاہئے کہ ان کی فوجی طاقت بے پناہ ہے۔''[2] اس نے حکومت سے کہا کہ وہ ہندوستان پر برطانوی سلطنت کے ایک جز کی حیثیت سے حکومت کرے یعنی ایک مفتوح بدیسی ملک جو کمتر نسلوں کا وطن ہے۔

شدید نفرت کا یہ جذبہ سب انگریزوں میں پایا جاتا تھا چاہے وہ حکام ہوں یا غیر سرکاری لوگ، خون آشام غدار مسلمان پر گالیوں کی بوچھار اور ''کمزور ہندو'' پر طنز و طعن سول ملازمین اور باغدار دونوں کا محبوب مشغلہ تھا''[3] لیکن رفتہ رفتہ حکام کا غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور انھوں نے بغاوت کے واقعات کا اثر اپنی رائے اور عمل پر نہیں پڑنے دیا[4] لیکن نئے حالات پرانے حالات سے مختلف تھے ''ملک کے رہنے والوں میں اب پہلی سی دل چسپی نہیں لی جاتی ہے اور اگلی سی ناقابل یقین جانب داری نہیں دکھائی جاتی ہے۔''[5]

حالانکہ بغاوت نے جن جذبات کو ابھار دیا تھا وہ ٹھنڈے پڑ گئے لیکن حکمراں حلقے کا رویہ

---

[1] فرینڈ آف انڈیا، 15 ستمبر 1859

[2] ایضاً۔

[3] ٹریویلین، جی۔ او، محولہ بالا، صفحہ 262

[4] ایضاً، صفحہ 261

[5] ایضاً، صفحہ 260

سخت ہو گیا۔ خود اعتمادی باقی نہیں رہی تھی۔ کابڈن کا ردعمل تھا کہ ''فاتح اور مفتوح کبھی بھی...... اطمینان اور آرام کے ساتھ نہیں رہ سکیں گے۔''[1] حکمرانوں کے ذہنوں میں مستقبل کے لیے خطرات اور ہندوستانیوں کے خلاف شکوک وشبہات نے جو جڑ پکڑ لی تھی۔ سلطنت کے مزید تحفظ کی فکر پالیسی کو سمت عطا کرتی تھی۔ سترو، ال فنسٹن، مالکم اور مٹکاف کی قسم کے پرانے لوگوں کی طرح اب کوئی اعلیٰ افسر یہ نہیں سوچتا تھا کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب ہندوستان ایک آزاد ریاست بن جائے گا۔ پالیسن نے کہا'' عام طور سے اس بات کو تسلیم کرلیا گیا ہے کہ کمتر نسلوں کو حکومت خود اختیاری کا فن سکھائے گا۔ قدیم لبرل تصور پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور صرف اس وقت تقریروں میں اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جب ملک پر الحاق کے نئے اقدامات کرنے کے لیے زور دیا جاتا ہے''[2] حکمراں جن پالیسیوں پر عمل کر رہے تھے ان پر مندرجہ ذیل مصنفین کے خیالات کا کوئی اثر نہیں پڑا یعنی بوریج کا، جس کا خیال تھا کہ بالآخر ہندوستان کو آزاد ہونا ہے، یا کارلائل کا جو ہندوستان کی سلطنت کو دائمی تصور نہیں کرتا تھا یا رلکے کا جو حکومت اختیاری کو منزل تو تسلیم کرتا تھا لیکن اس کے خیال میں وہ منزل بہت دور تھی۔ ان کا نعرہ تھا کارگزار حکومت نہ کہ حکومت خود اختیاری۔

اس تبدیلی کا عکس حکومت کے کام کے طریقے میں دکھائی دینے لگا۔ ہندوستان کے لوگوں کے لیے ان کے خطرناک نتائج کے باوجود مالیاتی پالیسیاں سامراجی معاشی اور سیاسی مفادات کے تابع ہو گئیں۔ تحفظ کی ضرورتوں نے لوگوں اور فوج کی تنظیم نو میں پھوٹ ڈالنے والے رجحانات کی ہمت افزائی کی۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستانی فوج سامراجی مقاصد کے لیے تو استعمال کی جاسکے لیکن 1857 کی طرح پھر کبھی برطانوی حکومت کے لیے خطرہ نہ بن سکے۔ برطانوی وقار کو برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ محکوموں کو ہمیشہ احساس کمتری میں مبتلا رکھا جائے اور اُسی کے ساتھ برطانوی سلطنت کی طاقت سے انھیں خائف رکھا جائے اور حکمراں نسل کی برتری کو تسلیم کرایا جائے۔ اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر نہ کرنے کی وجہ بتائی گئی کہ وہ اخلاقی طور سے اس

---

[1] سورے، جے، کوبڈن کی سوانح، جلد 2 صفحہ 193

[2] پالیسن، جے۔ اے۔ محولا بالہ، صفحہ 122

کے اہل نہیں ہیں اور نمائندگی اصول کو فرقہ وارانہ اختلافات اور ہم آہنگی کے عدم موجود کی بنا پر نا قابل عمل قرار دیا گیا۔

اُن مفید اقدامات کی وجہ بھی ہندوستان کی بھلائی نہیں تھی جن سے قومی ہم آہنگی بڑھی اور قومی ترقی نے فروغ پایا۔ حقیقت میں وہ بھی سامراجی مقاصد کے پیش نظر کئے جاتے تھے۔ حکومت کے فیصلوں میں عام لوگوں کی خواہشوں اور رایوں کو نا قابل اعتنا تصور کیا جاتا تھا۔ امن و امان کو بحال رکھنا، انصاف کرنا اور قانون کے مطابق حکومت کرنا بذات خود اچھی باتیں تھیں۔ لیکن اسی کے ساتھ سامراجی مقاصد کو کامیابی سے پورا کرنے کے لیے وہ ضروری شرائط کا حکم بھی رکھتی تھیں۔ ریلوں اور آمد و رفت کے دوسرے ذرائع کو ترقی دینے کی جو بھی اور وجہ ہوں لیکن ان کی سب سے بڑی وجہ تھی فوجی اور تجارتی ضرورتوں کو پورا کرنا۔ زراعت کو ترقی دی گئی تاکہ خام مال کی برطانوی ضرورتیں پوری کی جاسکیں۔ صنعتی ترقی پر توجہ دینے کی وجہ تھی برطانوی صنعتوں کو ہندوستانیوں کے مقابلے سے محفوظ رکھنا۔ اعلیٰ تعلیم کو فروغ دیا گیا تاکہ ماتحت ملازمتوں کے لیے عملہ مہیا کیا جاسکے لیکن جس وقت یہ محسوس کیا گیا کہ تعلیم کی ترقی سے آزادی کا تصور فروغ پا رہا ہے تو اس میں رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ تعلیم یافتہ لوگوں کے ساتھ حقارت آمیز برتاؤ کیا جاتا تھا اور انھیں ایسی ''چھوٹی سی اقلیت'' سے تعبیر کیا جاتا تھا جو کسی کی نمائندگی نہیں کرتی ہے اور برطانوی حکومت کے لیے ایک امکانی خطرے کے طور پر انھیں اعتماد کے قابل نہیں سمجھا جاتا تھا۔

انیسویں صدی کے نصف آخر کی تاریخ ہندوستان میں بڑھتی ہوئی مایوسی اور بے چینی کی تاریخ ہے 1858 سے 1885 تک کچھ افراد اور صوبائی ایجنسیوں کے علیحدہ علیحدہ احتجاج کا زمانہ تھا لیکن اس زمانے میں بھی ہندوستانی رہنماؤں نے صوبائی تحریکات کو ایک وسیع قومی تحریک کی شکل دینی شروع کر دی تھی۔

پچیس سال میں اقرار نے انکار کی شکل اختیار کر لی۔ اس کی بہت سی وجوہ تھیں ایک طرف تو حیات نو کا جذبہ تھا یعنی ہندوستان کے ماضی پر فخر اور مستقبل پر اعتماد کرنا سیکھ لیا تھا اور دوسری طرف یہ احساس تھا کہ آزاد ہندوستان پوری انسانیت کے لیے ایک پیغام رکھتا ہے۔ اس فخر اور احساس نے ان طاقتوں کے خلاف جو نئی خود اتحادی کے لیے ایک خطرے کا حکم رکھتی تھیں اپنی شناخت

کے احساس کوزندہ رکھا، آئین خودداری، مادی ترقی، سماجی اتحاد، سیاسی مقدر یعنی سامراج کے مکمل چیلنج پر کئی طرف ہونے والے حملوں کا مقابلہ ہندوستان کوکرنا پڑا۔

یہ بات پہلے کہی جا چکی ہے کہ 1857 کی بغاوت نے انگریزوں کو ہندوستانیوں سے دور کردیا اور محکوموں سے حاکموں کی علیحدگی نے بے مثال صورت اختیار کرلی۔ ان حالات میں شدت پیدا ہونے کی کئی وجوہ تھیں۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ سامراج کے تصور نے فخر اور تعصب دونوں کو بڑھاوا دیا۔ برطانوی حاکموں نے اپنی فوجی کامیابی کو خدا کی مہربانی اوراس امر کا ثبوت سمجھا کہ کمتر نسلوں کو مہذب بنانے کے کام کرکے وہ احکام الٰہی کی تعمیل کرتے رہے ہیں۔

اس تصور کا پرچار کرنے والے دوگروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔ ایک گروہ وہ تھا جواس کو ایک مذہبی فریضہ سمجھتا تھا۔ اس کی ابتدا کی مثال تھا چارلس گرانٹ۔ اس کے بعد ولیم وارڈ منظرعام پر آیا جس کا خیال تھا کہ ہندوستان میں اخلاقی تبدیلی کرنے کے لیے انگریز خدا کے آلہ کار تھے۔ رچرڈ کالڈویل کا، جس نے تامل مطالبات میں بیش قیمت اضافہ کیا، خیال تھا کہ برطانیہ کی کامیابی اس امر کا ثبوت تھی کہ خود برطانوی حکومت کا حامی ہے اورکورال کا مترجم پوپ سمجھتا تھا اقتدار اعلیٰ رکھنے والے لوگوں کے ساتھ ہم آہنگی ہندوستان کی خوشحالی کی ضامن ہے۔ مارش مین، جس کے سپرد کلکتہ یونیورسٹی کے لیے ہندوستان کی تاریخ کی نصابی کتاب تیار کرنے کا کام کیا گیا تھا، برطانوی سلطنت کو پورے ایشیا میں یورپی غلبے کی توسیع کے لیے ایک خداداد ذریعہ سمجھتا تھا۔[1]

دوسرا گروہ نسلی برتری کے وہ نظریات پیش کرتا تھا جن کی رو سے ایشیا، افریقہ اور دوسرے براعظموں کی غیر سفید فام نسلوں پر مغربی اور نورڈک نسلوں کا غلبہ جائز تھا۔ چیمبرلین نے نورڈک۔ نیوٹانک نسلوں کی تعریف کی اور نٹشے نے ''فوق البشر'' کے قصیدے لکھے۔ شاعروں اور ادیبوں نے انگلستان کے مشن اور ''سفید فام انسان کے بار'' کا پرچار کیا۔ ٹینی سن نے کہا۔

''ہمارے وسیع مشرقی (مقبوضات میں
پھیلتا ہوا انگلستان اوراُس کا تخت

---

[1] خلیس، سی، ایش، ہندستان، پاکستان اورسری لنکا کے مورخین (آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، 1961) دیکھئے پروفیسر مزیراور ڈاکٹر کے۔اے۔بال بال ہنچٹ کے مضامین، صفحات 354-332

ایک جزیرہ، ایک ایسا جزیرہ
جو اپنی عظمت سے واقف نہیں ہے''[1]
رڈیارڈ کپلنگ نے اپنے ہموطنوں سے کہا۔
سفید فام انسان کا بار اُٹھالو
اپنے بچوں میں سے بہترین کو وہاں بھیجو
اُنھیں جلاوطن کردو۔
تاکہ وہ تمھارے محکوموں کی ضرورت پوری کرسکیں۔
اپنی بھاری ذمہ داری کے ساتھ
وہ تڑپتے ہوئے اور وحشی لوگوں
یعنی نئے نئے زیر دام آنے والے
اُن روٹھے ہوئے لوگوں کو سہارا دیں جو
نیم خودسر ہیں اور نیم ناسمجھ''

وکٹوریا کے عہد حکومت میں انگلستان کی خوشحالی اور شان وشوکت اپنے نقطۂ عروج پر تھی۔ کرسٹل پیلس کی نمائش (1851) نے ملک کی بڑھتی ہوئی طاقت اور روز افزوں دولت کا سب سے پہلا مظاہرہ کیا۔ جیسا کہ پہلے کہا جاچکا ہے اُنیسویں صدی میں برطانوی سلطنت دنیا کے بڑے حصے کے چوتھائی رقبے پر پھیلی ہوئی تھی۔ دنیا کی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ اُس میں رہتا تھا۔ اُن میں سے 70 فیصدی ہندوستان میں اور 14 فیصدی دوسرے ایشیائی ممالک میں تھے۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ دنیا کی تاریخ کے اس عجیب وغریب واقع پر غذر کرتے وقت چار کروڑ پچاس لاکھ انگریزوں کا سینہ فخر سے پھول جاتا تھا۔

برطانیہ کا بحری بیڑا سمندروں پر حکمرانی کرتا تھا۔ برطانوی صنعتوں نے دنیا کی منڈیوں کو برطانوی مال سے بھر دیا تھا۔ لندن دنیا کی معاشی راجدھانی بن گیا تھا۔ سائنس اور ٹکنالوجی میں انگلستان سب سے آگے تھا۔ بدیسی حکومتوں کے لیے قانون برطانوی مدبر بناتے تھے۔ 1850

---

[1] کپلنگ، آر 1899 Hehite mans's buiden مجموعہ تصانیف

میں ڈان پیسی فیکو کے مطالبات پورے کرنے کے لیے جس کی برطانوی شہریت مشکوک تھی، پامرسٹن نے یونان کی ناکہ بندی کا حکم صادر کیا۔ اُس کے بعد اتحاد کی تحریکوں کو تقویت دینے کی غرض سے اُس نے جرمنی اور اٹلی میں مداخلت کی۔

ڈزرائلی نے سوئز کنال کمپنی میں مصر کے حصے خرید لیے اور اس طرح سلطنت سے بحری راستوں کے تحفظ کے ساتھ مصر کے داخلی معاملات میں مداخلت کا حق بھی حاصل کر لیا۔ 1877 میں اُس نے ملکہ وکٹوریہ کو قیصر ہند کا لقب دے کر اُس کی جوبلی منائی۔ افغانستان کے پہاڑی ملک کو برطانیہ کے حلقہ اثر میں لانے کی غرض سے اُس نے اُسے جنگ پر مجبور کر دیا۔

ڈزرائلی کے جانشینوں نے افریقی سرداروں کا بالکل لحاظ نہیں کیا اور اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق اُن کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ جنوبی افریقہ میں بورس نے اپنی جمہوریہ قائم کر لی تھی۔ انگلستان اُن کے ہیرے اور سونے کو بڑی حریفانہ نظروں سے دیکھتا تھا اور سیسل روڈس نے راس اُمید سے قاہرہ تک پھیلی ہوئی برطانوی سلطنت کی اسکیم تیار کی۔ 1899 میں بورس کے خلاف جنگ شروع کرنے کے بہانے ڈھونڈ لیے گئے اور نٹال اور اُورینج مزی اسٹیٹ کا الحاق کیپ کالونی میں کر لیا گیا۔

سامراج کے سائے ہر طرف پڑ رہے تھے اور اُس کے عمل درآمد کے لیے ہندوستان بہترین میدان تھا۔ چنانچہ یہاں سامراج نے مختلف شکلیں اختیار کیں یعنی محکوم نسل پر اپنی برتری کا اظہار اور خود پسندانہ علیحدگی، ہندوستانیوں کے ساتھ توہین آمیز برتاؤ اور غریب اور نادار لوگوں کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ، ہندوستانیوں کو بااختیار اور ذمہ دار عہدوں سے دور رکھنا اور خود مختاری نمائندہ اداروں کے لیے اُن کی اہلیت سے انکار۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے ابتدائی دنوں سے اُس کی بنیاد پڑ چکی تھی جب کمپنی کے حکام مغل نوابوں کی نقل کرتے تھے اور اُن کی طرح شان و شوکت کی زندگی گزارتے تھے۔ یہ روایت پوری کی پوری اُنیسویں صدی میں برقرار رہی اور سرخ وردی پہننے والے چپراسی، چاپلوس ملازمین اور زندگی کے کروفر نیشن میں داخل ہو گئے۔

انگریزوں کی سماجی علیحدگی پسندی اور ہندوستانیوں کے خلاف جذبات کو انڈین سول سروس

کے لوگوں کو دی جانے والی تعلیم تقویت پہنچاتی تھی۔ ہیلی بری کالج کے طالب علموں کو جیمس مل کی تاریخ ہند پڑھائی جاتی تھی اور مدتوں تک ہندوستان کے متعلق انگریزوں کی معلومات کا ماخذ وہ تاریخ بنی رہی۔

بغاوت کے بعد کے زمانے میں ہندوؤں کی مخالفت کے جذبے کو مسلمانوں کے خلاف دشمنی کے احساس نے دبایا تھا۔ سر ہنری ایلیٹ کی تاریخ ہند نے، جس نے آنے والے مؤرخوں کی نسل کو عہد وسطیٰ کی تاریخوں کے لیے، مواد فراہم کیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کو خراب کر دیا۔ برطانوی تعصّبات کو تقویت پہنچانے میں بڑا اثر انگیز رول ادا کیا۔

مل نے اپنی تاریخ میں ہندو تہذیب اور ہندو کردار کی مذمت کرنے کی غرض سے تمام ماخذ کھنگھال ڈالے اور پورا زور قلم صرف کر دیا۔ اس ملک کی تاریخ میں اُسے ''بغاوتوں، قتل عام اور وحشیانہ فتوحات''[1] کے سوا کچھ اور نظر نہیں آیا۔ اُس کی ریاست میں ''کمزور اور اُوباش وحشت کی وہ قابل نفرت صورت نظر آتی ہے جو ہندوؤں کی طرح کے مجہول لوگوں کی حکومت کا ایک نظری خاصہ ہے۔''[2]

ہندو سماج کو ''ماتحتی کے ذلت آمیز اور تباہ کن نظام''[3] سے تعبیر کیا گیا ہے، ذات کے لیے کہا گیا ہے۔ ''ایسا ادارہ جو انسانی کردار کے سدھار کے راستے میں ایسی رکاوٹ ہے جیسی کہ تلون مزاجی اور خود غرضی نے شاید پہلے کبھی نہ کھڑی کی ہو۔''[4] ہندوؤں کی مذہبی تنظیم کی ''بنیاد ایسی عظیم اور تکلیف دہ توہم پرستی ہے جیسی کہ شاید ہی انسانوں کے کسی گروہ کی ذلت کا باعث بنی ہو[5]'' اخلاقی کردار کی حد تک ہندوؤں اور مسلمانوں میں مشترک خرابیاں تھیں ''وہی خلوص کا فقدان، وہی دروغ گوئی اور دغابازی، دوسروں کے احساس کے تعلق سے وہی بے نیازی، وہی نمائش بینی اور

---

[1] مل اور ویلسن، برطانوی ہند کی تاریخ، جلد، صفحہ 125

[2] ایضاً، صفحہ 377

[3] ایضاً، صفحہ 131

[4] ایضاً، صفحہ 343

[5] ایضاً، صفحہ 133

ضمیر فروشی دونوں کے مشترک خاصے ہیں۔''[1]

ایلیٹ نے اپنے ''اصل مقدمے'' میں ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا ذکر مختصراً یوں کیا تھا ''عام لوگوں کی بدنصیبی اور نا اُمیدی کے گہرے اندھیروں میں پھینک دئے گئے ہوں گے۔ اس جلد میں جو چھوٹے موٹے اقتباسات دیے ہوئے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی مخالفت کرنے کی بنا پر ہندو قتل کئے جاتے تھے جلوسوں، عبادت اور طہارت کی عام مخالفت تھی اور اس کے علاوہ بھی غیر رواداری کے مظاہرے کئے جاتے تھے مثلاً بت توڑے جاتے تھے، مندر منہدم کر دیے جاتے تھے، بالجبر اسلام قبول کرنے اور شادی کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا، جلاوطنی اور قرقی، قتل اور قتل عام اور اُن ظالموں کی شراب نوشی اور عیاشی عام تھی جیسے جو ہندوؤں پر حکومت کرتے تھے۔ مندرجہ بالا واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تصویر میں رنگ آمیزی نہیں کی گئی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ ہمیں یہ تصویر اُن لوگوں کی تحریروں سے بنانی پڑتی ہے جنھوں نے واقعات بیان کئے ہیں اور جو ایسا لگتا ہے کہ اچھائیوں کو پسند کرتے تھے اور نہ برائیوں کو ناپسند۔ دوسرے ملکوں میں بھی اس قسم کے مظالم نظر آتے ہیں لیکن کم از کم کچھ لوگ اُن کا ذکر غصے اور نفرت کے ساتھ کرتے ہیں۔''[2]

اُس کے بعد اُس نے تاریخ لکھنے کی وجہ ان الفاظ میں بیان کی۔ ''وہ (ایرانی مؤرخین) ہماری ہندوستانی رعایا کو ہماری حکومت کے انصاف اور ترقی کے فوائد سے باخبر کریں گے۔ اگر اُن سے کوئی سبق ''سیکھتا ہے تو ہمیں مسلم ہندوستان کے متعلق بلا سوچے سمجھے بیانات'' دینے سے گریز کرنا چاہئے جو اکثر ایسے لوگ دیتے رہتے ہیں جو یقیناً جاہل نہیں کہے جاسکتے ہیں۔ وہ کردار جو اس وقت اپنے کارناموں کی شان وشوکت اور لگاتار فتوحات کی بنا پر مشہور ہیں۔ اگر اُن کے چہروں سے چاپلوسی کی نقاب ہٹا دی جائے اور خطابت کاری سے اُنھیں محروم کر دیا جائے اور اصل رنگ میں پیش کیا جائے تو وہ انسانیت کے دامن پر ایک بدنما دھبا نظر آئیں گے۔ ہمیں اُن بابو لوگوں کی

---

[1] ایضاً، صفحہ 366

[2] ایلیٹ اور ڈرسن The History of India of told by Its Own Historians جلد سر ہنرے ایلیٹ کا اصل مقدمہ، صفحہ XXI

بات نہیں سننی چاہیے جنھیں ہماری حکومت میں بڑی آزادی اور دوسری ایسی سیاسی مراعات جو کبھی کسی محکوم قوم کو نہیں عطا کی گئیں لیکن پھر بھی وہ وطن پرستی اور اپنی ذلت کے راگ گاتے ہیں۔ اگر وہ اُن جلدوں میں سے، جن کا ذکر بیان کیا جارہا ہے۔ کسی ایک کو پڑھ لیں تو اُن نوجوان سیاست دانوں کو بڑی جلدی معلوم ہوجائے گا کہ تاریکی کے جن دنوں کی یاد میں وہ آہیں بھرتے ہیں۔ اُن دنوں میں اگر وہ مضحکہ خیز فنتامسیوں کا ایک جملہ بھی زبان سے نکالتے تو ہماری حقارت آمیز خاموشی کے بجائے اُنھیں پگھلے ہوئے سیسے یا سولی سے سابقہ پڑتا۔ ہمیں اب لگان معاف لگان داری کے متعلق چیخ پکار پر کان نہیں دھرنا چاہیے۔ جب ہر صفحے پر اس بات کا ذکر ملتا ہے کہ اُس زمانے میں کوئی ایسی لگان داری نہیں تھی جسے فطری یا قانونی اعتبار سے واپس نہیں لیا جاسکتا ہو اور جو عملی طور سے بار بار واپس نہ لی جاتی ہو۔ اگر کوئی باحوصلہ حاکم اپنے مغل پیش رووں کے ''انتہائی فیض رساں'' طریقوں کی پیروی کی خواہش رکھتا ہے تو اُس کے حوصلے پست کرنے کے لیے اتنا بتادینا کافی ہے کہ محلوں، سرایوں، غلام گردشوں، مندروں اور مقبروں کے علاوہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی نقل اُتاری جاسکے۔ وہ دیکھے گا کہ اگر ہم دہلی کے شہنشاہوں کی لمبی فہرست میں سے تین نام نکال دیں تو لوگوں کی بہبود و خوشحالی کا خیال اُن میں سے کسی کو نہیں تھا اور کچھ پلوں اور سرایوں کے علاوہ جو محض شاہی فوجوں کی آمد و رفت کے لیے بنائے گئے تھے، اسے کوئی چیز ایسی نظر نہیں آئے گی جس کی تعمیر میں خودغرضی شامل نہ ہو۔ ہمارا یہ ارادہ نہیں ہے کہ اُن کی عمارتوں کے حُسن اور شان و شوکت سے انکار کریں لیکن اُن کی تعمیر کی وجہ تھی خودنمائی اور کچھ مندرجہ بالا چیزوں کو چھوڑ کر اُن میں کوئی ایک بھی عام لوگوں کی بھلائی کی غرض سے نہیں بنائی گئی تھی۔''[1]

ہندوستان مخالف جذبات کے خطرناک نتائج حکومت کے اراکین اور ہندوستان آنے والے لوگوں کی نظروں سے چھپے نہیں رہے۔ 1860 ہی میں سر چارلس وڈ نے کیننگ کے نام کئی خطوں میں اپنے خدشات کا اظہار کیا تھا۔ کیننگ کے نام ایک خط مورخہ 2 ستمبر 1880[2] میں اُس نے اُمید ظاہر کی تھی کہ کیننگ اُس نسل مخاصمت کے احساس کو ختم کرنے میں کامیاب ہوسکے گا جو

---

[1] ایضاً، صفحہ XXII اور بعد کے صفحات

[2] وڈ کے کاغذات سر چارلس وڈ کا خط اول کیننگ کے نام 9 ستمبر 1860

بڑھتا ہی جارہا تھا۔ 9/اکتوبر، 1861[1] کو اس نے دو ججوں کے طریقہ کار پر اپنی پریشانی کا اظہار کیا تھا اور اُن مقدموں کے فیصلوں میں، اُس کی جانب داری کو شرانگیز قرار دیا تھا جو ہندوستانیوں اور یورپینوں کے درمیان چلے تھے۔ ایک خط میں ایلکن کو اُس نے لکھا تھا ''میں نے سنا ہے کہ ہمارے حکام اب ہندوستانیوں کے ساتھ مہربانی اور تواضع کا ویسا برتاؤ نہیں کرتے تھے (جیسا غدر سے پہلے کرتے تھے)۔

یہ کہ ایک برترنسل، ایک شریف انسان اور انگریزی شرافت کے نمونے کے طور پر ہم ہندوستانیوں کی نظروں میں گرتے جارہے ہیں''۔[2]

جب ایلگن نے ایک انگریزی سپاہی روڈ کو، جس نے ایک ہندوستانی کو قتل کردیا تھا ''کئی دفعہ مقدمہ چلانے کے بعد پھانسی دلوادی تو وڈ نے اس بات پر خوشی ظاہر کی کہ اُس نے ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کا اثر قبول نہیں کیا۔ اُس نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ ''پست ذہنیت انگریزوں میں یہ جذبہ بہت زیادہ پایا جاتا ہے کہ ہندوستانیوں کو کمتر نسل سمجھا جائے اور جی بھر کے ستایا جائے۔''[3]

ایلگن نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو جو خط لکھا اُس میں روڈ کے مقدمے کے سلسلے میں اعتراف کیا کہ ''ہندوستانیوں اور یورپینوں کے ساتھ یکساں انصاف کرنا بہت دشوار ہے۔''[4]

سرجان لارنس نے کہا ''حقیقت میں اُن دونوں طبقوں کے درمیان بڑی چوڑی خندق ہے اور یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ وہ اور چوڑی ہورہی ہے یا نہیں۔ ان حالات کا سبب ہے غدر اور اُس کے بعد ہونے والی تبدیلیاں۔ میں اُسے ایک بڑا خطرہ سمجھتا ہوں جو ہندوستان میں ہماری حکومت کو درپیش ہے۔''[5]

---

[1] ایضاً، 19/اکتوبر 1861

[2] وڈ کے کاغذات سر چارلس ووڈ کا خط لارڈ لا کیننگ نام، 26/جون 1862

[3] ایضاً یکم اگست 1863

[4] ایگلن کے کاغذات۔ ایگلن کا خط سر چارلس وڈ کے نام، 22/جون 1862

[5] لارنس کے کاغذات، سرجان لارنس کا خط لارڈ کرین یوزی کے نام، 19/دسمبر 1869

ایک اور خط میں نے لکھا تھا ''اُس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان مخالفت کی ایک بڑی وجہ ہے مذہب۔ اس طرح نسل، رنگ اور سماجی طور طریق بھی اس کی وجہ ہیں۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ہمارے ہم وطنوں کا انفرادی طریق کار بڑا اثر ڈالتا ہے۔ چاہے وہ اچھا ہو یا برا۔''[1]

لارڈ لٹن نے ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کے متعلق لارڈ سیلس بری کو لکھتے ہوئے کہا تھا ''لیکن جہاں تک تنگ نظری اور سختی کا تعلق ہے وہ یقیناً امریکہ کے جنوبی باشندوں اور جمیکا کے سفید فام مالکان اراضی کے بہت مشابہ ہیں۔''[2] تین ہفتے بعد فلر کے مقدمے کا ذکر کرتے ہوئے اُس نے سکریٹری آف اسٹیٹ کو لکھا ''چونکہ فلر کے مقدمے کی بنا پر مجھے اُن مقدموں میں عدالتوں کے حالیہ فیصلوں کو غور سے دیکھنا پڑا جن کا تعلق ہندوستانیوں سے تھا اور مجھے بین ناانصافی دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ ہائی کورٹ کی منظوری کے بعد اپنے سائس کے قتل اتفاقی کے سلسلے میں فلر پر 30 روپیہ جرمانہ کیا گیا تھا لیکن کچھ دن پہلے ایک ہندوستانی کو چڑھانے کے لیے جس دوام بعبور دریائے شور کی سزا دی گئی۔''[3] ایک مہینے بعد اُس نے مزید لکھا ''نچلے طبقوں کے ہندوستانیوں کے ساتھ جو مظالم روا رکھے جاتے ہیں اور ہندوستانیوں کے بالائی طبقوں کی طرف حکام جس قسم کا رسمی رویہ اختیار کرتے ہیں اُس کے بعد تعجب تو یہ ہے کہ ہماری حکومت اور زیادہ غیر مقبول کیوں نہیں ہے...... مجھے یقین ہے کہ ہندوستان میں ہمیں جن خطرات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اُن میں سب سے بڑا خطرہ سفید فام لوگوں کا پیدا کردہ ہے۔''[4]

لارڈ کرزن نے لارڈ جارج ہملٹن کے نام ایک خط میں سول ملازمین کے معیاروں میں گراوٹ پر اپنی پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے حکام کی لوگوں سے بڑھتی ہوئی دوری پر اُس کی توجہ دلائی۔ اُس نے لکھا ''انگلستان سے دلچسپی بڑھنے کے معنی ہیں کہ اس قدر اخلاقی قوت یہاں

---

[1] ایضاً، 4/جنوری 1867

[2] لٹن کے کاغذات، لارڈ لٹن کا خط لارڈ سیلس کے نام 5/اگست 1876

[3] ایضاً، 27/اگست 1876

[4] ایضاً، 28/دسمبر 1976

کم ہو جائے گی۔ خود ہندوستانی بھی اس سے واقف ہوتے جا رہے ہیں۔ وہ اپنے اخباروں میں مسلسل لکھتے رہے ہیں کہ صاحب اب پہلا سا نہیں رہا اور یہ کہ دونوں نسلوں کے باہمی تعلقات بہتر ہونے کے بجائے بدتر ہو رہے ہیں۔"[1] کرزن میں جو بھی اور خرابیاں ہوں لیکن "ناانصافی سے وہ سخت نفرت کرتا تھا" اور چاہتا تھا "کہ حق وصداقت کا بول بالا ہو اور مجرم کو سزا ملے"[2] اُس کی وجہ سے ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کے اخبار اُس سے ناراض ہو گئے اور اُس پر سخت حملے کرنے لگے۔

ان بڑے بڑے افسروں نے جو کچھ کہا ہے اُس میں اور شہادتوں کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ کوبڈن نے برائٹ کے نام ایک خط میں یہ واقعہ بیان کیا ہے "اتفاق سے مجھے کچھ ایسی خواتین سے ملنے کا موقعہ ملا جو کچھ دن پہلے ہندوستان سے واپس آئی تھیں جہاں وہ باہر گاؤں میں رہنے کی عادی تھیں اس لیے کہ اُن کے شوہر ہندوستانیوں کی فوجوں میں افسر تھے۔ مجھے اُن کی گفتگو سے معلوم ہوا کہ ہماری ہندستانی رعایا کو عام طور سے نگر و حبشی، کہا جاتا ہے"[3] ایک اور خط میں اُس نے اعتراف کیا "اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ یہ کام ہندوستانی حکومت کی اصلاح، کسی طرح نہیں ہو سکتا حالیہ اور موجودہ واقعات نے دونوں نسلوں کے درمیان ایسی خلیج حائل کر دی جس کو پاٹا نھیں جا سکتا ہے۔"[4]

ٹریویلین کا کہنا تھا "ہندوستانی عام طور سے تیسرے درجے میں سفر کرتے ہیں...... اگر صاحبوں کا خوف، جس کو بے بنیاد نہیں کہا جا سکتا، مانع نہ ہو تو زیادہ تر دولت مند ہندو غالباً فرسٹ کلاس میں سفر کرنا چاہیں گے۔"[5]

ٹریویلین اور کچھ دوسرے افراد نے ہندوستانیوں کی توہین اور مار پیٹ کے واقعات لکھے

---

[1] لارڈ کرزن کا خط جارج ہملٹن کے نام 21/مئی 1902

[2] کاٹن ایچ۔ ایس۔ جے محولہ بالا، صفحہ 50

[3] مورے۔ جے، کابڈن کی سوانح جلد 3 صفحہ 189۔ مسٹر برائٹ کے نام خط، 27/اگست 1857

[4] خط مورخہ 22/ستمبر 1857، ایضاً صفحہ 193

[5] ٹریویلین، جے۔ مقابلہ کرنے والہ، صفحہ 24

ہیں۔ٹریویلین نے سونی پور کے میلے میں خود دیکھا کہ ایک انگریز باغدار نے اچھے کپڑے پہنے ہوئے دولت مند اور باعزت ہندوستانیوں کو ایک شکاری کوڑے سے زدوکوب کیا۔اُس نے حالات کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

''ایک شخص جتنا زیادہ اس ملک میں رہتا ہے اُتنا ہی اُس کا یقین پختہ تر ہوتا جاتا ہے کہ اُس ملک میں فاتحوں اور محکوموں کا باہمی اختلاط ایک دوراز کار تصور ہے جسے آٹو پیا سے تعبیر کیا جانا چاہئے۔'' اُس نے مزید کہا ''واقعہ یہ ہے کہ ہمارے کردار میں جو نسلی گھمنڈ اور فخر رچا بسا ہوا ہے وہ افسوسناک ہے اور اس کو محض اعلیٰ تعلیم اور روشن خیالی کے ذریعے دور کیا جا سکتا ہے۔سماجی اعتبار سے جتنا نچلا طبقہ ہوگا اتنے ہی زیادہ اس مضر جذبے کی علامتیں اس میں نظر آئیں گی۔''[1]

گرہم نے سرسید احمد خاں کی سوانح میں مسٹر جسٹس محمود کے حوالے سے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ جب چیف جسٹس سر چارلس ٹرنر کے ساتھ وہ مدراس کلب گئے تو کلب کے ایک ممبر نے چیف جسٹس کی موجودگی میں مسٹر محمود سے کہا کہ ''کسی ہندوستانی کو اس کلب میں آنے کی اجازت نہیں ہے'' اور دروازہ بند کر دیا۔جسٹس رانا ڈے اور جسٹس چندر اور کر کی طرح کے قابل تعظیم رہنماؤں کی ریل کے سفر کے دوران معمولی انگریزی سپاہی بے عزتی کرتے تھے۔

جی۔ایف آبت نے ہندوستان میں اپنے تجربات کا ذکر اس طرح کیا ہے ''میں نے کچھ نوجوانوں کو (ہندوستان کے نوجوان سرکاری افسروں کو) جو لندن مقامات سے آتے ہیں عمر رسیدہ ہندوستانی امرا کے ساتھ ویسا برتاؤ کرتے دیکھا ہے جیسا کوئی شریف انسان اپنے ملازم کے ساتھ بھی نہیں کرے گا۔''[2] ایچ۔ڈبلیو لوئس نے دیکھا کہ ریلوں، ہوٹلوں، کلبوں، بنگلوں اور سرکاری دفتروں میں ہندوستانیوں کے ساتھ بہت غیر شریفانہ سلوک کیا جاتا تھا ''اتنا برا کہ انگلستان میں اس کو ناقابل یقین حد تک شرمناک سمجھا جائے گا۔''[3]

کہا جاتا ہے کہ یونین تمبا لوجیکل سی سیزی کے صدر ڈاکٹر چارلس کتھ برٹ حال نے جنوری

---

[1] ایضاً، صفحات 35-349

[2] سندرلینڈ، جے۔ٹی، غلام ہندوستان، صفحہ 73

[3] نونسن، ایث۔ڈبلیو، New spirit in India صفحات 8-1110

1908 میں نیو یارک کے بار ایسوسی ایشن کلب ہاؤس کے جلسے میں کہا تھا ''میں نے نہایت ذہین اور با کردار ہندوستانیوں کو جو میرے نجی دوست ہیں ہندوستان میں انگریزوں کے ہاتھوں ذلیل ہوتے دیکھا ہے۔''[1]

اس زمانے کے اخبارات انگریزوں کے ہاتھوں ہندوستانیوں کی ذلت اور زدوکوب کے واقعات سے بھرے ہوئے تھے انگریزوں کے اخبارات عام طور سے مجرموں کی حمایت کرتے تھے اور جرمانوں کی رقمیں ادا کرنے کے لیے چندہ کرتے تھے۔ ''جو شخص اپنے لوگوں کا ساتھ دیتا ہے اُسے بھیڑ سے ڈرنا چاہئے۔''[2] یہ مشورہ ایک اہم اینگلو انڈین ہفتہ وار نے لارڈ کرزن کو دیا تھا جس کو ایک ایسے انسان سے تعبیر کیا جاتا تھا جس کا دل ہمدردی کے جذبے سے خالی ہے اور جو اس برطانوی فطری مہارت سے محروم جس سے حقیقی مدیر پہچانا جاتا ہے۔

فرینڈ آف انڈیا نے بھی، جو سب سے زیادہ متوازن انڈین اخبار سمجھا جاتا تھا اس وقت رجعت پسندانہ رویہ اختیار کر لیا جب البرٹ بل پر نزاعی بحث شروع ہوئی۔ اس نے نسلی امتیاز کے اصول کی حمایت کی اور حکومت کو مشورہ دیا ''دولت مشترکہ کو نقصان پہنچائے بغیر جس حد تک ممکن ہو اُسے ان مختلف نسلوں کے حق، استحقاق اور رواج کا احترام کرنا چاہئے جو سلطنت میں آباد ہیں۔''[3]

دوسری طرف ہندوستانیوں کے اخبار ہندوستانیوں پر انگریزوں کی زیادتیوں اور ذلت آمیز برتاؤ کے خلاف غم و غصے کا اظہار کرتے تھے۔ ہندوستانیوں کے ردعمل کو ظاہر کرنے کے لیے بنگال سے کچھ اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ حکمرانوں کے رویے کے متعلق اس کی رائے تھی ''حکمرانوں اور محکوموں کے درمیان خلیج وسیع تر ہو گئی ہے حکمراں طبقے عام لوگوں کے متعلق ویسا احساس نہیں رکھتے تھے جیسا پہلے تھا اور محکوموں کے دلوں میں اپنے مالکوں کے تعلق سے اگلا سا اعتماد نہیں ہے۔''[4]

---

[1] سندرلینڈ، جے۔ ٹی، محولہ بالا، صفحہ 72

[2] کامت ایچ، ایس، جے نے ذکر کیا، محولہ بالا، صفحہ 5

[3] فرینڈ آف انڈیا، اداریہ، 8/ستمبر 1883

[4] بنگالی، 6/ستمبر 1873

اگلے شمارے میں اس نے لکھا'' ہماری حکومت کا نوکر شاہی کردار اسے ان باتوں پر زیادہ توجہ نہیں دینے دیتا ہے جنھیں وہ لوگوں کی فرضی شکایتیں سمجھتی ہے وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ لوگوں کے تعلق سے وہ جو کچھ بھی کرتی ہے وہ بہر حال درست اور مناسب ہوتا ہے۔ ملک پر حکومت کرتے وقت ہندوستانیوں سے زیادہ انگریزوں کا مفاد پیش نظر رہتا ہے۔''[1] عام حالت نے ہر جگہ ہندوستانیوں اور انگریز افسروں کو بے چینی کا شکار بنا دیا ہے۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ یہ احساس عام ہے کہ حالات بے قابو ہو چکے ہیں اور اسی طرح یہ اندیشہ عام طور سے محسوس کیا جارہا ہے کہ طوفان آنے والا ہے۔''[2]

ایک انگریز سپاہی کے ہاتھوں دو مسلمان مزدور اور ایک دھوبی کے عمداً قتل پر اظہار رائے کرتے ہوئے اس نے لکھا'' اس کے لیے (انگریزوں کے لیے) صرف ایک سفید فام انسان ہی انسان ہوتا ہے۔ لیکن ایک کالا آدمی محض قابل نفرت جانور ہے جسے 1877 کے واقعات نے اور زیادہ قابل نفرت بنا دیا ہے۔'' اس کے بعد اس نے ان برطانوی جیوریوں کی، جو انگریز قاتلوں کو رہا کر دیتی تھیں، ان الفاظ میں ملزم گردانا '' حالانکہ یورپین برطانوی رعایا نے بہت سے قتل کئے ہیں لیکن صرف دو یورپینوں کو پھانسی دی گئی ہے جن کے نام مور اور روڈ ہیں۔ یورپین قاتلوں کو جو سزا سے بریت حاصل ہے اس کی ذمہ داری یورپین جیوریوں پر ہے جو انصاف پر اپنی نسلی وقار اور برتری کو ترجیح دیتی ہیں۔''[3]

فلر کے مقدمے کا ذکر کرتے ہوئے، جس میں مجسٹریٹ'' عمداً اس جرم کے ارتکاب کے لیے جس کو مجروح کرنے (قتل کو کم کر کے پیش کرنے) سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔'' 3 روپیہ جرمانہ کیا تھا اور ہائی کورٹ نے اس سزا کو ناقابل اعتراض قرار دیا تھا، بنگالی نے سخت تنقید کی جس میں بڑے طنز سے کام لیا گیا تھا اور مضحکہ انداز سے کیا تھا کہ'' کوڑے مارنے والوں کے اسٹیچو بنائے جائیں اور مندروں کو قاتلوں کے ناموں سے منسوب کیا جائے۔''[4]

---

[1] ایضاً، 19 رجنوری 1875

[2] ایضاً، 7 راگست 1875

[3] ایضاً، 17 رجون 1876

[4] ایضاً، 19 راگست 1876

ان اقتباسات سے جن میں بے انتہا اضافہ کیا جا سکتا ہے، ظاہر ہوتا ہے کہ حاکموں اور محکوموں کے درمیان خلیج کتنی چوڑی ہو چکی تھی۔ اُن سے ثابت ہوتا ہے کہ انیسویں صدی میں صدی کا سامراج انسانی صفات اور نسلی تعاون کے تصورات کا مخالف تھا۔ حکومت کے ایک ایسے نظام میں جس میں حکمرانوں پر محکوموں کی ذمہ داری نہیں تھی اور ان کے اختیارات کا سرچشمہ ملک کے باہر تھا محض فوجی طاقت ہی حکومت کی بنیاد بن سکتی تھی اس کی قانونی شکل اور سویلین خدوخال کے باوجود ہندوستان پر برطانیہ کی حکومت حقیقت میں فوجی نوعیت کی تھی۔ ایک فوجی حکومت میں رعایا کی اطاعت گذاری کو برقرار رکھنے کے لیے طاقت کا وجود اور اس کا مظاہرہ لازمی تھا۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ حکمراں نسل سے تعلق رکھنے والے سفید فام لوگوں کی برتری غیر سفید فام محکوموں کے ذہن نشیں کرائی جائے۔ مردم آزاری، دھمکی، بدتمیزی اور ستائی کی سامراجی طریق عمل اور نظریے کی قدرتی خصوصیتیں تھیں۔ کچھ شریف انسانوں کو چھوڑ کر یورپین اس سامراجی اصول کے پابند تھے جیسا کہ کاٹن نے 1904 میں کہا تھا بدقسمتی سے یہ ''اس امر کی خطرناک علامت ہے کہ ہندوستان کے حکام بھی غیر سرکاری لوگوں کی طرح ہندوستانیوں کے خلاف تعصّبات کے پوری طرح شکار ہو چکے ہیں۔'' اُس نے مزید کہا ''اب ہمارے پیش نظر ایسی صورت حال ہے جس میں ایک طرف محض ہندوستانی ہیں اور دوسری طرف سرکاری اور غیر سرکاری دونوں قسم کے انگریز ہیں۔''[1]

برطانوی حکومت کسی دوسری نوعیت کے مقابلے میں جس چیز پر خود آگاہی کے جذبے کی بیداری اور ذلت و خواری اور محرومی کے احساس کی ذمہ داری ہے وہ ہے انگریزوں اور ہندوستانیوں کے درمیان پایا جانے والا اس قسم کا رشتہ۔ لوگ محسوس کرنے لگے تھے سب سے بلند قامت ہندوستان بھی ایک معمولی انگریز سپاہی، تجارتی کلرک، باغدار کے نائب، ریل کے ٹکٹ کلکٹر اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں کے ہاتھوں پر برملا توہین سے محفوظ نہیں ہے۔ قدرتی طور سے وہ اسے ناپسند کرتے تھے اور چونکہ اس کا تدارک ممکن نہیں تھا اس لیے اُن میں بے چارگی کا جذبہ پیدا ہونا تھا جو نتائج سے بے نیاز ہو کر تشدد پر آمادگی میں معاون ہوتا تھا۔ چونکہ بہت سے

[1] کاٹن، ایچ۔ جے۔ ایس، محولہ بالا، صفحات، 51-50

ہندوستانی انگلستان جاچکے تھے، برطانوی خوش خلقی سے واقف تھے اور اُن کے گھروں میں برطانوی مہمان نواز کا تجربہ رکھتے تھے اس لیے انگلستان میں رہنے والے انگریز اور ہندوستان میں پائے جانے والے انگریز کے فرق کو بڑی شدت سے محسوس کرتے تھے اور مجبوراً اُنھیں اس نتیجہ پر پہنچنا پڑتا تھا کہ اُس کی اصل وجہ سامراجی حکومت ہے۔ اس خرابی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی خواہش ناگزیر تھی۔

V۔ ہندوستانیوں کی شکایتیں

ہندوستان میں رہنے والے انگریز فرقے کے اراکین کے طور طریقے نے جس عام نفسیاتی تنفر کو جنم دیا اُسے دو قسم کی شکایتوں نے تقویت پہنچائی۔ ایک شکایت کا تعلق تھا حکومت کی معاشی پالیسی سے اور دوسری کا لوگوں کی سیاسی توقعات کو پورا کرنے سے اُس کے انکار سے۔

حکومت کی سیاسی پالیسی اور اُس کے نتائج کا ذکر ایک پچھلے باب میں کیا جاچکا ہے۔ عام لوگوں کی غربت و افلاس، اُن کی بدحالی اور بار بار پڑنے والے قحطوں کے دوران اُن کے ملکوں نے وسیع پیمانے پر شدید بے چینی پیدا کردی تھی۔

متوسط طبقہ جس کی جڑیں گاؤں میں پھیلی ہوئی تھی، قدرتی طور سے بہت پریشان تھا برطانوی حکام کے طعن وطنز کے باوجود جن کا کہنا تھا کہ ہندوستانی رہنما زرعی مسائل سے واقفیت نہیں رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بدیسی حکمرانوں کے مقابلے میں عام لوگوں کے زیادہ قریب اور اُن کے حقیقی بہی خواہ تھے۔ حکومت کی مخالفت کا انھوں نے مقابلہ کیا اور عام لوگوں کی حالت کو سدھارنے کے لیے مسلسل تگ ودو کرتے رہے۔

دوسری شکایت کا تعلق سیاسی اُمور سے تھا۔ حکومت کی ناانصافیوں اور لوگوں کی خواہشات کی طرف اُس کی مکمل غفلت نے ہندوستانی رہنماؤں کے رویے کو متاثر کیا۔ اُنیسویں صدی کے اختتام ہی سے حکومت کی نافرمانی اور مزاحمت کی تنظیم کے منصوبے بننے لگے تھے۔ ہندوستانیوں کی درخواستوں کے سلسلے میں کرزن کے نخوت آمیز رویے، ہندوستانی کردار کی تحقیر اور ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقوں کا اثر کم کرنے کے اقدامات نے آزادی کی تحریک کو نئی توانائی بخش دی۔

ہندوستان پر حکومت کرنے کے تعلق سے برطانوی پالیسی کی بنیاد دو باتوں پر قائم تھی، یعنی سامراجی مفادات کا اقتدارِ اعلیٰ اور حکومت خود اختیاری کے لیے ہندوستانیوں کی ''نااہلیت''۔ اُن کی بنا پر وہ دوہری پالیسی پر عمل کرتے تھے۔ پہلی بات تو یہ کہ ایسی قابل اعتماد فوجی طاقت ہو جو بیرونی اور اندرونی دونوں قسم کی چنوتیوں کا پوری طرح مقابلہ کر سکے اور دوم یہ کہ ایک کارگزار انتظامیہ کے نظام کا قیام۔ چونکہ فوجی طاقت کو ایسا ہونا چاہیے تھا کہ وہ مخالف کا کامیابی کے ساتھ مقابلہ کر سکے۔ اس لیے 1857 کی بغاوت کے بعد اُس کے تجربے کی بنیاد پر فوج کی تنظیم نو کی گئی۔

لیکن چونکہ بڑی فوجی طاقت یا فرقہ وارانہ یا طبقاتی اختلافات ہمیشہ کے لیے سلطنت کی ضمانت نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے ضروری تھا کہ اُس کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لیے آبادی کے کچھ حصے برفسادرغبت حکومت کی اطاعت کریں لیکن برفسادرغبت اطاعت کروانے کے لیے ایک اچھی حکومت ہونی چاہیے۔ جو لوگوں کو یقین دلا سکے کہ حکمراں واقعی اُن کے بہی خواہ ہیں اور مادی اور اخلاقی ترقی کرنے میں اُن کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ سامراجی مقاصد حاصل کرنے اور رعایا کو مطمئن رکھنے کے لیے ایک اچھی حکومت اور ترقی پسند اقدامات ناگزیر تھے۔

لیکن برطانوی حکومت تضادات کا شکار تھی سامراجی مقاصد اُس کو ایک سمت میں کھینچ رہے تھے اور رعایا کے اہم مطالبات۔ دوسری سمت اُنیسویں صدی میں سامراج اور لبرلزم میں ٹکراؤ ہو رہا تھا لیکن جہاں تک ہندوستان کا تعلق تھا وہاں سامراج کا بول بالا رہا۔

برطانوی سامراج کو جو ہندوستان پر لادا گیا تھا اور جس کو فوج اور سول ملازمت چلا رہی تھی، لوگوں کے سماجی اور مذہبی اختلافات کے استحصال نے زیادہ مضبوط اور محفوظ بنا دیا۔ جو ہندوستانی آزادی کے خواہش مند تھے اُنھوں نے قدرتی طور سے اُن ستونوں پر حملے کئے جو بدیسی حکومت کو سہارا دے رہے تھے اور قومی تحریک نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو بڑھانے اور علیحدگی پسند کے رویوں کو ختم کرنے کی کوشش کی تاکہ حکومت اختیاری کے لیے اتحاد کی ضروری بنیاد فراہم کی جا سکے۔

برطانوی حکومت کی فوجی بنیاد

وِنس لو نے سامراج کا نمونہ میں لکھا ہے ''عسکریت اور سامراج میں یکساں فکر و عمل کے واضح نمونے ملتے ہیں''[1] برطانوی سلطنت کی توسیع کی تاریخ اُس بیان کی حمایت میں وافر شہادت مہیا کرتی ہے کہ فی الجملہ ہندوستان کا ایک فوجی کارنامہ تھا اور ہندوستان کی برطانوی سلطنت انگریز حکمرانوں کی توانائی مہارت اور یقین محکم کی یادگار تھی۔ فوج نے وہ قوت مہیا کی جس کی بنا پر برطانوی اقتدار ملک کے طول و عرض میں پھیل گیا اور اُسی نے حکومت کی ساخت میں پہل کی۔ کارنوالس جو ایک سپاہی تھا ملک کے گورنر جنرل کے ساتھ کمانڈر ان چیف کے عہدہ کو بھی سنبھالے ہوئے تھا۔ کلایو کے زمانے سے ڈلہوزی کے زمانے تک قریب قریب ہمیشہ ہی سول اور فوجی حکام کے درمیان کچھ نہ کچھ رقابت تھی۔ اس کی گونج بیسویں صدی کی ابتدا میں اُس وقت سنائی دی جب کرزن اور کچنز میں جھگڑا ہوا اور کرزن کو منہ کی کھانی پڑی۔

ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ برطانوی دستوری اصولوں کے باوجود حکومت جانتی تھی کہ اُس کی بقا کا دارومدار فوج پر ہے۔ برطانوی حکومت کی نوعیت کا تقاضا تھا کہ اُس کے حکام ہمیشہ چوکنا رہیں۔ لٹن نے کرین بروک کے نام ایک خط میں اعتراف کیا تھا ''یہ صحیح ہے کہ محکوم ہندوستانی ہم انگریزوں سے محبت نہیں کرتے۔''[2] اُس نے کہا کسان سست اور کاہل ہیں، ہندوستان کی رائے عامہ کے نمائندے دانش ور باغیانہ خیالات پھیلاتے ہیں، بہت سے راجے نواب ناقابل اعتماد ہیں اور سب کے سب پولیٹکل حکام کے برتاؤ سے غیر مطمئن ہیں۔'' اس نے مزید لکھا ''واقعہ یہ ہے ہندوستانی راجے، نواب سازش کے کسی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے ہیں۔''

عام طور سے سمجھا جاتا ہے کہ حیدرآباد کا سالار جنگ ایران کے ساتھ ساز باز کر رہا ہے اور کشمیر کا مہاراجہ روسیوں کے ساتھ۔ صرف ہندوستان کی فوج ایسا بند تھی جو اُس سیلاب کو روکے ہوئے تھی جس میں سلطنت غرق ہو سکتی تھی۔

---

[1] وِلس نو، ای۔ای، سامراج کا نمونہ، صفحہ 227 مزید دیکھئے انسائکلو پیڈیا آف سوشل سائنس، جلد 807 سامراج کے تحت۔

[2] لٹن کے کاغذ، لٹن کا خط کرین بروک کے نام، 8 رفروری 1879

1857 کے بعد فوج کی جو تنظیم نو کی گئی تھی اُس سے یہ بات صاف ظاہر تھی کہ برطانوی حکام کی پالیسیوں کی بنیاد ہندوستانیوں پر اعتماد نہ کرنے کے اصول پر قائم تھی اور ایسی انتہائی طاقتور فوج پر وہ تکیہ کرتے تھے جو برطانوی حکومت کے خلاف ہر خطرے پر قابو پا سکے۔

1857 سے پہلے ہندوستانی فوج کے دو حصے تھے یعنی یورپین اور ہندوستانی۔ یورپین حصہ مشتمل تھا ملکہ کی اُن رجمنٹوں پر جو ہندوستانی حکومت کو مستعار دی گئی تھی اور اُن یورپینوں پر جن کو ہندوستان میں بھرتی کیا گیا تھا۔ 1856 تک ہندوستان کی فوج میں زیادہ تر ہندوستانی تھے یعنی ہر یورپین سپاہیوں کے مقابلے میں 7 سے 9 تک ہندوستانی سپاہی''[1] بغاوت کو جس میں بنگال کی فوج نے اہم رول ادا کیا جو اعلیٰ ذات کے ہندوؤں یعنی اودھ کے راجپوتوں اور برہمنوں پر مشتمل تھی، حکومت نے فوجی تنظیم کی ناقابل اعتماد نوعیت کے لیے بڑا خطرہ سمجھا۔ جنرل پیل کی صدارت میں ایک کمیشن مقرر کیا گیا تاکہ وہ ضروری ترمیمات کی سفارش کرے اُس کی رپورٹ 1809 میں شائع کر دی گئی اور 1862 تک اُس کی زیادہ تر سفارشات پر عمل کر لیا گیا اور ہندوستانی فوج کی تنظیم نو کر دی گئی۔

تنظیم نو کی بنیاد یہ اصول تھا کہ یورپین عناصر کو غلبہ حاصل ہو تاکہ وہ فوج کے ہندوستانی عناصر کے خطرے پر قابو پا سکیں۔ پہلی بات تو یہ کی گئی کہ دونوں کے تناسب کو بدل دیا گیا۔ نیا تناسب جس کی سفارش کی گئی تھی وہ مندرجہ ذیل تھا۔ بنگال کی فوج میں دو ہندوستانیوں کے مقابلے میں ایک انگریز اور مدراس اور بمبئی کی فوجوں میں پانچ ہندوستانیوں کے مقابلے میں دو انگریز۔ مجموعی طور سے 40000 یورپین تھے اور 1,40,000 ہندوستانی۔ 1885 میں روسیوں کے

---

[1] فوج کے ہر شعبے میں سپاہیوں کی تعداد کے تخمینے مختلف ہیں لیفٹیننٹ جنرل کوڈین نو اور لیفٹیننٹ کرن بالٹون کی مولفہ کتاب ''برطانوی سلطنت کی فوجی کتاب'' کے مطابق یورپینوں کی تعداد تھی 45,522 اور ہندوستانیوں کی 3,48,000 مسٹر اتھنا سوامی نے یورپینوں کی تعداد 45,522 ہندوستانیوں کی تعداد 32,344 (کچھ اثرات جنھوں نے برطانوی انتظامی نظام کو جنم دیا، صفحہ 127)۔ ملٹری کے سکریٹری ملوبل کے تخمینے کے مطابق 1857 میں کل فوج تھی 2,77,746 جس میں یورپین 45,522 اور ہندوستانی 2,22,224 (ہندوستانی فوج کی تنظیم کے متعلق پیل کمیشن کی رپورٹ صفحہ 2 صفحہ 21)

خطرے کے بنا پر اُن کی تعداد بڑھا کے 73,500 یورپین اور 1,54,000 ہندوستانی کر دیے گئے۔ 1893 میں پانچ ہندوستانیوں کے مقابلے میں دو انگریزوں کا اصول اپنایا گیا۔ پوری کی پوری اُنیسویں صدی میں یہ تناسب برقرار رکھا گیا۔[1]

دوسری تبدیلی یہ کی گئی کہ یورپین فوج کے درمیان حصوں (باقاعدہ فوج اور مقامی فوج) کو ملا کر برطانوی فوج کا حصہ بنا دیا گیا۔ تیسری تبدیلی کی گئی کہ ہندوستانی سپاہیوں کو اسلحہ خانوں اور توپ خانوں سے ہٹا دیا گیا۔ صرف اُن چھاؤنیوں کے لیے اس اصول میں استثنا کیا گیا تھا جو یورپینوں کی صحت کے لیے خاص طور سے مضر تھیں۔ اس طرح یورپینوں کی قوت حرب کو بہت زیادہ بڑھا دیا گیا اور ہندوستانیوں کی قوت تناسب میں کمی کر دی گئی۔ ان دونوں کی تربیت میں بھی کچھ فرق پیدا کر دیا گیا تھا جس سے ہندوستانی سپاہیوں کو نقصان پہنچا۔ مقصد یہ تھا کہ فوج کے ہندوستانی حصے کی حیثیت اصل فوج سے کم کر کے یورپین فوج کی مددگار کر دی جائے۔

لیکن زیادہ اہم اور شرارت آمیز تبدیلی رجمنٹوں کو بھرتی کرنے اور اُن کی تنظیم کے طریقوں میں کئی گئی۔ 1857 کے واقعات نے حکمرانوں کے شکوک کی تصدیق کر دی تھی۔ اور ہندوستان کے لوگوں پر اعتماد کرنے کے خطرے سے اُنھیں آگاہ کر دیا تھا حالانکہ اب بھی میجر جنرل بین کاک کی طرح کے کچھ فوجی افسر سمجھتے تھے کہ اعتماد کرنے کی پالیسی سب سے اچھی ہے پھر بھی افسروں کی بڑی تعداد اُس کے خلاف تھی۔ بیل کمیشن کے ساتھ سامنے پیش کئے جانے والے نوٹ میں میجر جنرل ٹکر نے اُن کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی تھی۔ اُسے یقین تھا کہ ''ہندوستان میں ہم طاقت کے ذریعے اپنا اقتدار قائم رکھ سکتے ہیں۔ مختلف نسلوں اور قومیتوں پر فتح حاصل کر سکتے ہیں'' اس نے یہ دلیل دی ''یہ بات تجربے اور عقل سلیم کے منافی ہے کہ کسی حال میں بھی ہندوستانی دل سے ہماری حکومت کو پسند کر سکیں'' اس نے مزید کہا ''جب ہم ہندوستانیوں کو مذہب اور قوم پرست بنا دیں گے تو ہمیں یہاں سے ہٹنا ہوگا۔ اس وقت تک ہمیں یہاں ان غیر یقینی

[1] 1856 میں ہندوستانی فوج میں 39375 یورپین اور 2,14,985 ہندوستانی تھے۔ 1878 میں اُن کی تعداد تھی 6002 انگریز افسر، 60370 انگریز سپاہی اور 123254 ہندوستانی سپاہی تھے۔ فوجی کمیشن کی رپورٹ (1879) پیراگراف 11 اور 16۔

حالات میں رہنا ہوگا جن کے ایک افسوسناک نمونے کا تجربہ ہم ابھی کچھ دن پہلے کر چکے ہیں۔اس کے مطابق ''حالات کا تقاضہ ہے کہ ہماری شرقی مملکت محروصہ کے حکمران جن قومیتوں اور نسلوں کو ہماری فوجوں میں باقی رکھنا مناسب سمجھتے ہیں انھیں واضح اداروں میں تقسیم کیا جائے تاکہ وہ ہمارے لیے کم سے کم خطرے کا باعث بن سکیں۔''[1] چنانچہ بیل کمیشن نے سفارش کی کہ ''عام طور سے فوج کو مختلف قومیتوں اور ذاتوں پر مشتمل ہونا چاہیئے جنھیں ہر رجمنٹ میں گڈ مڈ کر دینا چاہیے۔'' مسئلہ یہ تھا کہ ہندوستانی فوج کی ایک اہم نوعیت کو ختم کرنے کے لیے مختلف مقامات، ذاتوں اور قبیلوں سے بھرتی کی جانے والی کمپنیوں کو رجمنٹ میں ملا دیا جائے تاکہ اگر ان میں سے کوئی ایک بغاوت کا مظاہرہ کرے تو اسے زیادہ دشواری کے بغیر علیحدہ اور ہتھیاروں سے محروم کر دیا جائے۔

چنانچہ فرقہ وارانہ نمائندگی کے اصول پر سیاست میں عمل کرنے سے بہت پہلے فوج میں اس پر عمل کیا جانے لگا تھا۔اس کے ساتھ یہ بھی انتظام کیا گیا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد میں توازن برقرار رکھا جائے۔رجمنٹوں میں کمپنیاں اور ٹروپ شامل ہوتے تھے۔مثال کے طور پر آٹھ ٹروپ کی ایک گھڑسوار رجمنٹ میں تین سکھ، تین مسلم اور دو ہندو ٹروپ تھے۔کسی بڑے یا چھوٹے ہندوستانی کو کمیشنر افسر مقرر نہیں کیا جاتا تھا۔جب ڈفرن نے سفارش کی کہ مہاراج کوچ بہار کو کمیشن دیا جائے تو اس کی سفارش کو یہ کہہ کر رد کر دیا گیا کہ اس سے ایک خطرناک مثال قائم ہو جائے گی۔

لارڈ الفنسٹن نے اپنی پالیسی کی وکالت کرتے ہوئے کہا تھا ''پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو قدیم رومیوں کا قول تھا اور اب یہ ہمارا ہونا چاہیے۔''[2] 1858 سے 1866 تک سکریٹری آف اسٹیٹ کے عہدے پر فائز رہنے والے سر چارلس وڈ نے اسے قبول کر لیا اس نے لکھا ''سب لوگوں میں مشترکہ احساس نہ پیدا ہونے دیجئے''[3] اور سپاہیوں کو آپسی ربط وضبط اور میل ملاپ

---

[1] بیل کمیشن رپورٹ، 1889 نمبر 1 میجر جنرل ایچ۔ٹی۔ٹکر، مورخہ 18/ستمبر، پرچہ صفحہ 9

[2] بیل کمیشن رپورٹ، ضمیمہ 3 صفحہ 146

[3] وڈ کے کاغذات، وڈ کا خط الگن کے نام، 3/مارچ 1862

سے بچایئے۔[1] اس پر پوری طرح عمل کیا گیا اور اس سوال کا جواب تلاش کر لیا گیا ''ہم ہندوستانی فوجی افسروں اور سپاہیوں پر کتنا اعتماد کر سکتے ہیں۔'' ہندوستانیوں کی حیثیت کو کمتر بنا دیا گیا اور اعتماد و ذمہ داری کے تمام عہدے ان کے لیے ممنوع قرار دے دیے گئے۔

سول خدمات میں امتیاز

سول ملازمت کی شرائط بھی بہتر نہیں تھیں۔ کارنوالس نے فیصلہ کر دیا تھا کہ ہندوستانی صرف ماتحت کی حیثیتوں سے کام کر سکیں گے۔ میٹنگ نے اُنھیں ایسی ماتحت حیثیتیں دیں جن میں تنخواہیں کسی حد تک زیادہ تھیں۔ 1833 کے چارٹر ایکٹ اور ملکہ وکٹوریہ کے 1858 کے بیان کے باوجود پوری اُنیسویں صدی میں اس صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔

اُنیسویں صدی میں اعلیٰ ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی تعداد کم تھی۔ قومی رہنما یہ مطالبہ کرتے تھے کہ امتحان بیک وقت انگلستان اور ہندوستان میں لیے جائیں تا کہ ہندوستانیوں کی زیادہ تعداد مقابلے کے امتحان میں بیٹھ سکے اور ملازمتیں حاصل کرنے کے زیادہ مواقع اُنہیں مل سکیں۔ لیکن حکمراں قوم اس کے لیے تیار نہیں تھی۔

اعلیٰ ملازمتوں اور خصوصیت کے ساتھ انتظامی ملازمتوں کی تنظیم اُن اُصولوں پر کی گئی تھی جو ہندوستان کے لیے مخصوص تھے۔ وہ اُصول انگلستان کی اعلیٰ ملازمتوں کے اصولوں سے بہت مختلف تھے۔ سول سروس کے ارکان صرف اُس حکومت کا ایک ماتحت حصہ ہی نہیں تھے جس کا کام تھا احکام کی تعمیل کرنا بلکہ وہ حکومت میں شامل تھے۔ یعنی پالیسی بنانے والے اُن میں سے گورنروں اور گورنر جنرل کی ایگزیکیٹیو کونسلوں کے ممبر سکریٹری آف اسٹیٹ کی انڈیا کونسل کے ممبر اور ہندوستان کی اور صوبوں کی لیجسلیٹیو کونسلوں کے میر چنے جاتے تھے۔ اُن میں سے کچھ نے عدلیہ کے اعلیٰ عہدوں تک ترقی کی۔ گورنر جنرل اور صوبوں کے گورنروں کے علاوہ کوئی ایسا عہدہ نہیں تھا جس پر اُن کا تقرر نہ ہو سکے۔ ریاست کے معاملات میں اُن کی اہمیت کی بنا پر اُنھیں نوکر شاہی سے تعبیر کیا جانے لگا۔

سبھی گورنر جنرل اور سکریٹری آف اسٹیٹ اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر کے یکساں

---

[1] ایضاً، وڈ کا خط الگن کے نام، 10 مئی 1862

مخالف تھے سرچارلس وڈ ہندوستانی کردار کے متعلق بُری رائے رکھتا تھا۔ اُس کے مطابق ہندوستانی ''اگرچہ علم وفہم میں کسی سے کم نہیں تھے۔لیکن اُن میں کرداراوراخلاقی جرأت کی کمی تھی جن کی بناپر کوئی شخص تنہا کسی ذمہ دارعہدے پر کام کرنے کے قابل ہوتا ہے۔''[1]

جب 1867 میں نارتھ کوٹ نے سول ملازمین کےتقررات کا حوالہ لارنس کودیا تواُس نے جواب میں کہا''ہم نےتلوار سے ہندوستان کوفتح کیا ہے۔حالانکہ پالیسی اوراچھی حکومت نے بھی ہماری مدد کی ہے۔ہمیں اسی طرح اُس کورکھنا چاہیے۔اپنی حکومت کوجاری رکھنے کی ایک شرط کے طور پرانگریزوں کواعلیٰ عہدوں پررکھا جانا چاہیے۔یعنی عزت اورطاقت کی حیثیتوں پر''۔[2]

لارنس کا خیال تھا''اس قسم کے لوگ (بنگالی) مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہونے کی کتنی ہی اہلیت کیوں نہ رکھتے ہوں لیکن اُن میں وہ صلاحیت نہیں ہے جواچھے حاکموں اورمنتظمین کے لیےضروری ہے۔''[3]

انگریز امیدوار کے لیے مقابلے کے امتحان کا جواز پیش کرتے ہوئے ڈیوک آف آرگل نے کہا''مقابلے کی طریقے میں اگرچہ کامیابی بذات خوداس کی دلیل نہیں ہوتی ہے کہ اُس میں حکمراں یاحاکم بننے کی صلاحیت بھی ہوپھر بھی خاندانی یاسیاسی سرپرستی کےمقابلے میں اس طریقے سے اہلیت تلاش کرنے کے بہتر مواقع ہاتھ آتے ہیں۔اور چونکہ یورپینوں میں عام طور سے وہ صلاحیتیں ہوتی ہیں جن کی بناپرانھوں نے ہندوستان کی سلطنت جیتی اورآج بھی اُسے رکھتے ہیں۔ اس لیے فی الجملہ مقابلے کے امتحان انگریزی نسل کےمختلف امیدواروں کے درمیان ایک اچھے قسم کی جانچ ہے۔''[4]

لارڈ نارتھ بروک نے اس کے جواب میں لکھا''عام مقابلہ ہندوستان کے لیے سازگارنہیں

---

[1] وڈ کے کاغذات، وڈ کی طرف سے سرایچ مین کو9/اکتوبر1862

[2] لارنس کے کاغذات، لارنس کی طرف سے نارتھ کوٹی کو17/اگست1867

[3] ایضاً، لارنس کی طرف سے نارتھ کوٹ کو،17/اگست1867

[4] ڈیوک آف آرگل، سکریٹری آف اسٹیٹ ٹو گورنمنٹ آف انڈیا، 8/اپریل 1861 مزید پارلیمنٹ لیتھری کے کاغذات، ہندوستان کی سول سروس میں ہندوستانیوں کاداخلہ (1879) سی 1376 نمبر 8 پیراگراف 6

ہے[1] اور اس بات پر زور دیا کہ امتحانات ''پبلک ملازمتوں کے لیے ہندوستان کے لوگوں کو بھرتی کرنے کے بہترین ذرائع نہیں ہیں'' اور یہ کہ ''مقابلہ کرنے کے لیے ہندوستان کے امیدواروں کی کسی طرح ہمت افزائی نہیں کرنی چاہیے۔[2] لٹن نے کہا ''مجھے اس نظریے سے بالکل اتفاق نہیں ہے کہ ہندوستان کے لوگ سرکاری ملازمتوں کے تعلق سے کوئی متعلق حق رکھتے ہیں۔''[3] اڈوکیٹ جنرل کے عہدے پر ایک مشرقی کے تقرر کو سیلسبری نے پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا حالانکہ اس سے پہلے ہندوستانی ہائی کورٹ کے جج کے عہدے پر فائز ہو چکے تھے۔ لیکن جب بھی ہندوستانی کا تقرر عمل میں آیا تھا تو انگریزوں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا تھا۔ سیلسبری کے مطابق اس کی وجہ تھی۔ ''ایسے یورپینوں کی تلاش کرنے میں دشواری جو ان کے (ہندوستانیوں کے) ماتحت کام کریں۔''[4]

سکریٹری آف اسٹیٹ ڈیوک آف آرگل نے ایک خط میں ہندوستانیوں کو سول سروس میں بھرتی کرنے اور امتحان کی موزونیت کے بارے میں بحث کرتے ہوئے اس رائے کا اظہار کیا تھا ''جہاں تک ہندوستان کے لوگوں کا تعلق ہے اس اصول پر تکیہ کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہیں ہے کہ ان کے تعلق سے محض ذہنی صلاحیت حکمرانی کے لیے کافی نہیں ہے۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ قوت، ہمت اور انتظامی صلاحیت کے اعتبار سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ مقابلے کے امتحان میں غالباً ایک بنگالی کسی پٹھان یا سکھ کے مقابلے میں زیادہ بہتر ثابت ہوگا۔ پھر بھی یہ ایک خطرناک تجربہ ہوگا کہ کلکتہ کے کالجوں کے کسی کامیاب طالب علم کو شمالی ہندوستان کے جنگ جو قبیلوں پر حکم چلانے کا موقع دیا جائے۔[5]

لیکن ہندوستان کا دعویٰ انصاف اور قانون کے اعتبار سے مضبوط تھا۔ لٹن نے کروین بروک

---

[1] نارتھ بروک کے کاغذات، نارتھ کی طرف سے سیلس بری کو، 14/جون 1874

[2] ایضاً، 30/ستمبر 1878

[3] لٹن کے کاغذات۔ لٹن کی طرف سے سیلس بری کے نام 10/مئی 1877

[4] نارتھ بروک کے کاغذات، سیلس کی طرف سے نارتھ بروک کو، 5/نومبر 1874 اور 27/جنوری 1875

[5] دیکھیے پارلیمنٹری کاغذات، سی 2376 نمبر 8 محولہ بالا۔

کو لکھے جانے والے ایک خط میں اس کی وضاحت کی تھی کہ قانون کے احکام کی تعمیل کیوں نہیں کی جاسکتی۔ اس نے کہا ''آپ نے لکھا ہے کہ 1833 کے ایکٹ نے ہندوستانیوں کو سرکاری ملازمتوں میں داخل ہونے کی آزادی دی ہے جونظری اعتبار سے غیرمحدود ہے۔ اس ایکٹ کا مقصد یا کم ازکم اثر یہ ہوا کہ انتظامیہ کو اجازت دی گئی کہ وہ اس نظری آزادی پر عملی بندش عائد کرے جو اتنی ہی غیرمحدود ہو۔ اس میں شک نہیں کہ یہ سچ ہے۔'' اس کے بعد اس نے اجمالی طور سے صورت حال مندرجہ ذیل الفاظ میں پیش کی۔

''(الف) مصلحت، فراخ دلی، پالیسی اور معیشت کی بنا پر یہ عام طور سے محسوس کیا جاتا ہے کہ ہندوستانیوں کو ہندوستان کے سول انتظامات میں پہلے کے مقابلے میں زیادہ جگہ دینا مناسب ہے۔

(ب) اس کے علاوہ پارلیمنٹ نے اس کا وعدہ کیا ہے جو غیرواضح ہونے کے باوجود بہت وسیع ہے۔

(ج) ابھی تک ان مقاصد کو حاصل کرنے یا ان وعدہ کو پورا کرنے میں کوئی پیش رفت نہیں ہوئی ہے۔ نہ سنجیدگی کے ساتھ اس کی کوشش کی گئی ہے۔

(د) ان وعدوں کو پورا کرنے میں جو مسلمہ اعتبار سے ناکامی ہوئی ہے اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ خود وعدے غیرواضح ہیں۔''

دوسری دشواریوں کا ذکر کرنے کے بعد یعنی اس ملازمت کے یورپین اراکین کی مخالفت کا اس نے یہ دلیل دی کہ ان ''وعدوں اور توقعات'' سے حیلہ سازی کرکے بچنے کے بجائے جو ''کبھی پورے نہیں کیے جاسکتے ہیں نہیں کئے جائیں گے'' بہتر یہ ہے کہ جو وعدے کئے گئے تھے انھیں توڑ دیا جائے اور ''ایکٹ (1870) کو لغو ثابت کرنے اور بے اثر بنانے کا عمداً اور واضح طریقہ اختیار کیا جائے۔'' اس سلسلے میں انھوں نے مشورہ دیا ''ان وعدوں کی'' جو غیرواضح ہیں اور جلدی میں کئے گئے ہیں، زیادہ احتیاط کے ساتھ وضاحت کی جانی چاہیے۔ احتیاط کے ساتھ ان کی وسعت کم کیجئے لیکن ان کے حدود کے اندر انھیں حقیقت بنادیجئے۔''[1]

---

[1] لٹن کے کاغذات، لٹن کی طرف سے کرین بروک کو، 21/جولائی 1878

حقائق کی اس تلاش کا نتیجہ، جو کئی سال تک جاری رہی تھی، یہ ہوا کہ از روئے قانون سول سروس کا قیام عمل میں آ گیا۔ لیکن اس میں آنے والوں نے اچھا کام نہیں کیا اور اس لیے اُسے ختم کر دیا گیا۔

اس کے بعد اس وقت کے پنجاب کے گورنر ایچیسن کی صدارت میں ایک پبلک سروس کمیشن 1886 میں قائم کیا گیا، اس کمیشن کی خاص خاص سفارشیں تھیں۔ (1) معہودہ سول سروس میں داخلے کے نظام کو جوں کا توں بحال رکھا جائے (2)، معہودہ سول سروس کے لیے مختص کئے جانے والے عہدوں کی تعداد کم کر دی جائے اور (3) ان میں سے کچھ کو اس نئی ملازمت میں منتقل کر دیا جائے جو پراونس سول سروس کہلاتی تھی جو انتظامی، عوامی، پولیس، تعلیمی، اُمور عامہ اور دوسرے شعبوں پر مشتمل تھی۔

انتظامی شعبے کے لیے بھرتی مقابلے کے امتحان کے ذریعہ کی جائے گی۔ چنانچہ انڈین سول سروس کے دروازے کھولنے کے بجائے اور زیادہ سختی کے ساتھ بند کر دیے گئے اور کم تر حیثیت کی ایک ملازمت، جس کی سماجی حیثیت کم تھی اور تنخواہیں بھی کم تھیں ہندوستانیوں کو مطمئن کرنے کے لیے شروع کر دی گئی۔ ''جو وعدہ کیا گیا تھا وہ ایک دفعہ پھر توڑ دیا گیا۔''

ہندوستان اور انگلستان میں بیک وقت سول سروس میں بھرتی کرنے کے لیے امتحان لینے کے حق میں دادا بھائی نوروجی کی کوششوں کے نتیجے میں 1893 میں ہاؤس آف کامنز میں ایک تجویز منظور کی گئی۔ سکریٹری آف اسٹیٹ لارڈ کمبرلی نے اُسے رائے معلوم کرنے کے لیے حکومت ہند کو بھیجا۔ حکومت ہند نے کہا کہ یورپین عہدہ داروں کی تعداد میں بڑی کمی برطانوی حکومت کے لیے خطرے کا باعث ہوسکتی ہے۔ اس میں کہا گیا تھا ''وہ سول سروس ہی ہے۔ جس کی انتظامی صلاحیت اور حکمرانی کرنے کی اہلیت کی بنا پر 22 کروڑ لوگوں پر، جو 9,43,000 مربع میل کے علاقے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اچھی طرح حکومت کرنے کا انحصار ہے۔ اس لیے یہ بات بہت زیادہ اہم ہے کہ اُن محنت طلب فرائض کی ادائیگی کے لیے جو اُن افسروں کو پورے کرنے ہوتے ہیں، بہتر سے بہتر لوگوں کی خدمات حاصل کی جائیں۔ اُن پر (برطانوی حکومت) کا انحصار ہے۔ اُن کے اثر میں کوئی کمی یا کارکردگی میں خامی دیسی طوائف الملوکی کو جنم

دے گی جس سے برطانوی اسلحہ نے ملک کو نجات دلائی ہے۔ چنانچہ یہ بات بدیہی ہے کہ ''سول سروس کے اراکین کی ایک خاصی تعداد ہمیشہ یورپین ہونی چاہئیں'' اور اس کا خطرہ پایا جاتا ہے کہ بیک وقت انگلستان اور ہندوستان میں امتحان ہونے کی صورت میں اس ملازمت میں نااہل ہندوستانی بھر جائیں گے اور برطانوی سلطنت کی سلامتی کے لیے خطرہ پیدا ہو جائے گا۔[1]

کرزن نے 1904 کی بجٹ کی تقریر میں اس پالیسی کی حمایت کی۔ اُس کے مطابق امپیریل سول سروس میں انگریزوں کو آنا چاہیے۔ ''اس کی وجہ یہ ہے کہ جزوی طور سے وراثت کی بنا پر، جزوی طور سے اپنی پرورش کی بنا پر، جزوی طور سے تعلیم کی بنا پر وہ حکومت کرنے کے اصولوں سے واقف ہیں اور دیسی عادتیں اور کردار کی پختگی رکھتے ہیں جو اُس کے لیے ضروری ہے۔'' اس مشاہیر کے گروہ کے باہر ہندوستانیوں کو زیادہ سے زیادہ ملازمتیں دی جا سکتی ہیں ''لیکن اس اصولوں پر عمل کرنے کے لیے بھی ایک شرط یہ ہے کہ کچھ خصوصی شعبوں میں، جہاں سائنسی اور تکنیکی معلومات ضروری ہیں۔ یا جہاں ایک خاص ذمہ داری پوری کرنی ضروری ہے، وہاں یورپینوں کو بھی موجود ہونا چاہیے اور کچھ صورتوں میں تو اُن کی تعداد غالب ہونی چاہیے۔''[2]

عدم قابلیت کے اظہار کا جو رویہ حکومت نے اختیار کیا تھا اُس نے ہندوستان کی رائے عامہ کو بڑا مشتعل کر دیا۔ انگریزی حکومت کے سو سال گزر جانے اور مغربی تعلیم کے بعد بھی انتظامی فوجی اور سیاسی شعبوں میں کلیدی عہدوں پر انگریزوں کا تقرر کرنے کی پالیسی نے برطانوی وعدوں اور اعلانوں کے تعلق سے ہندوستانیوں میں مایوسی کی لہر دوڑا دی۔ حکمرانی کے تکبر نے حکمرانوں کو اندھا کر دیا تھا اور اُن کے لیے یہ ممکن نہ رہا تھا کہ وہ اپنی دلیلوں کے نقائص کو دیکھ سکیں۔

البرٹ بل پر نزاعی بحث

جس وقت اعلیٰ امپیریل ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی شرکت کے دعووں پر بحث و مباحثہ ہو رہا تھا اُس وقت ایک ایسا حادثہ ہوا جس نے حکمراں قوم کے نسلی تکبر کو اور زیادہ واضح کر دیا۔ وہ تھا یورپین برطانوی رعایا کے تعلق سے ہندوستانی ججوں کے اختیار سماعت، سوال، ممبر، قانون،

---

[1] جارج ارتھر، لارڈ لیجز کی سوانح، جلد دوم صفحہ 177

[2] گورنر جنرل کی طرف سے سکریٹری آف اسٹیٹ کو محکمۂ داخلہ (عامہ)......62 مورخہ یکم نومبر 1893

سرکورٹنی البرٹ نے ایک بل پیش کیا جس کا مقصد تھا ضابطہ فوجداری کی اُس عدم یکسانیت کو درست کرنا جس کی رو سے معہودہ خدمات کے ہندوستانی اراکین کے اختیارات سماعت محدود تھے لیکن بغاوت کے بعد کی مدت میں ایک ہی خدمت کے اُن اراکین کے درمیان بھی، جن کا انتخاب ایک ہی طریقے سے ہوا تھا۔ برابری کا ذکر یورپینوں کو مشتعل کر دینے کے لیے کافی تھا۔ ہندوستان میں رہنے والے انگریز لارڈ رابرٹس کے جذبات کے حامی تھے ''میرا خیال ہے کہ ہم اُسے (ہندوستانی کو) کوئی بھی عہدہ کیوں نہ دے دیں۔ پھر بھی اُس کی بنا پر برطانوی حکام اُس کو اپنے برابر نہیں سمجھیں گے۔''[1]

چنانچہ ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ہندوستان کے لبرل وائسرائے رپن کی اُس کوشش میں رکاوٹ ڈالیں گے کہ اُنھیں اس حق سے محروم کر دیا جائے کہ اُن کے مقدمات کی سماعت محض یورپین مجسٹریٹ اور جج کر سکتے ہیں۔ شدید پرچار شروع کیا گیا۔ جلسے کئے گئے اور سخت لفظوں میں بل کی مذمت کی گئی۔ یہ کہا گیا کہ برطانوی آزادیوں کو ختم کرنے کی بنا پر اُن میں خطرے کا احساس پیدا ہو جائے گا۔ جس کی وجہ سے برطانوی سرمایہ یہاں سے چلا جائے گا۔

بنگالی بابو کو برا بھلا کہا گیا۔ اُس کے لیے کہا گیا کہ وہ ''چربی دار، سانپ کی طرح چالاک لغو مہمل الزامات لگانے والا وغیرہ ہے''[2] بردوان کمشنر مسٹر جیمس نے حکومت بنگال کے سکریٹری کو ایک خط لکھا جس میں اُس نے لکھا ''میرے ہم وطنوں کے لیے یہ بات بھی کم تکلیف دہ نہیں ہے کہ ہندوستانیوں کو اُن کے برابر کا درجہ دیا گیا ہے...... لیکن یہ بات کسی طرح سے بھی قابل قبول نہیں ہو سکتی ہے کہ انگریزوں کے مقدموں کو جو جدوجہد حیات میں پہلے ہی دوسروں کے مقابلے میں نقصان اُٹھا رہے ہیں، ہندوستانی مجسٹریٹ سن سکیں اور وہ ملزم کی طرح اُن کے سامنے پیش ہوں۔''[3]

---

[1] ریلے سرٹی، ہندوستان میں لارڈ کرزن، جلد 1 صفحات 07-106

[2] برانسن کی تقریر جس کی رپورٹ بنگال میں شائع ہوئی۔ 3/مارچ 1883

[3] بنگال عدالتی کاروائی، 1883 جس کا ذکر بنگال ماضی اور حال میں کیا گیا، جلد IXXXI حصہ اول، جنوری۔ جون 1991 بی۔ دیو کا مضمون۔

اُس تحریک کو چلانے کے لیے ایک ''دفاعی تنظیم'' بنائی گئی اخبارات کے کالموں میں حکومت کی پالیسی کی سخت مذمت کی گئی۔ کلکتہ اور آس پاس کے شہروں میں جلسے کئے گئے۔ وائسرائے، سکریٹری آف اسٹیٹ اور پارلیمنٹ کو یادداشتیں بھیجی گئیں اور انگلستان کے لوگوں کے سامنے اُن کا مقدمہ پیش کرنے کی خاطر ایک ایجنٹ انگلستان بھیجا گیا۔ سر جیمس اسٹیفنس اور مسٹیوں کار کی طرح کے رٹائرڈ برٹش حکام نے اُن تحریک کی حمایت کی۔

دوسری طرف لبرل، جن کے ہاتھوں میں اُس وقت حکومت کی باگ ڈور تھی اور اُن کے اخبارات بل کی حمایت کر رہے تھے۔ برائٹ نے آگاہ کیا کہ بل اگر واپس لے لیا گیا تو ''بے چینی بڑھ جائے گی اور وفاداری کم ہو جائے گی۔''[1]

رپن نے کہا کہ اس بل کے پس پشت جو پالیسی ہے وہ نئی نہیں ہے۔ اُس کو پارلیمنٹ نے بنایا تھا کی سکریٹری آف اسٹیٹ نے اُس کی وکالت کی اور 1879 میں لٹن نے جو قواعد بنائے تھے اُن کے تحت اس کا اطلاق کیا۔ جہاں تک اس کا تعلق تھا اُس نے اس پالیسی کی حمایت مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ''میں نے ایک کتاب میں پڑھا ہے کہ پاکبازی سے قوم بلند مرتبہ ہوتی ہے اور تاریخ کے مطالعہ سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ایک بڑی سلطنت کو فوجوں اور سپاہیوں کے ذریعے ہمیشہ زندہ نہیں رکھا جا سکتا ہے۔ بلکہ اس کو قائم رکھا جا سکتا ہے اُس کے قوانین کی پاکبازی اور انصاف کے اصولوں کے لیے اُس کے احترام کے ذریعے۔''[2]

لیکن لبرلوں کی کوشش بے سود ثابت ہوئی اور ہندوستانیوں نے عقل اور انصاف کی جو اپیل کی اُس پر کسی نے دھیان نہیں دیا۔ برطانوی قوم کے حقوق کو برقرار رکھنے کے لیے حکومت کو بل میں ترمیم کرنی پڑی۔ یہ پورا حادثہ حکمراں نسل کے لیے باعث شرم تھا۔ بڑی عجیب بات ہے کہ ایک خاص ملازمت کے ہندوستان اور یورپین اراکین کے درمیان برابری پیدا کرنے کی ایک چھوٹی سی کوشش نے ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں میں اتنا زیادہ مخالفت کا جذبہ پیدا کر دیا اور یہ کہ حکومت کو اُن کے سامنے اس بری طرح جھکنا پڑا۔

---

[1] بنگال، ولس کے کمرے پر ہونے والی ایک میٹنگ کی رپورٹ جو یکم ستمبر 1883 کو ہوئی تھی

[2] لیجسلیٹیو کونسل کی کی روداد، 7/ جنوری 1884

VI۔ نمائندہ حکومت

ہندوستان کے تعلیم یافتہ طبقوں اور حکمراں طاقت کے درمیان سب سے اہم بحث تھی ملک کی حکومت میں اُن کی شرکت اور نمائندہ اداروں کے قیام کا مطالبہ۔

1857 سے بھی پہلے کے دور میں انگریزوں کا جو زیادہ تر جیری بینتھم کے لبرل فلسفے کے پیرو تھے اور جو سمجھتے تھے کہ محکوم ملکوں سے برطانوی تجارت کو فائدہ ہوسکتا ہے، خیال تھا کہ برطانیہ کی نگرانی کی بنا پر ایک دن ہندوستان آزاد ہوجائے گا۔ وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کو نعمت محض نہیں سمجھتے اور اُس سے پریشان نہیں ہے کہ ہندوستان ایک دن برطانوی حکومت کے ساتھ اپنا رشتہ توڑ دے گا۔ لیکن 1857 کے بعد اُس قسم کے خیالات رکھنے والے لوگوں کی تعداد کم ہوگئی۔ خصوصیت کے ساتھ حکمراں حلقوں میں۔ اس کے باوجود کوبیڈن، برائٹ اور ہابسن کی طرح کے لبرل رہنما سامراجی فلسفے کی خدمت کرتے رہے۔ مثال کے طور پر کوبیڈن نے کہا کہ اُسے یقین نہیں ہے کہ انگلستان مستقلاً ہندوستان پر حکومت کرسکے۔ اُس کی رائے تھی کہ پارلیمنٹ کے کنٹرول میں تاج لاکھوں کروڑوں ایشیائی لوگوں پر حکومت کرنے کی جو کوشش کررہا ہے وہ ضرور ناکام ہوگی اور اس لیے اُس نے یہ نتیجہ اخذ کیا ''ہندوستان پر اُن لوگوں کو حکومت کرنی چاہیے جو دنیا کے اُس حصے میں رہتے ہیں۔ لوگ اس بات کو پسند کریں گے کہ اُن کے لوگ اور عزیز واقارب اُن پر حکومت کریں چاہے وہ ہمارے خیال کے مطابق بڑی حکومت ہی کیوں نہ ہو اور اُس کو اس بات پر ترجیح دیں گے دنیا کے دوسرے سرے سے بار بار آنے والے وقتی مزاحمت کار اچھی حکومت کریں۔''[1]

ہابسن کی رائے میں بدیسی حکومت کو صرف اُس صورت میں جائز قرار دیا جاسکتا تھا۔ ''اگر حکومت کے اختیاری اور حقیقت کی پرجوش نمو میں مہذب امداد کی روشن خیال پالیسی معاون ہو۔''[2] ہندوستان کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کے برطانوی سلطنت کے دعووں کی سچائی کو ثابت کرنے

---

[1] مورلے۔ جے، کوبیڈن کی سوانح، جلد دوم، صفحہ 187 ایوا سلے اڈیشن، 1903

[2] ہابسن، جے۔ اے، محولہ بالا، صفحہ 243

کے لیے اُن باتوں کا اطلاق حالات پر نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جہاں تک حکومت اختیاری کی نمو کا تعلق تھا ہابسن نے محسوس کیا کہ ’’بہت کم انگریز حکام، اُس قسم کا خیال رکھتے ہیں کہ ہم حکومت کے مغربی فنون ہندوستان کی عظیم آبادی کو سکھا سکتے ہیں۔ یا کامیابی کے ساتھ سکھا رہے ہیں۔ عام طور سے اس بات کا اعتراف کیا جاتا ہے یا یہ خیال پایا جاتا ہے کہ میونسپل یا دوسری قسم کی حکومتوں کے تعلق سے برطانوی حکومت کے تحت اور برطانوی خطوط پر جو تجربے کئے گئے ہیں وہ ناکام ہو چکے ہیں۔‘‘[1]

1857 کے بعد ہندوستان کے ہر حصے میں جو بحث چل رہی تھی وہ لوگوں پر مطلق العنانی انداز سے حکومت کرنے کا فطری نتیجہ تھی۔ سیاسی سوجھ بوجھ اور دوراندیشی کا تقاضہ تھا کہ لوگوں کا اعتماد حاصل کیا جائے اور کونسلوں کو لوگوں کی خواہش کا نمائندہ بنایا جائے۔ یہ مطالبہ اُس زمانے کی تمام سیاسی کاروائیوں میں گونج رہا تھا اور وقت کے ساتھ بڑھتا گیا۔

یہ مطالبہ اتنا فطری تھا کہ کچھ حکام بھی اُس کی حمایت کرنے لگے تھے۔ سلیکٹ کمیٹی کے سامنے 1873 میں شہادت دیتے ہوئے سر چارلس ٹریویلین نے کہا تھا کہ وصولی اور نمائندگی میں مطابقت ہونی چاہیے۔[2]

اُس نے اُس اصول کی وکالت کی کہ حکومت کو اُس کا حق دینا چاہیے کہ وہ اپنا روپیہ خود حاصل کریں اور خود خرچ کریں اس لیے کہ ’’پورے ہندوستان کے لیے یہ حکومت اختیاری سیکھنے کی ہوس گاہ بن جائے گا اور 20,00,00,000 لوگوں کو اپنے اوپر حکومت کرنے کا درس دینے کے سلسلے میں سب سے بڑا قدم ہوگا جو اُس ملک کے ساتھ ہمارے تعلقات کا مقصد و منزل ہے۔‘‘[3]

ٹریویلین کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی تھے جو اُسی قسم کے خیالات رکھتے تھے لیکن اُن کے خیالات صدا بہ صحرا ثابت ہوئے۔ جن لوگوں کے ہاتھوں میں طاقت تھی اُن کے پیش نظر دوسرے مقاصد تھے اور یہ مطالبہ اُس وقت تک بے سود ثابت ہوا جب تک حالات نے حکمرانوں کو اُسے

---

[1] ایضاً، صفحہ 119

[2] دف، رمیش چندر، وکٹوریہ کے دور میں ہندوستان کی معاشی تاریخ، (نیا ہندوستان اڈیشن)، صفحہ 276

[3] کیننگ کے کاغذات کیننگ کی طرف وڈ کو، 30 ستمبر 1959

تسلیم کرنے پر مجبور نہ کردیا۔ چنانچہ حکومت خود اختیاری کی ابتدائی کے لیے ملک کو تقریباً چالیس سال تک انتظار کرنا پڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ 1861 کے بعد سامراجی احیا کے دور میں اُن لوگوں کے لیے جو سفید فام نہیں تھے حکومت اختیاری کا تصور حکمراں حلقوں نے ترک کردیا تھا۔ 1853 کی امپیریل لیجسلیٹو کونسل کی توسیع کی تحریک کے سلسلے میں کیننگ نے وڈ کو ایک خط لکھا تھا جس میں سکریٹری آف اسٹیٹ سے کہا تھا ''جہاں تک ہندوستان کے باشندوں کا تعلق ہے مجھے اُس سے خوشی ہوگی۔ یہ ضرور ہے کہ اُس قسم کا ہر ممبر نامزد ہونا چاہیے (حکومت کی طرف سے) کسی بھی قسم کا حلقۂ انتخاب چاہے وہ ہندوستانیوں پر مشتمل ہو یا یورپینوں پر ناممکن العمل ہے۔''[1] اُس نے مشورہ دیا کہ ہندوستان کے لیے قانون ساز ادارے کو ختم کردیا جائے اور ہر پریسیڈنسی میں لیجسلیٹو کونسلیں قائم کی جائیں۔ بعد میں وہ اُس کے لیے تیار ہوگیا کہ سپریم لیجسلیٹو کونسلیں بحال رکھی جائے اور یہ تجویز پیش کی کہ ''ایسے ہندوستانیوں کو جو انگریزی طور طریقوں سے واقف نہیں ہیں۔ ان میں عملی حصہ دیا جائے۔''[2]

وڈ کا خیال تھا کہ نمائندہ ادارے ہندوستان کے لیے ناقابل عمل ہیں اور منتظمہ کے لیے باہر کے عناصر غیر مفید ثابت ہوں گے۔

لیکن آخر میں وڈ اس کے لیے تیار ہوگیا کہ سپرم لیجسلیٹو کونسل میں ترمیم کی جائے اور مدراس اور بمبئی پریسڈنسیوں میں لیجسلیٹو کونسلیں قائم کی جائیں۔ گورنر جنرل کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ بنگال، شمالی مغربی صوبہ جات اور پنجاب میں صوبائی کونسلیں قائم کردے۔

لیکن یہ لیجسلیٹو کونسلیں قانون سازی کے لیے انتظامی کونسلوں کی محض توسیع شدہ مشاورتی کمیٹیاں تھیں۔ چونکہ یہ ضروری سمجھا گیا کہ قانون سازی کے کام میں ہندوستانیوں کو شامل کیا جائے اس لیے باج گزار ریاستوں کے حکمرانوں یا ان کے وزیروں کو اور مالکان اراضی کے نمائندوں کو ابتدائی برسوں میں نامزد کیا گیا۔ سر سید احمد خاں، سر جتندر ناتھ ٹیگور اور کچھ دوسرے حضرات نامزد ہندوستانیوں میں شامل تھے جنھوں نے بعد میں کونسلوں کی بحثوں میں حصہ لیا۔

---

[1] ایضاً 4 فروری 1861

[2] وڈ کے کاغذات، وڈ کی طرف سے ایلگن کے نام، 28/اگست 1862

کونسلوں کو اور کوئی اختیارات حاصل نہیں تھے نہ وہ حکومت کے انتظامی اقدامات پر بحث کر سکتی تھی۔ لیکن وہ تھوڑے بہت اختیارات بھی جو انھیں حاصل تھے حکومت ہند کی دستوری حیثیت کی بنا پر اور کم ہو گئے تھے اس لیے کہ انتظامی اور قانون سازی دونوں میدانوں میں ہندوستانی امور کے تعلق سے کنٹرول کرنے اور رہنمائی کرنے کا آخری اختیار انگلستان میں موجود سکریٹری آف اسٹیٹ کو حاصل تھا۔

تقریباً 30 سال تک کونسلوں کو زیادہ جمہوری بنانے کے تعلق سے کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ ایکٹ کے منظور ہونے کے ایک سال بعد وڈ نے الگن کو لکھا کہ ہندوستان کی رائے عامہ کی حقیقی نمائندگی ممکن نہیں ہے۔ ''ہندوستان میں جو حالات پائے جاتے ہیں ان میں صرف ایک قسم کی حکومت ممکن ہو سکتی ہے یعنی ایسی مطلق العنانیت جس کو انگلستان سے کنٹرول کیا جائے۔''[1]

جبکہ ارباب اقتدار ذمہ دار کونسلوں کے مطالبے کے تعلق سے کان بند کئے ہوئے تھے۔ ہندوستان میں اس قسم کے حالات رونما ہو رہے تھے جن کی بنا پر حکومت کو بالآخر لوگوں کی خواہشات پر دھیان دینا پڑا۔ اُنیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں دُکھوں اور شورشوں میں اضافہ ہو گیا۔ اس زمانے میں ہندوستان کو اس صدی کے کچھ بدترین قحطوں کا سامنا کرنا پڑا۔ دیسی حکمرانوں سے تعلقات بھی تشویش کا باعث بنے ہوئے تھے۔ ان کے داخلی معاملات میں برطانوی مداخلت بڑھ رہی تھی اور ان کے ساتھ حلیفوں کی طرح کا سلوک کرنے کے بجائے انھیں ماتحت سمجھا جانے لگا تھا۔ 1857 میں ملہار راؤ گیکواڑ کو تخت سے اتار دیا گیا جس کا برا اثر ہندوستان کے رائے عامہ پر پڑا۔ اس کے علاوہ جرمنی کے فرانس پر فتح پانے کی وجہ سے یورپ میں طاقت کا توازن بدل گیا اور روس مشرق کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کا اثر بھی ہندوستان پر پڑا اس لیے کہ اس کی بنا پر حکومت ہند وسط ایشیا میں مہم جوئی کرنے لگی، افغانستان کے ساتھ اس کی تباہ کن جنگ ہوئی اور بلقان میں جنگ کا خطرہ بڑھ گیا۔ اس کی وجہ سے مسلمانوں میں بے چینی اور خطرے کا احساس پیدا ہو گیا اور انھیں بین الاقوامی اسلامی تحریک شروع کرنی پڑی۔

ہندوستان میں بڑی بے چینی تھی۔ ہیوم نے 1872 میں نارتھ بروک کو حالات کی سنجیدگی

---

[1] وڈ کے کاغذات، وڈ کی طرف سے ایلگن کے نام، 28/اگست 1862

سے آگاہ کیا کہ ''اب ہمارے اور ہماری تباہی کے درمیان محض سنگین حائل ہیں'' اور ''یہ کہ سلطنت کا مقدر معلق ہے۔'' اس نے گورنر جنرل کو مشورہ دیا ''میری یہ عاجزانہ درخواست ہے کہ آپ اس پر غور کریں کہ وقت گزرتا جا رہا ہے کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اپنی رعایا کی رائے اور خواہشوں کا اپنے انتظامی کاموں میں زیادہ لحاظ رکھ سکیں۔[1]

لیکن ہیوم کی بات سنی ان سنی کردی گئی۔ ہندوستان کے لیے حکومت خود اختیاری کا اصول انگلستان کے حکمراں طبقے کے لیے ناقابل قبول تھا۔ لٹن کہہ چکا تھا کہ ہندوستانی حکومت اختیاری اہلیت نہیں رکھتے ہیں۔ سر رچرڈ ٹیمپل نے 1880 میں لکھا تھا ''تعلیم یافتہ ہندوستانی بھی حکومت خود اختیاری کی توقعات رکھتے ہیں وہ بھی سیاسی طاقت بلکہ نمائندے ادارے چاہتے ہیں۔ یہ رعایتیں فی الوقت عملی سیاست کے میدان میں نہیں آتی ہیں۔''[2]

کاٹن کے اس خیال کو رد کر دیا گیا کہ تعلیم یافتہ طبقے ملک کی آواز اور ذہن کی نمائندگی کرتے ہیں اور یہ کہ عام لوگوں نے اپنے قدرتی اور بہترین نمائندوں کے طور پر تعلیم یافتہ طبقوں کو قبول کرلیا ہے اور اس لیے اس تحریک نے ایک قومی تحریک کی شکل اختیار کرلی ہے۔ اس کی اس یقین دہانی کا کوئی اثر نہیں ہوا کہ اس کے معنی یہ کہ تعلیم یافتہ طبقے وفادار ہیں کہ وہ برطانوی حکومت کے فوائد کو جانتے ہیں اور یہ کہ وہ یہ نہیں چاہتے ہیں کہ برطانوی حکومت ختم ہو جائے ''لیکن اُنھیں طاقت سے محروم کرکے ان میں تلخی پیدا کردی گئی ہے۔ ان کے حق میں جو بار بار کہا گیا تھا اس کو بالمقصد نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ یورپین ان کے ساتھ توہین آمیز سلوک کرتے ہیں اور ان کی جائز توقعات کو بڑے غرور اور تکبّر کے ساتھ ٹھکرایا جاتا ہے۔''[3]

1881 میں رپن نے ہارٹنگن کو، جو اس وقت سکریٹری آف اسٹیٹ تھا یہ مشورہ دیا کہ

---

[1] نارتھ بروک کا کاغذات، ہیوم۔اے۔او۔ کی طرف سے نارتھ بروک کو، یکم اگست 2781 (انڈیا آفس لائبریری)

[2] ٹیمپل، سر رچرڈ، 1880 میں ہندوستان، صفحہ 124

[3] کاٹن، ایچ۔جے۔ایس۔محولہ بالا، صفحہ 13۔کاٹن نے ان خیالات کا اظہار 1885 میں کیا تھا، جب کتاب کا پہلا اڈیشن شائع ہوا تھا۔

لیجسلیٹیو کونسلوں میں چنے ہوئے عناصر کو شامل کرنا مناسب ہوگا اس لیے کہ اس سے ہندوستانیوں کی ''سیاسی تعلیم'' ہوگی اور حکومت عام لوگوں کے خیالات سے واقف ہو سکے گی اور ''اُسے اس کا موقع ملے گا وہ اپنے ارادوں کی وضاحت کر سکے اور غلط فہمیاں دور کر سکے''[1] لیکن ہارٹنگٹن نے اس کی بات نہ مانی۔

اس دوران سیاسی تحریک ہندوستان میں طاقت حاصل کرتی رہی۔ سریندر ناتھ بنرجی نے 78-1877 میں ملک کا دورہ کیا تھا کہ سول سروس کے امتحان کے لیے عمر کم کرنے کے سوال پر پورے ہندوستان میں احتجاج کروایا جا سکے۔ صوبائی سیاسی انجمنوں نے عام جلسوں میں احتجاج کیا۔ ہندوستانی اخبارات نے حکومت کے فیصلے کے خلاف احتجاج کیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہوئی کہ انڈین نیشنل کانگریس نے، جو سیاسی تحریک میں آگے آگے تھی، نمائندہ حکومت کے تعلق سے ہندوستانیوں کے توقعات کی حمایت میں اپنی آواز اٹھائی۔ کانگریس کے پہلے اجلاس میں ایک تجویز منظور کی گئی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ ''سپریم اور موجودہ مقامی لیجسلیٹیو کونسلوں میں چنے ہوئے نمائندوں کی بڑی تعداد کو شامل کر کے ان کی اصلاح اور توسیع کی جائے۔'' اس قسم کی تجویزیں سال بہ سال منظور کی جاتی رہیں۔

لیکن نوکر شاہی حکومت کا ردعمل مایوس کن تھا۔ لارڈ ڈفرن نے حالات کا اجمالی جائزہ مندرجہ ذیل الفاظ میں لیا ''آ ؤ کانل کی طرح کی انجمنیں معرض وجود میں پہلے ہی آ چکی تھیں، کاکس کو بے اثر بنا دیا گیا ہے اور شدت پسند تحریک کے تمام فنون ہندوستان میں استعمال کئے جا رہے ہیں۔ ایک کمیٹی پارلیمنٹ کے لیے بھی یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم انصاف اور اعتدال پسندوں کا گھر ثابت ہو پھر آپ خود ہی سوچئے کہ ایک بابو پارلیمنٹ کیا ہوگی۔''[2] کانگریس کے مقاصد اور طریق کار کے تعلق سے اُس کی رائے کا اظہار اُس کے پرائیویٹ سکریٹری نے اُن لفظوں میں کیا ''چالاک اور فعال بنگالی بابوؤں کا ایک چھوٹا سا گروپ ایک یا دو انگریزوں کی مدد سے یہ کوشش کر

---

[1] رپن کے کاغذات، رپن کا خط رہاٹنگنن کے نام، 31 ردسمبر 1881

[2] ڈفرن کے کاغذات، ڈفرن کی طرف سے سر این۔ جے۔ اسٹیفین کو 6 رمارچ 1886

رہا ہے کہ ہندوستان کے تمام حصوں میں ایک سیاسی تحریک کی تنظیم اور اُس کی رہنمائی کرے۔''[1]

انگلستان میں قدامت پسند رائے عامہ کے سرکردہ آرگن لنڈن ٹائمس کا خیال تھا کہ وہ لوگ جو ہندوستان سے واقف ہیں اُس تبدیلی کی نامعقولیت کو تسلیم کریں گے۔

سرسید احمد خاں کے سیاسی مشیر اور ایم۔اے۔اُو کالج علی گڑھ کے پرنسپل بیک نے اُن چار وجوہ کا ذکر کیا جو نمائندہ اداروں کی کامیابی کی راہ میں ناقابل عبور رکاوٹ بنی ہوئی ہیں۔اُس کا خیال تھا کہ انڈین نیشنل کانگریس کے تصور کے مطابق جو نمائندہ حکومت بنے گی وہ نقلی نمائندہ حکومت ہوگی جس میں محض انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں کی نمائندگی ہوگی، یعنی اُس قسم کی اولی گارکی ہوگی جس میں اُس طبقے کو مکمل اقتدار سونپا جائے گا جس کی آبادی میں بہت تھوڑی سی تعداد ہے۔ بیک کے مشورے سے تعلیم یافتہ مسلمانوں میں نمائندہ حکومت کے مطالبے کی مخالفت کرنے کی خاطر تحریک شروع ہوئی۔دلیل یہ دی جاتی تھی کہ ہندوستان میں ایک قوم نہیں ہے اور یہ کہ نمائندہ حکومت میں ہندو اکثریت مسلم اقلیت پر ظلم توڑے گی اور اس لیے یہ بات مسلمانوں کے مفاد میں تھی کہ انتظامی طاقت یورپینوں کے ہاتھوں میں رہے۔[2]

سیاسی ترقی کی راہ میں حائل بڑی بڑی رکاوٹوں کے باوجود سرکاری حکام اُن واقعات کی طرف سے آنکھیں بند نہیں کر سکتے تھے جو ملک میں رونما ہو رہے تھے۔نمائندہ حکومت کی طرف پیش قدمی کی مخالفت کرتے وقت بھی اُنھیں تسلیم کرنا پڑتا تھا کہ ہاتھ رکھے بیٹھا رہنا ممکن نہیں ہے۔ ڈفرن نے بھی، جو نمائندہ حکومت کے مطالبے کا مذاق اُڑاتا تھا اور اُسے ''بابو پارلیمنٹ'' سے تعبیر کرتا تھا۔اب لارڈ نارتھ بروک کو لکھا کہ وہ کونسلوں میں چنے ہوئے عناصر کو شامل کرنے کے تعلق سے ایک منصوبہ سکریٹری آف اسٹیٹ کی خدمت میں پیش کر رہا ہے۔''[3]

اُس کے دس دن بعد کراس سے خطاب کرتے ہوئے اُس نے اعتراف کیا ''یہ شور و ہنگامہ محض بنگالی بابو ہی نہیں کر رہے ہیں بلکہ پورا تعلیم یافتہ ہندوستان، جس میں مسلمان بھی شامل ہیں۔

---

[1] ایضاً، والس کی طرف سے اے۔گوڈلے کو، 26/اپریل 1886

[2] شمال کے مسلمانوں میں ایک خط کو گشت کرایا گیا جس کا حوالہ بنگال میں دیا گیا، 29/جنوری 1887

[3] ڈفرن کے کاغذات، ڈفرن کی طرف سے نارتھ بروک کو، 11/مارچ 1887

چاہتا ہے کہ اُس کے داخلی معاملات کے انتظام میں اُس سے مشورہ کیا جائے۔''[1] اُس نے مزید کہا ''اُس میں شک نہیں کہ ایک مطلق العنان طاقت کی حیثیت سے جس کے پاس 200000 فوج موجود ہے۔ ہم کچھ دن تک اُن کے مطالبوں کو نظرانداز کر سکتے ہیں۔ ایسا صرف کچھ مدت تک کیا جاسکے گا۔''[2]

اس نے کیمبرج کے مٹرنیٹی کالج کے ماسٹر کو بھی لکھا تھا کہ ''ہندوستان پر حکومت کرنا روز بروز دشوار تر ہوتا جارہا ہے۔ اب یہ الگ تھلگ علاقہ نہیں ہے بلکہ ایک ایسا برّاعظم ہے جس کے دروازے پر جارحیت پسند پڑوسی کھڑے ہیں۔ دوسری طرف پچھلے تیس سال میں ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کئی اعتبار سے قابل اور ذہین طبقہ معرض وجود میں آگیا ہے اور فطری طور سے اس بات کا خواہش مند ہے کہ اپنے معاملات سے نبٹنے میں اُسے بڑا حصہ دیا جائے اور اس طرح ان دونوں نقاط نظر سے ملک کا نظم ونسق اب ویسا نہیں ہے جیسا اس پچھلے زمانے میں تھا جب یہاں خلا پائی جاتی تھی۔''[3] اس کے بعد انزیبل اے۔ میکینیزی کے نام ایک خط میں اس نے لکھا ''ہندوستانیوں کے ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ذہین طبقے کی نشوونما سرعت کے ساتھ ایسے حالات پیدا کررہی ہے جو ہوم رول کی تحریک کے مشابہہ ہیں اور اس کے ساتھ اس کی انجمنیں، گروہ اور دوسرے شدت پسند لوازمات بھی وجود میں آرہے ہیں۔''[4]

کونسل کی اصلاح کے تعلق سے ڈفرن بہت شک وشبہات رکھتا تھا۔ کلکتہ میں سینٹ انڈروز ڈنر کے موقع پر اس نے 30/نومبر 1888 کو جو تقریر کی تھی اس میں ہندوستان کے نمائندہ حکومت کے مطالبہ کے تعلق سے اس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔ جن باتوں پر اس نے خاص طور سے زور دیا وہ تھیں:

(1) ہندوستان ایک ملک نہیں ہے بلکہ ایسی سلطنت ہے جس کی آبادی '' ایسی مختلف قومیتوں پر

---

[1] کراس کے کاغذات، ڈفرن کی طرف سے کراس کو، 30/مارچ 1887

[2] ایضاً

[3] ڈفرن کے کاغذات، ڈفرن کی طرف سے کیمبرج کے مٹرنیٹی کالج کے ماسٹر کے نام، 8/اپریل 1887

[4] ایضاً، ڈفرن کی طرف سے انزیبل اے۔ میکینزی کے نام، (ٹرنٹو، کناڈا)، 26/اپریل 1887

مشتمل ہے جو مختلف مذاہب رکھتی ہیں، مختلف رسوم ادا کرتی ہیں، مختلف زبانیں بولتی ہیں، جنھیں تعصّبات، مختلف سماجی جلسوں اور مخاصمانہ مادی مفادات نے بھی ایک دوسرے سے علیحدہ کردیا ہے۔''

(2) ''ہندوستان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ دو بڑے سیاسی گروہوں یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں میں بٹا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ اور بہت سی چھوٹی قومیں ہیں، یعنی سکھ، عیسائی اور اینگلوانڈین۔''

(3) ''ہندوستان برطانوی سرمائے کی بڑی بڑی سرمایہ کاریوں کا اور وسیع برطانوی مفادات کا مرکز ہے جن میں سرکاری اور نجی دونوں مفادات شامل ہیں۔''

(4) ''برطانیہ عظمیٰ کے بین الاقوامی رشتوں کے تعلق سے ہندوستان اہم رول ادا کرتا ہے۔''

(5) ''ہندوستان کے لوگوں کی بہت بڑی اکثریت ناخواندہ ہے اور جن لوگوں نے تعلیم حاصل کی ہے وہ بھی بہت معمولی علم رکھتے ہیں۔''

''دو کروڑ کی آبادی میں سے صرف چند ہزار ایسے ہیں جو اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے والے اُلجھے ہوئے اور باریک معاشی اور سیاسی سوالوں کے تعلق سے ذہانت آمیز رویہ اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔''

اس مقدمے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ''کوئی سمجھدار آدمی یہ کیسے سوچ سکتا ہے کہ برطانوی حکومت ایک چھوٹی سی اقلیت کو اس کی اجازت دے کہ وہ اس عالی شان اور مختلف النوع سلطنت کے نظم و نسق کو کنٹرول کرے جس کی حفاظت اور خوش حالی کے لیے وہ (انگریز) خدا اور انسانی تہذیب کے سامنے ذمہ دار ہیں۔'' ظاہر ہے کہ ڈفرن کا جواب تھا ''ہندوستان کے موجودہ حالات میں ان لوگوں کی حقیقی اور موثر نمائندگی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے جن کی تعداد بہت زیادہ ہے، جن کے مفادات مختلف ہیں اور جن کی قومیتیں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔'' اور یہ کہ ''ان خصوصی حالات میں اس سے بڑی نعمت کوئی نہیں ہوسکتی ہے کہ ملک میں ایک بدیسی، خاطر اور غیر متغیر حکومت موجود ہے جو انصاف پسند ہے اور جس کے پاس اتنی طاقت اور خواہش موجود ہے کہ وہ سلطنت کے مختلف عناصر کے حقوق اور حیثیتوں کو ایک پُرامن اور ہم آہنگ اتحاد میں

تبدیل کرے۔[1] ظاہر ہے کہ اس کی آخری رائے یہ تھی کہ انگلستان کو کبھی بھی عوامی معاملات کو کنٹرول کرنے کے اقتدار اعلیٰ سے دست بردار نہیں ہونا چاہیے یا ان مختلف فرقوں کی خوشحالی کی ذمہ داری، جن پر وہ حکومت کرتا ہے، کسی اقلیت یا طبقے کے سپرد نہیں کرنا چاہئے۔

ہندوستان کے لوگوں کی ایسی پھوٹ اور اختلافات کے متعلق تو ڈفرن نے بہت کچھ کہا لیکن اُسے یہ خیال نہیں آیا کہ اُس مسئلے کو وجود میں لانے میں برطانیہ کا کتنا ہاتھ ہے جس کا حل (سیلی کے ایک جملے کی رو سے) کسی بھی منظم حکومت کے بنیادی فرائض میں شامل ہے یا جب وہ برطانوی حکومت کے فوائد کے گن گا رہا تھا اُس وقت اس نے یہ نہیں سوچا کہ خود اس کے اعتراف کے مطابق ہندوستانی عام طور سے اس حکومت سے کتنی نفرت کرتے تھے۔ اس نے اس قسم کے واقعات کا بھی کوئی ذکر نہیں کیا جیسے ہندوستانیوں کی طرف انگریزوں کا حقارت آمیز رویہ، عام لوگوں کی بڑھتی ہوئی غربت و افلاس، بار بار قحطوں کا پڑنا، ان عہدوں سے ہندوستانیوں کو محروم رکھنا جن میں ذمہ داری اور تنخواہ زیادہ تھی اور خود اپنے معاملات میں فیصلوں پر اثر انداز ہونے کے مواقع سے اُنھیں دور رکھنا۔

لارڈ ڈفرن نے کونسل میں جس قسم کی اصلاح کرنی چاہی وہ بہت محدود نوعیت کی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ''ذمہ دار ہندوستانی شرفا ملک کے نظم و نسق میں مدد دیں۔'' وہ اس کے لیے آمادہ تھا کہ ''صوبائی کونسلوں میں اصلاح کرے''، لیکن اُسی کے ساتھ اس کا کہنا تھا کہ پالیسی پر مکمل کنٹرول انتظامی ادارے کو حاصل ہوگا۔ کونسل کے سوال پر ہندوستانیوں کے احساس کی شدت نے ڈفرن کو متاثر کیا تھا۔ اس نے سکریٹری آف اسٹیٹ کے سامنے تجویز رکھی کہ ہندوستانی ممبروں کے تعلق سے انتخاب کے اصول کو مان لیا جائے لیکن اُسی کے ساتھ کہا ''اس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ ہندوستان کی مقدر یا ماتحت حکومتیں اپنے ان سامراجی اختیارات کے ضروری حصے سے دست بردار ہوں جو ایسی حکمراں طاقت کی حیثیت سے ان کے وجود کے لیے ضروری ہے جو مختلف قومیتوں پر اقتدار رکھتی ہے۔ جن میں سے زیادہ تر تہذیب اور روشن خیال کے اعتبار سے بہت پس ماندہ

---

[1] مارکوئنز آف ڈفرن نے ہندوستان میں جو تقریریں کی (1890) کلکتہ میں 30 نومبر 1888 کو سینٹ انڈورڈنر کے موقع پر کی گئی تقریر، صفحات 248-229

ہیں۔[1] لیکن اس کے مطابق دستوری پیش رفت میں ایک اور قدم اُٹھانے کا وقت آ گیا تھا'' اُسے (حکومت کو) نظم و نسق کے کام میں تعلیم یافتہ طبقے کے کئی ''نامزد اور منتخب'' لوگوں کو شامل کرنا چاہیے تا کہ اس کا ربط ہندوستان کی رائے عامہ کے ایک بڑے حصے سے قائم ہو جائے اور اس طرح اُن ذرائع میں اضافہ ہو جائے جن کی وساطت سے وہ ان مختلف فرقوں کے احساس سے باخبر ہونا چاہتی ہے جن کی خوشحالی اس کی ذمہ داری ہے۔''[2] ڈفرن کا مقصد تھا کونسلوں کو کچھ توسیع دینا اور حکومت کے کام میں ہندوستانیوں کو زیادہ شامل کرنا۔

یہ معمولی تجاویز بھی سکریٹری آف اسٹیٹ کے لیے قابل قبول نہ تھیں۔ لیکن ڈفرن کے جانشین لینڈ اوَن نے ان پر اصرار کیا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ کو اس نے جواب دیا ''حقیقت میں یہ ممکن نہیں ہے کہ نمائندگی ہندوستان کے لوگوں کے بجائے اس کی قوموں کو دی جائے۔ بابو ہندوستان کی قوموں کی نمائندگی نہیں کریں گے وہ تو صرف اپنی نمائندگی کریں گے۔''[3] اس نے مزید کہا ''میرا خیال ہے کہ ایسا کوئی اقدام ہندوستان میں ہماری حکومت کے لیے پیغام موت ہوگا۔''[4]

لیکن جب 1892 میں برطانوی حکومت کو مجبوراً ایکٹ بنانا پڑا تو کرزن نے، جو اس وقت انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ تھا، اس بات کی وضاحت کر دی کہ ایکٹ کا مقصد تھا ہندوستانیوں کے بالائی طبقے کی خواہشات سے حکومت کو باخبر رکھنا۔ اس کا مقصد نمائندہ حکومت میں حقیقی شرکت یا اس کی طرف پیش قدمی نہیں تھا۔ اس کے مطابق ہندوستان کے بے زبان کروڑوں انسانوں کے لیے نمائندہ حکومت نا قابل عمل تھی۔

---

[1] محکمہ داخلہ (عوامی)، خفیہ روداد، دسمبر 1889، نمبر 3-1 دستوری اصلاحات کے متعلق لارڈ ڈفرن کی روداد جو سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام اس کے مراسلے میں شامل تھی، مورخہ 6/نومبر 1888

[2] محکمۂ داخلہ (عوامی)، خفیہ روداد، دسمبر 1889 نمبر 3-1 دستوری اصلاحات کے متعلق لارڈ ڈفرن کی روداد جو سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام اس کے مراسلے میں شامل ہے، مورخہ 6/نومبر 1888

[3] کراس کے کاغذات، کراس کی طرف سے لینڈ اوَن کے نام، 30/جون 1889

[4] ایضاً، کراس کی طرف سے لینڈ اوَن کے نام، 23/جنوری 1890

اس ایکٹ کا مقصد انتہائی محدود تھا۔ نئی کونسلوں کو حدود کے اندر رہتے ہوئے کام کرنا تھا۔ مزید ممبروں کی تھوڑی سی تعداد اور حکومت کی طرف سے ان کی نامزدگی اور بحث پر بحث کرنے اور تفصیلات معلوم کرنے کا محدود میدان ہندوستانیوں کی سیاسی تعلیم کے لیے کافی نہیں تھا۔ ہندوستان کی رائے عامہ نے اس ایکٹ پر سخت تنقید کی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے صدروں میں سے فیروز شاہ مہتا، ڈبلیو سی۔ بنرجی۔ سریندر ناتھ بنرجی اور آر۔ سی۔ دت نے اور ہندوستان کے اخباروں نے زور دیا کہ راست انتخاب کئے جائیں اور کونسل کے کام کی توسیع کی جائے۔

لارڈ کرزن، جس نے حکومت ہند کی کارکردگی کے معیار کو بہت اونچا کر دیا اور اس میں بلا کی چستی پیدا کر دی، ایک فعال حکومت میں یقین رکھتا تھا اور حکومت کے تمام محکموں کے کاموں کو ترقی دینے اور ان کی ٹھوس پالیسیوں کی وضاحت کرنے میں اس نے اپنا خون پسینہ ایک کر دیا۔ لیکن اس کا رجعت پسند مزاج ایک اچھی اور اچھی طرح سے کی جانے والی حکومت سے آگے نہ بڑھ سکا، یعنی وہ یہ نہ سوچ سکا کہ سب کے ساتھ برابر کا انصاف کیا جائے، نظم ونسق کو خرابیوں سے پاک کیا جائے اور حکمرانوں کے تصورات اور انگلستان میں ہندوستان کے مفادات کے دعووں کے مطابق لوگوں کی بھلائی کے کام کئے جائیں۔ اس نے کہا ''ہندوستان جو دوسو سال بعد بھی اپنے فاتحین کے سامنے ایک خوبصورت اجنبی کی طرح کھڑا ہوا ہے وہ غیر محفوظ ہے، تنہا ہے، جس کو بہت کم سمجھا گیا ہے اور جس کے متعلق بہت کم واقفیت حاصل کی گئی ہے۔''[1] لیکن وہ یہ بات نہیں تسلیم کرتا تھا کہ اچھی حکومت حکومت خود اختیاری کا بدل نہیں ہوسکتی ہے۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے تعلیم یافتہ طبقوں کو ناراض کر دیا ہے۔ جنھیں اس کی اصلاحات میں حکومت خود اختیاری کا ہلکا سا عکس بھی نظر آتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ یہ بات ہندوستان کے مفاد میں عقلمندی یا تدبر نہیں کہ سیاسی راحت دی جائیں یا اصلاحات کی جائیں۔ اس نے کہا ''زیادہ قومی اتحاد کے تعلق سے ہندوستانیوں کی توقعات اور ملک کے عوامی امور میں زیادہ حصہ لینے کی ان کی خواہش سے مجھے بڑی ہمدردی ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ہندوستان کی نجات کی تلاش سیاست کے میدان میں نہیں کی جانی چاہئے۔''[2]

---

[1] لارڈ کرزن ہندوستان میں، 1896ء۔ 1905 اس کی تقریروں کا انتخاب از سرٹامس ایلے، جلد دوم، صفحہ 331

[2] ایضاً، جلد 1 صفحہ 156

چنانچہ 1892 کے ناکافی اور غیر اطمینان بخش ایکٹ میں سترہ سال تک کوئی ترمیم نہیں کی گئی۔ حالانکہ بغاوت کو پچاس سال اور میکالے کی لبرل پیش گوئی کو پچھتر سال گذر چکے تھے پھر بھی ہندوستان کی حکومت خود اختیاری ایک خواب سے زیادہ کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی جس پر دل چسپ گفتگو تو کی جا سکتی تھی لیکن اُسے عملی شکل نہیں دی جا سکتی تھی۔

پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو

برطانوی حکمراں اپنی بے عملی کے جواز میں یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ ہندوستان ایک قوم نہیں ہے اور یہ کہ انتخاب یا نمائندہ حکومت کا اصول ہندوستانی تصور نہیں ہے اور مشرقی روایات اور مشرقی ذہن سے مطابقت نہیں رکھتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے حکمرانوں نے اپنی ڈیڑھ سو سال حکومت میں یہ نہیں سوچا کہ ان رکاوٹوں کو دور کرنے کی ذمہ داری ان پر بھی ہے خاص طور سے ایسی صورت میں جب کہ ان کا کہنا تھا کہ سامراجی حکومت کا مشن تھا ان پس ماندہ قوموں کو، جن پر وہ حکومت کرتے تھے، تربیت دینا اور مہذّب بنانا۔ ہر ریاست کا یہ پہلا کام ہونا چاہیے کہ اچھی زندگی کے راستے میں حائل داخلی رکاوٹوں کو دور کرنے اور سماجی ہم آہنگی اور یک جہتی کے راستے میں آنے والی دشواریوں کو ختم کرے۔ تاریخ کے صفحات ان واقعات سے بھرے ہوئے ہیں کہ ریاستوں نے کس طرح قوموں کو جنم دیا اور پروان چڑھایا۔ برٹش کی ریاست نے کس طرح سینکڑوں چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستوں کو ملا کر جرمن قوم بنائی، ہیڈ مانٹ کی چھوٹی سی ریاست نے کس طرح اٹالوی قوم کو جنم دیا اور خود برطانیہ نے کس طرح کناڈا، آسٹریلیا اور جنوبی افریقہ کی قوموں کو ایسے گروپوں کو ملا کر بنایا جو سیاسی اختلافات رکھتے تھے اور تہذیبی اعتبار سے مختلف قوموں اور قومیتوں پر مشتمل تھے۔

اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ہندوستان دو بڑے اور کئی چھوٹے چھوٹے مذہبی فرقوں کا دیس تھا، یہ کہ اس کے لوگ بہت سی زبانیں بولتے تھے، یہ کہ اس کی آبادی 20 کروڑ سے لے کر 30 کروڑ تک تھی اور یہ کہ ان میں نسلی اور تہذیبی اختلافات پائے جاتے تھے پھر بھی کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ انتظام اور تعلیم کی سمجھداری اور فیض رسائی پر مبنی پالیسیوں پر عمل کر کے ان میں ایسی سیاسی برادری ہونے کا شعور پیدا کیا جا سکتا جس میں مختلف نسلیں، مذہب اور تہذیب شامل تھیں جو کچھ

ریاستہائے متحدہ امریکہ، کناڈا اور روس میں حاصل کیا گیا۔ اس کا ہندوستان میں حاصل کرنا ناممکن نہیں ہونا چاہیے تھا جہاں ایسی بہت سی وجوہ موجود تھیں جو سیاسی اتحاد کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جہاں تک دوسرے ملکوں کا تعلق ہے وہاں کی حکومت ''لوگوں کے ساتھ ایک فطری رشتہ رکھتی تھی'' اور داخلی یک جہتی کے لیے کوشاں تھی۔ لیکن ہندوستان میں حکومت اور عام لوگوں کے رشتے کی بنیاد مختلف مفادات پر قائم تھی۔ حکمراں نہ صرف نسل، مذہب، زباں، تہذیب اور روایات کے اعتبار سے مختلف تھے بلکہ وہ نفسیاتی اعتبار سے بھی الگ اور نمایاں تھے۔ فرض یا مفادات کے خیال کی بنا پر ایک انگریز کچھ مدت کے لیے ہندوستان آجاتا تھا لیکن اس کا مادی، جذباتی اور روحانی گھر کہیں اور تھا۔ وہ ہندوستان کے لوگوں کی امیدوں اور خواہشوں میں یا ان کے دُکھوں اور تکلیفوں میں شامل نہیں تھا نہ وہ ان کے ذہن کو سمجھ سکتا تھا۔ وہ ان کے درمیان رہ کر بھی ان میں سے ایک نہیں بن پاتا تھا۔

ان حالات میں جبکہ سامراجی اپنے مفاد کے اقتدار اعلیٰ پر اصرار کر رہے تھے اس میں کوئی تعجب نہیں کہ انگریز حکومت کا اولین فرض ادا کرنے میں ناکام رہے یعنی لوگوں کے درمیان ہم آہنگی اور باہمی اعتماد کا احساس پیدا نہ کر سکے۔ اس کے برعکس انھوں نے ایسی پالیسیاں اختیار کیں جن کی بنا پر فرقے اور فرقے اور طبقے اور طبقے کے درمیان خلیج اور بڑھ گئی۔ سامراج کے اس پہلے اصول پر سختی کے ساتھ عمل کیا گیا کہ ان کو فتح کرنے کے لیے لوگوں کے باہمی اختلافات کا استحصال کیا جائے اور اس کے بعد ان پر دائمی غلبہ رکھنے کے لیے ان اختلافات کو استعمال کیا جائے۔

اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں اختلافات پائے جاتے تھے۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ ابتدا میں حب الوطنی کے احساس کا ایسا رشتہ نہیں تھا جو کسی علاقے کے لوگوں کو متحد رکھ سکتا اور یہ کہ اپنی تباہی کے لیے ہندوستانیوں نے خود کو آلہ کار بنانے کی اجازت دی۔ پہلے ہندو اور مسلمان دیسی حکمرانوں اور سرداروں نے اور ان کے زوال کے بعد دونوں فرقوں نے اپنے سامراجی مالکوں کی چالوں میں ان کی مدد کی۔ 1857 کی بغاوت کے فوراً بعد سے لے کر منٹو کے عہد تک ہندو حکومت کے پسندیدہ عناصر بنے رہے۔ بغاوت میں انھوں نے جو حصہ لیا تھا اس کو معاف کر دیا گیا

مگر مسلمانوں کو برطانوی حکومت کے اصل دشمن سمجھا جاتا رہا۔ اس کے بعد حالات نے کروٹ لی۔ ہندوؤں کی بیداری نے حکومت کو پریشان اور ناراض کردیا جس کا اظہار مذہبی اور سماجی اصلاحات کی تحریکوں میں، ادب کے نشاۃ الثانیہ میں، شاندار ماضی کی یادوں کے احیا میں اور ہندو دانش وروں کی بڑھتی ہوئی قوم پرستی میں ہوا جس نے اخبارات اور منظم تحریک کے ذریعہ سیاسی شکایتوں کو دور کرنے کا مطالبہ کیا۔ سر رچرڈ ٹیمپل نے اپنے غصے کا اظہار اس طرح کیا ''وہ (برہمن پجاری) جو اپنی نسل اور خاندان پر فخر کرتے ہیں، اپنی ایزدی ابتدا پر یقین رکھتے ہیں، اپنے تقدس پر اصرار کرتے ہیں اور اپنی ذہنی برتری کا شعور رکھتے ہیں ایک ایسی نئی سلطنت کے متعلق ناقابل بیان جذبات رکھتے ہونگے جس نے تعصّبات، توہمات اور فرسودہ تصورات کو اس طرح کچل دیا جس طرح پرانے زمانے میں خود ان کی روایات کے مطابق جگن ناتھ کا رتھ لوگوں کو کچل دیا کرتا تھا۔''[1]

چنانچہ حکومت نے اپنی سرپرستی بدل دی۔ مسلمانوں کی خطرناک وہابی تحریک کچلی جاچکی تھی۔ سر سید احمد خاں، امیر علی اور عبداللطیف خاں کی طرح کے مسلم رہنما برطانوی شکوک کو رفع کرنے اور مسلمانوں میں وفاداری کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کررہے تھے۔ ہندو اور خاص طور سے بنگالی بابو کو انگریز حاکم قابلِ نفرت سمجھنے لگے تھے اور ان کے خلاف جذبہ مخاصمت بڑھتا جارہا تھا۔

لیکن ان کے پسندیدہ لوگ چاہے ہندو تھے یا مسلمان ان کا مقصد یکساں تھا یعنی فرقوں میں پھوٹ ڈالنا اور انھیں تیسرے فریق کے خلاف مل کر کام کرنے سے روکنا یعنی اس کے خلاف جو ان پر حکومت کرتا تھا۔ اس زمانے کے ریکارڈ پر نظر ڈالنے سے یہ بات اچھی طرح ثابت ہوجاتی ہے کہ فرقہ وارانہ منافرت سے حکمراں حلقوں کو کتنی خوشی ہوتی تھی اور کس طرح وہ اپنی کارروائیوں اور پالیسیوں سے فرقہ وارانہ جذبات کو مشتعل کرنے میں مدد دیتے تھے۔

وڈ نے ایلگن کے نام ایک خط میں کہا تھا ''ہم نے ایک دوسرے کے خلاف شہہ دے کر اپنی حکومت کو باقی رکھا ہے اور آئندہ بھی ہمیں یہی کرنا چاہیے۔ اس لیے آپ مشترکہ احساس کو روکنے کے لیے جو بھی کرسکتے ہیں وہ کیجیے۔''[2] مزید کہا ''میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ فوجیوں

---

[1] ٹیمپل سر رچرڈ، محولہ بالہ، صفحہ 118

[2] وڈ کے کاغذات، وڈ کا خط ایلگن کے نام، 3/مارچ 1862

کے درمیان بھائی چارے اور میل ملاپ کا جذبہ نہ پیدا ہو پائے۔ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے لیے اس بات کی بڑی ضرورت ہے کہ نسلوں اور طبقوں کو ایک دوسرے سے دور رکھا جائے تا کہ اس قسم کے خطرے سے زیادہ سے زیادہ بچا جا سکے۔ شمالی مغربی صوبے کا روزمرہ کام شمالی مغربی فوجوں سے چلائے، پنجاب کا کام پنجاب کی فوجوں سے، پنجاب کی فوجوں کو اس کے لیے تیار رکھے کہ وہ پوربیوں کو مار بھگائیں اور اگر ضرورت پڑے تو پوربیوں کو سکھوں کے خلاف استعمال کیجئے[1] ایک اور خط میں وڈ نے بڑے حکیمانہ انداز میں لکھا ہے ''ہندوستان میں ہمارے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ ہم اپنی حیثیت کو مضبوط بنانے کے کسی بھی ذریعہ کو نظرانداز کر سکیں۔ یقین کیجئے کہ نسلوں کی فطری مخالفت ہماری تقویت کے لیے ایک اہم عنصر ہے۔ اگر پورا ہندوستان ہمارے خلاف متحد ہو جائے تو ہم کتنے دن وہاں رہ سکیں گے۔''[2]

ہندوستان کے ساتھ ترک کے رشتے اور عثمانی خلیفہ کے ساتھ ہندوستانی مسلمانوں کی ہمدردی پر بحث کرتے ہوئے لٹن نے سلیس بری کو خطرے سے ان الفاظ میں آگاہ کیا تھا ''اس بات سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے کہ ہندوستان میں برطانوی سلطنت ایک مسلم طاقت ہے اور اس کا پورا انحصار ملک معظم کی حکومت کی پالیسی پر ہے کہ ہماری مسلم رعایا کے جذبات ہمارے لیے بڑی سلامتی کا باعث بنیں گے یا بڑے خطرے کا۔''[3]

پورے ہندوستان کا دورہ کر کے سریندر ناتھ بنرجی نے جو تحریک شروع کی تھی اس نے، انڈین ایسوسی ایشن کی 78-1877 کی تحریک نے اور 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کے قیام نے حکام کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔ لارڈ ای اے نے انجمن اسلام کی ایک یادداشت ڈفرن کو بھیجتے ہوئے لکھا تھا کہ ''اس میں شک نہیں کہ ہندوؤں کے ساتھ مقابلے میں مسلمان پیچھے ہیں اور میں چاہتا ہوں کہ ان کے لیے جو کچھ کر سکوں وہ کروں حالانکہ سرکاری عہدوں کے لیے درخواستیں دینے والوں کی تعداد میں اضافہ خوش آئندہ نہیں ہے۔''[4] بنگال کے لیفٹیننٹ گورنر سر ریورس

---

[1] ایضاً، ایضاً، 10/مئی 1862

[2] وڈ کے کاغذات، وڈ کا خط ایلگن کے نام، 19/مئی 1862

[3] لٹن کے کاغذات، لٹن کا خط سیلسبری کے نام، 23/جون 1877

[4] ڈفرن کے کاغذات، ای اے کا خط ڈفرن کے نام، 31/مئی 1885

ٹامس نے ''ملازمتیں حاصل کرنے میں مسلمانوں کی دست گیری کرنے''[1] کی سرکاری پالیسی میں تبدیلی کا استقبال کیا تھا۔ سر ڈبلیو۔ ایچ۔ گریگوری نے مسلمانوں کی تعلیم پر حکومت ہند کی تجویز کو بہت پسند کیا تھا۔ اس نے ڈفرن کو لکھا تھا ''مجھے یقین ہے کہ یہ بہت مفید ثابت ہوگی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس کا فائدہ محسوس ہو رہا ہے اور مسلمان برہمو اور بابوؤں کی تحریک سے بالکل علیحدہ ہیں۔ یہ بات بڑی کارآمد ثابت ہوگی کہ ہمارے تعلقات آبادی کے اس حصے سے اچھے ہو جائیں جو سب سے زیادہ بہادر ہے اور ایک زمانے میں سب سے زیادہ خطرناک دشمن تھا۔ لیکن انھوں نے ایک زبان ہو کر اعلان کر دیا کہ 1857 میں انھیں سزا مل چکی ہے اور وہ ایک مرد کی طرح اس کا مقابلہ کرنے کو تیار ہیں۔ ہندوؤں کے غلبے سے محفوظ رہنے کے لیے وہ اب ہماری طرف اور صرف ہماری طرف دیکھتے ہیں۔[2] ایک سال بعد گریگوری نے پھر گورنر جنرل کو لکھا ''انھیں (مسلمانوں کو) صاف صاف نظر آتا ہے کہ اُنھیں ہمارا ساتھ دینا چاہیے اس لیے کہ انھیں کسی بابو یا برہمن سے بھلائی کی توقع نہیں ہے۔''[3] اس کے بعد اگلے سال اس نے ان الفاظ میں ڈفرن کو مبارک باد پیش کی ''یہ بات آپ کے لیے بڑے اطمینان کا باعث ہوگی کہ آپ نے سمجھداری سے کام لے کر مسلمانوں کو ہمارے راج کا پکّا حامی بنا دیا ہے۔ اب آپ بابو کی کینہ پروری پر مسکرا سکتے ہیں۔''[4] شمال مغربی صوبجات کے لیفٹیننٹ گورنر کولون نے ڈفرن کو یقین دلایا تھا کہ اس کے صوبے کے مسلمان کانگریس کے بہت خلاف ہیں جسے وہ ہندو اقتدار کے دعوے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کا خیال تھا کہ ہندوستان کی قومی تحریک احمقانہ ہے جس میں مسلمان حصہ نہیں لیں گے۔[5]

سر جان اسٹریچی نے اعتراف کیا کہ ''حقیقت یہ ہے کہ ان مخاصمانہ مذاہب کا ساتھ ساتھ وجود ہندوستان میں ہماری سیاسی حیثیت کی تقویت کی ایک بڑی وجہ ہے۔''[6]

---

[1] ایضاً، سر ریورسٹی ٹامسن کا خط ڈفرن کے نام، 14/جنوری 1886

[2] ایضاً، ڈبلیو۔ ایچ، گریگوری کا خط ڈفرن کے نام، 24/فروری 1886

[3] ایضاً، سر ڈبلیو۔ ایچ، گریگوری کا خط ڈفرن کے نام، 21/مارچ 1887

[4] ایضاً، 16/مئی 1888

[5] ایضاً، سر اکلیفڈ کولون کا خط ڈفرن کے نام، 24/مئی 1888

[6] پی۔ مون نے ہندوستان میں بدیسی میں اس کا اقتباس دیا ہے۔ صفحہ 99

سکریٹری آف اسٹیٹ فار انڈیا جارج فرانسس ہملٹن نے ہندوستان کے وائسرائے کرزن کو لکھا تھا ''میرا خیال ہے کہ اب نہ سہی پچاس سال بعد ہندوستان میں ہماری حکومت کے لیے حقیقی خطرہ ہے۔ تحریک اور تنظیم کے مغربی تصورات کو رفتہ رفتہ قبول کرنے اور توسیع دینے کی کوشش اور اگر ہم تعلیم یافتہ ہندو پارٹی کو دو ایسے حصوں میں تقسیم کر سکیں جو متضاد تصورات رکھتے ہوں تو ہم اس قسم کی تقسیم سے اپنی حیثیت کو ان مسلسل حملوں سے محفوظ رکھ سکتے ہیں جو تعلیم کے پھیلاؤ کی بنا پر ہماری حکومت کے نظام پر ضرور کئے جائیں گے۔''[1]

اعلیٰ حکام کے خیالات اس قسم کے تھے جن کی اور بھی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جہاں تک خود ڈفرن کا تعلق تھا اس نے کراس سے کہا تھا ''اس ملک میں آتے ہی میں نے جن مسلمانوں کا اعتماد حاصل کر لیا تھا وہ بھی میرے ساتھ دوستانہ برتاؤ کرتے ہیں اور قریب قریب ہندوستان کے ہر شہر کے مسلمانوں نے مجھے سپاس نامے پیش کئے ہیں۔''[2] کراس اُسے پہلے ہی لکھ چکا تا کہ ''مذہبی جذبات میں یہ پھوٹ ہمارے لیے بہت مفید ہے اور مجھے امید ہے کہ آپ کی تفتیش کی کمیٹی کا نتیجہ اچھا ہی ثابت ہوگا۔''[3]

جب 1892 میں لیجسلیٹیو کونسلوں کی توسیع ہوئی تو ممبروں کو چننے کا سوال پیدا ہوا۔ امپیریل لیجسلیٹیو کونسل میں تقریر کرتے ہوئے لارڈ لینس ڈاؤن نے اس کی وضاحت کی کہ ایسے ادارے قائم کرنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے جو یورپ کی پارلیمانی اسمبلیوں کی طرح کے ہوں۔ ہم تو صرف اتنا چاہتے ہیں کہ ان کونسلوں کے لیے ان ممبروں کی خدمات حاصل کی جائیں جو واقعی نمائندہ ہوں لیکن جو حلقے اور تعداد کے بجائے قسموں اور طبقوں کی نمائندگی کریں گے۔''[4] چنانچہ اس طرح مختلف مذہبی فرقوں اور گروہوں کے لیے جداگانہ رائے دہندگی کا اصول شروع کیا گیا اور ہندوستان کو ایسے مختلف مفادات، طبقات اور تہذیبوں کا آمیزہ سمجھا گیا جن میں کوئی فطری سیاسی اتحاد نہیں

---

[1] ہملٹن کا خط کرزن کے نام، 2/ستمبر 1897

[2] کراس کے کاغذات، ڈفرن کا خط کراس کے نام، 26/مارچ 1888

[3] ایضاً، کراس کا خط ڈفرن کے نام، 14/جنوری 1887

[4] لینس ڈاؤن، امپیریل لیجسلیٹیو کونسل میں تقریریں، 16/مارچ 1893

تھا نہ آئندہ ہونے کی امید تھی۔

حکومت کے ان دعووں کے متعلق ایک کنزرویٹو انگریز نے نیشنل ریویو میں لکھا، جو ایک کنزرویٹو اخبار تھا کہ ''مسلمان اور ہندوؤں کے درمیان مبینہ رقابت توجہ ہٹانے اور اصلاحات سے بچنے کا ایک آسان طریقہ ہے میں یہ نہیں کہنا چاہتا ہوں کہ دونوں مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان اختلافات نہیں ہیں۔ لیکن یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ ان اختلافات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا گیا ہے۔'' انڈین نیشنل کانگریس کے متعلق اس نے لکھا تھا'' کانگریس کے ممبر قومیت کی مشترکہ بنیاد پر ہر ایک ملک کے شہری ہونے کی بنا پر، ایک حکومت کی رعایا ہونے کی وجہ سے، ایک قسم کے قوانین رکھنے والوں، ایک حکومت کو ٹیکس ادا کرنے والوں، ایک انتظامی نظام سے فائدہ یا نقصان اٹھانے والوں کی طرح، مشترک عوامل کی بنا پر، ایک سے حقوق حاصل کرنے کے لیے اور بوجھ سے ایک سا چھٹکارا پانے کے لیے آپس میں ملتے ہیں۔ لوگوں کو قومیت کے رشتے میں باندھنے کے لیے اگر یہ وجوہ کافی نہیں ہیں تو پھر یہ سوچنا بھی دشوار ہے کہ کیا کافی ہوگا۔''[1]

رجواڑوں کے ساتھ اتحاد

برطانوی اقتدار کو باقی رکھنے کے لیے ہندو، مسلم اختلافات گویا کہ ناکافی تھے اس لیے برطانوی سامراج کی دوہری ضمانت کے طور پر انگریزوں نے ایک اور دفاعی لائن بنائی۔ ہوسکتا تھا کہ مسلمان ان صورتوں میں انگریزوں کا ساتھ چھوڑ دیتے اور مذہبی اشتعال کے تحت 1857 کی خطرناک راہ پر چلنے لگتے۔ یہ محض خیال تھا خطرہ نہیں تھا۔ ہوسکتا تھا کہ بین الاقوامی مفادات کی بنا پر انگریزوں کا جھگڑا عثمانی خلیفہ سے ہوجاتا جس کی بنا پر مسلمان اپنا توازن کھو دیتے۔ واقعہ یہ ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں افغانستان، ایران اور مصر میں اسلام اور انگلستان کے درمیان تصادم ہوچکا تھا اور آرمینیا کے عیسائیوں کی گلیڈسن جو حمایت کر رہا تھا وہ امکانی جھگڑے کی وجہ بن گئی تھی۔

---

[1] فیروز شاہ نے خطبہ صدارت میں اس کا ذکر کیا، کلکتہ، 1890 انڈین نیشنل کانگریس (ٹینسن، 1917) صفحہ 72

یہ بات زیادہ کارآمد معلوم ہوئی کہ ہندوستان کے لوگوں کے ایک ایسے حصے کو دریافت کیا جائے اور اس سے تعلقات بہتر بنائے جائیں جس پر غیر معمولی حالات کی صورت میں اعتماد کیا جاسکے۔ عام لوگ جو جاہل اور تباہ حال تھے ان سے کوئی امید نہیں تھی۔ ان کے سامنے مسلسل روزی، روٹی کا سوال رہتا تھا۔ تعلیم یافتہ متوسط طبقہ سیاسی اعتبار سے فعال تھا۔ لیکن اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے اس میں بڑی بے چینی تھی اور وہ ایسے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے جنھیں حکومت تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوسکتی تھی۔

اب صرف دیسی حکمرانوں، سرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کا طبقہ اشرافیہ باقی رہ گیا تھا۔ مراعات دے کر ان کی وفاداری اور حمایت حاصل کرنے میں کچھ خطرے تھے۔ لٹن کے مطابق دیسی حکمراں سازشوں کے لیے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔[1] پھر بھی وہ جانتے تھے کہ حکمرانوں کی خوشنودی حاصل کرنا خود ان کے مفاد میں ہے۔ 1857 کی بغاوت کے دوران انھوں نے اپنے عمل سے ثابت کردیا تھا کہ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں۔ ڈلہوزی کی پالیسی نے انھیں خائف کردیا تھا اور اودھ کے تعلق داروں کے متعلق کیننگ نے جو پہلا فیصلہ کیا تھا وہ بھی ان کے لیے بہت اطمینان بخش نہیں تھا۔ چنانچہ وہ تذبذب کے شکار تھے اور اپنے مستقبل کے متعلق پریشان۔

ان حالات میں یہ ضروری تھا کہ دیسی حکمرانوں کے تعلق سے ایسی پالیسی تشکیل کی جائے جو ایک طرف تو ان کے سازش کرنے کے جذبے کو داب دے اور دوسری طرف ان کے تعاون کی ضامن ہو۔ ان کے عزائم کو ختم اور تمام خطروں کو دور کرنے اور حکم فرماں مالک اعلیٰ کا دیسی حکمرانوں کو وفادار رکھنے کی غرض سے وہ پالیسی تشکیل کی گئی جسے لی۔وانرنے "ماتحتی یونین" سے تعبیر کیا ہے۔

ماتحتی کی پالیسی کی بنیاد بالادستی، شاہی حق، حقوق معاہدے کے مضمرات اور فوجی مصلحت کے اصولوں پر قائم تھی۔ اس کا اطلاق ریاست کے خارجی اور داخلی دونوں اُمور پر کیا جاتا تھا۔ اس کا مقصد تھا ریاست کو برطانوی سلطنت کے ایک لازمی جزو میں تبدیل کرنا۔

1858 کے بعد ظاہر ہوگیا تھا کہ جب کہ ہندوستان بدل رہا تھا اور نئی سیاسی، انتظامی اور

---

[1] لٹن کے کاغذات، لٹن کا خط۔۔بروک کے نام، 8رفروری 1879

معاشی طاقتیں ملک کی صورت تبدیل کر رہی تھیں اس وقت ریاستیں علیحدہ اور وسطی پس ماندگی میں مبتلا نہیں رہ سکتی تھیں۔

1857 میں چھ سو سے زیادہ ریاستیں موجود تھیں اور کمپنی کی حکومت کے ساتھ ان کے رشتے مختلف نوعیت کے تھے۔ حیدرآباد کی طرح کی کچھ ریاستیں اقتدارِ اعلیٰ کے حقوق کی دعویدار تھیں اور ایسی حکومت کہی جاتی تھیں جن کی حیثیت حکومت کے مساوی تھی۔ کچھ دوسروں کو اتنے زیادہ حقوق حاصل نہیں تھے لیکن وہ بھی بالا دست حکومت کے ماتحت نہیں تھے۔ لیکن ان میں زیادہ تر ایسی تھیں جنھیں انگریزوں نے جنم دیا تھا اور انھیں ماتحت سمجھا جاتا تھا۔ ہر قسم کی ریاستوں کے حقوق و فرائض محض معاہدوں اور سمجھوتوں ہی میں درج نہیں تھے بلکہ کنونشن اور رواج کی بنیاد پر بھی قائم تھے۔

جب حکومت ہندوستان کمپنی سے تاج کو منتقل ہوگئی اس وقت ان تمام معاہدوں، سمجھوتوں اور سندوں کی، جو کمپنی اور ریاستوں کے درمیان ہوئے تھے، تصدیق کردی گئی تاکہ دیسی حکمرانوں کے ذہنوں میں کوئی شک وشبہ یا خطرہ باقی نہ رہے۔ لیکن عملاً ان کو لفظاً پورا کرنا ممکن نہ تھا اور حالات اور وقت کی تبدیلی کے ساتھ ان کے مفہوم کو بھی اس طرح توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا کہ ان کا اصل مقصد بڑی حد تک بدل گیا۔ اس طرح کی جانے والی ترمیم کے جواز میں یہ دلیلیں پیش کی گئی کہ پارلیمنٹ کے اختیار کی تجدید نہیں کی جاسکتی ہے، یہ کہ تاج کو ایسے شاہی حقوق حاصل ہیں جن کی ریاستیں پابند ہیں اور یہ کہ بالا دست حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ ریاست کو خارجی حملوں اور داخلی شورشوں سے محفوظ رکھے اور اس کے لیے ان کے داخلی معاملات میں مداخلت کرے۔

اس طرح برطانوی حکومت کا کنٹرول ریاستوں پر بڑھتا رہا اور ان کی حیثیتیں کم ہوتی رہیں اور بہت سی پابندیاں ان پر لگ گئیں۔

سب سے پہلے برطانوی تاج یعنی انگلستان کے بادشاہ وقت سے وفاداری اور اس کی اطاعت۔ چونکہ بادشاہ عزت کا سرچشمہ تھا اس لیے اُسے حق حاصل تھا کہ وہ دیسی حکمرانوں کو خطابوں، سلامی، تمغوں، عہدوں اور حقوق سے نوازے اور دیسی حکمرانوں کا فرض تھا کہ وہ انھیں

قبول کریں۔ پچھلے راجہ یا نواب کی گدی پر اس کا جانشین اس وقت بیٹھ سکتا تھا جب اُسے بادشاہ یا اس کا نائب بھی وائسرائے قبول کرے۔ وراثت کے متعلق تمام جھگڑوں کا فیصلہ برطانوی حکومت ان حقوق کے مطابق کرتی تھی، ان ریاستوں کا انتظام سنبھال لیتی تھی جن کے حکمراں نابالغ تھے اور بدنظمی یا بغاوت کی صورت میں حکمراں کو گدی سے اتار دیتی تھی۔ اس کو برطانوی بالادستی کہا جانے لگا۔

جہاں تک خارجہ رشتوں کا تعلق تھا چاہے بدیسی حکومتوں کے ساتھ ہوں یا دوسری ہندوستانی ریاستوں کے ساتھ، ہندوستان کے دیسی حکمرانوں کو بین الاقوامی حیثیت حاصل نہیں تھی۔ ان کے اختیارات پوری طرح حکومت ہندوستان کو منتقل کر دیے گئے تھے۔ وہ کسی بدیسی طاقت کے ساتھ معاہدہ کر سکتے تھے نہ کسی دوسری ہندوستانی ریاست کے ساتھ سرکاری رشتے قائم کر سکتے تھے۔ ہندوستانی ریاستوں کے باشندے جب کسی دوسرے ملک کو جاتے تھے یا وہاں رہتے تھے تو ان کی حفاظت برطانوی حکومت کی ذمہ داری تھی اور وہ برطانوی قوانین کے پابند تھے۔

جہاں تک خارجہ رشتوں کے دفاع کا تعلق تھا یا بالادست حکومت کو غیر معمولی حالات میں ریاستوں کے پورے وسائل کو استعمال کرنے کا لامحدود حق حاصل تھا۔ اسکے علاوہ کچھ ریاستوں کو فوج کی ایک مقررہ تعداد برطانوی حکام کی انتظامی اور تکنیکی کمانڈ میں مشترکہ دفاع کے لیے رکھنی ہوتی تھی۔ فوجی معاملات میں ریاستوں کے اختیارات سختی کے ساتھ کم کر دیے گئے تھے اور اس کا فیصلہ برطانوی حکومت کرتی تھی کہ کس ریاست کے پاس کتنی فوج ہوگی۔

چونکہ ریاستوں کی حفاظت کی ذمہ داری بادشاہ پر تھی اس لیے یہ بھی ضروری تھا کہ آمدورفت اور خبر رسانی کے ذرائع یعنی ریلیں، ٹیلی گراف اور ڈاک کے نظام بھی برطانوی حکومت کے کنٹرول میں ہوں۔

آخری بات یہ کہ بالادست حکومت نے معاہدوں کی وضاحت کچھ اس طرح کی تھی کہ ریاستوں کی داخلی آزادی بھی بڑی حد تک کم ہوگئی تھی۔ مثال کے طور پر وہ کہتے تھے کہ اُنھیں حق حاصل ہے کہ ریاستوں کی شکست وریخت نہ ہونے دیں، جائز حکمراں کے خلاف بغاوت کو کچل دیں۔ بدنظمی سے ریاست کو بچائیں، غیر انسانی رواجوں یا فطری قوانین اور عام اخلاق کے خلاف

جرائم کو روکیں اور مذہبی رواداری پر اصرار کریں پھر عدالتی معاملات میں حکومت ہندوستان کو برطانوی رعایا کی ذات پر اختیار حاصل تھا اور ریاستوں کے علاقوں میں واقع چھاؤنیوں میں ہر شخص اور ہر چیز پر اُسے اختیار حاصل تھا حالانکہ وہ اس کا علاقہ نہیں تھا۔

چنانچہ جیسا کہ سیلسبری نے کہا تھا ہندوستان کے دیسی حکمران اپنے علاقوں کا انتظام کرنے کے لیے برطانوی حکومت کے نائب بنا دیے گئے۔ برطانوی سلطنت کے لیے خطرہ پیدا کرنے کی ان کی طاقت ہمیشہ کے لیے ختم کر دی گئی۔

لیکن اتنا کافی نہیں تھا۔ لٹن کا مقصد تھا ''ہندوستان کے طبقہ شرفا کو پوری طرح ہاتھ میں لینا اور اچھی طرح استعمال کرنا''۔[1] اس نے تجویز کیا ''باج گزار ریاستوں اور دیسی حکمرانوں کے ساتھ ہمارے تعلقات میں اس طرح ترمیم کی جانی چاہیے کہ ان سے ہماری سلطنت کے استحکام اور سلامتی کو فائدہ پہنچے۔''[2] اس کا کہنا یہ نہیں تھا کہ دیسی حکمرانوں کی سیاسی طاقت میں اضافہ کیا جائے بلکہ وہ صرف اتنا چاہتا تھا کہ ان کی تسکین کی جائے اس لیے کہ ''آپ جتنا زیادہ مشرق کی طرف جاتے ہیں اتنی ہی زیادہ ایک چھوٹی سی جھنڈی کی اہمیت بڑھتی جاتی ہے۔''

ان جھنڈیوں میں سب سے زیادہ اہم تھا ملکہ وکٹوریہ کا اعلان جس میں کہا گیا تھا ''اپنے موجودہ علاقوں میں توسیع کرنے کے ہم خواہش مند نہیں ہیں۔'' دوسری تھی ڈلہوزی کے ریاست کے سوخت ہونے کے نظریے اور گود لینے کی سند دینے کے طریقے کو ادا کرنا۔ ان دونوں کی وجہ سے یہ یقین ہو گیا تھا کہ ریاستوں میں تاریخی خاندانوں کی حکمرانی ہمیشہ باقی رہے گی اس طرح ان کی تشویش دور ہو گئی اور دیسی حکمراں اس کے لیے آمادہ ہو گئے کہ معاہدوں کی وہ تعمیری وضاحت کی جائے جس کی بنا پر ان کی حیثیتیں اور اختیارات بہت کم ہو گئے پھر بھی وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کو بحال و برقرار رکھنے کے لیے بڑی وفاداری کے ساتھ آمادہ ہو گئے۔

اتنے زیادہ، اتنے مضبوط اور بظاہر ناقابل تسخیر سلامتی کے قلعے بنانے کے بعد ہندوستان کے برطانوی حکمراں طاقت کے نشے میں اتنے چور اور اپنی نسلی ''برتری'' کے خیال میں اتنے مگن

---

[1] لٹن کے کاغذات، لٹن کا خط سیلسبری کے نام، 11 / مئی 1876

[2] ایضاً، 25 / مئی 1876

ہو گئے کہ وہ اس تبدیلی کی اہمیت کو نہ سمجھ سکے جو ملک میں آ رہی تھی۔ ان کے اس خیال نے کہ وہ ہندستان کے بے زبان کروڑوں لوگوں کے ولی کی حیثیت سے نیک ارادے رکھتے ہیں۔ اُن کی آنکھوں سے دیکھنے کی صلاحیت چھین لی اور وہ یہ نہ دیکھ سکے کہ عام لوگوں کو کتنے دکھوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور اپنی پاکبازی کے متعلق ان کے غرور نے انھیں اس بات پر اُکسایا کہ ہندوستانیوں کے دکھوں کو وہ خود اُن کے رواجوں اور عادتوں کا نتیجہ بتائیں جس کی بنا پر لوگوں کی ترقی کی راہ میں ناقابل عبور رکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔ چونکہ عام لوگ سیاسی اعتبار سے بہت پس ماندہ تھے اور برطانوی راج کے لیے خطرہ پیدا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے اس لیے انگریزوں کو ان کی حقیقی بھلائی کے اقدامات کرنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی تھی۔ ہندوستان کے دیسی حکمرانوں کو چرب زبان اور مراعات کے ذریعے بے ضرر بنا دیا گیا۔

دوسری طرف متوسط طبقہ اور خاص طور سے اُس کا اگوا دستہ یعنی تعلیم یافتہ حصہ حکمرانوں میں ملے جلے احساسات پیدا کرتا تھا۔ یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ ان کے تعاون کے بغیر انتظامی ڈھانچہ نہیں چلایا جا سکتا ہے۔ اس لیے ان سے اچھے تعلقات رکھنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ اپنے غیر تعلیم یافتہ ہم وطنوں پر وہ اثر ڈال کر تشویش ناک مسائل پیدا کر سکتے تھے اس لیے انھیں مطمئن رکھنا ضروری تھا لیکن حکومت پر ان کی تنقید ناپسندیدہ تھی۔ اور ان کی سیاسی مانگوں کو بنیادی طور سے سامراجی مفادات کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ وہ جن اصلاحات کی وکالت کرتے تھے اُن سے برطانوی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے جو سیاسی، معاشی غلبہ حاصل کیا گیا تھا وہ ختم ہو جاتا۔ اس رجحان کو ختم کرنا ضروری تھا۔ موثر انداز میں ان سے نبٹنے کے لیے ایسی پالیسی پر عمل کرنا ضروری تھا جس کے دو رُخ ہوں۔ یہ ضروری تھا کہ انھیں دلیلیں دے کر یقین دلایا جائے کہ ان کی کم تعداد اور نمائندہ حیثیت کی کمی کی بنا پر ان کے مطالبات ناقابل قبول ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستان کی مطلق العنانیت کی سیاسی روایتیں اور جمہوری طریقِ عمل کے متعلق اس کی ناتجربہ کاری حکومت کے نمائندہ نظام سے مطابقت نہیں رکھتی ہیں۔

یہ کہا گیا ہے کہ ہندوستان متحد نہیں ہے نہ اس کا کوئی امکان ہے کہ نسلی، مذہبی اور تہذیبی اختلافات کی بنا پر کبھی قومی جذبہ وجود میں آ سکے۔ دوسری بات یہ تھی کہ اپنی دلیلوں کو تقویت

پہنچانے کی غرض سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان مذہبی اختلافات کو اور مختلف تہذیبوں اور مذہبوں کو، جو سیاسی اتحاد کے راستے میں حائل تھے، انتظامی اقدامات کے ذریعہ ابھارا گیا۔ تعلیم یافتہ مسلمانوں نے خصوصیت کے ساتھ اس کا اثر قبول کیا اس لیے کہ ان کے قلیل المدتی اور فوری مقاصد میں اور ہندوؤں کے مقاصد میں ٹکراؤ تھا۔ اُن باتوں پر بہت اختلاف نہیں تھا جن کا راست تعلق مذہب سے تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ مذہب کے محافظ یعنی مسلم علما قومی مطالبات کی حمایت کرنے کے لیے تیار تھے۔ اختلافات تو سیکولر امور میں تھے مثلاً کونسلوں میں نمائندگی، ملازمتوں میں نمائندگی اور حکومت کی سرپرستی حاصل کرنے میں مقابلہ۔

اس قسم کی پالیسیوں پر عمل کرکے انگریزوں نے یوم الحساب کو ملتوی کرنے کی کوشش کی۔ ہندوستان کے حالات میں انھوں نے اسی قدیم قول کی اہمیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ ''اچھی حکومت حکومت خود اختیاری کا بدلہ نہیں ہوتی ہے۔'' وہ متوسط طبقہ کے اثر کو بھی پوری طرح نہ سمجھ سکے جو ایک ''چھوٹی سی اقلیت'' ہونے کے باوجود عام لوگوں کے دل دماغ کے مترادف تھا۔ انھوں نے تاریخ کے اس سبق سے فائدہ نہیں اٹھایا کہ کوئی سیاسی نظام تغیر سے بری نہیں ہوتا ہے اور یہ کہ فرقہ وارانہ اختلافات اس طوفان سے نہیں بچا سکتے ہیں جو عالمی تبدیلیوں کے نتیجے میں ہندوستان کی سلطنت پر منڈلا رہا تھا۔ ان کی ضد، کم نگاہی اور تکبر نے ان میں ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی پیدا کر دی تھی اور اس لیے وہ وقت کی تحریر کو پڑھنے اور مستقبل کے لیے تیار رہنے کی اہلیت کھو بیٹھے تھے۔

انگریزوں میں کچھ ایسے بھی تھے جو اہل نظر تھے اور جنھوں نے یہ دیکھ لیا تھا کہ برطانوی راج ہمیشہ نہیں رہ سکتا ہے اور اس لیے ایک نہ ایک دن ہندوستان کو آزادی دینا پڑے گی۔ کچھ ایسے بھی تھے جو لبرل نقطۂ نظر رکھتے تھے لیکن ہندوستان کے مسئلے کی اُلجھنوں نے انھیں پریشان کر دیا تھا اس لیے وہ مستقبل کو صاف صاف نہیں دیکھ سکتے تھے۔ لیکن فی الجملہ حکمراں طبقہ اپنی گرفت ڈھیلی کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جب یہ بات واضح ہوگئی کہ برطانوی مفادات کو پورا کرنے کے لیے سیاسی غلبہ ضروری نہیں ہے اُس وقت بھی وہ سامراجی بنے رہے۔

انھوں نے کارلائل کی اس بات کو بھلا دیا یا غیر اہم سمجھا جو اس نے اٹھارہویں صدی کے

فرانس کے متعلق کہی تھی لیکن جس کا اطلاق دوسرے ملکوں پر بھی ہوتا تھا یعنی ''بھوک اور برہنگی اور پاکبازی کے ساتھ کئے گئے مظالم کا بوجھ 25 ملین دلوں پر تھا۔ فرانسیسی انقلاب کی اصل وجہ یہ تھی نہ کہ زخمی احساس برتری اور فلسفے کے وکیلوں، دولت مند دکانداروں اور دیہاتی اشرافیہ کے فلسفوں سے انکار تمام ملکوں میں ہونے والے انقلابیوں میں ایسا ہی ہوگا۔''[1]

انھوں نے اس دور کے عظیم انقلابی لینن کو بھی اہمیت نہیں دی جس نے کہا تھا ''سیاست وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں عام لوگ ہوتے ہیں۔ وہاں سے نہیں جہاں ہزاروں ہوتے ہیں بلکہ وہاں سے سنجیدگی کے ساتھ سیاست شروع ہوتی ہے جہاں لاکھوں کروڑوں ہوتے ہیں۔''[2]

بھوک، برہنگی اور مظالم کا احساس ہندوستان کے لاکھوں کروڑوں عام لوگوں کے دلوں میں مایوسی پیدا کررہے تھے اوراس کے ساتھ انھیں ان لوگوں کے پیچھے لے جارہے تھے جو بہتر زندگی کے دعوے کرتے تھے۔ انھوں نے ان لوگوں کو بھی اخلاقی تقویت پہنچائی جوان کے لیے اچھی خبر لائے تھے۔ انسانی نسل کی 1/5 آبادی کے بے چینی اور بے اطمینانی کے طوفان کو چھوٹی موٹی باتوں سے نہیں روکا جاسکتا تھا۔ پانی کو مختلف دھاروں میں بانٹ کر کچھ دن کے لیے سیلاب کو ٹالا جاسکتا تھا لیکن ہمیشہ کے لیے آگے بڑھنے سے روکا نہیں جاسکتا تھا۔

---

[1] کارلائل، انقلاب فرانس کی تاریخ، III باب 1

[2] لینن، مجموعۂ تصانیف، جلد 7 صفحہ 290

بارہواں باب

سیاسی تحریک

I۔ متوسط طبقے کا رول

اُنیسویں صدی کا نصف آخر ایسا زمانہ تھا جب ملک کے بدیسی حکمرانوں کے ہاتھوں سے سیاسی باگ ڈور چھوٹتی جارہی تھی اور ملک کی کشتی موجوں کے رحم وکرم پر تھی۔ ایک طرف تو یہ عہد برطانوی سامراجی طاقت کی مرکزیت کا دور تھا، جس کا مستقر لندن میں تھا اور جسے ہندوستان میں نوکرشاہی کا آہنی ڈھانچہ اور ایک منظم فوج تقویت پہنچارہی تھی جو بظاہر ناقابل تسخیر اور ناقابل تغیر معلوم ہوتا تھا اور دوسری طرف یہ دور تھا ہندوستان کے عام لوگوں کا جو غریب تھے، ناخواندہ تھے، غیر مسلم تھے اور بٹے ہوئے تھے جنھیں ''ایک سست گام مجمع '' کہنا چاہیے۔ ان دونوں کے درمیان تھا متوسط طبقہ جس کی تعداد کم تھی اور جو پورے ملک میں بکھرا ہوا تھا لیکن وہ زیادہ تر شہروں میں پایا جاتا تھا اور اس نے جدید تصورات کو جذب کرلیا تھا اور سیاسی اور معاشی سوالوں کے تعلق سے تنقیدی رجحان رکھتا تھا۔ لیکن عملاً یہ طبقہ وسطی قسم کے بہت زیادہ دیہاتی آبادی میں گھرا ہوا تھا اور قرابت داری اور ذات پات کے وسطی رشتوں میں بندھا ہوا تھا۔ رسم ورواج، روزمرہ کی

عادتوں اور جذباتی ردِعمل کی حد تک یہ عام لوگوں سے علیحدہ نہیں تھا اس لیے کہ اس کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ روایت کے اُن رشتوں کو توڑ دے جن میں وہ جکڑا ہوا تھا۔

مکمل طور سے سیکولر، جمہوری اور قومی نقطۂ نظر رکھنے والے ایک گروہ کی شکل میں متوسط طبقے کا ارتقا کسی حد تک غیر یکساں تھا۔ اس کے باوجود آزادی کی وہ خواہش، جو ہر انسانی دل میں پائی جاتی ہے، تمام ہندوستانی فرقوں میں ایک تحریک پیدا کر رہی تھی اور ان میں پائے جانے والے تذبذب، شکوک اور خطرات کے باوجود سب چاہتے تھے کہ عام لوگوں کی حکومت حقیقت میں عام لوگوں کی حکومت ہو اور ان میں سے ہر فرقے کو حکومت میں اس کا حصہ ملے۔

اس قسم کی صورتحال کسی بھی طرح عجیب و غریب نہیں کہی جا سکتی۔ سیاسی آزادی ہر قسم کے سماجوں میں پائی جاتی رہی ہے اور پائی جا سکتی ہے چاہے وہ فیوڈل سماج ہو، نیم غلام اور نیم آزاد سماج ہو، توہمات آلودہ سماج ہو، اصنام پرستانہ سماج ہو، نیم خواندہ سماج ہو وغیرہ وغیرہ۔ آزادی کو اس کا انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ عام لوگ اخلاقی طور سے مکمل ہو جائیں، تمام سماجی خرابیاں دور کریں اور سب لوگ خواندہ ہو جائیں۔ اپنی تمام تر خامیوں کے باوجود ہندوستان کے متوسط طبقے نے برطانوی حکومت کو چنوتی دی، حالات نے اس کی مدد کی۔ ہندوستان کے لوگوں کے ساتھ یکجہتی پیدا کرنے سے برطانوی حکمرانوں نے انکار کر دیا، اس کی حکومت ہندوستانی سماج کے لیے فطری نہیں تھی۔ وہ تو داخلی یا بدیسی عنصر تھا جو ہندوستان کی سیاست میں داخل ہو گیا تھا۔ چونکہ انگریزوں نے جذب ہونے سے انکار کر دیا تھا اس لیے وہ ہندوستان میں صرف اس وقت تک حکومت کر سکتے تھے جب تک وہ غیر متحد تھا۔ لیکن جونہی ہندوستان اپنے قومی اتحاد سے واقف ہو گیا اس کے لیے فوراً بدیسی عناصر کو نکال پھینکنے کی کوشش کرنا ضروری ہو جائے گا۔

دوسری بات یہ کہ جن علاقوں کو طاقت کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے ان کو صرف اس صورت میں رکھا جا سکتا ہے جب اُس کا اخلاقی جواز پیش کیا جا سکے اس لیے کہ سنگینوں سے اور سب کچھ کیا جا سکتا ہے لیکن ان پر بیٹھا نہیں جا سکتا۔ اخلاقی جواز کی بنیاد ہوتی ہے محکوموں کا اُسے تسلیم کرنا، اس کی اجازت دینا اور اس کے متعلق نیک خیالات رکھنا، لوگوں کی مرضی کے خلاف کچھ کیجیے تو اس کا نتیجہ ہوگا مزاحمت، اگر آپ طاقت اور تشدد سے کام نہ لے کر ان کی مرضی کے مطابق

کام کریں گے تو وہ خود بخود آپ کے ساتھ آئیں گے۔ بدیسی حکومت میں اس کی تباہی کے اسباب مضمر ہوتے ہیں۔

II۔ابتدائی سیاسی انجمنیں

ہندوستان کی انفرادیت کے متعلق سیاسی شعور رام موہن رائے کے زمانے ہی میں نمودار ہو چکا تھا۔ ان کا کام دونوں لبرل اور قدامت پسند ہندوستانیوں نے جاری رکھا جن میں شدت پسند دوسروں کے مقابلے میں زیادہ فعال تھے، انھوں نے 1828 میں اکاڈمک ایسوسی ایشن قائم کی تھی جس میں مذہبی اور اخلاقی سوالوں کے ساتھ سماجی اور سیاسی مسائل پر بھی بحث ومباحثہ کیا جاتا تھا۔ 1838 میں انھوں نے سوسائٹی فار اکیوزیشن آف جنرل نالج (عام معلومات حاصل کرنے کی انجمن) قائم کی جس میں جیوری کے ذریعہ مقدموں کی سماعت، اخباروں کی آزادی اور سرکاری محکموں میں جبراً کام کرنے والے کی طرح کے سوالوں پر بحث کی جاتی تھی۔ اس کے بعد 1842 میں دوارکا ناتھ ٹیگور سیاسی تحریک کی تنظیم کے لیے جارج ٹاپسن کو انگلستان سے ہندوستان لائے۔ انگلستان میں غلامی کے خلاف تحریک چلانے میں ٹاپسن نے بڑا حصہ لیا تھا۔ کلکتہ آنے کے بعد وہ جلسے کرنے لگا اور اس کی کوششوں کے نتیجے میں بنگال برٹش انڈیا سوسائٹی کا قیام 1843 میں عمل میں آیا۔ اس کے اغراض اور مقاصد میں یہ شامل تھا کہ ملک کے لوگوں کے حالات، قوانین، اداروں اور وسائل کے متعلق معلومات حاصل اور لوگوں کو فراہم کی جائیں اور اور پرامن اور قانونی نوعیت کے ایسے دوسرے ذرائع سے، جو ضروری معلوم ہوں، ہندوستان کے لوگوں کے تمام طبقوں کی بھلائی کے کام کئے جائیں، ان کے حقوق کی توسیع کی جائے اور ان کے مفادات کو فروغ دیا جائے۔

1828 میں کلکتہ کے زمینداروں نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے ایک انجمن بنائی تھی جس کا نام تھا ''لینڈ لارڈ سوسائٹی''، اس کا ابتدائی مقصد تھا قانونی ذرائع سے مال گزاری معاف اراضیوں کو حاصل کرنے کی حکومت کی کوشش کو ناکام بنانا۔

اس طرح بالائی طبقے کے زمیندار اور درمیانی طبقے کے شدت پسند دونوں سیاسی تحریک میں

شامل ہوگئے تھے۔ 1851 میں انھوں نے مل کر برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی بنیاد ڈالی اس کے پہلے صدر تھے رادھا کانت دیپ اور پہلے سکریٹری تھے ربندرناتھ ٹیگور، وہ چاہتے تھے مقامی انتظام اور حکومت کے نظام میں سدھار کیا جائے۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ '' اس کے گذشتہ اور آئندہ انتظام کے تعلق سے ہندوستان کے لوگوں کے احساسات سے برطانوی عام لوگوں کو واقف کرایا جائے۔ 1853 '' کے چارٹر کی جدید سے پہلے پارلیمانی تفتیش کے دوران برٹش انڈین ایسوسی ایشن نے ان کے ملاحظے کے لیے ایک یادداشت پیش کی تھی جس میں ان کی تجاویز شامل تھیں جن میں سے ایک یہ تھی کہ ہندوستانیوں کو اس کا حق دیا جائے کہ وہ لیجسلیٹیو کونسلوں کے لیے اپنے نمائندے منتخب کرسکیں۔

اسی قسم کے حالات ہندوستان کے دوسرے حصوں میں بھی نمودار ہورہے تھے۔ مثال کے طور پر بمبئی میں '' لوک ہت وادی '' دیش مکھ نے ہندوستان کے لیے ایسی پارلیمنٹ کی مانگ کی جس میں ہر شہر اور ضلع کی نمائندگی ہو۔ اگست 1852 میں جگناتھ شنکر شٹ، دادا بھائی نوروجی، نوروجی فریدوں جی، بھاؤ داجی اور دوسرے لوگوں نے '' بمبئی ایسوسی ایشن '' قائم کی، اس کے مقاصد تھے '' لوگوں کی خواہشات معلوم کرنا، عام بھلائی کے لیے حکومت کو اقدامات کی سفارش کرنا اور موجودہ خرابیوں کو دور کرنے اور عام مفاد کے اقدامات کرنے کے لیے ہندوستان اور انگلستان کی حکومتوں کو یادداشتیں پیش کرنا۔ ''

1852 میں ایسوسی ایشن نے پارلیمنٹ کو ایک عرضداشت پیش کی جس میں بدنظمی کے متعلق خصوصی الزامات درج تھے اور عملی اصلاحات کی سفارشیں کی گئی تھیں، ان میں شامل تھیں لیجسلیٹیو کونسلوں کی تنظیم نو، اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کے تقرر اور یونیورسٹیوں کے قیام کی سفارشیں۔

مدراس میں بھی 1853 کے چارٹر کی تجدید سے کچھ پہلے اس قسم کی ایک انجمن معرضِ وجود میں آگئی جس کا نام تھا '' مدراس نیو ایسوسی ایشن '' اس نے پارلیمنٹ کو ایک یادداشت پیش کی جس کے ذریعے '' اس پریسیڈنسی کے لوگوں کی شکایتوں اور ضرورتوں سے '' اُسے مطلع کیا گیا، شکایتوں میں سب سے زیادہ اہمیت محاصل کو دی گئی تھی۔ یادداشت پیش کرنے والوں نے

''زمینداری اور رعیت داری دونوں نظاموں میں جدتیں پیدا کرنے کے خلاف اپنی بیزاری کا اظہار کیا تھا خصوصیت کے ساتھ اس بنا پر کہ وہ دونوں ناانصافی اور مظالم کے آلہ کار ہیں۔ لیکن انھوں نے سب سے زیادہ رعیت داری کی خدمت کی تھی جس نے کاشتکاروں کے طبقے کو بدترین غربت اور بدحالی کا شکار بنا دیا تھا۔ اس یادداشت میں '' کمپنی کی عدالتوں کی ناکارگی، دیگر اور اخراجات کی شکایت کی گئی تھی۔ ان کی خاص خاص مانگیں تھیں سڑکوں، پلوں اور ذرائع آب رسانی کی تعمیر اور لوگوں کی تعلیم کا بہتر انتظام۔ انھوں نے سرکاری اخراجات میں کمی اور مقامی حکومت کی ایسی شکل کی مانگ کی تھی جو رعایا کی بھلائی اور ملک کی خوش حالی کا باعث بن سکے۔''[1]

چنانچہ اس سے پہلے کہ حکومت ہندوستان تاج کو منتقل ہو تعلیم یافتہ طبقے نے رائے عامہ کو ہموار کرنا اور حکومت کی غلطیوں اور خامیوں کے خلاف شکایتیں کرنا شروع کر دیا تھا۔ انھوں نے سیاسی تحریک کے مغربی طریقہ پر عمل کرنا شروع کر دیا تھا اور انھیں یہ معلوم ہو چکا تھا کہ شکایتوں کو رفع کرانے کے لیے انھیں ہندوستان اور انگلستان میں حکومتوں کو توجہ دلانی ہوگی۔

انیسویں صدی کے نصف آخر میں برطانوی حکمرانوں اور ہندوستانی متوسط طبقے کے درمیان جو جھگڑا شروع ہوا اُس کو دو مرحلوں میں بانٹا جانا چاہیے۔ پہلا مرحلہ 1885 تک چلا جب انڈین نیشنل کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ اس مرحلے میں ہندوستان کی سیاسی تحریک غیر منظم تھی، کبھی کبھی اس میں اُبال آتا تھا اور جوش سے محروم تھی۔ اشتعال انگیزی کے بعد جب جذبات مستقل ہو جاتے تھے تو تحریک میں جان پڑ جاتی تھی اور جب شکایت کی فوری وجہ دور ہو جاتی تھی تو اس پر جمود طاری ہو جاتا تھا۔ اس زمانے میں متوسط طبقہ کمزور تھا اور اس کی سیاسی سرگرمیوں میں قدرتی طور سے منصوبے اور اتحاد کی کمی تھی۔ لیکن 1885 کے بعد اس نے طاقت اور خود اعتمادی حاصل کر لی۔ دوسرے مرحلے میں سیاسی تحریک کا مرکز کانگریس بن گئی، تحریک میں تیزی پیدا ہو گئی اور اس کا اصل مقصد بن گیا ذمہ دار حکومت خود اختیاری کا حصول۔

---

[1] حکومت ہندوستان کے علاقوں کے متعلق سلیکٹ کمیٹی کے سامنے دی گئی شہادت کی روداد کا ضمیمہ، تیسری رپورٹ، ضمیمہ ڈی، صفحات 223-194

III۔قوم پرستی تحریک کی ابتدا

اس بات کو یاد رکھنا چاہیے کہ انیسویں صدی کا نصف آخر وہ زمانہ تھا جب برطانوی سامراج کی بڑی توسیع ہوئی جس کے دوررس نتائج نکلے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس توسیع کی بنا پر ایشیا اور افریقہ میں جو جارحانہ فوجی کارروائیاں کی گئیں ان سے ہندوستان پر بوجھ بڑھ گیا اور اس کی معاشی اور سماجی ترقی میں رکاوٹ پڑ گئی۔ ہندوستان کے مسلمانوں پر اس کا خصوصی اثر پڑا کیونکہ زیادہ تر توسیع مسلم ریاستوں کی قیمت پر کی گئی تھی۔ بدیس کے ہم مذہبوں کی بدحالی نے ان میں ہمدردی کے مذہبی جذبات پیدا کر دیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمانوں کے فرقہ وارانہ جذبات نے ایک واضح شکل اختیار کر لی اور ان کا رشتہ غیر ملکوں سے جُڑ گیا۔

خود ملک کے اندر حکمراں طبقے کے رویے میں تبدیلی اور ان کے بڑھتے ہوئے سامراجی تکبّر نے ہندوستانی متوسط طبقے کو اپنی کم حیثیت اور ہتک آمیز موقف کا اور زیادہ احساس دلا دیا۔ چنانچہ اس کی ناراضگی بڑھتی گئی۔ دانش وروں کا طبقہ سماجی نابرابری کو پسند نہیں کرتا تھا اور اُسے نمائندہ حکومت اور سرکاری ملازمتوں کے جن میں سول اور فوجی دونوں ملازمتیں شامل تھیں، مسئلوں سے زیادہ دلچسپی تھی، تاجر لوگ حکومت کی آزاد تجارت پالیسیوں سے نالاں تھے جو ہندوستان کے بجائے انگلستان کے مفاد میں تھیں۔ ان کے کاروبار میں انتظامی دشواریاں حائل تھیں۔

جہاں تک عام لوگوں کا تعلق تھا ان کی معاشی حالت بہت خراب تھی اور معیار زندگی انتہائی ناقابل اطمینان۔ بار بار پڑنے والے قحطوں نے معاشی دکھوں میں اضافہ کر دیا تھا۔ لوگوں کے عام دکھوں میں اور اضافہ اس وقت ہو گیا جب طاعون کی وبا ملک میں پھیل گئی جس کے بہت سے لوگ شکار ہو گئے اور جس نے 1892 کے بعد ملک میں خوف و ہراس پھیلا دیا۔

حالات کچھ بہت اچھے نہیں تھے جب مذہبی مصلحین منظر عام پر نمودار ہوئے۔ ان کا مقصد تھا مذہب کی روح کی بازیافت اور لوگوں کو بتانا تھا کہ دوسرے لوگوں کی طرف ان کے فرائض کیا ہیں۔ مذہبی اصلاح کی تحریک نے ادبی نشاۃ ثانیہ کے ایک نئے مرحلے کو جنم دیا اور قوم پرستی کے

جذبات اور غریب بدحال لوگوں کے لیے ہمدردی میں اضافہ کردیا۔ شاعروں، ناول نگاروں، مضمون نگاروں، صحافیوں، مؤرخوں غرض کہ سبھی لکھنے والوں نے قومی شعور کو ابھارنے میں اپنا رول ادا کیا۔

مصنفوں اور خطیبوں نے عام لوگوں میں مغرب کی آزادی کی تحریکات کے متعلق معلومات پھیلائی یعنی آئرلینڈ کی ہوم رول کی تحریک اور اٹلی کی اتحاد اور آزادی کی تحریک کے متعلق 1858 میں سوم پرکاش نے میزنی، گاری بالڈی، کسور اور اسکاٹ لینڈ کے ہیرو ولیم والس کے متعلق مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ سریندر ناتھ بنرجی نے 1875 میں اٹلی کی بیداری اور سکھوں کی تاریخ پر کئی تقریریں کیں جن میں سکھ رہنماؤں کی بہادری کی داستانیں دہرائیں۔ دوسرے لوگوں نے تھودے، تالستائی اور کاتے کے تصورات بیان کیے۔ بنکم چندر چٹرجی (1834۔1894) میں اثر آفریں کہانیاں لکھیں جنھوں نے قومی جذبے کو بڑھایا۔

اس طرح جو جذبہ بیدار ہوگیا تھا اس نے عملی کاموں کو بڑھاوا دیا۔ نیشنل سوسائٹی کا قیام عمل میں آیا جس میں پیش پیش تھے راج نرائن بوس اور بابا گوپال متر۔ انھوں نے ایک اسکول، ایک چھاپا خانہ، ایک اخبار اور ایک جن جمنیزیم کی بنیاد ڈالی۔ انھوں نے '' ہندو میلے '' کی ابتدا کی جو ہر سال کیا جانے لگا۔ اس میں ہندوؤں کی گذشتہ اور موجودہ برتری اور بنگالی زبان و ادب کے متعلق تقریریں کی جاتی تھیں۔ گیت گائے جاتے تھے جن میں بار بار دہرایا جاتا تھا ''ہندوستانیوں کی پوری نسل کو متحد ہونا چاہیے۔'' مغرب سے واپسی کے بعد ویویکانند نے ہندوستان کے دورے کے دوران اپنی تقریروں میں آزادی کا پیام دیا اور ہندوستان کے نوجوانوں سے کہا کہ اٹھیں، ہمت سے کام لیں اور عام لوگوں کی خدمت کریں۔

مسلم علما جو عام مسلمانوں کی رہنمائی کرتے تھے، برطانوی حکومت کے خلاف تھے، دیوبند کے اسکول نے، جس کے اثر اور شہرت کو عام طور سے تسلیم کیا جاتا تھا، ایسی تمام تحریکوں کی حمایت کی جن کا مقصد تھا برطانوی غلبے کو کمزور بنانا اور ہندوستان کی آزادی کی خواہش کو تقویت پہنچانا۔

1851 میں برٹش انڈین ایسوسی ایشن قائم کی جاچکی تھی لیکن اس ایسوسی ایشن کو جمہوری

بنانے کی نئی کوششیں کی گئیں خاص طور سے کمار گھوش نے کی (امرت بازار پتریکا کے بانی) لیکن اس میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔ اُس کے بعد سریندر ناتھ بنرجی اور ان کے دوستوں آنند موہن بوس (پہلے ہندوستانی جنھوں نے کیمبرج میں ریاضی میں درجہ اوّل پایا اور بیرسٹر تھے)، سبنا تھ شاستری (برہمو رہنما) اور کرشن موہن بنرجی نے 1876 میں انڈین ایسوسی ایشن کی داغ بیل ڈالی۔ اس کی شاخیں بنگال کے اضلاع میں قائم ہوگئیں اور بنگال کے باہر کی سوسائٹی سے انھوں نے رشتے قائم کرلیے۔

اس ایسوسی ایشن کی تجویز پر سریندر ناتھ بنرجی نے 78-1877 میں ہندوستان کا دورہ کیا اور اس کے دوران 1878 کے ورنا کلر پریس ایکٹ اور لائسنس ایکٹ کی خدمت کرنے اور کسانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے جدوجہد کی گئی۔ 1880 کے عام انتخابات سے کچھ پہلے لال موہن گھوش کو انگلستان بھیجا گیا تاکہ برطانوی رائے دہندگان کو وہ ہندوستان کے مسائل سے واقف کرا سکیں، اس ایسوسی ایشن کے آرگن بنگالی نے زوردار الفاظ میں لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا'' صوبوں کے بے حسی سے پیچھا کٹا لیجیے اور اس خلوص و جوش کا مظاہرہ کیجیے جو قوم کی تعمیر کے لیے ضروری ہیں ''اُس نے پروگرام کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا'' بڑے بڑے صوبائی شہروں میں عام جلسے کئے جائیں گے جن میں ہندوستان کے مسائل پر مباحثہ ہوگا اور ہندوستان کی ضرورتوں اور شکایتوں سے انھیں واقف کرایا جائے گا۔ پورے ایک سرے سے لے کر دوسرے سرے تک ایسے کتابچوں کو گشت کرایا جائے جن میں ہندوستانی موضوعات پر بحث کی جائے گی ... اور آخر میں ہندوستان کے لوگوں کے مسلم دوستوں کو ایک ایسی جامع اور مشترکہ تنظیم کے تحت مجتمع کیا جائے گا جو ملک کے عوامی اداروں سے ہمدردی رکھتی ہو اور ان کے ساتھ خط و کتابت کرتی ہو۔ چنانچہ اس ملک اور انگلستان میں پائے جانے والے ہندوستان کے دوستوں کو ایک مشترکہ ادارہ بنانا چاہیے اور میرا خیال یہ ہے کہ اس قسم کی مشترکہ تنظیم ناقابل مزاحمت ہوگی۔''[1]

---

[1] بنگالی، 21/اپریل 1879

IV۔سامراج کی حیات نو

سیاسی تحریک کی مزید پیش رفت کا سبب دو قوتوں کا عمل تھا یعنی 1870 کے بعد سامراج کی حیات نو اور برطانیہ کی سامراجی پالیسیاں اور تعلیم یافتہ ہندوستانیوں میں حکومت خوداختیاری کی بڑھتی ہوئی خواہش۔کبھی کبھی انگریز اس کو سیاسی مصلحت سمجھتے تھے کہ بہت احتیاط کے ساتھ اور بادل ناخواستہ چھوٹی چھوٹی سیاسی مراعات دے کر لوگوں کی تسکین کردی جائے جو حکومت کی سب سے نیچی سطح سے شروع ہوتی تھیں یعنی شہروں اور ضلعوں کی حکومت خوداختیاری سے۔لیکن انھیں نمائندہ اداروں اور حکومت خوداختیاری کی طرف انقلابی قدم اٹھانے کی مترادف بتایا جاتا تھا اور اس کے متعلق بڑا ڈھنڈورا پیٹا جاتا تھا۔چنانچہ 19 صدی کے آخری پچیس سال کی تاریخ حاکموں اور محکوموں کے درمیان تصادموں اور ایک طرف حقوق پر اصرار اور دوسری طرف ان سے انکار کیا ایک بے رنگ کہانی ہے۔

پہلے مرحلے یعنی 1857 سے 1874 تک انگلستان کی پالیسیوں کا تعین وہ لوگ کرتے تھے جن کی قیادت پامرسٹن کرتا تھا۔وہ چاہتا تھا کہ سمندروں پر برطانیہ کا اقتدار قائم ہو، آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والی پارٹیوں کے چیمپئن کی حیثیت سے براعظم کے معاملات میں رول ادا کرے، برطانیہ کے رقیب روس کی تحدید کرے اور عثمانی سلطنت کو انگریزوں کے رقیبوں کے ہاتھوں میں آنے سے بچائے رکھے۔جہاں تک ہندوستان کا تعلق تھا اس پالیسی کے معنی تھے سرحدوں پر ''بااقتدار عدم حرکت'' اور وہاں امن قائم رکھنے اور سامراجی مقاصد کو پورا کرنے کے لیے ملک کو ترقی دینا۔

1874 میں طاقت ٹوریوں کے ہاتھوں میں آگئی اور 1905 تک ان کے ہاتھوں میں رہی۔صرف دو دفعہ حکومت تھوڑی تھوڑی مدت کے لیے لبرلوں کے ہاتھوں میں آئی یعنی 1880 سے 1886 تک اور 1892 سے 1895 تک۔نئے ٹوری سامراج کے پس پشت ڈسرائلی کا دماغ کام کررہا تھا اور سامراجی توسیع کے لیے عوامل اس نے مہیا کئے تھے، گورنر جنرلوں نے، جو اس کی پیش رفت کی پالیسی کے ایجنٹ تھے، ہندوستان کو مہموں اور جنگوں میں مبتلا کردیا، اس کی

بہت قلیل مالیات پر نا قابل برداشت بوجھ ڈال دیا، ترقی پسند سرگرمیوں کو قریب قریب ختم کر دیا، معاشی ترقی کو نظر انداز کر دیا اور حکمرانوں اور محکوموں کے درمیان تلخی بڑھا دی۔

بغاوت کے بعد کے برسوں میں زیادہ تر انتظامی نظام کی تشکیل نو کا کام کیا گیا تھا یعنی ضرورت سے زیادہ مرکزی اور فضول خرچ حکومت کی مالی دشواریوں کا مقابلہ کرنے اور لوگوں کی معاشی تکلیفوں کو کسی قدر دور کرنے کا کام۔

1861 میں مقنّنہ، عدلیہ اور دفاعی فوجوں کے متعلق قوانین بنائے گئے۔ 1853 میں جو لیجسلیٹو کونسل قائم کی گئی تھی اس نے اس سے زیادہ اختیارات حاصل کر لیے تھے جو اس کو دیے گئے تھے۔ چنانچہ نئی کونسلوں (1861) کے پر کاٹ دیے گئے اور انھیں یہ محسوس کرا دیا گیا کہ وہ محض مشاورتی ادارے ہیں۔ 1861 کے انڈین ہائی کورٹ ایکٹ نے تاج کو سارا اختیار دے دیا کہ وہ ہائی کورٹ قائم کر دے اور قدیم اور بے ڈھنگی سپریم کورٹ اور صدر دیوانی اور فوجداری عدالتوں کو ختم کر دے۔ ہائی کورٹوں کو ان عدالتوں کی نگرانی کے، جن کی اپیلیں سننے کا وہ مجاز تھا، اور ماتحت عدالتوں کے کام اور مقدموں کی سماعت کو منضبط کرنے کے لیے ضابطے بنانے کے اختیارات دے دیے گئے۔ 1861 کے ایک اور ایکٹ کی بنا پر فوج کی ساخت میں بڑی تبدیلی ہو گئی یعنی ہندوستانی حصے کے مقابلے میں ہندوستانی فوج کے یورپین حصے کی تعداد اور طاقت میں اضافہ کر دیا گیا۔

معاشی مسئلے کے خاص خاص پہلو تھے عام لوگوں کی انتہائی غربت وافلاس اور ملک پر بڑھتا ہوا محاصل کا بوجھ، لوگوں کے دکھوں کا اندازہ فرد کی آمدنی سے لگایا جا سکتا ہے۔ حکام نے جو حساب لگایا تھا اس کی رو سے ہندوستان میں فی کس اوسط آمدنی 30 روپیہ سالانہ تھا۔[1] لیکن اس وقت قیمتیں تیزی کے ساتھ بڑھ رہی تھیں۔ اعداد سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حالات پورے ملک میں پائے جاتے تھے۔ بنگال میں چاول، جو 1860 میں روپیہ کا 50 سیر ملتا تھا، 1870 میں روپیہ کا 20.8 سیر، 1890 میں روپیہ کا 18.3 اور 1905 میں روپے کا 13.2 سیر تھا۔ پچاس سال میں قیمتیں تقریباً چار گنا ہو گئی تھیں جب کہ آمدنی میں فی کس 25 فیصدی کا بھی مشکل سے

---

[1] ڈیوس، کے ہندوستان اور پاکستان کی آبادی (ہرنسٹن، 1591) صفحہ 602

اضافہ ہوا تھا۔[1]

1857 کی بغاوت میں جو اخراجات کئے گئے تھے ان کی وجہ سے ہندوستان کی مالی حالت بہت خراب ہوگئی تھی۔قحطوں اور حکومت کی فضول خرچی خصوصاً فوجی اخراجات کی زیادتی نے اور 80-1878 کی افغان جنگ، 40-1839 کی چین کی جنگ، 1836 کی ایرانی مہم اور 1875 کی پیراک ی مہم کی طرح کی برطانوی فوجی کارروائیوں کے اخراجات کے ہندوستان پر غیر منصفانہ بوجھ کی بنا پر حالات خراب تر ہوگئے۔سال بہ سال حکومت کو خساروں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔فصلیں خراب ہونے کی وجہ سے مالگزاری میں کمی ہوگئی جس کا اثر فی الجملہ سرکاری آمدنی پر پڑا۔دیہاتوں میں لوگ دکھوں میں مبتلا ہوگئے تھے جنھیں راحت پہنچانے کے لیے حکومت کو روپیہ خرچ کرنا پڑتا تھا اس لیے کہ 1860 کے بعد ملک کے کسی نہ کسی حصے میں قحط پڑتا ہی رہتا تھا، سرکاری قرض بڑھتا جارہا تھا۔ 1870 میں بڑھ کے وہ 102 ملین پاؤنڈ ہو چکا تھا۔

بڑھتے ہوئے اخراجات کو پورا کرنے کے لیے محاصل میں اضافہ کیا گیا۔انکم ٹیکس ایک فیصدی سے بڑھا کر ڈھائی فیصدی اور پھر 3 فیصدی کر دیا گیا، مدراس میں نمک پر محصول دگنا کر دیا گیا، بمبئی میں تقریباً تگنا (3.81 فیصدی(اور دوسرے صوبوں میں اس میں 50 فیصدی کا اضافہ کر دیا گیا۔

قرضوں میں سے یا پیداوار سرکاری کاموں پر خرچ کرنے کی پالیسی اختیار کی گئی اور صوبوں کو اس کا اختیار دے دیا گیا کہ وہ اپنے کچھ اخراجات مقامی محاصل لگا کر پورے کریں۔ 57-1856 اور 71-1870 کی درمیانی مدت میں محاصل میں 50 فیصدی سے زیادہ کا اضافہ ہو گیا تھا۔[2]

حکومت کی معاشی پریشانی کا ایک اور سبب تھا چاندی کی قیمت میں گراوٹ جس کی وجہ سے روپیہ کی شرح تبادلہ پر اثر پڑا اور ہندوستانی خزانے پر بوجھ بڑھ گیا۔اس کے علاوہ بدیسی تجارت کے تعلق سے جن پالیسیوں پر عمل کیا جاتا تھا وہ ہندوستان کے مفادات کے لیے مضر تھیں۔ذرائع

---

[1] جوشی، جی۔وی، تحریریں اور تقریریں، صفحہ 600

[2] دت، رمیش، وکٹوریہ کے عہد میں ہندوستان کی معاشی تاریخ (نیا ہندوستانی ایڈیشن) صفحہ 279

مواصلات اور آمدورفت میں جو انقلاب آیا تھا اس نے ہندوستان کی بدیسی تجارت کو بڑھا دیا تھا۔ 1834-35 اور 1838-39 کی درمیانی پانچ سالہ مدت میں اس کی مالیت 1894 لاکھ روپے تھی جو 1868-69 میں ختم ہونے والی پانچ سالہ مدت میں 10,697 لاکھ روپیہ ہوگئی اور 1877 میں 11,400 لاکھ روپیہ ہوگئی تھی۔[1] یہ بات مشکوک ہے کہ تجارت میں اضافہ ہندوستان کے لوگوں کی خوشحالی میں تناسب اضافے کو ظاہر کرتا ہے یا نہیں۔ لیکن اس سے یہ ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ ہندوستان کی معیشت پوری طرح انگلستان کی معیشت کے تابع تھی جس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ ملک جو ایک زمانے میں مصنوعات برآمد کرتا تھا اب دنیا کو خام مال مہیا کرنے لگا اور اُسے جدید صنعت کو فروغ دینے سے روک دیا گیا، صرف ہندوستان میں سوتی کپڑے کے مل تھے جنھیں برطانوی صنعت کاروں کے حسد کے خلاف سخت جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔

V۔ ہندوستانیوں میں بے چینی

(1) نیل کی شورشیں

تاج کی راست حکومت کی ابتدا ہی سے 1858 میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان جھگڑے شروع ہوگئے۔ پہلے جھگڑے کی وجہ تھی نیل کے باغداروں کی زیادتیاں۔ اس جھگڑے کا سبب تھا ہندوستانی کسانوں کی طرف نیل کے باغداروں کا ظالمانہ اور غیر انسانی رویہ۔ نیل ایک قیمتی رنگنے کی چیز تھی جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارت میں ایک اہم عنصر سمجھی جاتی تھی۔ 1780 کے لگ بھگ کمپنی نے اس کی راست کاشت شروع کردی تھی۔ اُس نے ویسٹ انڈیز سے باغداروں کو بلایا تھا اور کاشت کرنے میں ان کی ہمت افزائی کرنے کے لیے انھیں بڑی بڑی رقمیں پیشگی دی تھیں یہ باغدار سرکش قسم کے لوگ تھے۔ خود کاشت کرنے کے بجائے انھوں نے پیشگی رقمیں دینے کے ایک نظام کے تحت مقامی کاشتکاروں سے کام کروانا شروع کیا۔ جو کسان پیشگی رقم لے لیتا تھا وہ قریب قریب زرعی غلام بن جاتا تھا۔ باغدار غلاموں کا مالک تھا جو فصل حاصل کرنے کے لیے طاقت اور دھوکا دھڑی دونوں سے کام لیتا تھا۔ اس صورت حال کے متعلق

---

[1] سندرا راجن، ہندوستان کی معاشی تاریخ V صفحہ 252۔ دت۔ آر۔ سی محولہ بالا صفحہ 249

لارڈ میکالے کا خیال تھا کہ '' بڑی خرابی پائی جاتی ہے، یہ کہ اکثر اوقات بڑی ناانصافی کی جاتی ہے اور یہ کہ جزوی طور سے قوانین کے ذریعہ اور جزوی طور سے قانون کے خلاف عمل کر کے بہت سے کسانوں کو اس منزل تک پہنچا دیا گیا ہے جو زرعی غلامی سے زیادہ دور نہیں ہے۔''[1]

فرید پور کے مجسٹریٹ ڈبلیو۔ای۔ دی لاتور نے انڈیگو کمیشن کے سامنے شہادت دیتے ہوئے نیل کی باغداری کے نظام کو '' قتل و غارت کے نظام '' سے تعبیر کیا تھا۔[2] انڈیگو کمیشن اس نتیجے پر پہنچا) '' جن شرائط پر اُس سے کام کرایا جاتا ہے (اُن شرائط پر نیل کی کھیتی کسان کے لیے منافع بخش نہیں ہے۔ اُس نے محسوس کیا ہے کہ اُسے اپنی مرضی کے مطابق کام کرنے سے روکا جاتا ہے اور اس کھیتی کو جاری رکھنے پر مجبور کیا جاتا ہے جس سے اُسے مناسب یافت نہیں ہوتی ہے۔''[3]

میکالے نے بے ایمان باغداروں کو سزا دینے کا مطالبہ کیا لیکن چونکہ حکومت میں ان کے حلیف شامل تھے اس لیے انھیں کوئی چھو نہ سکا، آخر وہ دن بھی آ گیا جب تکلیفوں اور مظالم کو برداشت کرنے کی قوت نے جواب دے دیا اور 1859 میں کسانوں نے مزاحمت شروع کر دی۔ انھوں نے نیل پیدا کرنے کے لیے پیشگی رقمیں لینے سے انکار کر دیا اور باغداروں کے مکانوں اور سرکاری دفتروں پر ہلّہ بول دیا، دیہات میں سواریوں پر بیٹھ کر گھومنے والے یورپینوں پر حملے کئے گئے، ان کی رسد روک دی گئی، نیل کی بڑھتی ہوئی فصلیں تباہ کر دی گئیں اور کارخانوں کو لوٹ کر اُن میں آگ لگا دی گئی۔ بھالوں، تلواروں اور لاٹھیوں سے مسلح کسان بڑی تعداد میں جمع ہو گئے۔ شمالی بنگال میں وہابی رفیق منڈل نے ان کا ساتھ دیا اور بسواس برادران نے مرکزی بنگال میں ان کی قیادت سنبھال لی۔

درمیانی طبقے کے دانش وروں نے اخباروں اور اپنی تقریروں میں ان کی حمایت کی۔ ہندو پیٹریاٹ کے ہریش چندر مکھرجی نے ان کے دکھ بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کئے اور ان کی

---

[1] مترا، للت چندر، بنگال میں نیل کی شورشوں کی تاریخ، 1906، صفحہ 3

[2] ایضاً، صفحہ 4

[3] مترا، للت چندر، بنگال میں نیل کی شورشوں کی تاریخ، 1906، صفحہ 6

تکلیفوں کی دل دہلا دینے والی کہانیاں سنائیں۔ جیسور اور نادیا سے آنے والے خطوط شائع کئے گئے جن میں باغداروں کے مظالم کا ذکر تھا۔ اُن کے اور ان کے غلط طریقوں کے خلاف نفرت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے گیت لکھے گئے۔ دین بندھو مترا نے ایک ڈراما نیل درپن کے نام سے لکھا جو بڑا مشہور ہوگیا۔ ریورنڈ لانگ کی نگرانی میں مائکل مدھ سودن دت نے اس کا ترجمہ انگریزی میں کیا جس کے خلاف باغداروں نے مقدمہ دائر کیا۔ اُسے ایک مہینہ کی سزا دی گئی اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کیا گیا۔ اس مقدمے نے لوگوں میں بڑا جوش پیدا کردیا اور انھیں بہت مشتعل کردیا۔ کیننگ نے اس کا اعتراف کیا تھا'' دن بھر کے سفر میں دریا کے دونوں کناروں پر ہزاروں لوگ قطار بنائے کھڑے تھے اور سب بڑے احترام اور ضبط و نظم کے ساتھ صاحب سے انصاف کی درخواست کررہے تھے۔ ''اس نے سوچا'' جو لوگ اتنی دانش مندی کے ساتھ یہ کرسکتے ہیں ان سے نبٹنے میں احتیاط برتی جانی چاہیے۔''[1]

شورش کو فرو کرنے کے لیے حکومت نے فوری اقدامات کئے۔ نیل پیدا کرنے والے اضلاع کو سینیئر اور تجربہ کار افسروں کے سپرد کیا گیا اور وہاں کی صورت حال کے متعلق رپورٹ پیش کرنے کے لیے ایک کمیشن مقرر کیا گیا، کمیشن اس نتیجے پر پہنچا کہ کاشت میں منافع نہ ہونے اور پیشگی رقم کے ظالمانہ نظام کے متعلق کسانوں کی شکایتیں صحیح ہیں۔ انھوں نے سفارش کی کہ باغداروں کا زور و ظلم ختم ہوجانا چاہیے۔ حکومت نے اس کی سفارش قبول کرلی اور دھمکیاں دینے کا طریقہ ختم کردیا گیا۔'' کسانوں نے اپنی آزادی کا نقش ہر ذہن میں بٹھا دیا۔''

نیل کی شورش ہندوستان کے ایک حصے میں پائی جانے والی ایک مخصوص شکایت کے خلاف ردعمل تھا۔ لیکن یہ شورشیں اس دیہی خرابیوں کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو پورے ملک میں پائی جاتی تھیں اور جو خود بھی اس عام معاشی دکھوں کا حصہ تھیں جو پورے ہندوستان میں پھیلے ہوتے تھے۔

(2) سول ملازمتوں کا مسئلہ

نیل کے فسادات نے جو حالات پیدا کردیے تھے ان کے معمول پر آنے کے بعد سول سروس کے امتحان میں شامل ہونے کے لیے عمر کم کرنے کی بنا پر تعلیم یافتہ ہندوستانی تشویش میں

---

[1] کیننگ کے کاغذات، کیننگ کا خط وڈ کے نام، 30/ اکتوبر 1980

مبتلا ہو گیا۔

کارنواس کے زمانے سے بار بار وعدے کرنے کے باوجود اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے ہندوستانیوں پر بند رہے۔ چنانچہ 1853 میں جب سرپرستی کے بجائے تقرر مقابلے کے امتحان کے بعد کیا جانے لگا تو ایک چھوٹا سا راستہ کھل گیا جس کے ذریعہ ہندوستانی داخل ہو سکتے تھے۔ یہ راستہ کتنا چھوٹا سا تھا اس کے سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انیسویں صدی کے وسط کے ایک نوجوان ہندوستانی کی دشواریوں کو پیش نظر رکھا جائے اُسے انگلستان کا طویل سفر کرنا پڑا تھا تاکہ وہاں جا کر اُن نوجوان انگریزوں سے مقابلہ کرے جنھوں نے برطانوی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی تھی۔ ہندوستانی کو بہت سی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ انگریزی اس کی مادری زبان نہیں تھی، ہندوستان کے اعلیٰ تعلیم کے ادارے برطانوی تعلیمی اداروں کے مقابلے میں کمتر تھے اور برطانوی ماحول، طور طریقے اور آب و ہوا بہت مختلف اور صبر آزما تھے۔ اس کے باوجود آئندہ کچھ برسوں میں ہندوستانیوں نے ہر قسم کے خطروں کا مقابلہ کیا، رکاوٹوں پر قابو پایا اور امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ 1853 میں امتحان میں بیٹھنے کی عمر 23 سال رکھی گئی تھی لیکن 1859 میں اسے گھٹا کر 22 سال، 1862 میں 21 سال اور آخر میں 1876 میں 19 سال کر دیا گیا۔ عمر کم کرنے کی وجہ سے نوعمر ہندوستانی امیدواروں کے راستوں میں زیادہ رکاوٹیں پیدا ہو گئیں۔

لیکن ہندوستانی رائے عامہ کو مطمئن کرنے اور ملکہ وکٹوریہ کے اس وعدے کو پورا کرنے کے لیے، جو 1858 کے اعلان میں شامل تھا، 1870 میں ایک ایکٹ منظور کیا گیا جس کی رو سے گورنر جنرل کو یہ اختیار حاصل ہو گیا کہ وہ کسی ہندوستانی امیدوار کو مقابلے کے امتحان سے مستثنیٰ کر کے سول سروس کے لیے نامزد کر سکتا تھا۔ لیکن 1879 تک اس ایکٹ کے عمل درآمد کے سلسلے میں کچھ نہیں کیا گیا۔ جب لارڈ لٹن نے یہ تجویز پیش کی کہ سول سروس کے دروازے ہندوستانیوں پر بالکل بند کر دیے جائیں اور ان کے لیے ایک اور محدود ہندوستانی سروس شروع کی جائے اس کی تجویز سنجیدگی کے ساتھ کئے گئے تمام اعلانوں کے منافی تھی اس لیے اُسے سرکاری طور سے رد کر دیا گیا لیکن اس کے اصل مقصد کو منظور کر لیا گیا۔ اس لیے کہ ایک قانونی سول سروس شروع کی گئی جس میں ہر سال '' اچھے خاندانوں اور اچھی حیثیتوں کے '' کچھ ہندوستانیوں کا

تقرر کیا جاتا تھا بشرطیکہ اُن کی تعداد اُن ملازمین کی تعداد کے چھٹے حصے سے زیادہ نہ ہو جنھیں اس سال سکریٹری آف اسٹیٹ مقرر کیا تھا۔

اس نئی ملازمت کو ہندوستانی متوسط طبقے کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اس ملازمت سے دور رکھنے کا ایک طرح سمجھتے تھے اور اس لیے اس کی بڑی مخالفت کی گئی۔ نئی ملازمت کے متعلق بنگالی نے لکھا تھا ''ہم نے اس اسکیم کو ایک بڑا فریب سمجھا تھا... اور ہمیں جلد معلوم ہو گیا کہ تعلیم یافتہ ہندوستان ہمارا ہم خیال ہے، ہندوستان کے لوگ چاہتے تھے کہ مقابلہ کا امتحان اس ملک میں لیا جائے، لیکن نئے قاعدوں نے مقابلہ کے امتحان کو نظر انداز کر دیا اور اس کی جگہ نامزدگی کا طریقہ شروع کیا جس کی بنا پر ہم یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ بد دیانتی اور رشوت خوری کی انتہا نہیں رہے گی۔''[1]

سول سروس کے امتحان کے لیے عمر گھٹا کر 19 سال کرنے کی بڑی مذمت کی گئی۔ اس نے پورے ملک کے دانش وروں کو اس کا موقع فراہم کر دیا کہ وہ ایک جھنڈے کے نیچے آکر عمر کو بڑھانے کا مطالبہ کریں۔ سریندر ناتھ بنرجی (1878۔ 1925) نے، جنھوں نے سول سروس کے امتحان میں کامیابی حاصل کی تھی لیکن نہایت ہی معمولی وجوہ کی بنا پر ملازمت سے برطرف کر دیئے گئے تھے، اپنی عوامی زندگی شروع کر دی تھی اور انڈین ایسوسی ایشن کے روحِ رواں بن گئے تھے۔ انھوں نے اس رجعت پسند اقدام پر حکومت کو چنوتی دینے کا فیصلہ کیا۔ اُنھوں نے انڈین ایسوسی ایشن کو ایک کل ہند تحریک کا مرکز بنا دیا اور '' ایک متحد ہندوستان کے تصور کو عملی شکل دی جو مزہنی کی قائم کردہ مثال سے اخذ کیا گیا تھا جس نے بنگال کے رہنماؤں کے ذہنوں میں جگہ پالی تھی۔''[2]

اس مقصد کے پیشِ نظر انھوں نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا تاکہ رائے عامہ کو ہموار کیا جائے۔ مشترکہ سیاسی مفاد کی بنیاد پر تمام صوبوں کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو متحد کیا جائے اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوستانہ تعلقات قائم کرائے جائیں۔ اس سفر کے دوران وہ اُتر پردیش

---

[1] بنگالی، 3/جنوری 1880

[2] بنرجی، سریندر ناتھ، ''ایک زیرِ تعمیر قوم''، صفحہ 41

گئے (بنارس، الہ آباد، لکھنؤ، کانپور، آگرہ، علی گڑھ، میرٹھ اور دہلی)، پنجاب گئے (امرتسر اور لاہور)، بمبئی پریسیڈنسی گئے (سندھ، احمد آباد اور پونا) اور مدراس گئے۔ پہلی دفعہ ''اپنی مختلف نسلوں اور مذہبوں کے ساتھ ہندوستان کو ایک مشترکہ اور متحدہ کوشش کے لیے ایک پلیٹ فارم پر لا کھڑا کیا گیا۔''[1]

اس تحریک کے نتیجے میں حکومت نے 1886 میں چارلس ایچیسن کی صدارت میں ایک پبلک سروس کمیشن مقرر کیا۔ اس کی سفارشات کی بنا پر قانونی سول سروس ختم کر دی گئی اور سول سروس کے امتحان کے لیے عمر بڑھا کر 23 سال کر دی گئی۔ سرکاری ملازمتوں کو تین درجوں میں تقسیم کر دیا گیا یعنی امپریل، صوبائی اور ماتحت۔ امپریل سروس کے لیے انگلستان میں مقابلے کے امتحان کی بنیاد پر، جو وہاں ہوتا تھا، بھرتی کی جاتی رہی، بقیہ دو قسم کی ملازمتیں کم حیثیت کی تھیں اور معمولی ہندوستانیوں کا ان پر تقرر صوبائی حکومتیں کرتی رہیں۔ امپریل سروس میں کچھ عہدے، جو درج فہرست عہدے کہلاتے تھے، صوبائی سروس کے حکام کو مل جاتے تھے جن کو ان پر ترقی دی دی جاتی تھی۔ اس طرح ہندوستان کے لوگوں کو بڑی مدت تک کلیدی عہدوں پر اپنا جائز مقام حاصل کرنے سے قریب قریب محروم رکھا گیا۔

(3) ورناکلر پریس ایکٹ

کونسل میں اصلاح اور ہندوستانیوں کو ملازمتوں میں لینے کے مسائل تو طویل المدتی تھے لیکن کچھ ایسے سوال سامنے آ گئے جن کی وجہ سے بڑے بڑے اختلافات پیدا ہو گئے خصوصیت کے ساتھ یہ اُس وقت ہوا جب نارتھ بروک رٹائر ہو گیا اور اس کی جگہ لٹن نے عہدہ سنبھال لیا۔ ورناکلر اخباروں کو برطانوی حکمرانوں نے کبھی پسند نہیں کیا تھا۔ ان کے دلوں میں ہمیشہ ان کے متعلق شکوک وشبہات رہے لیکن حکومت کی ناراضگی کے باوجود 1885 کے بعد ان اخباروں نے خاصی ترقی کی تھی۔ حکومت کی نظروں میں ان کا لہجہ زیادہ تنقیدی بلکہ '' باغیانہ ''ہوتا جا رہا تھا۔ ہندوستانی زبانوں میں شائع ہونے والے اخباروں کو وہ ہندوستانی پڑھتے تھے جو انگریزی سے واقف نہیں تھے اور چونکہ وہ لوگ انگریزی کے اخبار نہیں پڑھتے تھے جو حکومت کے نقطۂ نظر پیش

---

[1] بنرجی، سریندر ناتھ، ''ایک زیر تعمیر قوم'' صفحہ 51

کرتے تھے اس لیے یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کے خیالات کا آزادانہ اظہار، جس میں حکومت پر تنقید کی جاتی تھی، حکومت کے استحکام کے لیے ایک خطرہ ہے، چنانچہ لٹن نے جلد ہی خفیہ طور سے سکریٹری آف اسٹیٹ سے اس امر کی اجازت حاصل کر لی کہ " مقامی اخبارات کے بڑھتے ہوئے تشدد کو جواب راست بغاوت کی اشتعال دینے لگے ہیں۔ "، ختم کرنے کے لیے ایک قانون بنایا جائے اور لندن سے اجازت آنے کی دو گھنٹے کے اندر 1878 کا ایکٹ منظور کر لیا گیا۔ ہندوستانیوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ جلسے کر کے اس کے مذمت کی اور برطانوی پارلیمنٹ سے اس کو واپس لینے کی اپیل کی، یہ تحریک اس وقت تک جاری رہی جب تک 1882 میں رپن نے اس قانون کو منسوخ نہیں کر دیا۔

(4) لٹن کی دوسری کاروائیاں

انڈین سول سروس کے امتحان کے لیے عمر کم کرنے اور اخبارات کی آزادی پر پابندیاں لگانے کے علاوہ لارڈ لٹن نے اور بھی قابل نفرت کارروائیاں کیں۔ 1878 کے اصلاح کے ایکٹ نے، جس میں امتیاز برتا گیا تھا اور محض ہندوستانیوں پر جس کا اطلاق کیا گیا تھا، بجا طور سے ہندوستانیوں کو ناراض کر دیا۔ اس طرح برطانوی مال اور خاص طور سے سوتی کپڑے پر محاصل درآمد ختم کرنے سے ہندوستانی ناراض ہو گئے تھے۔

ایسے وقت میں جب ملک ایک شدید قحط کے ہولناک تجربات سے گزر رہا تھا جس وقت شمالی مغربی سرحد پر جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے جس کے لیے بڑے روپے کی ضرورت تھی ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کی جوبلی منانا اور اس کا ملکہ کا لقب اختیار کرنا ظاہر کرتا تھا کہ حکومت کو لوگوں کے جذبات کا کوئی خیال نہیں ہے۔

جہاں تک خارجہ امور کا تعلق تھا لٹن کے ہندوستان میں آنے کے بعد وہ پالیسیاں بدل گئیں جن پر پچھلے پچیس سال سے عمل ہو رہا تھا۔ ایلگن، لارنس، میو اور نارتھ بروک ہم جوئی کا راستہ اختیار کرنے سے بچتے رہتے تھے اور " بااقتدار بے عمل " کی پالیسی پر عمل کرتے رہتے تھے، لیکن نئے گورنر جنرل نے " پیش رفت کی پالیسی " پر عمل کیا جسے اس کے مالکوں نے شروع کیا تھا، افغانستان کے خلاف جنگ کے لیے اشتعال انگیزی کی اور سرحدی قبائل کے خلاف لامتناہی

جھگڑوں میں حکومت کو مبتلا کر دیا۔

مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ لارڈلٹن کے چار سالہ دور حکومت کو ('' (80-1876 ہندوستان میں برطانوی حکومت کی سب سے ناکام اور رسوائے زمانہ مدتوں میں شمار کیا جا سکتا ہے... جو بات عجیب وغریب اور بے نظیر تھی وہ تھی شک، ہچکچاہٹ اور خطرے کا احساس جو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ حکومت کی روح پر مسلّط ہو گیا ہے اور اس کے عمل کا سبب بنا ہوا ہے۔''[1] 1880 میں جب لارڈ نے استعفیٰ دیا تو بنگالی نے لکھا تھا'' اس ملک میں عوامی زندگی کے فروغ کا سہرا اس کے ظالمانہ اقدامات کے سر جاتا ہے اور اس خدمت کے لیے ہمیشہ جذبہ احسان مندی کے ساتھ ہنری لارڈ بشپ کو یاد رکھے گا۔''[2]

1880 میں جب انگلستان میں طاقت لبرلوں کے ہاتھ میں آ گئی تو وائسرائے کی حیثیت سے رپن کو ہندوستان بھیجا گیا، توقع کی جاتی تھی کہ وہ اُس نقصان کا ازالہ کر سکے گا جو اس کے پیش رو کی آمرانہ حکومت کی بنا پر ملک کو ہوا تھا۔ وہ نیک نیت انسان تھا۔ اُس نے قابل نفرت ورناکلر پریس ایکٹ کو منسوخ کر کے رائے عامہ کو مطمئن کیا۔ افغان جنگ ختم کی گئی اور کسی حد تک حکومت خود اختیاری کو چلن، اضلاع کی تحصیلوں اور میونسپل شہروں میں دیا گیا۔ یورپین مجرموں کے مقدموں کی سماعت کرنے کا اختیار ہندوستانی مجسٹریٹوں کو دے کر اس نے قانون فوجداری میں اصلاح کرنی چاہی لیکن اس کی بڑی سخت مخالفت یورپینوں نے کی اور ان کی رائے کے احترام میں بدقسمتی سے یہ تجویز بدلنی پڑی۔

(5) مقامی حکومت خود اختیاری

لٹن کے رجعت پرستانہ اقدامات کے باوجود ہندوستانی دانش ور انگریزوں کے نیک ارادوں اور مساوی برتاؤ اور حکومت خود اختیاری کے ان کے وعدوں پر یقین کرتے رہے۔ رپن نے جب ورناکلر پریس ایکٹ کو منسوخ کیا اور اس سے بھی زیادہ جب اس نے حکومت خود اختیاری کی اسکیم پر عمل کرنا شروع کیا تو یہ احساس اور پختہ ہو گیا۔

---

[1] بنگالی، 31 ستمبر 1879

[2] بنگالی، 21 جون 1880

پریسیڈنسی شہروں میں میونسپل حکومتیں ابتدا ہی سے چلی آرہی تھی۔ 1842 میں انھیں دوسرے شہروں میں بھی رائج کردیا گیا۔ اس کے بعد 1850 میں صوبائی حکومتوں کو اختیار دے دیا گیا کہ وہ شہروں میں بالواسطہ محاصل لگانے کی اجازت دے دیں۔ 1870 کے منتقلی اختیارات کے ضابطوں کے تحت تعلیم، صحت عامہ، طبی امداد اور رفاہ عام کے کاموں کا انتظام مقامی اداروں کی ذمہ داری بن گیا اور انھیں مقامی محصول اور چنگی وصول کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔

1857 کی بغاوت نے جو مالی دشواریاں پیدا کردی تھیں ان کی بنا پر حکومت اخراجات کم کرنے پر غور کرنے کے لیے مجبور ہوگئی۔ مالیات کے ممبر جس میں ولسن نے تجویز پیش کی کہ سڑکوں اور رفاہ عام کے کاموں کی ذمہ داری مقامی اداروں کے سپرد کردی جائے۔

1854 میں لارنس نے ایک قرارداد منظور کی جس کی رو سے شہروں کی ہمت افزائی کی گئی کہ وہ شہر کی پولیس، ترقی، تعلیم اور دوسرے مقامی امور کے اخراجات پورے کرنے کے لیے مقامی آمدنی بڑھائیں، اس قرارداد میں بڑی شان کے ساتھ کہا گیا تھا'' ہندوستان میں جو ہمیں حیثیت حاصل ہے اس کے فرائض اور پالیسی کا تقاضا ہے کہ ملک کا زیادہ سے زیادہ کام یہاں کے لوگوں کو کرنے دیا جائے۔''

چنانچہ 1870 تک ہندوستان کے ہر اہم شہر میں میونسپلٹی قائم کی جاچکی تھی۔ حالانکہ ان اداروں کے اراکین کا انتخاب رائے دہندگان کرسکیں اس کے متعلق کئی ایکٹ بنائے گئے لیکن انتخاب کے اصول پر عمل نہیں کیا جاسکا۔ ہر جگہ سرکاری اثر تھا 1880 تک صرف کلکتہ اور بمبئی کے شہروں کی میونسپل کونسلوں میں کچھ عوامی عناصر تھے حالانکہ مقامی حکومت اور مقامی محاصل کا ڈھانچہ موجود تھا پھر بھی دوسرے شہروں میں کنٹرول پوری طرح سرکاری حکام کے ہاتھوں میں تھا۔

اس مرحلے پر رپن نے مداخلت اور صوبائی حکومتوں سے مشورہ کرنے کے بعد اس نے 1882 میں مقامی حکومت خوداختیاری کے تعلق سے ایک قرارداد منظور کی۔ خودمختار ادارے جو محض شہروں تک محدود تھے انھیں وسعت دی گئی اور دیہاتی علاقوں میں ان کی توسیع کردی گئی۔ ڈسٹرکٹ بورڈ قائم کیے گئے جن کے حلقے اختیار میں اور تحصیلیں آگئیں اور انھیں کنٹرول کرنے

کے اختیارات دے دیے گئے۔ اس تبدیلی کو ''سیاسی اور عوامی تعلیم کے ایک ذریعے''[1] کے طور پر پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا اور اس لیے شہری اور دیہاتی دونوں قسم کے بورڈوں میں سرکاری ممبروں کی تعداد گھٹا کر کل ایک تہائی کر دی گئی اور غیر سرکاری نشستوں کو بھرنے کے لیے انتخاب کے اصول پر عمل کیا گیا۔ اس قرارداد میں جو پالیسی پائی جاتی تھی اس پر عمل کرنے کے لیے 84-1882 میں صوبوں نے لوکل سیلف گورنمنٹ ایکٹ منظور کئے۔ یہ ظاہر تھا کہ قرارداد کا مقصد تھا عوامی جذبے کو ترقی اور اختیارات استعمال کرنے کی تربیت دینا۔ حکومت کو چلانے والی نوکرشاہی ایکٹ کے لبرل رجحان سے خائف ہوگئی اور عمل میں اس کو بدل دیا۔ ابتدا ہی سے بورڈ ''دائرہ عمل کی تنگی، محدود اختیارات اور نامکمل نمائندہ نوعیت'' کے شکار تھے اور بالآخر نوکرشاہی کے غیر لبرل رویے کی بنا پر یہ تجربہ وہ مقاصد حاصل نہ کر سکا جو رپن کے پیش نظر تھے۔

(6) البرٹ بل

رپن کے عہد حکومت میں البرٹ کی نزاع سیاسی دباؤ ڈالنے کے تعلق سے ایک سبق کے مترادف تھی، اس کو کوئی بڑی اہمیت نہ تھی اور اس کا تعلق عدالتی کاروائی سے تھا۔ 1857 میں صورت حال یہ تھی کہ پریسیڈنسی شہروں میں ہندوستانی مجسٹریٹ اس کے اہل سمجھے جاتے تھے کہ جسٹس آف پیشن کے فرائض ادا کر سکیں اور اس لیے یورپینوں کے مقدموں کی سماعت ختم کر دی۔ اس میں کہا گیا تھا کہ یورپینوں کے ایسے مقدموں کی سماعت جن میں تین مہینے کی سزا یا ایک ہزار روپیہ جرمانہ یا اس سے زیادہ سزا اور جرمانہ ہوسکتا تھا محض یورپین مجسٹریٹ یا جج کر سکتے تھے۔ 82-1881 میں ضابطہ فوجداری پر آخری بحث ہوئی اور مہاراجہ جیتندر موہن ٹیگور نے اس کا نوٹس دیا کہ وہ یورپینوں کے مقدمات کی سماعت کرنے کے ہندوستانی مجسٹریٹ کے اختیارات پر بحث شروع کریں گے۔ انھیں یقین دلایا گیا کہ ضابطہ منظور ہونے کے بعد اس سوال پر بحث کی جائے گی۔

لیکن بل منظور ہونے سے پہلے بنگال کی سول سروس کے بی۔ ایل۔ گپتا نے حکومت کی توجہ اس غیر معمولی صورت حال کی طرف دلوائی جس کی رو سے یورپین برطانوی رعایا پر معہودہ سروس

---

[1] ہندوستانی دستوری دستاویزات، ترتیب مکر جی، نے کی۔ جلد اول، صفحہ 642

کے ہندوستانی اراکین کو محدود اختیار حاصل تھا۔ بنگال کے لفٹیننٹ گورنر ایشلے ایڈن نے سفارش کی کہ سول سروس کے ہندوستانی اراکین کو ان پابندیوں سے مستثنیٰ کردیا جائے جو نئے ضابطہ فوجداری نے لگائی ہیں، زیادہ تر صوبائی حکومتوں نے اس سفارش سے اتفاق کیا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ سے اجازت مانگی گئی جو اس نے دے دی، اس کے بعد غیر قانون سرکوانٹی البرٹ نے اُن امور کے تعلق سے ایک بل تیار کرکے پیش کیا۔ البرٹ بل ایک غیر اہم اقدام تھا جس کا مقصد تھا قانونی نابرابری کو دور کرنا جس کی بنا پر ہندوستانی مجسٹریٹوں کے خلاف امتیاز برتا جاتا تھا۔

لیکن یورپینوں نے نسلی برابری کے خیال کو توہین آمیز سمجھا اور اس بات کو ناقابل برداشت ذلّت سے تعبیر کیا کہ ایک ہندوستانی مجسٹریٹ کسی سفید فام مجرم کے مقدمے کی سماعت کرے۔ شدید تحریک شروع کی گئی۔ جس میں تشدد اور بغاوت کی دھمکی دی گئی۔

تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے، جنھیں حالات کی شدت نے حیرت میں مبتلا کردیا تھا، گورنر جنرل کو پریشانی سے بچانے کے لیے بڑی اعتدال پسندی سے کام لیا۔ ان کے احساس کا اظہار کرتے ہوئے بنگالی نے لکھا تھا '' ایک بڑے اصول کے متعلق فیصلہ کرنا ہے، اس کا فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا کہ انگریز انصاف اور مساوات کے اصولوں کی بنیادوں پر ہندوستان میں حکومت کریں گے یا طاقت کے بل بوتے پر۔''[1]

ایک دفعہ پھر اس نے اس موضوع پر لکھا '' یہ سمجھنا حماقت اور انصاف سے بعید ہے کہ یہ بڑی سلطنت ... زیادہ حد تک اس پالیسی کی بنیاد پر باقی رہ سکتی ہے جس کی اساس طاقت ہو اور جس کو طاقت اختیارات عطا کئے ہوں، برطانوی اختیار کی بنیاد کو بدلہ جانا چاہیے ... نسلی برتری اور فتح کے حق کی باتیں اس قوم کے منہ سے اچھی نہیں معلوم ہوتی ہیں جس نے بار بار پارلیمنٹ کے مقصد ایکٹوں کے ذریعے پر اعلان کیا ہے کہ وہ فاتح کے حقوق سے دست بردار ہوتی ہے اور انصاف کے اصولوں کے مطابق اس ملک پر حکومت کرنا چاہتی ہے۔''[2]

اس تحریک کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ اس بل میں ترمیم کردی گئی اور یورپین مجرموں کو اس کا حق دیا گیا کہ چھوٹے سے معاملے میں بھی وہ جیوری کے ذریعہ مقدمے کی سماعت کا مطالبہ کرسکیں جس

---

[1] بنگالی، 3/ مارچ 1883

[2] بنگالی، 2/ جون اور 16/ جولائی 1883

کے کم سے کم آدھے ممبر یورپین یا امریکن ہوں۔ چنانچہ برتر نسل کے خصوصی دعووں کو تسلیم کرلیا گیا حالانکہ اس نے انصاف کا خون کردیا۔ ہندوستان میں رہنے والے انگریزوں کی تحریک سے ہندوستانیوں نے کچھ سبق سیکھ لیے۔اس نے ظاہر کردیا کہ دیو پیکر سامراج بزدل ہوتا ہے۔

بل میں تبدیلیاں کی گئیں تھیں ان سے ہندوستانیوں کو بہت مایوسی ہوئی۔ انھوں نے ان تبدیلیوں کو بجا طور سے سفید فام لوگوں کے آگے حکومت کے جھکنے سے تعبیر کیا اس لیے کہ انھیں معلوم تھا کہ نسلی بنیادوں پر بنائی جانے والی جیوریاں کتنی غیر حقیقی اور نمائشی ہونگی۔ ’’ پچھلے پچاس سال یا اس سے بھی زیادہ مدت میں یورپین جیوریوں نے زیادہ تر یورپین ملزموں کے حق میں جو شرمناک اور غلط فیصلے کئے ہیں وہ تاریخ کے جُز بن گئے ہیں اور اس کے تاریک ترین ابواب میں شمار کئے جانے چاہیے۔ سرایڈورڈ ایان اور سر یارنس پیکاک کی طرح کے اعلیٰ کردار رکھنے والے ججوں نے اس کی شہادت دی ہے کہ یورپینوں کے زیادہ تر جرائم میں انصاف نہیں کیا گیا اور ہندوستان کے لوگوں نے شہر شہر اور گاؤں گاؤں میں یہ کہنا شروع کردیا ہے کہ کسی یورپین کو سزائیں دی جائیں گی۔ لارڈ میکالے نے بھی اس کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور کہا تھا کہ وہ آزادی جس کے معنی ہوں بہت سے لوگوں کے حقوق پر کچھ لوگوں کی فوقیت وہ آزادی نہیں بلکہ بدترین قسم کا ظلم ہے۔‘‘[1]

VI۔ ہندوستانیوں کی طرف سے چنوتی کا جواب

اس بات نے ہندوستانیوں کی آنکھیں کھول دیں کہ یورپینوں کے ساتھ ہندوستانیوں کی برابری کے سلسلے میں جس کا ملکہ وکٹوریہ کے اعلان میں وعدہ کیا گیا تھا، ایک چھوٹے سے قدم کی سفید فام لوگوں نے کتنی سخت مخالفت کی، ہندوستان کے لوگوں کو یہ بتادیا گیا تھا کہ اپنے ہی وطن میں ان کی حیثیت کمتر تھی، یہ کہ حکام انھیں بڑی حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے اور یہ کہ آزاد شہریوں کے حقوق حاصل کرنے کے لیے انھیں طویل اور پرخطر راستہ طے کرنا ہوگا۔ بل کے بالکل ابتدائی مرحلے ہی میں ملک کے عوامی اداروں نے متحد ہو کر بل کے حق میں ایک عرضداشت سپریم

---

[1] بنگالی، 11رفروری 1882

کونسل میں پیش کی تھی، بمبئی میں اس مقدمے کی پیش نظر ایک عام جلسہ کیا گیا، ہندوستانی اخباروں نے حکومت کی پوری حمایت کی، لیکن یہ سب بے سود ثابت ہوا۔ یہ بات صاف ہوگئی تھی کہ سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لیے یادداشتیں اور عرضداشتیں ناکافی ہیں اور یہ محسوس کیا گیا کہ ''مسلسل تحریک چلانے اور ملک کے سامنے وہ اغراض ومقاصد رکھنے کے لیے جن سے ملک کی دائمی بھلائی کا امکان پیدا ہو سکے۔''[1] اور سیاسی جدوجہد جاری رکھنے کے لیے تنظیم بنائی جائے یہ محسوس کیا گیا کہ وقت آگیا ہے کہ ملک کے انتظام میں بھی نہ صرف مقامی بلکہ مشترکہ قومی معاملات میں بھی حقیقی اور موثر کنٹرول حاصل کرنے کے لیے پوری کوشش کی جائے۔ یہ کام صرف ایک ایسی ملک گیر تنظیم کرسکتی تھی جو رائے عامہ کو ہموار کرسکے اور عام لوگوں میں تحریک کو مقبول بنا سکے۔

اس کی حمایت بمبئی اور مدراس کے اخباروں نے کی۔ چونکہ یہ شکایت مقامی نوعیت کی نہیں تھی اس لیے یہ محسوس کیا گیا کہ ایک کل ہند تنظیم زیادہ بہتر انداز سے حالات سے نبٹ سکے گی۔ 1876 میں دہلی دربار سے کچھ پہلے پونا کی سروجنک سبھا کے جوشی نے ایک خط ان لوگوں کو لکھا جنھیں دربار میں مدعو کیا گیا تھا اور اس میں کہا کہ قومی اہمیت کے مسائل پر گفتگو کرنے کے لیے اس موقع سے فائدہ اٹھایا جانا چاہیے۔ 1882 میں قومی کانفرنس کرنے کا خیال پھر ظاہر کیا گیا۔ ''قومی یا پھر کم ازکم ایک صوبائی کانگریس کا اجلاس کیوں نہ کیا جائے۔ یعنی ملک کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے مندوبین کا جلسہ جنھیں اپنے اپنے نقطۂ نظر کی نمائندگی کرنے کے لیے مختلف عوامی ادارے بھیجیں؟ یہی ہماری عوامی تحریکوں کو حقیقی نمائندہ نوعیت عطا کر سکتے ہیں۔ اب وقت آگیا ہے کہ ایک عظیم قومی کانگریس کا سالانہ جلسہ ہندوستان کی نسلوں میں جذبہ اتحاد پیدا کردے اور ملک میں بکھرے ہوئے مختلف سیاسی اداروں کے سیاسی معاملات کے تعلق سے متحدہ عمل کے لیے میدان تیار کردے۔''[2]

1883 میں جب البرٹ بل کے خلاف تحریک اپنے شباب پر تھی اس وقت سریندر ناتھ بنرجی کے خلاف عدالتی کارروائی نے رائے عامہ کو اور مشتعل کردیا۔ اخبار میں ایک مضمون لکھنے کی

---

[1] بنگالی، 26/جون 1884

[2] بنگالی، 27/مئی 1882

وجہ سے اُن پر مقدمہ چلایا گیا تھا۔حکومت کے گھمنڈ اور ضد کا مناسب جواب دیا جانا ضروری تھا۔ یہ محسوس کیا گیا کہ انگلستان اور ہندوستان دونوں ملکوں میں تحریک چلانے اور '' ایک ایسی قومی عبادت گاہ تعمیر کرنے کے لیے روپیہ جمع کیا جائے جس میں سب پارٹیاں یعنی زمیندار، کسان اور دکان دار مل کر قومی مفادات کو فروغ دے سکیں ''[1] اس فنڈ کا ایک مقصد یہ تھا کہ ملک کے مختلف حصوں کے نمائندوں کی ایک سالانہ کانفرنس منعقد کی جائے تاکہ وہ عوامی جذبہ پیدا کر سکے اور ہندوستان کی رائے عامہ کو استوار کر سکے۔''[2]

قومی کانفرنس کا پہلا اجلاس 28 سے 30 دسمبر 1883 تک کلکتہ میں ہوا۔جن سوالوں پر اس کانفرنس میں بحث کی گئی وہ تھے نمائندہ کونسلیں، تعلیم جس میں عام اور تکنیکی دونوں قسم کی تعلیم شامل تھی، عدلیہ کی انتظامیہ سے علیحدگی، فوجداری مقدمات کی سماعت اور آخر میں سرکاری ملازمتوں میں ہندوستانیوں کی زیادہ بھرتی، البرٹ بل کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کا تعلیم یافتہ ہندوستان نے یہ جواب دیا جسے '' سنہرے ناقوس کی گونجتی آواز سے '' تعبیر کیا جانا چاہیے[3] بقول بلنٹ کے یہ '' قومی پارلیمنٹ کی طرف پہلا قدم تھا۔''[4]

سیاسی گروپوں کو متحد کرنے اور قومی فنڈ کے لیے روپیہ اکٹھا کرنے کی غرض سے 1884 میں بنرجی نے ایک دفعہ پھر شمالی ہندوستان کا دورہ کیا، لارڈ رپن کی ہندوستان سے روانگی کے موقع پر پورے ملک میں مظاہرے کئے گئے جس نے حکام پر ظاہر کر دیا کہ ہندوستان میں قوم پرستی کی نئی طاقت کتنا زور پکڑ چکی تھی۔

آکلینڈ کوٹون نے بڑی حیرت کے ساتھ کہا '' کھلی وادی کی سوکھی ہڈیوں میں نئی جان پڑ گئی ہے۔''[5] کلکتہ کارپوریشن کے چیرمین سر ہنری ہیرسن نے تسلیم کیا کہ '' تعلیم یافتہ

---

[1] ایضاً، 18/ جولائی 1883

[2] ایضاً، 3/ اگست 1883

[3] بنرجی، محولہ بالا صفحہ 36

[4] بلنٹ، ڈبلیو ایس، رپن کے زیر حکومت ہندوستان، صفحہ 116

[5] بنرجی، محولہ بالا، صفحہ 88

ہندوستانی پہلے ہی ہندوستانی قوم کے ایجنٹ، رہنما، معلم اور اطلاعات فراہم کرنے والے بن چکے ہیں اور اس کو سمجھنے کے لیے زیادہ ذہانت کی ضرورت نہیں ہے کہ آئندہ کا ہندوستان ویسے ہی سوچے گا جیسے وہ لوگ بتائیں گے جن کے ہاتھوں میں ان کے اسکول، ان کے اخبارات، ان کی عدالتیں اور ان کے سرکاری دفاتر ہیں۔ظاہر ہے کہ وہ ہندوستان کی آواز اور اس کا ذہن بنیں گے اور عام لوگ اس کے ہاتھ ہوں گے جن سے اس کی تعلیم چھلکے گی، جیسا کہ اُسے کبھی کبھی نام دیا جاتا ہے۔نوجوان ہندوستان سے معاملہ کرتے وقت یہ سمجھنا بڑی غلطی ہوگی کہ ہم سیاسی اعتبار سے (جیسا کہ ظاہراً ہم فوجی اعتبار سے کر رہے ہیں (آبادی کے ناقابل اعتنا حصے میں بٹ رہے ہیں اس وقت جو جذبات دو لاکھ لوگوں کے سینوں میں پک رہے ہیں وہ بیس کروڑ لوگوں کے سینوں تک پہنچ سکتے ہیں بلکہ پہنچ رہے ہیں۔ یہ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہوگی کہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کے ساتھ ہمارے برتاؤ کا اثر محض اس طبقے تک محدود رہے گا۔''[1]

انڈین نیشنل کانفرنس کے پہلے اجلاس کے بعد جو 1883 میں ہوا تھا، دوسرا اجلاس دسمبر 1885 میں ہوا جسے کلکتہ کی تین ایسوسی ایشنوں نے طلب کیا تھا یعنی برٹش انڈین ایسوسی ایشن جو زمینداروں کی نمائندگی کرتی تھی، متوسط طبقوں کی انڈین ایسوسی ایشن نے اور محمڈن ایسوسی ایشن نے جس کے سکریٹری امیر علی تھے۔ بنگالی، شمالی ہندوستان اور بمبئی کے مندوبین نے اس میں حصہ لیا اور منجملہ دیگر موضوعات لیجسلیٹیو کونسلوں کی فوری اصلاح پر زور دیا۔

(2) پونا ساور جنک سبھا

بنگال کی طرح مغربی ہندوستان میں بھی سیاسی شعور بڑھ رہا تھا۔ 1870 میں حکومت تک لوگوں کی خواہشات کو پہنچانے کے لیے سارو جنک سبھا کا قیام عمل میں لایا گیا۔اس کے ممبروں میں شامل تھے بڑے بڑے زمیندار، تاجر، بنک کار، ریٹائرڈ سرکاری ملازمین، وکیل، پروفیسر اور مہاراشٹر کے کچھ راجے مہاراجے، مہادیو گوند رانا ڈے، جن کا تقرر 1871 میں پونا میں ہوا تھا، اس کے رہنما اور فلسفی بن گئے۔ان کے خیالات نے سبھا کو متاثر کیا اور اس کی سرگرمیوں کو

---

[1] ایضاً، صفحہ 91

سمت عطا کی۔ ایسوسی ایشن کا اصل مقصد تھا رائے عامہ کو ہموار کرنا لیکن اس نے ہندوستانی معیشت کے مسئلوں کے مطالعے پر زیادہ توجہ دی اور لوگوں کی معاشی دشواریوں پر حکومت کو توجہ دلائی۔ اسی کے ساتھ اس نے ملکہ کو ایک عرضداشت بھیجی جس میں درخواست کی گئی تھی کہ ہندوستانیوں کو بھی وہی سیاسی حقوق دیے جائیں جو برطانوی شہریوں کو حاصل ہیں۔ لیجسلیٹیو کونسلوں کے لیے انتخابوں کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ 1878 میں اس نے ایک رسالہ شائع کرنا شروع کیا جس نے زرعی اصلاحات، زرعی بنکوں کے قیام، تعلیم پھیلانے، محاصل اور سرکاری اخراجات کم کرنے اور عدالتی نظام کو سدھارنے کی وکالت کی۔

1885 میں فیروز شاہ مہتا، کے۔ ٹی۔ تلنگ اور بدرالدین طیب جی نے باقاعدگی کے ساتھ سیاسی سرگرمیاں جاری رکھنے اور حکومت کو عام لوگوں کے خیالات سے باخبر رکھنے کے لیے بمبئی پریسیڈنسی ایسوسی ایشن قائم کی۔

(3) مہاجن سبھا

مدراس میں ہندوؤں کی بیداری کا آرگن ہندو 1878 میں شروع کیا گیا اور اس کے حامیوں نے 1884 میں ایک سیاسی انجمن قائم کی جس کا نام تھا'' مہاجن سبھا '' انھوں نے دسمبر میں صوبائی کانفرنس کی، جس میں مدراس اور پریسیڈنسی کے دوسرے بڑے شہروں کے مندوبین نے شرکت کی۔ اس کانفرنس میں لیجسلیٹیو کونسل کی اصلاح، عدلیہ کو مال کے کاموں سے علیحدہ کرنے، سول ملازمتوں اور فوجی اخراجات کے مسائل پر بحث کی گئی۔ یادداشتیں تیار کی گئیں اور حکومت کو پیش کی گئیں۔

VII۔ کانگریس کی ابتدا

اس قسم کی صوبائی سیاسی سرگرمیوں نے ایک سیاسی تنظیم بنانے کے لیے میدان تیار کر دیا تھا۔ ایک ایسی تنظیم جو پورے ہندوستان پر حاوی ہو اور ملک میں بکھری ہوئی سیاسی تنظیموں اور سیاسی شعور رکھنے والے افراد کو ایک تنظیم میں متحد کر دے۔ ایک ایسی قومی اسمبلی کے قیام کے لیے حالات سازگار تھے جو قومی مطالبات اور ضرورتوں کا اظہار کر سکے۔

تاریخ کے کسی دور میں حکومت عام لوگوں سے اتنی دور اور محکوموں کے ساتھ ہمدردی سے مُبرا نہیں تھی۔ دوسری طرف تعلیم یافتہ متوسط طبقہ بڑا ہو گیا تھا اور مادرِ وطن کی طرف فرائض کا زیادہ شعور اُس میں پیدا ہو گیا تھا۔ صوبوں کی سیاسی سرگرمیوں کے ذریعہ وہ اپنی طاقت اور جذبہ آزادی کا ثبوت دے چکا تھا۔ نام نہاد لیجسلیٹیو کونسلوں کی حقیقی نوعیت کے متعلق اُسے اب دھوکا نہیں دیا جا سکتا تھا۔ جیسا کہ بنگالی نے کہا تھا '' آس پاس کے تین یا چار راجاؤں کو تھوڑی تھوڑی مدت بعد کلکتہ بلایا جاتا ہے تاکہ وہ کونسل بورڈ میں گورنر جنرل اور اس کے کچھ یورپین ساتھیوں سے ملاقات کر سکیں اور کم اہمیت کے سرداروں کو اسی طرح گورنروں سے بات کرنے کے لیے مدراس اور بمبئی بلایا جاتا ہے۔ اگر اسے بدیسی حکومت کی علیحدگی پسندگی سے باضابطہ روگردانی سمجھا جائے تو یہ اچھا ہے، لیکن اس کو بدیسی حکومت اور مقامی لوگوں کے درمیان اختیارات کی شرکت کون تصور کرتا ہے۔''[1]

اس کا کافی جواز پایا جاتا تھا کہ حکومت کے کاموں میں لوگوں کے نمائندوں کو شریک کیا جائے۔ ہندوستانی اخبارات، جو رائے عام کی نمائندگی کرتے تھے، اس کا مطالبہ کر رہے تھے، سیاسی انجمنیں بار بار حکومت ہندوستان اور حکومت انگلستان کو توجہ دلا چکی تھیں اور ہندوستانی رہنما بہت سے پلیٹ فارموں سے اس کے متعلق ہندوستانیوں کی خواہشات کو ظاہر کر چکے تھے۔ ہندوستان کی توقعات سے ہمدردی رکھنے والے انگریز بھی اس کی ضرورت پر حکومت کو توجہ دلا چکے تھے۔

اُن میں ہنری کاٹن اور آلن اکیوٗین ہیوم کی طرح کے لوگ شامل تھے۔ ہندوستان کے مطالبات کی حمایت وہ دو اسباب کی بنا پر کرتے تھے۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ وہ ہندوستان کے لوگوں کے لیے حکومت خود اختیاری کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے اور دوسری یہ کہ اس بات کی فکر تھی کہ دونوں ملکوں کے باہمی رشتے نہیں ٹوٹنا چاہیے اور یہ کہ حکومت خود اختیاری حاصل کرنے کے لیے تشدد پر مجبور نہ کیا جائے، کاٹن نے لکھا تھا '' وہ (تعلیم یافتہ ہندوستانی) ہماری حکومت کو ایک ناقابل تنسیخ ضرورت کے طور پر برداشت کرتے ہیں جس نے ماضی میں انھیں بہت فوائد

---

[1] بنگالی، 16/اپریل 1881

پہنچائے ہیں لیکن جس میں ترمیم کرنے کا وہ مُبہم ارادہ کر چکے ہیں اگر وہ خود ہی اُن تبدیلیوں کو قبول نہیں کر لیتی ہے جو خود اس کی وجہ سے وجود میں آئی ہیں... ان کا مطالبہ ہے کہ نام نہاد مساوات کے بجائے حقیقی مساوات ہو، خود ان کے ملک کی حکومت میں ان کی آواز ہو اور سرکاری ملازمتوں کے انھیں مواقع ملیں۔''[1]

الن اکٹوین ہیوم (1829ء، 1846ء 1912) سے سرکاری ملازمت میں تھا لیکن 1879 میں اُسے آزاد خیالات رکھنے اور بلاخوف ان کو ظاہر کرنے کی بنا پر لٹن نے حکومت ہندوستان کے سکریٹری کے عہدے سے '' شرمناک اور ظالمانہ انداز '' سے ہٹا دیا تھا۔ 1882 میں وہ ملازمت سے رٹائر ہو گئے۔ اپنی ملازمت کے ابتدائی زمانے میں اُسے یقین ہو گیا تھا کہ ہندوستان اور برطانیہ کے لوگوں کے مفادات لازمی طور سے یکساں ہیں اور یہ کہ ہندوستان میں حکومت اس طرح کی جانی چاہیے جس سے دونوں کو برابر فائدہ ہو۔ انھیں یہ بھی محسوس ہو گیا تھا کہ اس برطانوی ہندوستان کے معاشی مسئلے کو حل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی ہے ، یہ کہ قحطوں اور مایوسیوں نے کسانوں کو تباہ کر دیا ہے، یہ کہ اس زمانے کی حکومت لوگوں سے خطرناک حد تک دور ہو چکی ہے۔ اور یہ کہ حاکموں اور محکوموں کے درمیان روابط قائم کرنے کا کوئی جانا پہچانا ذریعہ نہیں ہے یعنی ہندوستانیوں کی ضرورتوں اور رائے سے حکومت کو باخبر رکھنے کا کوئی دستوری ذریعہ نہیں ہے۔ 1872 میں اس نے نارتھ بروک کو اس خطرہ سے آگاہ کیا تھا کہ برطانوی علاقہ مفلوج ہوتا جا رہا ہے۔ اس نے لکھا تھا '' ہماری حکومت کتنی غیر مستحکم ہے اس کا علم غالباً آپ کو نہیں ہے... مجھے اس کا پورا یقین ہے کہ سلطنت کی صورت حال بہت خراب ہو چکی ہے اور کسی وقت بھی پوری طرح نظر نہ آنے والا بادل کا چھوٹا سا ٹکڑا بڑھ کے ایسا طوفان بن سکتا ہے جو ملک کو طوائف الملوکی اور تباہی کا شکار بنا دے۔''[2]

اُنیسویں صدی کی آٹھویں دہائی میں ہندوستان میں بڑے دکھ اور بڑی بے چینی تھی اور حکومت کے سکریٹری کی حیثیت سے ہیوم کو جو اطلاعات ملی تھیں ان کی بنا پر اُسے یقین ہو گیا تھا کہ

---

[1] کاٹن، ایچ، نیا ہندوستان (دوسرا ایڈیشن، 1904)، صفحہ 32۔ اس کا پہلا اڈیشن 1885 میں شائع ہوا تھا۔

[2] اے۔ اُو۔ ہیوم کا خط نارتھ بروک کے نام، یکم اگست 1872، نارتھ بروک کے کاغذات، انڈیا آفس لائبریری لندن۔

صورت حال خطرناک ہے۔ وہ کہتا ہے '' اس وقت (میرا خیال ہے کہ لٹن نے جانے سے تقریباً 15 مہینے پہلے (مجھے جس ثبوت نے یہ یقین دلایا تھا کہ ایک بڑی شورش کا فوری خطرہ ہے وہ یہ تھا۔ مجھے سات بڑی بڑی جلدیں دکھائی گئیں ... جن میں بہت سے اندراجات تھے ... ان سب سے ظاہر ہوتا تھا کہ سب سے نچلے طبقوں کے ان غریب لوگوں کو موجودہ حالات میں اپنی بے بسی کا یقین ہو گیا ہے اور انھیں یقین ہو گیا ہے کہ وہ فاقوں پر فاقے کریں گے اور مر جائیں گے اور یہ کہ انھیں کچھ کرنا چاہیے۔ وہ کچھ کرنے والے ہیں اور ایک دوسرے کا ساتھ دیں گے اور اس کچھ کے معنی ہیں تشدد ''[1] دکن کے بلووں نے اس کے خطرات وخیالات کا ثبوت فراہم کر دیا۔

اس خطرے سے بچنے کے لیے قدرتی طور سے ہیوم نے محسوس کیا کہ اس کا کاٹ کرنا ضروری ہے یعنی قومی تحریک کی ایک ایسی تنظیم بنائی جائے جس کے تین مقاصد ہوں۔ '' پہلا مقصد یہ کہ اُن تمام مختلف عناصر کو جن پر ہندوستان کی آبادی مشتمل ہے ایک قومی دھارے پر لانا، دوسرا یہ کہ روحانی، اخلاقی، سماجی اور سیاسی خطوط پر اُس قوم کی بتدریج حیات نو جو اس طرح بنائی گئی ہو اور تیسرا یہ کہ ان شرائط میں جو غیر منصفانہ اور غیر مفید ہوں تبدیلی کر کے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان یونین کو مستحکم بنانا۔ ''[2]

چنانچہ ہندوستان کے مختلف حصوں کے ہندوستانی رہنما جس ملک گیر سیاسی ادارے کی تعمیر کرنا چاہتے تھے ہیوم کی پُر جوش حمایت اُسے جلدی معرض وجود میں لے آئی۔ ہیوم نے یکم اگست 1883 کو کلکتہ یونیورسٹی کے گریجویٹوں کے نام ایک خط میں اس بات پر زور دیا کہ ایک مقررہ طریق عمل کی پیروی کرنے کے لیے وہ ایک یونین بنائیں اور ان الفاظ میں انھیں مشورہ دیا '' جہاں تک ضبط ونظم اور ساز وسامان کا تعلق ہے ہماری چھوٹی سی فوج کو آپ اپنی نظیر ہونا چاہیے اور سیدھا سادا سوال یہ ہے کہ آپ میں سے کتنے ایسے نکلیں گے جو اعلیٰ تعلیمی استعداد کے علاوہ وہ بے لوثی، اخلاقی جرأت، ضبط نفس اور فیض رسانی کا جذبہ رکھتے ہیں جو اس میں شامل ہونے

---

[1] وڈابرن، ڈبلیو یا الن اکیوئین ہیوم، صفحات 81-80

[2] ایضاً، صفحہ 47

والوں کے لیے ضروری ہے۔''[1] اُس نے مزید لکھا'' ہر قوم جس قسم کی حکومت کے قابل ہوتی ہے اس کو ویسی ہی حکومت ملتی ہے اگر آپ جو چُنندہ اور تعلیم یافتہ ہیں اپنے لیے اور اپنے ملک کے لیے زیادہ آزادی حاصل کرنے کی غرض سے جدوجہد کر سکتے ہیں... تو کم از کم اس وقت ترقی کی تمام امیدیں ختم ہو جائیں گی۔''[2]

ہیوم نے ہندوستانی رہنماؤں سے مشورہ کر کے 1884 میں مندرجہ بالا تین مقاصد کے ساتھ انڈین نیشنل یونین کی اسکیم شروع کی۔ یونین کے مقاصد کی وضاحت اس طرح کی گئی ''تمام دستوری طریقوں سے یہاں یا انگلستان میں کسی بھی ایسے چھوٹے یا بڑے حکام کی مخالفت کرنا جن کا عمل یا عدم عملی ہندوستان کی حکومت کے ان اصولوں کے منافی ہے جو برطانوی پارلیمنٹ نے بنائے ہیں اور جن کی توثیق برطانوی بادشاہ نے کی ہے۔''[3]

ان یونین کی تنظیم جلد ہی پورے ہندوستان میں پھیل گئی تا کہ ہندوستان کی رائے عامہ کو پیش کیا جا سکے۔ اس کے مطالبات یہ تھے'' انڈیا کونسل کو ختم کیا جائے یا اُسے بالکل بدل دیا جائے... پارلیمنٹ کو ایک باضابطہ اور بڑی یادداشت ان موضوعات کے متعلق پیش کرنی تھی۔ حکومت کے عدالتی اور دوسرے شعبوں کے اعلیٰ عہدوں سے ہندوستانیوں کو قریب قریب علیحدہ رکھا جا رہا ہے، محاصل عائد کرنے کے معاملے میں ان کی کوئی آواز نہیں ہے اور موجودہ لیجسلیٹیو کونسلوں میں ایسی ترمیم کرنے کی ضرورت جس سے وہ کسی حد تک نمائندہ بن جائیں۔''[4]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہیوم نے سیاسی کانفرنس کے منصوبے پر گورنر جنرل ڈفرن سے گفتگو کی تھی اور اس کی اجازت حاصل کر لی تھی۔ ڈفرن اس کا خواہش مند تھا کہ لوگوں کی حقیقی خواہشات سے واقف ہو اور اس کا خیال تھا کہ اس کے لیے کانفرنس ایک اچھا ذریعہ ثابت ہوگی۔

ہندوستان کے دوسرے بہی خواہوں سے مشورہ کرنے کے لیے ہیوم اس کے بعد انگلستان

---

[1] ایضاً، صفحہ 51

[2] ایضاً، صفحہ 52

[3] ایضاً، صفحہ 35

[4] لیسی کا خط ڈفرن کے نام، 4/جولائی 1835 ڈفرن کے کاغذات۔

گیا۔ جب اُسے ان کی مدد کا یقین ہوگیا تو ہندوستان واپس آیا تا کہ اس کانفرنس میں شرکت کرسکے جو 25 دسمبر کو پونا میں یونین نے طلب کی تھی۔ چونکہ اس کی حمایت ہندوستان کے مختلف حصوں کی طرف سے ہوتی تھی اس لیے اس کا نام ''انڈین نیشنل کانگریس'' پڑ گیا، آخری وقت میں یہ طے کیا گیا کہ وہ پونا کے بجائے بمبئ میں منعقد ہوگی۔

کانگریس کے انتظامات بمبئ پریسیڈنسی ایسوسی ایشن نے کیئے۔ اس کے اجلاس گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج میں ہوئے۔ مندوبین جن کی تعداد 72 تھی ہندوستان کے سبھی حصوں سے آئے اور کلکتہ کے ایک بڑے وکیل ڈبلیو۔ بی۔ بنرجی کو صدر چنا گیا۔ بغاوت کو ابھی تیس سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ جب ہندوستانیوں کی ایک نئی نسل، جس کے دلوں میں نئے تصورات اور نئے ہندوستان کی تصویر نے امنگیں بھر دی تھیں، ایک جگہ اکٹھا ہوئی اور اس تحریک کی داغ بیل ڈالی جو ساٹھ سال میں اپنی منزل تک پہنچ گئی۔ 1885 میں انڈین نیشنل کانگریس کا پہلا اجلاس ہونے کے بعد پورے ملک میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ہندوستان کی تاریخ میں یہ سب سے اہم واقعہ تھا۔ پہلی دفعہ سیاسی اتحاد کا پیغام کسی مرکزی مقامی یا بدیسی حکومت کے بجائے مادر وطن کے جرأت منداور ترقی پسند سپوتوں نے دیا تھا جو ملک کے ہر گوشے سے آئے تھے۔ وہ بمبئ میں جمع ہوئے، آپس میں مشورہ کیا اور ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں تبادلہ خیال کیا۔ انھوں نے حکومت وقت کو چنوتی دی، ہندوستان کے حاکموں سے صاف صاف کہا کہ وہ اس کے لیے تیار نہیں ہے کہ ملک کے متعلق فیصلے بدیسی کریں اور یہ کہ وہ اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کا مصمم ارادا کر چکا ہے، انڈین نیشنل کانگریس نے قیادت سنبھال لی اور ملک نے اس کی رہنمائی کو قبول کرلیا۔ واقعہ یہ ہے کہ کانگریس لوگوں کی امیدوں اور آرزوؤں کا اظہار تھی۔ یہ ہندوستان کی ذلّت کے خلاف کرب کی ایک چیخ بھی تھی اور غلامی کے خلاف اعلان جنگ بھی۔ اس کی ابتدا ہوئی برطانوی راج کی فیض رسانی پر یقین سے لیکن ایک ہی نسل کی زندگی میں اس نے بڑھ کے حکومت خود اختیاری کا مطالبہ شروع کردیا تھا۔

انڈین نیشنل کانگریس کا معرض وجود میں آنا ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں ایک بے مثال واقعہ تھا۔ اس نے ایک نئے دور کے آغاز کا اعلان کیا یعنی ایسے سیاسی اتحاد کے دور کا جو اوپر سے

تھوپے جانے کے بجائے لوگوں کے مرض کا اظہار ہو۔ کانگریس اس نئے سماج کا مرکزی ادارہ تھی جو پلاسی کے بعد کے سو برسوں میں ہونے والی معاشی، سماجی، اور تہذیبی تبدیلیوں کا نتیجہ تھا۔ اس نے ایک ایسے عمل کو مکمل کر دیا جس کا اثر سب ہندوستانیوں پر انفرادی اور اجتماعی حیثیتوں سے پڑا۔

لیکن 1885 میں یہ کہنا مشکل تھا کہ کانگریس کا مستقبل کیا ہوگا؟ سبھی اداروں کی طرح اس کو بھی دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور ان مراحل سے گزرنا پڑا جب لوگوں نے اس کی طرف بے نیازی کا رویہ اختیار کیا اور حکومت نے عدم پسندیدگی کا، لیکن اس سب کے باوجود یہ ایسا طاقتور حربہ بن گئی جس نے برطانوی سلطنت کی طاقت کا مقابلہ کیا۔

اس کی ابتدا زیادہ دھوم دھام سے نہیں ہوئی تھی۔ پہلے اجلاس کی تقریروں اور تجویزوں میں اعتدال پسندی سے کام لیا گیا تھا اور برطانوی حکمرانوں کے احترام کا خیال رکھا گیا تھا۔ صدارتی خطبہ میں بڑے شائستہ انداز سے حکومت کو یاد دلایا گیا کہ '' حکومت کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کر کے کانگریس محض اتنا چاہتی ہے کہ حکومت کی بنیاد کو وسعت دی جائے اور لوگوں کو اس میں ان کا مناسب اور جائز حصہ دیا جائے۔''

لیجسلیٹیو کونسلوں کی اصلاحات پر جو تجویز پیش کی گئی تھی وہ سب سے زیادہ اہم تھی۔ اُسے کے۔ ٹی۔ تلنگ نے پیش کیا اور اس کی تائید ایس۔ سبرامنیا ائیر نے کی تھی اس میں مانگ کی گئی تھی کہ منتخب ممبر ہو، سوالات کرنے کا ممبروں کو حق دیا جائے، بجٹ کونسلوں میں پیش کئے جائیں، شمالی مغربی صوبجات، اودھ اور پنجاب میں کونسلیں قائم کی جائیں اور ہاؤس آف کامنز میں ایک اسٹینڈنگ کمیٹی (مستقل کمیٹی) بنائی جائے جو کونسلوں کی اقلیتوں کے باقاعدہ احتجاجوں پر غور کرے۔

(1) انگریس کے مقاصد

یہ صحیح ہے کہ کانگریس ویسے ہنگاموں اور جوش وخروش کے ساتھ معرض وجود میں نہیں آئی تھی جو عام طور سے سیاسی قراردادوں کے ساتھ دیکھنے میں آتے ہیں۔ پہلے اجلاس میں صرف 72 مندوبین شریک ہوئے تھے لیکن بعد میں ان کی تعداد بڑھ گئی تھی۔ کلکتہ میں ہونے والے دوسرے

اجلاس میں ان کی تعداد تھی 434 اور مدراس کے تیسرے اجلاس میں 607۔ مندوبین زیادہ تر پیشہ ور طبقوں سے تعلق رکھتے تھے مثلاً وکیل، استاد، ناشرین، مدیر وغیرہ۔ بہت کم تاجروں نے حصہ لیا اور زمیندار زیادہ تر اُس سے علیحدہ رہے۔ مسلمان بٹے ہوئے تھے اور سرسید احمد خاں کی قیادت میں اُن کے ایک حصے نے 1886 کے بعد کانگریس کی عملی مخالفت شروع کردی تھی۔ پھر بھی مسلمان مندوبین کی تعداد جو بمبئی میں دو تھی کلکتہ میں بڑھ کے 33 اور مدراس میں 81 ہوگئی تھی۔ 1890 میں چھٹے اجلاس کے موقع پر کل مندوبین کی 702 تعداد میں سے مسلمانوں کی تعداد 156 تھی۔

ابتدائی برسوں میں کانگریس کے اجلاس خوش سلیقگی، سنجیدگی اور متانت کے ماحول میں منعقد ہوئے تھے۔ تقریروں اور تجویزوں میں انقلابی جوش نہیں ہوتا تھا۔ اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا جاتا تھا، خطبات صدارت میں برطانوی راج کے فوائد کا ذکر کیا جاتا تھا، تاج کے ساتھ ہندوستان کی ناداری کی یقین دہانی کی جاتی تھی اور کہا جاتا تھا کہ ہندوستان چاہتا ہے کہ برطانوی سلطنت میں شامل رہے۔

کانگریس کے مطالبات مقابلے اور چنوتی کے بجائے عرضداشتوں اور درخواستوں کی شکل میں پیش کئے جاتے تھے، لیکن ابتدا ہی سے ان کا رُخ بنیادی دستوری تبدیلیوں کی طرف تھا۔ کانگریس کے پہلے ہی اجلاس میں سپریم اور مقامی لیجسلیٹو کونسلوں کی توسیع ان میں منتخب ممبروں کے خاصے تناسب کو جگہ دینے اور اُن کے اختیارات بڑھانے کی درخواست کی گئی تھی۔ یہ ایسی تجویز تھی جس کا مقصد تھا حکومت کے غیر نمائندہ نظام کو ایک ایسے نظام سے تبدیل کیا جائے جس کی بنیاد لوگوں کے نمائندوں کے مشوروں پر قائم ہو، آئندہ اجلاسوں میں یہ تجویز دہرائی گئی۔

اگرچہ کانگریس متوسط درجہ کی تنظیم تھی پھر بھی وہ تمام طبقوں کی ضرورتوں میں دلچسپی لیتی تھی۔ اگر متوسط طبقہ کے لیے یہ حکومت سے مطالبہ کرتی تھی کہ سول اور فوجی دونوں قسم کے ملازمتوں میں اور خصوصیت کے ساتھ ان کے اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کو زیادہ بھرتی کی جائے تو دیہات کے کاشتکاروں کے لیے یہ مطالبہ کرتی تھی کہ زمیندار جو مال گزاری ادا کرتے ہیں اور کسان زمینداروں کو جو لگان دیتے ہیں ان کا استمراری بندوبست کیا جائے۔ اس نے جنگل کے قوانین

کے خلاف احتجاج کیا جنھوں نے غریب دیہاتوں کے لیے مشکلات پیدا کردی تھیں اور نمک کے محصول کے خلاف بھی احتجاج کیا جس کی بنا پر ان کی چھوٹی چھوٹی آمدنیوں پر ایک ایسے محصول کا بار پڑتا تھا جو صرف کرنے کی ایک ناگزیر شے پر لگایا جاتا تھا۔

اس کے بعد کانگریس کے تجویزوں میں مالی معاملات کا ذکر کیا جانے لگا جیسے فوجی اخراجات کا غیر منصفانہ بوجھ، بدیسی زرمبادلہ کی ہیرا پھیری جو ہندوستانی معیشت کے لیے مضر تھی، انتظام پر کیا جانے والا زیادہ خرچ، بھاری محاصل، تارف کی پالیسی اور اکسائز ڈیوٹیاں، آخری الذکر کا مقصد تھا ہندوستانی تاجروں کے مفادات کا تحفظ۔

کانگریس نے اس پر زور دیا کہ عام لوگوں کی تعلیم نظر انداز کی جاتی ہے، قانون اور انصاف میں سدھار کے مشورے دیے اور خاص طور سے یہ سفارش کی کہ عدالتی اور انتظامی کام علیحدہ کردیے جائیں اور لوکل سیلف گورنمنٹ کے قانون میں اسقام کی طرف توجہ دلائی۔ حالانکہ اس کے ممبروں کی تعداد کم تھی اور اس کے پاس طاقت تھی نہ دولت پھر بھی کانگریس نئے ہندوستان کے دل و دماغ کی نمائندگی کرتی تھی۔ اس کے بحث و مباحثوں میں ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور خوشحالی کے تصور کے انعکاسات دیکھے جاسکتے تھے اور اس کی تجاویز کے پیچھے بلند تر اور آزاد تر زندگی کی ہندوستان کی خواہش کارفرما تھی۔ کانگریس نئے ہندوستان کی علامت اور اس کی اخلاقی انفرادیت کی زندہ گواہ تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا کانگریس ہندوستان کی سیاسی امیدوں اور آرزوؤں کی تجسیم اور آزادی کے لیے ہندوستان کی جدوجہد کا آلہ کار بن گئی۔

(2) کانگریس کا اثر ہندوستانیوں پر

کانگریس کی فعال حیثیت کے ہندوستان کے مختلف طبقوں اور انگریزوں میں مختلف ردّعمل ہوئے۔ پرانے فیوڈل طبقوں کے باقیات اور نئے مالکان اراضی، چاہے وہ ہندو تھے یا مسلمان، بہت خائف ہوگئے۔ کانگریس کی بنا پر اُس سیاسی نظام کے لیے خطرہ پیدا ہوگیا تھا جس نے انھیں جنم دیا تھا اور زندہ رکھے ہوتے تھے۔ اس نے انھیں ایک غیر یقینی مستقبل کے خطرے سے آگاہ کیا۔ قدرتی طور سے ان عناصر نے اپنے ان داتا یعنی برطانوی حکومت کی طرف نظریں اُٹھائیں اور پریشانی کے عالم میں اس کا دامن اور مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیا۔

جہاں تک تجارتی طبقے کا تعلق تھا اس کی ضرورتیں فوری بھی تھیں اور مستقل بھی جوں جوں اُسے اپنی مستقل ضرورتوں کا اور اس بات کا زیادہ احساس ہوتا گیا برطانوی حکومت ان کو پورا کرنے کی راہ میں کس طرح حائل ہوئی ہے ویسے ویسے وہ کانگریس کے قریب آتا گیا جو یہ چاہتی تھی کہ عام لوگوں کو بے انتہا غربت و افلاس سے چھٹکارا دلوانے کے لیے ملک کو معاشی ترقی دی جائے۔

اب رہی عام لوگوں کی بہت بڑی تعداد۔ انگریز حکام ڈینگیں مارا کرتے تھے کہ زمین پر کام کرنے والے یعنی کسانوں اور شکمی داروں کے مفادات کے حقیقی محافظ وہ ہیں لیکن جیسا کہ دادا بھائی نوروجی نے بتایا کہ واقعات اس کے برعکس تھے۔ بے زبان عام لوگوں کا استحصال مہاجن کرتے تھے، زمیندار کرتے تھے اور سرکاری ملازمین کرتے تھے۔ دیر میں سہی پھر بھی حکومت نے مہاجنوں کے چنگل سے انھیں چھڑانے کی اور زمینداروں کے مظالم سے نجات دلانے کی کوشش کی لیکن تمام کا تمام زرعی اور قانونی نظام ایسا تھا کہ یہ کوششیں کم و بیش بے سود ثابت ہوئیں۔

عدم واقفیت کی بنا پر عام لوگ حالانکہ ان کو پوری طرح سمجھ نہیں سکے پھر بھی کانگریس نے ان کے دکھوں کو دور کرنے کی کوشش بڑی مستقل مزاجی کے ساتھ کی، اس طرح وہ ان کی بہی خواہ اور نمائندہ بن گئی۔

سمجھدار لوگوں نے کانگریس کی اہمیت کو سمجھ لیا اور اس کے اعتدال پسندانہ الفاظ اور معتدل دعوؤں کے پس پشت کام کرنے والے مقصد کو دیکھ لیا۔ پارلیمنٹ کے ایک ممبر سلیگ نے، جو 1885-86 کے موسم سرما میں ہندوستان آیا تھا، اپنے ملک کے لوگوں کو آگاہ کیا کہ وہ حالات کو سمجھیں اور ہندوستان کے مطالبات کو شرافت کے ساتھ تسلیم کرلیں، اس نے کہا '' کانگریس کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش حماقت ہوگی یہ اس تحریر کی طرح ہے جو بل شازار کے محل کی دیواروں پر نمودار ہوئی تھی''۔[1] پارلیمنٹ کے ایک اور ممبر سیموئل اسمتھ نے ہندوستان کے سفر کے بعد سلیگ کے الفاظ دہرائے کہ '' وقت آگیا ہے جب ہندوستانیوں کے سیاسی حقوق کو توسیع دینی چاہیے اور

---

[1] بنگالی، 29 مئی 1886

ان میں بہترین کو ملک کی حکومت میں شامل کیا جانا چاہیے۔''[1]

کانگریس کے خلاف حکومت کا ردّعمل

حکومت کا ردّعمل کیا تھا؟ برطانوی حکومت کا محل جریکو کی دیواروں کی طرح نہیں تھا کہ کانگریس کے بگل کی آواز کے ساتھ مسمار ہو جاتا۔ اُنیسویں صدی کی اخری دہائیوں میں واقعہ یہ ہے کہ برطانوی سلطنت اپنی طاقت اور وقار کے نقطۂ عروج پر تھی '' لٹل انگلینڈر) '' وہ لوگ جن کا خیال تھا کہ انگلستان کو نو آبادیوں کے تعلق سے اپنی ذمہ داریاں کم کرنی چاہیے (پس پا ہو رہے تھے اور لبرلوں کے ایک اہم گروپ نے سامراجی مسلک اختیار کر لیا تھا۔ سکریٹری آف اسٹیٹ کے ہاتھوں میں پوری طاقت تھی اور اس کو پورے اختیارات حاصل تھے اور حکومتِ ہند ان فیصلوں پر عمل کرنے کے لیے محض آلہ کار تھی جو لندن میں کئے جاتے تھے۔

حکومت ہندوستان نے جسے سیاسی حالات کے متعلق سکریٹری آف اسٹیٹ کو مشورہ دینا تھا، کانگریس کی کارروائیوں پر کچھ تعجب کا اظہار کیا اور تحریک میں تھوڑی بہت دلچسپی لی۔ 1886 میں ڈفرن نے کلکتہ میں مندوبین کو ایک دعوت میں مدعو کیا۔ مدراس میں منعقد ہونے والے اگلے اجلاس میں گورنر نے اسی طرح انھیں مدعو کیا۔ سرکاری حکام کو اجلاس میں شرکت کرنے کی اجازت تھی۔ لیکن 1888 تک حکومت کا رویہ بالکل بدل چکا تھا۔

قراردادوں میں ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کیا جاتا تھا اور تقریروں میں حکومت کی کارروائیوں اور خصوصیت کے ساتھ سامراجی پیش قدمی کی پالیسی اور جنگوں کی مذمت کی جاتی تھی جسے برطانوی حکمراں ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ جس چیز نے انھیں اور زیادہ ناراض کر دیا وہ تھی ان پمفلٹوں کی اشاعت جن میں ہندوستانیوں کی شکایتیں درج ہوتی تھیں اور جو ظاہر ہے کہ سیاسی تحریک کو جاری رکھنے کا ایک ذریعہ تھا۔ اس کی وجہ سے بے چینی اور تناؤ اور بڑھا اور آئرلینڈ کی ہوم رول کی تحریک کی سی شکل اس نے اختیار کر لی۔

کانگریس کے مطالبات کے تعلق سے ڈفرن نے شدید ردعمل ظاہر کیا اس نے کانگریس کے سکریٹری ہیوم کو ملازمت کا نشانہ بنایا، سرہنری مین کو ایک خط میں اس نے لکھا 'ایک شریر انسان

---

[1] ایضاً، 7/اگست 1886

ہے جس کا نام ہے ہیوم اسے لارڈ رپن نے بہت اچھالا تھا، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی ہوم رول کی تحریک میں جان ڈالنے والوں میں اس کا بھی شمار ہوتا ہے۔ وہ چالاک، کسی حد تک مخبوط الحواس ہے، خود پسند ہے اور بد دیانت ہے۔ سچائی کے متعلق احتیاط سے کام نہیں لیتا ہے۔ ''[1]

میں نے اس سے اتفاق کیا کہ ہندوستان نمائندہ حکومت کے اہل نہیں ہیں اور اس کے لیے دلیلیں دیں۔ اس نے ڈفرن کو لکھا'' یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ پڑھے لکھے ہندوستانی جس کو اپنی منزل سمجھتے ہیں وہاں وہ کبھی نہیں پہنچ سکتے ہیں اٹھارہ کروڑ لوگ اپنے اوپر حکومت کیسے کر سکتے ہیں؟ جب اس جم غفیر پر اُن کا اطلاق کیا جاتا ہے تو ذمہ دار نمائندہ حکومتوں کی اصطلاحیں اپنے معنی کھودیتی ہیں...... حالانکہ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں نے ہماری جمہوری زبان کا استعمال سیکھ لیا ہے لیکن حقیقت میں وہ تنگ نظر پر مبنی ایک اولی گارکی قائم کرنا چاہتے ہیں... میرا خیال ہے کہ یونیورسٹیوں میں تعلیم پانے والے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی تعداد 5,000 سے زیادہ نہیں ہوگی، لیکن کوئی بھی ایسا نظام جس میں 5000-18 کروڑ پر حکومت کریں طبقہ اشرافیہ کو جنم ضرور دے گا اور اس مخصوص صورت میں ایسے طبقہ اشرافیہ کو جنم دے گا جس کے پاس نہ طاقت ہوگی، جو نہ نمائندہ ہوگا اور نہ کسی سماجی اصلاح کی طرف مائل ہوگا۔''[2]

ڈفرن نے نارتھ بروک کو لکھا'' بڑی بڑی تبدیلیوں کے لیے عام لوگوں کی خواہش کو بڑھانے سے میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنا دامن بچایا ہے اور انھیں ایسی امیدیں اور توقعات نہیں دلائی ہیں جنھیں پورا کرنا ممکن نہیں ہے۔''[3]

بنگال کے شدت پسند طبقے کے متعلق'' جو دستوری اداروں کو شروع کرنے کے لیے مسلسل چیخ پکار کرتے رہتے ہیں '' ملکہ کو بھیجے جانے والے خط میں گورنر جنرل نے ان کے بارے میں لکھا تھا'' یہ چھوٹا سا جتھا ہے...... جس کا اثر بہت معمولی ہے اور جس کی تعداد اتنی کم ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں کر سکتے ہیں''۔[4] پھر بھی ہندوستانیوں کو خوش کرنے کے لیے اُس نے جشن جوبلی کے نام

---

[1] ڈفرن کا خط مین کے نام، 4/مئی 1886، ڈفرن کے کاغذات

[2] مین کا خط ڈفرن کے نام، 2/جون 1886، ڈفرن کے کاغذات

[3] ڈفرن کا خط نارتھ بروک کے نام، 23/جون 1886

[4] ملکہ کے نام خطوط، ڈفرن کا خط ملکہ کے نام، نمبر 76۔ 26/مارچ 1888

ایک پیغام میں کہا'' جس زمانے کا ہم جائزہ لے رہے ہیں اُس میں تعلیم نے اپنا کام کیا ہے اور ہمارے چاروں طرف وہ ہندوستانی شرفا پائے جاتے ہیں جن کے بڑے بڑے کارنامے ہیں اور جو بہت ذہانت رکھتے ہیں اور جن کے صدق دل اور وفاداری اور دیانت داری سے کئے جانے والے تعاون سے ہمیں بہت فائدے کی امید ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایک ایسی حکومت کے لیے جیسی ہماری ہے اُن کے مشورے امداد اور یکجہتی کامیابی کے ساتھ حکومت چلانے کے لیے ضروری ہیں۔ پسندیدگی اور نیک نیتی کے علاوہ میں کسی اور نظر سے ان کی اس قدرتی خواہش کو نہیں دیکھتا ہوں کہ اپنے معاملات کے الزام میں وہ اور زیادہ انگریز حکمرانوں کے ساتھ مل کر کام کریں اور مجھے بڑی خوشی ہوگی کہ اگر ہندوستان میں میری مدّت قیام میں حالات مجھے اس کی اجازت دیں کہ میں اس سیاسی حیثیت کو زیادہ وسیع اور زیادہ لفظی بنیاد دے سکوں جو ایک نسل پہلے لارڈ ہیلی ٹیکس نے اُن ہندوستانی شرفا کو عطا کی تھی جنھیں ان کے اثر، ان کی اہلیتوں اور اس اعتماد کی بنا پر، جو ان کے ہم وطن اُن میں رکھتے تھے، لیجسلیٹیو کونسلوں میں مفید اضافہ سمجھا گیا۔''[1]

ایک مہینے بعد اُس نے سکریٹری آف اسٹیٹ سے اعتراف کیا'' اس کے علاوہ آپ کو یہ جاننا چاہیے کہ یہ چیخ پکار محض بنگالی بابو نہیں کر رہے ہیں بلکہ پورا تعلیم یافتہ ہندوستان اس میں شامل ہیں اور مسلمان بھی اس سے علیحدہ نہیں ہیں۔ اس میں وہ سب لوگ شامل ہیں جو چاہتے ہیں کہ داخلی امور کے انتظام میں اُن سے زیادہ مشورہ کیا جائے۔''[2] لیکن اُسے اس پر اصرار تھا کہ اقتدار اعلیٰ برطانیہ کا ہو۔ اُس نے کہا تھا'' مجھے آپ سے پورا اتفاق ہے کہ جس چیز میں ہندوستانیوں کی واقعی بھلائی ہے وہ ہے انگریزی انصاف اور انگریزوں کی انتظامی صلاحیت اور ہر حال میں انھیں پوری طرح باقی رکھا جانا چاہیے۔''[3] اُس نے انڈین نیشنل کانگریس کو ''بچکانہ حرکت'' ، '' آئین اور پیرو کی بحث ومباحثے کی انجمن ''اور ایسی'' جذباتی ''انجمن سے تعبیر کیا'' جس میں زیادہ شدت پسند اور زیادہ بیوقوف اراکین کا حکم چلتا ہے ''اس

---

[1] ڈفرن، جوبلی کے جشن میں کی جانے والی تقریر 16 فروری 1887 دیکھئے' ہندوستان میں کی جانے والی تقریریں' صفحہ 159

[2] کراس کے کاغذات، ڈفرن کا خط کراس کے نام، 20/ مارچ 1887

[3] ایضاً

نے اُسے ''بابو پارلیمنٹ'' کہا جس کی ''حمایت ایک چھوٹی سی اقلیت کرتی ہے۔''[1]

لینس ڈاؤن نے جذباتیت سے بچتے ہوئے 1880 میں انڈین نیشنل کانگریس کے متعلق اپنی رائے مندرجہ ذیل میں ظاہر کی۔

''حکومت ہندوستان تسلیم کرتی ہے کہ کانگریس کی تحریک کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ اُس کی نمائندگی کرتی ہے جس کو یورپ میں ایک ''پیش قدم لبرل پارٹی'' کہا جائے گا جو اُس کنزرویٹیو رائے عامہ سے مختلف ہے جو ملک میں پائی جاتی ہے۔ جب تک یہ دونوں پارٹیاں دستوری طریقے سے کام کرتی ہیں وہ دونوں کی طرف نامزدگی کا رویہ اپنانا چاہتے ہیں۔''[2]

ایلگن کے زمانہ حکومت میں سکریٹری آف اسٹیٹ جارج ہملٹن نے وائسرائے کو لکھے جانے والے ایک خط میں اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ کانگریس روبہ تنزل تھی اس لیے کہ اُس کا خیال تھا کہ وہ باغیانہ تنظیم ہے اور اس کے رہنما مشکوک کردار رکھتے ہیں۔

سب سے بڑے سامراجی وائسرائے کرزن نے سکریٹری آف اسٹیٹ کی اس نامناسب خوشی میں اور اضافہ کیا اور یہ سوچ کر خوشی سے پھول گیا کہ کانگریس کی موت قریب ہے۔ اس نے کہا'' میرا اپنا خیال ہے کہ کانگریس لڑکھڑا رہی ہے اور گرنے والی ہے اور ہندوستان میں جب تک میں ہوں میری خواہش ہے کہ اس کی پرامن موت میں مدد کروں۔''[3]

VIII۔ حکمرانوں اور محکوموں کے درمیان نزاع

واقعہ یہ ہے کہ کانگریس کے منظرِ عام پر آنے کے بعد وہ نزاع اور واضح ہوگئی جو ایک سامراجی طاقت اور اس کی رعایا کے باہمی رشتوں کا لازمی جز ہوتی ہے۔ اس نزاع نے ایک اخلاقی سوال پیدا کر دیا۔ برطانوی حکومت کے پاس اس کا جواز کیا تھا کہ وہ ہندوستان کے لوگوں سے اطاعت کا مطالبہ کرے۔

---

[1] کراس کے کاغذات، ڈفرن کا خط کراس کے نام، 4/ جنوری اور یکم فروری 1887

[2] اے۔ سی نزدرار نے ''ہندوستان کے قومی ارتقا'' میں اقتباس دیا، صفحہ 82

[3] کرزن کا خط سکریٹری آف اسٹیٹ کے نام، 18/ نومبر 1900

انگریزوں کا کہنا تھا کہ ہندوستان کوئی وجود نہیں رکھتا ہے۔ جسے ہندوستان کہا جاتا ہے وہ محض ایک جغرافیائی اصطلاح ہے اور ایک ایسا علاقہ ہے جس میں کئی قبیلے، فرقے اور نسلیں مذہبی سماجی اور تہذیبیں ملتی ہیں۔ انھیں ایک قدرتی سماجی یا اخلاقی اکائی نہیں کہا جا سکتا اور انگریزوں کو ان پر حکومت کرنے کا اتنا ہی حق حاصل ہے جتنا ان سے پہلے حکمرانوں کا تھا۔ ان کے حق کی بنیاد بھی وہی تھی جو پچھلے فاتحین کے حقوق کی بنیاد تھی یعنی تلوار۔ پچھلے فاتحین کی طرح انگریزوں نے بھی امن قائم کیا اور نظم وضبط پیدا کیا۔ انھوں نے اس کے علاوہ بھی کچھ دیا یعنی ایک جدید حکومت جو قانون، عدالتی نظام اور اچھے انتظامیہ پر مشتمل ہے۔ قومی اتحاد کی عدم موجودگی میں حکومت کو تقریباً بیس بے ربط اور متصادم گروپوں کے سامنے ذمہ دار کیسے بنایا جا سکتا ہے؟

مضبوطی کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھی ہوئی نوکرشاہی نے سماجی پہچان کو پوری طرح نہیں سمجھا اور ان کے چاروں طرف جو سماجی انقلاب ہو رہا تھا اُس کو دیکھنے سے وہ قاصر رہے۔ ملک کے متعلق ان کا خیال تھا وہ ناقابل تغیّر مشرق ہے جہاں سفید فام لوگ حکومت کا بوجھ سنبھالتے ہیں اور آپس میں لڑنے والے راجاؤں، مہاراجوں اور قبیلوں میں قانون کی عملداری قائم کرنے میں اس بات کو ثابت کرنے کے لیے وہ اعداد وشمار کا سہارا لیتے تھے کہ نئے انگریزی تعلیم پائے ہوئے طبقے کی اہمیت کتنی کم ہے۔ وہ پوچھتے تھے کہ کتنے ہندوستانی یونیورسٹی کا تجربہ رکھتے ہیں اور کس طرح یہ چھوٹا سا طبقہ لاکھوں کروڑوں بے زبان لوگوں کی خواہشوں کی نمائندگی کر سکتا ہے؟ شہر کے باسیوں یعنی وکیلوں، اڈیٹروں اور کلرکوں اور چھوٹے چھوٹے ہزاروں گاؤں میں رہنے والے کسانوں اور دستکاروں کے درمیان ایک خلیج ہے۔ وہ عام لوگوں کی زندگیوں اور ان کی ضرورتوں اور تکلیفوں کے متعلق کچھ نہیں جانتے ہیں اور ان کی طرف سے بات کرنے کا انھیں کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ہندوستان کے سیاست داں وہ نعرے دہراتے ہیں جو انھوں نے انگریزی کی کتابوں میں پڑھے ہیں اور جو ہندوستان کی حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ حالات کے متعلق اس قسم کے خیالات کی بنا پر نوکرشاہی بڑی حقارت کے ساتھ کانگریس کی کارروائیوں کو بے معنی بکواس کہا کرتی تھی۔ وہ ہیوم کی اس وضاحت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے " کہ کانگریس وسیع تر جذبۂ ایثار حقیقی عوامی جذبہ پیدا کرنا چاہتی ہے... اور زیادہ بڑے پیمانے، ہر نمائندہ اداروں، کاموں

اور طریقوں سے ملک کو متعارف کرانا چاہتی ہے۔ ''نوکر شاہی کے مبصّر سر آکلینڈ کولون نے پائنیر کے کالموں میں اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

''میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ بار بار آپ کے رسالے پڑھے اور ان میں مجھے ایسے ٹکڑے ملے جن میں برطانوی حکومت اور ہندوستان کے انگریز افسروں کو لوگوں کے سامنے غیر انصاف پسند، ناعاقبت اندیش، جاہل اور اپنی کارروائیوں میں بے پرواہ کی حیثیت سے پیش کر کے ان کے غصے کا نشانہ بنایا گیا ہے'' ۔

رہ گیا آج کا ہندوستان جیسا کہ ہم اُسے جانتے ہیں یعنی وہ ہندوستان جو تعلیم حاصل کر رہا ہے، وہ ہندوستان جسے اپنے کمزور عام لوگوں کے مفادات میں ایک ناطرفدار انصاف کے سامنے جھکنا پڑا، وہ ہندوستان جس میں سڑکوں اور ریلوں نے اتحاد پیدا کیا، وہ ہندوستان جو دنیا کی اول درجے کی تجارتی منڈیوں تک رسائی حاصل کر سکا، وہ ہندوستان جس میں مذہبی رواداری ہے، وہ ہندوستان جس میں برسوں تک مسلسل امن قائم رہا، وہ ہندوستان جس میں اخباروں کو آزادی حاصل ہے اور آخر میں وہ ہندوستان جسے پہلی دفعہ سکھایا گیا کہ حکومت کا مقصد ہے لوگوں کی بھلائی نہ کہ بادشاہ کا ذاتی مفاد، اس کا کوئی ذکر آپ کی تحریروں میں نہیں ملا ...ان رسالوں کے لیے کانگریس کے ناقدین پارٹی کے رہنماؤں کو ذمہ دار قرار دیتے ہیں۔''

ہندوستان کا جواب تھا کہ یہ ملک ایک تہذیبی اکائی ہے جس میں ایک قدیم تہذیب غالب ہے اور کئی اقلیتوں کی تہذیبیں ہیں۔ یہ ایسی صورتحال ہے جو تاریخ میں عام طور سے دیکھنے میں آتی ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ اس کا حجم اور پیمانہ بڑا ہے۔ زیادہ اہم بات یہ تھی کہ اُسے قوم کی حیثیت یعنی سیاسی اتحاد کا شعور بخش دیا تھا۔ کانگریس کے صدروں نے بار بار اُس پر زور دیا تھا۔ فیروز شاہ مہتا نے 1890 میں کہا تھا۔ '' کانگریس کے اراکین اُن انسانوں کی طرح ملتے ہیں جن کی مشترکہ بنیاد قومیت ہے، جو حکومت کے ایک نظام کی بھلائی یا برائی سے متاثر ہوتے ہیں، جنھیں ایک سے حقوق حاصل کرنے اور ایک سے بوجھوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے ایک سے عوامل حرکت میں لاتے ہیں ... یہ وجہ ہے کہ اس تنظیم کو انڈین نیشنل کانگریس کا نام دیا گیا ہے اور وہ اپنے خیالات کو ظاہر کرنے کی خواہش مند ہے۔ ''اس خیال کے مطابق انڈین نیشنل کانگریس اس شعور کی علامت اور منظم ادارہ تھی۔

IX۔ برطانوی پالیسیاں

(1) لیکن یہ دلیل انگریزوں کو مطمئن نہ کرسکی اور وہ ہندوستان کو ایک نام اور جغرافیائی اکائی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہ محض اپنے سامنے ذمہ دار ہیں اور فیصلے کرنے اور پالیسیاں بنانے میں ہندوستانیوں کی رائے لینے یا اُنھیں شریک کرنے کو وہ تیار نہیں تھے۔ فرانس کے کلونیل اسکول کے ایک اہم ممبر اور پرچارک اور مشرقی مسائل کے طالب علم چیلی کا کہنا ہے کہ یورپ کی سامراجی طاقتوں کی اپنی " نیو پالیسی " تھی جس کے دو مقصد تھے۔ پہلا مقصد تھا یورپ کے کارخانوں کے لیے سستے مزدور مہیا کرنا اور دوسرا تھا " محکوم لوگوں کو اس پر آمادہ کرنا کہ وہ بدیسیوں کے اقتدار اور حکومت کو قبول کرلیں۔ "[1] باغداری کی صنعتیں یعنی نیل، پٹ سن اور چائے ایسے برطانوی کاروبار تھے جن میں سستے ہندوستانی مزدور کام کرتے تھے اور اس کے علاوہ ہندوستان میں برطانیہ نے جو حیثیت تعمیر کی تھی وہ انگلستان کی صنعتوں کے لیے ہندوستان کے سستے مزدوروں کے ذریعے خام مال پیدا کرنے کی ہمت افزائی کرتی تھی۔

دوسرے مقصد کو پورا کرنے کی کوشش ایک اچھی حکومت قائم کرکے اور محکوموں کے احساسات کو سمجھ کر اور انھیں خوش کرکے کی جاتی تھی، چیلی کے مطابق اس مقصد کو حاصل کرنے میں انگریزوں کو بڑی کامیابی ہوئی۔ صرف ایک تعلیم یافتہ طبقہ ایسا تھا جس کی حمایت حاصل نہیں کی جاسکی۔ لیکن اس کی تعداد بہت کم تھی اور کسی بھی حالت میں وہ آبادی کے نو فیصدی سے زیادہ نہیں تھے۔

چیلی کا خیال تھا کہ برطانوی حکومت نے بڑے طریقے سے " نیو پالیسی " پر عمل کیا یعنی ایک ایسی حکومت قائم کرکے جو ان کے خیال کے مطابق اچھی ہو اور محکوموں کے احساسات کا احترام کرکے ان کا خیال تھا کہ اس پالیسی کی بنا پر ان کی حکومت ہمیشہ قائم رہے گی اور لوگ ہمیشہ کے لیے ان کے اقتدار کو تسلیم کرلیں گے۔

اچھی حکومت کے معنی سمجھے جاتے تھے وہ حکومت جو امن وامان قائم رکھے، داخلی شورشوں کا سدِّ باب کرے، جان و مال کی حفاظت کرے اور بیرونی حملوں سے ملک کو بچائے۔ امن وامان کو

---

[1] دیکھئے چیلی۔ جے۔ برطانوی ہند کے انتظامی مسائل، صفحات 203 اور اس کے بعد۔

قانون کے ضابطوں یعنی سول قانون اور تعزیرات ہند، سول اور فوجداری کے ضابطوں، قانون شہادت وغیرہ سے، سول سروسوں کی تنظیم سے، عدالتوں سے اور پولیس کے ذریعہ برقرار رکھا گیا۔

لیکن جس وقت حکومت کے یہ ضروری کام پورے ہو گئے تو انگریزوں کو حکومت کے فلاحی کاموں کی ضرورت کا احساس نہیں ہوا۔ اس زمانے کے متعلق لکھتے ہوئے پرسیول اسپیر کہتا ہے ''حکومت ہندوستان کو تخلیقی کوشش یا ایک نئے عہد کے لیے تیاری کرنے کی دعوت کے بجائے اور زیادہ سفید فام لوگوں کا بوجھ سمجھا جانے لگا ... دوررس امید کو پس پشت ڈالنے کے بعد صرف اتنا کام رہ گیا تھا کہ وہ امن بحال رکھیں اور انصاف کریں، ترقی کے اقدامات کریں اور پیار کے ساتھ دیکھ بھال کریں۔''[1] رپن کے رٹائر ہونے سے کرزن کے واپس بلائے جانے تک کے بیس سال میں حکمرانوں کا سب سے اہم مقصد تھا اُس غیر ذمہ دار سامراجی حکومت کو برقرار رکھنا جس پر لوگوں کا اعتماد روز بروز کم ہوتا جا رہا تھا اور جس کے خلاف قوم پرستانہ جذبہ روز بروز بڑھ رہا تھا۔

(2) عام فلاح و بہبود کے مسائل

ایک ناگزیر عمل کے طور پر انگریز ہندوستانی معیشت کے بنیادی مسائل کو حل کرنے، سماجی اصلاح کرنے اور سیاسی ترقی کرنے کے بجائے اپنی حکومت کو برقرار رکھنے اور سامراجی مفادات کو فروغ دینے میں مصروف تھے۔ اور کانگریس کے اصرار اور جلدی کو تکلیف دہ امر سمجھ کر ٹال دیا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر لوگوں کی اُس بہت بڑی تعداد کی حالت سدھارنے کے لیے جو کاشت کرنے میں مصروف تھے اس زمانے میں وہ جو کچھ کر سکے وہ صرف اتنا تھا کہ شمالی ہندوستان کے زمینداری کے علاقے میں انھوں نے بنگال، پنجاب اور اودھ کے قوانین مال کے ذریعہ کسانوں کو کچھ راحت پہنچائی۔

اس کے بعد زمین کو علیحدہ کرنے کے قوانین بنا کر مہاجنوں کے خلاف کسانوں کا کچھ تحفظ کیا گیا۔ لیکن اگریکلچر کمیشن کی سفارشوں، ڈاکٹر ولکر (1889۔ 1890) کی رپورٹ اور کاشتکاری کے محکموں اور فارموں کے قیام کے باوجود'' ہندوستانی کاشت کو ترقی دینے کی انگریزوں کی کوششوں میں اتنا تذبذب اور بین تامل پایا جاتا تھا کہ اُس میں زیادہ سدھار نہیں ہو سکا۔''

---

[1] اسمتھ، ڈی۔ اے، ہندوستان کی آکسفورڈ کی تاریخ، نیا اڈیشن (1958)، صفحہ 682

صنعت کی حالت بھی کچھ ایسی ہی تھی ہندوستان کے چھوٹے سے اور تذبذب سرمائے کو صنعتوں میں لگانے کے لیے ہمت افزائی نہیں کی جاتی تھی جیسا کہ جے۔جے۔ٹاٹا کے واقعے سے ظاہر ہوتا ہے۔ جو صنعتیں صرف معرضِ وجود آگئی تھی ان میں سے زیادہ تر انگریزوں کا کنٹرول تھا جیسے سوتی کپڑے کی صنعت، چائے کی صنعت، کوئلے کی صنعت، پٹ سن کی صنعت اور کاغذ کی صنعت۔ ریلوں اور جنگلات وغیرہ پر حکومت کا کنٹرول تھا، یہ صحیح ہے کہ ریلوں نے بڑی تیزی کے ساتھ ترقی کی۔ 1900 تک 25000 میل ریل کی پٹری بچھائی جا چکی تھی لیکن اس قابل تعریف ترقی کے پس پشت دو عوامل کام کر رہے تھے یعنی برطانوی سرمائے کے لیے محفوظ اور منافع بخش اصل کاری کا موقع اور حکومت کی فوجوں کی ضروریات کو پورا کرنا۔ 1852 کی مشہور روداد میں ڈلہوزی نے ریلوں کے اصل فوجی رول کا ذکر کیا تھا[1] اور اس کی طرف اشارہ کیا تھا کہ انگلستان کو بھیجی جانے والی کپاس کے برطانوی تجارت کو ملک کے اندرونی حصوں کی پیداواری کو دنیا میں برآمد کرنے اور برطانوی مال کے لیے نئی منڈیاں کھولنے میں اُن سے فائدہ ہوگا۔

ریلوں کے مقابلے میں آب رسانی کے ذرائع کو کم اہمیت دی گئی حالانکہ ایک کاشتکاری کرنے والے ملک میں، جس کے بڑے بڑے علاقوں کو پانی کی ضرورت ہے اُس کی ضرورت اگر زیادہ نہیں تھی تو کم بھی نہیں تھی۔ صحت، صفائی، رہنے کے لیے گھروں اور زندگی کے عام حالت کو بہتر بنانے کی طرف اور بھی کم توجہ دی گئی۔ چنانچہ 1871 سے 1911 تک اگر ہندوستان کی

---

[1] ''نقشے پر ایک نظر ڈال کر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ ہماری سلطنت کتنی بڑی ہے، کتنے مختلف طبقات اور مفادات اس میں شامل ہیں اور اُن مختلف مقامات کے درمیان کتنا فاصلہ ہے۔ جہاں کبھی بھی حملہ ہو سکتا ہے۔ اُن لوگوں میں اس قسم کی دشمنی کا مستقل خطرہ پایا جاتا ہے جن سے ان کی امید نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اس علاقے میں فوجوں کی معمولی نقل و حرکت میں وقت، روپیہ اور جان کا جتنا خطرہ ہو سکتا ہے اس کے پیش نظر سمجھا جا سکتا ہے کہ داخلی مواصلات کے ایک نظام سے کتنے سیاسی فوائد اٹھائے جا سکتے ہیں جو آج کی رفتار کے مقابلے میں پانچ گنی تیزی کے ساتھ ہر حال میں حکومت کو اطلاعات پہنچا سکتا ہے۔ اور حکومت کو اس قابل بنا سکتا ہے کہ وہ کسی بھی مقام تک فوجوں کا بڑا حصہ اتنے دنوں میں پہنچا دے جتنے مہینوں میں آج کل پہنچتی ہے اور اتنی زیادہ جتنی آجکل ممکن نہیں ہیں'' ڈلہوزی کی روداد، مورخہ 20/اپریل 1885 محکمۂ داخلہ (عوامی)، کارروائی نمبر 288 صفحہ 815۔

آبادی بیس کروڑ سے بڑھ کے تیس کروڑ ہوگئی۔ شرح اموات بہت زیادہ تھی۔ تعلیم کا ذکر ایک پچھلے باب میں کیا جاچکا ہے۔ لیکن یہ دوبارہ بتادیا جانا چاہیے کہ 1885اور 1901 کی درمیانی مدت میں خواندگی کے تناسب میں کوئی بڑا فرق نہیں ہوا تھا۔

حکومت کو جمہوری بنانا یہ تھا ریکارڈ اچھی حکومت کا۔ حکومت خوداختیاری کو فروغ دینے کے لیے کیا کیا گیا؟ عظیم بغاوت کے بعد کی تین دہائیوں میں سامراجی حکومت کو جو لبرل وقفہ آیا وہ تھا رپن کا چارسالہ دورحکومت جب حکومت خوداختیاری کو توسیع دینے کی کوشش کی گئی لیکن اُسے نوکرشاہی نے کامیاب نہیں ہونے دیا۔ ہندوستان کے رہنماؤں کی یہ اپیلیں ردکردی گئیں کہ ہندوستانیوں کا سول سروس کے اعلیٰ عہدوں پر تقرر کیا جائے اور انتخابات کے ذریعے اُنھیں لیجسلیٹیو کونسلوں میں داخل ہونے کی اجازت دی جائے۔ اگر ہندوستان کی حکومت مقامی حالات کے زیر اثر کچھ پیش قدمی کرنے کی ضرورت محسوس بھی کرتی تھی تو انگلستان کی حکومت اُن تجاویز کو رد کردیتی تھی یا کوئی بڑی تبدیلی کے بغیر '' محکوموں کو خوش کرنے کا کوئی طریقہ دریافت کرلیا جاتا تھا۔''

لیجسلیٹیو کونسلوں میں ہندوستانیوں کی شرکت کی کہانی بڑی افسوسناک ہے۔ جب 1831 میں کونسلوں کی تشکیل نو کی گئی تو اُنھیں مشکل ہی سے مقنّنہ کا نام دیا جاسکتا تھا۔ اس لیے کہ حقیقت میں حکومت کے ہاں میں ہاں ملانے والی کمپنیاں تھیں۔ مثال کے طور پر حکومت ہندوستان کی لیجسلیٹیو کونسل توسیع شدہ ایگزیکٹیو کونسل تھی۔ گورنر جنرل کی کونسل کے ممبروں کے علاوہ اُس میں چھ سے لے کر بارہ تک ایسے ممبر تھے جنھیں گورنر جنرل نامزد کرتا تھا۔ شرط صرف اتنی تھی کہ اُن میں سے آدھے غیرسرکاری ہوں اُس کے کام محدود تھے۔ گورنر جنرل کی پیشگی اجازت کے بغیر وہ سرکاری آمدنی، قرضوں اور فوج کی طرح کے اہم اُمور پر غور نہیں کرسکتی تھی۔ گورنر جنرل کو درخواست ادا کرنے کا مطلق حق اور آرڈیننس بنانے کا اختیار حاصل تھا۔ تاج کسی بھی ایکٹ کو نامنظور کرسکتا تھا اور ہندوستان کے لیے قانون بنانے کے پارلیمنٹ کے اختیار پر اعتراض نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اُس کا دائرہ عمل کتنا محدود تھا اُس کا اظہار اس واقعہ سے ہوتا ہے کہ کونسل کے ساتھ انگلستان میں ایک آزاد لا کمیشن بھی کام کرتا تھا۔ جو اُن قانونوں کے مُسودے تیار کرتا تھا جنھیں

لیجسلیٹیو کونسل منظور کرتی تھی وہ کتنی بے بس تھی اُس کا ثبوت 1876 میں سوتی کپڑے کی درآمد پر ڈیوٹی ختم کرنے کا واقعہ پیش کرتا ہے لارڈ میکڈانل نے 1888 میں کونسلوں کے متعلق یہ کہا تھا۔

''اُن لیجسلیٹیو کونسلوں کی نوعیت، جنھیں 1861 کے ایکٹ کے تحت قائم کیا گیا تھا، صرف اتنی ہے کہ وہ قانون سازی کرنے کی کمیٹیاں ہیں۔ ایسی کمیٹیاں جن سے انتظامی حکومت اپنی قانون سازی میں مشورہ کرتی ہے مدد لیتی ہے''...

جہاں تک اُس کے بنائے ہوئے قوانین کا تعلق تھا۔ اُس نے کہا'' لیجسلیٹیو کونسلوں میں جو قوانین بنائے جاتے ہیں اُنھیں حقیقت میں حکومت کے احکامات کہنا غلط نہیں ہوگا۔ ''اُس نے مزید وضاحت کی'' کونسلوں کو یہ اختیار حاصل نہیں ہے کہ اُن قانونوں کے علاوہ جو اُس کے سامنے ہوں کسی اور موضوع پر بحث کریں۔ وہ شکایتوں کی تفتیش نہیں کر سکتی ہیں، اطلاعات حاصل نہیں کر سکتی ہیں۔ یا مجلس عاملہ کے کردار پر غور نہیں کر سکتی ہیں۔ انتظامیہ کے کام پر گرفت نہیں کی جا سکتی ہے یا اُن کی اِن اسمبلیوں میں صفائی پیش کی جانی چاہیے جب تک کہ ان کا تعلق اُن اقدامات سے نہ ہو جس پر بحث کی جا رہی ہو۔''[1]

ان کونسلوں میں بالائی طبقوں کے لوگوں کو داخل کیا جاتا تھا جیسے راجے، نواب، امرا، زمیندار، مالدار تاجر، وکیل اور رجعت پسند اخباروں کے وفادار اڈیٹر۔ اُن کی رکنیت کے متعلق یہ کہنا مذاق معلوم ہوتا ہے کہ '' اپنے ملک کی حکومت میں حصہ لینے کے لیے ہندوستانیوں کے حق کو تسلیم کر لیا گیا۔''

کونسلوں کی اصلاح پر تیس سال تک ہندوستانی زور دیتے رہے۔ تعداد اور کام کے اعتبار سے کونسلوں کی توسیع اور لوگوں کے منتخب نمائندوں اور اُن طبقوں کے لوگوں کو ان کے ممبر بنانے کے متعلق کانگریس سال بہ سال تجاویز پاس کرتی رہی جو اس حق پر سمجھ داری اور آزادی کے ساتھ عمل کر سکیں۔ اُس نے مشورہ دیا کہ صوبائی کونسلوں کے ممبروں کو میونسپلٹیوں، ڈسٹرکٹ بورڈوں، چیمبر آف کامرس اور یونیورسٹیوں کے ممبر منتخب کریں یا رائے دہندگان کے ایسے ادارے کریں جو اُن لوگوں پر مشتمل ہوں جن کے پاس اتنی تعلیم یا املاک ہو جو ضروری سمجھی جائے اور گورنر جنرل کی

---

[1] ہندوستان کی دستوری اصلاحات پر رپورٹ، (1918)، پیراگراف 64۔ صفحات 55-54

لیجسلیٹیو کونسل کے ممبروں کو صوبائی کونسلوں کے ممبر منتخب کریں۔ کلکتہ کی انڈین ایسوسی ایشن کی طرح کی سیاسی انجمنوں نے میٹنگیں اور کانفرنسیں کر کے حکومت کی توجہ کونسلوں کی تشکیل نو کی ضرورت اور اہمیت پر دلائی۔

ہندوستان کے اخباروں نے رائے عامہ کا اظہار کیا جو کونسلوں کو ہندوستانیوں کے ساتھ مذاق اور لوگوں کو بے وقوف بنانے کی کوشش سمجھتی تھی اور اس کو پوری طرح بدلنے کے لیے حکومت پر زور دیا چیمبر آف کامرس اور دوسرے عوامی اداروں میں یہ مانگ کی۔

کونسل کے سوال پر ہندوستانیوں کے احساسات کی شدت سے ڈفرن متاثر ہوا تھا ہندوستانی ممبروں کے لیے انتخاب کے اصول کو تسلیم کرنے کے لیے اس نے سکریٹری آف اسٹیٹ کے سامنے تجاویز رکھیں لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہا'' ہندوستان کی اعلیٰ یا ماتحت حکومتوں کے لیے اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے کہ وہ اُس اختیار کے کسی بھی ضروری حصے سے دست بردار ہو جائیں جو ان بہت سی قومیتوں پر، جن میں سے زیادہ تر تہذیب اور روشن خیال کے اعتبار سے بہت زیادہ پس ماندہ ہیں، حکومت کرنے والی طاقت کے طور پر ہمارے وجود کے لیے ضروری ہیں۔''[1] لیکن اس کے مطابق وقت آ گیا تھا کہ اپنے (حکومت کے (ساتھ انتظامی معاملات میں ایسے لوگوں کی معقول تعداد کو شریک کر کے دستوری ترقی میں ایک قدم بڑھایا جائے جو تعلیم یافتہ طبقے میں سے '' منتخب یا نامزد '' کئے جائیں اور ہندوستان کی رائے عامہ کے بڑے حصے سے ربط پیدا کر لیں اور اس طرح اُن ذرائع کی تعداد بڑھائیں اور ہندوستان کی رائے عامّہ کے بڑے حصے سے ربط پیدا کر لیں اور اس طرح اُن ذرائع کی تعداد بڑھائیں جن کے ذریعہ وہ ان مختلف فرقوں کی ضروریات و احساسات کو معلوم کر سکیں جن کی بہبودی کی ذمہ داری اُن پر ہے۔[2]

اُس سے ظاہر ہے کہ کونسلروں کو توسیع، ان کے کاموں کی توسیع اور جزوی طور سے انتخاب کے اصول کو تسلیم کرنے کا مقصد اختیارات دینا یا نمائندہ حکومت قائم کرنا نہیں تھا بلکہ اس کا مقصد

---

[1] محکمۂ داخلہ (عوامی)، کانفرنس کی روداد، دسمبر 1889 نمبر 301۔ دستوری اصلاحات پر لارڈ ڈفرن کی روداد جو سکریٹری آف اسٹیٹ کو بھیجے جانے والے مراسلے کے ساتھ بھیجی گئی۔ 6/نومبر 1888

[2] ایضاً

تھا ہندوستان کی رائے عامہ کے متعلق اطلاع حاصل کرنے کا ایک ذریعہ حکومت کو مہیا کرنا۔

جس وقت سکریٹری آف اسٹیٹ اور گورنر جنرل میں دستور کی جن جزئیات پر بحث ہو رہی تھی۔ ہندوستان کی توقعات سے دلچسپی رکھنے والے مسٹر بریڈ لا نے انڈین نیشنل کی درخواست پر 1890 میں ہاؤس آف کامنز میں ایک بل پیش کیا جس کا مُسودہ کانگریس کی اسکیم کے مطابق تیار کیا گیا تھا۔ اس نے حالات کی رفتار تیز کردی اور برطانوی حکومت نے ایک بل پاس کیا۔ جلد ہی اُسے 1892 میں کرزن نے ہاؤس آف کامنز میں پیش کیا۔ کرزن اس وقت انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ تھا۔ اس بل کے مقاصد مندرجہ ذیل بتائے گئے تھے (1) اسی اصول کو تسلیم کرنا (الف (تمام کونسلوں میں مالیاتی تنقید کی جاسکے) ، ب (سوالات کئے جاسکیں اور (ج (کونسلوں کے ممبروں کی تعداد بڑھائی جاسکے۔

حالانکہ کرزن نے کہا تو یہ تھا کہ کونسلوں کے کاموں میں اضافہ کیا جائے گا اور حکومت کے کاموں میں حصہ لینے کے مواقع فراہم کئے جائیں گے لیکن اس کے حقیقی معنی تھے بالائی طبقے؛ کے ایک نتیجہ چھوٹے سے حصہ کی خواہشات اور احساسات سے حکومت کو باخبر رکھنے کے ذریعے میں اضافہ کرنا، کرزن نے پارلیمنٹ میں جو تقریر کی تھی اُس سے یہ بات صاف ہوگئی تھی کہ حکومت واقعی شریک کرنے یا نمائندہ حکومت کی بڑھنے کا کوئی ادارہ نہیں تھا۔ اس نے کہا تھا کہ ہندوستان کے کروڑوں ناخواندہ'' بے زبان لوگوں کے لیے نمائندہ حکومت کا کوئی نظام نہیں بنایا جاسکتا ہے۔''[1]

ایک دلچسپ بحث کے بعد جس میں پارلیمنٹ کے کئی ممبروں نے کانگریس کے نقطۂ نظر کی وضاحت کی، لیکن وہ حکومت کو مطمئن نہ کرسکے، بل منظور کرلیا گیا اور 1892 کا انڈین کونسلر ایکٹ قانون بن گیا۔

انتخاب کے اصول کے بارے میں ایکٹ میں کچھ نہیں کہا گیا اس لیے کہ حکومت اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھی اس کے بجائے گورنر جنرل آف کونسل کو اختیار دیا گیا کہ وہ سکریٹری

---

[1] ہاؤس آف کامنز میں لارڈ کرزن کی تقریر، 28/ مارچ 1892۔ دیکھئے بنرجی، اے۔ سی۔، ہندوستانی دستور کے متعلق دستاویزات، جلد دوم، صفحہ 119

آف اسٹیٹ کے مشورے کے ساتھ مزید ممبروں کی نامزدگی کے شرائط کے تعلق سے ضابطے بنائے (جن کی تعداد 12 سے بڑھا کر 16 کر دی گئی تھی) (ان ضابطوں کی رو سے 16 مزید ممبروں میں سے زیادہ سے زیادہ دس نامزد ممبر غیر سرکاری ہو سکتے تھے تا کہ سرکاری ممبروں کی اکثریت باقی رہے، ان میں سے چار ممبر چار صوبائی کونسلوں کے غیر سرکاری ممبروں کی سفارش پر نامزد کئے جاتے تھے، ایک کو کلکتہ چیمبرس آف کامرس کی سفارش پر نامزد کیا جاتا تھا، مانٹیگو اور چیمسفورا اپنے اس کارنامے سے اتنے خوش تھے کہ وہ اُسے ''دستور میں انقلاب'' سے تعبیر کرتے تھے۔

سوالات کرنے اور بجٹ پر بحث کرنے کا حق دے کر کونسلوں کے کاموں میں اضافہ کیا گیا۔ حالانکہ انھیں بجٹ پر ووٹ دینے کے حق سے محروم رکھا گیا تھا۔ امپیریل لیجسلیٹیو کونسل میں □ 2فروری 1893 کو تقریر کرتے ہوئے لارڈ لینس ڈاؤن نے کہا تھا'' ان کونسلوں کے کرداروں میں ہم بڑی تبدیلی کر رہے ہیں۔''[1] اُس نے انتخاب کے اصول کو رد کرنے کی صفائی پیش کرتے ہوئے کہا'' ہندوستان کے بہت سے حصوں میں انتخاب کا کوئی نظام وہاں کے لوگوں کے احساسات اور عادات کے منافی ہے اور اگر ہم اس قسم کے نظام کو چلن دیں تو اس کے تحت شاید کوئی نمائندہ شخصیت سامنے آسکے۔''[2] حکومت کا مقصد تھا کہ'' ان کونسلوں کے لیے ایسے ممبروں کی خدمات حاصل کرے جو واقعی نمائندہ ہوں لیکن جو علاقوں اور تعدادوں کے بجائے قسموں اور طبقوں کی نمائندگی کریں۔''[3]

چنانچہ 1891 کے کونسلرا یکٹ نے فرقہ وارانہ نمائندگی کے بیج بو دیے۔ جب دستور کی ترقی کے دوسرے قدم کا سوال حکومت کی توجہ کا مرکز بنا تو اُن بیجوں سے پودے پھوٹنے لگے۔ خود ایکٹ ہندوستان کی توقعات سے بہت کم ثابت ہوا۔ انتخاب کے اصول کی نفی اور بجٹ پر بحث اور سوال کرنے کے محدود مواقع کی بنا پر ہندوستان کی رائے عامہ کو مایوسی ہوئی اور وہ ایکٹ پر نظر ثانی کرنے کا مطالبہ کرنے لگی لیکن اُس میں اُسے کامیابی نہیں ہوئی۔

---

[1] مارکسونی آف لینس ڈاؤن کی تقریریں، جلد دوم، صفحہ 515

[2] ایضاً، تقریر، 16/مارچ 5351892

[3] ایضاً صفحہ 536

X۔ملک کی اخلاقی اور مادی ترقی پر بحث

(الف (برطانوی صفائی

حکومت خود اختیاری یا اچھی حکومت کے متعلق اگر کوئی رائے قائم کرنی ہے تو وہ اس کے نتائج کی بنا پر قائم کرنی چاہیے یعنی لوگوں کی مادی اور اخلاقی ترقی کی بنا پر ماضی میں اس سوال پر ہندوستان کے قومی رہنماؤں اور برطانوی حکومت کی وکالت کرنے والوں کے درمیان بڑی بحث ہوئی ہے۔

برطانوی مصنفین میں سے ہابسن کی طرح کے کچھ سامراجیت کے مخالفوں اور ڈگبی کی طرح کے ہندوستان کے حامیوں نے اور ماضی قریب میں جان اسٹریچی اور پامے دت کی طرح کے مارکسوادیوں نے خود اپنے ہم وطنوں کے خلاف فیصلہ دیا ہے۔ برطانوی حکومت کی وکالت کرنے والوں کا خیال ہے کہ برطانوی حکومت میں ہندوستان کے لوگوں کی فی الجملہ مادی خوشحالی بڑھی ہے۔ حالانکہ عام غربت وافلاس اب بھی پایا جاتا ہے۔ دوسری طرف لوگ اتنے ہی وثوق کے ساتھ کہتے تھے کہ انگریزوں سے پہلے کے زمانے کے مقابلے میں غربت وافلاس میں اضافہ ہوا ہے۔

زیر بحث مدّت میں ہندوستان میں جو معاشی حالات پائے جاتے تھے اُن کا ذکر ایک پچھلے باب میں کیا جا چکا ہے۔ اُن دلیلوں کی تکرار کے بغیر اب ضرورت اس کی ہے کہ معاشی حالات کے متعلق خیالات کا تجزیہ کیا جائے اور اُس زمانے کی سیاسی تحریک پر اُن کے اثر کا جائزہ لیا جائے۔

برطانوی حکومت کے حامیوں کے صحیح خیالات کی ترجمانی وہ کتابیں کرتی ہیں جنھیں جارج چیزنی، جان اور رچرڈ اسٹریچی، رچرڈ ٹمپل، جے۔ ڈی۔ ایس، لووف فریزر، پرسویل گریفتھس اور دوسرے رٹائرڈ حکام نے لکھا تھا۔ ان کے علاوہ گورنمنٹ کے شائع کردہ بیانات، یادداشتیں اور رپورٹیں ہیں جو مختلف سیاسی مسائل کے تعلق سے اُس کے نقطۂ نظر کی وضاحت کرتی ہیں۔ ان تحریروں سے ہندوستان کے برطانوی حاکموں کے ذہنوں کا اظہار ہوتا ہے۔

اسٹریچی برادران نے 1882 میں لکھتے ہوئے بتایا تھا'' اس تمام کام (اُمور عامّہ (کی

تکمیل اور اس پر کئے جانے والے خرچ نے، جو اتنا بڑھ گیا ہے کہ اُس کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا، ہندوستان کے لوگوں کی دولت اور سہولت میں اضافہ کر دیا ہے۔''[1] انھوں نے مزید کہا'' یہ واقعہ کہ ہندوستان اُتنی تیزی کے ساتھ جس سے زیادہ تیزی کے ساتھ کوئی ملک نہیں بڑھ سکتا تھا، علم، دولت اور ترقی کے دوسرے شعبوں میں آگے بڑھا ہے... میری رائے میں کسی دلیل کا محتاج نہیں ہے۔''[2]

چیزنی نے اپنی کتاب ہندوستانی سیاسی نظام میں، جس کا پہلا اڈیشن 1868 میں شائع ہوا تھا، 1894 میں لکھا تھا'' جہاں تک مادی پہلو کا تعلق ہے ہندوستان پہلے کی کسی بھی ریاست کے مقابلے میں اب غیر معمولی طور سے خوش حال ہے۔ کوئی بھی جانچ کا طریقہ اختیار کیجئے چاہے وہ داخلی اور خارجی تجارت ہو، اشیا کی زیادہ پیداوار اور ان کا صرف ہو، قیمتی دھات کا ذخیرہ ہو یا سب سے بڑھ کے ریلوں کے ذریعہ زیادہ تر وہ ہندوستان، جو برطانوی معیار کے مطابق اب بھی ایک بہت غریب ملک ہے، مقابلتاً اتنا دولت مند کبھی نہیں تھا جتنا آج ہے۔''[3]

جی۔ڈی۔ایس نے، جو اُس زمانے کے قریب قریب آخر میں، جس کا جائزہ اس جلد میں لیا گیا ہے، گورنر جنرل کی کونسل کا مزید ممبر تھا، ہندوستانی قانون کی دلیلوں کے ذریعے خود پرانچے اڑانے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا۔'' ان لوگوں نے، جو میری طرح بتیس سال پہلے ہندوستان کو جانتے تھے، اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ موجودہ صدی میں زیادہ اونچا معیار راحت وہاں پایا جاتا ہے۔ یعنی بہتر کپڑے، بہتر مکانات، مٹی کے برتنوں کے بجائے پیتل کے برتن وغیرہ وغیرہ جو زیادہ آمدنیوں اور بہتر حالات کی غمازی کرتے ہیں۔''[4]

سرکاری بیانات میں لارڈ لارنس کی بات دہرائی جا سکتی ہے اس نے کہا'' بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ عام لوگ زیادہ خوشحال ہیں اور اتنے خوش ہیں جتنے کسی ہندوستانی حکمراں کے دور میں

---

[1] اسٹریچی، جے اور اسٹریچی۔آر، ہندوستان کی مالیات اور اُمور عامہ، 1882، صفحہ 8

[2] ایضاً صفحہ 12

[3] چیزنی۔جی، ہندوستانی سیاسی نظام، (1894)، صفحات 394-390

[4] ایس، جے، ڈی، حقیقی ہندوستان (1908)، صفحہ 327

کبھی نہیں رہے۔''[1] ڈفرن نے 1887 میں'' آبادی کے نچلے طبقوں کے حالات '' کی خفیہ تفتیش کروائی تھی۔ اُس کی رپورٹ بہت بری تھی لیکن حکومت ہندوستان نے اس کے متعلق جو قرارداد شائع کی تھی اس میں کہا گیا تھا'' عام برسوں میں ایسا لگتا ہے کہ لوگوں کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔''[2]

تیسری دس سالہ اخلاقی اور مادی ترقی کی رپورٹ ((92-1891 میں کہا گیا تھا کہ '' مادی اعتبار سے ایک کسان کی عام حالت ایسی ہے جس میں اُس معیار کے اعتبار سے، جو رفتہ رفتہ برابر بڑھ رہا ہے، اُس کے پاس کافی وسائل ہیں۔''[3]

حقیقی تنظیمیں یا حکومت کے ممبروں کے بیانوں میں سکریٹری آف اسٹیٹ فیری فاؤکر کا بیان پیش کیا جاسکتا ہے جس نے □ 15 اگست 1894 کو ہاؤس آف کامنز میں کہا'' میں جس سوال پر غور کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ کیا اس حکومت نے، جو اس وقت اپنے تمام لوازمات کے ساتھ ہندوستان میں پائی جاتی ہے، ہندوستان کے لوگوں کی عام خوشحالی میں اضافہ کیا یا نہیں اور یہ کہ برطانوی تاج کے ایک صوبے کی حیثیت سے ہندوستان پہلے سے بہتر ہے یا بدتر۔ یہ ہے اصل جانچ''۔ اس سوال کا جواب اس نے یہ دیا'' وہاں بہت افلاس پایا جاتا ہے لیکن میرا کہنا یہ ہے کہ برطانوی حکومت میں وہ افلاس بڑھنے کے بجائے کم ہوا ہے۔''[4] اس نے مزید کہا'' لیکن ہندوستان کے افلاس کو برطانوی حکومت کی دین کہنے کا جہاں تک تعلق ہے واقعات برعکس صورت پیش کرتے ہیں۔''[5]

---

[1] اسٹریچی۔ جے، ہندوستان، صفحہ 365

[2] حکومت ہندوستان کی روداد 19 / اکتوبر 1888

[3] بیان جس میں 92-1891 اور اُس سے پہلے کے نو برسوں میں ہندوستان کی اخلاقی اور مادی ترقی اور حالات کو ظاہر کیا گیا (1894)، صفحہ 427

[4] ہنسرڈ، چوتھا سلسلہ، جلد XXVIII۔ 1894، صفحات 1135 اور 1139

[5] ایضاً، صفحہ 1139

(ب) ہندوستانیوں کا جوابی حملہ

ہندوستان کے برطانوی حکمراں اپنے کارناموں سے بظاہر مطمئن تھے اور جو لوگ حکومت کی خامیوں اور برطانوی حکومت کے معاشی نتائج کی طرف اشارہ کرتے تھے اور سامراج کے چہرے کے دوسرے پہلو کو بے نقاب کرتے تھے انھیں وہ ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔

بدیسی حکومت کی خرابیوں کو پوری طرح سمجھنے میں ہندوستان کے دانش وروں کو وقت لگا۔ بڑی مدت تک اٹھارہویں صدی کی خانہ جنگیوں، بدنظمی اور طوائف الملوکی کی یادیں انھیں ستاتی رہیں اور انھیں جو بھی نقصان ہوئے اُن کے مقابلے میں امن وامان اور باضابطہ حکومت کے قیام کے فوائد انھیں زیادہ معلوم ہوتے لیکن حکومت کی منفی پولیسی کی طرح کے کام چاہے کتنا ہی مہارت اور قابلیت کے ساتھ سرانجام کیوں نہ دیے جائیں وہ ہمیشہ کے لیے محکوموں کو مطمئن نہیں کر سکتے ہیں۔ ان کی خودداری کا تقاضہ ہوتا ہے کہ انھیں بے جان چیزیں نہ سمجھا جائے جن کی خواہشات، توقعات اور تصورات کوئی اہمیت نہیں رکھتے ہیں اور حکومت کے فیصلوں کے تعین میں کوئی رول ادا نہیں کر سکتے ہیں۔ لیکن جب صرف اتنا ہی نہیں کیا جاتا ہو کہ اُن کی خواہش کو پوری طرح نظر انداز کیا جائے بلکہ اُن کے مادی مفادات قربان کئے جائیں اور ان کے عزائم کا خون کیا جائے تو اس حالت میں بے چینی اور بے اطمینانی کا پیدا ہونا اور اچھے انتظامات کے فوائد کے تعلق سے جذبہ احسان مندی کا ختم ہو جانا ضروری ہوتا ہے۔

1857 کی بغاوت کے فوراً بعد یہ خیال جڑیں پکڑنے لگا کہ اس کے باوجود کہ وہ ماضی کے مطلق العنان حکومتوں سے بہتر ہے اور ہر حال میں اٹھارہویں صدی اور اُنیسویں صدی کے اوائل کی بدنظمی کے مقابلے میں زیادہ قابل قبول ہے پھر بھی برطانوی حکومت لوگوں کی ضرورتیں پوری کرنے میں ناکام رہی ہے۔ چنانچہ برطانوی حکومت کے فوائد کو تسلیم کرنے، برطانیہ کے ساتھ تعلقات برقرار رکھنے کی خواہش کی تصدیق اور برطانوی تاج کے ساتھ وفاداری کے اعلان کے باوجود ہندوستان کے رہنماؤں کو ضروری معلوم ہوا کہ شکایتوں کی طرف حکومت کو توجہ دلائی جائے۔ انھیں امید تھی کہ لبرل ذہن رکھنے والے حکمرانوں کو جوں ہی اُن کا علم ہوگا وہ انھیں دور کر دیں گے۔ انھیں بالکل یقین تھا کہ برطانوی حکومت مفید ہے لیکن اُس میں چند سیاسی اور معاشی

خامیاں ہیں۔ سیاست کی حد تک دو اہم خامیاں تھیں، حکومت کی کونسلوں میں عوامی آواز کی عدم موجودگی اور اعلیٰ عہدوں پر ہندوستانیوں کا تقرر نہ کیا جانا معاشی میدان میں بنیادی شکایت تھی ہندوستان کا افلاس جو بہت کم قومی اور انفرادی آمدنیوں سے، قحطوں سے، کسانوں کے قرضے سے، زندگی کی کم مدت سے اور زیادہ شرح اموات وغیرہ سے ظاہر ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ عام طور سے سمجھا جاتا تھا کہ افلاس کی ایک اہم وجہ تھی ہندوستان سے دولت کا نکاس۔

(ج) دادا بھائی نوروجی کی تنقید

حکومت کی معاشی پالیسیوں کے باجرأت اور نڈر ناقد تھے دادا بھائی نوروجی۔ 1825 میں وہ پارسی مذہبی رہنماؤں کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے تھے اور بمبئی کے الفسٹن انسٹی ٹیوٹ میں تعلیم پائی تھی۔ 1845 میں تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد وہ دس سال تک ایک اُستاد کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ 1855 میں وہ تجارت کے پیشے میں داخل ہوئے اور لندن کی کاما اینڈ کو کے معاملات کی دیکھ بھال کرنے کے لیے انگلستان گئے۔ 1874 میں وہ بروداکے مہاراجہ کے دیوان ہو گئے لیکن برطانوی ریزیڈنٹ کے ساتھ اختلاف کی بنا پر اُنھیں اس عہدے سے استعفیٰ دینا پڑا۔ وہ انگلستان واپس چلے گئے اور بقیہ زندگی خدمت خلق میں گذاری۔

دادا بھائی نوروجی نے لندن میں 1867 میں ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کے جلسے میں ایک مضمون پڑھا تھا جس کا عنوان تھا'' ہندوستان کے تعلق سے انگلستان کے فرائض ''اس میں اُنھوں نے یہ سوال کیا تھا کہ '' ہندوستان میں برطانوی حکومت کیا ہندوستان اور انگلستان کے لیے مفید ہے۔ ''اور اُس کے جواب میں کہا تھا'' لیکن اب (برطانوی حکومت میں) (چونکہ ملک کا خون مسلسل چوسا جا رہا ہے اس لیے اُس کی طاقت کا کم ہونا ضروری ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو مستقل سدھار کئے جا چکے ہیں یا مساوی وسائل میں آئندہ کئے جائیں گے وہ اُس کو اتنا صحت مند بنا دیں جیسے وہ پہلے تھا۔ ''[1]

ان جملوں میں انھوں نے ہندوستان کے افلاس، دولت کے نکاس اور اُن کے باہمی قریبی رشتوں کے مسائل پیش کئے۔ اپنی پوری زندگی وہ اُن مسائل کی جزئیات پر غور کرتے ہیں اور

---

[1] دادا بھائی نوروجی، مضامین، تقاریر وغیرہ جس کی تدوین سی۔ ایل پارکھ نے کی، صفحہ 31

جوں جوں اُن کا مطالعہ گہرا ہوتا گیا اور بدیسی حکمران کا سنگین جرم کھلتا گیا ویسے ویسے ہندوستان کے فوائد کے لیے جذبہ احسان مندی ختم ہوتا گیا۔ 1873 میں انھوں نے پارلیمنٹ کی اُس سلیکٹ کمیٹی کے سامنے شہادت دی جسے ہندوستانی مالیات کی صورت حال کے متعلق تفتیش کرنے کے لیے تقرر کیا گیا تھا۔ اور 1876 میں اُنھوں نے '' ہندوستان کے افلاس '' پر اپنے مشہور پرچے کا مُسودہ ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کی بمبئی شاخ کے سامنے رکھا جس میں اُنھوں نے ہندوستان کی بدقسمتی کی ذمہ داری نکاس پر ڈالی تھی۔ اُنھوں نے کہا تھا۔

'' ہندوستان کے مفادات کو نظرانداز کرنے اور انگلستان کو فائدہ پہنچانے کی غرض سے اُنھیں تابع بنانے کی حکومت کی اس غیر فطری پالیسی کی بنا پر پوری حکومت غلط، غیر فطری اور خودکشی کے راستے پر چل رہی ہے۔ ''[1]

ہندوستان میں برطانوی حکومت کے معاشی پہلو کے متعلق اُن کی رائے بہت خراب تھی۔ اُنھوں نے کہا تھا۔

'' افسانہ یہ ہے کہ ہندوستان میں جان و مال محفوظ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ ''

جان و مال کی حفاظت صرف ایک نئی کریا ایک طریقے سے ہے یعنی منفی لوگ ایک دوسرے کے تشدد یا ہندوستان مطلق العنان حکمرانوں کے تشدد سے محفوظ ہے۔ اس حد تک واقعی جان و مال کی حفاظت ہے۔ اور اس کے لیے ہندوستان اپنے جذبہ احسان مندی سے کبھی انکار نہیں کرتا ہے۔ لیکن انگلستان کی اپنی گرفت سے مال کی حفاظت بالکل نہیں ہے اور اُس کے نتیجے میں جان کی حفاظت بھی نہیں ہے۔ ہندوستان کا مال محفوظ نہیں ہے۔ جو چیز محفوظ اور بہت زیادہ محفوظ ہے وہ یہ ہے کہ انگلستان بالکل محفوظ ہے اور پوری حفاظت کے ساتھ ہندوستان میں رہ کر اور ہندوستان سے باہر لے جا کر موجودہ شرح کی رو سے تقریباً 3,00,00,000 یا 4,00,00,000 پاؤنڈ سالانہ ہضم کر جاتا ہے۔

'' چنانچہ حقیقت یہ ہے کہ جیسی انگریزی حکومت ہے (ویسی نہیں جیسی وہ ہوسکتی ہے یا اُسے ہونا چاہیے (اُس کی پالیسی ایک مسلسل فزوں تر اور روز افزوں بدیسی حملہ ہے جو رفتہ رفتہ سہی مگر

---

[1] دادا بھائی نوروجی، افلاس، اور ہندوستان کی غیر برطانوی حکومت (1901) صفحہ 125

ملک کو بالکل تباہ کر رہا ہے''۔

''لیکن ہندوستان میں برطانوی حکومت کی موجودہ صورت حال نے ایک اور قابل افسوس خرابی کو جنم دیا ہے جس سے پچھلے بدترین بدیسی حملے پاک تھے وہ یہ کہ 3,00,00,000 یا 4,00,00,000 پاؤنڈ سالانہ کی حد تک ملک کی مادی دولت کے ساتھ یہاں کا اعلیٰ'' فہم " بھی باہر جا رہا ہے''۔

''اس لیے میں یہ عرض کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ ہندوستان میں جان و مال کی حفاظت نہیں ہے اور اس کے علاوہ'' علم ''اور'' فہم '' کی حفاظت بھی نہیں ہے۔ کروڑ ہندوستانیوں کے لیے زندگی کے معنی ہیں'' آدھے پیٹ روٹی کھانا ''یا فاقے کرنا یا قحط اور بیماریاں۔''[1]

دولت کے نکاس کے بارے میں اپنی دلیل کی حمایت میں اُنھوں نے سیلسبری کا قول پیش کیا۔ سلیسبری کے اعتراف کے مطابق'' ہندوستان کے معاملے میں نقصان (معیشت کو) بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں سے اتنی آمدنی کسی راست معاوضے کے بغیر برآمد کی جاتی ہے۔ چونکہ ہندوستان کی فصد لینا ضروری ہے اس لیے نشتر جسم کے اُن حصوں میں لگایا جانا چاہیے جہاں خون جمع ہے یا کم از کم کافی ہے۔ اور اُن حصوں میں نہیں (کسانوں میں (جو خون کی کمی کی بنا پر خود ہی کمزور ہیں۔''[2]

جس زمانے میں یعنی کمیشن کا اجلاس ہو رہا تھا اور گوپال کرشن گوکھلے، دلشاد ادجی واچا، سریندر بنرجی اور سبرامنیا ائیر شہادت دینے کے لیے انگلستان گئے تھے دادا بھائی نوروجی نے اُس موقعے کو پورے انگلستان میں'' پلیٹ فارم کی جدوجہد کرنے کے لیے استعمال کیا تا کہ انگلستان کے عام لوگوں کے سامنے ہندوستان کی شکایتیں رکھی جا سکیں۔ اس جدوجہد کے اختتام پر لندن انڈیا سوسائٹی کی سرپرستی میں 28 دسمبر 1897 کو جو تجویز منظور کی گئی تھی اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ دادا بھائی نے چالیس سال تک حکمرانوں کو غلط اور غیر برطانوی راستے سے ہٹانے کی جو

---

[1] دادا بھائی نوروجی، مضامین، تقریریں، خطبے وغیرہ جن کی سی۔ ایل۔ پارکھ نے تدوین کی، صفحات 485-484

[2] روداد، مورخہ 62/اپریل 1875

ناکام کوشش کی تھی اُس نے اُنھیں کس حد تک مایوس کر دیا تھا۔

تجویز ذیل میں درج کی جا رہی ہے۔

''یہ کہ ہندوستان پچھلی ڈیڑھ صدی سے جن شدید دکھوں کا سامنا کر رہا ہے اور جن میں ادھر حال میں افسوسناک قحطوں اور طاعون کا، جو روز افزوں غربت و افلاس کے نتائج میں اور احمقانہ سرحدی جنگ کا اضافہ ہو گیا ہے جس میں پورے پورے گاؤں کو تباہ کرنے کی وحشیانہ حرکتیں کی گئیں۔ جو کسی بھی قوم اور قومیت کے ساتھ برطانوی تہذیب کے لیے باعث شرم ہونی چاہیے اس کے علاوہ بغاوت کے لیے احمقانہ مقدمات چلائے جا رہے ہیں۔ تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی بے وفائی کے متعلق جاہلانہ چیخ و پکار کی جا رہی ہے۔ ہندوستانیوں کی اخباروں کی آزادی کم کی جا رہی ہے اور حکومت میں مطلق العنانیت سے کام لیا جا رہا ہے جس کا عام معیار کارکردگی گرتا جا رہا ہے۔ ان کی اور دوسری چھوٹی چھوٹی خرابیوں کی وجہ سے ہے حکومت کا غلط اور غیر برطانوی نظام جس کی وجہ سے مسلسل ملک کا خون چوسا جا رہا ہے اور جس کو ایسے سیاسی مکروفریب اور مسلسل بہانوں سے برقرار رکھا جا رہا ہے۔ جو برطانوی وقار اور نام کے منافی ہیں اور برطانیہ کے لوگوں اور بادشاہ کی خواہش کے خلاف ہیں یہ کہ اگر موجودہ غلط اور غیر برطانوی نظام حکومت کو سدھار کے صحیح اور حقیقی برطانوی نظام میں تبدیل نہیں کیا گیا تو اُس کا لازمی نتیجہ ہوگا ہندوستان کی تباہی اور برطانوی حکومت کا زوال۔''

بار بار کی ناکامیوں اور ہندوستان میں بڑھتی ہوئی کشیدگی نے دادا بھائی کو 1898 میں اس نتیجے پر پہنچا دیا'' حکومت فیض رسانی کے قریب کے نقاب اپنے چہرے سے ہٹا رہی ہے اور دوسری طرف لوگ یہ محسوس کرنے لگے ہیں۔ چنانچہ یہ ایک فطری امر تھا کہ وہ اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں حکومت کے پرامن ارتقا کا بدل تھا دھاکا۔ اُنھوں نے لندن انڈیا ایسوسی ایشن کے ایک اجتماع میں یکم جون 1904 کو کہا تھا۔

''موجودہ[1] بے عزتی، ذلت اور تباہی کے نظام کا یعنی اُس نظام کا محض ایک علاج ہے جس کا اگر پرامن ارتقا کے ذریعے تدارک نہ کیا گیا تو وہ سلطنت کو توڑ کے رکھ دے گا۔ وہ علاج ہے

---

[1] آر۔ پی۔ سالی نے اس کا حوالہ ''دادا بھائی نوروجی، ہندوستان کے شاندار بزرگ'' میں دیا ہے، صفحہ 404

برطانوی اقتدار اعلیٰ کے تحت حکومت خود اختیاری کا قیام جب یہ بنیادی غلطی دور ہوجائے گی تو موجودہ نظام کی تمام دوسری خرابیاں اور خامیاں خود بخود دور ہوجائیں گی۔"[1]

کانگریس کے 1906 کے کلکتہ اجلاس میں، جب کرزن کی اُن پالیسیوں کی بنا پر جذبات بھڑکے ہوئے تھے جن کا نتیجہ بنگال کی تقسیم کی صورت میں سامنے آیا، اُنھوں نے سوراج کا مطالبہ کیا اور ہندوستان کے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ مل کر کام کریں اُنہوں نے کہا:

"متحد ہوجایئے، ثابت قدمی کے ساتھ کوشش کیجئے اور خود اختیاری حاصل کرلیجئے تاکہ اُن لاکھوں کروڑوں انسانوں کو بچایا جاسکے جو غربت، قحط اور طاعون کا شکار ہورہے ہیں اور جنھیں پیٹ بھر روٹی بھی نصیب نہیں ہوتی ہے اور ہندوستان ایک دفعہ پھر دنیا کی متمدن قوموں میں اپنی قدیم باعزت حیثیت حاصل کرے"۔[2]

دادا بھائی نوروجی کی عملی زندگی اُنیسویں صدی کے نصف آخر پر پھیلی ہوئی تھی ہندوستان میں سامراجی حکومت کے تعلق سے اُن کے خیالات وجذبات میں جو تبدیلی رونما ہوئی اُن میں اُس تبدیلی کے انعکاسات دیکھے جاسکتے تھے جو رائے عامہ میں پیدا ہورہی تھی۔ ابتدا میں برطانوی حکومت کے فوائد اور ہندوستان کو تباہی سے بچانے کے اُس کے خداداد مقصد پر زور دیا جاتا تھا۔ لیکن جوں جوں زمانہ گزرتا گیا احساسات میں تبدیلی آتی گئی اور صدی کے آخر تک حکومت کے موجودہ نظام کو ختم کرنے اور حکومت خود اختیاری قائم کرنے کا خیال لوگوں کے ذہنوں میں جاگزیں ہوچکا تھا۔

شاندار بزرگ دادا بھائی نوروجی کی شخصیت اُس دور کے سیاسی اور معاشی دونوں میدانوں پر چھائی ہوئی تھی عام طور سے لوگ اُن کی قیادت کو تسلیم کرتے تھے جہاں تک برطانوی حکومت کی خدمت کا تعلق تھا لوگ عام طور سے اُن سے اتفاق کرتے تھے یعنی عام لوگوں کی کمر توڑنے کی ذمہ داری۔

دولت کے نکاس کے غیر معاشی نتائج اور اُس کے حجم کے متعلق ہندوستان کے ماہرین

---

[1] ایضاً صفحہ 428

[2] انڈین نیشنل کانگریس (تانیسن، 1917) صفحہ 857

معاشیات نے اعداد و شمار کے ساتھ بار بار ذکر کیا (دیکھئے باب 7) لیکن اُس کے معاشی مضمرات کے علاوہ نکاس کے سوال پر سیاسی اور اخلاقی بحث بھی شروع ہوگئی تھی اور ہندوستانیوں کا جواب مندرجہ ذیل پر مشتمل تھا۔ برطانوی سلطنت کے جواز اور مقاصد کا گہرا تجزیہ سرکاری قرضوں کی ضرورت، بدیسی سرمائے کی ہندوستان میں اصل کاری کی ہمت افزائی جس سے ہندوستان کی دولت میں اضافہ ہونے کے بجائے درآمدات کی زیادتی کے کبھی نہ ختم ہونے والی جنگوں اور مہموں کی بنا پر بڑھتا ہوا غیر منصفانہ قرض اور بڑی بڑی تنخواہیں پانے والے سول ملازمین اور ضرورت سے زیادہ فوج پر کیا جانے والا صرف بیجا۔ ہندوستانیوں کے جواب میں انگریزوں کے اس دعوے کو بھی غلط ٹھہرایا جاتا تھا کہ اُنھوں نے ہندوستان کی فلاح و بہبود کے لیے برطانوی مہارت، دیانت داری اور علم مہیا کیا۔ ویلبی کمیشن کے سامنے شہادت دیتے ہوئے گوکھلے نے اس دعوے سے انکار کیا۔ اُنھوں نے کہا۔

''لیکن واحد خرابی محض ضرورت سے زیادہ قیمتی بدیسی ایجنسی نہیں ہے ایک اخلاقی برائی بھی ہے جو اُس سے بھی بڑی ہے۔ موجودہ نظام میں ہندوستانیوں کی نسل کا قد گھٹانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ہمیں اپنی زندگی کے دن احساس کمتری کے ماحول میں گزارنے پڑتے ہیں اور ہم میں جو سب سے زیادہ قدآور ہے اُسے بھی جھکنا پڑتا ہے۔ تاکہ موجودہ نظام کی ضرورتیں پوری کی جاسکیں۔ اگر اجازت ہو تو میں کہوں کہ آگے بڑھنے کا وہ جذبہ ہم سے چھین لیا گیا ہے جو ایشین ہیرو کے ہر بچے میں ہوتا ہے۔ جو سمجھتا ہے کہ ایک دن وہ گلیڈسٹن، نیلسن یا ولنگٹن بن سکے گا اور جس کی بنا پر وہ اپنی سی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ موجودہ نظام کے تحت ہمارے لوگوں کو اس کا موقع نہیں دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے فطری قدوقامت تک پہنچ سکیں۔ اخلاقی برتری کا وہ احساس ہم میں نہیں ہے جو خود پر حکومت کرنے والی ہر قوم میں ہوتا ہے۔ استعمال نہ کئے جانے کی وجہ سے ہماری انتظامی اور فوجی اہلیت ختم ہوتی جارہی ہے اور وہ وقت آرہا ہے جب ہم اپنے ہی ملک میں دوسروں کے خدمت گار بن کے رہیں گے۔''[1]

غربت اور دولت کے نکاس کے متعلق بحث و مباحثہ، جسے دادا بھائی نوروجی نے شرع کیا

[1] گوکھلے، ج۔ کے، تقریریں، ناشر۔ اے۔ رائسن، دوسرا اڈیشن مدراس، 1916، صفحہ 1188

تھا، زیادہ سے زیادہ لوگوں میں اخباروں اور تقریروں کے ذریعے، کتابچوں کے ذریعہ، رسالوں اور کتابوں کے ذریعہ اور بہت سے جلسوں، کانفرنسوں اور کانگریس میں جاری رہا یہاں تک کہ اس پر پورے ہندوستان کو یقین آ گیا یعنی وہ ایسا وسیع تصور بن گیا جس نے قومی شعور کو جنم دیا۔ سیاسی تحریک کا سب سے بڑا محرک تھا بڑے پیمانے پر پھیلی ہوئی غربت اور اس بات پر اتفاق رائے کہ وہ بدیسی حکومت کا نتیجہ تھی۔

لیکن برطانوی حکمرانوں نے اس تحریک کو نظر انداز کیا اور حقارت کی نظر سے دیکھا۔ لارڈ کرزن نے 1892 میں ہاؤس آف کامنز میں کہا ''ہندوستان میں کانگریس پارٹی کے منصوبوں اور پالیسی کا کوئی اثر اس غیر متشکل تلچھٹ (عام لوگوں) پر نہیں پڑے گا ... ''جہاں تک ہندوستان کے لوگوں سے اس کے رشتے کا تعلق تھا'' کانگریس نیابت کے جن حلقوں کی نمائندگی کرتی ہے اُنھیں ہندوستان کی مجموعی آبادی کی بہت چھوٹی سی اقلیت کے علاوہ کچھ نہیں کہا جاسکتا۔''[1] اعداد وشمار کی دلیل نے حکمرانوں کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا تھا۔

کرزن سے اتفاق کرنے والے سرکاری اور غیر سرکاری لوگوں نے اُن نسلی اور فرقہ وارانہ اختلافات کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا جو ہندوستان میں پائے جاتے تھے۔ اس کی جزوی وجہ تو یہ تھی کہ ان کے تجربے مغربی یورپ کے بہت چھوٹے چھوٹے سماجوں تک محدود تھے جہاں اختلافات کم تھے اور جزوی وجہ یہ تھی کہ وہ سامراجی موقف کی اخلاقی راست بازی کا خود کو یقین دلانا چاہتے تھے اور تکلیف دہ مطالبات کرنے سے محکوموں کو باز رکھنا چاہتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ تاریخ میں کسی ملک نے سماجی عناصر کے مکمل اتحاد سے ابتدا نہیں کی ہے نہ اس قسم کا اتحاد کہیں پایا جاتا ہے۔ یونائٹڈ کنگ ڈم بھی مختلف نسلی اور مذہبی عناصر کے ملنے سے وجود میں آئی تھی جیسے انگلز، سیکسنس، جیوٹس، ڈینس، نارمنس وغیرہ اور آج بھی اُس میں مختلف گروہ پائے جاتے یں جیسے انگلش، اسکاٹ، وش، پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک، اُنیسویں صدی کے وسط تک جرمنی اور اٹلی محض جغرافیائی نام تھے۔ بیسویں صدی میں روس ایک قوم بنتا جا رہا تھا۔

عہد وسطیٰ سے عہد جدید تک عالمی تبدیلی کا رجحان ہے فیوڈل سوسائٹی سے، جس کے سماجی

---

[1] بنرجی، اے۔ سی، ہندوستان کی دستوری دستاویزات، جلد دوم (1948)، صفحہ 119

رشتے قبائلی اور فرقہ واری مذہب پر جس کے خصوصی اعتقادات اور رسوم ہوتی تھیں، ایسے سماج کی طرف عبور کرنا جس کی بنیاد پڑوس سے مادی مفادات میں باہمی تعاون اور قومیت پر قائم ہوتی ہے۔

ریاست نے اس عمل کو بہت بڑھایا ہے، فرانس کو متحد اُس کے بادشاہوں نے کیا جنھوں نے شہروں اور کمیون کے ساتھ مل کر فیوڈل لارڈوں کی حکومت کا تختہ الٹ دیا اور فرانسیسی قوم کو استحکام عطا کیا۔ ہونہزوسرنس نے بہت سی دعویٰ دار ریاستوں کو ملا کر جدید جرمنی کی تعمیر کی۔ اٹلی کا اتحاد ہیڈ فونیر بادشاہوں کا زمانہ تھا۔ یہی عہد کے بعد ریاست کی کوششوں کے نتیجے میں جاپان ایک قوم بن گیا۔ پہلی عالمگیر جنگ کے بعد اتاترک نے جس ریاست کی تنظیم کی تھی اس کی رہنمائی میں ترکی نے قوم پرستی اور جدیدیت کی راہ پر چلنا شروع کر دیا۔

بدقسمتی سے ہندوستان میں برطانوی حکومت کا رول اس کے برعکس تھا س۔ ماجی یکجہتی کو فروغ دینے کے بجائے اس نے اپنا اثر اختلاف کو بڑھانے کے لیے استعمال کیا۔ سچ ہے کہ برطانوی حکومت کے بالواسطہ اثرات اور برطانوی انتظامیہ کے غیر متوقع نتائج ملک کی مادی ترقی اور اتحاد کی صورت میں سامنے آئے اور انھوں نے اُسے کسی حد تک جدید بھی بنا دیا لیکن حکومت کی بالمقصد پالیسی کی بنیاد '' پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو '' کا اصول تھا۔

چنانچہ ان منفی حالات کے تحت بدیسی حکومت نے جو کچھ کیا اس نے اس نئے جذبے کے ساتھ مل کر جو ہندوستان میں پیدا ہو چکا تھا ہندوستان کی قومیت کو وجود میں لانے کا ناگزیر عمل سرانجام دیا۔ تاریخی تسلسل اور عجیب وغریب تہذیبی شخصیت جس چیز کی ضرورت تھی وہ یہ تھی کہ ریاست متوسط طبقے کے دانش وروں کے قومی شعور کو تقویت پہنچائے اور وسطیٰ ذہن رکھنے والے گروہوں کے برکھا روگ کا علاج کرے۔ لیکن ان وسطیٰ اور قدیم سماجی طاقتوں پر قابو پانا بہت دشوار تھا جن کی مدد وہ حکومت کر رہی تھی اس لیے اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ سیاسی شعور رکھنے والے طبقوں کے مبہم عزم اور انڈین نیشنل کانگریس کی کوششوں کے باوجود قومی تحریک میں پھوٹ پڑ گئی۔

XI۔ مسلم رَدِّعمل[1]

قومی تحریک سے حکام ناراض ہوگئے جنھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے کچھ حلقوں میں خوف و ہراس پھیلا دیا۔ سرسید احمد خاں نے ان حلقوں کی قیادت کی اور مسلمانوں سے کہا کہ وہ کانگریس سے علیحدہ رہیں اور اُتر پردیش کے کچھ ہندو زمینداروں کے ساتھ مل کر انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے نام سے ایک اور تنظیم بنائی۔ لیکن یہ تنظیم زیادہ مدت تک نہ چل سکی اور اس کے بعد سرسید اور علی گڑھ پارٹی نے مسلمانوں کو برطانوی حکومت کی حمایت میں مجتمع کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس میں بھی انھیں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی۔

پرانے مکتب خیال کے بہت سے رہنماؤں یعنی علما نے سرسید کی مخالفت کی اور ہندوستان کے دوسرے حصوں کے کئی تعلیم یافتہ اور روشن خیال مسلمانوں نے کانگریس کی حمایت کی۔ بدقسمتی سے 1890 کے بعد فرقہ وارانہ صورت حال خراب ہوگئی اور بہت سے شہروں میں فساد ہوئے۔ اس سے نوکر شاہی کو اس کا موقع مل گیا کہ وہ کانگریس پر طنز کریں اور اس کے اس دعوے پر اعتراض کریں کہ ہندوستان ایک ہم قوم ملک ہے جسے نمائندہ ادارے ملنا چاہئے۔ لندن اسٹینڈرڈ نے لکھا'' ہمارا خیال ہے کہ یہ بات خطرناک حدتک بڑھ چکی ہے کہ ہندوستانیوں کا ذمہ دار عہدوں پر تقرر کیا جائے اور لوگوں کا انتخاب اس لیے کیا جائے کہ انھوں نے کچھ تعلیمی امتحان پاس کر لیے ہیں ... ہم ہندوستان پر آج بھی تلوار سے حکومت کرتے ہیں اور آئندہ بھی کریں گے۔ ہم اس ملک میں بلکہ یوں کہیے کہ بہت سے ایسے ملکوں کے گروپ میں امن قائم رکھتے ہیں جو ہمیشہ لڑ سکتے ہیں اور باہمی جنگ وجدل کر سکتے ہیں۔''[2]

ہندوستانیوں کا خیال تھا کہ یہ فساد پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو کی پالیسی کے نتیجے ہیں جس پر وہ برطانوی حکام عمل کرتے ہیں جو کانگریس کے مطالبات سے ناراض ہیں اور قومی تحریک میں

---

[1] مسلمانوں کی تحریک کے لیے دیکھئے VIII مسلم فکر کے رجحانات

[2] اسٹیٹس مین نے 9/ستمبر 1893 کی اشاعت میں اقتباس پیش کیا

رخنے ڈالنے کے لیے مسلمانوں کو اُکساتے رہتے ہیں، امرت بازار پتریکا نے لکھا'' لوگوں کو یہ یقین دلایا گیا تھا کہ حکومت مسلمانوں کی حمایت حاصل کرنا چاہتی ہے ... مسلمانوں کی بالواسطہ انداز سے ہمت افزائی کی گئی اور ان کی پیٹھ ٹھونکی گئی۔''[1]

کانگریس نے فرقہ واریت کے اثر کو زائل کرنے کی کوشش کی اور اپنے صدر فیروز شاہ مہتا کے ذریعہ اعلان کیا'' کانگریس کے ممبران انسانوں کی طرح یکجا ہوتے ہیں جن کی بنیاد مشترکہ قومیت ہے اور جو ایک ملک کے شہری ہیں''[2] بدالدین طیب جی نے اپنے خطبہ صدارت میں کہا (1887 '' کم از کم یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ مسلمانوں کو دوسری نسلوں اور دوسرے مذاہب سے تعلق رکھنے والے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ شانے سے شانہ ملا کر سب کی بھلائی کے لیے کیوں نہیں کام کرنا چاہیے۔''

XII۔شدت پسند پارٹی کی ابتدا

حکام کی ڈھٹائی اور مخالفت کے باوجود سیاسی تحریک طاقت پکڑتی رہی اور بہت وسیع ہوگئی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے اجلاس سال بہ سال ہوتے رہے جن میں حکومت کی بنیادی خرابیوں اور وقتی غلطیوں کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرائی جاتی رہی۔صوبوں میں سیاسی کانفرنسیں کی جاتی تھیں جن میں کانگریس کی تجاویز کو دہرایا جاتا تھا۔ ہندوستان کے سبھی حصوں میں سیاسی انجمنوں کے جلسے ہوتے تھے جن میں تنقید کی جاتی تھی۔انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کے اخبارات قومی رہنماؤں کے خیالات کا پرچار کرتے تھے۔سیاسی تحریریں چھاپے خانوں سے نکلتی اور ملک میں پھیلتی رہتی تھیں اور لوگوں میں سیاسی شعور پیدا کرنے کے لیے بہت سے سیاسی کارکن چھوٹے اور بڑے جلسوں میں لوگوں سے خطاب کیا کرتے تھے۔

اس قسم کی بے چینی ملک میں پائی جاتی تھی جب حکومت کے رویے سے مایوس ہوکر ہیوم نے قوم سے اپیل کرنے کا فیصلہ کیا تاکہ اس جنگ میں کوبڈن اور اس کے شریف رفقا کی طرح

---

[1] امرت بازار پتریکا، 10 ستمبر 1895

[2] خطبہ صدارت، 1890 دی انڈین نیشنل کانگریس (تابٹسن 1917) صفحہ 27

انصاف، اپنی آزادی اور حقوق کے لیے لڑیں گے ہر وہ ہندوستانی جو اس مادرِ وطن کی مقدس سرزمین پر سانس لیتا ہے ہمارا ساتھی، ہمارا مددگار، ہمارا حامی اور ضرورت پڑنے پر ہمارا سپاہی بن جائے۔''[1] یہ اس امر کا تہیہ تھا کہ کانگریس کے طریقوں کے حدود سے باہر آکر سیاسی تحریک کو ملک کے طول و عرض میں پھیلایا جائے۔ تمام طبقوں کے لوگوں سے چندہ کرنے کے لیے جلسے کئے گئے، شہروں اور ضلعوں میں جلسوں سے خطاب کرنے کے لیے مقررین بھیجے گئے اور تحریریں تقسیم کی گئیں۔ دو پمفلٹ لوگوں کی توجہ کے مرکز بن گئے اور حکومت کے حامیوں میں انھوں نے خوف و ہراس پیدا کر دیا وہ تھے کانگریس کا سوال و جواب نامہ اور کمبیت پور کے مولوی فریدالدین اور رام بخش کی گفتگو جس میں زمینداری اور مطلق العنان حکومت کی خرابیوں کا ذکر کیا گیا تھا اور یہ بتایا گیا تھا کہ ان خرابیوں کو دور کرنے کا طریقہ ہے نمائندہ حکومت کا قیام۔

1881 میں ہندوستان کے باہر اور خاص طور سے انگلستان میں پروپگینڈا کرنے کی ضرورت کو تسلیم کیا گیا۔ انڈین نیشنل کانگریس کی ایک برطانوی کمیٹی قائم کی گئی جس کا صدر تھا ولیم وڈر برن، سکریٹری تھا ولیم ڈگبی اور دادا بھائی نوروجی اور کچھ دوسرے انگریز اُس کے ممبر تھے۔ کانگریس کے خیالات کا پرچار کرنے کے لیے انڈیا نام کا ایک رسالہ شروع کیا گیا۔

ہیوم نے جو کام شروع کیا تھا اُس سے تلک اور اروبندو گھوش کی طرح کے قومی رہنماؤں نے فائدہ اُٹھایا۔ وہ کانگریس کے پروقار مگر ضرورت سے زیادہ سنجیدہ طرزِ عمل سے غیر مطمئن تھے جس کی قیادت پیشہ ورانہ طبقوں کے اعلیٰ تعلیم یافتہ اور کامیاب ممبروں کے ہاتھوں میں تھی۔ اُنھیں کانگریس کے اختلاف اور درخواست کرنے کے طریقے سے اختلاف تھا اور وہ زیادہ فعال سیاسی تحریک کے حامی تھے۔ اروبندو گھوش نے 1893 میں اندر پرکاش میں مضامین کا ایک سلسلہ لکھا جن کا عنوان تھا'' پروانوں کی جگہ نئے چراغ ''ان مضامین میں انھوں نے کانگریس کے ان طریقوں کے نقائص کو بے نقاب کیا جن پر وہ ابھی تک عمل کر رہی تھی، انھوں نے لیجسلیٹیو کونسلوں کی توسیع اور بہ یک وقت امتحانوں کو'' شعبدے بازی ''سے تعبیر کیا اور'' برطانوی حکومت کی برکتوں اور اُس ناقابل فہم مشیت کا مذاق اُڑایا جس نے ہمیں انگلستان کی فیض رسانی آغوش مادر

---

[1] وڈر برن، ڈبلیو، اے۔ او۔ ہیوم، صفحہ 63۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہیوم نے 1888 میں یہ اپیل کی تھی۔

تک پہنچادیا۔ ''اور اس خطرے سے آگاہ کیا'' آج بھی برطانوی جیریکو کی دیواریں صحیح سلامت ہیں اور غربت وافلاس کے سیاہ سائے بڑھتے اور دور تک پھیلتے جارہے ہیں۔''[1]

اروبندو کانگریس سے بہت غیر مطمئن تھے اس کے متعلق اُن کا خیال تھا کہ '' متوسط درجہ کا ادارہ جو اپنے عوامی عمل میں مطلب پرست اور زمانہ ساز ہے اور بے لوث وطن پرستی کے کھوکھلے دعوے کرتا ہے... سنجیدہ سوالوں سے نبٹنے کے بجائے کھلونوں سے کھیلتا ہے اس نے کبھی ایسی کوشش نہیں کی ایسا عوامی ادارہ بن سکے جسے ہندوستان کے لوگوں نے اختیارات عطا کئے ہوں۔ زیادہ تر لوگوں کو وہ متاثر نہیں کرسکا ہے۔ اس صورت حال میں کلیدی حیثیت پرولسانیت کو حاصل ہے۔ صحیح اور بامعنی پالیسی سے ملک کی پوری آبادی کو بیدار اور منظم کرنا اور اس طرح اس کے حجم اور اہمیت (عام لوگوں کے حجم اور اہمیت (میں بہت زیادہ اضافہ کرنا''،[2] اروبندو کے چیلنج کا جواب بال گنگادھر تلک نے دیا اور اُن دونوں نے مل کر ہندوستانی سیاست کی پرسکون سطح آب میں ہلچل مچادی۔

لینس ڈاؤن کے ہندوستان سے روانہ ہونے سے پہلے نئے حالات کے سائے پڑنے لگے تھے۔ ہندوستان میں بڑی بے چینی پھیلی ہوئی تھی جس میں نئی خطروں اور امیدوں نے اضافہ کردیا۔ شدید قحطوں، طاعون اور فرقہ وارانہ فسادات نے سبھی کو خائف کردیا تھا۔ اُسی کے ساتھ مذہبی احیا پرستی کے جذبات ملک میں ہر طرف پھیل رہے تھے اور ماضی کے متعلق فخر ومباحات کا جذبہ اور اپنی عزت کا احساس بڑھ رہا تھا۔ ویویکانند کے کامیاب دورے نے شاندار مستقبل کی امیدیں جگادیں تھی اور حالات تیزی کے ساتھ اس کی نفی کرتے جارہے تھے کہ مغرب کو مشرق پر فوقیت حاصل ہے۔

ہندوستان کے باہر برطانوی سلطنت کو تین چوتھائی صدی تک عالمی امور میں مسلمہ طور سے قیادت کرنے کے بعد، نئی رقابتوں اور خطروں کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا۔ ریاستہائے متحدہ امریکہ اور جرمنی نے صنعتی ترقی میں انگلستان کو مات دیدی تھی اور دنیا کی تجارت میں بڑا سخت مقابلہ کر

---

[1] مکرجی، ہری داس اور اُما شری اروبند وگھوش کے سیاسی خیالات، صفحات 68-67

[2] ایضاً، صفحات 120-107

رہے تھے۔ جرمنی کے نوجوان اور باحوصلہ بادشاہ قیصر ولیم روم نے پرانے مشیر بسمارک کو برطرف کر کے اختیارات خود سنبھال لیے تھے۔ وہ سمندر پار توسیع کرنے کے دعوے کر رہا تھا جو برطانیہ کے لیے چیونٹی کے مترادف تھے، روس بڑی بے رحمی کے ساتھ بحرالکاہل کے ساحل کی طرف بڑھ رہا تھا جہاں نیا نیا بیدار ہونے والا جاپان سنتری کے فرائض ادا کرتا تھا۔ جاپان کی ترقی نے یورپ کو آگاہ کر دیا تھا کہ ایشیا میں نئی ہوا چلنی شروع ہوگئی ہے۔

ایلگن 1893 میں ہندوستان آیا اور نئے حالات کا سامنا کیا۔ منظر عام پر نئے ہندوستانی رہنما آ چکے تھے جو پرانے رہنماؤں کی جگہ لینے والے تھے۔ اُن میں پیش پیش تھے بال گنگادھر تلک۔ نوجوانی میں انھوں نے تہیہ کر لیا تھا کہ اپنی زندگی ملک کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گے۔ انھوں نے اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ایک اسکول شروع کیا اور دو اخبار شائع کرنا شروع کیے جن میں سے ایک تھا مراہٹا جو انگریزی میں نکلتا تھا اور دوسرا تھا کیسری جو مرہٹی میں شائع ہوا تھا۔ ان کا مقصد تھا عام لوگوں کو تعلیم دینا اور رائے عامہ کو ہموار کرنا۔ حکومت کی کارروائیوں اور پالیسیوں کی بے باک اور نڈر تنقید کی وجہ سے یہ دونوں اخبار بہت جلد مقبول ہو گئے۔ 1890 میں تلک اُس وقت منظر عام پر آئے جب انھوں نے اس بنا پر رضامندی کی عمر کی بل کی مخالفت کی کہ ایک بدیسی حکومت کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ ہندوؤں کے مذہبی اور سماجی معاملات میں مداخلت کرے۔ 1893 میں انھوں نے گئو رکھشا کی تحریک شروع کی اس لیے کہ ان کو شبہ تھا کہ حکومت مسلمانوں کی حمایت اور ہمت افزائی کر رہی ہے۔

اُسی سال انھوں نے قدیم مراٹھی تیوہار گن پتی کو دوبارہ منانا شروع کیا اور تقریروں، گانے والی ٹولیوں اور جلوسوں کی تنظیم کر کے اسے سیاسی رنگ دیا۔ اس تیوہار کے مقاصد ویسے ہی تھے جیسے ہندو میلے کے تھے جسے پہلے بنگال میں راج نرائن بوس اور ان کے دوست شروع کر چکے تھے تاکہ عام لوگوں کو سیاسی ذہن رکھنے والے تعلیم یافتہ طبقوں کے زیر اثر لایا جائے، ان میں قوم پرستی کا جذبہ پیدا کیا جائے اور انھیں ضبط و نظم اور ہمت و جرأت کی تعلیم دی جائے۔

1895 میں انھوں نے بہادری دلآوری کا جذبہ پیدا کرنے اور بدیسی حکومت سے ملک کو آزاد کرانے کی خواہش کو جگانے کے لیے شیواجی کا تیوہار شروع کیا۔

اس میں شک نہیں کہ ان دونوں تیوہاروں نے س عام لوگوں میں بڑا جوش وخروش پیدا کر دیا اور سیاسی تصورات کے پر چار میں مدد دی۔ تلک کے مطابق ان تیوہاروں نے لوگوں میں اتحاد پیدا کرنے کی حد تک وہی رول ادا کیا جو یونان میں الپین اور پائی تھین نے ادا کیا تھا۔ غالباً مہاراشٹر میں جہاں ہندو طور طریقوں کا غلبہ تھا تلک ایسے تہوار کے ذریعے عام لوگوں کو آسانی سے بیدار کر سکے جس کا تعلق اُن کے مذہبی جذبات سے تھا اور دوسرے اُس تیوہار کے ذریعہ عام لوگوں کو مرہٹا عروج کے دن یاد دلا دیے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تلک پکے قوم پرست تھے جیسا کہ تقسیم کے دوران اور اس کے بعد کی تحریک سے ظاہر ہوتا ہے پھر بھی راناڈے کی طرح کے لبرل ہندوؤں اور مسلمانوں کی تنقید بے بنیاد نہیں تھی۔ سیاست کے ساتھ مذہب کو ملانا ایک خطرناک فعل تھا جیسا کہ بعد کے حالات نے ثابت کر دیا۔ بہرصورت ایک بسیار مذہبی سماج میں اس کو غلط انداز سے سمجھنا لازمی تھا۔

اپنے فوری مقصد یعنی لوگوں میں وطن پرستی کا جذبہ پیدا کرنے میں تلک کامیاب ہو گئے اور عام لوگوں کے ذہنوں پر ان کی گرفت کی تصدیق ہو گئی۔ 1896 اور 1897 میں مہاراشٹر میں قحط پڑے اور 1897 میں طاعون پھوٹ پڑا۔ ان کی وجہ سے بڑا جانی نقصان ہوا۔ جون 1897 میں ان کی زیادتیوں کی بنا پر ہلینگ کمشنر انڈیا اور لفٹننٹ آئیر لیٹ کو قتل کر دیا گیا اور حکومت نے تلک پر الزام لگایا کہ انھوں نے اپنے مضامین کے ذریعہ لوگوں کو بھڑکا دیا تھا۔ ان پر مقدمہ چلا اور انھیں 18 مہینے کی قید کی سزا دی گئی۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے ناٹو برادران کو گرفتار کر کے ایک فرسودہ ضابطے کے تحت نظر بند کر دیا گیا، جنھوں نے واقعی قتل کیا تھا۔ انھیں بعد میں پکڑا گیا اور پھانسی دی گئی۔

تلک کو قید و بند کی سزا کی بنا پر غم و غصے کی لہر دوڑ گئی اور پورے ہندوستان میں حکومت کی مذمت کی گئی۔ بنگالی نے لکھا'' اپنے ہم وطنوں کی نظروں میں وہ گر نہیں گئے، ان کی نظروں میں وہ جیل سے باہر بغیر کسی داغ کے آئیں گے۔ ان کی تکلیفوں کی بنا پر ان کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا اور اپنے وطنوں کی مذمت کرنے کی ان کی طاقت بڑھ جائے گی۔ کسی بھی حکومت نے اس سے بڑی غلطی کبھی نہیں کی ہوگی۔ بے اطمینانی کو دور کرنے کی کوشش میں اس نے ملک کے طول وعرض

میں بے چینی پیدا کر دی۔''[1]

کانگریس کے صدر سر سنکرن نائر نے کہا'' حکومت ہندوستانیوں کو ذاتی آزادی اور جائداد سے اپنی مرضی کے مطابق محروم کر سکتی ہے... لیکن ہر وہ چیز انتہائی افسوسناک ہے جو اظہار خیال کی آزادی پر رکاوٹ لگائے۔''[2]

اس وقت لارڈ کرزن ہندوستان آیا۔ کرزن آکسفورڈ یونیورسٹی کا ذہین طالب علم اور غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اعلیٰ درجہ کی قابلیت کے ساتھ وہ کام کرنے کی انتھک طاقت رکھتا تھا۔ وسیع مطالعے اور ایشیا میں بڑے پیمانے پر کئے جانے والے سفروں نے اُسے اُس رول کے لیے تیار کر دیا تھا جو وہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ انڈر سکریٹری آف اسٹیٹ کی حیثیت سے وہ ہندوستان کے انتظامی مسائل سے واقف ہو چکا تھا۔ چنانچہ اُس کی خداداد ذہانت اور اُس واقفیت کی بنا پر جو اُس نے بڑی محنت سے حاصل کی تھی یہ معلوم ہوتا تھا کہ اُس کا دور حکومت بہت کامیاب رہے گا۔ لیکن جو واقعات رونما ہوئے اُنھوں نے اُن اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اُن کی وجہ دریافت کرنا دشوار نہیں ہے۔ اُنیسویں صدی کے آخر میں جو بین الاقوامی حالات پیدا ہو رہے تھے اُن کی بنا پر کرزن کو یقین ہو گیا کہ برطانوی سلطنت کی اُفق پر طوفان منڈلا رہا ہے۔ اُس طوفان سے سلطنت کو بچانا اُس نے اپنا فرض سمجھا۔ اُس کا رول چمکتی ہوئی زرہ بکتر پہنے اُس نائٹ کا سا تھا جو اُس لیے بھیجا گیا تھا کہ اُس رقیب کو شکست دے جو اُس سلطنت پر بری نظر ڈالنے کی ہمت کرے جسے وہ پیار کرتا تھا۔

اُس میں بڑی انانیت تھی۔ ہندوستان میں اُس کی پالیسیوں کے پس پشت محض ایک تصور کارفرما تھا، یعنی سلطنت کی جڑوں کو مضبوط کرنا۔ اُس کے خیال میں جس چیز نے حکومت کو کمزور بنا دیا تھا وہ تھی کارکردگی اور سامراجی جذبے کا فقدان، معاملات کی رہنمائی کرنے کی صلاحیت آہستہ آہستہ حکومت کھو رہی تھی، حکومت کے کل پرزے ڈھیلے ہو گئے تھے اور پدری خبر داری، انصاف اور برتر فہم کا وہ احساس کم ہوتا جا رہا تھا جو کمتر نسلوں پر حکومت کرنے کا واحد جواز ہے،

---

[1] بنگالی، 18 ستمبر 1897

[2] خطبہ صدارت، 1897

نظام کو لوگوں میں نیا خون دوڑانا ضروری تھا۔

کرزن اتنی بات نہ سمجھ سکا کہ وہ جس پدریت کو بحال کرنا چاہتا تھا وہ ہندوستان کے جذبہ خودداری اور خود اپنے پر حکومت کرنے کی خواہش کے منافی تھا۔ کرزن کے رویے اور ہندوستان کے لوگوں کے دعوے کے درمیان جو وسیع خلیج حائل تھی اُس کی بنا پر غلط فہمیوں اور جھگڑوں کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ اُس نے اچھے یا بُرے جو بھی کام کئے اُن کی بنیاد چونکہ نسلی برتری کے مفروضے پر قائم تھی، اس لیے ہندوستانی اُنھیں ناپسند کرتے تھے۔ کلکتہ کارپوریشن اور یونیورسٹی کو اُس نے سرکاری لوگوں کے ہاتھوں میں دے دیا، تعلیم یافتہ طبقوں پر اُس نے غلط بیانی کا الزام لگایا، اُس نے اعلان کیا کہ ہندوستانی اعلیٰ عہدوں کی ذمہ داریوں کو سنبھالنے کی اہلیت نہیں رکھتے ہیں۔ اُس نے انڈین نیشنل کانگریس کا ذکر بڑی حقارت کے ساتھ کیا اور سب سے زیادہ یہ کہ اُس نے لوگوں کی مرضی کے خلاف بنگال کو تقسیم کیا۔ یہ ایسے اقدامات تھے جن کی بنا پر وہ نہ صرف ذاتی طور سے غیر مقبول ہو گیا بلکہ اُس نے تعلیم یافتہ طبقے کے ایک بڑے حصے کو برطانوی طاقت سے دور کر دیا۔ لیکن بنگال کی تقسیم نے قومی آزادی کی تحریک میں ایک نئے مرحلے کا آغاز کیا جس کا جائزہ اگلی جلد میں لیا جائے گا۔

تیرہواں باب

ادبی نشاۃ ثانیہ

ادب سماج کی زندگی کی آئینہ داری کرتا ہے اور اس کی اُمیدوں، آرزوؤں اور شکوؤں کی عکاسی کرتا ہے۔ اس لیے وہ اُن تبدیلیوں کا ریکارڈ ہوتا ہے جن سے سماج گزرتا ہے۔ چنانچہ اُنیسویں صدی میں ہندوستان کی سماجی اور ذہنی تبدیلی کی تاریخ اُن ادبی کتابوں میں دیکھی جاسکتی ہے جو اُس زمانے میں مختلف زبانوں میں لکھی گئی تھیں۔ وہ اُس انقلاب کی شہادتیں پیش کرتی ہیں جو سماج میں ہو رہا تھا۔

ہندوستان کی زبانوں میں بنگالی پہلی زبان تھی جس میں مغرب کے اثرات کے نتائج دیکھنے میں آئے۔ رفتہ رفتہ دوسری تمام زبانیں اُس سے متاثر ہوئیں اور اُن میں بھی اُسی قسم کی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ حالانکہ یہ سچ ہے کہ ہندوستان میں برطانوی راج کے قیام سے تمام طبقات متاثر ہوئے تھے پھر بھی سماج کے مختلف حصوں میں جو تبدیلیاں رونما ہوئی وہ یکساں نہیں تھیں۔ جہاں تک تمام لوگوں کا تعلق تھا وسطی زرعی اور صنعتی نظاموں کے زوال کی بنا پر اُن میں بہت سی تبدیلیاں ہوئی تھیں۔ چونکہ عام لوگ سب کے سب ناخواندہ تھے اس لیے اُس زمانے کی ذہنی تبدیلیوں سے وہ متاثر نہیں ہوئے۔ پیداوار کی پرانی تکنیک میں یا پیشوں میں بہت کم تبدیلی ہوتی تھی۔ معیشت

جامد تھی اور عام لوگوں کے طور طریقوں اور لوک ادب میں روایت سے کوئی بڑا انحراف نہیں کیا گیا تھا۔

دوسری طرف متوسط طبقہ ایک نئے معاشی اور ذہنی ماحول میں نمو کر رہا تھا۔ اُس میں نوجوان زیادہ سے زیادہ انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور اُن کے ذہنوں میں نئے تصورات رسائی پا رہے تھے ایسے نئے جذبے معرض وجود میں آنے لگے جنھیں عہد وسطیٰ میں کوئی نہیں جانتا تھا اور سوچنے سمجھنے کے طریقے بدلنے لگے۔ نئی طرز زندگی اور نئی تعلیم دونوں کے اثر کے تحت متوسط طبقے کے سماج نے جدید تصورات قبول کر لیے اُن کی رائے اور مزاج کی عکاسی ادب کرنے لگا۔

لیکن مغرب کے طور طریقوں نے متوسط طبقے اور عام لوگوں کے درمیان خلیج کو وسیع تر کر دیا۔ یہ کوئی بات نہیں تھی۔ پہلی جلد میں اس فرق پر توجہ دلائی گئی تھی جو فوج کے طبقہ اشرافیہ اور علما کے طبقے اور عام لوگوں کے درمیان پایا جاتا تھا جو تاجروں، دستکاروں اور کاشتکاروں پر مشتمل تھے پھر بھی تہذیبی اور سماجی اعتبار سے ماضی میں اُن میں یک گونہ اتحاد پایا جاتا تھا۔ اُن کے اختلافات اس قسم کے تھے جیسے ایک ہی قسم کی چیز کی ذیلی قسموں میں پایا جاتا ہے لیکن جہاں تک نئے سماج کا تعلق تھا، اُس کے متوسط طبقے کے، جس کا نقطۂ نظر مغربی تھا، اور عام لوگوں کے درمیان، جو قدیم رواجوں کو اپنے سینوں سے لگائے ہوئے تھے، فاصلہ اور زیادہ بڑھ گیا۔

I۔ بنگالی ادب

بنگالی زبان اور ادب کے ارتقا میں یہ ثنویت زیادہ واضح ہے۔ مغربی اثرات پڑنے سے پہلے پڑھے لکھے اور کھاتے پیتے لوگوں کا بنگالی ادب اور عام لوگوں کا ادب یکساں خصوصیات کا حامل تھا اور اُن کے یکساں موضوعات تھے۔ اُن کی ہیئتوں اور مواد میں کوئی بڑا فرق نہیں تھا۔

شاندار ادب وہ ادیب پیدا کر رہے تھے جنھیں راجا نواب اور زمینداروں کی سرپرستی حاصل تھی اور عام لوگوں کا ادب گاؤں کے لوک شاعر پیدا کر رہے تھے۔ اٹھارہویں صدی میں تہذیب کے دو اہم درباری مرکز تھے۔ ایک نادیا (کرشن نگر (تھا جہاں راجہ کرشن چندر رائے حکومت کرتا تھا۔ اور دوسرا ڈھاکہ کا وکرم پور جہاں راجہ رائے ببو کی حکومت تھی۔ شاعر بھرت چند کو اول الذکر کی سرپرستی حاصل تھی جئے نرائن اور اُس کی بھتیجی آنند سائی کو آخر الذکر کی۔ بھرت چندر

کی شہرت کی باعث ہوئی اُس کی کتاب '' آنند منگل '' جس میں ودیا اور سندرا کی مشہور کہانی بیان کی گئی ہے اور جے نرائن کو شہرت ملی مشہور و معروف '' ہری لیلائے '' سے۔ روایتی شاندار اسلوب کے وہ آخری بڑے شاعر تھے۔

عام لوگوں کے لیے جو شاعر لکھتے تھے اُن میں گیت کار یا '' کابی وال غنائیہ ڈراموں یا یاتراؤں '' ، '' مذہبی نظموں یا '' کیرتنوں '' اور دوسرے اصناف کے لکھنے والے تھے جیسے ٹپا، نیچی، دھاپ وغیرہ۔ اٹھارہویں صدی میں کابلی والوں میں سب سے زیادہ مشہور تھے رام پرشاد، ہاردٹھاکر، ہرے کرشنا ویرگھانگی، رام باسو اور نیتا نند ویراگی۔ کرشن کمل گوسائیں یاترا کا بڑا شاعر تھا۔

اِن گیتوں میں گھریلو زندگی کے اچھے اور برے پہلوؤں کی عکاسی کی جاتی تھی جیسے نوجوان بنگالی بیوی جو شوہر کے سامنے زبان نہیں کھول سکتی تھی۔ ماں جس کا دل بچوں کی محبت سے بھرا ہوا تھا، خاندان زندگی کے آرام اور دکھ، تیوہاروں پر خوشیاں منانے کا منظر، قربانیوں، قناعت اور تکلیفوں کی کہانیاں جن کو خاموشی کے ساتھ برداشت کیا جاتا تھا، حیات بعد از ممات کی خواہش اور مشیت ایزدی پر بھروسہ۔

دونوں قسم کے شاعروں کے موضوعات یکساں تھے۔ وہ زیادہ تر مذہبی تھے یعنی ویدانت کا فلسفہ، مذہبی کہانیوں کی تعریف و توصیف، دیومالا کے قصے اور شخصیتیں اور رادھا کرشن کی زندگی کے رومانی حصے۔ ان کے علاوہ ان میں زندگی کی خوشیوں اور ہوس پرستانہ محبت کے نشیب و فراز اور قسمت کے اُلٹ پھیر کا بیان بھی کیا جاتا تھا۔ دونوں دبستانوں کے مختلف شاعر ایک ہی قسم کے موضوعات کی عکاسی ایک روایتی طریقے سے کرتے تھے۔ ان کے لیے تمام مرد اور عورتیں قسمت کی ڈوری میں بندھے ہوئے تھے اور خدا کی مرضی کے تابع تھی، دیوتا یا دیوی کی چھوٹی سے چھوٹی توہین کا خمیازہ بھگتنا پڑتا تھا اور توبہ اور استغفار کی بنا پر ان کی خواہش پوری ہوتی تھی۔ زندگی ایک یاترا تھی، اس کے دکھ ایمان کے امتحان تھے اور اس کی کامیابیاں من جانب اللہ تھیں۔ انسان کو دکھ اور تکلیفیں صبر و سکون کے ساتھ برداشت کرنا چاہیے اس لیے کہ زندگی آنی جانی ہے اور آواگون کا تکلیف دہ چکر محض مکمل اطاعت قبول کرنے اور اپنے کو پہچاننے کے بعد ختم ہوسکتا ہے۔

انسانی محبت، جوجدائیوں اور بدقسمتیوں کی داستان ہوتی ہے، عام طور سے عاشق و معشوق کے ملن پر ختم ہوتی ہے۔ اُس عہد کے شاعر وارداتِ قلب کے متعلق اس طرح لکھتے ہیں کہ اُس میں نفس پرستی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ مرد اور عورت کے رشتے میں اخلاق کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے ہیں اور سازشوں، غلط کاریوں، وعدہ فراموشی اور ناجائز جنسی رشتوں کو برا نہیں سمجھتے ہیں۔ بشرطیکہ اُن میں کامیابی ہو۔ جہاں تک سماج کی طرف فرد کے فرائض کا تعلق تھا اُن کے حدود کا یقین خاندان اور ذات کرتی تھی اور اُس سے آگے انسانیت کے لیے ایک غیر واضح احساس کا اعتراف کیا جاتا تھا۔ سماج کا تصور درجہ بندی کا اور فیوڈل کا تھا۔ لیکن سماج میں چونکہ مقابلے کا جذبہ نہیں تھا۔ اس لیے سماجی تناؤ کم تھے اور گھروں کی باہمی رقابت اور چشمک کا اثر زندگی پر کم ہی پڑتا تھا۔ اس بات کو بلا چون و چرا تسلیم کیا جاتا تھا کہ دنیاوی معاملات میں حکمراں کو اقتدار حاصل ہے اور مذہبی معاملات میں پروہت کو۔ عورتوں کی حیثیت ایسے ماتحتوں کی طرح تھی جو مرد کے لیے جیتی تھیں اور مرد کے لیے مرتی تھیں۔ سری ختا سوداگر کی کہانی میں لاہانا کا شوہر کھملانا کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اس سے شادی کر لیتا ہے وہ چاہتا ہے کہ اُس کی پہلی بیوی اُس کی نئی بیوی کی خدمت کرے اور وہ اپنے مالک کا حکم بجالاتی رہے لیکن ملازمہ کے خراب اثر کے تحت وہ اپنا طریقہ کار بدل دیتی ہے۔ پھر بھی ملازمہ کے خراب مشوروں کا اثر زائل ہو جاتا ہے اور لاہانا اپنے کئے پر پچھتاتا ہے اور پرانے تعلقات پھر اُستوار ہو جاتے ہیں۔

نظموں کے ہیرو اور ہیروئن فرد نہیں ہوتے ہیں بلکہ افراد کی قسمیں ہوتی ہیں۔ جن کے کرداروں کو یا تو بہت اچھا بنا کر پیش کیا جاتا ہے یا بہت بُرا۔ یا تو وہ مکمل اچھائی کی تجسیم ہوتے ہیں۔ یا مکمل بُرائی کی۔ اِسی قسم کا رویہ بظاہر فطرت کے بیان میں بھی اختیار کیا جاتا ہے۔ الاول کی بہار مسرت و شادمانی کا موسم بنے جب پھول کھلتے ہیں۔ کوئل بولتی ہے، شہد کی مکھیاں پھولوں سے رس لیتی ہیں۔ مسالیا کونپلوں سے لو جاتے ہیں اور آم کے درختوں میں نئی نئی پتیاں اور ٹہنیاں پھوٹنے لگتی ہیں۔ بھرت چندر اُنھی باتوں کی زیادہ پرشکوہ زبان اور غنا کی نظموں میں تکرار کرتا ہے جن کا بیان اول الذکر کی بہار میں کیا جاچکا ہے۔ تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ دوسرے شاعر بھی ایسے ہی منظر نامے پیش کرتے ہیں۔

ایسے ادب کی نمایاں خصوصیت انفرادیت اور حقیقت پسندی نہیں ہوسکتی ہے جس میں محض داخلیت ہو اور محض مافوق الفطرت واقعات یا نصب العین کی عکاسی کرتا ہے۔ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں تو اُس میں پیش پا افتادہ، غیر شائستہ اور مخرب اخلاق موضوعات پر لکھا جانے لگا۔

جہاں تک درباروں کے شاعروں اور عوامی شاعروں کا تعلق ہے اُن میں محض اسلوب نگارش کا فرق پایا جاتا تھا۔ بھرت چندر اور جئے نرائن تعلیم یافتہ تھے اور ان کے اشعار میں سنسکرت کے بھی بھاری بھرکم لفظیات کی بھرمار ہے۔ اگر سنسکرت کے الفاظ کو سوچ سمجھ کر استعمال کیا جائے اُن سے شعر کا وقار و اعتبار بڑھ جاتا ہے ورنہ وہ طرز نگارش کو غیر ضروری حد تک پر تکلّف اور مختلف بنادیتے ہیں۔

بھرت چندر کی موت کے بعد کوئی باصلاحیت شاعر منظر عام پر نہیں آیا چاہے۔ درباری شاعر ہوں یا عوامی شاعران میں بھرت چندر، جئے نرائن اور رام پرشاد کے ادبی قدوقامت کا کوئی دوسرا شاعر پیدا نہ ہوسکا۔ جذبات پھیکے پڑ گئے اور نئی خوبیاں ختم ہونے لگیں۔ وسطیٰ دور کی روایتی شاعری کی دھار سست ہوگئی اور اس کا پھیلاؤ کم ہوگیا۔ بنگال پر مغرب سے آئے ہوئے بدیسیوں کی حکومت قائم ہوگئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس فتح نے شاعرانہ صلاحیتوں کو مفلوج کردیا۔

چنانچہ پلاسی کی جنگ کے بعد کی نصف صدی بنگالی ادب کے زوال کا زمانہ تھا۔ بھرت چندر کے بعد پیدا ہونے والے ''کالی کمار'' کے مصنف کالی کرشن داس اور '' جیاترا '' کے مصنف باسک چندر رائے کی طرح کے شاعر پرانے موضوعات اور تکنیک کو دہراتے رہے لیکن اُن میں اپنے اُستادوں کی سی گرمی نہیں تھی۔ محض وہ زبان کے استعمال میں زیادہ آزادی سے کام لیتے تھے اور ان کا فنی اسلوب زیادہ ترقی یافتہ تھا۔ ناجائز محبت کی کہانیاں بیان کرکے وہ زیادہ سیکولر ادب کے لیے میدان تیار کررہے تھے۔

رام ندھی گپتا، سردھر کھنک، رام باسو کالی وال، دسرتھی رائے، کرشنا کمل گوسوامی اور مدھوکان (دھپوں کا مصنف) کی طرح کے مقبول شاعروں نے گاوؤں اور شہروں میں عام لوگوں کی جذباتی تسکین کا سامان کیا۔

II۔ بنگالی ادب کی ابتدا

لیکن انیسویں صدی کی ابتدا سے بنگالی ادب میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔شاعری جو ابھی تک غالب صنف تھی پیچھے ہٹنے لگی اور اپنی اہمیت اور مقبولیت کھونے لگی اور نثر تیزی کے ساتھ منظرعام پر نمودار ہونے لگی جو علم اور معقول فکر کے اظہار و ابلاغ کا ذریعہ ہے۔ یہاں تک کہ پچاس سال میں وہ اظہار کا ایک پرزور اور لطیف وسیلہ بن گیا۔اس تبدیلی کے بعد سوچنے کا وسطی انداز ختم ہو گیا اور ہندوستان میں جدید اندازِ فکر کی ابتدا ہوئی۔

حالانکہ برطانوی فتح سے پہلے ایک قسم کی نثر کا بنگال میں رواج تھا جیسے کاروباری خط و کتابت کی فارسی سے بھری ہوئی بنگالی، سوریہ پرائے، دیوسمار اتنتر اور سہاجیا کی طرح کی مذہبی کتابوں کی آراستہ نثر اور قانون اور منطق کی کتابوں کی نثر لیکن علمی اور سنجیدہ کتابیں لکھنے کے لیے نثر کا استعمال محض انیسویں صدی میں شروع ہوا۔

اس قسم کی نثر کی ضرورت اُس وقت بھی محسوس کی گئی تھی جب کمپنی کے ضوابط کا بنگالی میں ترجمہ کرنا پڑا تھا۔ 1785 جوناتھن ڈنکن کی رہنمائی میں دیوانی عدالت کے انصاف کے الزام کے ضوابط کا ترجمہ کیا گیا تھا۔ 1791 میں نیل بینجمن ایڈ مونسٹن کی نگرانی میں ضابطہ فوجداری کا ترجمہ کیا گیا اور 1893 میں ہنری پٹسن فوسٹر کی نگرانی میں ضابطہ کارنوالس کا بنگالی میں ترجمہ کیا گیا۔

لیکن فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد جدید ہندوستانی زبانوں کو ترقی دینے کے لیے اہم اقدامات کئے گئے اس کالج کو قائم کرنے میں ویلیزلی کا مقصد تھا نوجوان انگریز سول ملازمین کو قانون، اخلاقیات، فلسفہ، قانون، سائنس وغیرہ کی طرح کے علوم کے ساتھ ہندوستانی زبانوں کی تعلیم دینا۔ وہ چاہتا تھا کہ یہ نوجوان ہندوستانی زبانوں میں مہارت حاصل کریں اور ہندوستانی شرفا کے جلسوں میں اس کا مظاہرہ کریں۔اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کالج کو ہندوستان کی مختلف زبانوں میں طالب علموں کے لیے مختلف علوم کی کتابیں تیار کرنی پڑیں، ڈاکٹر گلکرسٹ اور ولیم کیری پر ان کی تیاری کی ذمہ داری تھی۔گلکرسٹ ہندوستانی، فارسی اور عربی کا نگراں تھا اور کیری

بنگالی اور دوسری زبانوں کا۔ ان کی دیکھ ریکھ میں کام کرنے کے لیے پنڈت اور منشی ملازم رکھے گئے تھے۔

جن بنگالی عالموں نے درسی کتابیں تیار کیں ان میں مرہٹوں جئے ودنکار، رام رام باسو، چندی چرن منشی اور راجیولوچن لکھو پادھیائے مشہور ہیں۔ ان ابتدائی مصنفین میں دو قسم کے لوگ تھے یعنی پنڈت اور منشی۔ اولالذکر نے ایسا اسلوب اختیار کیا جس میں سنسکرت کے پرشکوہ الفاظ شامل تھے۔ آخرالذکر نے اپنی تحریروں کو فارسی الفاظ سے بوجھل بنا دیا۔ لیکن چونکہ ان کے برطانوی مالکوں کا جھکاؤ سنسکرت کی طرف تھا اس لیے سنسکرت کے حامی جیت گئے اور مدت تک بنگالی ادب اُن کے زیر اثر رہا، آخر کار ایک درمیان کا راستہ نکالا گیا اور بول چال کی زبان اور علمی زبان میں ایک قسم کا سمجھوتا ہو گیا۔ ایک آراستہ و پیراستہ اور طمطراق اور بیجا عبارت آرائی سے بھرے ہوئے مصنوعی اسلوب کی جگہ ایک ایسی قدرتی اور آسان نثر نے لے لی جس کے ذریعہ ہر قسم کے احساسات وجذبات کا اظہار کیا جا سکتا تھا۔

III۔ اُنیسویں صدی کا بنگالی ادب

بنگالی نثر کے ارتقا میں جن اور لوگوں نے مدد دی وہ تھے عیسائی مشنری۔ سیرم پور کے مشنریوں کے بہت سے ہیرو تھے جن میں کیری، مارش مین اور وارڈ نے راستہ نکالا تھا۔ اُن کے خاص خاص کام تھے صرف نحو اور لغتوں کی تیاری اور انگریزی سے ترجمہ۔ فیلکس کیری نے انسائکلو پیڈیا کی پہلی جلد تیار کی جس میں اعضا کے افعال اور انسانی جسم کی ساخت کو بیان کیا گیا تھا۔ کالی موہن بنرجی نے، جو ابتدا میں عیسائی ہونے والوں میں شامل تھا۔ اور پادری بن گیا تھا، تیرہ جلدوں میں ایک انسائکلو پیڈیا کی تدوین کی (ودیا کلپدروما (سوانح عمریاں، تاریخیں، سائنسی اور فلسفیانہ کتابیں چھاپی گئیں۔ پھر سیرم پور مشن کی درپن، رام موہن رائے کے سمبند کومندی، راجندر لال مترا کے دیوی دھارتھا سنگرہ، ربندرناتھ ٹیگور کے تتوابودجی پتریکا اور ایشور چندر گپتا کے سمبند پربھاکر کی طرح کے اخباروں نے زبان میں ترقی میں بڑی مدد دی۔

مغربی علم کا پرچار کرنے والے تعلیمی اور تہذیبی ایجنٹوں نے بھی ادبی کام میں حصہ لیا۔ اُن

میں ایک تھی کلکتہ اسکول بک سوسائٹی جس کا قیام 1817 میں عمل میں آیا تھا۔ اس کا مقصد تھا اسکولوں کو سستی قیمتوں پر کتابیں مہیا کرنا اور مختلف علوم یعنی تاریخ، جغرافیہ، اخلاقیات وغیرہ کے متعلق بنگالی میں کتابوں کا ترجمہ کرنا اور انھیں شائع کرنا۔ ایک اور انجمن تھی ورنا کلر لٹریچر سوسائٹی (1851) جو انعامات دے کر بنگالی میں کتابوں کی اشاعت کی ہمت افزائی کرتی تھی۔ اس کی مطبوعات میں مندرجہ ذیل کتابیں شامل تھیں۔ ڈفو کی رابنسن کروسو، سنٹ پیر کی پال اینڈ ورجینیا، لیب کی ٹیلس فرام شیکسپیر اور الیز بتھ کی اگزائس فرام سائبیریا۔

سماجی، مذہبی اور سیاسی تحریکوں نے بھی ادب کی پیداوار کی ہمت افزائی کی۔ مذہبی گیت، فلسفیانہ کتابیں اور سوال وجواب کی شکل میں مضامین لکھے اور چھاپے گئے۔

جیمس لانگ نے، جس نے انیسویں صدی کے نصف اوّل میں لکھی جانے والی بنگالی کتابوں کی وضاحتی فہرست بڑی محنت اور جانفشانی کے ساتھ تیار کی تھی، 11400 بنگالی کتابوں اور کتابچوں کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بنگالی زبان اور ادب نے کتنی ترقی کر لی تھی۔ اس فہرست میں مندرجہ ذیل موضوعات پر کتابیں شامل ہیں، ریاضیات، سائنس، طب، قانون، لسانیات، تاریخ، فلسفہ اور مذہبی کتابیں۔

یہ صحیح ہے کہ سب کتابیں اعلیٰ معیار کی نہیں تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ ان میں سے بہت سی بہت معمولی تھیں۔ لیکن ان میں سے کوئی ایسی تھیں جن سے اُس زبان کی صلاحیتوں کا اظہار ہوتا تھا۔ حالانکہ انگریزی نہ صرف سرکاری زبان بلکہ اسکولوں اور کالجوں کی تعلیم کی زبان بھی بن گئی تھی۔ اس کے باوجود بنگالی نے تیزی کے ساتھ جو ترقی کی وہ اس کا ثبوت ہے کہ لوگوں کو اپنی مادری زبان سے بڑا لگاؤ تھا۔ اگر بنگالی کو سرکاری زبان کی حیثیت دے دی گئی ہوتی اور اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنا دیا گیا ہوتا تو وہ کتنی ترقی کرتی اس کا اندازہ جاپانی زبان کی 1860 کے بعد ہونے والی ترقی سے لگایا جا سکتا ہے۔

اُس زمانے کے لکھنے والوں میں رام موہن رائے سب سے پیش پیش تھے حالانکہ، بنگالی نثر کی ابتدا ہو چکی تھی لیکن وہ تجرباتی مرحلے سے گزر رہی تھی اور زیادہ تر درسی کتابوں میں استعمال کی جاتی تھی۔ انھوں نے اسے سنجیدہ اور اعلیٰ افکار کے اظہار کا ذریعہ بنا دیا۔ انھوں نے اُپنشدوں کا

ترجمہ کیا، عیسائی مشنریوں کے حملوں کے خلاف ہندودھرم کے تحفظ کے لیے کتابیں لکھی اور اپنے ہم وطنوں کے غلط رواجوں کی مذمت بھی کی۔

بنگالی نثر کے بانی سمجھے جانے کی صرف اتنی وجہ ہی نہیں ہے کہ رام موہن رائے دوسرے لکھنے والوں سے پہلے پیدا ہوئے بلکہ اس کی دوسری ٹھوس وجوہ بھی ہیں۔ اُن سے پہلے کے لکھنے والوں نے تالیف وترجمہ کئے تھے لیکن ان کا کوئی اپنا انوکھا اسلوب نہیں تھا۔ رام موہن رائے نے جو نثر لکھی وہ سیدھی سادی اور واضح ہونے کے ساتھ دل میں جگہ بنانے والی آراستہ اور شیریں تھی جس میں جذباتیت سے کام نہیں لیا جاتا تھا۔

حالانکہ اُن کی تحریروں کا مواد بہت اہم تھا یعنی اخلاق اور سماجی اہمیت کے مسائل پھر بھی اُنھوں نے اس کا اظہار ایسی زبان میں کیا جو راست تھی، آسانی سے سمجھی جاسکتی تھی اور خطابت کے فن سے مبرا تھی۔ ہندوستان کی مذہبی کتابوں میں پائے جانے والے قدیم حقائق کے تعلق سے انھوں نے جدید معقولیت پسند اور تنقیدی رویہ اختیار کیا۔

ہندوستان کے ذہن میں مذہبی ہلچل اور اُس پر مغرب کے اثرات کے نتیجے میں اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں کئی تعمیری تحریکیں وجود میں آگئیں۔ جن سانچوں میں ہندوستانی فکر ڈھلی تھی وہ مغربی فکر اور ہندوستانی روایت کی دین تھے۔ سترھویں صدی سے اُنیسویں صدی تک نشوونما پانے والے مغربی فلسفے سائنس اور ادب کے وسیع نظریہ نے اُن ہندوستانی دانشوروں کے لیے جنھوں نے انگریزی اداروں میں تعلیم پائی تھی اور جو دوسرے طریقوں سے اُس کے زیر اثر آئے تھے۔ ذہنی غذا مہیا کی۔ انھوں نے ڈکارٹز اور اسپنوزا کی مقبولیت، ہیوم کے شک وشبہات، بینتھم مل کی افادیت پرستی، کانٹ کا فوق التجربہ، کومتے کی ثبوتیت اور عصری یورپین فلاسفی کے نظریات کا مطالعہ کیا۔

یورپ کی روشن خیالی نے جس کی بنیاد تھیں جدید عہد کی سائنسی دریافتیں، اُن کے ذہنوں کو متاثر کیا اور نہ صرف فطرت کو سمجھنے میں ایک انقلابی تبدیلی پیدا کردی بلکہ علم کے متعلق اُن کے خیالات کے علاوہ کائنات کے متعلق اُن کے رویے اور عالمی نقطۂ نظر میں بھی بڑی تبدیلی پیدا کردی۔ اُس روشن خیالی کے بعد وہ روحانی انقلاب آیا جسے روسو نے شروع کیا تھا۔ اس کا اثر نہ

صرف فلسفیانہ فکر پر پڑا بلکہ ادب کے تمام شعبے بھی اس سے متاثر ہوئے یعنی شاعری، ڈراما، کہانی، تاریخ اور سماجی سائنس۔

اُنیسویں صدی کے ہندوستان پر سب سے زیادہ اثر روحانی تحریک کا پڑا۔ یورپ میں اُس نے سوکھی پھیکی معقولیت کی کلاسیکی مہارت کے خلاف جذبات و احساسات کے اظہار کی ابتدا کی۔ اس کو بغاوت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس میں بہت سے تضادات پائے جاتے تھے۔ وہ آج کے خلاف احتجاج ہونے کے باوجود ایک خیالی سنہرے ماضی کی مدح و ثنا بھی تھی۔ سماج کے مصنوعی طریقوں کے خلاف وہ فطرت سے کی جانے والی اپیل تھی۔ وہ محض دانش وری کی سست روی کے خلاف عجلت پر زور دیتی تھی وہ ذہن کو اعتقاد و نظریے کے بندھنوں سے آزاد کرنا چاہتی تھی اور فرد کو ضابطوں کی قید سے چھڑانا چاہتی تھی پھر بھی اُس نے ماضی کی توصیف و تعریف کی اور اُس کی سادگی اور دلداری کے گرد ایک رفعت و برتری کا ہالہ بنا دیا وہ مذہب کی رسوم اور ظاہرداری کی تنقید کرتی تھی لیکن باطنی تجربات کی قدر و قیمت پر زور دیتی تھی اُس سے ذہنی تناؤ دور ہو جاتا تھا اور اس لیے تخلیقی صلاحیت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ اُس سے انفرادیت اور موضوعیت میں اضافہ ہو جاتا تھا۔ اور اُسی کے ساتھ اخلاقی نظام کی عالمگیریت، تاریخ کا تسلسل اور فطری قانون اور معقولیت پسندی کی برتری باقی رہتی تھی۔

مغرب کی جدیدیت نے ہندوستان کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اُس نے بہت سے جالے صاف کر دیے لیکن ہر پرانی چیز کو فتح نہ کر سکی۔ اُس نے ہر قدیم چیز کو آنکھیں بند کر کے تسلیم کرنے کے رویےّ کو بڑی حد تک تبدیل کر دیا۔ اُس نے انسانی مسائل کے تعلق سے ایک فعال طریقۂ عمل کو فروغ دیا، جن چیزوں کی بنیاد محض عادات یا رواج پر قائم تھی اُن کے متعلق ہندوستان کے اعتقاد کو متزلزل کر دیا اور قدیم اعتقادات میں ترمیم کرنے اور انھیں جدید زندگی کے حالات کے مطابق بنانے کے لیے ہندوستانی ذہن کو مائل کیا۔ اس نے قدیم اقدار کا دوبارہ جائزہ لینے اور مغرب اور مشرق میں سمجھوتا کرانے کے لیے پرزور عوامل مہیا کر دیے۔

اس کا اثر سب سے پہلے ہندوستان کی مذہبی فکر میں نمودار ہوا۔ لیکن جلد ہی ہندوستانی ادبیات بھی اُس سے متاثر ہو گئے اور اُن میں مکمل تبدیلی ہو گئی اور خدا، فطرت اور انسان کے

متعلق نئے رویے کا اظہار ہونے لگا۔ اس نے مغرب سے نئے موضوعات مستعار لیے اور مقامی ادب سے پرانے موضوعات کا انتخاب کر کے اُنھیں نئے سانچوں میں ڈھالا۔ ادب میں نظم کی قدیم ہیئتیں استعمال کی گئیں لیکن انگریزی شاعری کی نقل میں نئی ہیئتوں کا بھی تجربہ کیا گیا۔ نثر میں ایک نیا ادب وجود میں آ گیا۔ بنگال نے انگریزی ادب کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور شیکسپیئر سے سوئین برن تک کی انگریزی شاعری پر اور ڈینیل ڈف سے ٹامس ہارڈی تک کی انگریزی نثر پر وہاں کے لوگوں کی اچھی نظر تھی اس کی وجہ سے قدرتی طور پر ایسی کتابیں لکھی گئیں جن پر انگریزی تصورات اور ہیئتوں کا گہرا اثر تھا۔ صرف اتنا ہی نہیں کہ مواد اور موضوعات کی حد تک ہندوستانی مصنفین انگریزی ادب سے متاثر ہوئے بلکہ اسلوب، طرز نگارش اور اوزان پر بھی اُس کا اثر پڑا لیکن وہ محض مغرب کی نقل نہیں کرتے تھے اس لیے کہ ان کے موضوعات اور کردار، ان کی نثر اور شاعری کا ماحول، ان کی تحریروں میں پائی جانے والی زریں لہریں اور اقدار و تصورات کا انتخاب ظاہر کرتا تھا کہ وہ اپنے وطن کی سرزمین سے جڑے ہوئے ہیں۔ رامائن، مہابھارت، بھگود گیتا اور پرانوں نے، کلاسیکی سنسکرت، فارسی، عربی اور وسطی زبانوں کی نظموں نے، عشق و محبت اور دلاوروں کی داستانوں نے، تاریخ ہندوستان کے کارناموں کی کہانیوں وغیرہ نے اُن کی تخلیقات کے لیے مواد اور رنگ و آہنگ مہیا کر دیا تھا چنانچہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادب سے، جسے مختلف مذہبوں اور نسلوں سے تعلق رکھنے والے ادیبوں نے پیدا کیا تھا، ہندوستانی تہذیب کا پورا منظر جھلکتا تھا۔ اس کے پس پشت ایک مشترکہ جذبہ کارفرما تھا اور اُس سے بڑی حد تک ایک مشترکہ ذہنی رویے کا اظہار ہوتا تھا۔

مصنفین کا حلقہ محض عالموں کے اُن چھوٹے سے طبقے تک محدود نہیں تھا جس نے تعلیم کے قدیم طریقوں سے تربیت پائی تھی بلکہ اُن میں اُن طبقات کے رکن بھی شامل تھے جنھیں نئے تصورات کو جذب کرنے اور جدیدیت کے ماحول میں اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کرنے کا موقع ملا تھا۔ اُن سے زیادہ تر متوسط طبقے کے وہ لوگ تھے جو سیکولر کاموں میں مصروف رہتے تھے اور سبھی ذاتوں اور فرقوں سے تعلق رکھتے تھے مثلاً ہندو، مسلمان، عیسائی اور دوسرے۔ انھوں نے پنڈت اور مولوی کی ذہنی اجارہ داری کو ختم کیا جن کی درباری سرپرستی ہندوستانی سیاست میں ہونے والی

تبدیلی کی بنا پر ختم ہو چکی تھی۔

نئے ادب نے نہ صرف نئے احساس و فکر کی عکاسی کی بلکہ انھیں ملک میں پھیلانے اور لوگوں کے ذہن نشیں کرانے میں بھی مدد دی۔ انسانی ذہن کو قدامت کی غلامی سے چھٹکارا دلانے کے ساتھ اُس نے اس ذہنی رویّے کو جنم دیا جو جدید اقدار کو قبول کرنے کے لیے ضروری ہے۔ مذہب میں ادعائیت کو تنقید نے شکست دے دی۔ اطاعت پروری کو ذاتی تجربے، پاکبازی اور روحانی لگاؤ نے ہرا دیا۔ مذہبی اصولیت کو اخلاقی عمل نے پسپا کر دیا۔ دوسری دنیا کے تصور پر سماجی بہتری اور خدمت کے تصورات نے غلبہ حاصل کر لیا۔ دنیا کو قابل مذمّت مایہ جال سمجھنے کا رویہ بدل گیا۔ فطرت کو ایک ایسی دوستانہ طاقت سمجھا جانے لگا جس کا تعاون انسانی بہبودی کے لیے ضروری ہے اور جو اس ایزدی توانائی کا مظہر ہے جو مسرّت کا ذریعہ ہے۔

اس ادب میں انسان دوستی کا جذبہ تھا جس نے انسان کے وقار کو ایک نئے انداز سے ابھارا تھا۔ تمام لوگوں کی برابری اور عورت اور مرد کی برابری پر زور دیا جاتا تھا اور فرد کو خاندان، ذات اور قبیلے کی بندشوں سے آزاد کرانے کی بات کی جاتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ قومی اتحاد کا شعور معرض وجود میں آ گیا تھا۔ حب الوطنی اور ملک سے پیار کے جذبے نے انفرادی خواہش پر غلبہ پا لیا تھا اور فرد کے سماجی کردار پر اثر انداز ہونے لگا تھا۔ بدیسیوں کی اطاعت کی ذلّت اور آزادی کی خواہش نے جس ذہنی کشمکش کو جنم دیا تھا اس نے ادبی اظہار اور فنی تخلیق میں سکون تلاش کرنے کی کوشش کی۔

شاعری، ڈرامے اور نثر میں روحانی تبدیلی نظر آتی تھی جو عظیم بغاوت کے بعد پچاس سال میں سن بلوغ کو پہنچ گئی تھی اس سے پہلے کی مدت میں بنگالی شاعری نے بندشوں سے پوری طرح چھٹکارا نہیں پایا تھا لیکن سمبند پربھاکر کے اڈیٹر ایشور چند گپتا (1802۔ 1859) کی شاعری کی اشاعت کے بعد یہ تبدیلی واضح ہو گئی۔ اُن کے ایک ساتھی رنگ لال بنرجی نے (1826-1887) اپنی طویل نظم لکھی جس میں عشق و محبت دلاوری اور وطن سے محبت کے جذبات بھرے ہوئے تھے۔ اُن کی نظم پدمنی اُپ کھیان کی بنیاد راجپوت تاریخ کی ایک کہانی تھی جس سے راجپوت عورتوں کی بہادری کا ثبوت ملتا تھا۔ پدمنی کی طرح اُن کی نظموں کرم دیوی اور شعور سندری

میں انگریزی شاعروں کے طریقوں کی عمداً پیروی کی گئی تھی اور وہ حب الوطنی کے جذبات کے لیے ایک اپیل رکھتی تھی۔

ہیم چندر بندیو پادھیائے (1834۔ 1904) بہاری لال کے عمر عصر تھے۔ انھوں نے رزمیہ نظم کے تجربے کئے۔ انھوں نے رزمیہ نظمیں بیر بہو کاویہ اور بھرت سنگیت لکھیں جن میں ہندوستانیوں کی خودداری کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی تھی اور نوجوانوں سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ ہندوستان کی قدیم عظمت وقار کو بحال کریں اور اُسے آزاد کرائیں۔ اسا کانن نے انھوں نے ''سنہری روشنی سے جگمگاتے ہوئے مشرق '' کے گیت گائے اور کہا'' مادرِ وطن جو ایک دفعہ پھر اپنے تخت پر بیٹھی ہوئی ہے اور اس کے چہرے پر قدیم مدت کے جدید مسکراہٹ کھیل رہی ہے ... ایک دفعہ پھر خوشی سے سرشار ہو کر ہندوستان کے بچے بنسی بجا رہے ہیں اور مسرت سے سرشار ہو کر وہ ایک دفعہ پھر بگل کی آواز کے ساتھ ذہن پر جادو پیا ہو گئے ہیں۔''

ہیم چندر کی طرح نیسن چندر سین (1878۔ 1909) نے بھی ہندو سماج کی حیات نو کے خواب دیکھے۔ اُن کی سہ المیہ رائے واتکا اور پربھاس میں اُنھوں نے کرشن کے کارناموں کا ذکر کیا ہے۔ اُس میں قومی ذلت کے وجود پر بحث کی گئی ہے اور اُس کا علاج بتایا ہے۔

''ایک مذہب ہونا چاہیے، ایک نسل، ایک سلطنت، ایک قانون اور سب کا نظریہ ہونا چاہیے سب کی بھلائی۔''[1]

لیکن اُن کے ہم عصروں میں سب سے زیادہ ادبی صلاحیت رکھنے والے تھے مائکل مدھوسودن دت (1828۔1873)۔ اُن کی تعلیم ہندو کالج میں ہوئی تھی۔ جہاں وہ نئے تصورات سے روشناس ہوئے جس کی وجہ سے اُن کے اور اُن کے والدین کے درمیان اختلافات ہو گئے اور اُنھوں نے اپنا گھر اور مذہب چھوڑ کر عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ اُن کی زندگی بڑی پر آشوب تھی۔ گھر چھوٹا، شادی سازگار نہیں رہی۔ طلاق ہوئی۔ یورپ میں بے سود قیام رہا، واپس آئے تنگ دستی میں بقیہ عمر گزری، بیمار ہوئے اور مر گئے۔ اُن کی مقابلتاً کم لیکن پر اثر واقعات زندگی میں

---

[1] سین، نیسن چندر، رائے واتکا، صفحہ 30 واس گپتا۔ ایچ۔ ایم اُنیسویں صدی میں بنگالی شاعری پر مغربی اثر، صفحات 79-78

اُنہیں تخلیقی کاموں کے لیے صرف چار سال ملے (1858۔ 1862) جس میں اُنھوں نے اپنے شاہ کار لکھے یعنی ڈرامے سرشتھا بد ماؤں اور کرشنا کماری رزمیہ نظمیں تیلوتما، میگھنا دبادھ، غیر مکمل غنائیہ نظم براجن گن اور مکتوبی نظم برنگن۔ اُن کتابوں نے ظاہر کر دیا کہ مدھوسودن دت کو شاعری کی ہر صنف میں عجیب وغریب مہارت حاصل تھی چاہے وہ رزمیہ ہو، غنائی ہو، ڈرامائی ہو، بیلڈ ہو، سانٹ ہو یا کوئی اور صنف ہو۔ اُنھوں نے شاعری میں نئے اوزان اور قافیوں کے نظام کو چلن دیا یعنی نظم معرا، چھ رکنی بحر اور ہشت مصرعی بند کو اور قدیم بنگالی اوزان اور بحروں اور بندوں کی ساخت کے تجربے کئے۔ ہندوستان کے ماضی کے لیے اُن کے دل میں جو محبت تھی اُس کی بنا پر اُنھوں نے ہندوستان کے لوگوں کے ادب اور تاریخ سے موضوعات کا انتخاب کیا یعنی رامائن، مہابھارت، کالی داس کی نظموں ، وشنوگیتوں، راجپوتوں کے دلاوری وغیرہ سے۔ لیکن اُنھوں نے اُن موضوعات کو نئے سانچوں میں ڈھالا۔ قدیم ہیرو کے بیان میں یا مسلحہ اقدار کی اہمیت پر اعتراض کرنے میں یا زندگی کے متعلق جدید نقطۂ نظر کی اہمیت اور ضرورت پر زور دینے میں وہ روایت سے روگردانی کرنے سے ڈرتے ہیں۔ اُن کے ڈرامے '' سرشتھائے '' کے متعلق ایک پڑھے لکھے پنڈت نے کہا '' اس میں سنسکرت صرف ونحو کے تمام اصولوں کی خلاف ورزی کی گئی ہے۔ اپنی رزمیہ نظموں میں اُنھوں نے بنگالی شاعری کے قاعدوں کو نظر انداز کیا اور کامیابی کے ساتھ اُن میں انقلاب برپا کر دیا۔ اپنی مزاحیہ تحریروں میں اُنھوں نے بنگال کے سماج پر طنز کیا۔ یعنی اُس کی ریاکاری اور بد دیانتی پر۔ '' کرشنا کماری '' میں اُنھوں نے جدت سے کام لیتے ہوئے المیہ کی عکاسی کی جو ہندوستان کی ڈرامائی روایت کے خلاف تھا۔ اپنی سب سے اہم کتاب '' میگھاند بدھ '' کے متعلق اُنھوں نے اپنے ایک دوست سے کہا تھا '' میں یونانی کہانیاں مستعار نہیں لونگا بلکہ اُس طرح لکھنے کی کوشش کروں گا جیسے یونانی لکھتے تھے '' اُن کی کردار سازی میں حقیقت پسندی کی کوشش شامل ہوتی ہے اور وہ قدیم ہیرو کو انسان بنا کر پیش کرتے ہیں۔ بالمیکی کی رامائن کے کردار کے برعکس اُن کا راون '' برائیوں سے پاک ہونا چاہتا ہے '' جو ایک بہادر سپاہی ہے۔ لیکن ایک پیار کرنے والا باپ بھی ہے۔ میگھاند ایک نظم کا حقیقی ہیرو ہے جو بہادر ہے، باوقار ہے اور اولوالعزم ہے جسے ایک ریاکاری لکشمن قتل کر دیتا ہے جو اپنی فتح کے لیے مایا کی چالوں پر

بھروسہ کرتا ہے۔ رام ایک کمزور انسان ہے جس میں بہت سی خوبیاں ہیں لیکن کئی کمزوریاں بھی ہیں۔

مائکل مدھ سودن دت کی شاعری پر مغرب کی رومان پسندی کا اثر تھا۔ '' اُن کی طرح وہ فطرت کو ایک دوست اور ایک فیض رساں سمجھتے ہیں۔ اور انسان کو فرشتے یا شیطان کے بجائے انسان سمجھتے ہیں جس میں انسانی جذبات اور خواہشات ہیں اور جو زندگی کی تکمیل کے لیے جدوجہد کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہے اور اُسے اپنا مقصد سمجھتا ہے۔ اُنیسویں صدی میں مدھ سودن دت کے بعد جو شاعر پیدا ہوئے اُن میں سب سے اہم تھے رابندر ناتھ ٹیگور۔ لیکن اُنھیں بیسویں صدی کا شاعر سمجھنا چاہیے۔ اُن کی صلاحیتیں پوری طرح بیسویں صدی ہی میں بروئے کار آئیں۔ ٹیگور کا اثر پورے ہندوستان پر پڑا اور اُن کی شہرت دنیا کے گوشے گوشے میں پھیل گئی۔

بنگالی نثر کی پوری ترقی مغربی اثر کا نتیجہ ہے کہ اُنیسویں صدی کے نصف اول میں وہ صحافت، تاریخ اور سوانح، مضامین، مذہبی فکر، انگریزی اور سنسکرت سے تراجم اور دوسرے سنجیدہ ادبی کاموں میں استعمال کی گئی۔

اُنیسویں صدی کے نصف آخر میں اکشے کمار دت (1820۔ 1886) ایشور چندر ودیا ساگر (1820۔ 1891) اور بنکم چندر چٹر جی (1828۔ 1894) کی کاوشوں سے وہ فکر کا صحت مند ذریعہ بن گئی۔ دت نے رابندر ناتھ ٹیگور کے تتوابودھینی کے اڈیٹر کے طور پر اپنے مضامین میں اخلاقی بلندی، مذہبی سرگرمی اور اصلاح کے جذبے کو پیش کیا۔ پڑھے لکھے پنڈت اور سنسکرت کالج کے پرنسپل ودیا ساگر نے ہندوستانی عورت کی سماجی ترقی کے لیے بنگالی زبان کے غیر مشکوک وسائل کو استعمال کیا۔ اُن کی طرز نگارش کے متعلق رمیش چندر دت کی رائے ہے:

'' اکشے کمار کے اسلوب میں ہمیں ایک پہاڑی چشمے کی شدت اور زور ملتا ہے جس کا حسن اُن کے کھردرے پن اور ناتراشیدگی میں ہے ودیا ساگر کے یہاں زیادہ شائستگی ہے...... جسے ہم جدید بنگالی نثر تصور کرتے ہیں۔ اُن کو اُن دونوں نے شکل عطا کی ہے۔ ''[1]

لیکن اس صدی کے سب سے اچھے نثر لکھنے والے بنکم چندر چٹر جی کو سمجھا جانا چاہیے۔

---

[1] دت، آر۔ سی۔ بنگال کا تہذیبی ورثہ، صفحہ 17

1838 میں پیدا ہوئے اور کلکتہ یونیورسٹی کے پہلے دو گریجویٹوں میں اُن کا شمار تھا۔ ڈپٹی کلکٹر کے عہدے پر اُن کا تقرر ہوا اور سرکاری اعزازات سے نوازے گئے۔ 1894 میں اُن کا انتقال ہوا۔ 1864 میں اُن کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا جب اُنھوں نے اپنا پہلا تاریخی ناول ''نندینی'' بنگالی میں شائع کیا۔ وہ عہد ساز کتاب تھی۔ اُس کے بعد تھوڑی تھوڑی مدت کے بعد کئی کہانیاں آئیں جن میں '' آنند مٹھ (1883) '' سب سے زیادہ مشہور ہے۔ اس لیے کہ اُس میں بندے ماترم نظم شامل ہے جو جدوجہد آزادی کے دوران ہندوستان کا قومی ترانہ بن گئی تھی اور آزاد ہندوستان میں جسے قومی گیت کی حیثیت حاصل ہے۔ بیرم پور کے زمانہ قیام میں (1869۔ 1874) اُنھوں نے کئی ادیبوں کو یکجا کر لیا تھا یعنی بھودیو مکھرجی، دین بندھو مشرا، گروداس ہنر اور دوسروں کو جنھوں نے سیاسی مسائل، سماجی اصلاح اور تہذیبی ادبی سرگرمیوں پر تبادلہ خیال کرنے کے لیے انجمن بنائی تھی۔ 1872 میں اُن کی کوششوں سے رسالے بنگا درشن کی اشاعت شروع ہوئی جس نے بنگالی زبان اور ادب کی ترقی میں بہت مدد کی۔ بنکم کے الفاظ میں اُس کا مقصد تھا۔ '' انگریزی سے پیچھا چھڑانا... اور عام لوگوں سے اُس زبان میں گفتگو کرنا جسے وہ سمجھتے ہیں۔ ''[1]

آخری زندگی میں وہ بہت مذہبی ہو گئے تھے اور کرشن چرتر اور دھرم تتو میں اُنھوں نے ہندو دھرم کے متعلق اپنے خیالات پیش کئے اور یہ بتایا کہ وہ ہندو دھرم کے لازمی اصول سمجھتے ہیں۔ نیا ہندو دھرم جس کی اُنھوں نے وکالت کی، ہندو سماج کی ماضی کی عظمت کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش تھی اس لیے کہ اُن کا خیال تھا کہ قوم کی نجات انفرادی سماجی اصلاح سے نہیں ہو سکتی بلکہ اُس کے لیے قدیم روحانی نصب العین کو دوبارہ زندہ کرنا ضروری ہے۔

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ناولوں میں شیکسپیئر، وسکاٹ، ولکی کولنس، بلورلٹن اور دوسرے انگریزی کے ادیبوں سے اُنھوں نے بہت کچھ لیا تھا۔ اُن کے یہاں روحانی تصورات تھے یعنی ماضی کی عظمت، سماجی خرابیاں اور سیاسی محکومی کے خلاف بغاوت، قومی وقار کی بازیافت اور ہم جوئی۔ چونکہ اُنھوں نے ماضی کی عزت کے جذبات کو ابھارا۔ ناول کے ہیرو کے

---

[1] ڈبلو۔ تھیوڈوری بار، اسٹیٹسن، لے، آر۔ ریلدت، اے۔ یادو' ہندوستانی روایت کے نافذ'' صفحہ 709

گرد شجاعت وقربانی کا ہالہ بنایا، اور اُس مذہب کی تبلیغ کی جس کا مرکزی کردار بھگود گیتا کے کرشن کی فعال شخصیت تھی۔ اس لیے بنکم جدید عہد کے سب سے زیادہ بااثر مصنف بن گئے۔ ڈاکٹر سوکمار سین کے بقول '' وہ محض ناول نگار ہی نہیں تھے اُنھوں نے ایک راستہ تلاش کیا اور راستہ بنایا۔ ''[1]

لیکن بنگال اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں احیا پرستی کی ان تحریکوں کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو فرقے کی علیحدگی پسندی اور بڑھ گئی اور وہ اتنے موضوعی ہو گئے کہ غیر ہندو لوگوں کے وجود سے بے خبر ہو گئے۔ اپنے کام سے کام رکھنے اور اپنی بہبودی کے خیال میں مگن رہنے کے رویے نے اس میں شک نہیں کہ ملک میں وسیع قومی جذبے کے نشوونما پر مضر اثر ڈالا۔

IV۔ مراٹھی ادب

اُنیسویں صدی کے پہلے ربع میں جب پیشوا کی سلطنت پر انگریزی کا قبضہ ہو گیا تو وہ سیاسی ومعاشی اور سماجی عوامل جو پہلے بنگال پر اثر انداز ہو چکے تھے، بمبئی پریسیڈنسی میں بھی کام کرنے لگے۔ مراٹھی زبان اور ادب بھی اُنہی خطوط پر تبدیل ہونے لگے جن پر بنگالی زبان اور ادب تبدیل ہوتے تھے۔

برطانوی فتح سے پہلے کا مراٹھی ادب دوسرے تمام وسطی ہندوستانی ادبوں کی طرح زیادہ تر نظم میں لکھا جاتا تھا۔ اور اُس کا مقصد تھا مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کی ترسیل یا محبت اور دلاوری کے متعلق عوامی جذبات کی عکاسی۔ ابتدائی وسطی عہد میں ناتھوں، مہانو بھادوں اور درکریوں نے اُسے غیر مقلد خیالات کے اظہار کرنے، مسلک کے اصولوں کا پرچار کرنے اور خدا کی محبت کے گیت لکھنے کے لیے استعمال کیا پھر سولھویں صدی کے بعد ادبی ارتقا کا ایک نیا عہد شروع ہوا۔ روایتی انداز فکر واعتقاد پر اسلامی تصورات کا اثر پڑا اور مراٹھا زمینداروں اور تاجروں کی خوشحالی نے ادب کے نئے فروغ کے لیے میدان تیار کر دیا۔ اس تحریک کے بانی تھے ایکناتھ۔ اُن کے بعد مکٹیشور، ٹکارام اور رام داس کی طرح کے قابل ادیب پیدا ہوئے۔

---

[1] سین، سوکمار، بنگالی ادب کی تاریخ، صفحہ 237

اٹھارہویں میں شاعری کے دو دبستان پائے جاتے تھے۔ ایک طرف تو تھی مذہبی اور کلاسیکی شاعری اور دوسری طرف سیکولر اور مقبول عام شاعری تھی۔ پہلے دبستان کے زیادہ مشہور شاعر تھے سری دھر جنھوں نے رام وجئے، ہری وجئے، پانڈو پرتاپ اور سیولیل امرت لکھیں رمن پنڈت جنھوں نے مذہبی دیومالا پر بہت سی کتابیں لکھیں۔ نظم میں یعنی یا تھارتھ، دیپکا، بھیشم پرتجنا، کالیا مردان وغیرہ، مورد پنت جو بڑے پرگو شاعر تھے اور جنھوں نے رامائن اور مہابھارت کی نقل میں رزمیہ نظمیں کہیں، پرانوں کی داستانوں میں اضافہ کیا اور کیکاولی کی طرح کی متفرق نظمیں لکھیں۔ اُن کے علاوہ امرت راؤ، مہی پتی اور رگھوناتھ پنڈت اُن کے بہت سے شاگرد تھے۔

دوسرے دبستان شاعری سے تعلق رکھتے تھے لونیوں یا عشقیہ گیتوں کے لکھنے والے اور پودوں یا تاریخی نظموں کے کہنے والے۔ لونی میں بڑی آزادی کے ساتھ عشق و محبت کا اظہار کیا جاتا تھا اور وہ فحاشی تک پہنچتی تھیں۔ رام جوشی سب سے بڑا لونی لکھنے والا تھا۔ اور اُس کی لونیاں بڑی حد تک فحاشی سے مبرّا ہیں۔ یہ لونیاں گانے کا کام مرلیوں یا کھان دوب دیوتا کے لیے وقف مندر کی لڑکیوں اور گوندھالیوں کے سپرد تھا جو چلتے پھرتے گویّے تھے اور گاؤں میں ڈرامے دکھایا کرتے تھے۔

تاریخی طویل نظمیں لکھنا شیواجی کے دور میں شروع ہوا۔ شیواجی کی ماں جیجا بائی کی فرمائش پر اگن داس نے پہلی تاریخی نظم لکھی جس میں افضل خاں کے حادثے کو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن بہت سی طویل تاریخی نظمیں پیشواؤں کے زمانے میں لکھی گئیں۔ تاریخی نظمیں شاعری کی مقبول عام صنعت ہے۔ اُن میں صحت مند اور سیدھے سادے مراٹھا کسانوں کی زبان استعمال کی جاتی ہے۔ ان کی تشبیہات جانے پہچانے روز مرّہ کی زندگی کے مناظر اور دیہاتی ماحول سے لی جاتی ہیں۔ اُن کا انداز نگارش سیدھا مساوی ہوتا ہے اور اُن میں عام لوگوں کے جذبات کی عکاسی کی جاتی ہے۔

کچھ شعرا نے از خود ایسی نظمیں لکھیں۔ کچھ دوسروں نے اپنے مربیوں کی فرمائش پر قلم اٹھایا۔ اگن داس، تلسی داس اور بماجی کی سرپرستی شیواجی کرتا تھا، آنند پھندی کے آخری پیشوا۔ گنگا بیھتی، میوناجی اور پربھاکر کی عزت افزائی پیشواؤں اور دوسرے سرداروں نے کی۔ ظاہر

ہے کہ وہ اپنے مربیوں کی تعریف وتوصیف میں بڑے مبالغے سے کام لیتے تھے۔

اس قسم کی شاعری برطانوی دور کے ابتدائی زمانے تک جاری رہی، بعد کے شعرانے اُس شان وشوکت کے قصیدے پڑھے جو ختم ہوگئی تھی اور محکومیت کے ابتدائی دنوں میں جن کے دلوں میں شکوک، بے یقینی اور خطرات پیدا ہوگئے تھے۔

ابتدا میں نثر میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے ادبی تخلیق سے تعبیر کیا جاسکے۔ سنسکرت کی کہانیوں کے کچھ ترجمے تھے جیسے بیتال پچیسی، سنگھاسن بتیسی اور پنچو پاکھیان۔ راٹھا ریاست کے عروج کے ساتھ بکھرا اور کیفیات لکھی جانے لگی جن میں تاریخیں داستانیں اور تاریخی شخصیتوں کی زندگیوں کے حالات پیدا کئے جاتے تھے۔ ان کے لکھنے والے محرر تھے جو راجوں اور ان کے وزیروں کی ملازمت میں تھے۔ ان کی زبان بڑی کھُردری رہتی تھی اور حقائق کے بیان میں احتیاط نہیں برتی جاتی تھی۔ ان کی بہترین مثالیں ہیں بھاؤ صاحب جانجی بکھر، پانی پت چی بکھر، سبھا سرکا شیو چرتر اور چٹنس کی لکھی ہوئی سوانح عمریاں۔

تیسرے قسم کی نثر مراٹھا حکمرانوں کے خطوط، مراسلوں اور سرکاری ریکارڈوں میں دیکھنے میں آتی ہے۔ اُن میں راجپوت حکمرانوں، مغل گورنروں اور دہلی کے شہنشاہ کو بھیجے جانے والے سفیروں کی رپورٹیں ہیں اور پیشوا اور سندھیا، ہلکر، ناگپور کے بھونسلے، نانا پھڑنویس وغیرہ کی طرح کے سرداروں کے تعارفی خطوط ہیں۔ یہ چیزیں ایسی زبان میں ہوتی ہیں جو فارسی لفظیات سے بھری ہوتی ہے۔

برطانوی عہد سے پہلے کا ادب زیادہ تر مذہبی موضوعات پر پیدا ہوجاتا تھا سیکولر ادب مشتمل تھا عشقیہ شاعری اور رزمیہ نظموں پر اور روزمرہ کی ضرورت کے موضوعات پر لکھی جانے والی کتابوں پر جیسے نجوم، مساحت، طب اور حکومت ان دونوں کو نظم کی شکل دی جاتی تھی تاکہ آسانی سے یاد کیا جاسکے۔ نثر بہت کھردری تھی، اس میں ادبی چاشنی نہیں تھی اور فارسی سے بھری ہوئی تھی۔

انیسویں صدی سے نئے رجحانات ظاہر ہونے لگے۔ اس میں پیش پیش تھے عیسائی مشنری 1805 میں کیری نے مراٹھی صرف ونحو پہلی مرتبہ شائع کی اور ایک مراٹھا پنڈت وجے ناتھ کی مدد

سے مراٹھی، انگریزی لغت تیار کی۔ 1814 میں سیرم پور پریس نے پہلی مراٹھی کتاب سنگھاسن بتیسی شائع کی گئی۔ بمبئی پریسیڈنسی کے پہلے گورنر مونٹ اسٹورٹ الفنسٹن نے، جولبرل ذہن رکھتا تھا اور تعلیم کا شائق اور تعلیم وادب کے فروغ کا حامی تھا، 1820 میں بمبئی نیوا یجوکیشن سوسائٹی قائم کی اور اُسے 50000 روپے کی مالی مدددی۔ اس سوسائٹی نے اسکول قائم کئے اور وہاں کی مقامی زبانوں میں درسی کتابیں تیار کرنے کا کام شروع کیا۔ اس پروجیکٹ کی نگرانی کیپٹن جرویز کے سپرد کی گئی اور ریاضی، فزکس، تاریخ، صرف ونحو اور کہانیوں وغیرہ کی کتابیں مراٹھی میں شائع کی گئیں۔ سرائے مساحت، علم اجسام، علم تقسیم امراض اور مٹریامڈیکا کی انگریزی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا گیا۔

اسکول بک سوسائٹی نے، جس کا قیام 1882 میں عمل میں لایا گیا تھا، اسکول کی کتابوں اور بڑوں کے لیے سنجیدہ موضوعات پر لکھی جانے والی کتابوں پر انعامات دے کر کتابوں کی تیاری کی ہمت افزائی کی۔ چنانچہ جن کتابوں کے ترجموں کی سفارش کی گئی اُن میں مندرجہ ذیل شامل تھیں۔ گولڈ اسمتھ کی تاریخ روم، مالکم کی ایران کی تاریخ، ولک کی عربوں کی تاریخ اور چینیوں کی تاریخ، فزکس کمیسٹری، اخلاقیات کی کتابیں، تاریخ گجرات اور آرمے کی ہندوستان کا حال، آئین اکبری اور سکندر نامہ۔

اس طرح نئی مراٹھی نثر کی طرح ڈال دی گئی۔ ترجمے، جنھیں تصرفات کہنا چاہیے روزمرہ کی زبان میں کئے گئے تھے جسے مقفی و مسجع طرز نگارش سے پاک رکھا گیا تھا جہاں مراٹھی مترادفات نہ مل سکے وہاں انگریزی اصطلاحات استعمال کی گئی تھیں۔

سیکولر اور سائنسی علم کو پھیلانے کا ذریعہ یہ نثر بن گئی۔ 1831 میں سارا سمگر اہا یا سائنسوں اور فنون کا خلاصہ شائع کیا گیا، 1832 میں جغرافیے اور ارضیات پر ایک کتاب شائع ہوئی۔ 1832 میں قدرتی فلسفے کی گفتگو کا ترجمہ شائع کیا گیا۔ 1835 میں فیکینکس پر مضامین کا ایک مجموعہ شائع کیا گیا جو ولیم ہینری بال کی کتاب کا ترجمہ تھا اور اسی سال اصولی اور اطلاقی ریاضیات پر لیکچروں کا ترجمہ شائع کیا گیا۔ انگلستان کی تاریخ، ایک وضاحتی یک موضوعی کتاب، انگلستان کا اجمالی بیان اور جان ولسن کی ہندو دھرم کا نقش ثانی بھی شائع ہوئیں۔

1832 میں حکومت کی تعلیمی پالیسی بدل گئی۔ ایک رجعت پسندانہ فیصلہ کیا گیا اور ہندوستانی زبانوں کے بجائے انگریزی کی سرپرستی کی جانے لگی۔ بمبئی کا بورڈ آف ایجوکیشن، جس کا صدر تھا سرارسکن ہیری، انگریزی کی حمایت کرنے لگا اور ہندوستانی زبانوں میں کتابیں شائع کرنے پر روپیہ صرف کرنے سے دامن بچانے لگا۔ ہندوستانی مصنفین کے لیے یہ چنوتی تھی۔ انھوں نے بلاتاخیر اس کا جواب دیا۔ سامتری جمبھیکر، دادو پانڈورنگا اور پرشورام تاتیہ گوڈبولے نے اس چیلنج کو قبول کرلیا۔ جمبھیکر نے مراٹھی میں کئی درسی کتابیں تیار کیں۔

مراٹھی زبان پڑھنے کا چلن بڑھانے کے لیے کئی رسالے شروع کئے گئے۔ 1832 میں بال شاستری جمبھیکر نے پہلا مراٹھی اخبار بمبئی درپن شروع کیا اور 1840 میں ایک دوسرا اخبار دِک درشن شائع کرنا شروع کیا۔ بھاؤ مہاجن نے 1841 میں پربھاکر شروع کیا جس میں لوک ہت وادی نے ست پترن کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ مضامین کا ایک ایسا سلسلہ تھا جس میں سماجی اور سیاسی مسائل کے تعلق سے معقولیت پسندی کی سفارش کی جاتی تھی اور بہت سی سماجی برائیوں کا پردہ فاش کیا جاتا تھا۔ عیسائی مشنریوں نے دنیانودایا نکالنا شروع کیا جس میں عصری مسائل پر بحث کی جاتی تھی۔ 1849 میں دنیائن پرکاش پونے سے شائع ہونا شروع ہوا اور 1852 میں کرشنا شاستری چپ لنکر نے وچارلاہری شروع کیا جس کا مقصد تھا مشنریوں کے پرچار کی مخالفت کرنا۔ ان اور دوسرے اخباروں نے مراٹھی تحریر کو بہت فروغ دیا۔

نکتوں اور صرف ونحو کی کتابوں کو تیار کرکے زبان کو معیاری بنانے کی ضرورت پوری کی گئی۔ پرانے مراٹھی ادب کا احیا کیا گیا۔ جدیدیت کے ماحول نے جو تعلیم کی وجہ سے بڑھ رہا تھا، ذہنی آزادی اور تحقیق وتفتیش کا جذبہ پیدا کیا۔ کئی انگریزی کی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا اور سائنسی معیشت اور تکنیکی موضوعات پر کتابیں لکھی گئیں۔ اسی کے ساتھ سنسکرت کی کتابوں کا مراٹھی میں ترجمہ کیا گیا۔

حالانکہ اُنیسویں صدی کے نصف اول کے ادبی کارنامے بہت بڑے نہیں تھے پھر بھی جیسا کہ راناڈے نے کہا تھا اس تبدیلی کی اُمید افزا نوعیت تھی تیزی کے ساتھ ادب کا پیدا کیا جانا۔ اُنھوں نے کہا'' تمام وہ راستے کھل گئے ہیں جن سے مراٹھی ادب کی مزید نشوونما ہوسکتی ہے۔

پرانی شاعری کی اشاعت میں بہت ترقی ہوئی۔ سنسکرت اور انگریزی کی کتابوں کے ترجموں کی اچھی ابتدا ہوئی اور ترقی کا یہ پہلا مرحلہ جو کچھ کیا جا چکا تھا اُس کے مقابلے میں آئندہ ترقی کے زیادہ امکانات رکھتا تھا۔

صدی کے وسط تک طبع زاد تصنیفات سامنے آنے لگیں۔ ونا یک جناردن کرتار نے پہلا ناٹک '' تھورے مادھوراؤ '' لکھا ((1816۔ بابا پاونچی نے (1831۔ (1906 جو عیسائی ہو گئے تھے۔ ایک ناول '' نمیا پریاتن ''میں ایک ہندوستانی بیوہ کے دکھ بیان کئے اور یسوع کے پیغام کی تعریف کی۔ اُس کے بعد کئی اور ناول لکھے گئے جن میں رومانی جذبات پائے جاتے تھے، حقیقی انسانی احساسات جھلکتے تھے اور بالواسطہ انداز میں اس زمانے کے سماجی مسائل کے خلاف جدوجہد کی گئی تھی۔ ان ابتدائی کوششوں کے بعد جن میں عجیب وغریب اور مافوق الفطرت کردار اہم رول ادا کرتے تھے مقصدی ناولیں لکھی جانے لگیں۔ اس قسم کے ادب کی بہترین مثال تھے ہری فرائن آپٹے (1864۔ (1889 وہ اپنے کردار زندگی سے لیتے تھے اُن کے ذہنوں کو تجزیہ کرتے تھے اور اُن مسائل پر بحث کرتے تھے جس کا اُن کرداروں کو سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اُن کی کہانیوں میں اس قسم کی سماجی خرابیوں کی عکاسی کی جاتی تھی۔ جیسے بچپن کی شادیاں، بیواؤں کے دکھ، مشترکہ خاندان، عورتوں کی کمتر حیثیت اور مردوں کا اُن کی طرف تحکمانہ رویہ۔ اُن کی کتابوں کا مرکزی موضوع ہے جدیدیت کے ساتھ روایت کا ٹکراؤ۔ نثر کی ادبی ترقی پر آپٹے کا اثر دیرپا ہے۔

مراٹھی ادب کے نمو میں 1874 ایک اہم سنگ میل ہے۔ ابھی تک زیادہ تر مصنفین یا تو سنسکرت کلاسک یا مشہور انگریزی کی کتابوں کے ترجمے میں مشغول تھے۔

نہ صرف اُن کے خیالات بلکہ زبان کی وہ شکل بھی بدیسی معلوم ہوتی تھی جسے وہ استعمال کرتے تھے۔ 1874 میں وشنو شاستری چپلنکر نے '' نبندھ مالا '' لکھ کر مراٹھی قارئین کو دکھایا کہ انسانی عمل کے تمام میدانوں جیسے تاریخ، سیاست، معیشت، فلسفہ اور اخلاقیات میں انتہائی دقیق و پیچیدہ تصورات کو پیش کرنے میں مراٹھی نثر کن بلندی تک پہنچ سکتی ہے اُن کے مضامین اسلوب اور اظہار کے نمونے بن گئے۔ اُنھوں نے مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کی

جیسے مراٹھی زبان، شاعری، تاریخ، اوہام پرستی، ترجمہ کا فن، جانسن کی سوانح، ملک کی صورت حال وغیرہ وغیرہ۔'' ان کے طنز، دشنام آمیز تجدید، پروقار اسلوب، بے اندازہ اطلاعات اور سنسکرت اور مراٹھی ادب کی پوری پوری واقفیت نے پڑھنے والوں کا من موہ لیا۔ ''اُن کی تحریروں نے تعلیم یافتہ طبقے کو اُن زنجیروں سے آزاد کرادیا۔ جو اُنھیں بدیسی فکر سے باندھے ہوئے تھیں۔ چپ لنکر نے کیسری اور مراٹھا کو بھی شروع کیا تھا۔ جنھوں نے آگے چل کر تقریباً آدھی صدی تک مراٹھوں کی سیاسی تحریک اور فکر کی رہنمائی کی۔

1882 میں چپ لنکر کا انتقال ہوگیا۔ اُس وقت اُن کی عمر صرف بتیس سال کی تھی۔ لیکن زبان کو مالا مال کرنے کے اُن کے کام کو اگرکر تلک، شورام مہادیو پرانجی اور بہت سے دوسرے مصنفوں نے جاری رکھا۔ اگرکر نے کیسری کی اشاعت کے وقت سے سات سال تک اُس کی ادارت کی ذمہ داری سنبھالی۔ اُس کے بعد تقریباً اتنی ہی مدت تک وہ سدھارک کے اڈیٹر رہے۔ وہ سماجی معاملات اور سیاسی دونوں میں شدت پسند تصورات رکھتے تھے اور بلاخوف اُن کا اظہار کرتے تھے۔ تلک نے سیاسی جدوجہد پر توجہ رکھی اور اپنے حملوں کا نشانہ زیادہ تر بدیسی حکومت کو بنایا۔ اُن کی زبان سے اُن کی شخصیت جھلکتی تھی یعنی ایک نڈر، کھردری اور زور دار شخصیت۔ اُنھوں نے گیتا رہسیہ لکھی جو گیتا کی تشریح تھی اور جس میں ترک دنیا کے تعلق سے اُنھوں نے شنکر کی دلیل کی تردید کی اور اس بات پر زور دیا کہ ہر شخص کو بے لوثی کے ساتھ اپنا مقررہ کام پورا کرنا چاہیے۔ چپ لنکر، اگرکر اور تلک کی تحریروں نے کئی دوسرے مصنفین کو متاثر کیا۔ جن میں سے شری پد کرشنا کولہاٹکر نے مزاحیہ مضامین میں شہرت پائی، شورام مہادیو پرنجی نے ادبی مضامین میں کیلکر نے تنقیدی مضامین میں اور راج وادے نے تاریخی مضامین میں۔ کئی لکھنے والوں نے سوانح اور تاریخ پر توجہ کی۔ مغرب کے مشاہیر یعنی شاعروں، ڈرامہ نگاروں، سیاست دانوں اور حکمرانوں کی سوانح اور ہندوستان کی تاریخ کی عظیم ہستیوں کی سوانح بھی لکھی گئی ہیں۔ تاریخ پر کتابیں راج وادے، واسودیو شاستری کھرے اور پرس نس نے لکھیں۔

مغرب کے جذبے سے متاثر ہوکر اور مغربی نمونوں کے مطابق شاعری کی گئی اور ڈرامے لکھے گئے۔ کوشناجی کیشو رملے نے، جو اپنے تخلص '' کیشوسوت '' سے زیادہ مشہور ہیں، ورڈس

ورتھ اور دوسرے رومانی ادیبوں سے متاثر ہو کر فرد کے وقار، آزادی، مساوات اور انسان دوستی پر زیادہ زور دیا۔ اُن کی نظمیں توتاری، زبورزا اور نواشیائی نے مراٹھی ادب میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ان کے ہم عصروں ریورنڈ تلک، رندالکر، ونائک، تامبے، گدکاری اور تھومرے نے فطرت کے مختلف احوال کی عکاسی کی۔

ڈرامہ نگاروں میں کرلوسکر کے ڈرامے زیادہ مقبول تھے۔ جن کی بنیاد اصل سنسکرت ڈراموں پر قائم تھی۔ اُن کے ہیروؤں میں دیول اہم تھے۔ انھوں نے نابرابری کی شادیوں کی مذمت کی اور ان کے ڈرامے '' مستر د '' کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔

V۔ اردو اور ہندی ادب

شمالی ہندوستان میں اردو اور ہندی نئے حالات میں تیزی کے ساتھ ترقی کر رہی تھیں۔ لیکن اردو کا ارتقا معمول کے مطابق ہو رہا تھا جب کہ ہندی کی ترقی میں وہ تذبذب حائل تھا جو ادبی زبان کی بنیاد بنانے کے لیے ہندی کی بولیوں میں سے کسی کا انتخاب کرنے میں ہو رہا تھا۔ ان بولیوں میں سے برج بھاشا میں اعلیٰ درجہ کا ادب مقابلتاً زیادہ تھا اور انیسویں صدی کے ادیبوں کو ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کسی حد تک غیر شائستہ '' کھڑی بولی '' شاعری کے لیے مناسب اظہار کا ذریعہ نہیں ہے۔ جہاں تک نثر کا تعلق تھا اس قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں تھی۔ برج بھاشا اور ہندی کی دوسری بولیوں میں نثری ادب کا وجود بالکل نہیں تھا۔ دوسری طرف فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد کھڑی بولی میں کتابیں لکھی جارہی تھیں[1] اور یہ ظاہر ہو گیا تھا کہ وہ بولی سنجیدہ تحریروں کی صلاحیت رکھتی ہے۔

سب سے پہلے نثر کے اس اسلوب کو سدا سکھ لال، للولال جی، شومسرّا اور انشا اللہ خاں انشا نے استعمال کیا تھا۔ رفتہ رفتہ اس کا رواج بڑھنے لگا لیکن نصف اُنیسویں صدی ختم ہونے کے بعد اس کی رفتار میں تیزی آئی۔ لیکن ہندی شاعری میں نزاعی بحث جاری رہی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک آواز اور طاقت ور زبان کی حیثیت سے ہندی کی ترقی بیسویں صدی میں ہوئی۔ لیکن نثر میں

---

[1] کھڑی بولی دہلی اور اس کے آس پاس بولی جاتی ہے۔

ہندی کے اخباروں، تاریخی کتابوں، مضامین اور ڈراموں نے آئندہ کی ترقی کے لیے میدان تیار کر دیا۔

اُن نثر لکھنے والوں میں جنھوں نے مختلف اسلوبوں کے تجربے کیے مندرجہ ذیل شامل تھے۔ راجہ شیو پرشاد (1823۔ 1895) جنھوں نے تین جلدوں میں ہندوستان کی تاریخ لکھی اور اُس میں بہت سے فارسی کے الفاظ استعمال کیے۔ راجہ لکشمن سنگھ جو اپنی تحریروں میں سنسکرت کا استعمال زیادہ کرتے تھے۔ بھارت اندو ہریش چندر (1850۔ 1885) جنہوں نے درمیانی راستہ اختیار کیا۔ انھوں نے انگریزی نمونوں کی پیروی کرتے ہوئے کئی ڈرامے لکھے۔

اس زمانے کی ہندی شاعری میں بڑی حد تک احیا پرستی پائی جاتی تھی اور وہ برج بھاشا میں لکھی جاتی تھی لیکن سری دھر پاٹھک نے (1856۔ 1923) اپنی نظم '' اکانت واسی یوگی " میں یہ روایت توڑی اور کھڑی بولی کا استعمال کیا۔ ان کی پیروی دوسروں نے کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر یہ بولی ہندی شعری اظہار کا اصل ذریعہ بن گئی۔

اردو کو اس قسم کی مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ اُس کی شاعری حیرت ناک حد تک ترقی کر چکی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ غالب (وفات 1869) کی نظم و نثر نے آنے والے جدید رجحانات کی نشاندہی کر دی تھی۔ ان کے خطوط کی زبان، جو سیدھی سادی بات چیت کے انداز میں ہیں، ایک ایسا نمونہ پیش کرتی ہے جو جدید اظہار کے لیے سازگار ہے۔ ان کی شاعری میں فکر و فن کو جو اہمیت دی گئی ہے، تشبیہہ اور استعارے کی آمد اور نئے پن پر جو زور دیا گیا ہے اور روایتی اسلوب کی جزئیات سے جس طرح بچا گیا ہے وہ ترقی کے راستے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

1857 کی تباہ کاری، مغل اشرافیہ کے باقیات کے خاتمے، ایک جدید حکومت کے قیام، معاشی حالات میں ہونے والی تبدیلیوں اور نئے تصورات اور نئی تعلیم کے پھیلنے کی وجہ سے جو سماج وجود میں آیا اس نے شمالی صوبوں کے سماجی ماحول کو بدل دیا۔ آنکھوں کے سامنے ایک دنیا آ گئی اور نئے مسائل، موضوعات اور مفادات توجہ کے مرکز بن گئے۔ غزل کی محدود فضا ان کے اظہار کے لیے ناکافی تھی اس لیے مثنوی اور مسدس کو ترجیح دی جانے لگی۔ فطری مناظر و مظاہرے جیسے برسات کا موسم، سردی اور گرمی، بہتے ہوئے دریا اور پہاڑوں کے منظر شاعرانہ تخیل کے جز بن

گئے۔خیالی، بیانیہ، تاریخی، پندآمیز اور وطنی موضوعات عام ہو گئے۔

نئے حالات میں اُردو ترقی کرنے لگی اور روایتی تصورات سے ناآسودگی کا اظہار ہونے لگا۔سرسید احمد خاں نے (1817-1897) جو سیدھی سادی تکلفات سے مُبرا نثر لکھنے والوں میں پیش پیش تھے، خواہش ظاہر کی کہ '' ماضی کی اُن خیالی روایتوں کو ختم کر دیا جائے جو ہماری ترقی کی راہ میں حائل ہیں ''اور یہ کہ '' مشرقی علوم اور مغربی ادب اور سائنس میں سمجھوتا کیا جائے ''نذیر احمد نے لکھا'' ادب (قدیم (ہمیں غلط بیانی اور چاپلوسی سکھاتا ہے۔ یہ ادب واقعات کے حقیقی حسن پر پانی پھیر دیتا ہے اور اُسے ظاہر نہیں کرتا ہے... غیر صحت مند جذبات کو مشتعل کرتا ہے ... انگریزی کے مطالعے نے مجھ پر رفتہ رفتہ اپنے ادب کی خرابیاں روشن کر رہی ہیں۔''[1]

نئے دبستان کی بنیاد محمد حسین آزاد (وفات 1910) اور الطاف حسین حالی (1837۔1913) نے ڈالی جنھوں نے اردو ادب کو فروغ دینے کے لیے لاہور میں ایک ادبی سوسائٹی قائم کی۔آزاد نے نئے انداز کی اور نئے موضوعات پر نظمیں لکھیں جیسے شام کی آمد، مثنوی حب وطن، خواب امن، داد و انصاف، زمستان وغیرہ۔

حالی نے ادب کی زیادہ خدمت کی۔ وہ جتنے بڑے شاعر تھے اتنے ہی بڑے نثر نگار اور ناقد بھی تھے۔انھوں نے وطنی نظمیں لکھیں، زبان اور فطرت کے متعلق نظمیں لکھیں، سماجی اصلاح کے متعلق نظمیں لکھیں اور ناصحانہ نظمیں اور مرثیے لکھے۔اُن کی نظم شکوہ ہندوستان کے شاندار ماضی کا قصیدہ بھی ہے اور موجودہ ذلت کی شکایت بھی۔انھوں نے اپنا شاہکار مسدس حالی لکھ کر ابدی شہرت حاصل کر لی جو اسلام کے عروج و زوال کا ایک مرثیہ ہے۔

اس زمانے کے دوسرے شاعر جنھوں نے جدت کا پیغام دیا وہ تھے میرٹھ کے محمد اسمٰعیل (1873۔1910) جو بڑے پرگو تھے خصوصاً تاریخی اور مذہبی نظموں کے میدان میں اور اکبر الہ آبادی (1846۔1921) جن کی ابتدائی ادبی زندگی اس دور میں گزری اور اردو کے سب سے بڑے طنز نگار تھے۔

---

[1] نذیر احمد، مسلمانوں کی حالت تعلیم پر تقریر، آگرہ، 1889

اردو کی نئی نظم فورٹ ولیم کالج میں وجود میں آئی۔اس کی سرپرستی میں جن ادیبوں نے نشوونما پائی ان میں میر امنؔ اور ان کے ساتھی شامل تھے۔ان کا اصلی کام تھا فارسی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنا۔دہلی میں پروفیسر رام چندر نے سائنسی نثر اور مضامین کی داغ بیل ڈالی۔

اس کے بعد وہ مصنف پیدا ہوئے جنھوں نے اردو ادب کو مالا مال کردیا۔اُن میں مندرجہ ذیل شامل تھے۔آزاد جنھوں نے اردو ادب کی مشہور تاریخ '' آب حیات '' لکھی، حالی، جنھوں نے سعدی، غالب اور سرسید احمد خاں کی سوانح لکھیں، نذیر احمد (1821۔1912) جنھوں نے ناولیں لکھیں اور قانون کی کتابوں کا ترجمہ کیا، شبلی نعمانی (1857۔ 1914) جو مورخ، ناقد، فلسفی اور عالم دین تھے، ذکاءاللہ (1882۔ 1910) جو مورخ تھے، انگریزی کی سائنس کی کتابوں کے مترجم تھے اور رام چندر کے شاگرد تھے۔مرزا ہادی حسن رسوا تخلیقی نظم یعنی مزاح، طنز، ناول اور کہانی میں جنھوں نے شہرت پائی۔

سجاد حسین (1856۔ 1915) جو مزاح میں بڑی مہارت رکھتے تھے اور مشہور اخبار اَودھ پنچ کے اڈیٹر تھے، رتن ناتھ سرشار (1822۔ 1902) جو چار جلدوں میں چھپنے والے دلچسپ ناول فسانہ آزاد کے مصنف تھے جس میں انیسویں صدی کی ابتدا کے اودھ کے سماج کی عکاسی کی گئی ہے اور عبدالحلیم شرر (1860۔ 1926) جو تاریخی ناولوں کے مصنف تھے اور ایک ایسا اسلوب نگارش رکھتے تھے جس میں تازگی پائی جاتی تھی۔

VI۔تامل اور تلگو ادب

جو رجحانات شمال کی آریائی زبانوں میں دیکھنے میں آئے وہی دراوڑی زبانوں میں بھی ظاہر ہوئے یعنی تامل، تلگو، کنڑ اور ملیالم میں۔تامل بہت پرانی زبان ہے جس میں وسیع ادب پایا جاتا ہے۔تامل بولنے والے لوگوں کے روابط یورپ کے لوگوں سے بہت پرانے زمانے سے قائم تھے۔ پندرھویں صدی میں پرتگالی ہندوستان آئے، مغربی اور مشرقی ساحلوں پر آباد ہوگئے، ہندوستانی عورتوں سے انھوں نے شادیاں کیں، ہندوستانی رہن سہن اختیار کی اور تامل اور ملیالم زبانیں سیکھیں۔اُن کے بعد عیسائی مشنری آئے جن کا تعلق سوسائٹی آف جینیس سے تھا۔

انھوں نے تامل نثر کو جنم دیا، تفتیش تیار کیں اور صرف ونحو کی کتابیں لکھیں۔ اُن میں پہلا شخص تھا رابرٹ دی نوبل (1577۔ 1656) اُس کے بعد 1700 میں کاسٹن پٹن جوزف بیچی آیا۔ وہ بڑا ماہر لسانیات تھا جس نے تامل میں کتابیں لکھیں یعنی جوزف کی زندگی پر تمبارانی اور نثر میں پرمارتھا گرد کتھائے۔ اس کے جلد ہی بعد پروٹیسٹنٹ مشنری آئے بارتھولو میوز جنبا لگ نے (1683۔ 1719) جو 1706 میں آیا تھا، تامل کا چھاپا خانہ قائم کیا۔

مشنریوں کے ساتھ تاجر اور سلطنت قائم کرنے والے بھی آئے۔ پرتگالی، ولندیزی، فرانسیسی اور انگریز ہندوستان میں طاقت حاصل کرنے کے لیے رقابت میں مبتلا ہوگئے۔ اٹھارہویں صدی میں انگریزوں کی فتح کے بعد ان کی باہمی کشمکش ہوگئی جنھوں نے جزیرہ نما میں فرانسیسیوں اور ہندوستانی حکمرانوں کو شکست دے کر اپنی حکومت قائم کر لی۔

اس کے بعد ایسٹ انڈیا کمپنی کا انتظامی ڈھانچہ بنایا گیا اور کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج کی طرح کا فورٹ سینٹ جارج کالج 1812 میں مدراس میں قائم کیا گیا۔ یہاں کمپنی کے ملازمین کو تامل زبان پڑھائی جاتی تھی، تامل کی ایک لائبریری بنائی گئی اور تامل میں کتابیں چھاپی گئیں۔

جو پنڈت کالج میں پڑھاتے تھے انھوں نے سب سے پہلے مغربی نقطۂ نظر کو جذب کیا۔ انھوں نے قدیم کلاسیکی کتابوں کے تنقیدی اڈیشن چھاپے، انگریزی کتابوں کے ترجمے کئے اور لغتوں اور صرف ونحو کی کتابوں کی تیاری میں مدد دی۔ رفتہ رفتہ جدید اور طبع زاد ادب کے لیے زبان معرض وجود میں آگئی۔ مناکشی سندرم پلے (1815۔ 1926) جو ایک جانے پہنچانے عالم اور تامل کے استاد تھے، اپنی زبان میں لکھنے کے لیے اپنے طالب علموں کی ہمت افزائی کی۔ اُن کے شاگرد ویدنا یکم پلے (1826۔ 1889) نے تامل میں پہلا ناول لکھا۔ ان کے ایک اور شاگرد تھے۔ یو۔ وی۔ سوامی ناتھ ایئر (1800۔ 1942) جنھیں '' تامل کی نشاۃ ثانیہ کا نقیب، تامل کلاسیکی ادب میں جان ڈالنے والا اور تامل لوگوں کو اُس نسل کو محرکات مہیا کرنے والا کہا جاتا ہے جس میں سبرامنیم بھی شامل تھے۔''

انگریزی اور سنسکرت سے کہانیوں اور حکایتوں کے ترجمے کا دور شروع ہوا جس نے تامل پڑھنے والوں میں حرکت پیدا کر دی۔ اس کے بعد طبع زاد ناولیں، جن کے موضوعات رومانی اور

سماجی ہوتے تھے، اور ڈرامے لکھے جانے لگے جو شیکسپیئر، بن جانسن، گوٹواستی، شریڈن اور دوسروں کے چربے تھے۔ تاریخی، سماجی، رومانی اور وطنی تصورات ادب میں مقبول ہوگئے۔

نثر کی ترقی اور جدید تصورات کی اشاعت میں اخباروں نے بھی مدد دی۔ اور انگریزی تعلیم کے فروغ نے مغربی ادب میں لوگوں کی دل چسپی بھی بڑھادی اور جدید انداز فکر کو قبول کرنے کے لیے انھیں آمادہ بھی کردیا۔ عالموں اور مصنفوں کا ایک طبقہ پیدا ہوگیا جس نے جدید تامل ادب کو جنم دیا۔

تلگو ادب کی تاریخ کے مطالع سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ادب کی ترقی میں اُسی قسم کے عوامل کام کررہے تھے جو ہندوستان کی دوسری زبانوں کی نشوونما میں کررہے تھے۔ اٹھارہویں صدی کے وسط سے انیسویں صدی کے وسط تک کا دور انحطاط کا دور تھا۔ شاعر حقیقی شاعری کے بجائے ''ذہنی ورزش'' کے دلدادہ تھے۔ اچھی شاعری ختم ہوگئی تھی اور عشق ومحبت کے مصنوعی واقعات غالب آگئے تھے۔ اس کے بعد کا دور یعنی 1850 سے 1900 تک کا تبدیلی کا دور تھا جس میں انگریزی اثر اور روایت میں تصادم ہورہا تھا۔ شاعری میں پرانا اسلوب اب بھی بہترین سمجھا جاتا تھا۔ مہابھارت اور رامائن سے اخذ کئے موضوعات پر نظمیں لکھیں جاتی رہیں۔ تشبیہ و استعارے سے کام لیا جاتا تھا، سرمدنی صفت کو پسند کیا جاتا تھا اور اوُدھنم جس میں ادبی اہمیت کی آٹھ صفتیں اور سوشعر ہوتے ہیں، مقبول تھا۔ نثر کا چلن چینیا سودی (1806۔ 1862) نے ڈالی۔ وہ مقفّٰی اور سجی سجائی نثر لکھتے تھے جو بول چال کی زبان سے بہت دور تھی۔

1880 کے لگ بھگ سماجی اصلاح کی سرگرمیوں کے بعد ایک نئی تحریک شروع ہوئی جس کو کنڈکاری وینسا لنگم (1848۔ 1919) نے شروع کیا تھا۔ انھوں نے خراب سماجی رواجوں کا مذاق اڑانے کے لیے ایک اخبار ہاسیہ سنجیونی کی اشاعت شروع کی اور تخلیقی فن اور ادب کو فروغ دینے کے لیے ایک اور اخبار دیوک وردھنی شروع کیا۔ وہ پہلے تلگو مصنف تھے جنھوں نے ناول، مضامین، ڈرامے اور سائنس پر کتابیں لکھیں۔ ان کے ساتھ ایک نیا ادبی دور شروع ہوا جس نے چینیا سودی کی اُس دور میں رائج پستہ قد نثر سے منہ موڑا اور ایک سادہ اور فطری اسلوب نگارش کو چلن دیا۔

دوسرے مصنف جنھوں نے جدید اسلوب کو فروغ دیا وہ تھے گروزادہ ونکٹ اپّا راؤ (1861۔ 1916)، گڈوگوونکٹا راما مورتی (1868۔ 1940)، کمارا جوونکٹ لکشمن راؤ اور دیودھرا کوکامی ناتھن نگیسورا راؤ۔ وہ لوگ تلگوادب میں نشاۃ ثانیہ کے نقیب تھے اس لیے کہ انھوں نے اُس زبان کو جو پہلے استعمال ہوتی تھی تبدیلی دور کے مطابق بنانے کی کوشش کی۔ انھوں نے نئے دور اور ایک نئے ادب کے لیے میدان تیار کردیا۔

ہندوستان کی کچھ زبانوں کی ادبی تحریکات کے اس اجمالی جائزے سے ظاہر ہوتا ہے کہ پورے ملک میں ہندوستانی ذہن کی ترقی میں مشترکہ رجحانات پائے جاتے تھے۔ مغرب کے تصورات کو جذب کرنے اور مغربی رجحانات اور اظہار کے طریقوں کو قبول کرنے کے لیے ہندوستانی ذہن تیار تھا لیکن اسی کے ساتھ اُسے اپنے روایتی ورثے سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ وہ بہت سی قدیم چیزوں میں ترمیم کرنے بلکہ انھیں رد کردینے کے لیے بھی تیار تھا۔ لیکن وہ اس کے لیے تیار نہیں تھا کہ مجموعی اعتبار سے ماضی کے پورے ورثے کو رد کردے۔ اس کی کوشش تھی کہ اپنی تہذیب کی مستقل اور دیرپا اقدار کو محفوظ رکھے اور مغرب سے وہ اقدار حاصل کرے جو ایک نئے سماج کی تعمیر کے لیے ضروری تھیں۔ مشرق اور مغرب میں سمجھوتا کرنے اور مشرق کے ضروری اقدام کو ترک کیے بغیر مغربی طور طریق سیکھنے کی ہندوستان کی کوشش نے فکر اور مذہب کے بہت سے نظاموں کو جنم دیا۔ لیکن اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے مشترکہ نقطۂ نظر اور یکساں تصورات و جذبات کو جنم دیا جو قومی شعور کے پیدا ہونے کی پہلی شرائط ہیں۔

***

''تاریخ تحریک آزادی ہند جلد دوم'' کے مصنف تاراچند مشہور مورخ ہیں۔ انھوں نے دل کو گرمانے والے ان واقعات کو سچائی اور یکسانیت کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کی ہے جو انسانی ارتقا کی تاریخ کے ایک دلچسپ اور سبق آموز باب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کتاب کو لکھتے وقت اتنا زور نئے واقعات کی دریافت پر نہیں دیا گیا جتنا کہ جانے پہچانے واقعات کی تشریح وتصریح پر۔ اس بات سے اچھی طرح واقف ہونا چاہیے کہ تاریخ نویسی میں قطعیت نہیں ہوا کرتی ہے۔ ساتھ ساتھ یہ دکھلانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان کے بنگال کے مسلمانوں میں انگریزوں کی طرف سخت بے اطمینانی اور نفرت کے جذبات پائے جاتے تھے۔ ان کے بالائی طبقہ نظامت کی معزولی، انگریزی انداز کے انتظام اور مسلمان حاکموں کی جگہ انگریز حاکموں کے تقرر سے متاثر ہوئے تھے۔ بڑی بڑی زمینداریوں کے مسلمانوں کے ہاتھوں سے نکل جانے کی وجہ سے بھی ان پر مضر اثر پڑا تھا۔ انگریزوں اوران کے بندگماشتوں کے مظالم اور نیل کی کاشت کرنے والے انگریزوں کی بنا پر مسلم نچلے طبقے بے روزگار ہوگئے تھے۔ ہندوستان میں برطانوی حکومت کی پہلی صدی میں بڑھتے ہوئے دکھوں اور تکلیفوں کا زمانہ تھا۔ پرانے حکمراں طبقے محسوس کرتے تھے کہ ان کی زندگی رنگ ونور سے محروم ہوگئی ہے۔ حقیقت میں ایک اداس منظر تھا۔ 1857 کی بغاوت میں وہ تمام تحریکیں اور مقاصد شامل تھے، جنھوں نے گزشتہ بغاوتوں اور شورشوں کو جنم دیا تھا اور قریب قریب پورے ہندوستان پر محیط تھی۔

تاراچند نے تاریخ سے متعلق تعلیم وتعلم کے تجربات کے بعد ''تاریخ تحریک آزادی ہند جلد دوم'' کو تمام مواد کی چھان بین اوران کے مختلف پہلوؤں پر غوروفکر کرنے کے بعد مزین کیا تاکہ یہ کتاب علمی وعملی دونوں اعتبار سے اہمیت کی حامل ہو جن کا جاننا تاریخ کے طالب علم کے لیے نہایت ضروری ہے ڈاکٹر تاراچند الہٰ آباد یونیورسٹی میں درس وتدریس سے وابستہ رہے ہیں۔ انگریزی زبان پر ان کی قدرت قابل داد ہے اس کتاب میں تاریخی حقائق اپنی اصلی صورت میں نظر آتے ہیں۔

غلام ربانی تاباں نے اس کتاب کا ترجمہ اردو زبان میں کیا ہے۔ مترجم نے اردو کا حسن برقرار رکھا ہے۔ امید ہے کہ تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔

ISBN: 978-93-87510-84-5
9 789387 510845
NCPUL
New Delhi
₹ 310/-

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی، 33/9،
انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولا، نئی دہلی۔ 110025